ندیم
بہار نمبر ۱۹۴۰ء
قیمت
دو روپے

۷۸۶

رسولِ پاک صلعم

کا

ارشادِ عالی ہے

طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کلّ مسلمٍ و مسلمۃٍ

(علم کا طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے)

پس آپ اپنے

قیمتی وقت کو ضایع نہ کریں۔ بلکہ فرصت کی گھڑیوں کو کتب بینی میں صرف کر کے

فلاحِ دارین حاصل کریں

شاعرِ اسلام زندہ جاوید

حضرتِ اقبال رح

و

تمام دیگر مصنّفین کی تصانیف

اقبال بکڈپو پٹنہ

سے

منگائیں

قطعہ

مستمندانہ بادشاہی ہے — خاکسارانہ کجکلاہی ہے
حال کا غم نہ خوفِ مستقبل — صبر و تسلیم و مست حالی ہے
بغض و کینہ و رشک و آز نہیں — راستی کی زبان عادی ہے
ہمت و عزم شرم و خودداری — سیر چشمی و بُردباری ہے
منصفی و خلوص و حسن پسند — سینہ آئینۂ آگہی ہے
دامنِ اغدار پاک و صاف — فیضِ جامِ طہور ساقی ہے
اوستادانہ درد مندانہ — سعیِ کسبِ معاش جاری ہے
حسبِ حاجت فلوس و سیم و زر — بیم پرسش سے جیب خالی ہے
مار در آستیں سراسیمہ — نوشدار وے آسمانی ہے
خاص ہیں غیر غیر خود غرضے — چند سے لطفِ زندگانی ہے
گھر کے اندر سکون کی دنیا — جنتِ ارضی و سماوی ہے
دلِ دفینہ ہزار حسرت کا ہے — فکر گنجینۂ معانی ہے
فارسی کا دقیق شاعر تھا — دسترس فلسفہ میں کافی ہے
ابتلا انقلاب ہنگامہ — پردۂ رازِ درمیانی ہے
پیرِ تعلیم ذوق و شوقِ خلش — فضلِ پروردگار شافی ہے
مصلحت راز نکتۂ باریک — فرطِ ارزانی و گرانی ہے

خود فراموش کسمپرس اختر
جامِ جسم خاکِ کیمیائی ہے،

نگراں
اختر حسن ہومیوپیتھ۔ ایم اے۔ بی اے بی ایل ایم ڈی ایچ

غسل کیلئے مثالی صابون

دنیائے سائنس کی کامیاب تحقیق

کمینیا وھائٹ سوپ

اپنی خوشبو سے آپ کے غسل کو فرحت بخشے گا۔ تین عدد صابون کے پیکٹ کیلئے صرف ۱۲؍ علاوہ محصول ڈاک۔
ہر بڑے شہر کے اسٹور اور دوکان میں بکثرت ملتا ہے۔
پوسٹیج کیلئے ۲؍ آنہ کا ٹکٹ روانہ کریں۔

دوسری قسمیں کمینیا صندل سوپ، دل بہار سوپ، کمینیا لونڈر سوپ اور خس وغیرہ تین عدد صابون کے پیکٹ کے لئے ۱۲؍ آنہ علاوہ محصول ڈاک۔

عمدہ اور سستے صابون کی دوسری قسمیں

کمینیا ٹرکش باتھ سوپ، کمینیا مورننگ سوپ، اِگ سوپ، اور کمینیا بابا سوپ

کمینیا	ٹرکش	باتھ	سوپ	قیمت	فی درجن	عہ؍
״	مورننگ	״	״	״	״	عہ؍
״	اِگ	״	״	״	״	۱۴؍
״	بابا	״	״	״	״	۱۲؍

بازار کے ہر اسٹور میں ملتا ہے محصول ڈاک علاوہ۔ نمونہ سے معاف رکھیں البتہ نیچے کا کوپن پر کرکے بھیجئے نمونہ بھی مفت بھیجا جائے گا۔

سول ایجنٹس:۔ اینگلو انڈین ڈرگ اینڈ کیمیکل کمپنی بمبئی نمبر ۲

مفت عطیہ:۔ کاکوپن مہربانی کرکے اپنے تیار کئے ہوئے مالوں کے چار عدد نمونے بھیج دیجئے محصول کیلئے ۲؍ کے ٹکٹ روانہ کر رہا ہوں۔
نام و پتہ:۔

تصانیف حضرت مولینا شاہ محمد عزالدین صاحب پھلواروی ندوی سابق خطیب شاہی مسجد لاہور

(۱) علوم الحدیث

حدیث اپنی گوناگوں عظمت کے باعث دین میں جو مرتبہ رکھتی ہے وہ کسی اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لیکن اب تک بجز مختصر مضامین اور چھوٹے چھوٹے رسالوں کے جو اپنے باب میں بالکل ناکافی ہیں، علم حدیث کی مفصل تاریخ کی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی، الحمد للہ کہ یہ بڑا کام بھی کافی تحقیق و تدقیق کے ساتھ عربی اور غیر عربی ماخذوں سے بڑی دیدہ ریزی اور عرق سوزی کے بعد تکمیل کو پہنچ گیا اس میں سب سے پہلے ضرورت حدیث اور سنت کی تعریف اس کے اقسام بیان کئے گئے ہیں۔ پھر سنت کے سینوں کے محفوظ خزانے سے نکل کر سفینوں میں آنے کی وجہ اور نفس حدیث کے جزو دین ہونے کے دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ کیونکہ اس دور میں ایک نیا فتنہ انکار حدیث کا بھی پیدا ہو گیا ہے۔ جو حدیث کے جزو دین ہونے سے انکار کرتا ہے۔ اور اپنے زعم فاسد میں یہ سمجھتا ہے کہ حدیث رسول کریم صلعم کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ حدیث کے جزو عقائد ہونے پر اس کتاب میں نہایت محکم اور حقیقت تک پہونچانے والے دلائل دئے گئے ہیں، پھر علم حدیث کی ہر ایک مدون شاخ کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ اور بیان حدیث میں صحابہ کے مسلک کی توضیح بھی ہے۔ حدیث کی جملہ اقسام سے بحث کی گئی ہے۔ مثلاً علم الجرح والتعدیل، علم غریب الحدیث، علم ناسخ الحدیث و منسوخہ، علم الانساب والکنا والالقاب، علم موضوعات الحدیث وغیرہ، سبھوں سے پوری بحث کی گئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ وہ حضرات جو اہل قرآن ہونے کے مدعی ہیں اور حدیث نبی کریم صلعم کو اپنی ناسمجھی کی وجہ سے وقعت نہیں دیتے، ان کے رد میں یہ ایک زبردست خزانہ ہے جو کتابی شکل میں قوم کے سامنے آ گیا ہے۔ نیز طلبائے مدارس عربیہ کے لئے یہ ایک ایسا مجرب تریاق ہے جو بڑی تلاش و جستجو کے بعد مہیا کیا گیا ہے، علما و طلبائے مدارس عربیہ کے لئے یہ نادر موقع ہے، اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیئے، طلبہ کے لئے امتحانات کے موقع پر بھی یہ کتاب نہایت کار آمد ہے غرض جلد از جلد اس کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ ورنہ پھر کف افسوس ملنا پڑے گا۔ اور دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا ہوگا۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ) رکھی گئی ہے۔ لیکن طلبہ کے لئے خاص طور پر یہ رعایت ہے کہ ان کو صرف ایک روپیہ (عہ) میں دیدی جاتی ہے۔ علاوہ محصولڈاک۔

(۲) حیات احمد بن حنبل

دنیائے اسلام جن چار اماموں کی نام لیوا ہے، ان میں ایک حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ بھی ہیں اردو زبان میں اب تک حضرت امام ابو حنیفہ امام مالک، امام شافعی رحمہم اللہ کے حالات زندگی آچکے ہیں لیکن حضرت امام احمد رح کی کوئی سوانح عمری اردو میں نہیں لکھی گئی تھی، اور بڑی ضرورت تھی کہ ان کے حالات زندگی بھی اردو کا جامہ پہن لیں۔ اس کتاب میں امام احمد رح کے پورے حالات زندگی، تحصیل علم شیوخ حدیث و فقہ، تقویٰ و زہد، مسئلہ خلق قرآن میں بے نظیر ثبات قدمی، صبر و استقلال، ظالم بادشاہوں کے مقابلہ میں حق کی حمایت، پھر جسم مبارک پر کوڑوں کا لگنا اور حضرت کا اقرار حق کرتے جانا یہ تمام باتیں بڑی تفصیل سے بیان ہوئی ہیں۔ موجودہ زمانے کے مجاہدین اور اہل حق کے لئے یہ کتاب بہترین بصیرت ہے۔ تمام مسلمانوں کو جلد از جلد اس کی خریداری کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے، کیونکہ یہ کتاب اپنی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ہے۔ اور ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے۔ قیمت صرف ۵

(۳) کشف الظلام فی ترجمہ شفاء السقام

شیخ الاسلام علامہ تقی الدین سبکی کی معرکتہ الآرا کتاب شفاء السقام فی زیارت خیر الانام کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ ایک عرصہ سے اس کتاب کے اردو ترجمہ کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ الحمد للہ کہ یہ بڑا کام بڑی خوبی کے ساتھ پورا ہو گیا۔ ترجمہ کے ساتھ مصنف علام کی سوانح حیات اور ایک مبسوط دیباچہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ علامہ سبکی نے یہ تصنیف علامہ ابن تیمیہ کے بعض غلط معتقدات کی تردید میں لکھی تھی جن مسائل پر اس کتاب میں خصوصیت سے بحث کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔ "زیارت قبور، استمداد، توسل، تشفع، حیات انبیاء و شہداء، مقام محمود، اقسام شفاعت، ادعیہ ماثورہ وغیرہ، اتنے یکجا مواد اس کتاب کے علاوہ دوسری کتاب میں نہیں مل سکتے۔ ترجمہ کی زبان صاف و سلیس ہے۔ بلا مبالغہ کہا جاتا ہے کہ کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل چکی ہے۔ صرف معدودے چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ ان مسائل پر یہ اپنے نظیر کتاب ہے جس کا اعتراف ملک کے ہر اہل علم طبقہ نے کیا ہے۔ جلد آرڈر بھیجئے ورنہ ایک بڑی نعمت سے محروم ہو جائیں گے۔ نیز ایجنسیاں بھی اس کی طرف متوجہ ہوں۔ اگر کوئی بک ایجنسی اس کا حق تصنیف لینا چاہے۔ یہ کتاب دو سو آٹھ صفحوں کی ہے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ مصنف علام یا مینیجر مجیبیہ بک ڈپو۔ پھلواری شریف (ضلع پٹنہ)

لاثانی دوا ہے جو اپنے اثرات میں سو فیصدی کامیاب ہے۔ ملک کے ہر طبقہ میں کافی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ ہزاروں مایوس مریض اسکے استعمال سے اچھے ہو گئے۔

جریان یہ وہ مرض ہے جو انسان کی صحت کو بالکل برباد کر دیتا ہے۔ اس مرض کے لئے امیکو ٹانک نہایت مجرب و اکسیر ہے۔ اس کے استعمال سے جریان نیا ہو یا پرانا جڑ سے جاتا رہتا ہے۔ دھات گاڑھی ہو جاتی ہے اور قطرہ آنا بند ہو جاتا ہے۔

نامردی کے لئے بے مثل دوا ہے۔ اس دوا کا استعمال قوت مردمی کو بڑھاتا ہے۔ نامردی کی جملہ شکایت کو دور کرتا ہے۔ تمام جسم میں قوت جوانی عود کر آتی ہے۔ دل و دماغ قوی ہو جاتے ہیں۔ یہ دوا تمام اعضاء رئیسہ اور تمام جسمانی پرزوں کی اصلاح کرتی ہے۔ مرد و عورت کے تعلقات خوشگوار بناتی ہے

امیکو ٹانک کے استعمال سے زندگی کا پورا لطف حاصل ہوتا ہے۔ بھوک بڑھتی ہے۔ ہاضمہ درست رہتا ہے۔ غذا جزو بدن ہوتی ہے۔ کمزوری کی جملہ شکایات دوران سر، حافظہ کی کمزوری، اختلاج قلب، اعضا شکنی، وغیرہ رفع ہو جاتی ہیں جسم میں خون کا بڑھانا اور نیا خون پیدا کرنا اس دوا کی خاص صفت ہے۔

یہ دوا ہر موسم میں بلا خطر استعمال کی جاتی ہے۔ عورت و مرد دونوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ اس دوا کو عام اشتہاری دوا تصور نہ کریں۔ دعوی سے کہا جاتا ہے کہ یہ نہایت مجرب و اکسیر ہے۔ ایک مرتبہ آزمائش کر کے دیکھئے۔ اس کے فوائد آپ کو حیرت میں ڈال دیں گے۔ قیمت فی شیشی :- ۳۲ خوراک ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ) تین شیشیاں چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصولڈاک

امیکو طلاء یہ عجیب و غریب دوا ہے۔ حکمت قدیم اور سائنس جدید کی معلومات کا نچوڑ ہے۔ اس دوا کا ہر جز قابل قدر ہے۔ اس کے استعمال سے عضو مخصوص کی تمام خرابیاں، لاغری، کجی اور تمام کمزوریاں رفع ہو جاتی ہیں۔ یہ طلاء نہایت قوت بخش اور مفید ہے۔ ضعیف اور کمزور انسانوں کے لئے اور وہ نوجوان جو اپنی غلط کاریوں کے باعث زندگی کی لذت سے محروم ہیں ان کی معاون و مددگار ہے۔ یہ طلاء بالکل بے ضرر ہے۔ اس کے استعمال سے نہ چھالا پڑتا ہے نہ جلن ہوتی ہے۔ ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ دوا ہے۔ یہ دوا کریم کی شکل میں ٹیوب میں بند ہے۔ قیمت :- فی ٹیوب پچیس مرتبہ استعمال کی دوا صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ

امین اسمعیل۔ انگریزی دواخانہ نمبر ۸۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

(مکمل علاج کی فہرست مع جنتری سنہ ۱۹۴۰ء مفت طلب فرمایئے)

اخبار اتحاد کا دورِ جدید

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل

اخبار اتحاد سنہ ۱۹۱۲ء میں قایم ہوا اور مختلف دوروں سے گذرا، لیکن گذشتہ مارچ سنہ ۱۹۳۷ء میں اس کو جس مصیبت کا سامنا کرنا پڑا حقیقت میں وہ لمحہ اس کے لئے جانگسل تھا، اور اگر اس کے مدیر مکرم جناب شاہ سلطان احمد صاحب سہسرامی اپنے زبردست تحمل بُردباری، خلوص، نیک نیتی اور ایثار نفس سے کام لیکر ہمت نہ باندھتے تو آپ کے صوبہ کا یہ قدیم اخبار اس وقت تک خاکم بدہن ختم ہو چکا ہوتا۔ لیکن الحمد للہ کا صد ہزار شکر ہے کہ وہ پوری پابندی اور نہایت آب و تاب کیساتھ نہ صرف جاری ہے بلکہ اپنے اندر اس نے وہ تمام خصوصیات مہیا کرلی ہیں جو کسی قوم کے متحدہ طرز عمل کیلئے ازبس ضروری ہیں۔ اب قوم کا فرض ہے کہ اس کی جانب متوجہ ہو۔

اردو ادیب و مشاہیر کی اخبار اتحاد کے لیے زبردست اپیل!

انجمن ترقی اُردوئے ہند کی جو مجلس انتظامیہ ۲۸-۲۹ر اگست سنہ ۱۹۳۷ء کو پٹنہ میں منعقد ہوئی تھی، اس نے ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، حسب ذیل اپیل شایع کی ہے:-

"اتحاد صوبہ بہار میں زبان اُردو کا پُرانا اخبار ہے جو عرصہ سے قومی اور ملی خدمات انجام دے رہا ہے لیکن ہمیں یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ وہ اتنی مدت مستقل اشاعت کے باوجود اسوقت تک اپنے پیروں پر کھڑے ہونیکی صلاحیت حاصل کر سکا ہے۔ اگرچہ خیالات کے اعتبار سے ممکن ہے وقتاً فوقتاً ہر طبقہ وخیال کی نمایندگی باحسن وجوہ پوری نہ کرسکا ہو۔ لیکن زبان کی خدمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ اُردو زبان کا یہ ترجمان قایم وجاری رہے، اس لئے ہماری خواہش ہے کہ بہار کے تمام اُردو خواں بلا کسی لحاظ دنیا کے محض زبان اُردو کی بقا و ترقی کیلئے اخبار اتحاد کے قایم وجاری رکھنے میں کوشاں ہوں جس کی سب سے آسان صورت یہی ہے کہ اس کی توسیع اشاعت میں جہانتک ممکن ہو ہاتھ بٹایا جائے۔"

اس وقت اس کی مالی حالت اطمینان کے قابل نہیں ہے

اور اگر اُردو کے بہی خواہوں نے اس طرف جلد توجہ نہ کی تو اُردو زبان کا یہ قدیم خادم عنقریب دم توڑ دیگا۔ ہمیں امید ہے کہ اہالیان بہار اس کی امداد و استعانت فرمائیں گے اور اس کو زندہ و قائم رکھیں گے۔"

الداعین الی الخیر

(مولانا) عبد الحق سکریٹری آل انڈیا انجمن ترقی اُردو۔ (علامہ) سید سلیمان ندوی۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی۔ (حضرت) ظفر الملک ایڈیٹر الناظر لکھنؤ۔ (مولانا) نظام الدین حسین نظامی ایڈیٹر ذوالقرنین۔ بدایوں۔ خواجہ غلام السیدین پرنسپل ٹریننگ کالج علیگڈھ۔ پروفیسر محمد مجیب۔ جامعہ ملیہ دہلی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی علیگڈھ مسلم یونیورسٹی۔ مسٹر آل احمد سرور۔ ایم اے ایڈیٹر مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڈھ۔

(مینجر اتحاد پٹنہ)

فون نمبر بڑا بازار ۲۶-۲۷۶

دواخانہ یادگار اجمل

دہلی کا دواخانہ

جس کا ایک مدت سے انتظار تھا کلکتہ میں قائم ہو گیا

عالیجناب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کی وفات کے بعد عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب نے طب یونانی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور ہندوستانی دواخانہ کی سرپرستی قبول فرما کر طب یونانی کے معجز نما اثرات سے مردہ رگوں میں جان بخشی جس کی وجہ صحیح تشخیص اور مرکبات کے درست نسخے پورے پورے اجزا سے تیار کرنا ہے۔ اسی اصول پر **دواخانہ یادگار اجمل** کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جس میں دہلی کے مشہور مرکبات و مجربات خاص تیر بہدف نسخوں سے تیار کردہ دہلی کی فہرست کی قیمت کے مطابق صرف اس ہی دواخانہ میں ملتے ہیں اور شاگرد عالیجناب مسیح الملک حکیم حافظ **اجمل خاں** صاحب مرحوم و مغفور اوقات ذیل پر مطب فرماتے ہیں۔

المشتہر

مینیجر دواخانہ یادگار اجمل نمبر ۱۵-۱ زکریا اسٹریٹ کلکتہ

دنیا کی وہ پہلی معرکۃ الآرا ایجاد جس کی سو فی صدی کامیابی سے بڑے بڑے ماہرین فن انگشت بدنداں ہو جائیں گے۔ ایشیائی دماغ کا ایک نادر الوجود شاہکار۔ ہندوستان کی سربلندی کا ایک عظیم الشان افتتاحی باب۔ دنیا میں پائریا کے واحد معالج ایک ہفتہ کے اندر سو فیصدی چیلنج کے ساتھ بغیر کسی تکلیف کے شرطیہ اور گارنٹی کیساتھ علاج کیا جاتا ہے۔ سینکڑوں معززین کے سارٹفکیٹ موجود ہیں۔ نیز ہمارے علاج کو غلط یا ضرر رساں ثابت کرنیوالے کیلئے منہ مانگا انعام مقرر ہے۔

(نوٹ) دانتوں کی صفائی کیلئے ہمارے یہاں کا تیار کردہ **لطیف ٹوتھ پوڈر** طلب فرمائیں جو دانتوں کے تمام متعلقہ امراض کے حق میں سو فیصدی کامیاب اور مجرب ہے۔ پسند نہ ہونے پر دام واپس۔ قیمت ۸ر

پتہ

سید مشتاق علی (ماہر معالج پائریا)
ڈنسٹا ہال نمبر ۵ ۷ لور چیت پور روڈ۔ کلکتہ

عورتوں کی پرسوت کی بیماری اور سفید رطوبت

دُور کرنے کی زود اثر اور لاثانی دوا

نسوانی

رجسٹرڈ

قیمت فی شیشی ایک روپیہ

نسوانی

آجکل ہر گھر میں بیاہی ہوئی اور جوان عورتوں کو سفید سفید رطوبت آنے کی شکایت رہتی ہے۔ جسکی وجہ سے اُن کے بدن میں کمزوری بڑھتی جارہی ہے اور بہت تھوڑی عمر میں چہرے کی چمک اور بدن کی پھرتی غائب ہوجاتی ہے۔ یہ رطوبت جسکو پرسوت کی بیماری بھی کہتے ہیں مثل پانی کے سفید سفید قطرہ نکلتا رہتا ہے اور اکثر میلے رنگ کی گاڑھی گاڑھی سفید رطوبت برابر نکلا کرتی ہے اور کپڑے پر دھبہ آجاتا ہے۔ اِسکی وجہ سے تھوڑے دِن میں بدن پیلا پڑکے سوکھنے لگتا ہے (۱) ٹانگ میں درد (۲) آنکھ تلے اندھیرا (۳) اُٹھتے بیٹھتے سر چکرانے لگتا ہے (۴) کوئی چیز کھانے کو جی نہیں چاہتا (۵) ہاتھ پیر کا تلوہ جلتا رہتا ہے (۶) کمر میں درد (۷) طبیعت میں سُستی (۸) بھوک نہ لگنا (۹) مرد کی صحبت سے جی گھبرانا (۱۰) حمل نہ رہنا (۱۱) یا حمل گر جانا (۱۲) یا اولاد کمزور پیدا ہونا (۱۳) اولاد پیدا ہوکر زندہ نہ رہنا۔ غرضکہ اِن سب بیماریوں کے لئے اگر آپ ہمارے یہاں کی لاجواب دوا نسوانی استعمال کرائیں گے تو خدا چاہے تو عورت کی جملہ مندرجہ بالا شکایتیں جاتی رہینگی۔ عورت کی کمزوری سستی۔ لاغری دُور ہوکر بدن میں پھرتی ہاتھ پیر میں طاقت۔ چہرہ پر رونق۔ اور دل میں جوانی کی اُمنگ آجائیگی۔ صرف تین شیشی نسوانی پلانے سے رطوبت کا آنا بند ہوجائیگا۔ قیمت فی شیشی۔ ایک روپیہ۔ تین شیشی کی قیمت۔ دو روپیہ بارہ آنہ۔ محصول علاوہ

قدرتِ خدا کا تماشہ دیکھئے۔ بانجھ عورت کو حمل قرار پاگیا۔ جناب محمد اسحاق صاحب۔ ضلع سلطان پور سے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ میں نے چھ شیشی نسوانی منگا کر استعمال کیا۔ حالانکہ عورتیں بالکل بانجھ تھیں۔ اب خدا کے فضل و کرم سے دونوں عورتیں حاملہ ہیں۔ میں تہہ دل سے آپ کا مشکور ہوں۔ لہذا تین شیشی نسوانی اور روانہ فرمائیے۔ (فرمائش لکھتے وقت "ندیم" کا حوالہ دیجئے)

ملنے کا پتہ ایس۔ اے۔ بی بخشی کمپنی۔ گھڑی والی کوٹھی ۳۲/۲ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

صوبہ بہار کے اسکولوں اور کالجوں میں سنہ ۱۹۳۱ء سے منظور شدہ

رسالہ ندیم گیا

کا

بہار نمبر سنہ ۱۹۴۰ء

مرتبہ

سید ریاست علی ندوی

قیمت فی پرچہ ۵ر

قیمت بہار نمبر عہ

قیمت سالانہ للعہ

ششماہی عہ

جلد ۱۳ | ماہ صفر تا جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ مارچ لغایت جون سنہ ۱۹۴۰ء | نمبر ۴ تا ۷

فہرست تصاویر بہار نمبر سنہ ۱۹۴۰ء

سید ریاست علی ندوی اڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ندیم پریس گیا میں چھپوا کر دفتر ندیم گیا سے شائع کیا

فہرست مضامین بہار نمبر سنہ ۴۹ء

حساب کتاب

خریداران ندیم سے

ندیم کی اشاعت میں تاخیر اور اسکے اسباب کا علم "نظرات" کے مطالعہ سے آپکے علم شریف میں آئیگا لیکن ضرورت ہی کہ دفتر کی طرف سے خریداران ندیم کو انکا حساب کتاب بھی جزئی تفصیل کیسا تھ سمجھا دیا جاۓ

آپ کو یاد ہوگا!

بہار نمبر اوائل اپریل میں تین سو صفحوں کی ضخامت میں نکلنے والا تھا اور وہ پچھلے بہار نمبروں کی طرح مارچ اور اپریل کا مشترک نمبر ہوتا۔ لیکن افسوس کہ اسوقت یہ نمبر شائع نہ ہو سکا۔ اور دو مہینوں کے مزید پرچے اس میں بڑھا دئے گئے۔ مئی اور جون کی مشترک ضخامت ۶۴ صفحے ماہانہ کے اعتبار سے ۱۲۸ صفحے ہوتی۔ اس طور پر چار سو اٹھائیس صفحے آپ کے واجب الادا تھے۔ لیکن یہ نمبر ۴۲۸ صفحوں کے بجائے صرف صفحہ مضامین قسمے ۴۶۰ صفحوں میں شائع ہو رہا ہے۔ اور تصویروں اور اشتہاروں کے صفحات مزید ہیں۔ اس طور پر ۳۲ صفحے اس تاخیر کے سبب مزید بڑھ گئے۔ مجموعی طور پر چار مہینوں کے مجموعی صفحات ۶۴ صفحے ماہانہ کے اعتبار سے ۲۵۶ صفحے ہوتے اس طرح صرف صفحہ مضامین میں چار مہینوں کی ضخامت ادا کرنے کے بعد دو سو صفحات سے بالا صرف بہار نمبر کی خاطر اس میں مستزاد کئے گئے ہیں۔ پھر یہ بھی خیال شریف میں رہے کہ بہار نمبر کے ہر صفحہ میں ۲۵ کے بجائے ۳۲ سطریں ہیں اور حروف باریک ہیں گویا ندیم کے تمام نمبروں کے چار صفحوں کا مضمون تین صفحوں سے بھی کم میں آیا ہے۔ اس طرح یہ مجموعی ۴۶۰ صفحے گویا ۶ سو صفحوں سے بالا ہیں۔

بہرحال

گرچہ یہ رسالہ چار مہینوں کے رسالوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن دو سو سے بالا صفحات صرف صفحہ مضامین (ریڈنگ میٹر) کے اس میں خاص بہار نمبر ہی کے ہیں، اور بیسیوں تصویریں متعدد رنگین شاہکار وغیرہ مستزاد۔

نیازمند

سیّد علی مظفر امام آنگلوی

مینیجر رسالہ "ندیم" گیا

ساقی بنورِ بادہ برافروز جامِ ما ❦ مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکامِ ما

منشی محمد یوسف (کاتب)　سیّد علی مظفر امام آبگلوی (سب اڈیٹر و مینیجر)　سیّد ریاست علی ندوی (اڈیٹر و پروپرائیٹر)　جناب ابو محمد سیّد حسن امام وارثی حسن (رُکن اعزازی شعبۂ منظومات)　سیّد نظام الدین (ہڈ کاتب)

بقاتی (کلمین)، شمس الدین عرف رجو (کلمین) سیّد محمد اقبال حسین (پریسین) عبدالستار (مشین مین) سیّد ظہیر حسن (کاتب) محمد ہاشم خاں (دفتری) محمد زمان خاں (پیپرمین)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

خداوند تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ بہار نمبر سنہ ۴۰ء جسکے انتظار کی آخری حدیں بھی گذر چکی تھیں بالآخر اتمام کو پہنچا۔ اور ان سطروں کے ملاحظہ کے وقت وہ ناظرین ندیم کے ہاتھوں میں ہوگا۔ جس وقت بہار نمبر کا اعلان کیا گیا تھا۔ ندیم پریس دو عدد دستی پریسوں پر مشتمل تھا۔ جن میں سے ایک اپنی کہنگی و فرسودگی کے سبب بیکار سا تھا۔ اس لئے ایک ہی پریس پر دو پریس مینوں سے دن اور رات دونوں وقتوں میں کام لیا جاتا تھا۔ بہار نمبر کی چھپائی بھی اسی طور پر شروع ہوئی۔ لیکن چند ہی دنوں کام کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس راہ سے منزل مقصود تک پہنچنا شاید ممکن نہ ہو۔ اسلئے کارکنان ندیم کے سامنے اب دو راہیں تھیں، یا تو کاپیاں لکھا کر شہر گیا سے باہر کسی دوسرے شہر میں الکٹرک مشین پریس سے اسکو چھپوایا جائے یا ندیم پریس ہی کو ترقی دیکر "ندیم الکٹرک مشین پریس" کر دیا جائے۔ اول الذکر صورت کا اختیار کرنا مختلف اسباب کے لحاظ سے مزید دشواریوں کا باعث تھا اس لئے کارکنان ندیم مجبور ہوئے کہ وہ خدا کی ذات پر بھروسہ کرکے مؤخر الذکر صورت ہی کیلئے اپنی ہمتوں کو بلند کریں راہ کے دشوار گذار مرحلوں کا پورا علم تھا۔ لیکن انہیں خاطر میں نہ لاکر صرف خداوند ذو المنن پر توکل کرکے عزم راسخ کے ساتھ قدم اٹھایا گیا۔ اور بحمد اللہ کہ ۶ اپریل کو مشین پریس ندیم پریس میں لے آیا گیا۔

× × ×

الکٹرک مشین پریس کا لانا کارکنان ندیم کی دیرینہ آرزوؤں میں داخل تھا۔ جس کا تذکرہ وقتاً فوقتاً ان صفحوں میں آتا رہا ہے۔ اس میں جس طور پر کامیابی ہوئی اسکو بجز فضل خداوندی کے اور کسی امر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر دنیاوی اسباب و علائق کا ذکر آئے تو بہار شریف کے سنجیدہ با وضع صاحب ذوق اہل علم جناب سید شاہ حسین سجاد صاحب، جناب مولوی سید ابو الفتح محمد عثمان صاحب وکیل اور مخلص محترم مولوی سید محمد ایوب صاحب تقدا بنگلوی کی اخلاقی معاونت، ندیم کے ارکان دوامی کا بروقت ایفائے عہد، بہار نمبر کے شایقین کا پیشگی عطا کردہ زرچندہ اور ندیم اور ندیم پریس کے نام نہاد پروپرائٹر کا تھوڑا بہت ذاتی اندوختہ اس راہ کی اقتصادی صعوبتوں کے مرحلوں کے طے کرنے میں کام آیا۔ اور بیک وقت مشین پریس اور بہار نمبر کے متعلقات توقع غیر معمولی کثیر مصارف پورے ہوسکے۔

× × ×

۶ اپریل کو ندیم کے قبضہ میں مشین پریس کے آجانے کے بعد خیال تھا کہ اس پر بہار نمبر کو چند دنوں میں آسانی سے چھاپ لیا جائیگا۔ اسی توقع پر اطلاعات بھیجی گئیں کہ بہار نمبر اواخر اپریل یا اوائل مئی میں اپنے قدردانوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائیگا۔ لیکن جب مشین کے نصب (فٹ) کرنے اور اسکی آزمایش (ٹرائی) کرنے کی نوبت آئی تو معلوم ہوا کہ مشین کا ایک رولر مشین کے لانے میں لاری سے راہ میں کہیں گر کر کھو گیا ہے۔ نئے رولر کے تیار ہونے اور مشین کے چالو ہونے میں خاصی دیر لگی یہاں تک کہ ۱۵ مئی سے پہلے ہم اس پر صحیح طور پر کام کرنے کے قابل نہ ہوسکے۔ اور یہ تقریباً ڈیڑھ مہینے کا وقفہ "تعطل" میں گذر گیا۔ ہینڈ پریس کو معطل اس لئے کر دیا گیا کہ کام اس پر قدر تھوڑا زیادہ ہوسکتا تھا اور نہ حسب منشا مشین کے آجانے کے بعد رسالہ کو بری چھپائی کیساتھ جان بوجھ کر چھاپنا طبیعت کو گوارا نہ ہوسکا۔ اسکے ساتھ ستم ظریفی یہ تھی کہ اس کا بھی صحیح اندازہ نہ تھا کہ فٹنگ اور ٹرائی میں اتنے دن گذر جائیں گے۔ ورنہ ہینڈ پریس کو کسی نہ کسی طور پر جاری رکھا جاتا۔ بہرحال ۱۵ مئی سے کام شروع ہوا۔ اور ۱۹ سے اپنی پوری تیزی کے ساتھ جاری ہوگیا۔ یہاں تک کہ ۲۰ جون کو تقریباً پانسو صفحات پر مشتمل بہار نمبر چھپ کر تیار ہوسکا۔

× × ×

ہمیں بخوبی معلوم تھا کہ بہار نمبر کی اشاعت میں اس قدر غیر معمولی تاخیر ناظرین کیلئے سوہان روح ثابت ہو رہی ہے۔ انکے بیتابانہ خطوط دفتر میں آتے رہے اور ابتداءً انہیں جوابات دئے گئے۔ لیکن جب انکی کثرت اس حد تک بڑھ گئی کہ انکے جوابات کیلئے ایک مستقل علیحدہ دفتر قائم کرنے کی ضرورت سامنے آگئی تو مینیجر ندیم نے مجبوراً اخلاقی کمزوری کو راہ دیکر تقریباً پانچ چھ سو خطوں کو با دل ناخواستہ جواب دئے بغیر فائل کر دیا۔ بہار نمبر کی تاخیر اشاعت کے یہ تفصیلی وجوہ دراصل انہی کی خدمات میں معذرت کے ساتھ بطور عاجزانہ جواب کے پیش ہیں۔

× × ×

بہرحال جو واقعات گذرنے تھے گذر چکے۔ ان کا تذکرہ چھوڑئیے۔ اب یہ ہمارے لئے موجب اطمینان ہے کہ مشین کے آجانے کے باعث خدا کے فضل و کرم سے ندیم کی دو بنیادی خرابیوں کا ازالہ ہمیشہ کیلئے ہوگیا۔ اب نہ اسکی اشاعت میں تاخیر پیش آئیگی کہ جو کام پہلے ہینڈ پریس پر ہفتوں میں انجام پاتا تھا۔ وہ اب مشین سے ایک دن میں پار لگ جاتا ہے۔ اور نہ چھپائی کی وہ خامیاں ہونگی جن کو ہم ہینڈ پریس کے باعث اب تک انگیز کئے ہوئے تھے بلکہ یقین ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے گویا بالکل نئی مستند صناع (ریڈ کلیبت میکر) کی بنائی ہوئی نہایت اچھے حال (بہتر کنڈیشن) میں ہے چھپائی صاف ستھری اور اہتمام سے چھاپا جائے تو نہایت پاکیزہ ہوتی ہے۔ ہم نے اسوقت تک ندیم کی اشاعت کی کوئی متعین تاریخ مقرر نہیں کی تھی۔ "آئین ندیم" کے صفحہ کو خارج کر دیا گیا تھا۔ حالات قابو میں نہ تھے مگر اب مشین کے آجانے سے ہم پوری ذمہ داری سے اعلان کرتے ہیں کہ ان شاء اللہ بہار نمبر کے شائع ہوتے ہی جولائی کا رسالہ چند دنوں میں چھاپ کر پہلے ہفتہ میں شائع ہو جائیگا۔ اور پھر ہر مہینہ کا رسالہ وقت کی پوری پابندی کے ساتھ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو دفتر سے روانہ ہو جایا کرے گا۔ والقصد منی والاتمام من اللہ۔

مشین کے آجانے سے اب ہمیں مکتبہ ندیم کے ذریعہ مفید اور معیاری تصنیفات کے شائع کرنے کا موقع بھی حاصل ہوگا۔ توقع ہے کہ امسال ہم ایک دو کتابیں منظر عام پر لاسکیں گے۔

× × ×

ندیم کو قوت پر لانے اور مکتبہ ندیم سے کتابوں کے شائع کرنے کے بعد اس کے قدر دانوں کے ادائے فرض کے احساس کی ذمہ داری ان کے سامنے آئیگی۔ امید ہے کہ وہ بھی اپنے فرائض سے غافل نہ ہوں گے۔ اور صوبہ میں علم و ادب کے صحیح مذاق کے پھیلانے میں وہ ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

x x x

ندیم کی رکنیت دوامی کا اعلان پچھلے سال ماہ جنوری میں کیا گیا تھا کہ ایسے ایک سو اہل ذوق ہمارے ادارہ کی رکنیت دوامی قبول فرمائیں جو پچیس روپے یکمشت ادا کر سکیں تاکہ انہیں اس حق سے یہ آسانی حاصل ہو کہ ندیم انکی خدمت میں عمر بھر بلا معاوضہ حاضر ہو۔ اور مکتبہ کی تصنیفات نصف قیمت پر انہیں پیش کی جا سکیں۔ ہماری صدا پر بہتیروں نے لبیک کہا۔ بہت سے اسمائے گرامی رجسٹر میں درج کئے گئے۔ یہاں تک کہ ایفائے عہد کا موقع آنے کے بعد حسب ذیل ارباب کرم کے اسمائے گرامی رجسٹر میں درج رہ سکے۔ ہم انکی خدمات میں مخلصانہ شکریہ کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔ موصوفین کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جناب خان بہادر نواب سید شاہ واحد حسین صاحب ایم۔ ال۔ سی خسرو پور (۲) جناب سید حسن امام صاحب وارثی رئیس گیا (۳) جناب آنریبل سید حسین امام صاحب ممبر کونسل آف اسٹیٹ (۴) جناب سید مظہر علی امام صاحب حسنین منزل (۵) جناب سید ابو العاص صاحب رئیس ابو العاص پٹنہ (۶) جناب سید شاہ محمد حسین صاحب آف خسرو پور (۷) جناب سید علی حیدر صاحب گیا (۸) جناب سید شاہ حسین سجاد صاحب رئیس بہار شریف (۹) جناب مولوی سید محمد ایوب صاحب انگلوی (۱۰) جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (۱۱) جناب خان بہادر حاجی چودھری شیخ محمد بخش صاحب رئیس کٹھیار (۱۲) جناب خان بہادر حبیب الرحمن صاحب رئیس رانچی (۱۳) جناب پروفیسر سید مظفر الدین صاحب ندوی ایم۔ اے کلکتہ (۱۴) جناب ڈاکٹر سید اختر امام صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ال (۱۵) جناب سید شاہ رحمت اللہ صاحب ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر (۱۶) جناب سید عبد الجلیل صاحب رضوی انسپکٹر اکسائز (۱۷) جناب خواجہ غلام احمد صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ال (۱۸) جناب مولانا سید محمد طہ صاحب اشرف اتھوی (۱۹) جناب مولوی عبد الکریم صاحب آزاد بہا گلپور (۲۰) جناب مولوی محمد جمال صاحب ندوی گیا (۲۱) جناب محمد حسیب الحسن صاحب عظیم آبادی (۲۲) جناب سید رضا قاسم صاحب مختار پلاموں (۲۳) جناب سید آفتاب حسن صاحب ایم۔ ایس۔ سی علیگ (۲۴) جناب ڈاکٹر سید احمد امام صاحب گیا (۲۵) جناب سلیم الدین احمد صاحب آف رانچی

پچھلے فروری کے پرچہ میں اطلاع شائع کی گئی تھی کہ رکنیت دوامی کے لئے زرچندہ کی یہ رقم آیندہ باقی نہ رکھی جائیگی۔ لیکن مولوی سید محمد ایوب صاحب اور بعض دوسرے قدر دانوں کے خطوط آئے جن میں اس مہلت کو آگے بڑھانے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ پہلے اعلان کیا جاتا ہے کہ دوسری اطلاع تک رکنیت دوامی کا زرچندہ بھی باقی رکھا جائیگا کہ مشین پریس کے آجانے کے باوجود بعض دوسری بنیادی ضرورتیں ہیں نیز الکٹرک کی فٹنگ کا کام باقی رہ گیا ہے۔ امید ہے کہ اہل ذوق اس مہلت سے فائدہ اٹھائینگے۔

x x x

اب آیئے ندیم کے بہار نمبر کے باغ و بہار مضامین کی بھی سرسری طور پر ایک سیر کریں۔ بہار نمبر کا افتتاح حضرت مبارک کی نظم "نوید نو بہار" سے کیا گیا ہے۔ جو گویا بہار نمبر کے خیر مقدم میں لکھی گئی ہے۔ مبارک عظیم آبادی ہمارے صوبہ کے کہنہ مشق استاد فن ہیں۔ موصوف کے وجود گرامی سے عظیم آباد کی شاعری کا مینار بلند ہے۔ اور اسکی روشنی سے سارا صوبہ مستفیض ہو رہا ہے۔ مسرت ہے کہ موصوف ندیم کو اپنی شاعری کا ترجمان جانتے ہیں۔ بہار نمبر میں جتنے اصناف سخن چھپے ہیں۔ مبارک کی نمائندگی ان سب میں موجود ہے۔ "نوید نو بہار"۔ "ترانہ اردو"۔ "جذبات مبارک"۔ "رباعیات مبارک" آپ کی فکر رسا کے نتائج ہیں۔

x x x

مضامین کا آغاز حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کے مقالہ سے کیا گیا ہے۔ مولانا شبلی علیہ الرحمہ کے خدمات کے علمی ادبی اور تنقیدی پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اسوقت تک انکی اردو شاعری پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ یہ انکی اردو شاعری کی خوش نصیبی تھی کہ وہ موضوع بحث ان کے صحیح جانشین کے حصہ میں آئی۔ اور حضرت الاستاذ مدظلہ نے اردو شاعری میں مولانائے مرحوم کے صحیح مرتبہ سے ارباب ذوق کو آگاہ فرمایا۔ ندیم کے بہار نمبر کو ناز ہے کہ اس کے مضامین کا آغاز دور حاضر میں ہندوستان کے سب سے زیادہ جامع کمالات گرانمایہ ہستی کے اس گرانقدر مقالہ سے کیا گیا ہے۔ ولا فخر ——— حضرت وصی احمد بلگرامی ہمارے صوبہ کے وہ مایہ ناز ادیب ہیں جن کی انشا سے شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کی انشا کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ لیکن وہ کسی کے متبع نہیں بلکہ دور حاضر میں وہ خود ایک صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ ان کے مضامین بہت کم شائع ہوئے ہیں۔ لیکن جو دو چار چھپے ہیں انکی حلاوت قدر سے وہ ہندوستان کے بلند مذاق اہل علم کے طبقہ میں احترام اور اعتراف کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ جن لوگوں کی نگاہوں سے پچھلے بہار نمبر میں انکا انوکھے انداز کا مضمون "س۔ ش۔ ص" گذر چکا تھا۔ وہ بہار نمبر سنہ ... میں ان کے مضمون "سپاہی کی بیٹی" کی نقاب کشائی کے دیر سے منتظر تھے۔ اس مضمون کے عنوان کی ندرت بھی کچھ کم نہیں۔ ارباب نظر مقالہ کے مطالعہ سے لطف اندوز ہوں ——— دور حاضر کے مایہ ناز ممتاز انشا پرداز اور ہمارے دیرینہ مخدوم محترم مولانا عبد الماجد دریابادی نے "بہار کی بہار" میں اپنے بہاری دوستوں عزیزوں اور مخلصوں کی سلام محبت سے یاد فرمایا ہے۔ مولانائے محترم کی ذات گرامی پر اردو علم و ادب کو ناز ہے۔ ہم صوبہ بہار کے علم دوست طبقہ کی جانب سے ندیم کے بہار نمبر میں مولانائے موصوف کا مخلصانہ خیر مقدم کرتے ہیں۔ انھوں نے اودھ کے خطہ سے بہار کی خاک پاک کی طرف محبت کے جو ہاتھ پھیلایا ہے۔ ہم اس کو عقیدت کی نگاہوں سے چومتے ہیں۔ اور انکی خدمت میں ان کے بہاری قدر دانوں کے اخلاص و محبت کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔

x x x

اس کے بعد علمی مقالات کی ترتیب میں اولاً تاریخی دوروں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے برادر محترم مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی کے "فاتح بہار بختیار خلجی" کی جگہ قدرتاً سب پر مقدم ہے۔ اس میں اختصار، جامعیت اور سادگی کے ساتھ خلجی پر عالمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ پھر تاریخی ترتیب کے لحاظ سے ہمارے محترم دوست مولانا عبد الباقی کے "نصیر شاہ" کی جگہ تھی۔ لیکن یہ بہ تاخیر موصول ہوا۔ عمدۃ الملک نواب داؤد خاں اس پر طباعت میں سبقت لے جا چکا تھا۔ یورپ کے ایک ممتاز علمی رسالہ میں ایک مستشرق نے نصیر شاہ کے کردار کو غلط روشنی میں دکھایا تھا۔ مولانا عبد الباقی نے اس فاضلانہ مضمون میں دراصل

[illegible]

اس مضمون میں شیر شاہ کے کردار پر ایک نئے روپ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ مقالہ کی افادیت کا پہلو اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ؟ ——— جناب سید رضا قاسم صاحب کا مضمون انکی مساعی کا آئینہ دار ہے۔ داؤد خاں پر ایسا جامع مقالہ اردو میں اسوقت تک شائع نہیں ہوا۔ ہم موصوف کو اس کامیاب مقالہ پر دلی مبارکباد دیتے ہیں ——— جناب محترم پروفیسر سید حسن عسکری کے ہم شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اسلامی عہد کے "آخری ہندوستانی گورنر بہار بہادر زاہد کلدان سنگھ" پر مستند معلومات کا وقیع مقالہ ہمیں عنایت فرمایا۔ موصوف پٹنہ یونیورسٹی میں علم تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ انگریزی کے ممتاز معیاری تاریخی رسالوں میں ان کے مضامین وقعت کے ساتھ چھپتے رہتے ہیں۔ اردو میں شاید ان کا یہ پہلا مقالہ ہے جو ندیم کے صفحہ میں آیا ہے۔ اس موضوع پر اس وقت تک اردو نہیں انگریزی زبان میں بھی ایسا ذخیرہ فراہم نہیں ہوا ہے۔ امید ہے کہ موصوف اب اسکا انگریزی کتابوں میں بھی منتقل فرمائینگے

ان تاریخی مضامین کے سلسلے کی آخری کڑی ہمارے دیرینہ کرمفرما جناب مخدوم محترم مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا مضمون "مولانا سید عبد الغنی وارثی" ہے۔ اگرچہ اس مضمون کا موضوع ایک صاحب کمال کے سوانح حیات کا پیش کرنا ہے۔ لیکن دراصل اس ضمن میں صوبہ بہار میں اسلامی حکومت کے زوال اور انگریزی حکومت کے آغاز کے دور میں مسلمانوں کی مذہبی، اجتماعی اور تعلیمی زندگی پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ اور اس سلسلہ میں بہت سے ایسے معلومات جو کبھی احاطہ تحریر میں نہیں آئے۔ قلمبند کئے گئے ہیں۔ اس موضوع پر کوئی صاحب بصیرت درد مند صاحب دل اہل علم ہی قلم اٹھا سکتا تھا۔ حق یہ ہے کہ حضرت ممدوح نے اس مبحث کا حق ادا کیا۔ گفتگو لمبی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک مقالہ میں اسکی گنجائش نہ تھی۔ شاید مولانائے محترم کبھی اسکی تکمیل فرمائیں۔ اور اس سلسلہ میں ایک صاحب کمال کے قابل قدر سوانح حیات بھی ترتیب پاجائیں۔ ندیم کے صفحات موصوف کے لئے ہر وقت حاضر ہیں۔

× × ×

اس کے بعد مختلف موضوعوں پر مختلف اہل علم کے قابل قدر مضامین آئے ہیں۔ جن میں پہلا مضمون "فردوسی و دقیقی" ہے جو ہمارے عنایت فرما پروفیسر طاہر رضوی کا ہے۔ موصوف نے فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر ایران تشریف لے گئے تھے۔ فردوسی پر با معان نظر ڈالی ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے دکھایا ہے کہ فردوسی نے دقیقی کی طرف جو اشعار شاہنامہ میں منسوب کئے ہیں۔ وہ بھی دراصل فردوسی ہی کے ہیں۔ اس نظریہ کے ثبوت میں جو دلائل و براہین موصوف نے یکجا کئے ہیں۔ وہ کم سے کم ہماری عام نظر میں تو مدعا کو ثابت کرتے ہیں۔ اس مسئلے کے دو دیگر مضامین وقتاً فوقتاً اردو کے رسالوں میں شائع کراتے رہے ہیں۔ اور اہل علم میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں ——— برادر محترم مولانا پروفیسر سید مظفر الدین ندوی ام۔ اے نے ہندوستان کے موجودہ "خانقاہ ازم" پر نظر ڈالی ہے۔ شاید دینی نقطہ نظر سے تو اس میں وہی کچھ ہے جو اب تک سلف کا مسلک رہا ہے۔ خداوند تعالیٰ موصوف کو انکے حسن نیت کا اجر عطا فرمائے۔ ان مباحث پر اگر "روشن خیال" طبقے وقتاً فوقتاً لکھتے جائیں تو شاید آہستہ آہستہ بہت سے حجابات اوٹھتے جائیں۔

× × ×

یادش بخیر حضرت "دیو جانس بہاری" انھوں نے اپنے گرانقدر مقالہ میں "فلسفہ خود بینی و خود نمائی" کے تار و پود ایسے اچھوتے انداز میں بکھیرے ہیں کہ شاید یادگار زمانہ رہ جائے۔ اور اسکی صدائے بازگشت دیر تک سنائی دیتی ہے۔ ہمارے صوبہ میں یہ مرض اب کچھ عام سا ہوا جاتا ہے۔ بات میں بات یاد آئی۔ ہمارے صوبہ کے ایک روشناس شاعر قدیم وضع کے لکھنوی رنگ میں شاعری کرتے ہیں۔ کچھ دن ہوئے ان کا کچھ کلام دفتر میں ان کے چھپے ہوئے لیٹر پیپر پر آیا۔ موصوف نے اس سبز رنگ کے لیٹر پیپر کے سرنامہ پر انگریزی میں موٹے ٹائپ میں "ALLAMA" (علامہ فلاں) چھاپ رکھا تھا۔ ضرورت ہے کہ ان خود ساختہ خطابات کے بتوں اور خود نمائی کی ایسی کج عمارتوں کو توڑھا یا جائے۔ بوڑھوں کے دامن سے یہ ہوا نوجوانوں کے حلقہ میں پہنچ رہی ہے۔ اور صوبہ میں بد مذاقی کی وبا پھیل رہی ہے ——— گویا اسی قسم کی ذہنیتوں کو منظر عام پر آنے کے لئے حضرت دیو جانس بہاری کا یہ طنزیہ و نیم مزاحیہ علمی مقالہ ہے۔ اور جو اپنے نوع کی تو تنہا پہلی کڑی ہے۔ نوجوانوں کو کسی غلط روش سے آگاہ کرنا اور اسکے اتباع سے باز رکھنا بھی ادب کی ایک خدمت ہے۔ دیو جانس بہاری کی انشا کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی زبان اور طرز ادا میں امکان بھر "مفقود علیہ" کی عبارتوں لفظوں طرز ادا اور ان کے "بدیع المثال اختراعات فی لکھی" کے لباس میں انکی انشا اور انکی تصنیف پر نظر ڈالی ہے۔ اس لحاظ سے اردو زبان میں اس مضمون کے ذریعہ طرز تنقید کی ایک نئی طرح ڈالی گئی ہے۔ امید ہے کہ سنجیدہ علمی مضامین کے پڑھنے والے اس طنزیہ طرز کے علمی مقالہ سے لطف اوٹھائیں گے۔

× × ×

اس کے بعد "غالب کی خودداری" کے عنوان سے جناب سید حیدر صاحب کا مضمون ہے۔ "غالب کی خودداری" کے واقعات اس کے سوانح حیات اور رقعات میں بکثرت ہیں۔ صاحب مضمون نے اس مقالہ میں غالب کے اردو اور فارسی کلام سے اس موضوع کے شواہد کمال دیدہ ریزی اور وسعت نظر سے بہم پہنچائے ہیں۔ امید ہے کہ یہ مقالہ اہل علم میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا۔ غالب کے سلسلہ میں ایک اور مضمون یاد آیا وہ ڈاکٹر سید اختر امام صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کا "غالب ایک نئے زاویہ نگاہ سے" کے عنوان سے تھا جس میں جرمن شعرا کے کلام کی روشنی میں ڈاکٹر بجنوری کے مقدمہ غالب پر نظر ڈالی گئی تھی۔ افسوس کہ یہ مقالہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ شاید کسی آیندہ اشاعت میں شریک ہوسکے ——— "موجودہ طرز آفرینش اور اسکے اجزا" میں لائق مضمون نگار نے گویا سوشلزم کے پیدا ہونے کے فطری اسباب کی طرف مخفی اشارات کئے ہیں۔ اس نوع کے مضامین سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے یہ دلچسپ مقالہ ہوگا ——— ہمارے محترم دوست ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب (ام۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر گورنمنٹ کالج ملتان) نے تاریخ صقلیہ پر ایک نظر ڈالی ہے۔ ہمارے لائق دوست نے تاریخ صقلیہ کے مصنف کے بہاری ہونے سے بہار نمبر میں اس مضمون کی اشاعت کیلئے ایک دلچسپ قانونی سند جواز حاصل کیا ہے۔ موصوف یورپ کی کئی زبانوں کے مستند عالم ہیں علم کا پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین یورپ

کے مختلف رسالوں اور اسلامک کلچر حیدر آباد میں چھپتے رہتے ہیں۔ اردو میں اورینٹل کالج میگزین اور معارف میں کبھی کبھی لکھتے ہیں۔ قدیم کے دور جدید میں انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ اسکو بھی نوازا۔ بہار نمبر میں انکی یہ شرکت کچھ عجیب انداز کی ہے ——— "پورنیہ میں علم و ادب کا چرچا" مولوی محمد سلیمان صاحب صدیقی ایم اے جیسے صاحب ذوق اہل علم کے قلم کا رہین منت ہے۔ اس مضمون میں اس دیار میں علم و ادب اور انکی نشر و اشاعت کا قابل قدر نقشہ جامعیت سے مرتب کیا گیا ہے۔ اور بعض ایسے معلومات ہیں جو کبھی احاطۂ تحریر میں نہیں آئے۔ موصوف کی ذات گرامی سے ان اطراف میں علم و ادب کا مذاق قائم ہے ——— بہار نمبر سنہ ۱۹۳۸ء نے اردو میں ایک نئے تیاری ہندو خوش مذاق اہل قلم جناب رادھا موہن صاحب ایم اے بی ایل کو روشناس کرنے کی عزت حاصل کی ہے۔ موصوف نے شستہ اور پاکیزہ اردو میں اپنے محبوب فن مصوری پر چند صفحے لکھکر ہمیں عنایت فرمائے ہیں۔ موصوف کو فن مصوری میں بلند رتبہ حاصل ہے۔ اس عہد میں ہمارے صوبہ کے باکمال مصوروں میں سے ہیں۔ رام گڑھ کانگریس سشن کی نمائش میں صوبہ بہار کے جو مصور تاریخی مرقع کا کمرہ تھا۔ وہ موصوف کی خدمات کے اندازہ کیلئے کافی ہے۔ موصوف نے اپنے ذوق سے پٹنہ میں "پٹنہ اسکول آف آرٹس" کے نام سے ایک ادارہ کی بنا ڈالی ہے۔ اور تھوڑی مدت میں اسکو ترقی کے عروج پر پہنچایا ہے۔ موصوف نے وعدہ فرمایا ہے کہ وقتاً فوقتاً اپنے مضامین اور مصوری کے نوادر سے ندیم کو سرفراز فرمایا کریں گے ——— اس کے بعد حضرت رخشاں ابدالی نے "حضرت صوفی منیری کی تاریخ گوئی کا ایک شاہکار" پیش کیا ہے۔ موصوف علم کا ستھرا مذاق رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ ان کے مضامین سے ندیم کے اوراق کی زینت بڑھے گی ——— آخر میں ایک فورٹ کے سنجیدہ مضامین کا خاتمہ بہار نمبر کی مناسبت سے دو مضمونوں پر کیا گیا ہے۔ جن میں سے ایک "گوتم بدھ کے قبل جنوبی بہار" جناب اظہر الحق قادری کا ہے۔ جو ایک قابل قدر مضمون کا ترجمہ ہے۔ اور دوسرا "صوبہ بہار کا ایک دلکش اجمالی مرقع" کے عنوان سے ہے جو ایک دوسرے طویل دلچسپ مقالہ کی مناسب تلخیص ہے۔

× × ×

اس کے بعد دوسرے باب "بہار میں اردو زبان اور شاعری" کا آغاز ہوتا ہے۔ جس میں چند قابل قدر مضامین ہیں۔ "بہار اور اردو" پر حضرت حمید عظیم آبادی نے قابل قدر قیمتی معلومات یکجا کئے ہیں۔ افسوس "وان پرشاد اور خیال مرحوم اپنا اپنا حق ادا کر چکے تھے۔ حضرت حمید نے ان پیشرؤوں سے کسی تحقیق و اضافہ معلومات میں کوئی قدم آگے بڑھایا یا نہیں اس کا بتانا افسوس کہ ان پیشرؤوں کے لکھے ہوئے مباحث کے ذہن نشین نہ ہونے کے باعث اسوقت دشوار ہے۔ بہرصورت اس مضمون میں اس موضوع کے قیمتی معلومات ضرور یکجا ہوگئے ہیں ——— اس کے بعد ایک مضمون آیا ہے "ایک عظیم آبادی شاعر جس پر اکبر آباد نے قبضہ کرلیا" یہ اعتراف خود ایک اکبر آبادی اہل علم کا ہے۔ نظیر اکبر آبادی اردو شاعری میں قدرتی مناظر کی مصوری کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ یہ عظیم آباد کے لئے باعث فخر ہے کہ وہ اسکی خاک سے اٹھا تھا۔ اس مضمون میں اسکی ایک قلمی مثنوی کے کچھ اقتباسات چھاپے گئے ہیں ——— اس کے بعد شاد عظیم آبادی پر دو قابل قدر مضامین آئے ہیں۔ جناب سید شاہ ولی الرحمن صاحب شاد کی شاعری پر مبصرانہ نگاہ رکھتے ہیں۔ مسرت ہوئی کہ موصوف نے بہار نمبر کے لئے اسی موضوع کو منتخب کیا۔ اور انکی غزل گوئی پر سیر حاصل بحث فرمائی۔ ہمارے عزیز دوست جناب گلاب چاند بی۔ اے نے بھی اسی موضوع پر قلم اٹھایا اور شاد کی غزل گوئی میں ایک نئے پہلو کو سامنے رکھا ہے۔ عزیز موصوف ہمارے صوبہ کے مایۂ ناز مصور جناب ہیرالال جی کے خلف رشید ہیں۔ اسوقت ایم۔ اے میں تعلیم پا رہے ہیں۔ ادب کا ستھرا مذاق رکھتے ہیں۔ مستقبل میں ان سے توقعات وابستہ ہیں ——— جناب بہزاد فاطمی خانوادۂ شاد کے لعل شب چراغ ہیں۔ اسوقت ایم۔ اے میں پڑھ رہی ہیں۔ ذوق بلند، نظر وسیع اور طبیعت سنجیدہ پائی ہے۔ امید ہے کہ مستقبل میں یہ ادب کی گرانقدر خدمات انجام دیں گی۔ ان کا مضمون "عصر حاضر میں بہار کے شعراء" انکی نوعمری کے باوجود انکی پختہ کاری کا شاہد ہے۔ ترتیب، تبویب، استقصاء اور مناسب لفظوں میں نقد اسکی نمایاں خصوصیات ہیں ——— جناب نسیم گورگانوی نے بھی حسن اتفاق سے اسی موضوع پر قلم اٹھایا۔ مگر خوشی ہوئی کہ ان کا اصل روئے سخن شعراء پر نقد کے بجائے ان کے حستہ حستہ سوانح حیات کی جانب تھا۔ اس لحاظ سے یہ دلچسپ اور قابل قدر مضمون ہے ——— ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس باب میں "عالم علی اور اسکی تصنیفات" کے عنوان سے جناب مختار الدین آرزو کا قیمتی مضمون پیش نہ کرسکے۔ وہ آئندہ اشاعت میں شریک ہے۔

× × ×

تیسرا باب "خواتین بہار" ہے۔ اس میں صرف ایک مایۂ ناز مضمون ہمارے مخلص دوست مولانا سید محمد طٰہٰ اشرف المثنوی کا ہے۔ موصوف کے بصیرت افروز مضامین معارف، الاصلاح اور ندیم میں چھپتے رہے ہیں۔ اور اہل نظر سے سند قبولیت حاصل کر چکے ہیں ——— اسی باب میں "خضر بانو خیری" کے عنوان سے جناب عبدالوکیل عزیزی کا ایک مضمون تھا۔ جسے شریک اشاعت کرنے سے ہم محروم رہے۔ آئندہ ماہ یہ ناظرین کے مطالعہ میں ہوگا۔

× × ×

"آثار عتیقہ" کے باب میں پہلا مضمون "قلعہ رہتاس" پر راقم سطور کے فاضل دوست مولانا سید عبدالرؤف ندوی کا ہے۔ رہتاس گڑھ کے متعلق مستند تاریخوں میں جو کچھ ہے۔ ان سب کو انھوں نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ موصوف معارف اور ندیم کے قدیم اہل قلم ہیں۔ تحریر میں فطری مناسبت رکھتے ہیں۔ اخذ و مطالعہ اور ترتیب مواد کی اچھی استعداد کے مالک ہیں۔ اور اسی حیثیت سے یہ مقالہ [illegible] لیکن افسوس ہے کہ گنجائش نہ ہونے کے باعث اس پورے مضمون کو دو مستقل مضمونوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ ایک میں وہاں کے آثار ہیں جو شریک اشاعت ہے۔ اور دوسرے میں اسکی مکمل تاریخی سرگذشت جو آئندہ مہینہ میں نظر عالی سے گذریگا ——— دوسرا مضمون جناب سید محمد صابر صاحب قمر کاردی کا "روضۂ شیر شاہ" پر ہے۔ یہ مختصر اور جامع ہے۔

× × ×

بہار نمبر کا پانچواں باب "[illegible] صوبہ بہار میں" کے انوکھے عنوان سے ہے۔ اس میں ہمارے مخلص دوست عنایت خواجہ علاء الدین

صاحب وکیل گیا کا پُر معلومات و قابل قدر مقالہ "غدر میں گیا کے سیاسی حالات" ہے۔ موصوف ہمارے شہر میں علم کا ستھرا مذاق رکھتے ہیں۔ مطالعہ کے مستقل عادی ہیں۔ اور ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔ اچھی سنجیدہ قدیم و جدید مطبوعات ان کی نظر سے گذرتی رہتی ہیں۔ اس عنوان پر ایسا جامع اور بصیرت افروز مقالہ اس وقت تک اردو میں کم شائع ہوا ہے۔ خصوصاً ہمارے صوبہ کے متعلق اب تک اس باب کا صفحہ سادہ تھا۔ اس مقالہ میں گویا صوبہ کے واقعات کا ذکر یک گونہ آگیا ہے۔ مقالہ کا تمہیدی حصہ "اسباب واقعہ اور اس کے نتائج" پر حسن سلامت روی، سنجیدگی، غور و فکر، مناسب اور نپے تلے لفظوں میں نظر ڈالی گئی ہے۔ وہ ان کی قادرالکلامی پر شاہد ہے ——— اس باب کا دوسرا مضمون ہمارے نوجوان عزیز جناب خواجہ عبدالقیوم کا ہے۔ اس میں "صوبہ بہار کے ایک بہادر باغی" کو روشناس کیا گیا ہے۔ یہ مضمون الہ آباد یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر تاریخ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے جس میں دراصل اس عہد کے مشہور ہیرو کنور سنگھ کے سبب بغاوت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عزیز موصوف ایم۔ اے کے اچھے طالب علموں میں ہیں۔ اس سے پہلے ان کے مضامین ندیم میں چھپ چکے ہیں۔ توقع ہے کہ وہ مستقبل میں صاحب نظر اہل قلم ہوں گے۔

× × ×

اس کے بعد چھٹا باب منظومات پر مشتمل ہے۔ مبارک کے ترانہ اردو کے بعد ہمارے صوبہ کے کہنہ مشق ممتاز شاعر بلبل بہار حضرت سریر کابری مینائی کی قابل قدر نظم "قلعۂ رہتاس" پر ہے۔ موصوف کو نظم نویسی میں یدطولیٰ حاصل ہے۔ اور اس نظم میں ان کا خاص انداز نمایاں ہے ——— پھر حضرت جمیل مظہری کی ایک تازہ نظم آتی ہے ——— تازہ کی قید اس لئے کہ ان کے پرانے کلام آئے دن بار بار رسائل و اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں ——— حضرت جمیل صوبہ کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے امام ہیں۔ یا یوں کہئے کہ "نئے ادب" یا "ترقی پسند مصنفین" کی صف میں ہمارے صوبہ کے نمائندوں کے سرخیل و مقتدیٰ ہیں۔ ان سے تفصیلی ذاتی تعارف کا اتفاق ابھی چند ماہ گذرے حاصل ہوا۔ موصوف جدید تعلیم یافتہ ہیں۔ لیکن خیالات، عقائد، طور و طریق، آداب مجلس اور اخلاق میں قدیم تہذیب کی روایات کے حامل ہیں۔ ادب میں نئے رجحانات کے پیدا کرنے کے دلدادہ لیکن اس روش میں سختی سے جادۂ اعتدال پر قائم رہنے کے پابند ہیں۔ قدرت نے شعر و ادب کا ذوق لطیف فطری ملکہ ان کی طبیعت میں ودیعت کیا ہے۔ ان کی ایک نظم "عقیدت اسلامی" اور ایک تازہ غزل نثر یک اشاعت ہے۔ پھر ایک افسانہ "فرض کی قربانگاہ پر" افسانہ کے باب کے آغاز میں ہے اس کا پہلا حصہ پچھلے بہار نمبر میں شائع ہو کر قبولیت عام حاصل کر چکا ہے۔ اپنی غیر معمولی سرکاری مشغولیتوں کے باوجود شبانہ روز کے انہماک کے ساتھ اس دوسرے حصہ کو انھوں نے مرتب کیا۔ اس میں فرض، محبت کی کشمکش اور اس کے مختلف مرحلوں میں غیر شعوری نفسیاتی احساسات کی حقیقی ترجمانی کو حسن طور پر قلمبند کیا گیا ہے۔ وہ اپنی آپ مثال ہے۔ زبان کی شیرینی اور طرز ادا کی ندرت سے مطالعہ کے وقت کہیں کہیں زبان سے بے ساختہ داد تحسین نکلتی ہے۔ اگر جمیل صاحب کسی مستقل ادبی زندگی سے وابستہ ہوتے تو اردو ادب میں گرانمایہ جواہر کا اضافہ کرتے۔ تاہم انھوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنی تحریروں سے ندیم کو سرفراز فرمایا کریں گے ——— اس کے بعد منظومات میں حضرت نوح ناروی نے بہار نمبر کی مناسبت سے سلطان المجاہدین پر ایک نظم عنایت فرمائی ہے۔ جو ہمارے لئے تبرکات میں سے ہے ——— پھر حضرت رضی بادشش نجیبی ——— بھی وہ ادارہ ندیم سے وابستہ تھے کی نظم "میری شاعری اور سامعین" ہے۔ حضرت رضی صوبہ کے نوجوان شعرا کی صف اول میں ہیں۔ ابھی حال میں ان کی کئی نظموں کے لکھنے کا اتفاق ہوا اس کی موجودہ شاعری ان کے موجودہ سیاسی رجحانات کی آئینہ دار ہے یعنی ——— ع۔ شعر کی گرمی میں پگھلا کر سپاہی ڈھالنا ——— موصوف نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آئندہ اپنے کلام سے ندیم کو نوازا کریں گے کہ شاید ان کی فوج میں اس راہ سے بھی چند "سپاہی" انتخاب مل جائیں ——— اس کے بعد "نغمۂ بہار" کی لے حضرت ضیا رشید بی اے نے سنائی ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ پوری نظم کچھ عجیب دلکش دھن میں ہے۔ اور شاید بہار نمبر کی مناسبت کی سب نظموں سے زیادہ مناسب حال۔ اس میں انھوں نے پرمنت لے میں بہار کا نغمہ سنایا ہے۔ اور اپنی چمن میں بہار کے قابل ذکر ارباب کمال اہل علم ادبا اور شعرا کی خدمت میں انھوں نے گویا ندیم کی جانب سے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ موصوف کے تازہ کلام آئندہ اشاعتوں میں بھی نظر آئیں گے اسی انداز کی ایک دوسری نظم "چمن اردو" ہمارے لائق دوست جناب خبیر سرسری کی ہے۔ یہ نظم انھوں نے بہار کے "نمائندہ" کی حیثیت سے دلی کے ایک مشاعرہ میں سنائی تھی۔ اور بہار نمبر کی مناسبت سے ہمیں اشاعت کے لئے مرحمت کی ہے ——— جناب اختر قادری بلیاوی ایم۔ اے کی نظم "یہ دنیا" بھی ہماری حقیقی توجہ کی مستحق ہے۔ موصوف نوجوان ادیبوں میں شان امتیاز رکھتے ہیں۔ اور اردو فارسی میں نمایاں استعداد کے مالک ہیں۔ ان کے مضامین نظم و نثر سے ناظرین ندیم بارہا محظوظ ہو چکے ہیں ——— جناب اختر شہسرامی ایم۔ اے نے ہمارے مرحوم دوست مولانا سید منظر علی ندوی کی یاد میں چند آنسو بہائے ہیں۔ اور ایک فرض ادا ہوا ہے۔ کاش کسی دردمند شاعر نے صوبہ کے ایک دوسرے جوان مرگ مایہ ناز ادیب سید نورالہدیٰ مرحوم کی یاد تازہ کی ہوتی ——— جناب فخرالدین خاں صاحب نے اقبال مرحوم کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اور ان کی جدائی پر آنسو بہائے ہیں ——— "خیالات کی رو میں" برادر عزیز مولوی سید ناظر امام ندوی کی ایک دلچسپ نظم ہے۔ اسی طرح "صبح کا ستارہ" (جناب عبدالغنی شمس)، "منگل تالاب کی ایک رات" (جناب جوہر فریادی)، "آنسو" (جناب نقاد عظیم آبادی)، "کسی کی یاد" (جناب قیصر عثمانی)، "اشرائی سنسار" (جناب شفیق قادری)، "مقصد حیات" (جناب نجم کاکوی) اور "انتظار شوق" (جناب راز بھاگلپوری) ہمارے صوبہ کے نوجوان شعرا کے لطیف و دلکش جذبات کی آئینہ دار نظمیں ہیں۔

× × ×

"بادۂ کہن" میں پچھلے دور کے دو باکمال شعرائے بہار کے مختصر سوانح حیات اور کلام کو روشناس کیا گیا ہے۔ ان کے مفصل و مکمل اشارات ان دونوں مضامین میں ملاحظہ عالی سے گذریں گے۔

آٹھواں باب افسانوں کا ہے جس کا آغاز "فرمن کی قربانگاہ پر" کے پچیس صفحوں کے طویل اور دلچسپ افسانہ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہمارے صوبہ کے لائق احترام کہنہ مشق، باکمال اہل قلم پروفیسر مسلم کا افسانہ ہے۔ جس میں دہشت انگیز جماعت کے طریق کار اور فسانہ کی ہیروین کے عجیب کردار کو پیش کیا گیا ہے ——— پھر پروفیسر شبلی ابراہیمی کے فسانہ "دماغ کی شکست" میں دکھایا ہے کہ عورت میں محبوبیت اس کی مردانہ کردار کی نقل میں نہیں اسکی نسوانی خصوصیات میں مضمر ہے ——— اس کے بعد جناب صابر نور محاوی نے نیر قاسم کے دو معصوم بچوں کی داستان غم پیش کی ہے ——— پھر "ہڑبونگ سبھا" کا نظارہ حضرت ماہپوری کے موئے قلم سے کھینچا گیا ہے۔ جس میں ماہپوری کے مخصوص طرز ادا اور پر لطف انداز بیان میں بعض سیاسی مسائل کی بحث آتی ہے۔ ادھر مدت کے بعد ان کے قلم نے ان کے انداز کی اچھوتی چیز لکھی ہے۔ ہمارے صوبہ میں مزاحیہ مضامین سے دلچسپی کا ذوق حضرت ماہپوری ہی نے پیدا کیا ہے۔ خوشی ہوئی کہ بہار نمبر کے شائقین کے ذوق کی تسکین کا انھوں نے پورا سامان بہم پہنچایا ——— "ٹل ٹل کی موت" کی جگہ "ہڑبونگ سبھا" کے بعد خوب آئی ہے۔ اس میں مشہور سوشلسٹ لیڈر بابو بجے پرکاش نرائن کی چہیتی چڑیا کی موت کا فسانہ ہے۔ جو ان کے جیل کی زندگی میں ان کی دلچسپی کا محور تھی۔ ایسی مشکل میں فسانہ کے مصنف مولانا عبدالباقی نے اپنے مخصوص طرز انشا میں جیل کی دلچسپ بیکار زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ اس وقت ہمارے صوبہ کے ممتاز ترین انشا پردازوں میں ہیں۔ خدا کرے کہ سرکاری مشغولیتیں انہیں کبھی کبھی کچھ لکھنے کا موقع دیتی رہیں ——— "شادی" کے عنوان سے جناب آفتاب حسن صاحب نے صوبہ بہار کے "ٹیپیکل براتیوں" کا خاکہ کھینچا ہے۔ زمانہ بہت آگے بڑھ چکا مگر ابھی ہمارے صوبہ میں معاشرتی زندگی اور اس کے رسم ورواج کا وہی فرسودہ نظام باقی ہے۔ ایسے افسانے رسم ورواج کی بدنمائیوں پر فکر کی نظر ڈالنے کی عادت ڈالتے ہیں ——— "شادی کا تحفہ" پروفیسر اختر اورینوی کے قلم سے ہے۔ اس میں بظاہر "سسرال کی رنگین زندگی" کا سماں دکھایا گیا ہے۔ لیکن درپردہ معاشی تنگ دستی کے وقت کسی بیدار و حساس دل کے آبگینہ سے زیادہ لطیف و نازک جذبات کے احساسات کی مصوری کی گئی ہے۔ اور اس حیثیت سے یہ ایک کامیاب افسانہ ہے ——— "بہرزمیں کہ رسیدیم ... ..." ہمارے جناب الیاس اسلام پوری کے تازہ افکار کا حاصل ہے۔ موصوف پہلے ندیم کے مستقل افسانہ نگار رہے۔ اب ندیم کا دامن ان سے وابستہ ہے۔ ان کے افسانوں کا دلنواز مجموعہ امید ہے کہ جلد ناظرین کے ہاتھوں میں ہوگا ——— "بھوک" جناب سہیل عظیم آبادی کا افسانہ ہے۔ اور وہ ان کے اسی طرز میں ہے۔ جو اب ان کا ایک مخصوص طرز بنتا جاتا ہے۔ اس سلسلہ کا عمدہ افسانہ "پیاس" کے عنوان سے انہی پچھلی اشاعت میں چھپ چکا ہے ——— ہمارے نوجوان دوست کامریڈ انیس الرحمٰن ہمارے صوبہ کے ترقی پسند اہل قلم ہیں۔ ان کے لٹریچر میں زندگی ہوتی ہے۔ ان کا افسانہ "تالی" تصور کی محاکاۃ کی ایک لطیف مثال ہے ——— محترمہ کامریڈ خیرالنساء بیگم کا فسانہ "جنات" بھی کامیاب افسانوں میں ہے ——— جناب خواجہ عنایت اللہ صاحب نے اپنے افسانے "کامریڈ" میں مزدور تحریک کی ترقی کے اسباب خوبصورتی سے دکھانے چاہے ہیں۔ کہ ایک کسان مخصوص ماحول کے پیش آنے سے رفتہ رفتہ اس تحریک کے قریب آجاتا ہے۔ امید ہے کہ یہ فسانہ دلچسپی سے دیکھا جائے گا ——— جناب جی۔ آر قیس ہمارے صوبہ کے خوش مذاق نوجوان ہیں۔ تحریر میں سلاست اور شستگی موجود ہے۔ ان کا افسانہ "وطن کی راہ میں قربانی" آپ کی نگاہوں سے گذریگا۔ افسوس کہ ان کا ایک قابل قدر مضمون "متھلی زبان کے چند گمنام شعراء" کو جس کو بہار نمبر کا ایک ضروری جز ہونا تھا۔ ہم اس نمبر میں شائع نہ کرسکے اسکو آیندہ پرچہ میں ملاحظہ فرمائیے گا ——— جناب چغتائی کی نوازشیں ندیم پر بہت پہلے سے ہیں۔ بہار نمبر کے لئے انھوں نے خاص طور پر اپنے کسی قصور سے "بہاری دوست" کی سرگذشت اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں قلمبند کی ہے اور اپنے فن کا حق ادا کیا ہے۔ غیر بہاری اہل قلم میں سے دو محترم افسانہ نویسوں کے دلچسپ افسانوں سے ہم اپنے شرائط مضامین کے باعث ناظرین بہار نمبر کو محروم کرنے کے مجرم بھی رہے ہیں ایک ہمارے پروفیسر رشید احمد صدیقی ہیں۔ اور دوسرا افسانہ جناب ایم اسلم کا ہے۔ یہ دونوں افسانے آیندہ اشاعت میں شریک ہونگے۔ پروفیسر رشید احمد نے اس کی تلافی میں اپنے سفر بہار (پٹنہ یونیورسٹی میں زبانی امتحان لینے کے سلسلہ میں سالہا سال تشریف لاتے رہے) کی بعض دلچسپ داستان کے لکھنے کا وعدہ فرمایا۔ لیکن افسوس ہے اس کا موقع نہ آسکا۔ "... ... ... بجیر گذشت" (مولوی سید محمد ایوب آبگلوی) بھکاری (ذکی اختر ہاشمی عظیم آبادی) اور "مکافات عمل" (جناب مخزون چکیکوی۔ جناب عبدالکریم آزاد) ہمارے صوبہ کے نوخیز نوجوان افسانہ نویسوں کے نتائج فکر ہیں۔ امید ہے کہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

× × ×

اس کے بعد "جہان اسلام" کا باب آتا ہے۔ جس میں تین قابل قدر مضامین ہیں۔ برادر عزیز مولانا مسعود عالم ندوی نے نوخیز عراق کی نئی کروٹ پر بصیرت افروز نگاہ ڈالی ہے۔ جناب منصور کاکوی نے مصر کی سیاسی تشکیل کا نقشہ مرتب کیا ہے۔ اور جناب محبوب احمد صاحب وارثی نے جنگ عظیم کے بعد افغانستان کے سیاسی حالات" دکھائے ہیں۔ اسی طرز پر انھوں نے ایران پر بھی ایک مضمون لکھا تھا، جو افسوس ہے کہ اس نمبر میں شریک نہ ہوسکا۔

× × ×

دسویں باب میں "صوبہ بہار کے چند موجودہ مشاہیر" کو پیش کیا گیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں سر خواجہ محمد نور۔ ڈاکٹر سید احمد سہیل۔ سر سلطان احمد۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ مسٹر محمد یونس بابو انوگرہ نرائن۔ مسٹر سری کرشن کے سوانح بروقت موصول نہ ہوسکے خصوصاً اول الذکر جناب سر خواجہ محمد نور کے سوانح حیات ہمارے ہی شہر سے موصول ہونے والے تھے۔ مگر آج اور کل پر مدت بڑھتی گئی۔ بالآخر مایوس ہونا پڑا۔ بہر حال

ہم ان تمام کرمفرماؤں کے شکر گذار ہیں جنھوں نے حضرۃ الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ جناب ڈاکٹر سید محمود، عزیز ملت سید عبدالعزیز، آنریبل سید حسین امام اور جناب ہیرالال تبن جی کے سوانح حیات پر مضامین اور معلومات عنایت فرمائے۔

× × ×

یادرفتگاں کے ذیل میں چند ایسے ارباب فضل کا تذکرہ کرنا مقصود تھا جو ابھی حال میں ہم سے جدا ہوئے ہیں جناب مخدوم محترم سید حسن امام صاحب کے ہم شکر گذار ہیں کہ انھوں نے بڑی توجہ سے اپنے "میت کی بریت" لکھی۔ مسٹر سید حسن امام مرحوم بیرسٹر کے سوانح حیات پر ایسا جامع مقالہ آج تک لکھا نہیں گیا۔ اور نہ شاید کسی دوسرے کے قلم سے یہ فریضہ اس خوبی سے ادا ہو سکتا تھا۔ اس مضمون کے ذیل میں "خانوادۂ نیورہ" کی سرسیری سرگذشت بھی آ گئی ہے۔ پھر ان کے ذاتی سوانح، بیرسٹری کے کمالات، سیاسی خدمات، رجحانات، دینی عقائد اور خانگی حالات تفصیل سے درج کئے گئے ہیں۔ اثنائے تحریر میں ایسے بہت سے واقعات قلمبند ہوئے ہیں جن کو ضبط تحریر میں کسی نہ کسی طور پر لے آنا تھا۔ کاش وہ اسی انداز میں جسٹس شرف الدین، سر علی امام اور نواب امداد امام اثر کے سوانح حیات بھی مرتب فرما سکتے کہ ان بزرگوں کے پائیدار نقوش اس صوبہ میں موجود ہیں۔ اور موصوف کے ذاتی مراسم ان میں سے ہر ایک کے ساتھ قائم تھے۔ اس لئے جو کچھ کہ موصوف کے علم میں ہے وہ شاید کسی اور ذریعہ سے مجموعی طور پر حاصل نہ ہو سکے۔ کاش وہ کسی آئندہ فرصت میں ان اکابر پر قلم اٹھاتے۔

یادرفتگاں کے سلسلہ میں برادر عزیز مولوی سید حسن مثنیٰ صاحب ندوی نے ایک قابل ذکر مضمون حضرت مولانا سید شاہ سلیمان صاحب پھلواروی علیہ الرحمہ پر مرتب کیا تھا۔ یہ بہار نمبر کے لئے بہترین تحفہ تھا۔ لیکن افسوس کہ تاخیر سے موصول ہونے کے باعث ہم اس کو بہار نمبر کے لئے ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے سے معذور رہے۔ یہ قیمتی مقالہ کسی آئندہ نمبر میں آپ کی نگاہوں سے گذریگا۔

× × ×

"افکار و خیالات" کے تحت جناب کامریڈ سید علی اشرف اور جناب سید نصیر حیدر صاحب ڈپٹی کلکٹر گیا کے تازہ افکار پیش کئے گئے ہیں۔ اول الذکر غیر معمولی صلاحیتوں کے نوجوان ہیں۔ امید ہے کہ وہ مستقبل میں قابل قدر مفکرین کی صف میں ہوں گے۔ موخر الذکر اہل قلم کے بعض مضامین پہلے ندیم میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور چند قیمتی افسانے دفتر میں آ گئے ہیں۔ جو آئندہ اشاعتوں میں ناظرین کی ضیافت طبع کا سامان ہو

× × ×

"اصلاح و ترقی" کے ذیل میں جناب سید محمد مجتبیٰ صاحب ڈپٹی آرگنائزر محکمۂ دیہات سدھار کا ایک مختصر مضمون ہے۔ جس میں موصوف نے اپنے محکمہ کو پبلک سے متعارف کیا ہے۔ اور اس سے فائدہ اٹھانے اور دیہی ترقی کی جانب متوجہ ہونے کی تحریک پیش کی ہے۔

× × ×

"آثار علمیہ و ادبیہ" کے باب میں اس کے محتویات کی ندرتیں ...... جناب مخدوم محترم ڈاکٹر سید محمود کی نوازشوں سے اس قدر بے پایاں ہیں کہ ناظرین ورق الٹ کر بچشم خود ملاحظہ فرمائیں۔ علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی مرحوم، پنڈت موتی لال نہرو اور سر اکبر الہ آبادی وغیرہ کے خطوط کے عکس ناظرین کی نگاہوں کے سامنے آئیں گے۔ اور جن میں کے بعض غیر معمولی سیاسی دلچسپی کا باعث ہونگے۔ اسیطرح علامہ سر اقبال مرحوم اور علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ کے مکاتیب سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

× × ×

ادبیات کے باب میں جو دراصل غزلیات پر مشتمل ہے، حضرت آزاد کے تبرکات، حضرت مبارک و بلبل بہار حضرت سرپرد جناب جمیل مظہری کے افکار ہیں۔ اسیطرح حضرت عرفان اسلام پوری، حضرت تمنا عمادی، یادگار کوثر خیر آبادی حضرت رسا ہمدانی۔ جناب مشفق گیاوی، ہمارے شہر کے روشناس خوش فکر حضرت عابد نقوی جناب قوی کاکوی۔ جناب کشتہ گیاوی، جناب توحید عظیم آبادی۔ جناب ضمیر سریری جناب کمال ندوی، جناب شاہ علی شطاری جناب قدر آبکوی اور جناب مبلغ عظیم آبادی کے گلہائے رنگا رنگ سے اس کے صفحات کے دامن مالامال ہیں۔ پھر رباعیات میں مولانا شاہ صبیح الحق عمادی۔ جناب سید راحت حسین فلسفی۔ محبی مولوی سید محمد ایوب شمیم ندوی، جناب اختر قادری۔ مبارک عظیم آبادی۔ حمید عظیم آبادی، توحید عظیم آبادی اور جناب اعجاز صدیقی کے افکار پیش کئے گئے ہیں۔

× × ×

تصویر جذبات میں نوخیز و نوجوان ادبا جناب ضیا بازید پوری، جناب رشید اکیوروی اور جناب شباب کیوروی کے طبع زاد اور مترجم لطیف شہ پارے ہیں ———— نوادر کے عنوان سے حضرت عرفان اسلام پوری کے دست مبارک کی لکھی ہوئی ایک وصلی پیش کی گئی ہے ———— آخری باب "قند پارسی" ہے جس میں مولوی سید حسن مرتضیٰ صاحب شفق عماد پوری، جناب سید حسن امام صاحب وارثی، اور خان بہادر نواب سید احمد علی خاں کی فارسی غزلیات ہیں۔ سب کے آخر میں علم دوست و اہل علم نواز جناب سید یامین حسن خاں صاحب خیال کا قطعہ تاریخ جناب سید شاہ حسین الدین احمد کے سانحہ وفات پر ہے۔ اس طرح ندیم کے دیرینہ کرمفرما کی یاد اور بہار نمبر کا خاتمہ اسی قند پارسی کے آخری منظوم کلام قطعہ تاریخ طبع بہار نمبر سنہ ۱۹۴۰ء پر ہوتا ہے۔ جو جناب خان بہادر نواب سید احمد علی خاں صاحب کی فکر رسا کا رہین منت ہے۔

× × ×

بہار نمبر کے مضامین کا مکمل جائزہ آپ نے لے لیا۔ ہم آپ کی جانب سے ان تمام اہل قلم ادبا، شعرا کی خدمت میں مخلصانہ شکریہ پیش

کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ موصوفین ہمارے توسط سے آپ کے پیغام مسرت و جذبہ تشکر کو قبول فرمائیں گے۔

* * *

خاتمہ پر دو تین اہل قلم کے مضامین سے محرومی کا تذکرہ بھی کرلینا ہے۔ سب سے بڑی ستم ظریفی ہمارے قدیم رفیق کار پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی سے سرزد ہوئی ہے۔ لاکھ موانع اور خانگی پریشانیاں سہی وہ کسی نہ کسی حیثیت سے شریک بزم ہو سکتے تھے۔ اسکی پاداش انہیں بھگتنی ہے۔ خواہ وہ جس شکل میں ہو۔ اس کا فیصلہ ہماری اور ان کی آئندہ ملاقات پر موقوف ہے۔ دوسرے جناب قاضی سید عبدالودود صاحب بیرسٹر ہیں۔ موصوف وعدہ کے باوجود اپنی مسلسل علالت کے باعث کچھ ارسال نہ فرما سکے جس کا دلی افسوس ہے۔ شعرائے کرام میں حضرت نجم گیلانی کی عدم شرکت کا افسوس رہا۔ اور جناب اجتبیٰ رضوی نے اپنی ایک چیز بھیجی بھی تو ایسے اخیر وقت میں کہ وہ شریک اشاعت نہ ہو سکی۔

اس کے ساتھ ہم ان بہ کثرت اہل قلم کے شکر گذار ہیں۔ جنہوں نے اپنے مضامین ارسال فرمائے اور ہم انہیں شریک بزم کرنے سے کسی نہ کسی سبب کے باعث معذور رہے۔ جن میں بعض ایسے اہل قلم کے مضامین بھی تھے، جن کے نتائج افکار سے ہندوستان کے ادبی رسالے لبریز رہتے ہیں۔ لیکن انتخاب میں اگر سختی برتی گئی تو صرف اس لئے کہ آپ کے صوبہ کا ترجمان آپ کے یہاں کے اہل کمال کے شایان شان رہے۔ امید ہے کہ ارباب کرم ہماری مودبانہ معذرت کو قبول فرمائیں گے۔

* * *

چند سطریں تصویروں کے متعلق بھی کہہ دینی ہیں۔ ناانصافی ہوگی اگر ہندوستان کے مایۂ ناز آرٹسٹ جناب ہیرالال ہن جی کے نمایاں فن، اور ندیم پر ان کی نظر عنایت کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ موصوف نے گویا اپنے نگارخانہ چین کو کمال فیاضی سے ندیم کے حوالہ کر دیا۔ اور اجازت دی کہ جس شاہکار کو چاہے وہ اٹھالائے۔ چند تصویریں دفتر میں لائی گئیں۔ پھر موصوف نے اپنے ذوق سے بہار نمبر کے لئے سرورق تیار فرمایا۔ میاں مظفر (منیجر ندیم) کمال شوق سے ان تصویروں کو لے کر بلاک بنوانے کے لئے کلکتہ گئے ہیں۔ ان سے بھی غیر معمولی تاخیر عمل میں آچکی ہے۔ اب انہیں اطلاع بھیج دی گئی ہے کہ بلاک کے کام جس حد تک پہنچے ہیں۔ وہیں تک انہیں رکھ کر تصویریں چھپوا کر اپنے ساتھ لے آئیں۔ اور ان سطروں کے چھپتے ہی رسالہ شائع ہو جائے ——— بہار نمبر مجموعی حیثیت سے کیا کچھ ہے اس کا اندازہ آپ نے لگایا ہوگا۔ اب مضامین کا مطالعہ براہ راست کیجئے۔

تصحیح۔ "اپریل" کے آخری صفحہ پر مسجد شیر شاہ کی تصویر چھپی ہے۔ افسوس ہے کہ محلہ "دھولپورہ پٹنہ سٹی" کے بجائے محلہ مغل پورہ چھپ گیا ہے۔ نیز نظرات کے صفحہ ۲ سطر ۹ میں سیدہ باز حسین کے بجائے افسوس کہ محمد حسین چھپ گیا ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہے حسن

عمل چغتائی

حضرت مبارک عظیم آبادی

حضرت نوح ناروی

نوید نو بہار

از

فخر بہار یادگار داغ تاجدار سخن حضرت مبارک عظیم آبادی

نکلا ندیم کا پھر اک یہ بہار نمبر	ہر یادگار صوبہ یہ یادگار نمبر
مضمون ہیں گلِ تر گلشن نثار نمبر	ہے نمبروں میں اپنے یہ شاہکار نمبر

اک سکۂ رواں ہے یہ پیکر صحافت
چلتا ہوا ادارہ چلتی ہوئی ادارت

ہر خط ہے خطِ خوباں ہر نقطہ خال نکلا	یعنی باوجِ خوبی ماہِ کمال نکلا
کیا بے نظیر نکلا کیا بے مثال نکلا	مصرِ ادب میں گویا یوسف جمال نکلا

وہ صاحبِ اثر ہے وہ جاذبِ نظر ہے
جو دل ہے اس کا گھر ہے جو آنکھ ہے ادھر ہے

مضموں بلند پایہ اعلیٰ تریں ہے صنعت ہر نقش سے ہے سبک نقاش کو بھی حیرت

شاداب بیل بوٹے وہ تازگی وہ فرحت رکھ دیں اگر چمن میں تو ہو چمن کی زینت

کہتے ہیں کس کو گلشن کیسی بہارِ گلشن !

کھل جائیں اُس کی آنکھیں دیکھے جو اس کا جوبن

مضمونِ نو بنو کا اک دلکش آئینا ہے معنی شناس اس کا ہر صورت آشنا ہے

پرداز میں سراپا اک پیکرِ صفا ہے اللہ ری صفائی کیا روپ کیا جلا ہے

جوہر فصاحتوں کے جلوے بلاغتوں کے

سطریں نہیں وہ ان میں دریا سلاستوں کے

اللہ رے تیرا جوبن ملے خطّ و خالِ تصویر تصویر ہے سراپا حسن و جمالِ تصویر

فنِّ مصوری کو مژدہ مآلِ تصویر بولے گی کوئی دم میں یہ ہے کمالِ تصویر

ڈالی ہے جان بھر کر رنگ ان کے پیکروں میں

شوخی ابھارتی ہے یہ رہ چلیں گھروں میں

مقالات شبلیہ

مولانا شبلی اردو شاعر کے لباس میں

از حضرۃ الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

مولانا شبلی نعمانی شاعر نہ تھے، مولانا شبلی نعمانی شاعر تھے ۔ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ وہ شاعر نہ تھے کیونکہ ان کا نام شاعروں کی فہرست میں نہیں۔ اور پبلک میں شاعری کی حیثیت سے اونکی شہرت نہیں۔ لیکن وہ شاعر تھے ۔ کیونکہ ان کا اردو اور فارسی دیوان موجود ہیں ۔ علی گڈھ کالج ۔ علی گڈھ ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے جلسوں میں وہ بڑے دھوم دھام سے اپنی نظمیں پڑھتے تھے اور اپنے قصیدے سناتے تھے ۔ سننے والے سر دھنتے ۔ آنسو بہاتے اور قدر جاننے والے اونکی زبان کی فصاحت یعنی کی بلاغت اور طرز ادا کی خوبی کو مانتے تھے ۔ مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی ہماری زبان کے مشہور مقرر تھے ۔ اونکی عادت تھی کہ اپنے لکچر سے پہلے اپنی سیدھی سادی نظمیں سنایا کرتے تھے ۔ اپنی اسی قسم کی ایک نظم میں وہ اپنے شعروں کی بے اثر کیفیت کو دیکھ کر کہتے ہیں:۔

تمہاری شعر گوئی تو تقسیم کو ممنون نذیر احمد　　کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

مولانا حالی کی شاعری تو مشہور ہے ۔ مگر مولانا شبلی نعمانی کی شاعری اون کے مجموعۂ کمالات کے ڈھیر میں ایسی چھپ گئی کہ وہ بہت کم لوگوں کو نظر آئی ۔

مولانا شبلی مرحوم بچپن سے شاعر تھے ۔ ان کے بچپن کے ایک استاد کہتے تھے کہ مولانا شبلی بچہ تھے ۔ اور چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھتے تھے ۔ تو اون کو اوڑھنے کی ایک چادر کی ضرورت ہوئی ۔ ان کے باپ اعظم گڈھ کے نامور وکیل تھے ۔ تو بیٹے نے باپ سے زبانی کہنے کے بجائے یہ شعر کاغذ پر لکھ کر دیا ؎

پدر جس کا یوں صاحب تاج ہو　　پسر اس کا چادر کو محتاج ہو

باپ بہت خوش ہوئے اور بیٹے کو چادر انعام دی ۔

مولانا شعور جب اوپر کی کتابیں پڑھنے لگے تو اردو اور فارسی میں شعر کہنے لگے ۔ فارسی شاعری کا ذوق تو بہت اچھا تھا ۔ مگر اکی اردو شاعری ایسی ہی تھی جیسے اکثر نوجوان طلبہ کے زمانۂ جوانی کے جوش سے شعر کہنے لگتے ہیں ۔ حاضر جوابی یہ تھی کہ فوراً شعر کہتے تھے ۔ اون کے عربی اور فارسی کے استاد جریا کوٹ ضلع اعظم گڈھ کے مشہور عالم اور ادیب مولانا فاروق تھے ۔ شاگرد ایک دفعہ ننگے سر بیٹھا تھا ۔ استاد نے آکر پیچھے سے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی اور ظرافت سے فرمایا ؎

ہے گاہ چپت گاہ خلائق یہ سر

شاگرد نے فوراً جواب دیا ؎

جتنے ہیں سر اون پہ ہے فائق یہ سر

اعظم گڈھ میں ایک کتب فروش تھے جو اردو کے دیوان بھی بیچتے تھے ۔ مولانا کو اپنے بچپن میں شعر و سخن کا شوق اتنا تھا کہ چھٹیوں کے اوقات میں اونکی دکان پر جا بیٹھتے تھے ۔ اور وہیں بیٹھ کر دیوان پڑھا اور دیکھا کرتے تھے ۔ اور طبیعت کو مناسبت ہوتی تو سینکڑوں شعر انکو یاد ہو جاتے تھے ۔ اور لوگوں کو اون کے اس حافظہ پر تعجب ہوتا تھا ۔

مولانا کی جوانی کے زمانہ میں شعر وسخن کا عام چرچا تھا۔ ہر پڑھا لکھا آدمی کچھ نہ کچھ اس سے دلچسپی لیتا تھا۔ شہروں میں مشاعروں کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ نوجوان اور بوڑھے شوق سے شریک ہوتے تھے۔ اور داد سخن دیتے تھے مولانا بھی اپنے وطن اعظم گڈھ میں اسی قسم کی مجلسیں کرتے تھے غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ واہ واہ ہوتی تھی۔ سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

اس زمانہ میں مولانا کا تخلص تسنیم تھا۔ خیال ہوتا ہے کہ اوس زمانہ میں منشی امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی کی شہرت تھی۔ اسی لئے تسلیم کے وزن پر تسنیم کا تخلص پسند کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد اونھوں نے خود اپنے نام شبلی کو تخلص قرار دیا۔ مولانا شبلی نے کچھ دن ۱۸۷۶ء کے قریب غازی پور کے مدرسہ چشمۂ رحمت میں گذارے تھے۔ وہاں اردو کے مشہور شاعر شمشاد لکھنوی مدرس تھے۔ وہ اچھے شاعر تھے۔ اون کے دیوان چھپ چکے ہیں۔ اور مولانا سے اونکو تعلق بھی تھا۔ مولانا کی فارسی شاعری کے اصل استاد مولوی فاروق صاحب چریا کوٹی تھے۔ جو فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ اسی کے ساتھ اردو میں بھی نظمیں کہا کرتے تھے۔ اون میں سے دو مسدس اون کے چھپے ہوئے ہیں۔ مسدس فاروقی۔ اور مسدس عوالی پہلے میں اعظم گڈھ کے ۱۸۵۷ء کے بلوہ کا حال لکھا ہے۔ اور دوسرے میں مولانا حالی کے مشہور مسدس کا جواب لکھا ہے۔

مولانا شبلی کی اردو شاعری بالکل خود رو پودا ہے۔ نہ اونھوں نے اس میں کسی سے اصلاح لی۔ نہ کبھی اردو کی شاعری کی۔ اور نہ کبھی اردو شاعری کو عزت وشہرت کا ذریعہ سمجھا۔ یہاں تک کہ ۱۸۸۲ء میں علی گڈھ جانے سے پہلے وہ اردو میں خط وکتابت کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اوس زمانہ کے اہل علم کی طرح وہ فارسی ہی میں خطوط لکھتے تھے۔ اور تالیف کی طرح محنت سے لکھتے تھے۔ سیرۃ النعمان جو ۱۸۹۲ء میں لکھی ہے اوس تک میں یہ لکھا ہے۔ ع حرف ہاردو زدن آئین نبود یعنی اردو میں لکھنا میرا دستور نہ تھا۔ مگر کیا عجیب بات ہے کہ جس زبان میں لکھنا پڑھنا انکے لئے عار تھا وہی انکی شہرت اور انکی غیر فانی زندگی کا سبب بن گئی۔

مولانا کی اردو شاعری کے چار دور ہیں :-

پہلا: شروع سے ۱۸۸۲ء تک جب وہ علی گڈھ کالج گئے ہیں۔

دوسرا: علی گڈھ کے قیام کا زمانہ ۱۸۹۸ء تک

تیسرا: حیدرآباد کا زمانہ اور کچھ لکھنؤ کا یعنی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء تک

چوتھا: ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک جس میں اونھوں نے وفات پائی۔

پہلا دور پہلے دور کی یادگار دو تین چند غزلیں ایک قصیدہ اور ایک لمبی نظم ہے۔ غزلوں کا نمونہ یہ ہے۔

ضعف میں بھی یہ مرے تیر فغاں میں زور ہے　　روک لے اوسکو کہاں یہ آسماں میں زور ہے
نیست تھی اوسکی کمر پر تو نے ثابت کر دیا　　واہ وا تسنیم کیا تیرے بیاں میں زور ہے

اوس زمانہ کا قصیدہ سلطان عبدالحمید خاں کی تعریف میں ہے۔ زمین وہی ہے جو انشاء کے اس مشہور قصیدہ کی ہے۔

نکھیاں میووں کی تیار رکرائے بوی سمن　　کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانان چمن

مولانا فرماتے ہیں اور کس قدر پرجوش فرماتے ہیں۔ تشبیہیں اور استعارے کیسے نازک ہیں۔

پھر بہار آئی ہے شاداب ہے پھر دشت دمن　　بن گیا رشک گلستان ارم پھر گلشن
شعلہ زن پھر چمنستان میں ہوئی آتش گل　　پھر صبا چلتی ہے گلشن میں بچا کر دامن
آگ پانی میں لگا دی ہے کسی نے شاید　　تو من زیں عکس گل ولالہ ہے یا جلوۂ فگن
باغ میں باد بہاری کی جو آمد کی ہے دھوم　　بہر تسلیم ہر اک شاخ کی خم ہے گردن
مسند آرائے تجمل جو ہوا شاہد گل　　مرغ گلشن یہ صدا دیتے ہیں الملک لمن
شاخیں انگڑائیاں لیتی ہیں صبا ہے بدمست　　وجد میں تال لگاتا ہے ہر اک برگ سمن
سر نکالے ہیں حبابوں نے تہ آب سے کیوں　　نظر آتی نہ تھی پانی میں اگر سیر چمن
چو نکتے ہیں جو کبھی خواب سے اطفال بہار　　تھپکیاں دیتی ہے سونے کے لئے باد چمن

اسی زمانہ کی یادگار اونکی ایک لمبی نظم ہے۔ کسی انگریز شاعر نے انگریزی میں "قندھار اور کابل کی لڑائی کا حال نظم کیا تھا۔ جس میں اس فوج کے انگریز افسروں کی تعریفیں ہیں۔ ان میں کے ایک کوئی انگریز بدل کر اعظم گڈھ آیا تھا۔ اوسکی فرمایش سے اوسکی انگریزی نظم کا اردو میں ترجمہ فرمایا۔

لو سنو تیغ و سناں کی داستاں	رایت طبل و نشاں کی داستاں
پہلوانانِ جہاں کی داستاں	شاہ کے اعزاز و شاں کی داستاں

حکمرانِ بحر و بر کی فتح ہے
قیصرِ ہندوستاں کی فتح ہے

یہ ایسی ہی نظم ہے جیسی ایک فرمائشی نظم ہونی چاہیئے۔

مولانا کے پہلے دور کی اردو شاعری کی کل کائنات یہی ہے۔

دوسرا دور

دوسرے دور میں اونکی چند غزلیں ہیں جو اس طرح محفوظ رہ گئی ہیں کہ انھوں نے اوسی زمانہ میں علی گڈھ سے اپنے بعض عزیزوں کے خطوں میں لکھ کر بھیجا۔ اور چونکہ وہ خطوط اون کے خطوں کے مجموعہ میں جس کا نام "مکاتیب شبلی" ہے چھپ گئے ہیں۔ اس لئے وہ غزلیں عام نگاہوں کے سامنے آ گئی ہیں۔

مولانا علی گڈھ جنوری ۱۸۸۳ء میں گئے۔ اور ایک ایسے محلہ میں مکان لیکر رہے جو خواجہ محمد یوسف صاحب وکیل (خواجہ عبدالمجید بیرسٹر کے والد) کے پڑوس میں تھا۔ اون کے ہاں ایک شاعر جو نفیس تخلص کرتے تھے رہتے تھے۔ مولانا کی آمد و رفت اون کے ہاں رہتی تھی۔ اور شعر و شاعری کا شغل رہتا تھا۔ ایک اور صاحب عبدالحمید صاحب تھے۔ جو گو شاعر نہ تھے مگر دیوان کے دیوانہ تھے۔ اون سے بھی ملتے تھے۔ پھر اس وقت میر اکبر حسین صاحب جو اکبر الہ آبادی کے نام سے مشہور ہیں۔ علی گڈھ میں منصف تھے۔ اتحاد مذاق نے دونوں کو ملا دیا تھا۔

کالج میں جو مختلف قومی تقریبیں ہوتی تھیں ان میں مولانا عام طور سے اپنے فارسی قصیدے پڑھا کرتے تھے۔ لیکن اوس زمانہ میں مولانا حالی بھی اکثر آکر علی گڈھ میں رہا کرتے تھے۔ اور اون کا مسدس جو ۱۸۷۹ء میں چھپ کر مقبول ہو چکا تھا اس سے اردو نظموں و قصیدوں کا شوق اون کے دل میں پیدا ہوا۔ اس لئے کبھی کبھی اردو نظمیں اور قصیدے بھی اونھوں نے کہے۔

غزل

اس دور میں اونھوں نے جو اردو غزلیں کہیں اونکی کائنات تین چار سے زیادہ نہیں۔ اور یہ مشغلہ صرف دو برس رہا یعنی ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۵ء میں ان غزلوں میں سوائے غزل ہونے کے کوئی خاص خوبی نہیں۔ اس دور کی پہلی غزل کا مطلع ہے۔

تیرِ قاتل کا یہ احساں رہ گیا	جائے دل سینہ میں پیکاں رہ گیا
کی ذرا دست جنوں نے کوتہی	چاک آکر تا بداماں رہ گیا
حسن میکا یار کا اب آفتاب	اک چراغ زیرِ داماں رہ گیا
بزم میں ہر سادہ رو تیرے حضور	صورتِ آئینہ حیراں رہ گیا

مقطع ہے:۔

یاد رکھنا دوستو اس بزم میں	آکے شبلی بھی غزلخواں رہ گیا

جنوری ۱۸۸۵ء میں اُنکی دوسری غزل ہے:۔

....	اب جو تشریف صبا لائی ہے
نکہت زلف غبارِ رہِ دوست	آخر اوس کوچہ سے کیا لائی ہے
مجھکو لے جا کے مری آنکھ وہاں	اک تماشا سا دکھا لائی ہے

۲۶ جنوری ۱۸۸۵ء کو دو غزلیں بھیجیں پہلی یہ ہے:۔

پوچھتے کیا ہو جو حال شبِ تنہائی تھا	رخصت صبر تھی یا ترک شکیبائی تھا
شبِ فرقت میں دل غمزدہ بھی پاس نہ تھا	وہ بھی کیا رات تھی کیا عالم تنہائی تھا

صورت سے عیاں جلال شاہی — چہرہ پر فروغ صبحگاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم — توقیر کی صورت مجسم

نائٹ کے شعر یہ ہیں :

اسلام کے وہ اثر ہیں اب بھی — اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
اس حال میں بھی روش وہی ہے — ان ڈھنگ میں کیا لطف وہی ہے
اک جام میں ہے شراب باقی — اب تک ہے کمر میں آب باقی
گو خوار ہیں ناز خود وہی ہے — مرجھائے ہیں پھول بو وہی ہے

ان شعروں سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ باوجود ترجمہ ہونے کے لحاظ سے یہ مثنوی صنعت کے اعتبار سے کم نہیں ہے ۔

مسدس میں | سنہ ۱۸۹۰ء میں سرسید نے علی گڈھ کی سالانہ نمائش کے موقع پر "تماشائے عبرت" کے نام سے عبرت کا تماشا دکھایا تھا جس میں سرسید اور ان کی تحریک کے دوسرے ناموروں نے بہاؤں اور حلیہ بدل کر نظم میں کہیں اور نظمیں پڑھی تھیں اس موقع پر مولانا شبلی نے اردو میں ایک مسدس پڑھا تھا یہ کہنا روگیا کہ مولانا شبلی کے پڑھنے کا ایک خاص موثر انداز تھا اور وہ اپنی نظمیں اپنی دھن میں پڑھتے تھے جس کو سنکر سننے والے اثر میں ڈوب جاتے تھے اور سر دھننے لگتے تھے ۔ ان کی یہ اتنی پھیلی کہ علی گڈھ کالج کے لڑکوں اور قومی جلسوں سے نکل کر اب مشاعرہ کی محفلوں تک پہونچ گئی تھی لیکن اس وقت یہ بات بالکل نئی تھی ۔ مولانا نے اس تماشا گاہ میں جب اپنے مسدس کے یہ بند پڑھے ہیں تو ایک سماں بندھ گیا تھا ۔

ہم نے مانا بھی کہ دل سے یہ بھلا دیں قصے — یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے
یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے سینے — دیکھتے پائیں کہ تاریخ عرب کے صفحے

کبھی بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر
یادگاروں کو زمانہ سے مٹا دیں کیونکر

مرو و شیراز و صفاہاں کے وہ زیبا منظر — بیت حمرا کے وہ ایوان وہ دیوار وہ در
مصر و غرناطہ و بغداد کا اک اک پتھر — اور وہ دہلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر

ان کے ذروں میں چمکتے ہیں وہ جوہر اب تک
داستانیں انھیں سب یاد ہیں از بر اب تک

اس مسدس کے ۱۳ بند ہیں ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعرانہ استادی کے لحاظ سے یہ مولانا حالی کے مسدس سے کم ہے ۔

قصیدے | اس دور میں مولانا نے اردو کے تین قصیدے کہے ہیں ۔ ایک وہ ترکیب بند ہے جس کو سنہ ۱۸۹۳ء کے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا تھا ۔

بجا ہے آج اگر اس بزم میں یہ زیب ساماں ہیں — یہ اُن کی بزم ہے جو یادگار نسل عدناں ہیں
بفضل اللہ سے مہماں نوازی جن کو پہونچی ہے — ہزاروں کوس آ آکے وہ اس گھر میں مہماں ہیں

یہ قصیدہ تین بندوں میں تمام ہوا ہے تاریخی واقعات سے مسلمانوں کو عبرت دلائی اور ترقی کی روح پھونکی گئی ہے ۔

تیسرا قصیدہ بھی مولانا نے کسی جلسہ ہی میں پڑھا تھا اس کو تماشا گاہ عبرت میں سنہ ۱۸۹۴ء میں ایک طالب علم نے پڑھکر سنایا تھا مطلع یہ تھا

بزم احباب پر جوش ہے جلسہ کیا — جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشا کیسا

اس قصیدہ میں بعض تشبیہیں اچھوتی ہیں ۔

صفحۂ سیمیں کی سطریں ہیں برابر دیکھو — حسن منظر ہے یہ مجمع ہے صف آرا کیسا

نوجوان جمع ہیں با جوش کی تصویریں ہیں — یہ نئے اس بزم کا کھینچا ہے سراپا کیسا
اب بھی اس راکھ میں تھوڑے سے شرر ہیں پنہاں — اب بھی اک فتنہ ہے یہ شاہد زیبا کیسا

مقطع ہے:

اے حریفو! تمہیں خالق کی قسم سچ کہنا — شبلی خستہ نے لکھا یہ قصیدہ کیسا

چوتھا قصیدہ آنریبل جسٹس سید محمود کی شادی کی مبارکباد میں ہے۔ موقع بھی خوشی کا تھا۔ اس لئے مولانا کا یہ قصیدہ بھی باغ و بہار ہے۔ فرماتے ہیں:

پھر ہوا باد بہاری کا جو عالم میں عمل — چھا گیا سبزۂ نوخیز سے [illegible]
ناز سے سوئے چمن جاتی ہے پھر باد بہار — جھومتے آتے ہیں پھر سوئے چمن میں بادل
نوعروسان چمن کے ہیں نرالے انداز — کہ صبا گود میں لیتی ہے تو جاتے ہیں مچل
سمت قبلہ سے جو اٹھتی ہیں گھٹائیں ہر بار — کہتی ہیں توبۂ زاہد سے کہ اک بار سنبھل
کچھ عجب شان سے نکلے ہیں امامان چمن — صحن گلزار ہے یا [illegible]
جھومتی چلتی ہے بیخود روشوں پر جو نسیم — غنچے کہتے ہیں جھک کے کہ [illegible]
اے صبا باغ میں آنا تو دبے پاؤں ذرا — نیند میں سبزۂ خوابیدہ کے آئے نہ خلل
بوئے خوش سے یہ نسیم سحری کہتی ہے — حجرۂ غنچہ میں کیا کر [illegible]
اوج اقبال تو دیکھو کہ سلیماں کی طرح — سیر کرتے ہوئے پھرتے ہیں ہوا پر بادل
مژدہ اے بادہ کشو اب تمہیں ڈر کس کا ہے — ابر کا عالم بالا پہ بھی ہے اب تو عمل

اس کے بعد سید محمود کی تعریفیں ہیں۔ اور آخر میں مقطع ہے:

میں بھی ہوں عنصری وقت جو محمود ہے تو — میں بھی ہوں ناز سلف تو ہے اگر فخر ازل

مولانا کا یہ اردو قصیدہ بہت پر زور اور پرشکوہ ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کہتے وقت شاعر کی نگاہ میں دو قصیدے تھے۔ ایک انشا کا وہ قصیدہ ع کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانان چمن
اور دوسرا محسن کاکوروی کا یہ قصیدہ ع سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل۔ مقطع کا فخریہ انداز بھی لاجواب ہے۔

تیسرا دور | مولانا کی اردو شاعری کا تیسرا دور حیدرآباد کے قیام کا ہے۔ جو صرف چار برس رہا۔ سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۰۴ء تک۔ اس زمانہ میں حیدرآباد کے شعر و شاعری کی زمین حضرت داغ کے وجود سے بڑی رنگین تھی۔ داغ سے وہ ملتے بھی تھے۔ اور ان کی شاعری کے وہ بڑے مداح تھے۔ ان کے بہت سے اچھے شعر مولانا کو یاد تھے۔ اسی لئے حیدرآباد میں ایک فارسی قصیدہ شروع کیا تھا۔ اس میں کہا ہے۔

ہاں تو دعوی کن و ما نیز مسلم داریم — شبلی سحر فن و داغ غزلخواں از تست

حیدرآباد میں مشاعرے ہوتے تھے مجلسیں جمتی تھیں۔ غزلیں پڑھی جاتی تھیں مگر افسوس ہے کہ سوائے ایک غزل کے اس زمانہ کی کوئی چیز ہاتھ نہیں آئی۔

اثر کے پیچھے دل حزیں نے سراغ چھوڑا نہیں کہیں کا — گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رخ کیا زمیں کا
وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں۔ وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں — سیانے ہونگے تو ہاں بھی ہوگی ابھی تو سن ہے نہیں نہیں کا
یہ نظم آئیں یہ طرز بندش سخنوری کیا فسوں گری ہے — کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرز علی حزیں کا

چوتھا دور | یہ دور سنہ ۱۹۰۸ء سے شروع ہو کر سنہ ۱۹۱۴ء یعنی ان کی وفات تک قائم رہا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی اردو شاعری کا امتیازی دور ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی دنیا میں انقلاب برپا تھا۔ مسلم لیگ کا ہنگامہ۔ مسلم یونیورسٹی کا قیام۔ اور اس کے

بعض حقوق کے لئے گورنمنٹ اور مسلمانوں کے درمیان شدید اختلاف - کان پور کی مسجد کا خونی منظر - بنگال کی تنسیخ - طرابلس کی لڑائی - بلقان کی جنگ - ندوہ کے طلباء کی وہ اسٹرائک جس نے پورے ہندوستان میں شورش پھیلا دی تھی - اور آخر میں دنیا کی بڑی لڑائی -

اس وقت .... یورپ کی طرف سے عموماً اور برطانیہ کی طرف سے خاص طور سے مسلمانوں کے دل جلے ہوئے تھے - سرسید کی پرانی پالیسی کا عہد توڑ کر مسلمان علانیہ بغاوت کا اظہار کر رہے تھے - بنگال کی تقسیم کی جو "طے شدہ امر" کہا جا رہا تھا - تنسیخ نے ایک قیامت سی برپا کر رکھی تھی - اور اوس کا مجموعی اثر یہ تھا کہ اوس زمانہ میں مسلمانوں کی طبیعتوں میں سخت اشتعال تھا - اس پرآشوب زمانہ کا شاعر اگر کوئی ہے تو وہ مولانا شبلی تھے - ہر ہفتہ جو واقعہ پیش آتا تھا - اوس پر وہ ایک ایسا شاعرانہ اظہار خیال کرتے تھے کہ اوس زمانہ کے بچہ بچہ کی زبان پر وہ اشعار چڑھ جاتے تھے - ان نظموں میں جوش بیان - قوت نظم - اور موثر طنز کا ایسا تیز نشتر چھپا تھا کہ وہ جس پر پڑتا تھا تلملا جاتا تھا مولانا کی اسی شاعری کے نمونے ہیں جن کو اردو شاعری کی ایک نئی چیز کہنا چاہئے - اس زمانہ میں لاہور میں "زمیندار" دلی میں "ہمدرد" لکھنؤ میں "مسلم گزٹ" اور کلکتہ میں "الہلال" نکل رہا تھا - یہ چاروں اخبار آگے بڑھنے والے مسلمانوں کی جن کو "احرار" کہا جاتا تھا زبانِ حال تھے - انھیں میں مولانا کی نظمیں چھپتی تھیں - اور خاص طور سے "الہلال" کلکتہ میں - جو مولانا ابو الکلام کا ہفتہ وار اخبار تھا - مولانا ابو الکلام اور مولانا شبلی میں اس زمانہ میں بیحد علمی و عملی تعلقات اور سیاسی اتحاد خیال تھا - اور اسی لئے الہلال اونکی نظموں کی اشاعت کا خاص ذریعہ بن گیا تھا -

یہ نظمیں مولانا شبلی کے نام کے بجائے پہلے کشاف کے نام سے چھپیں - ایک ہی دو نظمیں چھپی تھیں کہ لوگوں کی نظریں اوٹھ گئیں - اور شاعر کی تلاش شروع ہوگئی اور آخر بعض بعض پر اوسکی شخصیت کا بھید کھل گیا - تو کشاف نے وصاف کا بھیس بدلا - مگر اس بھیس میں بھی شخصیت پر پردہ نہ پڑ سکا - اور یہ راز سب پر کھل گیا - تب مولانا نے اپنے نام سے نظمیں لکھنی شروع کیں -

مسلمانوں کی سیاسی نظموں میں سے سب سے پہلے قابل ذکر وہ نظم ہے جو شہر آشوب اسلام کے نام سے جنگ بلقان کے زمانہ میں لکھی - یہ نظم ندوہ کے عام جلسہ میں پڑھی گئی تھی - اور جب پڑھی گئی تھی تو اوس کا یہ اثر تھا کہ صدر سے لے کر پائیں تک ماتم برپا ہوگیا تھا -

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کردئے پرزے
فضائے آسمانی میں اوڑینگی دھجیاں کب تک

مراکش جاچکا - فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض خستہ جاں کب تک

خواجہ کمال الدین صاحب لاہور نے ایک خط میں مولانا کو لکھا تھا کہ اس نظم نے مجھ کو لندن میں تڑپا دیا - اور اسلامک ریویو کے نکالنے کے محرکات میں سے ایک یہ نظم بھی تھی - اس نظم کا اتنا چرچا ہوا - کہ کئی صاحبوں نے اس زمین میں طبع آزمائی کی - اس کے آخر کے چند شعر بالکل الہامی ہیں -

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

پرستارانِ خاک کعبہ دنیا سے اگر اُٹھے !
تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوس کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید و گلبانگِ اذاں کب تک

کہیں اڑ کر یہ داماں کو بھی نہ چھو آئیں !
غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک

جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و اماں شام و نجد و قیرواں کب تک

بلقان کی لڑائی میں ڈاکٹر انصاری کا طبی وفد ہندوستان سے گیا تھا - وہ جب واپس آیا تو مولانا بمبئی میں تھے - وہیں خیر مقدم لکھا اور وہیں جلسہ میں پڑھا گیا - اس نظم میں دو بند ہیں - دوسرا بند قیامت کا ہے - ناممکن ہے کہ آج بھی وہ پڑھا جائے اور سننے والوں کا دل اثر سے بھر نہ جائے -

مسلمانوں کے تم نے طالع افزوں بھی دیکھے ہیں
نئے سب انقلاب گردشِ گردوں بھی دیکھے ہیں

تمہارا دردِ دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے
کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں

یتیموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جانگزا تم نے　　زنانِ بے نوا کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں
گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا　　بلادِ مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں
مسلمانوں کا قتلِ عام۔ اور ترکوں کی بربادی　　نتائج ہائے امید گلیڈسٹوں بھی دیکھے ہیں
انہیں نے غازیوں کے زخم پر ٹانکے لگائے ہیں　　شہیدانِ وطن کے جامۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں
لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسارِ شہیداں پر　　زمیں پر پارہ ہائے سینۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں
نگاہ آرائیاں دیکھی ہیں چشم گوہر افشاں کی　　شہیدانِ وفا کے عارضِ گلگوں بھی دیکھے ہیں
انہیں سے کچھ پتہ ملتا ہے شیدایانِ ملت کا　　کہ تم نے شاہدِ اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں
جنونِ جوشِ اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے　　کہ تم نے لیلیِ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں

اخیر کے تین شعر ایسے ہیں جن کو پیشین گوئیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی ہر　　تو تم نے وہ رموزِ قوتِ مکنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر ابھر آئے　　کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

مچھلی والا ان کانپور کی مسجد کے انہدام پر سارے ہندوستان میں کہرام مچ گیا تھا اس سانحہ پر مولانا نے خوب خوب نظمیں لکھیں۔ جو مدت تک سب کی زبانوں پر تھیں۔ مولانا اس وقت بمبئی گئے تھے۔ اونکی پہلی نظم یہ نکلی:

پنہائی جا رہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں　　یہ زیور سیدِ سجادِ عالی کی وراثت ہے
یہی دن ہیں اگر ہیں کشتگانِ تیغِ اندازی　　تو مجھ کو سستیِ بازوئے قاتل کی شکایت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں　　کہ بچے ہیں سویرے انکو سو جانے کی عادت ہے
شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں　　کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے

کانپور کے سلسلہ کی سب سے موثر نظم کے چند شعر یہ ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر شعر کس طرح تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔

کل مجھکو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے　　دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفلِ خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر　　بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر　　نیند آ گئی ہے منتظرِ نفخِ صور ہیں
کچھ نوجوان ہیں بیخبرِ نشۂ شباب　　ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ　　مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینوں پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار　　ازبسکہ مستِ بادۂ نازِ غرور ہیں
کچھ پیرِ کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا　　جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں!

بلقان و طرابلس کے خونیں معرکوں کی تصویریں بھی اسی خوبی سے مولانا کے شاعرانہ مرقع میں موجود ہے۔ مسلم لیگ جس نے ۱۹۱۲ء میں سوٹ ایبل گورنمنٹ کا نقاب اپنے چہرہ پر ڈال لیا تھا۔ مولانا نے اوسکی خوب خوب دھجیاں اڑائی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اسوقت اونکی شاعری کے اس حصہ سے پردہ اٹھانے کا موقع نہیں۔ ورنہ ستیاگرہ کا ڈر ہے صرف ایک نظم پر اکتفا کی جاتی ہے۔ جس میں اس بات کا بیان ہے کہ سرسید کی وفادارانہ پالیسی اونکی طبیعت کی اصلی آمد نہ تھی۔ بلکہ کالج اسٹاف کے انگریز ممبروں کی سکھائی ہوئی تھی۔ فرماتے ہیں:-

کوئی پوچھے تو کہدونگا ہزاروں میں یہ بات　　روشِ سیدِ مرحوم خوشامد تو نہ تھی

ہاں گر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف — اونکی جو بات تھی آزردتھی آمد تو نہ تھی

مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی نے مسلمانوں کے عام مطالبہ کے برخلاف جس میں علی گڈھ یونیورسٹی کے بجائے مسلم یونیورسٹی نام رکھے جانے تمام ہندوستان کے اسلامی اسکولوں اور کالجوں کے الحاق کے حق اور وایسرائے کے اختیارات کم کئے جانے کے مطالبے بہت سخت تھے ۔ مولانا نے اس مسئلہ کے متعلق نہایت ہی پرزور نظمیں لکھی ہیں ۔ جس کے ایک ایک دو دو شعر بھی سنائے جائیں تو ہمارے تربیت احباب ہم کو اجازت نہیں دے سکتے ۔ ان سیاسی نظموں میں سب سے بڑی خوبی نظم کی متانت ۔ الفاظ کا دروبست ۔ ترکیبوں کی چستی اور ان کا طنزیہ طرز بیان ہے ۔ ہر شعر مخالف پر تیر و نشتر کا اثر رکھتا ہے ۔ اور پھر گرفت کی کوئی چیز نہیں ۔

کامیابی میں بس اک آدھ برس باقی ہے — لیگ سے سلسلۂ کانگرس باقی ہے
اب بھی آجاتی ہے کالج سے خوشامد کی صدا — جا چکا قافلہ اب بانگ جرس باقی ہے

اس دور میں سیاسی نظموں کے علاوہ مولانا نے تاریخی اور اخلاقی نظموں کے دو الگ سلسلے شروع کئے ۔ جن میں سے ہر ایک اپنی خوبی اور بلندی کے لحاظ سے اردو کے بڑے بڑے ضخیم دیوانوں کے مقابلہ میں بھاری ہے ۔ بلکہ یہ کہنا چاہئیے کہ اردو ادب میں اونکی کوئی مثال نہیں ۔ اور نہ اب تک اونکی تقلید کی جاسکی ۔ ان نظموں نے ایک طرف اسلامی تاریخ کے انمول موتیوں کو ایک دھاگے میں پروکر قومی اخلاق کے حسن کو دوبالا کیا ۔ دوسری طرف ہماری زبان کی شاعری میں صحیح واقعات کو نظم کرنے کا بہترین نمونہ پیش کیا ۔ اکثر کہا گیا ہے کہ بہترین شاعری وہ ہے جس میں جھوٹ یعنی مبالغہ اور خیال آرائی کا حصہ زیادہ ہو ۔ مگر مولانا کی ان نظموں نے یہ دکھا دیا کہ واقعیت کی سطح پر بھی شاعری کا کمال دکھایا جا سکتا ہے عموماً ان نظموں میں روایت کے الفاظ کا ٹھیٹھ ترجمہ کر دیا گیا ہے ۔ پھر بھی کمال یہ ہے کہ خوبی ادا اور تعبیر میں شاعری کا پورا زور ہے ۔

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال — گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں — چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پر مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار — گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
اٹ جاتا تھا لباس مبارک غبار سے — جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح و شام تھا
آخر گئیں جناب رسول خدا کے پاس — یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اذن عام تھا
محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کر سکیں نہ عرض — واپس گئیں کہ پاس حیا کا مقام تھا
پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضور نے — کل کس لئے تم آئی تھیں کیا خاص کام تھا
غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ منہ سے کہہ سکیں — حیدر نے اون کے منہ سے کہا جو پیام تھا
ارشاد یہ ہوا کہ غریبان بے وطن — جن کا کہ صفۂ نبوی میں قیام تھا
میں ان کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز — ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا
جو جو مصیبتیں کہ اب ان پر گذرتی ہیں — میں اون کا ذمہ دار ہوں میرا یہ کام تھا
کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے اون کا حق — جنکو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں — جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا

یوں کی ہے اہل بیت مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دختر خیر الانام تھا

ان نظموں میں اسلامی روایتوں کے ایسے پرتاثیر واقعے موزوں کئے گئے ہیں جو اسلامی تاریخ کے پر فخر کارنامے ہیں ۔ ۱۹۱۳ء میں ندوۃ العلما اور اس کے دار العلوم کا جو اصلاحی ہنگامہ سارے ملک میں برپا ہوا تھا ۔ گو لوگ اوسکو بھول چکے ۔ مگر مولانا کی وہ چند نظمیں جب تک باقی ہیں جن میں ادھر اشارہ کیا وہ بھلایا نہیں جا سکتا ۔

مولانا کی طبیعت بہت ہی حساس تھی۔ اس لئے وہ فوری واقعات سے بہت جلد متاثر ہوتے تھے۔ اور یہی تاثیر اون کی شاعری کی روح تھی۔ یہی سبب ہے کہ مولانا نے اپنے زمانہ کے اکثر ناموروں کی وفات پر مرثیے لکھے اور بڑے پُر درد لکھے۔ مگر یہ سب مرثیے فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن اپنی زندگی کے سب سے آخری سانحہ اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق وکیل ہائیکورٹ الہ آباد کی وفات پر جو دلدوز نوحہ لکھا ہے وہ اردو ہی میں لکھا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک اُردو مرثیہ ہماری زبان کے بہترین مرثیوں کے لئے ایک عمدہ نمونہ ہے۔ مرثیہ کیا ہے درد کی پوری تصویر ہے:

وہ برادر کہ مرا یوسف کنعانی تھا — وہ کہ مجموعۂ ہر خوبیٔ انسانی تھا
وہ کہ گھر بھر کے لئے رحمتِ یزدانی تھا — قوتِ دست و دلِ شبلی نعمانی تھا
جوش اوسی کا تھا جو میرے سر پُرشور میں تھا
بل اوسی کا یہ مرے خامۂ پرزور میں تھا

اسی طرح مسدس کا ہر بند نالہ و فریاد ہے۔

فوری واقعات پر اون کے دو دو تین تین شعر کے قطعے اردو ادب میں پہلی پہلی چیزیں ہیں۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

پیغمبرِ خاتم اور خاتمہ بالخیر کی مناسبت چھپی نہیں۔ مگر اس میں جو بات چھپی ہے وہ یہ کہ اونکی یہ شاعری کتنی الہامی تھی کہ شاعرانہ پیشین گوئی تاریخ کا واقعہ ہو کر رہی۔

"سپاہی کی بیٹی"

از ادیب جلیل جناب سید وصی احمد صاحب بلگرامی ڈپٹی مجسٹریٹ مونگیر

دیکھا کہ ایک بڑھیا چلی آ رہی ہے ——— ہزار سالہ۔ تصویر آہ و نالہ۔ خمیدہ کمر۔ خاک بسر۔ خانماں برباد۔ سراپا فریاد۔ نقش قدم زنجیر پا۔ دیدۂ عبرت کا توتیا۔ آنکھیں طاقِ زیدوں کا جواب۔ مرغ روح رگوں کے جال میں بیتاب!

اور دیکھا کہ اس بڑھیا کے ساتھ ایک ماہ دو ہفتہ بھی ہے۔ چودھویں کا چاند لیکن گہن میں۔ یہ دیکھ کر ہم نے بڑھیا سے پوچھا ؎

کہاں سے آتی ہے؟ جاتی کہاں ہے؟ قصہ ہے کیا؟
یہ اور کون ہے؟ تو کون؟ کیوں ہے یوں دلگیر؟

وہ بولی۔ حالِ دل خستگاں چہ می پرسی؟ | مجل زعمر خودم از حوادث تقدیر!
من آنم آہ کہ عبرت سراست خانۂ من | سفوج سانحہ ام حشر را کند تعبیر
من آنم آہ کہ نامم شدہ غریب وطن | شروع نغمۂ من می کند ز درد خمیر
من آنم آہ کہ بودم ز انتخاب زماں | کنوں ببیں بچہ حالم ز گردش تقدیر

غریب ماندہ ام و کارواں گزشت و گزاشت
پئے کشاکش دا ——— پامالِ صغیر و کبیر

بداں کہ گوہرم از فارس است و ترکستاں | بپاک طینتیم معترف بود تقدیر
نخست ہمرہِ محمود غزنوی سوئے ہند | رسید موکب عالی من بصد توقیر
سن مسیح بدہ۔ نہ صد و نود و نہ ۹۹۹ | اگرچہ کرد شہ غزنوی بسے تدبیر
نیافت شگونِ قیام در حد ہند | مرا گرفتہ و برگشت صورت تقدیر

بڑھیا نے کہا ہمارے حال پر مت جائیو! حال اور ماضی کے بیچ میں ایک گاڑھا پردہ ہے۔ اس پردہ کو اٹھا کر دیکھو! ہم کون ہیں؟ یہ ہم سے کیوں پوچھو؟ پوچھنا ہے تو فارس سے پوچھو۔ ترکستان سے پوچھو۔ فارس ہم کو لکھتا ہے نورِ چشم طول عمرہا۔ ترکستان ہم کو لکھتا ہے نورِ دیدہ مدعمرہا۔ نورِ دیدۂ فارس و ترکستان نے ہندوستان کی صورت اول اول سنہ ۹۹۹ء میں دیکھی۔ دیکھی مگر نہیں دیکھی۔ آنکھیں دیکھیں۔ دل نہیں دیکھا۔ دل نہیں دیکھا تو کچھ نہیں دیکھا۔ کیوں نہیں دیکھا؟ وہی ننانوے کا پھیر۔ سنہ ۹۹۹ء!

یہ اس وقت کی بات ہے جب محمود غزنوی نام ایک پرستار زادہ ہماری پرستاری میں تھا۔ مگر تم غریب ہمارے محمود کو کیا جانو۔ محمود شاگرد تھا برق و سیلاب کا۔ باڑھ آتی ہے آندھی کے پاؤں۔ بجلی دوڑتی ہے ملک الموت کے پاؤں۔ باڑھ آنا جانتی ہے مڑ کر دیکھنا نہیں جانتی۔ بجلی دوڑنا جانتی ہے۔ کہیں ٹھہرنا نہیں جانتی۔ برق و سیلاب کا شاگرد رشید بھی ہندوستان میں کبھی ٹھہرا نہیں۔

سپس محمد غوری ز فارسم آورد | بہ ہند رخت بینداختم ز لطف قدیر

سن مسیح ہزار و صد و نود بد و یک (۱۱۹۱) زبخت خود متمتع شدم چو شاہ و وزیر

کشادہ اند ز من صلح و جنگ را صد راہ کہ فتح باب سخن بود م از سر تسخیر

شدم بہند چو من روشناس شاہ و گدا درسے کشود ز من بر رخ صغیر و کبیر

پھر سنہ ۱۱۹۱ء میں دوبارہ آنا ہوا تو ہم نے ہندوستان کی صورت بھی دیکھی دل بھی دیکھا۔ اور دل دیکھا تو سب کچھ دیکھا۔ یہ اوس وقت کی بات ہے جب ہمارے غلاموں میں ایک زریں کمر غلام، محمد غوری نام ہمارے لئے ہندوستان کا دروازہ کھول چکا تھا۔

ہنوز سالِ کن ہندوستاں بُدم۔ ناگاہ رسید موکبِ تیمور با شکوہ کثیر

رواج یافت ہمہ حکم از ذریعۂ من شد از وسیلۂ من دفترِ شہی تحریر

ز بس رسیدہ ہندوستاں بُدم چوں شاہ گلِ شباب بہندم شگفت بے تاخیر

بوصفِ حسنِ صفائی کہ داشتم از بخت سرود زمزمہ منقارِ بلبلِ تصویر

بقصرِ شہ کہ محلّ حجاب و صدادیست براستانِ وزیر و بخانہائے امیر

بجایگاہ رئیس و شریف و اہلِ ہنر بہ مامنِ غربا و بہ آشیانِ فقیر

باہلِ سیف۔ باہلِ قلم۔ باہلِ صلاح بہ ہر مکاں کہ رسی بشنوی ز من تقریر

درونِ متّقیاں جایگاہِ الفت من برونِ اہلِ علوم از من انتظام پذیر

تمام خلق بدنبالِ من رواں و دواں مگر مرا ہوسِ اہلِ طبع دامن گیر

مدام مسکن و ماوائے من دلِ شعرا کہ بود تربیتم حق این گروہ کبیر

پھر تو یہ حال ہوا کہ ہندوستان ہمارا کلمہ پڑھنے لگا۔ عاشقانِ باصفا کی صفیں آراستہ تھیں۔ ان صفوں میں شاہ و گدا، اہلِ سیف و اہلِ قلم، اہلِ صلاح و اہلِ ہنر سبھی استادہ تھے۔ ہر فدائی اپنا دل ہتھیلی پر لئے منتظر کھڑا تھا۔ مگر نظرِ انتخاب ہماری صرف ایک دل پر پڑی۔ یعنی حضورِ محل کے لئے ہم نے شاعر کا دل چن لیا۔ کیونکہ یہی وہ بیت الشرف ہے جہاں وحدت میں کثرت اور خلوت میں جلوت کی بہار رہی ہے!

یہ اوس وقت کی بات ہے جب ہمارے گھر کا ایک پاسبان، صاحبقران امیر تیمور گورکان، شرفِ حضوری کے لئے ہمارے پاس دلّی میں حاضر ہوا تھا۔ امیر تیمور کا بیٹا میران شاہ مرزا۔ اوس کا سلطان محمد مرزا۔ اوس کا سلطان ابوسعید مرزا۔ اوس کا عمر شیخ مرزا اور اوس کا ظہیر الدین محمد بابر۔

یہ سب خانہ زاد تھے۔ ہمارے قدیم نمک خوار تھے۔ مگر تیغِ ہجر کے گھائل تھے۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل تھے۔ زیارت تک کو ترستے تھے۔ ہم دلّی میں تھے یہ غریب سمرقند اور کابل میں۔ پھر زیارت ہوتی تو کیونکر ہوتی؟ ادھر دلّی کا یہ حال کہ یہاں بھی عرصہ سے عشق کا بازار گرم تھا۔ یہاں بھی شمع اپنے پروانوں کے جھرمٹ میں تھی۔ اللہ اللہ! ہندی پروانوں کا وہ عالم کہ فدائیوں کی فوجیں بہ یک وقت ناپید اور پیدا ہوتی تھیں! شام سے سحر تک بہار رہی۔ یہ عالم ایک شب نہیں۔ ایک ماہ نہیں۔ ایک سال نہیں۔ اسی میں صدیاں گذر گئیں!

تب ظہیر الدین محمد بابر کابل سے دلّی آیا۔ اور سراج الدین محمد بہادر شاہ دلّی سے رنگون گیا۔ ہندوستان کو آلِ تیمور سے وہی نسبت ہے جو کوہِ رقیم کو اصحابِ کہف سے ہے۔ اوس غار میں اصحابِ کہف کو اور دلّی میں آلِ تیمور کو نیند آگئی۔ ایسی نیند آئی کہ مسلسل تین سو برس کے بعد آنکھ کھلی۔ جب آنکھ کھلی تو کسی نے ان کو پہچانا نہیں! شہر افسوس[1] نے اصحابِ کہف کو نہیں پہچانا۔ شہر رنگون نے

---

[1] شہر افسوس (EPHISEUS) ارضِ روم میں بحر ایجین کے کنارے واقع تھا۔ دقیانوس فرعونِ وقت تھا۔ اوسی کے ظلم سے بچنے کے لئے سات آدمیوں نے شہر افسوس چھوڑا تھا۔ اور دو فرسخ کے فاصلہ پر ایک پہاڑ کے غار (یعنی کہف) میں پناہ لی تھی۔ اسی نسبت سے یہ لوگ اصحابِ کہف

آلِ تیمور کو نہیں پہچانا۔ شہر رنگون بھی آلِ تیمور کے لئے آج تک شہر افسوس ہے!

بابر کابل سے دلّی آیا۔ بہادر شاہ دلّی سے رنگون گیا۔ کابل کی بہار ہنستی ہوئی دلّی آئی۔ دلّی کی بہار روتی ہوئی رنگون گئی۔ قسم ہے بابر، دلّی اور رنگون کی کہ ہندوستان میں آلِ تیمور کا آنا شباب کا آنا تھا۔ اور ہندوستان سے آلِ تیمور کا جانا شباب کا جانا تھا۔ دریغا کہ عہدِ جوانی گذشت!

پُرس بازچہ شد حاصلم زکشت امید — مجوی رازِ درونم کہ می شوی دلگیر
ہنوز چہرۂ من زنگ ارغوانی داشت — ہنوز بود دو گیسوی من سیاہ چو قیر
نظر زبانۂ فریب ولبم رواں افزا — کمان دو ابروی پیوستہ۔ قامتم چوں تیر
کہ ناگہاں زکمیں گاہ جست وزد ناوک — بسینہ ام قدر انداز لشکر تقدیر

افسوس کہ دیکھنے کی چیز تم نے دیکھی نہیں۔ زلیخا کا خواب۔ یا ہمارا شباب۔ وہ بھی رنگین۔ یہ بھی رنگین۔ جوانی میں ہمارے پاس کیا نہیں تھا؟ تم ہوتے تو دیکھتے۔ نرگسِ سامری فن سحرِ بنگالہ کا جواب۔ ابروی پیوستہ کماں کا جواب۔ قامتِ بالا تیر کا جواب۔ زلفِ مشکیں ظلمات کا جواب۔ لبِ جاں بخش آبِ حیواں کا جواب۔ چہرۂ لالہ رنگ مئی ارغواں کا جواب۔ گیسوئے شب رنگ رخِ لیلیٰ کا جواب!

ان سب کا جواب ہمارے پاس موجود تھا۔ لیکن مارِ آستین کا کیا جواب؟ دشمن دوست نما کا کیا جواب؟ اس عیاری کا کیا جواب کہ قدر انداز نے تیر چھوڑا تو چوروں کی طرح چھپ کر۔ اور پھر ایسا تیر جو وہاں کمان سے چھوٹا اور یہاں دل میں آکر ترازو ہوگیا۔ سچ پوچھو تو اسی عیّاری نے ہمکو مار ڈالا!

رسید موسم نکبت۔ خمید نخل قدم — دمید موی سپید و زید باد صریر
نماند بخت نہ دولت نہ قدر دان سخن — زحادثات مرا چرخ کرد چوں خود پیر
یہ سن کے میں نے کہا۔ اے اداطراز یہ کیا — کہ تو نے مجکو مفصل سنائی سب تقریر
مگر وہ پیچ دکھائے کہ کچھ نہ حال کھلا — سنے جو نام تو پائے نشان کچھ یہ حقیر
بیکاری زدوکے۔ مکن جستجوئی نام کہ نیست — بجز ذلیل و حقیر و ظہیر و بے توقیر
بُریدہ اند چو سلمان فارسی ز وطن — چو شعر خوش سلمان بہند گشتہ شہیر
عزیز اہل خرد فارسی بود نامم — اگرچہ در جہلا گشتہ ام ظہیر و حقیر
پراز علوم درونم چو سنگہا ز شرار — پراز فنون دل من ہمچو دوق در انجیر
مراکہ فاتحۂ الباب خواندہ اند چہ حظ — گرستہ اند بروم درِ ہمہ تدبیر
مراکہ گوہر شہوار گفتہ اند۔ چہ سود — کہ بیخت خاک مذلت بفرق من تقدیر

یہ داستانِ غم سن کر ہم نے بڑھیا کے نام پوچھا تو اوس نے کہا اسکو سلمان سے پوچھو۔ ہم بھی فارسی۔ سلمان بھی فارسی قسمت کی ترازو میں سلمان فارسی ہے اور فارسی سلمان! ثبوت یہ کہ ؎

بریدہ اند چو سلمان فارسی ز وطن

کل تک ہمارا نام تھا دُرِ شہوار۔ آج ہمارا نام ہے ذلیل و خوار۔ کل تک محبوبِ چمن۔ آج مردودِ چمن۔ کل تک عزیزِ وطن! کیوں؟ اسلئے کہ کارواں آگے بڑھ چکا۔ عاشقانِ با صفا سب مرمٹے۔ اب کوئی ناز بردار نہیں رہا۔ جس نے شق القمر نہ دیکھا ہو وہ ہمارا دل دیکھ لے وہاں

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲) مشہور ہوئے۔ ان کے ساتھ قطمیر نام ایک کتا بھی تھا۔ بعد میں اصحابِ کہف کے نام اوس جگہ کندہ کردئے گئے۔ اسلئے اوس کا نام کوہِ رقیم ہوا۔ —— اصحابِ کہف کے نام تاریخ کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں لیکن ناموں میں کچھ اختلاف ہے۔

ایک چاند کے دو ٹکڑے، یہاں ایک دل کے سَو ٹکڑے۔

تب ہم نے فارسی سے پوچھا کہ تیرے ساتھ یہ اور کون ہے ؎

وہ بولی۔ آہ ہیں دخترِ خواندہ ام اردو ست چو من بعین جوانی شدہ زحادثہ پیر
مدام مونس جان من است قوتِ روح من آفتاب منیرم چو اوست بدر منیر
چو من بہند رسیدم شدہ ولادت او پس از حکومتِ بابر بلطف حی قدیر
بہ عہد شاہجہاں نامزد بہ اردو شد ز ربطِ لشکر و آمیزشِ صغیر و کبیر
ز ہر کہ رابطۂ اولیں نمود منم اگرچہ از عربی ہم شدہ است لذت گیر

نور دیدۂ فارس نے جواب دیا کہ اس نے ہمارا دودھ پیا ہے۔ راج دلاری ہے۔ یہ ہماری چہیتی ہے۔ نین سکھ ہے۔ گدڑی کا لعل ہے۔ غضب کی پیری ہے۔ سپاہی کی بیٹی ہے۔ سپاہی کی جان ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ میر انیس کی فیاضی نے یہ خطاب تلوار کو بخش دیا۔

سپاہی کی بیٹی اردو بازار میں پیدا ہوئی۔ اس کی آنکھیں تلواروں کی چھنکار سے کھلی۔ اس کا عقیقہ بھی اردو بازار میں ہوا۔ نام نکالنے کے لئے کلام اللہ کھولا گیا تو اللہ کا الف نکلا۔ ایک تو اس الف کی برکت۔ پھر جائے ولادت کی رعایت اور پھر شجرہ کی حفاظت۔ یہی وجہ تھی کہ سپاہی کی بیٹی کا نام اردو رکھا گیا۔ یہ اوس وقت کی بات ہے جب سدا سہاگن دلّی بارہویں مرتبہ دلہن بنی تھی۔ اور میر یحیٰی کاشی نے اس کے سہاگ کی تاریخ لکھی تھی۔ ؎ "شد شاہجہان آباد از شاہجہاں آباد" سنہ ۱۰۵۸ہجری —— اب جانے بھی دو اس قصہ کو۔ رات کی بات گئی رات کے ساتھ۔

سنا یہ حال جو میں نے کہا بصد حیرت کدھر کا قصد ہے۔ تم کس طرف کو ہو رہگیر
وہ بولی۔ تنگ شدہ بر من ایں فضای جہاں درے نماند کہ ما نم زسہم گوشہ پذیر
نہ آں زمان و نہ آں ارم و ماں نہ آں نازش سخن شناس و نہ اہل سخن نہ آں تاثیر
کجا روم۔ چہ کنم۔ بہ در کہ رَو آرم کہ نیست یار و مددگار ایں نزار و حقیر
گہے بشرق شتابم۔ گہے بہ غرب گردم روا نبود جای و دلم کرد آخر ایں تدبیر
کہ غرق بحر شوم و چو عمر خوش گذرم ز لطمہ ہای بلیات تجربہ تقدیر
یہ کہہ کے صدمہ ہوا فارسی کے دل کو کمال جگر کو تھام کے بیہوش ہوگئی دلگیر
کماں ضعف سے پھیلائے جو ہاتھ اور پاؤں سر اوس کا گود میں اردو نے رکھ لیے تاخیر

تب ہم نے خانماں برباد فارسی سے پوچھا کہ اس وقت تو جاتی کہاں ہے۔ اوس نے کہا دریا میں ڈوبنے۔ بات یہ ہے کہ یہاں سے ہمارا دانہ پانی اوٹھ گیا۔ ہماری صاحبقرانی تخت طاؤس کی طرح فسانہ ہوچکی۔ ہماری نورجہانی اور جہانگیری اور عالمگیری پر ایمان لانے والے مرمٹے اب زمین دشمن۔ آسمان دشمن۔ شمع انجمن انجمن سے نکال دی گئی۔ بھری محفل میں یہ رسوائی۔ سچ پوچھو تو ڈوب مرنے کی بات ہے۔ ڈوب مرنے کا نسخہ ہم کو غالب کے سفینہ سے ملا۔ بڑی بات اس نسخہ میں یہ ہے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یعنی جنازہ اور مزار کا کھٹراگ نہیں! ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا نہ کہیں جنازہ اوٹھتا۔ نہ کہیں مزار ہوتا

اتنا کہنے پائی تھی کہ فارسی شدت غم سے بیہوش ہوگئی۔ اردو نے اوس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ کہنے لگی کہ اللہ رے انقلاب زمانہ! مسیحا آج خود بے ہوش ہے۔ اور ایک چلو پانی نہیں ملتا ؎

کل جو اوٹھتے تھے بٹھانے کے لئے
آج بیٹھے ہیں اوٹھانے کے لئے صفیر بلگرامی

ہم نے اردو سے پوچھا کہ تو یہاں کسی کو جانتی ہے؟ اوس نے کہا ؎

فصاحت اور بلاغت حقیر زادیاں ہیں — پسند آئی اونھیں خدمتِ انیس و دبیر
صفیر ایک ہیں حضرت دبیر کے شاگرد — ہر ایک اون سے ہی واقف۔ امیر ہو کہ فقیر
میں روشناس ہوں ان کی۔ مجھے ہے ابتک یاد — وہ ان کے شعر۔ وہ لکنت بھری ہوئی تقریر
یہ کہہ کے سوچ کے بولی۔ ادھر تو دیکھیں آپ! — تو مسکرا کے کہا میں نے۔ ہاں میں ہی ہوں صفیر
یہ سن کے خوش ہوئی ایسی کہ۔ رنج بھول گئی! — پھڑک کے کہنے لگی۔ اب کھلی مری تقدیر

بسانِ نقشِ قدم فارسی جو تھی سرِ خاک
پکاری دیدۂ حیرت کو کھول کر دلگیر

توئی صفیرِ سخن سنج اے خجستہ صفات؟ — توئی کہ ہست کلامت ز حسنِ عالمگیر؟
توئی کہ داد مرا نام تو ز رنج نجات؟ — زہے نشاط و زہے وقت و حبذا تقدیر!
بگو کہ در چہ خیالی؟ چہ شغل ہا داری؟ — بگو بگو کہ بہ پے من چرا نکنی تدبیر؟

اردو نے کہا تم لاکھ چھپاؤ۔ ہم پہچان گئے! حضرت موسیٰ کی قسم۔ پہچان گئے! تم صفیر ہو! صفیر ہو! صفیر! صفیر کا نام سننا تھا کہ بیہوش کو ہوش آگیا۔ فارسی نے آنکھیں کھول دیں۔ پوچھا سچ سچ صفیر نہیں ہو؟ کلیم وقت نہیں ہو؟ صفیر سخن آرا نہیں ہو؟ توئی کہ ہست کلامت ز حسن عالمگیر؟ نہیں۔ تم صفیر نہیں ہو سکتے! صفیر ہم پر مرتا ہے۔ تم صفیر ہو تو وہ چاہت کہاں گئی؟

مگر درست مشہور پیلے نماند؟

ہم نے کہا تیرا صفیر تجھ پر اب بھی مرتا ہے۔ مگر وہ کفر کی موت مرنا نہیں جانتا۔ ڈوب مرنے کا نسخہ نہیں جانتا۔ مذہب یا مذہب کا مذہب نہیں۔ رات سے دن ہوتا ہے۔ اور اندھیرے سے اجالا۔ اچھا۔ ہم سے ایک بات سن لے

زمانہ آج سر نو ہے محو آرائش — جہاں آج طراوت سے ہے بہشت نظیر
ہماری قیصرِ ہند آبروی تاج و نگیں — شہ ادیکۂ انگلینڈ آفتاب سریر
پچاس سال ہوئے اونکو تخت پر بیٹھے — ہے اس خوشی کا زمانہ میں ذکرِ عالمگیر
کہ فروری کے مہینہ کی سولھویں تاریخ — اس انتظام کی خاطر ہے ٹھہری بے تاخیر

ہمارے آرہ میں سامان ہے وہ کچھ موجود
کہ اور جا کی ہوس اب نہیں ہے دامن گیر

کلکٹری کا جو رمنہ ہے سج کے ہے تیار — وہاں تہنیتِ دربار ہے بجشنِ کثیر
ادھر ہے کثرتِ مردم۔ ادھر ہے کثرتِ فکر — چلے ہی آتے ہیں مضمون تازہ جیسے بہیر
اسی سبب سے ہوئی قافیوں میں بھی تکرار — یوں کا دستِ تحکم بھی اس جگہ ہے قصیر
تمام فرش ہے مانند صفحۂ قرطاس — کہ جس پہ نظم ثریا مثال ہو تسطیر
تمام خطۂ انگلینڈ و گوشہ گوشۂ ہند — اسی نشاط پہ مامور ہے بصرفِ کثیر
نہ پوچھ جشن جو کلکتہ پر ہے ان روزوں — کہ دیسرائی کا مسکن ہے اور مقامِ سریر
نہ پوچھ جشن جو لندن میں ہے مسرت زا — کہ جائے قیصرِ ہندوستاں ہے خلد نظیر
بٹیں گے خلعت و انعام بھی خطاب کے ساتھ — یقین ہے کہ غنی ہونگے اب تمام فقیر

۱؎ خطاب۔ جوبلی ۱۸۸۷ء میں گورنمنٹ نے مفتی میر محمد عباس اعلی اللہ مقامہ اور چند دیگر حضرات کو شمس العلما کا خطاب دیا۔ مفتی صاحب کے (باقی ص ۲۶ پر)

پہونچ گئی جو تم اس جلسہ میں تو دیکھیو پھر
ملا وہ کچھ کہ کہیں لوگ - واہ ری تدبیر!

یہ ۱۸۸۷ء ہے - فروری کی آج سولہ ہے - ۱۸۳۷ء میں ملکہ وکٹوریہ تخت پر بیٹھی تھی - تخت نشینی کو آج پچاس سال ہوئے - اسی کا جشن ہے - اس ملک میں بھی - سات سمندر پار بھی - گھر گھر دیوالی ہے - گھر گھر چراغاں ہے - لندن میں - کلکتہ میں - آرہ میں - ملکہ وکٹوریہ کا دربار ہے - خاص نہیں - عام ہے - تو بھی چلی چل!

پھڑک گئی یہ سخن سنتے ہی وہ صورت چشم — شگون نیک کمانے لگی اوسے تقدیر
وفور شوق میں اک بار کھل گئیں باچھیں — پکڑ کے ہاتھ کو بولی - "بیا بہ سایہ بگیر"
تو شاعری و سخن من بسخن رس آن ممدوح — طبیب من شو و ایں درد را بکن تدبیر
نہ مونسے نہ رفیقے نہ ہمدمے دارم — وسیلتے نہ معینے نہ دست و نہ تدبیر
بدست تست ہمہ احتشام من اکنوں — ز مردمی بنما دستگیری من پیر
بیا بگاہ معلای او مرا برساں — بحضرتش بکن ایں عرض از زبان حقیر

چہ شد گناہ ز من اے پناہ اہل زماں؟
چہ شد ز دخترم اردو بحضرتت تقصیر؟

ز آستان تو مارا چرا بدر کردند؟ — اگر گناہ نمودیم - عذر ما بپذیر
شہان بدہر چو بر جای خویش عید کنند — بخلق بذل کنند و رہا کنند اسیر
چنانکہ وقت خطاب جناب قیصر ہند — رہا شدند اسیران واجب التعذیر
من اسیر بلاہای بے پنہہ را نیز — اگر ز لطف رہائی دہی - زہے تقدیر
بحال من نہ کنی رحم اگر - بہ اردو کن — کہ در شباب نمودہ است آسمانش پیر

شہان بپاس سخن ہای خویش مشہور اند
عزیز کردہ خود را مکن ذلیل و حقیر!

سراپا فریاد فارسی نے کہا ہکو ملکہ وکٹوریہ سے بہت کچھ کہنا ہے - کہنا ہے کہ ہمارے بچپن میں ایک بادشاہ تھا - اوس کے محل سے ..... ایک سونے کی زنجیر لٹکتی تھی - ہماری جوانی میں ایک بادشاہ تھا! وہیں کے محل سے بھی ایک سونے کی زنجیر لٹکتی تھی - عدل جہانگیری عدل نوشیروانی کا جواب تھا - اے ملکہ! تیرے راج میں بڑا اندھیر ہو رہا ہے - ۱۸۳۶ء میں لارڈ ولیم بنٹنک نے فارسی کو سولی دیدی - [illegible]ء میں لارڈ نارتھ بروک نے اردو کو سولی دیدی - ہندوستان فریادی تھا - فریادی کی زبان تک کھینچ لی گئی - دہائی نوشیرواں کی دہائی جہانگیر کی! وہ سونے کی زنجیر کیا ہوئی؟ اے ملکہ! غضب ہے کہ ؎

(بقیہ حاشیہ ص ۴۵) اسکی منطقی گرفت کی - یعنی آفتاب ایک ہوتا ہے - ایک سے زیادہ نہیں ہوتا - پھر بیک وقت اتنے آفتاب کس طرح پیدا ہو گئے - شمس العلما کسی ایک کو ہونا چاہئے تھا - ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ شمس العلما نہیں ہو سکتے ؎

گردش چرخ ببیں - لاٹ ذی تمکیں — کرد نام دل من سوختہ شمس العلما
بندہ را نیست سر و کار و تعارف با او — ز من غم زدہ را قوت تحریک سما
شہرہ چوں یافت - نوشتند من نیستے — کیں شکوہ و عظمت باد مبارک بشما
ہم باین نام ملقب شدہ اشخاص چند — گرچہ شمس است یکے - نے متعدد چوں ما
منقطع گشت رفت ز اسلام بنادانی ہا — مرز بوم است ہمایوں دچو عنقا سفتہا

رسائی زمانے کی ہو تیرے گھر میں
نہ پہونچے تو میری خبر تک نہ پہونچے!
(منیرؔ شکوہ آبادی)

اے ملکہ! اسن سنتاون نے تجکو قیصرِ ہند کیا۔ اس خوشی میں تونے قیدیوں کو رہا کیا تھا۔ آج پھر جشنِ قیصری ہے۔ اس قیدِ فرنگ سے ہم کو بھی آزاد فرما۔

اے ملکہ! تیری طرح ہم بھی کبھی ملکہ تھے۔ تیرے ہاتھ میں شمشیر ہے۔ ہمارے ہاتھ میں قلم تھا ——— دشمن کہتا ہے کہ یہ دعویٰ باطل۔ ہم کہتے ہیں" ولیکن قلم در کفِ دشمن است!

اے ملکہ! فارسی اگر مجرم تھی تو اردو نے کیا تقصیر ہوئی تھی؟ اے ملکہ! تو نے اردو کو پہچانا نہیں۔ اردو تیغ ہندی ہے۔ اردو شاہجہانی تحفہ ہے۔ آگرہ میں تاج محل اور ہندوستان بھر میں اردو۔ شاہجہانی تحفہ ہے۔ اے ملکہ! افسوس کہ تونے اس شاہجہانی تحفہ کی بھی قدر نہ کی!

اے ملکہ! تیرا فرمان تھا کہ سپاہی کی بیٹی کے واسطے فورٹ ولیم خالی کر دو۔ پھر فرمان ہوا کہ سپاہی کی بیٹی فورٹ ولیم خالی کر دے در پہ رہنے کو کہا۔ اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
غالبؔ

اے ملکہ! الف اپنے ملک کا بادشاہ ہے۔ کیوں بادشاہ ہے؟ بادشاہوں کی زبان ایک ہوتی ہے۔ الف کی زبان ایک ہے۔ اسی حق سے الف حروف تہجی کا بادشاہ ہوا۔ اے ملکہ! تیری زبان بھی الف کی زبان کیوں نہ ہوئی؟ اردو کو نظروں سے گرانا تھا تو آنکھوں پہ بٹھایا کیوں تھا؟

حضرت بلقیس زمانی کو سلیمانی مبارک! مگر فارسی کا آفتاب غروب ہو چکا۔ پھر کون کہتا ہے کہ تیری سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا؟ حضرت مریم زمانی کو ادوّد انی مبارک! مگر اردو کو سولی دیدی گئی۔ پھر کون کہتا ہے کہ تیرے راج میں خون ناحق نہیں ہوتا! فارسی کی یہ فریاد سسٹر ہم نے ملکہ وکٹوریہ سے فریاد کی۔ اے ملکہ! سوہنی و گنگ و جمن کی طرح ہندوستان میں تیرا فیض بھی عام ہے [1]

مگر عجب ہے تو اس کا کہ اے سپہر نشاں! | زبان ہند میں کس واسطے ہوئی تغیر؟
یہ فارسی ہے۔ یہ اردو ہے۔ تجھ سے داد طلب | کہ تیرے وقت میں کیوں گھٹ گئی مری توقیر
نہیں ہے فارسی اس وقت تجھ سے یہ خواہاں | کہ ہو مرے لئے اجرای و نشر کی تدبیر
مگر یہ اردو ہے پر مغز جس میں عجیب ہے | ہر اک زبان کے انداز و طرز کی تخمیر
ہوئی ہے کس لئے دورِ آستانِ رحمت سے | کہ خاص تو نے ہی اسکی بڑھائی تھی توقیر

رموزِ مصلحتِ خویش خسرواں دانند
میں تیرے رمز کی کس طرح سے کروں تحقیر

مگر عجب مجھے آتا ہے اس سے اے سلطاں | جسے عزیز کرے تو۔ وہ یوں ہو زار و حقیر
کسی زبان میں ہندوستاں کی یہ وسعت | نہیں ہے اور نہیں ہو سکے سب یہاں سے خبیر
امیدوار ہوں میں بھی کہ بعض جو بلی میں | جہاں بڑھائے تو اہلِ حقوق کی توقیر
ذلیل کردہ تری چاہتی ہے اردو بھی | عزیز کر لے۔ اے ملکِ نگیں وسریر

---

[1] اردو دہلی ——— حافظ عبدالکریم ساکن آگرہ ملکہ وکٹوریہ کو اردو پڑھاتے تھے۔

رواں رہیں ترے احکام ہند میں دائم — زبانِ اردو پہ مغز ہمیں بفضل قدیر
پچاس سال مبارک سریر آرائی — صدی کی سالگرہ بھی ہو یوں ہی جشن پذیر

جو کچھ دے بدل ہو - پر میں ہوں طالبِ امداد

صلہ قصیدہ کا اپنے یہ چاہتا ہے صفیر

صفیر بلگرامی نے جس وقت یہ قصیدہ کہا تھا اوس وقت آرہ میں خانہ جنگی تھی۔ اس بات پر کہ ملکہ وکٹوریہ کا نمائندہ اس ضلع میں کون ہے۔ جج کہتا تھا ہمارے ہوتے کلکٹر کوئی چیز نہیں ——— کلکٹر کہتا تھا۔ "نانا! نانا! کتنے بال؟ - بجمان جی! اتنا گھبراتے کیوں ہو؟ مونڈھے سے مونڈھے آگے آئیں گے! یعنی ذرا دربار ہونے دو۔ اوس وقت دیکھ لینا کہ ملکہ کا نمائندہ کون ہے!

بات زیادہ بڑھی تو گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ ضلع کا مکھیا کلکٹر ہے - جج مکھیا نہیں ہوسکتا - آرہ میں اوس وقت اے بی یادو کلکٹر تھے - ایک تو ملکہ کی پچاس سالہ جوبلی۔ پھر جج کے مقابلہ میں میدان مار لینے کی خوشی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شب پنجشنبہ ۱۶ فروری ۱۸۸۷ء کو آرہ میں جلوس اس شان سے نکلا گویا خود یادو صاحب کی برات دلہن کے دروازہ لگ رہی ہے! سڑکوں پر جا بجا محراب۔ جلوس میں پیادے سوار - ہاتھیوں کی قطار - نقیب عصا بردار - نالکی پالکی - دیپک مہتابی - بینڈ شہنائی - حسینوں کے جھرمٹ میں - ایک تختِ رواں - تخت رواں گویا موجِ رواں - اوس تختِ رواں پر ایک طرف سید نصیر الدین - دوسری طرف لطیف عالم - اور بیچ میں نوشاہ یعنی خود یادو صاحب کلکٹر!

(۱) سید نصیر الدین خلف مولوی سید فرزند علی رئیس نیورہ ضلع عظیم آباد - سید نصیر الدین کے دو بھائی اور دو بہنیں - بڑے بھائی سید فخر الدین - چھوٹے بھائی آنریبل جسٹس سید شرف الدین کلکتہ ہائی کورٹ - ایک ہمشیر کی شادی نواب بہادر سید امداد امام اثر عظیم آبادی سے ہوئی - اور دوسری ہمشیر کی شادی خان بہادر سید ظہیر الدین سے ہوئی۔ جشن جوبلی ۱۸۸۷ء کے بعد ہی مولوی سید نصیر الدین ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔

سید نصیر الدین جہان آباد ضلع گیا میں سب ڈویژنل آفسر تھے کہ بھوپال میں بھونچال آیا - اور وزیر بھوپال نواب عبد الجبار اپنے پرائیوٹ سکریٹری ابو القاسم کے ساتھ وہاں سے دامن جھاڑ کر کلکتہ چلے آئے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے گورنمنٹ بنگال کو خط لکھا کہ ہم کو نواب عبد الجبار کی دیانت وسطوت کا آدمی درکار ہے - بنگال گورنمنٹ نے تین نام پیش کیے:۔

۱- نواب سید محمد آزاد[1] - ساکن ڈھاکہ بنگال۔
۲- مولوی سراج الحق[2] ڈپٹی کلکٹر - ساکن استھاواں ضلع عظیم آباد۔
۳- مولوی سید نصیر الدین ڈپٹی کلکٹر - ساکن نیورہ ضلع عظیم آباد

تب بیگم بھوپال نے اپنے معتمد مولوی غلام قادر کو ہارون الرشید کے بھیس میں بھوپال سے روانہ کیا کہ چپکے سے ان تینوں کو دیکھ آؤ کہ کون کیسا ہے۔ اتفاق یہ کہ مولوی غلام قادر ساکن ہوگلی بنگالہ عرصہ تک بہار شریف ہائی اسکول میں مدرس رہ چکے تھے۔ اس لئے بھوپال سے تیر کی طرح یہ بہار شریف پہنچے۔ اور خلوت میں احباب خاص سے اپنے آنے کی حقیقت ظاہر کردی۔ بہار شریف نے کچھ سمجھ بوجھ کر اپنا ووٹ نیورہ کو دیا۔

۱؎ نواب سید محمد آزاد - انسپکٹر جنرل رجسٹریشن صوبہ بنگال - ممبر کونسل بنگال - ان کے ظریفانہ مضامین اودھ پنچ - اودھ اخبار اور آگرہ اخبار میں نکلتے تھے۔ دیکھو تاریخ ادب اردو مولفہ رام بابو سکسینہ۔ حصۂ نثر - ص ۱۰۶۔

۲؎ مولوی سراج الحق استھانوی کے بیٹے مسٹر ملک محمود بیرسٹر کلکتہ و پٹنہ - ان کے تین لڑکے - انوار الحق - اسرار الحق اور ابرار الحق -
مولوی انوار الحق مدرس ہائی اسکول بہار شریف۔
مولوی اسرار الحق وکیل بہار شریف۔

اس کے بعد مولوی غلام قادر نے ہارون الرشیدی دورہ شروع کیا ۔ اور تینوں قلندروں کی زیارت کی۔ دیکھا کہ نواب سید محمد میں قصاید عرفی کی تمکنت ۔ اور مولوی سراج الحق میں مسدس حالی کی سادگی ۔ اور مولوی سید نصیر الدین میں دیوان حافظ کی بہار ہے ۔ چنانچہ یہ بہار جہان آباد سے بھوپال پہونچی ۔ سید نصیر الدین[1] بھوپال پہونچتے ہی نصیر المہام ہوئے ۔ کچھ دنوں کے بعد بورڈ آف ریونیو بنگال کے جونیر سکریٹری ہو کر کلکتہ چلے آئے ۔ پھر کلکتہ سے دوبارہ بھوپال گئے ۔ اور ۱۹۱۱ء میں وہیں پیوند خاک ہوئے ۔

(۲) محمد لطیف عالم خلف قاضی محمد ظہور عالم رئیس آرہ ۔ کلکٹر شاہ آباد کی کوٹھی دراصل قاضی محمد ظہور عالم کی کی کوٹھی ہے ۔ گورنمنٹ نے یہ کوٹھی قاضی صاحب سے ۳۵ ہزار میں خریدی تھی ۔ قاضی ظہور عالم کا ایک دوسرا مکان تری محلہ میں آرہ ٹاؤن اسکول کی پشت پر تھا ۔ اوس زمین پر سید شاہ محمد مسعود ڈپٹی کلکٹر نے مدرسہ وحیدیہ کی عمارت اوٹھائی ۔

جشن جوبلی ۱۸۸۷ء کے بعد ہی قاضی لطیف عالم ڈپٹی کلکٹر ہوئے ۔ ۱۹۰۸ء میں قبل از وقت پنشن لی لیکن پنشن کا ایک پیسہ زندگی بھر بار آمد نہیں کیا ۔ اور اس طرح ۳۲ ہزار روپے چھوڑ دیئے خیال یہ تھا کہ پنشن کا روپیہ لینے والا (سرکار کے اقبال سے) بہت جلد مر جاتا ہے ۔ مگر بقول قبا لکھنوی ؎

"موت کس پردہ میں آئی ۔ دیکھئے!"

قاضی لطیف عالم کو اپنے لڑکے نظیر عالم سے عشق حقیقی تھا ۔ نظیر عالم کی شادی سکینہ خاتون سے بہار شریف میں ہوئی تھی ۔ شادی کے چند ماہ بعد دوشنبہ ۱۱ فروری ۱۹۲۹ء کو لطیف عالم اور نظیر عالم ایک تار پاکر بانکی پور سے بہار شریف پہونچے ۔ اوسی شام کو رمضان کا چاند ہوا ۔ چاند دیکھ کر یہ دونوں اپنے موٹر پر بانکی پور کے لئے روانہ ہوئے ۔ راستہ میں ملک الموت نے اپنا ہم ڈرائیور کو دھکا دے کر نیچے گرا دیا اور موٹر اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ موٹر میں اب تین شخص تھے ۔ عاشق و معشوق اور ملک الموت! ملک الموت نے موٹر کو درخت سے ٹکرا دیا ۔ لطیف عالم کو کسی کی نظر کھا گئی ۔ نظیر عالم کو اوس کی جوانی کھا گئی ۔ عاشق و معشوق کی جان ایک ساتھ نکلی ۔ کیوں ساتھ نکلی ؟ کہ ؎

اے بولائے تو تولائی من ازخود و از غیر تبرائی من
عشق تو سرمایۂ سودائی من گر بشکافند سراپائی من
جز تو نیابند در اعضائی من!

محمد باقر صحبت شیرازی

رہے نام اللہ کا! آج سید نصیر الدین نہیں ۔ قاضی لطیف عالم نہیں ۔ اسے بی پادر نہیں ۔ جشن جوبلی ۱۸۸۷ء میں یہ تینوں رات کے وقت آرہ میں تخت رواں پر نکلے تھے ۔ آج وہ تخت رواں بھی نہیں ۔ موج فنا ان تینوں کو تخت رواں کی طرح خدا جانے کہاں بہا لے گئی ۔ رہے نام اللہ کا!

طالب و مطلوب میں بھی فراق ہو چکا ۔ مطلوب کون ؟ اردو! طالب کون ؟ صفیر بلگرامی ؎

جہاں تک ہند میں ہے وصف میر و مدحت مرزا جہاں تک آتش و ناسخ کا ہے آفاق میں چرچا
جہاں تک ذوق و غالب کا سخن ہے انجمن آرا جہاں تک لطف اردو کو ہے موقع اور بڑھنے کا
مبارک جشن جوبلی قیصر ہندوستاں کو ہو خوشی اسکی صفیر طالب اردو زباں کو ہو

---

[1] نصیر المہام سید نصیر الدین ۔ ان کے دو صاحبزادے ۔ سید عزیز الدین سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس ۔ سال رحلت ۱۹۳۰ء ۔ اور سید وصی الدین منصف ۔ سال رحلت ۱۹۳۰ء ۔

طالب صادق کی پہچان یہی ہے۔ وہ اپنی نمود نہیں چاہتا۔ وہ چاندی سونا نہیں مانگتا۔ موتی مونگا نہیں مانگتا۔ فنا فی المطلوب صرف اپنے مطلوب کو مانگتا ہے۔ صفیر بلگرامی بھی اپنی لیلیٰ کا مجنوں تھا۔

مجنوں مرگیا۔ لیلیٰ جیتی ہے۔ لیلیٰ جیتی ہے تو مجنوں بھی جیتا ہے۔ مجنوں مر نہیں سکتا۔ مجنوں زندۂ جاوید ہے۔ ایک مجنوں مرتا ہے دوسرا سامنے آتا ہے۔ ایک مجنوں کی خاک سے ایک ہزار مجنوں اوٹھتے ہیں۔ پھر کون کہتا ہے کہ مجنوں مرگیا؟ مجنوں مرنا چاہے بھی تو ملک الموت آکر پلٹ جائے گا۔ لیلیٰ باؤلی نہیں۔ بڑی سیانی ہے۔ جانتی ہے کہ لیلیٰ کی لالی مجنوں تک! مجنوں نہیں تو لیلیٰ کہاں؟ مجنوں را "بچشم لیلیٰ" باید دید! لیلیٰ اپنے مجنوں کو کبھی مرنے نہیں دیتی۔ قُم باذنی کہہ کر جھٹ پٹ جلا لیتی ہے۔ لیلیٰ مجنوں رہتی دنیا تک!

لیلیٰ دیوانی نہیں۔ بڑی ہوشیار ہے۔ آنکھ والی ہے۔ داناؤں کی دانا ہے۔ وہ خوب پہچانتی ہے۔ اپنے دشمن کو۔ دشمن کے دوستوں کو۔ آشکارا نہیں خفیہ دوستوں کو۔ دشمن سے رشوت لینے والوں کو۔ دشمن سے سازش کرنے والوں کو۔ دشمن کی چوکھٹ پر سجدہ کرنے والوں کو۔ وہ خوب پہچانتی ہے۔ ابن الوقت کو۔ مار آستین کو۔ مکاروں کو۔ عیاروں کو۔ غداروں کو۔ عیسیٰ روح اللہ تک کو تیس روپے پر بیچ دینے والوں کو۔ چودھویں صدی کے جعفران بنگالہ اور صادقان دکن کو۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ آدم۔ ننگ دیں۔ ننگ وطن

ناقبول و نا امید و نا مراد
ملتے از کار شاں اندر فساد

دین او آئین او سوداگری است
عنتری اندر لباس حیدری است

ظاہر او از غم دیں دردمند
باطنش چوں دیر یا زنّار بند

از نفاقش وحدت قومی دو نیم
ملت او از وجود او لئیم

ملتے را ہر کجا غارت گرے است
اصل او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روح جعفر الاماں
الاماں از جعفران ایں زماں

اقبال

لیلیٰ اس وقت کہاں ہے؟ جہاں اوس کا تخت ہے! تخت اوس کا کہاں ہے؟ مجنوں کے دل میں! لیلیٰ کون؟ اردو!

مجنوں اس وقت کہاں ہے؟ جہاں اوس کا دل ہے! دل اوس کا کہاں ہے؟ لیلیٰ کی زلفوں میں! مجنوں کون عبدالحق! لیلیٰ اردو۔ مجنوں عبدالحق۔ مبارک ہو مجنوں اورنگ آباد سے دلّی آگیا۔ کیوں آگیا؟ زلف لیلیٰ کا سودا عبدالحق کے سر میں۔ زلف لیلیٰ کی زنجیر عبدالحق کے پاؤں میں۔ زنجیر ہو تو ایسی ہو۔ اور سودا ہو تو ایسا ہو۔ عبدالحق کہتا ہے انا لیلیٰ۔ لیلیٰ کہتی ہے انا الحق!

بہار کی بہار

(ایک بہار دوست اور بہار دوست غیر بہاری کے قلم سے)

از ادیب شہیر حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر "صدق" لکھنؤ

مارچ سنہ ۱۹۱۰ء کا ذکر ہے کہ انگریزی ہائی اسکول کے ایک نویں درجہ کے طالب علم کو اُس کے والد ماجد کے ہمراہ دارالعلوم ندوہ کی شہرت اُس کے جلسۂ دستار بندی میں کھینچ کر لکھنؤ لائی۔ کانوں کو اشتیاق تھا دو تقریروں کے سننے کا' اور آنکھوں کو تمنا تھی دو چہروں کی زیارت کی۔ اللہ نے دونوں شوق پورے کرائے پہلی بار تقریر سننی نصیب ہوئی مولانا شبلی کی' اور زیارت ہوئی اُن کے چہرہ کی۔ دوسرے نمبر پر آرزو تھی ایک ندوی طالب علم کے دیکھنے اور سننے کی۔ جس کے مضامین استاد کے رنگ میں ڈوبے ہوئے۔ انہیں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ الندوہ میں نکل رہے تھے۔ جلسہ گاہ (رفاہ عام) میں پہنچ کر یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک جوان عمر خوش لباس طالب علم ہے' چہرہ پر خوشنما چھوٹی سی داڑھی' عینک' سر پر ندوی وضع کی مندیل' بشرہ سے ذہانت ٹپکتی ہوئی۔ سب کی نظروں کا مرکز و مرجع۔ ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ دستار بندی ہوئی ـــــ صاحب کی لائی ہوئی اور پھیلائی ہوئی اصطلاحوں میں یوں کہئے کہ کانووکیشن ایڈریس پڑھا گیا اور ڈگریاں تقسیم ہوئیں ـــــ اور اس ندوی نوجوان کی مفصل تقریر اردو میں ہوئی اور برجستہ تقریر عربی میں بھی۔ آنے والے اسکولی طالب علم کی دونوں تمنائیں۔ لڑکپن کی پُرخلوص مسرتوں کا نقشہ اب کوئی کہاں سے لائے؟ ـــــ جی بھر کر پوری ہوئیں۔ سنہ ۱۰ء کا اسکولی طالب علم وہی تھا' جو آج ان سطور کا راقم ہے اور فاضل ندوی نوجوان وہ تھا' جو بحمد اللہ اردو میں سیرت نبوی کے ضخیم دفتر تیار کر چکا ہے' اور جسے دنیا اب "مولانا" اور "علامہ" کے القاب کے اضافہ کے ساتھ' سید سلیمان ندوی کہہ کر پکارتی ہے۔

اودھ کی سرزمین پر بہار کی محبت و عظمت کا تخم پڑا' اور وہ دن ہے اور آج' کہ تخم نے جڑ پکڑی' پودا بنا' برگ و بار پیدا کئے' اور آج ایک درخت ہی نہیں' پورا باغ کا باغ تیار! ۳۲ برس کی مدت کچھ تھوڑی ہوئی! قرن کا قرن گزر گیا۔ خدا جانے کتنی آندھیاں کیسے کیسے طوفان اتنی مدت میں آئے اور کیسے کیسے چمن لٹ کر رہے۔ لیکن بہار کی خوشگوار یاد کی بہار آج بھی قائم۔ بلکہ اُس میں اضافہ و ترقی دمبدم!

میں بے حد شرمیلا اور بد ہمت' الندوہ کے مقالہ نگار کی علمی عظمت کا رعب دل پر طاری۔ ملنے کی جرأت اُسوقت نہ ہوئی۔ کئی سال بعد جب لکھنؤ کے کیننگ کالج میں بی۔ اے کے پہلے سال کا طالب علم تھا۔ غالباً آخر سنہ ۱۲ء تھی اور مولانا شبلی مرحوم کی الکلام پر ملحدانہ تنقید کے سلسلہ میں "نام" حاصل کر چکا تھا' جب جا کر تعارف کی نوبت آئی۔ اور نیازمندی کے تعلقات رفتہ رفتہ اتنے بڑھے کہ دوستی کے ڈانڈے عزیز داری سے جا ملے' اور اب سید صاحب میں اور اپنے قریب کے عزیزوں میں کوئی فرق ہی نہیں معلوم ہوتا۔

مقامی خصوصیات تمدن' معاشرت ہر صوبہ کے الگ الگ ہوتے ہیں۔ پنجاب' بمبئی' سی۔ پی سب کہیں کا رنگ اودھ سے جداگانہ ہے۔ یہاں تک کہ خود یو۔ پی کے شمالی' مغربی' جنوبی علاقے طرز معاشرت میں اودھ سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ خصوصیت بہار ہی میں دیکھنے میں آئی کہ وہاں کا رنگ ڈھنگ

. . . .

بالکل اودھ والوں کا سا۔ اجنبیت کم از کم مجھے تو کسی موقع پر محسوس نہیں ہوئی۔ پٹنہ کا تمدن' لکھنؤ کے تمدن کا مثنیٰ' جس بہاری سے ملا' معلوم ہوا اپنے ہی

جوار کے کسی شخص سے مل رہا ہوں۔

سید صاحب ہی کے سلسلہ میں ان کے متعدد عزیزوں، ہموطنوں سے ملاقاتیں ہوتی گئیں۔ سید نجیب اشرف ندوی، جو اب ایم۔ اے ہیں اور کسی کالج کے پروفیسر، مگر میری نظر میں انکی وہی لڑکپن کی صورت پھر رہی ہے، جب وہ ندوہ میں پڑھ رہے تھے۔ اور ہنستے مسکراتے ہوئے چہرہ کے ساتھ، نو مشق بچوں میں ایک ہونہار مقرر تھے۔ مولوی ابو ظفر صاحب ندوی۔ مولوی سید ہاشم ندوی (دائرۃ المعارف والے) مولوی سید محمد ندوی (شاگرد مولانا عبد الرحمن نگرامی مرحوم) اور مولوی سید عبد الحکیم صاحب دیسنوی وغیرہم۔ ان میں سے بعض کی ضمنی ملاقاتیں خود مستقل داستان بن گئیں۔

بہار اور اودھ کے تعلقات کی تاریخ اس سے بھی قدیم تر ہے۔ یہ ذکر تو میری اور سید صاحب کی ملاقات کا تھا۔ لیکن سید صاحب ہی کے ایک بزرگ ہمنام، ابھی کل تک زندہ وسلامت، مولانا قاری سید شاہ سلیمان صاحب پھلواروی تھے۔ ۳۰۔ ۳۵ سال اُدھر علیگڈھ کانفرنس کا ہر اجلاس اُن کے دم سے آباد تھا، ندوہ کا ہر جلسہ اُن کے وجود سے شاد، اور محفل میلاد بیان کرتا تو گویا ان کا حصہ تھا۔ انکا ذکر خیر اپنے بالکل بچپن میں اپنے بزرگوں سے بارہا سننے میں آیا تھا، اور اپنے والد ماجد کے ان سے مخلصانہ تعلقات سنہ ۱۰ء تا سنہ ۱۲ء میں اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ شاہ صاحب کی طالب علمی کا ایک زمانہ لکھنؤ فرنگی محل میں گزرا تھا۔ اور ہمارا خاندان بھی اپنے قرب تعلقات کی بنا پر گویا فرنگی محل ہی کا ایک جزو تھا، شاہ صاحب نے بعض کتابیں ہمارے بزرگوں سے پڑھی تھیں اور اسی تعلق سے کبھی کبھی دریاباد میں تشریف لاتے تھے۔ مگر میری یاد سے پہلے۔ اس کا تذکرہ خود موصوف نے اپنی زبان سے فرمایا۔ جب بہت مدت کے بعد غالباً سنہ ۲۱ء میں مجھے ذاتی طور پر شرف نیاز حاصل ہوا۔ انکی بزرگانہ شفقت اور مکرم فرمائی بھولنے کی چیز نہیں۔ سنہ ۲۷ء میں جب پھلواری تھوڑی دیر کے لئے حاضری کا اتفاق ہوا تو خود شاہ صاحب، ان کے ایک بھائی صاحب (غالباً مولوی علی حافظ نام تھا) اور صاحبزادے شاہ حسین میاں صاحب نے پردیسی کو وطن بنا دیا۔ دوسرے صاحبزادے شاہ جعفر میاں اور نواسہ مولوی شاہ عز الدین سلمہ کی زحمت فرمائیاں عین اپنی روایات خاندان کے مطابق۔

لکھنؤ میں درسگاہ ندوہ ایک بڑا مرکز نوجوان اہل بہار کا رہا ہے۔ اپنی انگریزی طالب علمی کے زمانہ میں لبس یہ معلوم ہوتا تھا کہ بہار کا آدھا صوبہ کھنچ کر لکھنؤ آگیا ہے اور ندوہ کا دار الاقامہ پٹنہ ہی کا کوئی محلہ ہے۔ خدا جانے کتنوں سے ملاقات اس سلسلہ میں ہو گئی۔ مولوی حاجی معین الدین ندوی اس دور کے اوائل کی۔ مولوی ابو الحسنات ندوی مرحوم اور مولوی شاہ احمد حبیب ندوی اواسط کی، اور مولوی مسعود عالم ندوی اواخر کی خوشگوار یادگاریں ہیں۔ مولوی حاجی معین الدین (صاحب خلفائے راشدین) اور مولوی مسعود عالم (اڈیٹر "الضیاء" عربی) کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ مولوی ابو الحسنات بیچارہ کی یادگار شاید چند مضامین سے زاید نہ ہوں۔ بڑے ہونہار تھے۔ عین شباب میں وفات پا گئے۔ جلسوں میں نظم بالکل مولانا شبلی کے لہجہ میں پڑھتے تھے۔ مولوی احمد اللہ ندوی، مولوی عبد القدوس ہاشمی ندوی (اب یہ سب حیدرآباد میں ہیں) سے بھی تعارف اسی زمانہ میں ہوا۔ مولوی سید ریاست علی ندوی، آج ماشاء اللہ دوسروں کے "ندیم" و رہبر ہیں۔ ان کا وہ زمانہ یاد ہے، غالباً سنہ ۲۰ء میں جب وہ بالکل سبزہ آغاز تھے، اور مولانا عبد الرحمن نگرامی مرحوم کے عزیز و مخصوص شاگردوں میں تھے۔ مولوی عبد الغفور صاحب شرر کا نام لیجئے میں بھول ہی چلا تھا۔ دفتر ندوہ کے بڑے پرانے سرگرم کارکن تھے اور اب تو شاید نائب ناظم ہی ہیں۔

دار العلوم کے بورڈنگ کے مقابل کیننگ کالج کا ہوسٹل تھا (جو اب یونیورسٹی ہوسٹل ہے) اس میں سنہ ۱۹۱۱ء میں ایک سال میرا بھی قیام رہا۔ یہاں پٹنہ کا ایک نوجوان سید باقر حسن مرحوم پہلے سے بورڈر تھے۔ بہار کے مشہور بیرسٹر سلطان احمد کے چھوٹے بھائی، بڑے وجیہ و خوش شکل، بڑے ہونہار و خوشخو۔ علیگڈھ سے ہو کر آئے تھے۔ انگریزی تحریر و تقریر دونوں میں برق، مسلمانوں کے ہر کام میں آگے آگے۔ مجھ سے ایک سال سینیر تھے۔ بی۔ اے کے پہلے سال میں تھا، وہ آخری سال میں۔ بیچارہ کالج چھوڑتے ہی بیمار پڑے اور کچھ ہی روز بعد دق میں انتقال کر گئے۔ سر علی امام کے بھائی حسن امام اور والد ماجد نواب امداد امام اثر۔ نواب نصیر حسین خیال اور اس وقت کے مشہور بیرسٹر مظہر الحق کو راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں اور قومی جلسوں میں قریب سے دیکھنے کا اتفاق بارہا ہوا۔ لیکن ذاتی تعارف کی نوبت نہ آئی۔ پٹنہ ہی کے رہنے والے ایک ڈاکٹر ڈاکٹر محمد وارث ہیڈ ہنر یونیورسٹی کے ایم۔ ڈی۔ لکھنؤ میں پریکٹس کرتے تھے۔ حکیم مہدی کے مقبرہ کے متصل۔ سنہ ۰۹ء تھا کہ اپنی مریض آنکھوں کا معا

کرانے گیا۔ بڑی توجہ و شفقت سے دیکھا۔ میں طالبعلم بھلا فیس کیا پیش کر سکتا تھا۔ اور اسی بنا پر شہر کے ایک بہت نامور غیر مسلم ڈاکٹر معاینہ سے انکار بھی کر چکے تھے۔ انکی توجہ بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ اکثر ان کے ہاں جاتا رہتا۔ کام تو یوں ہی سا چلتا۔ لیکن فن کی قابلیت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ گزشتہ جنگ یورپ کے زمانہ میں کہیں سول سرجن ہو کر چلے گئے۔ اس کے بعد صرف ایک بار سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ جہاں کہیں ہوں اللہ خوش رکھے۔

خلافت و ترک موالات کی تحریک نے دور دور کے مسلمانوں کو یکجا کر دیا تھا۔ بہار اور اودھ کا تو پڑوس ہی تھا۔ میں تحریک میں اسوقت شریک ہوا، جب تحریک خود فنا ہو رہی تھی، تاہم محمد علی کی ذات بجائے خود ایک مرکز و مرجع تھی۔ میں تو عاشقوں میں تھا۔ باقی اور بھی خدا معلوم کتنے اس شمع کے پروانے تھے۔ دہلی بار بار میری آمد و رفت تھی۔ اور دفتر ہمدرد و کامریڈ میں سب کہیں کے مسلمان اکٹھے ہوتے رہتے تھے مولوی محمد شفیع داؤدی مولوی عبدالغنی ممبر صوبہ کونسل، پروفیسر عبدالباری (جو اب شاید "باری جی" کہلاتے ہیں) مولوی سید حسن آرزو وغیرہم سے اسی سلسلہ میں بارہا ملاقاتیں ہوتی رہیں حضرات بہار کی سادگی اور اخلاصمندی سے دل خاص طور پر متاثر رہا۔ مولوی شفیع داؤدی اور مولوی عبدالغنی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی، کہ اسمبلی اور کونسل کے ممبر ہو کر نماز کے پابند ہیں، لباس سادہ رکھتے ہیں، بازار میں پیدل چلتے پھرتے۔ اور اپنے ہاتھ سے سودا سلف لے آتے ہیں۔ بھلا ہمارے ہاں کے ارکان کونسل مسجد کی حاضری اور موٹر چھوڑ کر پیدل چلنا گیا جانیں؟ مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت کو پہلی بار مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم کے مکان پر دیکھا، پھر خلافت وغیرہ کے جلسوں میں متعدد بار لکھنؤ میں ملاقات رہی۔ دل ان کے علم و تدقیق دونوں کا قائل رہا۔ اور آگے چل کر مولوی شفیع صاحب داؤدی اور ان کے درمیان جو شدید جنگ برپا ہوگئی اس سے برابر رنج ہی ہوا کیا دنیا میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ مخاصمہ سے دونوں فریق اپنی اپنی جگہ بے قصور ہی رہے۔

ایک مرکز اہل بہار کا علیگڈھ بھی ہے۔ یونیورسٹی کورٹ کی ممبری کے سلسلہ میں وہاں سالہا سال سے آمد و رفت قائم ہے۔ مولانا سلیمان اشرف مرحوم اب بہاری ہو گئے تھے۔ لیکن انکا خاندان تھا ہمارے اودھ ہی کے قصبہ کچھوچھہ کا۔ انکی زبردست شخصیت بعض نادر خصوصیات کی مالک تھی۔ اور پروفیسر ابوبکر محمد حلیم صاحب ایم۔ اے جو اب عرصہ سے پرو وائس چانسلر ہیں۔ اسم بامسمیٰ۔ پیکر حلم و خوش خلقی ہیں۔ مرزا اختر حسین صاحب رجسٹرار پٹنہ یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر ہیں۔ ان سے بارہا نیاز حاصل ہوتا رہا۔

یہ بھی ایک ذریعہ اہل بہار کی توجہات منعطف کرنے کا تھا۔ مگر دکن کے بعد سچ کی شاید سب سے قدرافزائی علاقہ بہار ہی نے کی۔ چھپرہ کے وکیل محمد اسمٰعیل صاحب، نرہٹ ضلع گیا کے قاضی احمد حسین صاحب، رانچی کے ہیڈ ماسٹر الطاف کریم صاحب اور مولوی منظر علی ندوی مرحوم اس سلسلہ سے مہربان ہوئے۔ مولوی منظر مرحوم تو خدا کے گھر سدھارے۔ باقی حضرات کی خیریت ادھر ایک عرصہ سے دریافت نہیں ہوئی۔ الطاف کریم صاحب دریاباد کو بھی سرفراز کر چکے ہیں۔

سال اب خوب خیال میں تو نہیں۔ سنہ ۲۰ء یا سنہ ۲۱ء ہو گا۔ ایک بار حیدرآباد جانا ہوا۔ مولانا شروانی صدر الصدور امور مذہبی کے دولتکدہ پر کوئی علمی کمیٹی تھی نظر ایک نئے چہرہ پر پڑی اور جی چاہا کہ اب پڑی ہے تو نہ ہٹے۔ اور اب اسی چہرہ کو دیکھتے چلے جائیں۔ بتانے والے نے بتایا کہ یہ مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں۔ اللہ اللہ کیسا دھوکا ہوا نام سے عرصہ سے واقف تھا لیکن صورت، سیرت، ہر چیز سے متعلق اندازہ کس قدر غلط نکلا۔ خیال تھا کہ مسن ہونگے یہ نوجوان ہیں۔ قیاس تھا کہ بڑے بحاث ہونگے اور بڑے مناظر، اور خشکی و کرختگی تو مناظرہ بازی کے لوازم میں ہے۔ مشاہدہ نے بتایا کہ ایک لطیف روح لطیف تر جسم میں ہے! خندہ رو، نرم خو۔ نہ کہیں سے کرختگی نہ ثقالت۔ برعکس اس کے ایک مجسمہ لینت و لطافت! چہرہ معصومیت کی تصویر، بشرہ پر لطافت قلب کی تنویر! صورت پر نورانیت برستی ہوئی۔ گفتگو سے محبوبیت ٹپکتی ہوئی۔ علم کی جگہ علم، عشق کی جگہ عشق۔ تعارف ہوا، اور ملاقات کے پینگ بڑھے۔ اس اٹھارہ انیس سال کی مدت میں کیا کچھ دیکھا کیا کچھ پایا، کیا کچھ سیکھا، ان سوالات کو بس سوال ہی بنا رہنے دیجئے۔ حیدرآباد کی ہمنوائیاں لکھنؤ کی یکجائیاں، دریاباد کی سرافرازیاں، اور پھر عرشۂ جہاز پر ساتھ، مدینہ کے روضۂ جنت میں ساتھ، بیت اللہ کے طواف و زیارت میں ساتھ۔ منیٰ کی نمازوں میں ساتھ، یہ ساری داستان کہیں پھیلنی شروع ہوگئی تو سمیٹنی مشکل ہو جائیگی

مختصر یہ کہ دماغ اگر ایک بہاری کے علم و فضل کے آگے جھک گیا تھا، تو دل دوسرے بہاری کی محبوبیت کی نذر ہو گیا۔ دماغ اگر ایک کی عظمت کا قایل، تو دل دوسرے کی محبت کا گھائل۔ "بہار کی بہار" اب بھی روح پرور نہ ہو تو کیا ہو؟

سنہ ۲۹ء میں سفر حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ جہاز پر مولوی نصیرالدین صاحب پنشنر منصف اور ان کے صاحبزادہ ظفیرالدین صاحب کا، جو اُس وقت ایک پر جوش خلافتی تھے، خوب ساتھ رہا۔ اور اس لطف کی تجدید۔ ۸۔ ۹ سال بعد خاص شہر پٹنہ میں سنہ ۳۷ء میں ہوئی۔ مولوی شاہ لطف اللہ صاحب مونگیری۔ اور ان کے برادران عزیز مولوی نوراللہ و مولوی منت اللہ (جواب ایم۔ ال۔ اے ہیں) خصوصیت پیدا ہو جانے کے لئے اتنا ہی بس تھا کہ یہ حضرات مولانا گیلانی کے عزیز قریب ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ان حضرات کا لطف و اخلاص بجائے خود بھی یاد رہ جانے والی چیز ہے۔ اور مدینہ منورہ میں ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب کا وجود تو ہر مسافر و زایر کے لئے ایک تائید رحمت ہے۔ اور پھر ہم لوگوں پر تو کرم خاص رہا۔ مسجد نبوی کے باب جبرئیل کے دربان بھی ایک بہاری تھے۔ اور خوب شخص تھے۔ ہم لوگ عموماً اس دروازہ سے جاتے تھے۔ روز ملاقات رہتی تھی۔ نام اسوقت ذہن میں نہیں

جامعۂ عثمانیہ کے سررشتہ تالیف و ترجمہ کے سلسلہ میں ستمبر سنہ ۱۷ء سے ستمبر سنہ ۱۸ء تک، ایک سال مسلسل حیدرآباد میں قیام رہا۔ سرکار عالی کے نائب صدر محاسب مولوی عبدالغنی مرحوم تھے، ان کے کرم بے حساب رہے ــــــــ ان کے صاحبزادہ محی الدین صاحب بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا، محکمہ تعلیمات میں تھے۔ اب شاید اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہیں۔ جوانی ہی میں مذہبیت کے دلدادہ۔ لطف و کرم میں باپ کے قدم بہ قدم۔ انہیں کے ہاں شمس العلماء مولوی محب الحق کی زیارت کئی بار ہوئی۔ اُسوقت تو بہت بزرگ صورت معلوم ہوئے۔ بعد کو سننے میں آیا کہ عقاید کچھ اہل قرآن کے سے ہیں۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ بہار ہی سے ایک صاحب مولوی ابو محمد مصلح ایڈیٹر "حسن و عشق" مراسلت عرصہ سے فرما رہے تھے۔ حیدرآباد کی آمد و رفت کے سلسلہ میں ملاقات ان سے ہوئی۔ تحریک قرآن کے دھن میں لگے ہوئے۔ ایک اور بہاری عبدالرحمن خاں صاحب بھی یاد آگئے، انسپکٹر پولیس تھے۔ مدتوں مہربان رہے۔

پٹنہ کی حاضری کا اتفاق کل دو بار ہوا۔ ہوئے اس شہر کی گلی گلی سے آئی۔ نئی کوٹھیوں سے کہیں عظیم آباد کے کھنڈروں سے بیشتر۔ پہلی بار ستمبر سنہ ۲۷ء میں جانا ہوا۔ مولانا مناظر صاحب شدید علیل ہو کر پٹنہ کے بڑے ہسپتال میں داخل ہوئے۔ تار پا کر عیادت کو دوڑا ہوا گیا۔ مہمانداری مولوی منظر علی مرحوم ایڈیٹر "البشیر" نے کی۔ مولانا کے والد ماجد حیات تھے۔ انکی زیارت ہوئی۔ اور مولانا کے برادر عزیز سید مکارم احسن سے خوب ملنا ملانا رہا۔ مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی، قاضی احمد حسین صاحب ایم۔ ال۔ سی۔ مولوی نور محمد صاحب ایڈیٹر "اتحاد" وغیرہم لطف فرماتے رہے۔ اور مولوی سید محمد ندوی تو ہمہ وقت خدمت کیلئے وقف رہے۔ میزبان صاحب موٹر پر پھلواری لے گئے۔ مزارات کے علاوہ زندہ بزرگوں میں امیر شریعت مولانا محی الدین صاحب کی زیارت نصیب ہوئی۔ نیز مولانا قاری شاہ سلیمان مرحوم و مغفور انکے اہل خاندان اور جناب تمنا کی لطف فرمائیاں ہیں۔ غرض "پھلواری" کی سیر سے دل باغ باغ رہا اور اسکی سدا بہار سرسبزی کی دعائیں نکلتی رہیں

دوسرا سفر سنہ ۳۷ء میں ایک اردو کمیٹی کے سلسلہ میں ہوا، مثالی لطف سے میزبان قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر تھے۔ میرا قیام مولانا سید سلیمان کی رفاقت میں ریاض حسن خاں صاحب رئیس مظفرپور کی کوٹھی پر رہا۔ موصوف مولانا شبلی مرحوم کے کہنے والے اور اس رشتہ سے میرے بھی بزرگ ہوئے۔ بزرگانہ شفقتیں عین روایات بہار کے مطابق رہیں۔ تمنا صاحب اکی بھی کرم فرماتے رہے۔ اور ان کے علاوہ ضمیرالدین صاحب۔ اور متعدد حضرات کی عنایتوں کا مینہ دن بھر برستا رہا افسوس ہے کہ انکے اسمائے گرامی ذہن میں نہیں۔ شام کو ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم کے اعزاز میں علیگڑھ اولڈ بوائز کی طرف سے ایٹ ہوم تھا۔ متعدد نوجوانوں سے ملاقات رہی۔ سب خلوص و محبت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے۔ ایک ڈپٹی مجسٹریٹ اور دو یونیورسٹی کے طلبہ کی صورت کا نقش ذہن میں ہے۔

لیجئے ایک چلتا ہوا سا ہدیہ بزرگان بہار کی خدمت میں پیش کرنے کیلئے گو انکے مرتبہ کے قابل نہیں۔ تیار ہو گیا یہ موضوع "احباب بہار" خود ایڈیٹر صاحب ندیم کا عنایت کیا ہوا تھا، محفل خاص میں اغیار کے بار پانے کے کوئی معنی نہیں۔ بہار نمبر میں ایک غیر بہاری کیلئے جگہ نکالنا محض اس کا دل بڑھانا ہے لیکن یہ نمبر اسیا ہو کہ ا ہے یہ نمبر کا اطلاق زرا مشکل سے ہوگا۔ ایک تو اودھ والے بہار کے تمدن و معاشرت کی یہ مماثلت کہ ایک کو دیکھ بے اختیار دوسرے کی زبان سے نکلے۔

جو تو ہے وہی میں ہوں

اور پھر عموم میں ان سطور کو راقم کا اہل بہار کیساتھ نیاز مندانہ خلوص ــــ قطرہ فکر کو جب تولتے ہیں تو خس و خاشاک کے ذرے بھی قند و شکر ہی کے حکم میں داخل ہو جاتے ہیں

فاتح بہار و بنگالہ

محمد بن بختیار خلجی

از مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی سابق پروفیسر ٹیگور کالج شانتی نکیتان بنگال

تاریخ آل سلجوق[1] کے مصنف کا بیان ہے کہ خلج ترک بن یافث کے گیارہویں لڑکے کا نام تھا[1] جس سے یہ سلسلہ چلا، ممکن ہو کہ اس سلسلہ میں کوئی شخص خلج نامی ہوا ہو، جس نے ترکستان میں ایک بستی خلج نام سے آباد کی۔ جہاں سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔ کیونکہ لغت میں "خلج" ترکستان کے ایک خطہ کا نام لکھا ہے[2]۔ جہاں کے لوگ بڑی اچھی فوجی قابلیت رکھتے تھے، کچھ لوگ وہاں سے غور اور گرم سیر (افغانستان) ممالک میں آکر آباد ہو گئے[3]، جیسا کہ قاضی منہاج نے لکھا ہے، جو قریب تر عہد کا مصنف ہے[4]۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آبادی غور، اور گرم سیر ممالک تک پھیلی ہوئی تھی۔

خلجی خاندان افغانستان میں کب آیا۔ اس کے متعلق کوئی صحیح بات ابھی تک میری نظر سے نہیں گذری۔ البتہ غزنوی عہد سے ہندوستان کی تاریخ میں اس کا ذکر آتا ہے۔ چنانچہ ایلک خاں بادشاہ ماوراءالنہر کے مقابلہ میں سلطان محمود نے جو فوج ترتیب دی ہے، وہ اس طرح ہے کہ قلب میں امیر نصیر الدین، میمنہ پر التون تاش، میسرہ پر ارسلان جاذب کے ساتھ افغانی اور خلجی امیروں کو مقرر کیا[5]۔ پھر آگے چل کر انند پال کی شکست کے متعلق تاریخ میں ہے کہ عبداللہ طائی اور ارسلان جاذب دو ہزار ترکی، افغانی اور خلجی سپاہیوں کے ساتھ دو دن دو رات بھاگنے والوں کا تعاقب کرتے رہے[6]۔

اس سے اس قدر معلوم ہو گیا کہ خلجی سپاہی غزنوی فوج میں بڑی تعداد میں تھے، اور ان کے خاص خاص اشخاص امارت کے درجہ تک پہنچ چکے تھے، پس مصنف طبقات اکبری کا یہ بیان کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ "خلج" کا ماخذ "قالج" ہے، جو چنگیز خان کے خاندان سے تھا[7] اور غور میں بعد وفات چنگیز خان آبسا تھا۔ جس کی اولاد قلجی اور پھر خلجی کہلائی۔ کیونکہ عہد غزنوی میں چنگیز سے کئی صدی قبل خلجیوں کا ہونا مذکور ہو چکا ہے۔

پس صحیح تر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترکستانی قوم سبکتگین کے عہد میں اس کی شہرت سنکر فوج میں داخل ہوئی۔ اور پھر اسی ملک میں رہ پڑی۔ انہیں میں سے محمد بن بختیار خلجی کا خاندان تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کا خاندان معززین کے طبقہ میں شمار کیا جانے لگا[8]۔

نام و نسب محمد نام، اختیار الدین خطاب، باپ کا نام بختیار، خاندان خلج سے تعلق رکھتا، اور یہی پہلا آدمی ہے جس نے ہندوستان کی تاریخ میں خاندان خلج کا نام روشن کیا۔ غزنہ پر جب زوال آیا تو یہ لوگ غوریوں کی فوج میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ شہاب الدین غوری رائے پتھورا کی جنگ میں جب زخمی ہو کر گرنے لگا ہے تو ایک خلجی ہی تھا جو گھوڑے پر بٹھا کے میدان جنگ سے نکال لایا[9]۔

---

[1] تاریخ آل سلجوق مطبوعہ مصر ابتدا۔ [2] کشف اللغات قلمی و لغات سعیدی کانپور۔ [3] فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۰ حیدرآباد [4] کتاب مذکور صفحہ ۹۰ [5] طبقات اکبری جلد اول صفحہ ۱۱۶ کلکتہ۔ [6] کتاب مذکور صفحہ ۲۶ جلد اول کلکتہ۔ [9] طبقات ناصری صفحہ ۱۱۹ کلکتہ۔

محمد بن بختیار خلجی کے خاندان کے لوگ بھی پہلے ہی سے غزنہ اور ہندوستان آ چکے تھے۔ چنانچہ بختیار خلجی کا چچا محمد بن محمود غزنہ میں رہ کر پھر ہندوستان آیا، علی ناگوری کے ماتحت پہلے کمشنر ہوا، پھر اس کے انتقال کر جانے پر قنوج کا گورنر ہو گیا[۱]

تعلیم اور ملازمت

محمد بن بختیار کے ابتدائی حالات کسی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گذرے، لیکن خاندانی دستور اور رواج کے بموجب اس نے فوجی تعلیم کما حقہٗ حاصل کی جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

جب جوان ہوا تو اپنے خاندان کے قدم بہ قدم چل کر سلطان معز الدین (شہاب الدین غوری) کے عہد میں غزنہ پہنچا اور سرکاری ملازمت کا خواہاں ہوا۔ مگر دیوانی محکمہ کے اہل کاروں کی نظر میں کچھ جچا نہیں، اسلئے مایوس ہو کر اس کو ہندوستان کا رخ کرنا پڑا۔ لیکن بدقسمتی نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ چنانچہ تقریباً سنہ ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں جب وہ دہلی آیا اور محکمہ دیوانی میں درخواست دی تو یہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

آخر دہلی سے بدایوں پہنچا اور سپہ سالار ہزبر الدین حسن کی خدمت میں حاضر ہوا، جو اس وقت بدایوں کے صوبہ دار تھے، انہوں نے اس کو اپنے یہاں ملازموں میں شامل کر لیا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس جگہ سے خوش نہ تھا، اور موقع کی تاک میں رہا۔ کیونکہ جیسے ہی اودھ میں اس کو کچھ امید بندھی کہ فوراً وہاں روانہ ہو گیا۔

اودھ میں اس وقت سلطان شہاب الدین کا ایک مشہور امیر ملک حسام الدین اغلبک تھا، جو فتح بنارس کے بعد اودھ کا گورنر مقرر ہوا تھا اور بنارس ہی میں رہتا تھا۔ اور تنخواہ کے معاوضہ میں امیر کو دوآب (گنگا جمنا) کے درمیان کے کئی پرگنے دئے گئے تھے[۲]۔ محمد بختیار اس کے پاس حاضر ہو کر ملازم ہو گیا اور جب دو چار موقعوں پر اس نے اپنی بہادری کا نمونہ دکھایا تو امیر نے خوش ہو کر "کنیلہ اور پٹیالی" اس کے سپرد کئے، لیکن طبقات ناصری میں اس کے بجائے "سہلت اور سہلی" لکھا ہے، ممکن ہے کہ دونوں ایک ہی ہوں، یہ واقعہ غالباً سنہ ۵۹۰ھ (۱۱۹۴ء) کا ہے۔

محمد بن بختیار فطری بہادر تھا۔ اس کے بدن کی ساخت بھی ایسی تھی کہ لوگ دیکھ کر مرعوب ہو جاتے، ایک عجیب بات اس میں یہ تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ اس قدر لمبے تھے کہ جب چھوڑ دیتا تو زانو سے آگے بڑھ جاتے، اس سے وہ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ فائدہ اٹھاتا تھا۔

محمد بختیار کو اپنے اس جدید عہدے کے ذریعہ جب فارغ البالی حاصل ہوئی تو اس نے اپنی حالت کو بہت اچھی طرح درست کرنے کی بڑی کوشش کی اور جب قدرے اس کو اطمینان ہو گیا تو تھوڑے سواروں کا دستہ لیکر بہار اور منیر پر اکثر دھاوا کیا کرتا اور مال غنیمت لیکر واپس آیا کرتا۔ اس طرح جب اس کی شہرت دور دور ہوئی تو ہندوستان کے اطراف سے تمام خلجی دوڑ پڑے اور اس کے ارد گرد جمع ہو گئے، غور اور غزنہ کے لوگ بھی اس کی فوج میں بھرتی ہونے لگے، اب یہ بڑی شان سے زندگی بسر کرتا، اس نے آس پاس کے تمام سرکشوں کو زیر کیا۔ بہار اور منیر پر بھی حملہ جاری رکھا۔

جب اس کی بہادری اولوالعزمی اور سخاوت کا شہرہ سلطان قطب الدین کے کانوں تک پہنچا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے ایک خلعت اور علم شاہی بھیج کر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ اس سے اس کی ہمت بہت بڑھ گئی اور اب اس نے بہار اور منیر کو مستقل طور پر فتح کرنے کا ارادہ کیا۔

بہار

بہار دراصل وِہار (ویہار) ہے، یہ سنسکرت لفظ ہے جس کے اصلی معنی "کھیل کود" کے ہیں۔ پھر اس جگہ کو کہنے لگے جہاں سادھو عبادت الٰہی میں مصروف ہو کر خوش و خرم رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس کے معنی میں وسعت ہوتی گئی، اور مٹھ (خانقاہ) کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ اور آخر میں دارالعلوم (یونیورسٹی) کے معنی ہو گئے[۳]

اس سے اس قدر واضح ہو گیا کہ بہار (وہار) کسی ملک یا شہر کا نام نہ تھا، بلکہ ہر اس مقام پر جہاں ایسے کام ہوتے ہیں اس کو بہار (وہار) کہنے لگے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس عہد میں بہار کس مقام کو کہتے تھے؟

پانچویں صدی قبل مسیح (... ق م) میں مگدھ کی سلطنت بڑی مضبوط تھی۔ مگدھ دیش کے وسط میں اس کا پایہ تخت "کوساگرپورہ" نامی عمارت ... میں ایک مضبوط دار گھاس "کوسا" بکثرت ہوتی تھی اسلئے اس کا نام کوساگرپورہ ہو گیا، اس کے چاروں طرف پہاڑ تھے، صرف مغرب کی ... راستہ پہاڑ کاٹ کر شہر کے اندر جانے کے لئے بنایا گیا تھا[۴]

---

[۱] ... صفحہ ۱۴۶ کلکتہ۔ [۲] فرشتہ جلد چہارم صفحہ ۴۵۶ حیدر آباد [۳] سنسکرت انگلش ڈکشنری مصنفہ سر ایم۔ مونیر ولیمس۔ [۴] سفرنامہ ہیونگ شیانگ صفحہ ... لاہور

راج گرٹھ یا راجگیر

مگدھ کے راجوں میں ایک طاقتور حکمران بم بسار (بعضوں نے بم بیسر لکھا ہے) تھا۔ اس کی راج دھانی یہی کوسا گر پورہ تھی، اس کے عہد میں اس کی آبادی بڑھ گئی تھی، اس لیے شہر میں بار بار آگ لگ جاتی۔ آخر راجہ نے حکم دیا کہ آیندہ جس گھر میں آگ لگے اس کو جنگل میں آباد کیا جائے۔ اس حکم کے جاری ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد خود راجہ کے محل میں آگ لگ گئی، اس نے شاہی حکم برقرار رکھنے کے خیال سے شہر چھوڑ کر جنگل میں خود قیام کیا۔

جب یہ خبر ویسالی کے راجہ کو ہوئی تو اس نے خاموشی کے ساتھ اس کو گرفتار کر لینا چاہا۔ اتفاقاً اس کی خبر یہاں کے سپاہیوں کو ہو گئی۔ جنھوں نے راجہ کو اطلاع دی۔ راجہ نے اس جنگل کے گرد ایک زبردست فوجی پہرہ بٹھا دیا، پھر آہستہ آہستہ اس کی آبادی بڑھتی گئی اور اس کا نام "راج گرٹھ" پڑ گیا، جس کو آجکل راجگیر کہتے ہیں۔

جب راجہ مر گیا تو اس کے لڑکے "اجات شترو" نے راج گرٹھی کو راجدھانی بنایا۔ اس کے بعد راج اشوک نے پٹالی پتر (پاٹلی پتر) میں راجدھانی تبدیل کر دی[1] جس کو آج کل پٹنہ کہتے ہیں۔ اس سے پہلے یہاں کسم پورہ نام شہر تھا۔ اسی کے کھنڈر پر پاٹلی پتر آباد ہوا[2]

پایہ تخت تبدیل کرنے کے بعد اشوک نے راج گرٹھ میں برہمنوں کو آباد کرایا۔ ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں جب ہوشنگ شیانگ چینی سیاح آیا ہے تو اس میں ایک ہزار برہمن خاندان آباد تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ "اگرچہ اس کی شہر پناہ اس وقت برباد کر دی گئی ہے لیکن شہر کے اندر اب بھی عالیشان عمارتیں ہیں"[3]

نالندہ

راجگیر سے کچھ فاصلہ پر اتر طرف ایک "امر باغ" تھا، جہاں ایک تالاب میں ناگ رہتا، اسی کا نام "نالندہ" تھا۔ غالباً اس جگہ ناگ قوم کی بستی ہوگی۔ اس قوم کے سردار کا مکان اور باغ ہوگا۔ کیونکہ میرے محدود علم کے مطابق لفظ نالندہ کوئی غیر ملکی (اردو فارسی عربی، ترکی، انگریزی وغیرہ) لفظ نہیں ہے، اور کہا جاتا ہے کہ سنسکرت بھی نہیں ہے، اس سے گمان ہوتا ہے کہ غالباً ناگ ہی قوم کی زبان کا یہ لفظ ہے۔ (وفوق ذی کل علم علیم)

پھر اس لفظ نے آہستہ آہستہ وسعت اختیار کی یعنی ذاتی نام سے تالاب کا نام ہوا، پھر تالاب سے مکان کا، اور مکان سے گاؤں کا نام پڑ گیا (جس طرح سومنات کا لفظ کہ لنگ سے مندر اور مندر سے شہر کا نام ہو گیا) چونکہ بودھوں کی خانقاہیں بھی وہیں بنتی تھیں اسلیئے ان خانقاہوں کو بھی نالندہ کہنے لگے، اور ان خانقاہوں (مٹھ) میں تعلیمی سلسلہ چونکہ اعلیٰ پیمانہ پر تھا اسلیئے نالندہ کے لفظ میں اعلیٰ تعلیم کا خیال مفہوم ہونے لگا۔ جیسے آج علی گڑھ اور دیوبند میں سمجھا جاتا ہے۔ چینی سیاح کے بیان کے مطابق سنہ ... میں اس کی بنیاد رکھی گئی اور آہستہ آہستہ اس عرصہ میں ترقی کرکے ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو گئی۔

مذکورہ بالا حالات کے بعد چینی سیاح کا مندرجہ ذیل بیان بھی پیش نظر رکھیں جو مگدھ ہو کر جنوب کی طرف سفر کر رہا تھا، تاکہ بہار کی صحیح پوزیشن آپ کو معلوم ہو جائے۔

> "اس کے بعد ایک مسافت طے کرکے مگدھ دیس میں پہنچا جہاں لوگ ذی علم، نیک اور راستباز ہوتے ہیں۔ پھر وہاں سے پٹالی پتر (پٹنہ) آیا۔ اس وقت یہ شہر ویران ہے۔ شہر کے چار دیواریاں، کھنڈر، اور مندر باقی رہ گئے ہیں۔ اس کے جنوب میں ایک خانقاہ ہے جسے اشوک نے بنایا تھا۔ اس خانقاہ کے جنوب میں ایک ستون ہے جس پر اشوک نے جشن خیراتی کا حال لکھا ہے۔ اس کے جنوب مشرق میں رام دیپ ہے، اس میں ایک ہزار پوجاری رہتے تھے، اس سے آگے "تلاوک" کی خانقاہ ہے جہاں مذہبی کتب خانہ اور پجاری تھے، اس سے آگے نالندہ کا مندر ہے" (اس کا یہاں پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور مخزن شریعت سلابھدر نے اس سے ملاقات کی۔

نالندہ کے امر باغ میں عرصہ تک بدھ رہا۔ اس کے نروان پانے پر وہاں کے راجہ "سکردت" نے ایک خانقاہ بنوادی۔ اس کے بعد اس کے

---

[1] سفرنامہ ہونگ شیانگ صفحہ ۴۷ لاہور۔ [2] سفرنامہ مذکور صفحہ ۵۳
[3] سفرنامہ ہونگ شیانگ صفحہ ۲۵ لاہور

جانشین لڑکے "بدھ گپت" نے روایات ماسبق کو برقرار رکھ کر جنوب کی طرف ایک اور خانقاہ کا اضافہ کیا، پھر اس کے جانشین "تاتھاگاتہ" نے مشرق کی جانب دوسری خانقاہ تعمیر کی۔ اس کے بعد راجہ "بالادت" نے رہبانیت اختیار کرلی اور اپنا محل خانقاہ میں شامل کردیا اس کے لڑکے "وجیر راجہ" نے شمال میں ایک خانقاہ کی بنیاد رکھی۔ یہ ساری خانقاہیں ایک چار دیواری (فصیل) سے محصور ہیں۔

خانقاہوں کے درمیان میں ایک بڑا مدرسہ ہے، جس کے گرد آٹھ بڑے کمرے ہیں۔ خانقاہوں میں بلند مینارے ہیں، اور متعدد تالاب جن میں کنول کے پھول ہیں۔

خانقاہ کے متعلق جو مکانات ہیں ان میں پجاری رہتے ہیں، دس ہزار کے قریب پوجاری (طلبہ) دینیات کی تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہیں۔ یہاں ایک سو استاد (پروفیسر) ہیں اور چانسلر سالی بھدر ہے۔ اس کے اخراجات کے لئے ایک سو گاؤں وقف ہیں، اور دو سو خاندان سے روزانہ طلبہ کے لئے چاول اور دودھ وغیرہ آتا ہے۔

غرض اسی طرح سے چینی سیاح نے نالندہ کے شمال اور جنوب اور اس کے اطراف میں بے شمار خانقاہوں، میناروں اور باغوں کا پتہ بتایا ہے، یقین ہے کہ اس یونیورسٹی سے متصل پبلک آبادی بھی ہوگی جہاں تاجر (بنئے) اور کچھ شرفا مستقل طور پر قیام کرتے ہوں گے۔

گردش ایام سے بدھ سلطنت کے اختتام پر اس کا زوال شروع ہوا۔ اور آہستہ آہستہ ویران ہوتا گیا، یہاں تک کہ محمد بن بختیار کی آمد کے وقت بہار کی آبادی تو ترقی پا گئی تھی اور نالندہ کا دارالعلوم چار دیواری میں محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ نالندہ کی چار دیواری سے جو آبادی باہر تھی وہ آج بہار (قصبہ) کے نام سے موسوم ہے، جو آہستہ آہستہ جنوب جانب ترقی کرکے بڑا شہر بن گیا تھا۔ دراصل محمد خلجی کا حملہ اسی پر ہوا تھا۔

فتح بہار

محمد خلجی تقریباً آٹھ برس تک اس عہدہ پر اودھ میں رہا، اس درمیان میں اس نے کافی طور پر فوجی تیاری کرلی، اور جب اس کو اطمینان ہوگیا کہ اس فوج سے باقاعدہ جنگ کی جاسکتی ہے تو ایک فوج لیکر بہار کی طرف بڑھا۔ ۵۹۹ھ میں وہ نالندہ (بہار) پہنچ گیا، چونکہ وہ کئی سال تک بہار اور منیر پر غارت گری کر رہا تھا اسلئے اس کی آمد کی خبر سنتے ہی بہار کی عام آبادی خوفزدہ ہوکر نالندہ میں پناہ گزین ہوئی، ٹھیک اسی طرح جیسے محمد فاتح کے قسطنطنیہ فتح کرتے وقت تمام عیسائی آبادی سینٹ آیا صوفیا میں جمع ہوگئی تھی نالندہ چاروں طرف مضبوط فصیل سے گھرا ہوا تھا، اس وقت اس میں عوام، سپاہی، پروفیسر اور طلبہ سب ہی بھرے تھے، محمد خلجی صرف دو سو سپاہی (سوار) لیکر یلغار کرتا ہوا بہار آیا اور انہیں سواروں سے نالندہ کی فصیل پر حملہ کردیا۔

اس جنگ سے بیالیس برس بعد (سنہ ۶۴۱ھ میں) قاضی منہاج کی ملاقات دو فرغانی بھائیوں سے ایک صمصام الدین نامی کے ساتھ لکھنوتی (بنگال) میں ہوئی جو اس جنگ میں شریک تھا۔ اس کا بیان ہے کہ "محمد بختیار اپنی قوت اور بہادری کے سبب اس قلعہ کے دروازہ کے سامنے کود پڑا، اور بزور قلعہ فتح کر ڈالا، لوٹ کا مال بہت حاصل کیا"

پھر لکھتا ہے:-

کتب خانہ

"اس مقام میں زیادہ تر باشندے برہمن (بودھ بھکشو) تھے، جن کے سر منڈے ہوئے تھے۔ اور یہ سب مارے گئے۔ یہاں ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، جب ان کتابوں پر مسلمانوں کی نظر پڑی تو بہت سے لوگوں کو بلا کر ان سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ کس قسم کی کتابیں ہیں۔ لیکن (افسوس) کہ کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ کیونکہ تمام اہل علم مارے جاچکے تھے (اور عوام پالی یا سنسکرت سے جن میں یہ کتابیں تھیں ناواقف تھے) بعد کو معلوم ہوا کہ اس فصیل کے اندر یعنی نالندہ اور شہر (باہر کی آبادی) کل کا تعلق مدرسہ سے تھا، اور بہار (وہار) ہندی زبان میں مدرسہ کو کہتے ہیں"[1]

چونکہ یہ کتابیں مسلمانوں کے کام کی نہ تھیں، اسلئے اغلب یہ ہے کہ وہیں چھوڑ دی گئیں۔ اور بعد کو برہمنوں اور بودھوں نے وہاں سے منتقل کرلیا ہو

فتح بہار کی مسرت میں دہلی میں عام دربار، اور بختیار کی سرفرازی

۵۹۹ھ میں قطب الدین کالنجر، کالپی، فتح کرکے بدایوں میں مقیم تھا۔ خلجی نے اس موقعہ کو غنیمت جانا۔ اور فتح بہار کے بعد مال غنیمت کے ساتھ وہ قطب الدین سے ملنے کے لئے بہار سے روانہ ہوا قطب الدین بدایوں سے دہلی جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ محمد خلجی اُس کے دربار میں حاضر ہوا۔ بیش قیمت تحفے، ہر قسم کے جواہرات نذر کئے۔ اور پھر سلطان قطب الدین کے ساتھ وہ دہلی چلا گیا۔[2]

[1] طبقات ناصری صفحہ ۱۴۷ کلکتہ۔ [2] فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۳۴ حیدرآباد۔

دہلی پہنچکر قطب الدین نے ایک دربار کیا اس میں محمد خلجی کی فتوحات کی داد دل کھول کر دی، خلعت اور انعامات سے سرفراز فرماکر تمام ہمعصروں میں سر بلند کیا۔

حاسدوں کی کینہ پروری

درباریوں میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی، اُنہوں نے اس سے حقارت آمیز برتاؤ شروع کر دیا جس کو اس نے نہایت فراخدلی سے برداشت کیا، لیکن اس سے ان کی تسکین نہ ہوئی۔ اور اب اس کی جان لینے کے درپے ہوئے۔ مگر بظاہر کوئی ایسا حیلہ نظر نہ آیا جس سے اُن کی امید پوری ہو، اس لئے ایک ایسی تدبیر سوچی کہ ذاتی نقصان کے بغیر اس کی موت یقینی ہو۔ روضۃ الصفا میں ہے کہ

حاسدوں نے سلطان قطب الدین سے کہا کہ محمد خلجی فیل مست سے مقابلہ کا مدعی ہے، سلطان نے ہلاکت کے خوف سے پہلے تو انکار کر دیا لیکن لوگوں کے اصرار کرنے پر آخر راضی ہو گیا۔

سفید فیل مست سے مقابلہ

چنانچہ ایک دن قطب الدین دہلی میں دربار آراستہ کرکے بیٹھا، خاص و عام باریاب ہو رہے تھے۔ کہ ایک سفید فیل مست لوگ لائے اور عرض کیا کہ تمام ہندوستان میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ سلطان نے محمد بختیار سے کہا کہ اگر مقابلہ کی ہمت ہو تو اس کے سامنے جاؤ؛ اس سے قبل محمد بختیار خلجی کو اس سازش کی مطلق اطلاع نہ تھی، اسلئے سلطان کے ارشاد پر غیرتِ شجاعت سے انکار نہ کر سکا، اگرچہ دل میں سمجھا کہ دشمنوں نے اس کی ہلاکت کا سامان مہیا کیا ہے۔ اس نے ایک گرز ہاتھ میں لیا، اور ہاتھی کے مقابلہ آکر کھڑا ہوا۔ خلجی نے ہاتھی کے دونوں دانتوں کے درمیان سونڈ پر اس زور سے گرز مارا کہ دانت کی جڑوں پر سخت ضرب آئی۔ اس نے دوبارہ مارنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ہاتھی گھبرا کر بھاگا؛ اور سارا دربار انگشت بدندان رہ گیا۔

سلطان بہت خوش ہوا، اس نے خود بھی بہت انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا اور امرا کو بھی بخشش کا حکم صادر کیا۔ جس کی تعمیل تمام امرا نے کی[1] قاضی منہاج کا بیان ہے کہ سب نے مل کر اس قدر مال و دولت عطا کی کہ تحریر سے باہر ہے، لیکن جس طرح ظاہر جسم سے وہ بہادر تھا، اسی طرح دل کا بڑا، اور ہمت کا بلند، چنانچہ جس قدر انعام و اکرام اس کو ملا، کُل کا کُل لوگوں کو بخش دئے۔ اور صرف سلطان کا خاص خلعت لیکر دربار سے خالی ہاتھ نکل آیا[2]

فتح بنگال

محمد بن بختیار سے سلطان قطب الدین اس قدر خوش ہوا کہ فتح بنگال کا اس کو حکم دیا، اور فتح کے بعد وہاں کی حکومت بھی اسی کے سپرد کی گئی، چنانچہ دربار دہلی سے رخصت ہو کر وہ بہار پہنچا اور فوجی انتظام میں مشغول ہو گیا۔ اس درمیان میں اس کی بہادری کی شہرت دور دور پہنچی۔ بنگالہ، کامروپ (آسام) کے حکمران اس کی بہادری اور پیش قدمی کا حال سُن سُن کر لرز رہے تھے، اس وقت بنگال کا پایۂ تخت نودیہ (ندیا) تھا اور راجہ کا نام "لکھمنیہ" اس کی عمر اسی سال کی تھی۔ اور یوم ولادت سے تاج شاہی اس کے سر پر تھا۔

اس کے متعلق ایک دلچسپ کہانی قاضی منہاج نے لکھنوتی (بنگال) میں معتبر بزرگوں سے سُنی ہے، کہتے ہیں کہ راجہ کا باپ مر گیا اور یہ شکم مادر میں تھا، لوگوں نے ماں کے شکم پر تاج رکھ دیا۔ اور تا ولادت اس کی ماں حکمران رہی، جب ولادت کا وقت قریب آیا اور برہمن منجم سے شگون نیک کا وقت دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ اس وقت اگر ولادت ہوئی تو بڑا منحوس لڑکا ہوگا، لیکن دو گھڑی بعد کی ولادت البتہ باسعادت ہوگی۔ اور اسّی برس حکومت کریگا۔ مادر مہربان نے یہ سُنکر حکم دیا کہ مجھے سرنگوں کرکے دونوں پاؤں اوپر باندھ دیئے جائیں۔ حکم کی تعمیل کی گئی اور منجم ساعت نیک کے منتظر رہے، اُن کے خیال کے بموجب جیسے ہی نیک ساعت آئی کہ دونوں پاؤں کھول کر نیچے کر دیئے گئے۔ اسی ساعت لکھمنیہ (اصل لفظ لکشمن سِنہا) پیدا ہوا، لیکن اسی نیک ساعت میں اس کی مادر مہربان ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو گئی۔

قاضی منہاج لکھتے ہیں کہ میں نے معتبر لوگوں سے سُنا کہ اس نے اسّی برس حکومت کی، اور عمر بھر کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا۔ اور جب کبھی

---

[1] روضۃ الصفا قلمی کتبخانہ بہاودیالہ احمد آباد۔ [2] طبقات ناصری صفحہ ۱۴۶ کلکتہ۔

کسی نے دست سوال دراز کیا تو ایک لاکھ سے کم نہیں دیتا تھا، واضح رہے کہ بنگالہ میں جیتل (پیسہ) کے بجائے کوڑی کا رواج تھا۔ [1]

غرض جب محمد بختیار کی شجاعت اور پیش قدمی کا حال راجہ کے درباریوں اور امرا کو معلوم ہوا تو یہ لوگ خوفزدہ ہوگئے، اور راجہ کو لیکر کسی اور جگہ ٹل جانے کی یہ تدبیر نکالی کہ منجموں اور برہمنوں کو دربار میں پیش کیا، اور انہوں نے عرض کیا کہ ہمارے یہاں کتابوں میں ایسی پیشین گوئی لکھی ہے کہ یہ سلطنت ترکوں کے پاس چلی جائے گی، چنانچہ بہار تک فتح کر چکے ہیں اور اگلے سال بنگالہ پر حملہ ہوگا۔ اسلئے بہتر یہ ہوگا کہ راجہ تمام اراکین دولت کے ساتھ کسی دوسری جگہ چلا جائے۔

راجہ نے دریافت کیا کہ جو شخص ہمارے ملک پر قابض ہوگا اس کی کوئی علامت ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! اُس کے دونوں ہاتھ اس قدر لمبے ہوں گے کہ زانو سے نیچے تک پہنچ جائیں گے، راجہ نے کہا کہ بہتر ہے کہ معتبر جاسوس بھیجکر پہلے تحقیقات کرائیں۔ چنانچہ ان معتمد جاسوسوں نے واپسی کے بعد جب حقیقت حال سے آگاہ کیا تو اکثر برہمنوں نے ترک وطن کرکے جگن ناتھ کی راہ لی، اور دیگر امرا مشرقی بنگال اور آسام کی طرف چلے گئے۔

محمد بن بختیار نے دہلی سے واپس آکر پہلے فتح بہار کی تکمیل کی اور پھر باقاعدہ فوج کا انتظام کرکے بنگالہ فتح کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ چنانچہ سنہ ۶۰۰ھ میں پوری تیاری کے ساتھ بنگالہ کی طرف بڑھا، وہ خوب جانتا تھا کہ حریف کو اگر خبر لگ گئی تو راجپوتوں کا سخت مقابلہ کرنا پڑیگا۔ اسلئے خاموشی اور بڑی تیزی سے روانہ ہوکر پایہ تخت نودیہ پہنچ گیا۔

شہر کے دروازہ پر جب آیا تو اس کے ساتھ صرف اٹھارہ سوار تھے، اس نے اس قدر خاموشی اور اطمینان قلب کے ساتھ راستہ طے کیا تھا کہ کسی کو وہم وگمان بھی نہ ہوا کہ یہ کوئی فوجی جماعت ہے اور فاتح بہار محمد خلجی اس میں موجود ہے، بلکہ لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید یہ لوگ گھوڑے کے تاجر ہیں اور اسی لئے جب یہ لوگ شہر کے دروازہ پر پہنچے تو دربانوں نے کوئی روک ٹوک نہ کی، اور خلجی نے بھی کسی کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ دی۔ جب قصر شاہی کے پھاٹک پر پہنچا تو اچانک اس نے تلوار نکالی اور قتل عام شروع کردیا، تمام محل اور شہر میں ترکوں کی آمد کا شور مچ گیا۔ اس وقت راجہ لکشمن کھانا کھانے میں مصروف تھا، اچانک اس شور و غل سے گھبرا گیا، ترکوں کی آمد اور قصر میں محمد بختیار کی موجودگی کا حال معلوم ہونے سے اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ بجز راہ فرار اختیار کرنے کے کوئی چارہ اس کو نظر نہ آیا۔ چنانچہ ننگے سر اور بغیر جوتے کے گھر کے پیچھے کھڑکی سے کود کر بھاگا، پہلے اڑیسہ، پھر جگن ناتھ میں جاکر پناہ لی، اور کچھ عرصہ کے بعد اسی جگہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔ لیکن اس کی اولاد قاضی منہاج (سنہ ۶۴۱ھ) کے زمانہ تک بنگالہ کے بعض اضلاع میں حکومت کرتی تھی۔ [2]

غرض محمد خلجی قصر شاہی پر قبضہ کرنے میں مصروف ہی تھا کہ عقب سے اس کی فوج بھی آپہنچی، پھر تو چند گھنٹوں ہی میں سارا شہر قابو میں آگیا، تمام خزانہ، محلات کی عورتیں، خدم، حشم، اور جنگی ہاتھی سب اس کے قبضہ میں آگئے۔ اور وہ اسی جگہ مقیم ہوگیا لیکن اس نے اس شہر کو لوٹ کر بالکل تباہ کردیا اور ایک دوسرے شہر کی بنیاد رکھی جسکو آج لکھنوتی کہتے ہیں، اس نے اسی کو اپنا پایہ تخت بناکر آس پاس فوجی کاروائی شروع کردی، چنانچہ تھوڑی مدت میں جاج نگر (اڑیسہ) لوکوٹ اور بارسوئی فتح کرکے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔ [3]

لیکن فرشتہ لکھتا ہے کہ اس جدید پایہ تخت کا نام "رنگ پورہ" رکھا، اس میں مسجدیں، خانقاہیں اور مدارس بنائے اور اسلامی احکام رائج کیے، مال غنیمت میں سے انتخاب کرکے بہترین مال سلطان قطب الدین کے پاس روانہ کیے۔

فتح آسام و تبت

تقریباً دو سال اس نے اس ملک کے انتظام میں صرف کیے اور اس ضمن میں اپنے ہمسایہ ملکوں کے حالات سے آگاہی حاصل کرتا رہا۔ جب فوجی انتظام مکمل ہوگیا تو سنہ ۶۰۲ھ میں دس بارہ ہزار سوار لیکر روانہ ہوا۔ ان اطراف میں تین قسم کے لوگ آباد تھے، ایک کا نام کوچ "دوسرے کو میچ" اور تیسرے کو تھارو" کہتے تھے، گو ان کے نام الگ الگ تھے، لیکن شکل وصورت اور شباہت سے سب ترکی النسل معلوم ہوتے، ان کی زبان بھی اپنی تھی۔ اور ہندوستانی اور تبتی سے الگ۔

میچ خاندان کا رئیس علی نامی محمد بن بختیار کی ہدایت سے مسلمان ہوگیا تھا، اس نے فوج کی راہبری قبول کرلی۔ اور فوج کو ایک ایسے شہر

---

[1] طبقات ناصری صفحہ ۱۴۹ کلکتہ۔ [2] طبقات ناصری صفحہ ۱۵۱ کلکتہ۔ [3] فرشتہ جلد چہارم صفحہ ۶۶۰ حیدرآباد

کے قریب لاکھڑا کر دیا جس کا نام "سردمن کوٹ" تھا، اور اس کو برہمن گڈھ بھی کہتے تھے۔ [1]

ایسا بیان کیا جاتا ہے کہ گرشاسپ شاہ ایران چین سے واپسی کے وقت اس راستہ سے گذرا، اور اس شہر کو آباد کرتا ہوا چلا گیا۔ اسی کے ساتھ دریا بھی تھا جس کا نام "بنگ متی" ہے۔ یہی آگے چل کر سمندر میں مل جاتا ہے۔ (غالباً یہ برہم پتر ہوگا) اس کا پاٹ گنگا سے تگنا زیادہ ہے جب فوج اس کے کنارے پہنچی تو اس کو عبور کرنا مشکل نظر آیا۔ اسلئے علی میچ لشکر کو دس روز تک اوپر ہی اوپر لیتا چلا گیا، پہاڑوں اور دروں سے نکال کر ایک پل کے سامنے لے آیا جو پتھر کے ۲۹ کمانوں پر بنا ہوا تھا۔ محمد بن بختیار کی پوری فوج اس پل کے ذریعہ پار ہوگئی اور حفاظت کے خیال سے دو امیر ایک خلجی اور دوسرا ترک چھوڑ دئے۔ [2]

راجہ کامروپ (آسام) کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو ایک سفیر بھیجکر اطاعت قبول کی، مگر ساتھ ہی اس نے یہ مشورہ دیا کہ اس سنگلاخ زمین کا فتح کرنا ذرا مشکل کام ہے، اسلئے اس سال آپ واپس جائیں اور سال آئندہ پوری تیاری کے ساتھ آئیں۔ میں بھی اس معاملہ میں پوری مدد دیکر تبت کا ملک فتح کرادوں گا، لیکن خلجی نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا اور آگے روانہ ہوگیا۔ [3]

قاضی منہاج کا بیان ہے کہ سنہ ۶۴۱ھ میں ایک شب لکھنوتی میں معتمد الدولہ مقبل کے یہاں جو گھاٹیوں کو طے کرتے ہوئے سولہویں دن تبت کے مسطح زمین پر پہنچے، وہ ملک شہروں اور گاؤں سے آباد تھا۔ سب سے پہلے ایک ایسی جگہ پہنچے، جہاں ایک مضبوط قلعہ بنا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے اس پاس کو لوٹنا شروع کر دیا، مجبوراً قلعہ والے بھی مدافعت کے لئے تیار ہوگئے۔ صبح سے عصر تک دونوں میں سخت خون ریز جنگ ہوئی، جس میں بڑی تعداد مسلمانوں کی شہید اور زخمی ہوئی۔

ایک دلچسپ بات قابل ذکر یہ ہے کہ ان کے تمام اسلحے نرکل کے تھے، مثلاً جوشن جول اسپ، نیزہ، سپر، خود وغیرہ جو ریشم سے بندھے اور گندھے ہوئے تھے، وہ اعلیٰ درجہ کے تیر انداز بھی تھے، ان کی کمانیں بڑی لمبی لمبی تھیں جس کے سبب سے فاصلہ تک تیر اندازی کر سکتے تھے،

شام کے وقت جب قیدی افسر کے سامنے پیش ہوئے اور حالات دریافت کئے گئے تو معلوم ہوا کہ یہاں سے پانچ فرسنگ (۱۵ کوس) کے فاصلہ پر ایک بڑا شہر کرم پٹن نامی ہے [4] جہاں تین لاکھ پچاس ہزار تیر انداز ترک ہیں [5] جیسے ہی کہ مسلمان اس سرزمین پر وارد ہوئے، ایک قاصد وہاں بھیجدیا گیا، اور کل صبح تک سواروں کی مدد یہاں آجائے گی۔ چونکہ اول ہی روز مسلمان بکثرت شہید اور زخمی ہوئے اور اب کمکی فوج کا حال بھی معلوم ہوا، اور ادھر مسلمانوں کو پیچھے سے کسی امداد کی بھی توقع نہ تھی اسلئے سالار فوج نے اپنے امراء سے مشورہ کیا، سب کی متفقہ رائے یہ ہوئی کہ اس وقت واپس ہوجانا ہی بہتر ہے اور آئندہ سال بڑی تیاری کے بعد واپس آنا چاہئے۔ چنانچہ اس رات کو یہ لوگ واپس ہوگئے۔

کرم پٹن

قاضی منہاج لکھتے ہیں کہ جب میں لکھنوتی میں تھا تو اس شہر کی نسبت میں نے پوری تحقیقات کی، معلوم ہوا کہ کرم پٹن ایک بڑا شہر ہے، جس کی فصیل ایک پتھر سے تراش کر بنائی گئی ہے، برہمن اور تونی قوم کی کثیر آبادی ہے۔ انہیں میں سے ایک شخص کی سرداری میں بہ آرام زندگی بسر کرتے ہیں۔ آتش پرستی ان کا مذہب ہے۔ شہر اس قدر بڑا ہے کہ اس کے بازار میں روزانہ ۱½ ہزار گھوڑے فروخت ہو جاتے ہیں۔

لکھنوتی کے بازار میں زین کسے ہوئے گھوڑے جو نظر آتے ہیں وہ اسی جگہ سے آتے ہیں۔ یہاں سے لکھنوتی آتے ہوئے بہت سے درّے راستہ میں ملتے ہیں۔ اور عام طور پر یہی راستہ زیادہ مشہور ہے۔ چنانچہ کامروپ سے تبت جاتے وقت ۳۵ درّے ملتے ہیں۔ اور پھر وہاں سے لکھنوتی لاتے ہیں۔ [6]

---

[1] ریاض السلاطین صفحہ ۶۵ ـ [2] طبقات اکبری جلد اول صفحہ ۹۳ کلکتہ ـ [3] فرشتہ جلد چہارم صفحہ ۶۶۱

[4] فرشتہ میں اس شہر کا نام کرسین اور طبقات اکبری میں کرم سین لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں میں کتابت کی غلطی ہے ـ [5] لیکن فرشتہ اور طبقات اکبری میں صرف پچاس ہزار سوار لکھا ہے جو غالباً زیادہ صحیح ہے۔ یہ فوجی لوگ ہونگے اور وہ شہر کی آبادی ہوگی۔ [6] طبقات ناصری صفحہ ۱۵۲ ـ

واپسی بنگال

محمد بختیار خلجی جب وہاں سے واپس ہوا تو تمام راہ پریشان حال رہا۔ تبتی لوگوں نے تمام مقامات میں آگ لگا کر ویران کر ڈالا تھا، اور کل آبادی خالی پڑی تھی۔ پندرہ دن کے اندر ایک سیر غلہ اور جانوروں کے کھانے کے لئے ایک پتہ بھی نصیب نہ ہوا۔ مجبوراً گھوڑوں کے گوشت پر گزارہ کر کے سب لوگ کامروپ پہنچے، لیکن جب اس پختہ پل پر آئے تو اس کو شکستہ پا کر بے حد مایوس ہوئے۔ بات یہ ہوئی کہ دونوں سردار ترک اور خلجی جن کے ذمہ پل کی حفاظت تھی دونوں آپس میں متحد نہ رہ سکے اور ایک دوسرے سے لڑ کر چلے گئے۔ چونکہ ان دونوں امیروں سے کامروپ والوں کو سخت تکلیف پہنچی تھی، اسلئے عداوت سے انہوں نے پل کی دو کمانیں توڑ ڈالیں۔ [۱]

جب محمد خلجی نے یہ حال دیکھا تو امراء سے مشورہ کر کے یہ رائے قایم کی کہ پل تیار ہونے تک کسی محفوظ مقام میں قیام کا بندوبست کیا جائے، جاسوسوں کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ قریب ہی ایک بڑا سنگین مندر ہے جہاں آرام سے رہ سکتے ہیں اور اس میں سونے چاندی کے بت بھی بکثرت ہیں۔ جس میں سے ایک بڑا بت دو تین ہزار مثقال سونے کا ہے۔ محمد خلجی اور اس کے تمام لشکر نے اسی بت خانہ (مندر) میں پناہ لی، لکڑی اور رسی وغیرہ کا انتظام کرنے لگا۔ لیکن کامروپ کے لوگ ان دونوں سرداروں کی بدعنوانیوں سے جلے بیٹھے تھے، جیسے ہی کہ راجہ کو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا لشکر تباہ حال مندر میں مقیم ہے اسے انتہائی رنج ہوا۔ اس نے فوجوں کو حملہ کا فوراً حکم دیا۔ رعایا بھی سابقہ ظلم اور مندر کے قبضہ سے راجہ کے ساتھ ہو گئی یہانتک کہ سب مندر کے پاس جمع ہو گئے۔ راجہ نے کہا کہ میدانی جنگ میں ہماری فوج غیر تعلیم یافتہ ہے۔ اسلئے بہتر ہے کہ مندر کا محاصرہ کر لو تاکہ بھوکے پیاسے خود ہی فنا ہو جائیں۔

چنانچہ نرکلوں کو مندر کے چاروں طرف گاڑ کر اور ایک دوسرے کو رسی سے باندھ کر ایک دیوار کی شکل بنا دی۔ اسلامی فوج نے جب یہ حال دیکھا تو بہت گھبرائے آخر سب کے مشورے سے یکبارگی ایک طرف زوردار حملہ کر کے باہر نکل آئے۔ اور دریا کنارے پہنچے [۲] آسامی بھی اُن کا تعاقب کرتے ہوئے نزدیک آ گئے، اب آگے پانی اور پیچھے دشمن، لوگ پار اترنے کے سامان کی فکر کر رہے تھے کہ اچانک ایک سوار نے گھوڑا دریا میں ڈال دیا، وہ تھوڑی دُور تک گیا تو پایاب نظر آیا، مایوسی کا وقت تھا، تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ تمام لشکر میں خوشی کی لہر بجلی کیطرح دوڑی، اور ہر شخص نے گھوڑا دریا میں ڈال دیا، جب کچھ دُور نکل گئے تو حقیقت کھلی، اب سامنے دریائے مواج اور پیچھے آسامیوں کی فوج، غرض ساحل تک پہنچتے پہنچتے فوج کا بڑا حصہ غرق بحر فنا ہوا اور بہ مشکل تمام دو تین سو سپاہیوں کے ساتھ محمد بن بختیار خلجی دریا پار ہوا۔ [۳]

علالت اور وفات

خشکی میں جب کچھ دُور چلے تو کوچ اور میچ قوم کو اطلاع ہوئی، علی میچ اپنے حدود ریاست میں جن جن رشتہ داروں کو حفاظتِ راہ کے لئے چھوڑ گیا تھا، سب استقبال کے لئے آئے، اور ہر طرح سے اُن کی خدمت کی، جب محمد خلجی دیوکوٹ آیا تو ناکامی اور کلفت راہ کی کوفت سے سخت بیمار ہو گیا، تلف شدہ سپاہیوں کی بیوی، بچوں کی شرم سے سوار ہو کر باہر نہ نکلتا تھا، اور کسی وقت اگر نکلا تو کوٹھوں پر سے سر بازار عورتیں اُسے گالیاں دیتی تھیں۔ اسی علالت کے زمانہ میں اکثر محمد خلجی کہا کرتا تھا کہ حضرت سلطان معز الدین محمد شہاب الدین غوری کے ساتھ کوئی واقعہ ہوا، اسی لئے ہماری قسمت پھر گئی۔ اور واقعہ بھی یہی تھا کہ انہیں دنوں وہ پنجاب میں گکھروں کے ہاتھ سے سنہ ۶۰۲ھ میں شہید کیا گیا تھا۔

محمد بن بختیار خلجی انتہائی غم و غصہ کے سبب مرض دق میں مبتلا ہو گیا، اور اس کی حالت دن پر دن گرتی گئی۔ یہانتک کہ سنہ ۶۰۲ھ میں صاحب فراش ہو کر عالم بقا کے طرف کوچ کر گیا، [۴]

قاضی منہاج کہتے ہیں کہ بعض لوگوں نے بیان کیا کہ علی مردان خلجی ایک امیر تھا جس کو ایک ضلع کا حاکم بنایا تھا۔ جب محمد خلجی کی حالت اس کو معلوم ہوئی تو فوراً دیوکوٹ پہنچا، اس وقت محمد خلجی کی حالت بہت نازک ہو چکی تھی، اور تین دن سے باریاب ہونے کا کسی کو موقعہ نہیں ملا تھا، علی مردان نے کسی طرح سے اندر داخل ہو کر اسکی چہرہ سے چادر اٹھائی اور چھرے سے اس کا کام تمام کر دیا۔ [۵] — محمد خلجی کی لاش بعد وفات دیوکوٹ سے بہار لائی گئی اور اسی جگہ سپرد خاک ہوئی، بس یہ ایسا قیاس ہوتا ہے کہ غالباً اس کے قریبی رشتہ دار اور خاندانی لوگ بہار ہی میں مقیم تھے اسی لئے اس کی لاش یہاں لائی گئی۔ [۶]

بہار میں اس کی قبر کہاں ہے صحیح طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن میرے خیال میں یا تو اسکی قبر نالندہ کے پاس ہونی چاہیئے کہ اصل شہر اسی طرف تھا، یا موجودہ کانگری کے پاس جو پہاڑی ہے اور شہر کے قریب ہی اس پر ایک گنبد ہیں ہیں، انہیں میں سے ایک بختیار خلجی کی ہے کیونکہ فوجی آبادی ہمیشہ شہر سے دُور رہتی تھی اور جنگی نقطہ نگاہ سے یہ مقام فوج کیلئے بالکل موزوں ہے اور ہو سکتا ہے کہ اسکی قبر بختیار پور کے متعلق مشہور ہے کہ اسی کا آباد کیا ہوا ہے جو بہار سے تقریباً بیس کوس پر شمال جانب آباد ہے — بہر حال بقیہ سے صاحبان بہار سے درخواست کرتا ہوں کہ اس فاتح بہار کی قبر ضرور تلاش کریں۔ اور فتح بہار کی سالانہ یادگار منائیں۔

[illegible]

عمدۃ الملک نواب داؤد خاں قریشی

(صوبہ دارِ بہار سنہ ۱۰۶۹ھ - سنہ ۱۰۷۴ھ)
(۱۶۶۰ء - ۱۶۶۵ء)

از جناب سید رضا قاسم صاحب مختار

گماں مبر کہ تو چوں بگذری جہاں بگذشت ہزار شمع بکشتند و انجمن باقیست

صوبہ بہار کی تاریخ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس صوبہ میں جس طرح ضلع پٹنہ (عظیم آباد) اپنے خاص اعزاز و احترام کے باعث مشہور ہے، اسی طرح ضلع گیا بھی خاص تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور دنیا کے پرانے مذہب بودھ مت کے بانی کا مرکز ہے، نیز آب و ہوا و قدرتی مناظر کے لحاظ سے بھی یہ ضلع بہت سی خوبیاں اپنے دامن میں لئے ہے، مواقع سیر و شکار و کوہستانی سلسلوں سے تو اس کی خوشنمائیاں اور بھی دوچند ہو گئی ہیں۔ چنانچہ ضلع گیا میں جہاں اور دوسرے مقامات اپنی تاریخی و جغرافیائی عظمت رکھتے ہیں وہاں قصبہ **داؤد نگر** بھی اپنی آبادی، تجارتی کاروبار، آب و ہوا، اور اپنی تاریخی اہمیت میں ایک خاص امتیازی شان رکھتا ہے، اس کو **نواب داود خاں قریشی** نے سنہ ۱۰۷۲ھ میں آباد کیا تھا۔

یہ قصبہ شہر گیا سے تقریباً پچاس میل دور مغربی سمت اورنگ آباد سب ڈویزن (تحصیل) میں دریائے سون کے مشرقی کنارہ پر واقع ہے۔ جس کے کنارے ریت اور سرپت کے جنگل از دکھن دور تک پھیلے ہوئے ہیں جس میں وحشی جانور سانبھر، نیل، ہرن اور جنگلی سور وغیرہ بکثرت پائے جاتے ہیں، قصبہ داؤد نگر ریلوے لائن سے تقریباً چودہ میل کی دوری پر جانب شمال واقع ہے، اور ای۔ آئی۔ آر کی جو لائن مغل سرائے سے گیا کو جاتی ہے اس پر سون ایسٹ بنک (باروں) اور اس کے بعد کا مشرقی اسٹیشن یا مرگنج، یہ دونوں ریلوے اسٹیشن داؤد نگر جانے کے لئے تقریباً کم و بیش مسافت رکھتے ہیں، لیکن یا مرگنج اسٹیشن سے داؤد نگر تک گیا ڈسٹرکٹ بورڈ کی پختہ سڑک ہے جس پر موٹر لاریاں آیا جایا کرتی ہیں۔

داؤد خاں قریشی کون تھا؟ کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا، کس طرح یہاں آیا اور کیونکر قصبہ داؤد نگر آباد کیا؟؟ گرچہ اس کی ذمہ داری صوبہ بہار کی تاریخ لکھنے والوں پر تھی لیکن ہمارے صوبہ بہار کی جہاں اور بدنصیبیاں ہیں وہاں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس صوبہ کے سیکڑوں مشاہیر سلف کو زمانے کی ناسازگاری و کجروی نے قعر گمنامی میں ڈال دیا ہے لیکن یہ لائق اطمینان ہے کہ بعض ان میں سے ایسے ہیں جن کے حالات متعدد پرانی کتب تاریخ میں جابجا تھوڑے بہت مل جاتے ہیں، جنہیں اگر تھوڑی سی کاوش و دیدہ ریزی کے ساتھ یکجا کیا جائے تو یقیناً اُن کے پورے پورے حالات پر کافی روشنی ڈالی جا سکتی ہے، مگر افسوس کہ صوبہ بہار کی تاریخ مرتب کرنے والوں نے اس کاوش کو گوارہ نہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے صوبۂ بہار کی نئی مطبوعہ تاریخیں[1] عمدۃ الملک نواب داؤد قریشی جیسی نامور و ذی وقار شخصیت کے ذکر سے خالی ہیں۔ اسلئے ناچیز راقم نے مناسب جانا کہ اس مرتبہ ندیم کے بہار نمبر میں داؤد خاں پر کچھ پیش کرے۔ چنانچہ مختلف کتابوں[2] کی ورق گردانی سے جس قدر بھی معلومات نواب موصوف کے خاندان و حالات کی حاصل ہو سکیں اُنہیں یکجا منضبط کر کے سطور ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتا ہے۔

---

[1] یعنی مطبوعہ تواریخ صوبہ بہار تصنیفات حضرت شاد عظیم آبادی علیہ الرحمۃ و جناب اولاد حیدر صاحب فوق بلگرامی مدظلہ العالی۔

[2] ماخذ کے متعلق یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عالمگیر نامہ قلمی نسخہ، مراۃ العالم قلمی نسخہ، دلکشا قلمی نسخہ، دستور العمل قلمی نسخہ، ماثر الامرا قلمی و مطبوعہ ہر دو نسخات، ماثر عالمگیری، تاریخ داؤدیہ، سیر المتاخرین و نیز مراۃ السلاطین (اردو ترجمہ سیر المتاخرین مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۳۱۴ھ ۱۸۹۷ء) وغیرہ کے علاوہ بعض انگریزی کتب مثلاً اسٹڈ ان مغل انڈیا، ہسٹری آف اورنگ زیب تصنیفات سر جادو ناتھ سرکار، اور پلاموں گزیٹر وغیرہ کی ورق گردانی کر کے یہ مضمون مدون و مرتب کیا گیا ہے۔

نسب اور خاندان نواب داؤد خاں قریشی کا سلسلۂ نسب حضرت علی مرتضیٰ کی زوجۂ ثانیہ جناب لبابہ سے جو پسر اکبر حضرت عباس تھے انہیں تک منتہی ہوتا ہے۔ جناب عباس کے دو فرزند عبداللہ اور افضل تھے۔ عبداللہ سے حسن، ان سے عبداللہ (جو اپنے دادا کے نام پر موسوم ہوئے، اور جن کی اولاد کثیر بلاد و امصار عالم میں پھیلی) از انجملہ ابراہیم بن طاہر اُن سے یحییٰ اُن سے احمد، ان سے محمد، ان سے زکی، ان سے تقی، اُن سے صلاح الدین، ان سے وجیہہ الدین، ان سے نجیب الدین، اُن سے بدر الدین، اُن سے عبداللہ، اُن سے وجیہہ اللہ، اُن سے محمد رمضان، ان سے محمد رضی ہوئے۔

جب محمد رضی مذکور کو تنگیٔ معاش نے بہت پریشان کیا تو وہ معہ اہل و عیال سنہ ۹۲۹ھ (۱۵۲۲ء) میں مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے کابل چلے آئے۔ کابل میں یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شاہ ظہیر الدین محمد بابر تسخیر لاہور کی تیاریاں کر رہا تھا۔ چنانچہ محمد رضی مذکور معہ اپنے دسوں فرزندوں[1] کے شاہ مذکور کے دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے ان کا کمال اعزاز و احترام کیا اور ان کو اپنے ہمراہ لے کر لاہور روانہ ہو گیا، اور صرف محمد رضی مذکور معہ مستورات کابل میں رہ گئے۔ کچھ دنوں بعد جب کہ لاہور میں معرکۂ جنگ درپیش تھا محمد رضی کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کا سارا کنبہ کابل سے لاہور چلا آیا اور جب ظہیر الدین محمد بابر کو تسخیر لاہور سے فراغت حاصل ہوئی اور وہ کابل واپس جانے لگا تو محمد رضی مرحوم کے فرزندوں نے کابل جانا پسند نہ کیا، اور وہ کل بھائی معہ اپنے کنبے کے عازم دہلی ہوئے۔ دہلی میں اُس وقت ابراہیم لودی برسرِ حکومت تھا، اُس نے ان میں سے نو بھائیوں کو فوجی خدمت سپرد کی اور محمد راضی پسرِ پنجم محمد رضی مرحوم کو جو فضل و ہنر میں کمال رکھتے تھے، اُن کے علم و فضل کا احترام کرتے ہوئے عہدۂ قضا تفویض فرمایا۔

سنہ ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) میں جب ظہیر الدین محمد بابر تسخیر دہلی کو آیا تو ابراہیم لودی بھی مقابلہ کو نکلا، اس مہم میں محمد راضی کے بقیہ کل بھائی اس کے ہمراہ جنگ کے لئے پانی پت روانہ ہو گئے، اور ادھر ابراہیم لودی کی غیر موجودگی میں چند پر آشوب عہدہ داران شاہی نے بعداوت باطنی موقع غنیمت پا کر ایک شخص کو محمد راضی کی توہین کے لئے آمادہ کیا۔ چنانچہ وہ شخص ایک روز محکمۂ قضا میں آیا اور بھرے اجلاس میں محمد راضی کے روبرو ان کی شان میں نا ملایم کلمات زبان پر لایا، ہر چند انہوں نے منع کیا مگر مانتا تو درکنار بلکہ اس کی گستاخیاں و بیہودگیاں حد سے اتنی زیادہ بڑھ چلیں کہ محمد راضی کے ضبط و برداشت سے باہر ہو گئیں اور انہوں نے مجبور ہو کر اُس شخص کو قتل کر ڈالا۔

اس واقعہ سے ایک فساد رونما ہوا۔ اور محمد راضی نے باوجودیکہ اُس فتنے کو فرو کرنے کی بلیغ کوششیں کیں لیکن جب انہیں اپنی کوششیں کارگر ہوتی نظر نہ پڑیں تو وہ نویں ماہ رجب المرجب سنہ ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) کو معہ عورتوں اور اثاث البیت کے پوشیدہ طور پر **حصار فیروزہ** روانہ ہو گئے۔ جب وہ حصار فیروزہ پہنچے تو انہیں اپنے بھائیوں و نیز ابراہیم لودی کے قتل ہو جانے کی خبر ملی۔ چنانچہ اس حادثۂ جانکاہ کی خبر پانے کے بعد دنیائے دوں کو زشت و زبون سمجھ کر وہ تارک جاہ و حشم ہو گئے۔ ذات خداوندی پر بھروسہ کر کے توکل پر کمر باندھ لی اور حصار فیروزہ ہی میں توطن اختیار کر لیا، اور کچھ دنوں بعد لاہور جا کر شاہ یوسف قتال[2] قدس سرہٗ سے مرید ہو آئے، جنہوں نے ان کو **راضی خاں** کا خطاب عطا کیا۔ اور اُسی زمانے سے بجائے محمد راضی کے وہ راضی خاں کے نام سے مشہور ہو گئے۔ (تاریخ داؤدیہ مرتبہ سید محمد ناصر بلگرامی مرحوم)

تاریخ داؤدیہ (مرتبہ سید محمد ناصر بلگرامی مرحوم) کی روایت بغیر کسی حوالے کے ہے کہ محمد راضی الملقب بہ راضی خاں کے سات فرزند ہوئے، منجملہ ان کے ایک اُن میں سے فرید خاں تھے جن کے بیٹے کبیر خاں تھے۔ کبیر خاں کی دو شادیاں ہوئیں۔ محل اولیٰ سے تین فرزند بھیکن خاں، داؤد خاں اور محمد خاں تھے، اور محل ثانیہ سے صفی خاں[3] ہوئے۔ مگر مآثر الامرا (جلد دوم مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سنہ ۱۸۹۰ء صفحہ ۳۲ و ۳۳) کی مندرجہ ذیل عبارت

"داؤد خاں قریشی پسر بھیکن خان است۔ از شیخ زادہ ہائی حصار فیروزہ کہ نوکر عمدہ و معتبر خانجہان لودی بود۔۔۔۔۔"

سے ظاہر ہوتا ہے کہ داؤد خان کے باپ کا نام کبیر خاں نہیں بلکہ بھیکن خاں تھا، مگر کتاب دستور العمل قلمی نسخہ (۱۴۳ / ۱۷ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ) صفحہ ۶ باب فہرست ناظمان صوبہ الہ آباد کی مندرجہ ذیل عبارت

"در سنہ ۱۴ جلوس داؤد خاں ولد خضر خاں کہ صوبہ داری برہان پور معزول شدہ آمدہ بود از تغیر میر خاں شش ہزاری۔۔۔۔۔"

---

[1] محمد کاظم، محمد صابر، محمد واسع، محمد شاکر، محمد راضی، محمد عالم، محمد تقی، محمد نقی، محمد جواد، اور محمد ذکی۔ (تاریخ داؤدیہ)

[2] شاہ صاحب موصوف قاضی جلال الدین لاہوری قدس سرہٗ کے مرید و جانشین تھے اور آپ کی خانقاہ لاہور میں ہفت پلہ کے نام سے مشہور تھی۔ (تاریخ داؤدیہ)

[3] صفی خاں کے دو لڑکے مرتضیٰ خاں اور اللہ داد خاں تھے جن کے مزارات قصبہ داؤد نگر کے جنوبی گوشہ پر ہنوز موجود ہیں۔

سے باپ کا نام خضر خاں ظاہر ہوتا ہے - خلاصہ یہ کہ ان کتب تواریخ کے مختلف البیان روایات کی بناپر نواب داؤد خاں کے والد کے اسم گرامی کا متیقن طریق پر پتا چلانا مشکل ہے - لیکن دیگر تصریحات سے پتہ چلتا ہے جیساکہ آگے آئیگاکہ داؤد خاں کے ایک بھائی کا نام بھی بھیکن خاں تھا - اس لیئے قیاس غالب یہ ہوتا ہے کہ باپ کا نام خضر خاں ہی تھا - یا نگیر خاں یا بھیکن خاں -

پیدائش و ابتدائی زندگی | داؤد خاں ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر **بمقام حصار فیروزہ** پیدا ہوا تھا[1] - اور اس نے اپنی زندگی کی ابتدا خانجہان لودی کی ملازمت میں کی تھی اور پہلی جنگ[2] میں وہ شریک ہوا - وہ دھولپورہ میں شاہی فوج اور خانجہان کے درمیان واقع ہوئی اور خانجہاں کے مرنے کے بعد وہ داراشکوہ کی ملازمت میں داخل ہو گیا -

داراشکوہ کی ملازمت | شاہجہان کے سنہ ۲۴ جلوس میں متھرا، مہابن، جلیسر، اور دیگر محالات جو داراشکوہ کو سعد اللہ کے مرنے کے بعد جاگیر میں دیئے گئے تھے، داؤد خاں اُن کا فوجدار مقرر ہوا، اس کے علاوہ آگرہ اور دہلی کے درمیان دو ہزار سواروں کے ساتھ اس کو راہ داری کی خدمت بھی سپرد کی گئی تھی، اور اسی سال داراشکوہ کی سفارش پر اس کو خان کا خطاب عطا ہوا تھا[3] - لیکن تاریخ داؤدیہ (مرتبہ سید محمد ناصر بلگرامی مرحوم مطبوعہ مطبع آئینی الہ آباد) میں نواب داؤد خاں قریشی کی نسبت داراشکوہ کی ملازمت کے متعلق اس طرح مذکور ہے کہ

> " نواب داؤد خاں قریشی اپنے بڑے بھائی بھیکن خاں کے مقتول ہوجانے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی محمد خاں کو ساتھ لیکر یکے از عمایدِ شاہی اعظم خاں کی سرکار میں رہا کرتا تھا، یہاں تک کہ ایک روز سلطان شہاب الدین شاہجہاں نے دربار عام میں فرمایا کہ اگر بھیکن خاں کے بھائیوں میں سے کوئی اُس کے وطن میں ہو تو طلب کیا جائے، حاضرین دربار نے عرض کی کہ خان مرحوم کے دو بھائی داؤد خان اور محمد خاں اعظم خاں کے ہمراہ ہیں - چنانچہ فوراً فرمان شاہی بنام اعظم خاں بطلب ان دونوں بھائیوں کے جاری ہوا - اعظم خاں نے دونوں بھائیوں کو باعزاز تمام روانہ کیا اور جب یہ دونوں بھائی دربار شاہی میں پہنچے تو شاہجہاں نے خوش ہو کر فرمایا " **آفتاب اقبال ما بدولت در ہفت اقلیم تاباں و درخشاں شد** " اس عرصہ میں داراشکوہ نے عرض کی کہ یہ دونوں جوانمرد جاں نثار کو مرحمت فرمائے جائیں - چنانچہ شاہجہان نے ان دونوں بھائیوں کو اپنے فرزند اکبر محمد داراشکوہ کے سپرد کر دیا "

سنہ ہجری کی گیارہویں صدی میں جب شہنشاہ محمد شہاب الدین شاہجہان بیمار رہنے لگا - تو اُس کے لڑکوں[4] میں تخت کے وراثت کی نزاع پیدا ہوئی، اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کو مٹا کر تخت لینے کا آرزومند تھا - محی الدین اورنگ زیب گرچہ اس وقت دکن میں تھا، لیکن وہ اس قدر دوراندیش تھا کہ اس کے بقیہ تینوں بھائی نہ تو اس کو کچل سکتے تھے، نہ عقل و تدبیر میں اس کو مات کر سکتے تھے اور اس کے موجود رہتے ہوئے نہ کوئی دوسرا اس پر سبقت لے جا سکتا تھا، چنانچہ جوں ہی اورنگ زیب کو معتبر ذرایع سے یہ خبر ملی کہ شہنشاہ اس قدر بیمار ہیں کہ سلطنت کے کاموں کو بذات خود دیکھ نہیں سکتے ہیں اور داراشکوہ کے بالکل ہی اختیار میں ہیں، اور در اصل داراشکوہ شاہجہاں کے نام سے حکومت کر رہا ہے، تو وہ فوراً پوری تیاریوں کے ساتھ دربار شاہی کی جانب روانہ ہوا، راہ میں جو شہر و قلعے ملتے گئے اُن کو لوٹتا، فتح کرتا اور جس قدر خزانے اور سامان جنگ اُن شہروں اور قلعوں میں دستیاب ہوئے وہ سب اپنے ساتھ سمیٹتا چلا -

---

[1] افسوس کہ باوجود تلاش و جستجو داؤد خاں کا سنہ ولادت معلوم نہ ہو سکا،

[2] مآثر الامرا قلمی نسخہ (کتب خانہ مشرقی پٹنہ) صفحات ۱۵۸ و ۱۵۹

[3] ماخوذ از مراۃ السلاطین - ترجمۂ سیر المتاخرین

[4]

(۱)	محمد داراشکوہ	ولادت	سنہ ۱۰۲۴ھ	وفات بذریعہ قتل	سنہ ۱۰۶۹ھ
(۲)	شاہ شجاع	ولادت	سنہ ۱۰۲۵ھ		

(۳) محی الدین اورنگ زیب - ولادت ۱۵ ذیقعدہ سنہ ۱۰۲۷ھ وفات ۲۸ ذیقعد سنہ ۱۱۱۸ھ بعمر اکانوے سال بمقام احمد نگر -

(۴) مراد بخش ولادت ۲۵ ذوالحجہ سنہ ۱۰۳۳ھ بمقام قلعہ روہتاس (بہار) وفات بذریعہ قتل ۲۱ ربیع الاول سنہ ۱۰۷۱ھ

محی الدین اورنگ زیب سے جنگ اس کے بعد دارا شکوہ اور اورنگ زیب میں وہ عظیم الشان فیصلہ کن معرکہ آرائی ہوئی جو ہندوستان کی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے اور جس کی تفصیلات میں ہمیں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس جنگ میں اورنگ زیب کے خلاف داؤد خاں نے بھی دارا شکوہ کی جانب سے حصہ لیا۔ دارا شکوہ نے ۱۶ شعبان المعظم مطابق وسط ماہ مئی سنہ ۱۰۶۸ھ؁ ۱۶۵۸ء؁ کو خلیل اللہ خاں کو ایک دستہ فوج کے ساتھ ہراول کے طور پر روانہ کیا کہ وہ دھولپور کے قریب جاکر ٹھیرے اور دریائے چنبل کی گھاٹیوں کی نگرانی کرے۔ اور خود ۲۵ ماہ مذکور کو مع اپنے چھوٹے بیٹے سپہر شکوہ اور کل فوج (جس میں کئی ممتاز و نامور شاہی جنرل بھی موجود تھے) اور توپخانہ و نیز داؤد خاں اور عسکر خان اپنے ملازمین خاص وغیرہ کے ساتھ روانہ ہوا اور دھولپور سے پانچ منزل ادھر ہی قیام پذیر رہ کر اپنے بڑے لڑکے سلیمان شکوہ کا (جس کے ساتھ ایک بڑا لشکر جرار تھا) انتظار کرتا رہا، اُدھر اورنگ زیب دھولپور کے زمینداروں کی معاونت اور رہنمائی سے رات کے وقت ایسے گھاٹ سے پار اتر آیا جہاں دریا کا پانی زانو سے اونچا نہ تھا، اور خوش قسمتی سے وہاں پر اس وقت دارا شکوہ کے ہراول کا کوئی سپاہی بھی نگرانی کے لئے موجود نہ تھا۔

القصہ جب دارا شکوہ کو اورنگ زیب کے لشکر کے دریا پار ہو جانے کی خبر ملی تو وہ نہایت سراسیمگی اور تیز رفتاری کے ساتھ جنگ کرنے کا عزم بالجزم کر کے دھولپور کو (لشکر فراہم کردہ) روانہ ہوا۔ اور ۵ رمضان المبارک مطابق ۱۶ جون سنہ ۱۰۶۸ھ؁ ۱۶۵۸ء؁ کو موضع راجپورہ میں پہنچکر اپنے لشکر کی ترتیب اور مست ہاتھیوں کی آراستگی میں مصروف ہوا۔ دوسرے دن یعنی ۶ ماہ رمضان المبارک مطابق ۱۷ ماہ جون کو وہ اور آگے بڑھا اور سموگڑھ کے قریب دھلپور کے وسیع میدان میں صف آرا ہوا،

دارا شکوہ نے بھی جب طنطنہ عالمگیری دیکھا تو اپنی فوج کو اس طرح ترتیب دیا کہ اپنا توپخانہ جو باہتمام میر آتش تھا، داہنی طرف کو، اور توپخانہ شاہی جو حسین بیگ خاں کے زیر اہتمام تھا بائیں جانب کو فوج کے آگے مقرر کیا اور امرائے بادشاہی سے راؤ ستر سال ہاڈا کو (جو ہندوستان کے راجپوتوں میں شجاعت، دلاوری اور سپاہگری میں معزز و ممتاز تھا) معہ راجہ روپ سنگھ راٹھور (عمزادہ راجہ جسونت سنگھ) راجہ گردھر (برادر زادہ راجہ بیٹھل داس) کنور گور بھیم (پسر راجہ بیٹھل داس) اور راجہ شیوارام وغیرہ راجپوتان نامی کو ہراول بنایا، اور (اپنے ملازم) نواب داؤد خاں قریشی کو معہ چار ہزار سوار اور عسکر خاں کو تین ہزار پیدل سپاہیوں کے ساتھ اس فوج کا ضمیمہ بنایا۔

الغرض دوپہر کے وقت دونوں لشکر کوہ دو پیکر کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرائے اور بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی تیر و سنان سے گذر کر شمشیر و خنجر تک نوبت پہنچ گئی، دونوں طرف سے ہزاروں تیر چلے اور سینوں کو برماتے ہوئے نکل گئے، طرفین کے سیکڑوں سپاہی زخمی اور ہلاک ہوئے۔ اس کے بعد سپہر شکوہ اور نواب داؤد خاں نے بارہ ہزار سواروں کے ساتھ اورنگ زیب کے توپخانہ پر حملہ کیا اور جدال و قتال کرتے ہوئے آگ برسانے والی صف سے گزر گئے۔ اس مہم میں نواب داؤد خاں نہایت بہادری اور دلیری سے لڑا۔ ہرچند عالمگیری فوج نے بہت کچھ ہاتھ پیر مارے مگر دارا شکوہی انبوہ کی مدافعت نہ ہو سکی اور قریب تھا کہ دارا شکوہی لشکر شہزادہ محمد سلطان کے ہراول پر حملہ کر کے عالمگیری فوج کے قدم اکھاڑ دے کہ میمین کی طرف سے اسلام خاں معہ بہادران بہرالغار کے اٹھ کر جا بھڑا اور شیخ میر بھی معہ فوج التمش کے برابر جا پہنچا، اور ایسی خونریز جنگ ہوئی کہ زمین و آسمان تھرانے لگے۔

دارا شکوہ گرمیٔ جنگ سے محض ناتجربہ کار تھا اور داؤد خاں کی بہادری اور سپہر شکوہ کی دلیری دیکھکر فوراً قول (انبوہ) اور التمش کی فوج لیکر عالمگیری فوج کے ہراول اور توپخانہ کی طرف بڑا اور جوش میں آ کر اپنے ہراول کو زیر کر کے اپنے توپخانے سے بھی آگے جا نکلا اور اپنے مخالف کے توپخانے کے پاس جا پہنچا اور جب اُسے آگے بڑھنے کی راہ نہ ملی تو پھر اپنے دست راست کی فوج کو حائل ہو گیا۔ جس کے باعث طرفین کے ہراول میں آویزش کی نوبت پہونچگئی اور دارا شکوہ کو مجبوراً مراد بخش سے جو مع فوج عالمگیری جرانغار کا سردار تھا دوبرو ہونا پڑا۔ ساتھ ہی خلیل اللہ خاں بھی جو معہ فوج برانغار پر متعین تھا اپنے آقا دارا شکوہ کی مدد پر پہنچکر حملہ آور ہوا اور گروہ ازبکیہ جو اس کے ہمراہ تھے گرم جرأت ہوئے۔ مراد بخش نے بہت کوشش کی اور آخر کو زخمی ہو کر پیچھے ہٹ گیا، یہ دیکھ کر اورنگ زیب نے دارا شکوہ کی طرف اپنے ہاتھی کا رُخ کیا، معًا اس کی فوج و نیز قول خاص (گروہ) نے بھی ادھر توجہ کی، اُس وقت نواب داؤد خان و نیز اُن راجپوتوں نے جنہوں نے مراد بخش کو شکست دی تھی اورنگ زیب کی فوج پر حملہ کیا۔ اورنگ زیب کی جانب کے بھی دلاوران جانفشان نے حق نمک ادا کرنے پر کمر باندھی۔

اس سخت حملے میں اگرچہ ہمراہیان اورنگ زیب نے شجاعت و مردانگی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا مگر داؤد خاں اور دارا شکوہ کے دوسرے افسران نے قیامت برپا کر رکھی تھی، چنانچہ راؤ ستر سال ہاڈا، رام سنگھ راٹھو، کنور بھیم (ولد راجہ بیٹھل داس) راجہ شیورام اور رستم خاں وغیرہ نے قول (انبوہ) عالمگیری تک پہنچکر داد جوانمردی دی اور زخمی ہو کر مارے گئے۔ الغرض جب دارا شکوہ نے دیکھا کہ اس کے سرداران جانباز جن کی پشت پناہی پر وہ باپ تک کا کہنا نہ مانتا تھا ایسے جا چکے تو اس کا پائے ثبات متزلزل ہوا، باوجودیکہ نواب داؤد خاں اور اس کی فوج ہنوز اس کے ہمراہ تھی اور ابھی جنگ کا قطعی فیصلہ بھی نہ ہوا تھا مگر خدا جانے دارا شکوہ کے دل میں کیا بات پیدا ہوئی کہ وہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا، داؤد خاں کی فوج نے جب دارا شکوہ کا یہ اضطرار و اضطراب دیکھا تو اس کی فوج میں گڑبڑی مچ گئی، اس درمیان میں دارا شکوہ کا ترکش دار بھی تیر اجل کا نشانہ ہو گیا، ان حالات نے دارا شکوہ کے قدم اکھاڑ دئے، پھر کیا تھا ہر ایک نے اپنی اپنی راہ پکڑی، سپہر شکوہ بھی بھاگ کر اسی روا روی میں باپ سے جا ملا، اور اورنگ زیب جو ایک آزمودہ کار جنگجو تھا اس نے فتح پائی۔ دارا شکوہ میدان جنگ سے فرار ہو کر آگرہ آیا اور صرف چند گھنٹے قیام کر کے راتوں رات اپنے چند ملازمین اور اہل و عیال کو ساتھ لیکر دہلی پہنچا، داؤد خاں اور دوسرے سردار بعد کو روانہ ہوئے اور جا کر دارا شکوہ سے مل گئے۔[1]

دہلی میں دارا شکوہ نے بہت کم قیام کیا اور جوں ہی اس کو خبر ملی کہ اورنگ زیب اس کے تعاقب میں چلا آ رہا ہے وہ زر نقد، جواہرات اور گرانبہا اسباب جس قدر اس کو مل سکے ساتھ لیتا ہوا پنجاب کی طرف بھاگ نکلا اور چلتے وقت گھبراہٹ میں باپ سے ملاقات تک نہ کر سکا راہ میں داؤد خاں کو ایک دستہ فوج کے ساتھ تالون[2] (TALWAN) میں چھوڑتا گیا کہ وہ اورنگ زیب کی بڑھتی ہوئی فوج کو روک دے اور دریا کے پار نہ ہونے دے تاکہ دارا شکوہ کو لاہور میں کچھ وقت مل جائے اور وہ شاہی خزانہ پر قبضہ کر کے اورنگ زیب سے مقابلے کے لئے ایک بڑی فوج تیار کر سکے، لیکن اورنگ زیب کی فوج جو بڑھتی آ رہی تھی نہیں رک سکی اسلئے کہ بعد کو دارا شکوہ نے داؤد خاں کو لاہور بلا لیا تھا چنانچہ اورنگ زیب کی فوج بلا روک ٹوک دریا کے پار اتر گئی، اور تب داؤد خاں فوج کا ایک دستہ لیکر دریائے بیاس کو روانہ ہوا لیکن وہاں پہنچکر جب اس نے دیکھ بھال کی تو وہ مقام جنگ کے لئے بیکار نظر آیا جس کی اطلاع دارا شکوہ کو دی گئی تو اس کے جواب میں داؤد خاں کو سپہر شکوہ کے ساتھ گوبندوال[3] روانہ ہونے کا فرمان آیا کہ وہاں جا کر وہ غنیم کی فوج کو روک دے۔

داؤد خاں گوبندوال پہنچا، لیکن قبل اس کے کہ اورنگ زیب کی فوج وہاں آئے دارا شکوہ نے اپنے بیٹے سپہر شکوہ کو لاہور بلا لیا اور اس کو اپنے ساتھ لیتا ہوا مع توپخانہ کل سامان جنگ اور گراں بہا اسباب ملتان روانہ ہو گیا، اور داؤد خاں کو حکم دیا گیا کہ وہ دریا کے کنارے کچھ دنوں قیام کرے اور جس قدر کشتیاں نظر آئیں ان کو غرق کرتا ہوا پھر دارا شکوہ سے آ کر مل جائے۔ داؤد خاں نے اپنے آقا کی ہدایتوں پر عمل کیا اور ملتان پہنچکر دارا شکوہ سے مل گیا، لیکن غنیم نے یہاں پر پھر آ لیا اور دارا شکوہ کو مجبوراً بھکر[4] روانہ ہونا پڑا۔ یہاں پہنچکر اوائل ماہ محرم الحرام ۱۰۶۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۶۵۸ء میں داؤد خاں اور دوسرے سپاہی دارا شکوہ سے کٹ کر الگ ہو گئے[5]۔ داؤد خاں جلیسر[6] ہو کر اپنے وطن حصار فیروزہ کو روانہ ہو گیا۔ دارا شکوہ نے کچھ دنوں بھکر میں قیام کیا اور پھر ۲۹ صفر کو دریائے سندھ عبور کر کے گجرات چلا گیا۔

شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب کی ملازمت میں دارا شکوہ کے میدان سے ہٹ جانے کے بعد مغلیہ سلطنت کی درخشندہ سپاہ پھر مجتمع ہوئی۔ نامی گرامی سرداروں کو معافیاں عطا ہوئیں اور وہ رفتہ رفتہ پرچم عالمگیری کے گرد جمع ہونے لگے۔ چنانچہ ۲۷ ربیع الاول مطابق ۲۳ ماہ دسمبر ۱۰۶۹ھ (۱۶۵۹ء) کو داؤد خاں اورنگ زیب کے دربار میں حاضر ہوا، جہاں اس کو ایک قیمتی خلعت، تلوار اور منصب چار ہزاری عطا ہوا۔ اسی تاریخ سے اس

---

[1] اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی جنگ کے حالات کے لئے عالمگیر نامہ قلمی نسخہ صفحات ۸۲ تا ۲۲۰ و مراۃ السلاطین (ترجمہ سیر المتاخرین) جلد اول
[2] یہ مقام موجودہ ضلع جالندھر میں واقع ہے۔
[3] بھکر یہ مقام ضلع میانوالی (پنجاب) کی ایک تحصیل ہے۔
[4] مآثر عالمگیری قلمی نسخہ صفحات ۱۱ تا ۱۶ ۔ [5] یہ مقام جودھپور (راجپوتانہ) میں واقع ہے۔

کی شاہی ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا - اور دربار عالمگیری کے افسران و امراء میں اس کا شمار ہونے لگا۔ [۱]

جنگ کھجوہا میں شرکت KHAJVHA

داؤد خاں ماہ ربیع الآخر مطابق ماہ جنوری ۱۰۶۹ھ / ۱۶۶۰ء میں اورنگ زیب کے ساتھ شاہ شجاع کے خلاف مہم میں شریک ہوا اور نہایت قابلیت و بہادری سے اورنگ زیب کی فوج یسار کی افسری کی اور جنگ کھجوہا میں اپنی ذاتی بہادریوں اور جانبازیوں کا ثبوت دیا - اس جنگ میں شاہ شجاع نے شکست کھائی اور میدان جنگ سے بھاگ نکلا - اورنگ زیب نے ایک جرار فوج اپنے لڑکے شہزادہ محمد سلطان کی ماتحتی میں شاہ شجاع کے تعاقب کے لئے روانہ کی اور نواب داؤد خاں و نیز دوسرے مشہور بہادروں نے اس مہم میں شہزادہ محمد سلطان کا ساتھ دیا۔ اپنی شکست کے بعد شاہ شجاع الہ آباد آیا اور یہاں سے ناخوش ہوکر اس کو بنگال کی طرف میں واپس پلٹ جانا پڑا۔

باب دوسرا

پٹنہ (بہار) کی صوبہ داری

اس کے بعد نواب داؤد خاں کو ایک شاہی فرمان موصول ہوا جس کے رُو سے وہ پٹنہ (بہار) کا صوبہ دار مقرر ہوا - اور اس ملازمت کے اعزاز کے علاوہ مزید ایک ہزار سوار دو اسپہ و سہ اسپہ اس کی ماتحتی میں دیے گئے - چنانچہ وہ فی الفور پٹنہ روانہ ہو گیا۔ [۲]

اس وقت نواب داؤد خاں کا پٹنہ کا صوبہ دار مقرر ہونا بہت بڑی سیاسی مصلحت پر مبنی تھا، اس لئے کہ ملک کی سیاسی حالت یہ تھی کہ اورنگ زیب کی شاہی عالم تزلزل میں تھی اور تھوڑے ہی دنوں پہلے داؤد خاں دوسرے دعویدار تخت یعنی دارا شکوہ کی جانب سے خود اورنگ زیب کے خلاف لڑ چکا تھا اور گرچہ اورنگ زیب کے حریف (دارا شکوہ) کو شکست ہو چکی تھی، لیکن وہ اس وقت تک زندہ تھا، یہ باتیں ہرگز کسی طرح خطرے سے خالی نہ تھیں، ماسوا اس کے ملک کے تقریباً کل صوبوں میں شہزادوں یعنی شاہجہاں کے بیٹوں کی آپس کی جنگ و جدال اور تاج و تخت کو حاصل کرنے کی سعی میں عام شورش اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی، ایسی حالت میں عالمگیری سلطنت کے کل نظم کا درہم برہم ہو جانا لازمی تھا اور مقامی سرداروں اور امراء کا بغاوت کرنا اور اورنگ زیب کی حکومت سے برگشتہ ہو جانا صد درجہ قرین قیاس تھا اور اس پر مزید طرّہ یہ تھا کہ شاہ شجاع صوبے کے اندر اور باہر طرح طرح کے فسادات برپا کرنے میں دن رات مصروف تھا۔

اس لئے اس پر آشوب زمانہ میں صوبہ بہار کی حکمرانی کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو صوبے کے کل حالات سے اچھی طرح واقف ہو اور حکومت و نظم سلطنت کی ذاتی لیاقت رکھتا ہو اور ساتھ ہی ساتھ جنگ آزمودہ اور بہادر ہو تاکہ وہ شاہ شجاع کی بخوبی روک تھام، باغیوں کو سزا اور عام رعایا کو اپنی سیاسی چال اور صلح کن روشن سے رام کرے۔

نواب داؤد خاں قریشی میں یہ کل صلاحیتیں موجود تھیں کیونکہ اس کے پہلے وہ دارا شکوہ کی ملازمت میں صوبہ بہار کے حالات اور یہاں کے باشندوں سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا، اسلئے کہ دارا شکوہ شاہجہاں کے طرح دے جانے سے ملک کے کئی صوبوں کی حکومت اور نظام سلطنت میں دخل اندازی کیا کرتا تھا، علاوہ اس کے نواب داؤد خاں قریشی بذاتِ خود اپنی لیاقت حکومت و نظم سلطنت کا جبکہ وہ فوجدار تھا اور راہداری کی خدمت اس کے سپرد کی گئی تھی، کافی ثبوت دے چکا تھا اور اورنگ زیب اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ شخصی حکومت میں

---

[۱] شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب کی ملازمت کے متعلق مندرجہ بالا چند سطریں عالمگیر نامہ قلمی نسخہ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ صفحات ۲۲۱ تا ۲۳۱ سے ماخوذ ہیں، لیکن تاریخ مراۃ العالم قلمی نسخہ (مملوکہ محترمی سید حسن عسکری پروفیسر شعبہ تاریخ پٹنہ کالج) کے صفحہ ۶۱۱ پر اورنگ زیب کی ملازمت کے ضمن میں یہ مندرج ہے کہ تاریخ ۲۰ ربیع الاول کو نواب داؤد خاں قریشی، امیر خاں سردار کی مساعدت میں آستان بوس عالمگیر ہوا اور اس کو ایک خلعت فاخرہ و نیز باساز مینا چار ہزاری سہ ہزار سوار عطا ہوا۔ ان دونوں قلمی نسخوں میں تاریخ کا اختلاف غالباً ۲۰ و ۲۷ کی کتابت سہو ہیش آگیا صحیح ۲۷ رہی ہے جس کا قطعی فیصلہ عیسوی تاریخ سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ [۲] یہ مقام موجودہ ضلع فتح پور میں واقع ہے۔ [۳] عالمگیر نامہ قلمی نسخہ صفحہ ۲۸۶

افسر حکومت کے چال چلن، روش، چال ڈھال اور اندرونی حالات سے باخبر ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ داؤد خاں بڑی خوبی سے عظیم آباد کی صوبہ داری کے فرائض کو انجام دینے لگا۔

شاہ شجاع سے جنگ اور فتح بنگالہ

۱۰۶۹ھ ۱۶۶۰ء میں شہزادہ محمد سلطان (پسر اورنگ زیب) جو شاہ شجاع کی سرکوبی کیلئے بھیجا گیا تھا (جس کا ذکر جنگ کھجوہ کے ضمن میں گذر چکا ہے) ٹانڈہ[۱] پہنچکر اچانک شاہ شجاع سے مل گیا[۲]۔ جب یہ خبر اورنگ زیب کو ملی تو اس نے نواب داؤد خاں کے نام یہ ضروری فرمان جاری کیا کہ وہ سائر کمکیان و تابعان کو ہمراہ لیکر معظم خاں (میر جملہ) کی مدد کیلئے (جو شاہ شجاع اور شہزادہ محمد سلطان کا تعاقب کر رہا تھا) فوراً پٹنہ سے روانہ ہو۔ چنانچہ اس فرمان کو پاکر نواب داؤد خاں اپنے بھتیجے شیخ محمد حیات کو ڈیڑھ ہزار سوار اور دو ہزار پیدل سپاہیوں کے ساتھ پٹنہ میں اپنا قائم مقام چھوڑکر فوراً دریائے گنگ کے پار اتر گیا اور جس قدر کمک و امدادی فوج مل سکی ساتھ لیتا گیا لیکن برسات شروع ہو چکی تھی اسوقت سفر کرنا نہایت دشوار تھا اور شدت بارش سے دریائے کوسی میں طغیانی کے باعث اطراف وجوانب کی کل سرزمین زیر آب ہو گئی تھی اور بغیر کشتیوں کے فوج کا لے جانا ممکن نہ تھا اس لئے داؤد خاں بھاگلپور کے قریب موضع قاضی کریہ[۳] میں ٹھہر گیا، لیکن شاہ شجاع نے دریا پار ہو کر اکبر نگر اور راج محل پر قبضہ کر لیا تو داؤد خاں بھی جرأت ذاتی سے استصواب کرکے گنگا کے اس پار اتر آیا اور بھاگلپور اور کہل گاؤں کے درمیان کچھ دنوں پڑاؤ ڈالے رہا اور جب دریا اتر آیا تو معظم خاں (میر جملہ) اور شاہ شجاع میں بڑے معرکے کی لڑائی ہوئی جس میں شاہ شجاع ہار کر مرشد آباد کی جانب روانہ ہوا اس عرصے میں داؤد خاں پھر گنگا سے پار اتر کر شمال کی جانب بڑھا اور شاہ شجاع نے دریائے کوسی کے کنارے جو مورچال (ڈمس) بنا رکھی تھی اس کو توڑ ڈالا اور محافظین کے سردار کو مار ڈالا[۴]۔

جب یہ خبر شاہ شجاع کو ملی تو اس نے مرشد آباد جانے کا ارادہ فسخ کرکے دوبارہ جنگ کے ارادہ سے ایک ایسے نالے کے قریب قیام کیا جس کے تین طرف دلدل تھا اور توپخانہ لگا کر خود مع فوج و سوار اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اسی روز معظم خاں بھی (جو شاہ شجاع کے تعاقب میں چلا آرہا تھا) اس مقام پر پہنچا اور نیز حسن اتفاق سے دن گزر کر رات کو اسی روز داؤد خاں بھی مع اپنی فوج کے معظم خاں (میر جملہ) کی فوج سے جا ملا۔ تین روز تک جنگ رہی آخر روز شام کو شاہ شجاع پسپا ہو کر پیچھے بھاگنے لگا اور داؤد خاں و معظم خاں اس کے تعاقب میں آگے بڑھتے گئے اور اس طرح تعاقب ہی کی حالت میں رفتہ رفتہ مالدہ اور بنگال کے دوسرے مقامات کو داؤد خاں دخل کرتا گیا اور شاہ شجاع نے

---

[۱] یہ مقام موجودہ ضلع فیض آباد (اجودھیا) میں ہے [۲] شاہزادہ محمد سلطان کے شاہ شجاع سے مل جانے کے متعلق صاحب سیر المتاخرین کا بیان ہے کہ جبکہ اورنگزیب داراشکوہ کا پنجاب کے علاقہ میں تعاقب کر رہا تھا اور محمد سلطان شاہجہاں آباد (دہلی) میں رہکر انتظام و انصرام کی نگہداشت کر رہا تھا تو اسوقت شاہ شجاع نے موقعہ غنیمت پاکر پوشیدہ مراسلات کے ذریعہ شہزادہ محمد سلطان سے اپنی لڑکی کو بیاہ دینے کا قول و قرار کر لیا تھا۔ اورنگزیب جب مراجعت فرمائے دہلی ہوا اور اسکو شاہ شجاع کی نسبت اپنے خلاف فوج کشی کی خبر ملی تو اس نے شہزادہ محمد سلطان کو ایک دستہ فوج کے ساتھ اسکی سرکوبی کے لئے روانہ کیا، شاہ شجاع نے شہزادہ محمد سلطان کی آمد کی خبر سے خوش ہو کر اپنے چھوٹے بیٹے بلند اختر کو جان بیگ کے ہمراہ اس کے استقبال کیلئے بھیجا اور اپنی لڑکی کے نکاح کا سامان شہزادہ محمد سلطان کے ساتھ ٹانڈہ میں کیا اور اپنے ملازم سراج الدین میر علاء الدولہ دیوان اور محمد باقر میر سامان وغیرہ کو حکم دیا کہ شادی کا انصرام کریں تاکہ بعد نکاح شہزادہ محمد سلطان کو خوشنودی اور ما بدولت کو دلجمعی حاصل ہو (مراۃ السلاطین ترجمہ سیر المتاخرین مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ماہ جون سنہ ۱۸۹۸ء مطابق ماہ صفر سنہ ۱۳۱۶ھ جلد اول صفحات ۴۰۵ و ۴۰۶ -

[۳] مذکورہ بالا حالات عالمگیر نامہ قلمی نسخہ صفحہ ۵۱۳ و سیر المتاخرین قلمی نسخہ صفحہ ۳۲۷ سے ماخوذ ہیں لیکن یہاں پر بطور تعلیق تاریخ مراۃ العالم قلمی نسخہ (مملوکہ محترمی سید حسن عسکری پروفیسر تاریخ پٹنہ) صفحہ ۴۶۶ کی عبارت بھی نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتی ہے "داؤد خاں صوبہ دار بہار بموجب فرمان واجب الاذعان شیخ محمد حیات برادر زادہ را باجمعی بنیابت خود در پٹنہ گذاشتہ خود با رشید خاں و مرزا خاں و ہادی داد خاں و سائر کمکیان صوبہ بہار غرۂ مبارک رمضان از گنگ گذشت ... ..." [۴] مراۃ السلاطین مذکور جلد اول صفحہ ۴۰۵ [۵] مراۃ السلاطین (ترجمہ سیر المتاخرین) مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۸ء جلد اول صفحات ۳۹۶ تا ۳۹۰۔ و عالمگیر نامہ قلمی نسخہ صفحات ۵۱۳ تا ۶۶۰ اور سیر المتاخرین قلمی نسخہ صفحات ۳۲۷ تا ۳۳۰۔

جب اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھی تو آخرکار وہ اراکان بھاگ گیا۔

داؤد خاں قریشی چونکہ اس جنگ میں ہر حملہ کے ساتھ مل کر برابر لڑتا رہا۔ اور اس مہم میں اُس نے اپنی بہادریوں اور دلیریوں کی بدولت بہت کچھ وثوق حاصل کر لیا تھا اس لئے اس جنگ کے فتح ہو جانے کے بعد شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب نے اسکو اپنے دربار شاہی میں طلب فرما کر سات پارچے کا خلعت، ایک زنجیر فیل، ایک مرصع جمدھر (کٹار) و نیز نواب کے معزز خطاب سے سرفراز فرمایا۔

تسخیر پلاموں اور سلطنت مغلیہ سے اس کا الحاق

نواب داؤد خاں قریشی جتنے دنوں (یعنی سنہ ۱۰۶۹ھ ۱۶۶۰ء لغایت سنہ ۱۰۷۴ھ ۱۶۶۵ء) پٹنہ (بہار) کا صوبہ دار رہا اتنی مدت میں سب سے بڑا کام جو اُس نے کیا وہ علاقہ پلاموں کی تسخیر اور اس کا سلطنت مغلیہ سے ملحق کرنا تھا اور اس مہم میں یہ بات خوب اچھی طرح ثابت ہوگئی کہ وہ بہت بڑا جنگجو، جانباز، زود تجویز اور ایک قابل حکمراں تھا۔

کسی زمانہ میں پلاموں کا علاقہ رکسل راجپوتوں کے زیر اثر تھا لیکن سنہ ۱۶۰۳ء عیسوی میں چیرو قوم کے سردار بھگونت رائے نے اپنی قوم کی مدد سے رکسل راجپوتوں کو نکال کر اس علاقے کو خود اپنے زیر نگیں کر لیا۔ اسوقت سے سنہ ۱۶۶۱ء تک چیرو قوم اس علاقے میں آزادانہ حکومت کرتی رہی۔[1] چنانچہ راقم السطور تسخیر پلاموں کے ضمن میں جس زمانے کا ذکر کرنا چاہتا ہے اُس زمانے میں پلاموں کا علاقہ موجودہ ضلع پلاموں سے وسعت میں بہت بڑا تھا اور پٹنہ سے اسی میل جنوب اسکی شمالی حد قرار دی جاتی تھی۔ یہ پورا علاقہ پہاڑیوں اور گھنے جنگلوں سے معمور تھا اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے سب سے زیادہ جو قوم یہاں آباد تھی اس کا نام چیرو تھا جن کا سردار راجا میدنی رائے نامی سنہ ۱۶۶۹ء سے نہایت زور شور کے ساتھ فرماں روائی کر رہا تھا اور اپنے علاقہ کو گیا سے لے کر ہزاری باغ اور ریاست سرگوجا (سی پی) تک بڑھا لیا تھا۔ اپنے علاقے میں اس نے متعدد قلعے بنوائے تھے تا آنکہ نواب داؤد خاں قریشی صوبہ دار پٹنہ (بہار) نے شہنشاہ اورنگ زیب کے حکم سے سنہ ۱۶۶۱ء میں فوج کشی کر کے دوسرے سال یعنی سنہ ۱۶۶۲ء میں اس علاقے کو سلطنت مغلیہ کے زیر اثر کر لیا (جس کا مفصل ذکر آگے آئے گا) اور پھر سنہ ۱۸۱۷ء سے یہ علاقہ گورنمنٹ برطانیہ کے قبضہ و دخل میں آگیا۔[2]

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے چیرو قوم بالکل خود سر اور اپنے علاقے کی تنہا مالک و مختار تھی۔ شاہی حکام انکی نظروں میں کوئی وقعت نہ رکھتے تھے اور چونکہ یہ لوگ قلعہ بند رہا کرتے تھے جہاں کسی کا پہنچنا نہایت دشوار تھا اسلئے وہ شاہی علاقوں میں دلیرانہ لوٹ مار کیا کرتے تھے۔

اول اول شاہجہاں کے زمانۂ حکومت میں شائستہ خاں جو اُس وقت پٹنہ کا صوبہ دار تھا سنہ ۱۰۵۱ھ ۱۶۴۱ء میں ایک بڑی فوج لیکر چیرو کے سردار پرتاپ ابن بال بھدر چیرو کی سرزنش کے لئے روانہ ہوا تھا لیکن اسکو پوری کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ تاہم شائستہ خاں نے اسی ہزار روپئے خراج وصول کر لئے تھے مگر اس کے بعد پھر کوئی خراج ان لوگوں نے خزانہ شاہی میں داخل نہیں کیا تھا اس لئے داؤد خاں کو شاہی فرمان موصول ہوا کہ وہ اپنی کل فوج نیز امدادی فوج کے ساتھ پلاموں کو روانہ ہو اور اسکو فتح کر کے سلطنت مغلیہ میں ملحق کر لے۔

اس فرمان کو پا کر نواب داؤد خاں دوسری شعبان المعظم سنہ ۱۰۷۱ ہجری مطابق ۲۳ ویں مارچ سنہ ۱۶۶۱ عیسوی کو پلاموں روانہ ہوا اور اپنے ساتھ مرزا خاں فوجدار دربھنگہ، تہور خاں برلاس جاگیردار چین پور (علاقہ سہسرام) اور راجا بہروز زمیندار مونگیر کو لے لیا اور فوج شاہی کے علاوہ زمینداروں اور صوبے کی امدادی فوج کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔

پلاموں کا شہر پٹنہ سے سو میل کی فصل پر تھا، شہر کے گرد و نواح میں دو بڑے بڑے قلعے واقع تھے، ایک تو قریب کی پہاڑی پر کھڑا دور تک نگراں تھا اور دوسرا سرزمین پر غنیم سے مقابلے کے لئے قدم جمائے اپنی شان دکھا رہا تھا۔ ان دونوں قلعوں کے نیچے اورنگا نامی ایک زخار ندی موج زن تھی اور ہر چہار جانب اونچے اونچے پہاڑ، گھنے اور خوفناک جنگلوں کے علاوہ اور تین بڑے بڑے قلعے بہار کی سرحد پر واقع تھے جن کے نام ملاحظہ ہوں:۔

(۱) قلعۂ کوٹھی[3]۔ جو قلعۂ پلاموں سے چالیس میل اتر تھا ———

---

[1] پلاموں گزیٹیر بزبان انگریزی مطبوعہ سنہ ۱۹۰۷ء [2] پلاموں گزیٹیر مطبوعہ سنہ ۱۹۰۷ء [3] گورنمنٹ آف انڈیا کے اٹلاس کی فرد نمبر ۱۰۴ کے رو سے اس قلعے کا محل وقوع موجودہ ضلع گیا کے مشہور قصبہ امام گنج سے چھ میل دکھن چوٹی اور مورہر ندیوں کے سنگم پر پایا جاتا ہے۔ (ہسٹری آف اورنگ زیب مصنفہ سر جدو ناتھ سرکار جلد سوئم فٹ نوٹ صفحہ ۳۹)

(۲) قلعۂ کونڈا[1] - جو قلعہ کوٹھی سے پورب اٹھارہ میل پر واقع تھا۔
(۳) قلعۂ دیوگن - جو کوٹھی سے تقریباً بائیس میل پچھم واقع تھا۔

نواب داؤد خاں نے پہلے قلعۂ کوٹھی کو دخل کرنے کی ٹھان لی چنانچہ پانچویں رمضان المبارک ۱۰۷۱ھ (مطابق ۲۴ ویں اپریل ۱۶۶۱ء) کو وہ اس قلعے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ چیروں کے قلعہ داروں کو جب خبر ملی کہ ایک بڑی جرار فوج اُن سے مقابلے کے لئے آگئی ہے تو وہ گھبرا کر حواس باختہ ہوگئے اور فوراً قلعے کو چھوڑ کر فرار کر گئے، اس طرح یہ قلعہ بلا کسی جنگ کے داؤد خاں کے قبضے میں آگیا اور داؤد خاں اس قلعے پر اپنا تسلط جما کر قلعۂ کونڈا کو فتح کرنے کے لئے آگے بڑھا۔

یہ قلعہ ایک پہاڑی کے اوپر واقع تھا اور اسکی محافظت کے لئے چیروں کی ایک بڑی فوج وہاں موجود تھی اور سامان و آلات جنگ بھی کافی مقدار میں موجود تھے اور گرچہ یہ قلعہ کوٹھی کے قلعے سے صرف اٹھارہ میل پر تھا لیکن راہ نہایت دشوار گذار تھی، گھنے جنگلوں کے علاوہ دس میل تک نہایت تنگ راستہ تھا جو پہاڑیوں سے ہو کر قلعے تک جاتا تھا، اس لئے داؤد خاں کو نہایت مشکل آن پڑی - پہلے تو وہ جنگلوں کو کٹوا کر سڑک بنواتا تھا اس کے بعد فوج کو لے کر آگے بڑھتا تھا اس طرح ابھی دو ہی میل تک جنگل کاٹ کر جوں ہی فوج آگے بڑھی چیرو یہ خبر پا کر گھبرا گئے اور خوف زدہ ہو کر اس قلعے کو بھی چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے - چوتھی شوال المکرم مطابق ۲۳ ویں مئی ۱۰۷۱ھ ۱۶۶۱ء کو داؤد خاں یہاں پہنچا اور اس قلعے پر اپنا عمل درآمد کر لیا۔

اس قلعہ کے محل وقوع کی اہمیت کا لحاظ کر کے داؤد خاں نے اسکو آلات حرب و سامان مدافعت سے بالکل خالی کر دیا لیکن چونکہ اس وقت برسات شروع ہوگئی تھی اسلئے داؤد خاں نے تا موسم برسات یہاں قیام کرنے کا ارادہ کر لیا اور کونڈا اور کوٹھی کے درمیان ہر سات آٹھ میل پر اُس نے مٹی کے قراول خانے بنوائے اور ان میں سے ہر ایک میں ایک سو سواروں کو چند بندوق چلانے والے زمیندار افسروں کے ساتھ قیام کرنے کا حکم دیا اور انہیں ہدایت کی کہ سڑک کی محافظت کے علاوہ جب قدر بھی رسد آئے اس کو اپنی نگرانی او حفاظت میں لے آئیں۔

جب برسات ختم ہوگئی تو داؤد خاں نے قلعۂ پلاموں پر حملہ کرنے کی تیاریاں کیں، چیروں کے سردار کو جب یہ خبر ملی کہ حملہ آور فوج آگے بڑھتی چلی آرہی ہے تو اُس نے داؤد خاں کو پیغام دیا کہ وہ سالانہ خراج دیا کریں گے اور آیندہ شاہی حکومت کے ماتحت رہیں گے بشرطیکہ شاہی فوج بغیر کسی مزید اقدام کے فوراً واپس چلی جائے - داؤد خاں نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور جنگ کی پوری تیاریاں کر کے یکم ربیع الاول مطابق ۱۵ ویں اکتوبر (۱۰۷۲ھ ۱۶۶۱ء) کو قلعۂ پلاموں کی جانب روانہ ہوگیا۔

تین سو سوار اور دو سو پیادوں کے ساتھ مرزا خاں کو آگے کی فوج کا سردار مقرر کیا، تہور خاں برلاس کو سات سو سوار اور تین سو پیادوں کے ہمراہ فوج کے داہنے بازو کی افسری سپرد کی، اپنے بھانجے شیخ تاتار کو پانچ سو سوار ان جانباز کے ساتھ اور راجا بہروز کو چار سو سواروں اور پندرہ سو پیادوں کے ہمراہ فوج کے بائیں بازو کی کمان دی اور قلب لشکر میں خود داؤد خاں ایک ہزار سواروں کے ساتھ جم گیا اور شاہی فوج و نیز اپنے ملازمین کی ماتحتی میں جنگل کاٹ کر پلاموں تک سڑک بنانے کی خدمت سپرد کی تاکہ غنیم اس میں چھپ کر جاتی ہوئی فوج پر حملہ نہ کر سکیں نیز راہ میں جا بجا چوکیاں بھی بنوائیں جن میں مسلح سپاہی حفاظت کیلئے متعین کر دئے۔

غرض اس طرح فوج محض تھوڑی دور تک روزانہ بڑھتی چلی، آگے تو جنگل کاٹ کر سڑک بنتی جاتی اور پیچھے سارا لشکر قدم بہ قدم بڑھتا جاتا تھا اور جہاں کہیں شام کو فوج قیام کرتی وہاں کھائی (خندق) کھود کر دشمنوں کے شب خون سے بچنے کا انتظام کیا جاتا یہاں تک کہ نو دنوں میں بیس میل کی مسافت اسی طرح طے ہوئی چنانچہ نویں ربیع الاول (مطابق ۲۴ ویں اکتوبر ۱۰۷۲ھ ۱۶۶۱ء) کو داؤد خاں کی فوج نے تہرسی[2] گاؤں تک پہنچ کر

---

[1] اس قلعے کے خستہ آثار اب تک پائے جاتے ہیں نیز فی زمانہ کونڈا نام کا ایک بڑا گاؤں بھی آباد ہے - جہاں چیرو قوم کا ایک راجا رہتا ہے اور ان اطراف کا علاقہ اسی کی زمینداری میں ہے۔
[2] عالمگیر نامہ قلمی نسخہ کی فارسی عبارت میں لفظ تہرسی لکھا ہوا ہے مگر سر جادو ناتھ سرکار نے اپنی تصنیف ہسٹری آف اورنگ زیب کے جلد سوم میں انڈین اٹلاس کے حوالے سے اسکو کاتب کی غلطی بتاتے ہوئے تو ھرسی لکھا ہے نیز مورخ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسٹر بلوک مین BLOCHMANN نے اس مقام کو ترھاسی TARHASI لکھا ہے - ناچیز کو مسٹر بلوک مین کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ پلاموں ضلع کے موجودہ نقشہ میں ترھاسی مندرج پایا جاتا ہے۔

اپنا پڑاؤ ڈال دیا جہاں سے پلاموں کا قلعہ دکھن پچھم سمت میں صرف سترہ یا اٹھارہ میل کے فاصلہ پر رہ جاتا ہے۔

داؤد خاں کی فوج کے اس مقام پر آ نکلنے کے بعد چیروں کا سردار میدنی رائے گھبرا اٹھا اور اپنے معتمد و خیر خواہ وکیل سورت سنگھ کو داؤد خاں کے پاس بھیجا (جس نے راجا بہروز کو اپنی سفارش تحفے کے لئے قبل سے ملازم رکھا تھا) اور سردار قوم نے اپنی ماتحتی کا یقین دلاتے ہوئے استدعا کی کہ اُس سے دوستانہ سلوک کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ یہ پیغام دیا کہ اگر اُسکی استدعا منظور کی جائے گی تو وہ ایک لاکھ روپیہ شہنشاہ اورنگزیب کی خدمت میں پیش کرے گا اور پچاس ہزار روپیہ نقد داؤد خاں کو دے گا۔

داؤد خاں نے اورنگ زیب کو اس تجویز کی اطلاع دی اور جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن اسی عرصے میں اس کو خبر ملی کہ سترہ اٹھارہ میل کی فصل پر غنیم نے حملہ کر دیا ہے اور اسکی فوج کے لئے جو رسد آ رہی تھی وہ کل لوٹ لی گئی۔ چیروں کے سردار یعنی پلاموں کے راجا نے اپنے وکیل کی معرفت اس جرم کی بہت کچھ معذرت کی اور یقین دلایا کہ یہ لوٹ بلا اسکی اطلاع اور حکم کے ہوئی ہے۔ اور اس زبانی معذرت کے ساتھ ایک لاکھ روپیہ جو اس نے پیشکش کرنے کا وعدہ کیا تھا اس میں سے پچاس ہزار روپیہ نقد داؤد خاں کے پاس بھیج دیا تاکہ داؤد خاں آزردہ اور غضبناک نہ ہو۔ مگر راجا کی یہ معذرت قبول نہیں کی گئی اور داؤد خاں اس مجرمانہ گستاخی کی سزا دینے پر آمادہ ہو گیا اور تیسری سپہر وہ ۱۲ ویں ربیع الاول مطابق ۲۷ ویں اکتوبر ۱۰۷۲ھ (۱۶۶۱ء) کو روانہ ہو کر قلعۂ پلاموں سے سات آٹھ میل کی فصل پر ایک کو مہائن میں پہنچکر ٹھہرا۔ سولہویں ربیع الاول مطابق ۳۱ ویں اکتوبر کو وہ دو میل اور آگے بڑھا اور اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔

غنیم قلعے کے باہر نکل آئے اور داؤد خاں کی فوج سے ایک میل کے فصل پر اپنا پڑاؤ ڈالا اور خندق کھود کر مدافعت کی تیاریاں کرانے لگے اس عرصے میں شاہی فرمان داؤد خاں کی اطلاع دہی کے جواب میں آ گیا اور وہ یہ تھا کہ اگر پلاموں کا راجا اسلام قبول کرے تو اسکی استدعا منظور کی جائے گی ورنہ نہیں[۱]۔

داؤد خاں نے اس فرمان سے راجا کو مطلع کر دیا اور اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن اسکی فوج جنگ کرنے کے لئے بیتاب تھی اور بیکار پڑی رہنے سے اکتا گئی تھی۔ چنانچہ ۲۴ ویں ربیع الثانی (مطابق ۷ ویں دسمبر ۱۰۷۲ھ ۱۶۶۱ء) کو داؤد خاں کو اطلاع دئے بغیر تہور خاں برلاس نے غنیم پر حملہ کر دیا۔

داؤد خاں یہ خبر پاکر فوراً آگے بڑھا اور دشمن کی فوج سے صرف ایک گولی کے فاصلے پر ٹھہر گیا اور پھر وہاں سے انہیں غارت و تباہ کرنے کے لئے آگے بڑھا نو بجے دن سے غروب آفتاب تک جنگ ہوتی رہی۔ تہور خاں برلاس چونکہ غنیم کی فوج کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا اس لئے اُس کے سولہ جانباز سپاہی مارے گئے اور پچاس جوان زخمی ہوئے۔ اور اندھیرا ہو جانے کے بعد حملہ آور فوج اپنی قیام گاہ پر پلٹ آئی۔

سوتی رات کو غنیم دو توپیں قلعے سے باہر لائے اور داؤد خاں کی فوج پر گولا باری شروع کر دی، چند سوار اور پیادے اور کئی گھوڑے مارے گئے۔ داؤد خاں کی فوج چونکہ نشیب میں تھی اس لئے غنیم کی اس گولہ باری سے ان کا بچنا نہایت دشوار ہو گیا اور انکی حیات کا دارومدار محض دشمن کے رحم پر قرار پایا۔ جب صبح ہوئی تو داؤد خاں نے غنیم کا پڑاؤ چھین لیا اور پے در پے غضبناک حملے کئے۔ غنیم نزدیک کی پہاڑی کی چوٹیوں پر چڑھ گئے اور خوب تلوار چلی۔ داؤد خاں نے بھی اپنی توپوں کو چڑھایا اور دشمن کی فوج پر گولا باری شروع کر دی۔ ستائیسویں (ربیع الثانی) (دسویں دسمبر) سے دشمن اپنی ہمت ہار کر پیچھے بھاگنے لگے اور اور نگا ندی کے کنارے سے جو زیریں قلعہ بہہ رہی تھی جا کر قیام کیا۔

داؤد خاں کی فوج سے دشمن کی کھائی تک جو راستہ تھا وہ نہایت دشوار گزار تھا اور گھنے جنگل ہو کر جاتا تھا جس کے صاف کرنے میں دو تین روز گزر گئے۔ تا اینکہ جب یہ راستہ فوج کے گزرنے کے قابل ہو گیا تو یکم جمادی الاولیٰ (۱۳ ویں دسمبر ۱۰۷۲ھ ۱۶۶۱ء) کو داؤد خاں حملہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھا اور اپنے دونوں برادر زادوں شیخ تاتار اور شیخ احمد کو چند شاہی منصب دار اور راجا

---

[۱] عالمگیر نامہ اور ہسٹری آف اورنگ زیب (مصنفہ سر جادو ناتھ سرکار) جلد سوم۔

بہروز کے لڑکے کے ساتھ ایک ہزار فوج کے ہمراہ جس میں مرزا خاں کی فوج کے سپاہی بھی شامل تھے لشکر کا بایاں بازو قرار دیا اور انکو حکم دیا کہ پہاڑیوں سے ہوکر غنیم پر حملہ کریں اور فوج کے دوسرے دستے کے ساتھ شیخ شفیع کو داہنے بازو پر مقرر کیا اور خود مرزا خاں، تہور خاں برلاس راجا بہروز، ابومسلم اور سید انجابت وغیرہ کو جو نہایت بہادر و جانباز شاہی منصب دار تھے ساتھ لیکر قلب لشکر میں رہا اور اس طرح تین جانب سے دشمن پر حملے ہوئے۔ یہ لڑائی مسلسل چھ گھنٹے جاری رہکر ختم ہوئی۔ داؤد خاں کے جانباز سپاہیوں نے کئی موقعوں پر نہایت دلیری کے کام کئے اور آخرش فتح پائی۔ غنیم بے شمار مارے گئے اور زخمی ہوئے لیکن انکی زیادہ تعداد پہاڑوں اور جنگلوں میں فرار ہوگئی اور کچھ جو بیچ رہے وہ حصارِ شہر کے اندر پناہ گزیں ہوگئے۔

اس لڑائی کے بعد داؤد خاں کا ارادہ تھا کہ وہ غنیم کی کھائی پر قبضہ کرلے اور پھر کچھ دم لے کر قلعے کو اُن سے چھین لے لیکن داؤد خاں[1] کے سپاہیوں پر ایک جوش کا عالم طاری تھا اور وہ اپنی کامیابی پر اسقدر خوش اور نازاں تھے کہ آخر نہیں رک سکے اور فوراً ہی حصار شہر پر حملہ کردیا اور اُرنگا ندی سے پار ہوکر شہر کی دیواروں پر پے در پے نہایت جوش وخروش میں حملے کرتے گئے۔ غنیم نہایت سراسیمگی و اضطراب کی حالت میں پسپا ہوگئے اور نہایت پریشانیوں اور دشواریوں سے اپنی جانیں بچاکر جنگلوں اور پہاڑوں میں بھاگ گئے۔

راجا نے کل گراں بہا اسباب رسد اور آلات حرب سے قلعے کو خالی کردیا اور نہایت عجلت سے اپنی کل عورتوں اور بچوں کو جنگل میں بھیجدیا اور خود چند جانباز سپاہیوں کے ساتھ قلعے میں جو نہایت دشوار گذار تھا۔ نہایت بہادری اور مستحکم ارادے کے ساتھ جنگ کے لئے ڈٹ گیا۔ بہادر حملہ آور حصار بیرونی کو توڑکر شہر میں داخل ہوگئے اور قلعے کے دروازے تک پہنچکر اس کو توڑ ڈالا اور جونہی قلعے کے اندر داخل ہوئے راجا نے اُن پر نہایت جانبازی سے حملے کئے، خوب تلوار چلی اور یہ لڑائی نو بجے رات تک جاری رہی آخرش جب راجا کے رفقاء ہارنے لگے تو ڈیڑھ بجے شب کو راجا قلعے کے چور دروازے سے نکل کر جنگل میں بھاگ گیا اور اس طرح دونوں قلعوں[1] کو حملہ آور فوج نے فتح کرلیا اور پلاموں کا پورا علاقہ داؤد خاں کے دخل میں آگیا۔ اس مہم میں نواب داؤد خاں کے اکسٹھ[1] سپاہی کام آئے اور ایک سو ستہتر زخمی ہوئے لیکن چیرو قوم کا کثیر نقصان ہوا اور اس کے بہت آدمی مارے گئے[2]۔

---

[1] پلاموں کے متذکرہ دونوں قلعوں کے آثار شکستہ پلاموں کے گھنے جنگلوں میں ہنوز موجود ہیں نیز اُرنگا ندی بدستور زیر قلعہ موجزن ہے جس کو فی زمانہ یہاں جانے کا آسان راستہ یہ ہے کہ ڈالٹین گنج کے بعد تقریباً نو میل دور کیچکی KICHKI نام کا ایک ریلوے اسٹیشن ہے جہاں سے تقریباً چھ سات میل کی مسافت باقی رہ جاتی ہے جو سائیکل یا بیل گاڑی یکے ذریعے طے کی جاسکتی ہے۔ نیز ڈالٹین گنج سے ٹیکسی موٹر پر جایا جاسکتا ہے۔ سڑک پختہ اور عمدہ ہے اور کرایہ کی موٹریں بھی ملتی ہیں ۔[2] تسخیر پلاموں کے یہ حالات عالمگیر نامہ قلمی نسخہ نیز ہسٹری آف اورنگ زیب (مصنفہ سر جادو ناتھ سرکار) جلد سوم سے ماخوذ ہیں لیکن تاریخ داؤدیہ مصنفہ سید محمد ناصر بلگرامی مرحوم مطبوعہ اہنی پریس الہ آباد میں اس طرح مندرج ہے کہ "دوسرے دن قلعے کا پھاٹک کھلتے ہی داؤد خاں کی فوج درانہ قلعے میں داخل ہوگئی اور داؤد خاں بذات خاص جہاں راجا پلاموں رسوئی بنارہا تھا پہنچ گیا اور فوراً راجا کو مغلوب کرکے اپنا زانو اس کے سینے پر رکھدیا اور پیش قبض کرسے نکال کر اس کے پہلو پر رکھدیا اسوقت ایک عجیب شور وغوغا بلند ہوا' راجا کے رفیقوں نے داؤد خاں پر وار کرنا چاہا یہ دیکھ کر داؤد خاں نے کہا کہ ہم تو جان دیکر اور سر ہتھیلی پر رکھ کر یہاں آئے ہیں مجھے مار ڈالنا کچھ مشکل نہیں لیکن ساتھ ہی اس کے راجا کی بھی خیریت نہیں ہے یعنی میری جان کے ساتھ راجا کی جان ہے۔ مجھ پر اگر کچھ آنچ آئی تو راجا کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔ شدہ شدہ یہ خبر راجا کے محل میں پہنچی اسکی ماں سر و پا برہنہ داؤد خاں کے سامنے آکر دست بستہ کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی کہ میرے لڑکے کی جان بخشی کیجئے اور ہموزن اسکے زر و جواہر قبول فرمایئے۔ داؤد خاں نے جواب دیا کہ ہم بطمع زر یہاں نہیں آئے ہیں راجا کو مع خراج شاہی میرے ساتھ کردو میں اس امر کی قسم کھاتا ہوں کہ جس طرح لئے جاتا ہوں اسی طرح ساتھ خیریت کے واپس بھی بھیجدونگا۔ غرضکہ راجا کو مع خراج ہمراہ لےکر داؤد خاں دہلی روانہ ہوگئے۔ بعد طے مراحل و قطع منازل مشرف بارگاہ سلطانی ہوئے۔ چونکہ راجا مدت سے باغی و سرکش تھا اسلئے حکم اسکی گردن زدنی کا صادر ہوا یہ سنکر نواب داؤد خاں نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ اسکی ماں کی حالت بیان کرتے ہوئے اسکی جان بخشی کا معروضہ پیش کیا اور خراج شاہی داخل خزانہ شاہی میں داخل کرادیا اور ایک روپیہ فی موضع خراج مقرر کراکے راجا کو اسی جاہ و حشم کے ہمراہ لیکر دوبارہ پلاموں روانہ ہوئے اور راجا کو صحیح وسالم اسکے قلعہ میں بھیجادیا۔ - افسوس ہے کہ تاریخ داؤدیہ کے ماخذ کا علم نہ ہوسکا کہ اس کی جانچ پڑتال کی جاتی۔

داؤد خاں نے اپنی اس فتح کی یادگار میں قلعۂ پلاموں میں ایک مسجد تعمیر کرائی جو شکستہ حالت میں ہنوز موجود ہے اور جس کی دیوار پر مندرجہ ذیل قطعہ جس سے بطریق ابجد سنہ ۱۰۷۲ ہجری فتح پلاموں کی تاریخ نکلتی ہے۔ کندہ کرادیا ہے

کفر در این بود پلاموں از قدیم　　حالیا داؤد خاں اسلام کرد

۱۰۷۲

بختاور خاں مصنف مراۃ العالم کا بیان ہے کہ نواب داؤد خاں کی اس گراں قدر کامیابی پر شہنشاہ محی الدین اورنگزیب نے اسکو خاص خلعت عطا کیا اور ان خدمتوں کا لحاظ کرکے اسکو مزید ترقی دی اور اب وہ پانچ ہزار سواروں کا افسر مقرر ہوا۔ نیز مصنف موصوف کا یہ بھی بیان ہے کہ فتح پلاموں میں داؤد خاں کو جو مال غنیمت ہاتھ لگا تھا اس میں دو ہاتھی بھی تھے جن کو اس نے شہنشاہ کی خدمت میں دہلی بھیجدیا اور شہنشاہ نے انکو شکار کے مصرف کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔[1]

اس کے بعد داؤد خاں وہاں کا انتظام درست کرکے اور اس علاقے کی حکومت منگلی خاں[2] کے سپرد کرکے اپنے صدر مقام پٹنہ کی طرف واپس لوٹا۔

قصبہ داؤد نگر کی بنا

صوبہ بہار میں داؤد خاں کا دوسرا کارنامہ قصبہ داؤد نگر (ضلع گیا) کی بنا و تعمیر ہے۔ اس نے پلاموں سے پٹنہ واپس ہوتے ہوئے دریائے سون کے کنارے موجودہ ضلع گیا کے انچھا گاؤں کے قریب ایک چوکی قائم کرنے کے لئے سلوٹا بھکوڑی نامی ایک جنگلی مقام کا انتخاب کیا تاکہ سڑک پر آنے جانے والے مسافروں کے جان و مال کی محافظت ہوسکے کیونکہ یہ جگہ نہایت پر خطر اور مخدوش سمجھی جاتی تھی جہاں گھنے جنگلوں میں رہزنوں اور ڈاکوؤں کا قدیم مسکن تھا۔ اور یہ کہاوت کہ

"انچھا لانگھے اور بھدوہی تب جانو گھر آئے بوڑہی"[3]

ان اطراف میں زبان زد ہر خاص و عام تھی۔ چنانچہ نواب داؤد خاں نے پہلے جنگلوں کو کٹوا کر صاف کرا دیا اس کے بعد ایک قصبے کی آبادی کا نقشہ معہ حقیقت مخدوش ہونے مقام مذکور کی بطور ایک عرضداشت شہنشاہ کی منظوری کے لئے بھیجا۔ اورنگ زیب نے نقشہ و عرضداشت ملاحظہ فرمانے کے بعد مجوزہ قصبے کی آبادی کی منظوری کے ساتھ ساتھ انچھا، منورہ اور گوہ تین پرگنے پلاموں کی فتح کے صلے میں داؤد خاں کو بطور جاگیر التمغہ مرحمت فرمائے چنانچہ داؤد خاں نے سنہ ۱۰۷۲ھ ۱۶۶۲ء میں وہاں پر ایک قصبے کے آبادی کی بنیاد ڈالی جو اس کے نام پر اب تک داؤد نگر کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ وہ قلعۂ کوٹھی میں فوج کا ایک دستہ بخیال محافظت چھوڑتا گیا جہاں بعد کو شدہ شدہ ایک بہت بڑا گاؤں آباد ہوگیا۔ جہاں کے موجودہ پٹھان باشندے اپنے کو داؤد خاں کے بہادر افغان سپاہیوں اور سرداروں کی اولاد بتاتے ہیں

باب تیسرا

اصلاحات صوبۂ بہار

داؤد خاں نے اپنی صوبہ داری بہار کے زمانے میں کون کون سے اصلاحات اس صوبہ میں کئے؟ باوجود تلاش و تجسس اس کا کوئی مفصل حال معلوم نہ ہوسکا۔ البتہ ایک کتبہ سے جو پٹنہ سٹی کے موجودہ خواجہ کلاں تھانے کی عمارت پر چسپاں ہے صرف اس قدر پتہ ملتا ہے کہ شخصے جعفر نامی نے جو داؤد خاں کا ملازم تھا ایک عمارت "دارالعدل" بنوائی تھی جو اس وقت کے عدل و انصاف کے محکمے کی عمارت تھی۔ اس عمارت پر حسب ذیل شعر کندہ ہے:-

بہر عدل و داد مظلوماں ز دست ظالماں　　ساخت دارالعدل جعفر بندۂ داؤد خاں

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ مراۃ العالم مصنفہ بختاور خاں قلمی نسخہ صفحات ۶۸۳ و ۶۸۴ (مملوکہ محترمی سید حسن عسکری پروفیسر تاریخ پٹنہ کالج)

[2] شاہی فرمان کے ذریعہ اس نئے علاقہ (پلاموں) کا فوجدار مقرر کیا گیا تھا۔ (عالمگیر نامہ قلمی نسخہ)

[3] یعنی انچھا اور بھدوہی گاؤں سے مسافر بخیریت تمام گزر کر جب آگے بڑھے تب سمجھئے کہ خیریت سے اس کا سفر تمام ہوا۔

فی زمانہ اُس عمارت کا کوئی نشان نہیں ملتا ہے لیکن متذکرہ تھانے کے صحن میں ایک قبر پر مندرجہ ذیل کتبہ ثبت ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ متذکرہ دار العدل کی عمارت اسی مقام پر تھی اور جس کو نواب فخر الدولہ کے ملازم حسن علی نے سنہ ۱۱۴۲ھ میں دوبارہ تعمیر یا مرمت کرایا تھا ؎

بندہ نواب فخر الدولہ ممدوح زماں　　آنکہ در نامش حسن را با علی باشد قراں

ساخت دار العدل جائے نکو مناسب داد　　در ہزار و یکصد و چہل و دو بنا کرد تاریخ آں

داؤد نگر ــــــ تاریخ داؤدیہ میں قصبہ داؤد نگر کی آبادی کے متعلق مندرج ہے کہ سنہ ۱۰۷۰ھ میں اس قصبے کی آبادی کی بنیاد ڈالی گئی۔ سنہ ۱۰۷۲ھ میں قلعۂ داؤد نگر کی بنیاد پڑی اور سنہ ۱۰۸۲ھ کے اوائل میں قلعہ مذکور کی تعمیر ختم ہوئی نیز اسی سال یعنی بارہ سال کی مدت میں قصبۂ داؤد نگر کی آبادی تکمیل کو پہنچی اور اس مدت میں انچھا اور گوہ دو پرگنوں کی آمدنی میں سے ایک عظیر رقم آبادیٔ قصبہ اور تعمیرات مسجد و قلعہ میں خرچ ہوتی رہی نواب داؤد خاں نے قصبہ داؤد نگر کو اس قرینے اور طرز پر آباد کیا کہ ہمارے صوبۂ بہار میں کوئی دوسرا قصبہ اس سلیقے سے آباد نہیں ہوا، ہر محلے میں ہر قسم کے اہل حرفہ آباد کئے تاکہ کوئی شخص تکلیف نہ اٹھائے یعنی ہر محلے میں دھوبی، حجام، تیلی، تنبولی، حلوائی، بنئے اور دوسرے ہر قسم کے لوگ بسائے کہ ہر شخص کو ضروری چیزیں اپنے ہی محلے میں مل جائیں اور صرف قصاب، ڈوم، چمار اور مہتر (بھنگی) وغیرہ کی قسم کے لوگوں کو البتہ آبادی کے کنارے بسایا، چنانچہ قصبۂ داؤد نگر کے مشرقی کنارے پر باغ پراہی[1] میں قصابوں کی آبادی بدستور ہنوز موجود ہے۔ یہ قصبہ نہایت لمبا چوڑا آباد کیا گیا تھا۔ چوک[2] پر جوہری رہتے تھے جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اس مقام پر اب بھی سنگ تراشیدہ کے ریزے کبھی کبھار مل جاتے ہیں۔ جنہیں حکاک نگینے تراشتے وقت پھینک دیتے ہیں۔ غرضکہ نواب داؤد خاں نے اس قصبے کو فن و حرفت کے لوگوں سے نہایت وسیع پیمانے پر آباد کیا تھا لیکن اب اس قصبے میں وہ پہلی سی شان و رونق جو نواب داؤد خاں کے وقت میں تھی باقی نہیں ہے بلکہ اسکی حالت مندرجہ ذیل شعر کے مصداق ہے ؎

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ　　آثار پدید است صنادید عجم را

اس قصبے کی ویرانی و بربادی کی دو تاریخی وجہیں بھی ہیں، ایک تو صاحب سیر المتاخرین کے بیان کے مطابق سنہ ۱۷۴۲ء میں جبکہ بالاجی راؤ کا اس طرف سے گزر ہوا تو نواب احمد خاں نبیرۂ نواب داؤد خاں قریشی اس کی اطاعت و فرماں برداری میں حاضر نہ ہوا اور اس گمان میں قلعۂ داؤد نگر میں بیٹھا رہا کہ بالاجی راؤ محمد علی وردی خاں مہابت جنگ کی کمک کو جاتا ہے ہمارے قلعے کے محاصرے سے اسکو کیا غرض چنانچہ بالاجی راؤ نے داؤد نگر کی تخریب کے لئے فوج بھیجی جس نے قصبہ داؤد نگر کو جلا کر خاک کر دیا۔ (ملاحظہ ہو مراۃ السلاطین ترجمہ سیر المتاخرین مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ، جلد دوم صفحات ۱۵۱ و ۱۵۲)

دوسری تاریخی وجہ اس قصبہ (داؤد نگر) کی ویرانی و بربادی کی حسب روایت مرتب تاریخ داؤدیہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ نواب احمد خاں (نبیرۂ نواب داؤد خاں) کی غیر موجودگی[3] میں ریاست نوکھا (ضلع شاہ آباد۔ آرہ) کا راجا داؤد نگر آیا اور میدان خالی پاکر زعم جواں مردی قلعۂ داؤد نگر کے پھاٹک اکھاڑ کرلے بھاگا۔

یوں تو نیرنگیٔ زمانہ نے اس قصبے کا وہ پہلا سا حال باقی نہ رکھا ہے مگر پھر موجودہ حکومت انگریزی کے دور میں دریائے سون کی بڑی نہر جو باروں (سون سیٹ بینک) کے قریب سے نکال کر دیگھا (پٹنہ) کے پاس دریائے گنگا میں گرائی گئی ہے وہ قصبہ داؤد نگر سے گزرتی ہے جس میں داؤد نگر سے کھگول (پٹنہ) تک ہفتے میں دوبار مسافروں اور مال کو لے کر اسٹیمر آیا جایا کرتا ہے اور اسی نہر کی وجہ سے فی زمانہ قصبہ

---

[1] باغ پراہی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس مقام پر ایک روضہ سردر سلطان قدس سرہٗ کا ہے جس کے مجاور پراہی کے لقب سے مشہور تھے اور انکو نواب داؤد خاں کی طرف سے جاگیریں بھی ملی تھیں لیکن اب پراہی مجاور نیست و نابود ہو گئے اور انکی اولاد منتشر ہو کر دوسرے ضلعوں میں آباد ہو گئی نیز انکی جاگیریں بھی انکے قبضے سے نکل گئیں لیکن سردر سلطان قدس سرہ کا روضہ اب تک بدستور موجود ہے اور اہل حاجت ــــــــــ نذر و نیاز کرتے ہیں۔ (تاریخ داؤدیہ)

[2] اس قصبہ کا چوک مرتضےٰ خاں اور اللہ داد کے مزارات کے قریب (جو اب ایک وسیع میدان ہے) تھا (تاریخ داؤدیہ)

[3] کیونکہ نواب احمد خاں قریشی نبیرۂ نواب داؤد خاں قریشی زیادہ تر محلہ مغلپورہ پٹنہ سٹی میں رہا کرتا تھا (تاریخ داؤدیہ)

داؤد نگر، ہمارے صوبۂ بہار میں محکمۂ نہر کا ایک مشہور سب ڈویژن ہے جہاں ایک نائب انجینئر مقیم رہتا ہے۔ اور ڈاک خانہ، تار گھر، ڈاک بنگلہ، ایک ہائی انگلش اسکول، اسپتال اور تھانے کے علاوہ ایک میونسپل بورڈ کے ذریعہ روشنی اور صفائی کا انتظام بھی اس قصبہ میں جاری ہے اور ہنوز ضلع گیا کا یہ قصبہ جنوبی بہار میں اپنے تجارتی کاروبار کے لئے کافی مشہور و معروف ہے۔

صوبہ داری بہار سے تبادلہ

داؤد خاں ماہ محرم ۱۰۷۴ھ مطابق ماہ اگست ۱۶۶۴ء تک پٹنہ (بہار) کا صوبہ دار رہا۔ اس کے بعد شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب نے اسکی خدمات خود حاصل کرلیں۔ اور اسکی جگہ پٹنہ کی صوبہ داری پر لشکر خاں کو مامور کردیا[۵]

داؤد خاں کی دیگر سیاسی مہمات

اس کے بعد داؤد خاں کی دیگر سیاسی مہمات کا آغاز ہوا۔ جن کا سلسلہ ۱۰۷۵ھ سے ۱۰۸۲ھ تک قائم رہا۔ اسی اثنار میں اس نے حکومت مغلیہ کے غیر معمولی اہم خدمات انجام دئے۔ چنانچہ ۱۰۷۲ھ میں وہ خاندیس کا صوبہ دار بنا یا گیا۔ پھر دکن میں سیواجی کی سرکوبی کے لئے جو فوج بھیجی گئی اسمیں شریک ہوا ۱۰۷۶ھ میں یہ مہم جاری رہی اور ۱۰۷۷ھ میں بیجاپور کی مہم میں شریک تھا۔ پھر برار کی صوبہ داری پر مامور ہوا پھر ۱۰۸۲ھ میں الہ آباد کی صوبہ داری پر بھیجا گیا۔

مراجعت وطن

لیکن ان تمام سیاسی خدمات سے وابستہ رہنے کے باوجود اس کے تعلقات صوبہ بہار سے قائم رہتے۔ کیونکہ جاگیر کے باعث قصبہ داؤد نگر کو اس کے وطن کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔

وفات

چنانچہ اسکی زندگی کا سب سے آخری واقعہ یہ ہے کہ جب کابل میں بدعملی پھیلی تو اورنگ زیب نے باضافہ منصب ششش ہزاری اور عمدۃ الملک کے خطاب سے سرفراز فرما کر داؤد خاں کو کابل جاکر وہاں کے انتظامات درست کرنے کا حکم دیا چنانچہ اورنگ زیب کا یہ حکم پاکر وہ فوراً اپنے اہل وعیال سے ملنے و نیز اپنی جاگیر کے انتظام وانصرام کے لئے داؤد نگر آیا اور یہاں بعجلت کل کاموں سے فراغت حاصل کرکے حکم سلطانی کی بجاآوری کے خیال سے رہگزرائے کابل ہوا مگر ابھی وہ قلعۂ رہتاس ہی تک پہنچا تھا کہ اذا جاء اجلهم فلا يستاخرون ساعة ولا يستقدمون کے اٹل قانون خداوندی کے مطابق موت کا پیغام آپہنچا اور کابل جانے کے بجائے اسکو راہی ملک عدم ہونا پڑا اور وہ وہیں قلعۂ رہتاس (ضلع شاہ آباد) میں مدفون کیا گیا۔[۵]

اولاد و احفاد

داؤد خاں نے صرف ایک فرزند چھوڑا جس کا نام حمید خاں تھا، جس نے قصبۂ داؤد نگر کے پورب جانب تقریباً سولہ سترہ میل کی دوری پر پرگنہ گوہ میں اپنے نام پر ایک گاؤں حمید نگر آباد کیا تھا۔ داؤد خاں کے مرنے کے بعد اورنگ زیب نے حمید خاں کو دربار شاہی میں طلب کیا اور جسونت سنگھ کی وفات کے بعد ۱۰۹۰ھ میں جو شورش پیدا ہوگئی تھی اسکو دبانے پر متعین کیا تھا اسکے بعد ۱۰۹۱ھ میں وہ بھوجپور کا فوجدار مقرر ہوا تھا اس کے بعد اورنگ زیب نے اس کو گجرات کی صوبہ داری کچھ دنوں کے لئے مرحمت فرمائی تھی۔ لیکن ابھی اس کا سن چالیس سال کا تھا کہ پیک اجل نے صدائے رحیل سنائی اور برہان پور میں ۱۵ ویں ربیع الآخر ۱۰۹۲ھ کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کر گیا۔

حمید خاں کا ایک لڑکا نواب جیون خاں تھا اور جیون خاں کے دو فرزند عنایت اللہ خاں عرف حمید خاں ثانی۔ اور تقیر اللہ خاں عرف احمد خاں ہوئے۔

عنایت اللہ خاں کے ایک فرزند شکر اللہ خاں[۴] تھے جن کے چار فرزند اسد اللہ خاں[۱]۔ رحم اللہ خاں[۲]۔ روح اللہ خاں[۳] و اکرام اللہ[۴]

---

[۱] مآثر عالمگیری قلمی نسخہ ص ۹۳ [۲] تاریخ داؤدیہ [۳] مآثر عالمگیری قلمی نسخہ ص ۲۱۷ و ۲۱۸ کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ ملتا ہے کہ نواب داؤد خاں کا ایک لڑکا جمشید خاں نامی بھی تھا جس نے ۱۰۹۸ھ میں برہان پور میں انتقال کیا تھا۔ [۴] مرتب تاریخ داؤدیہ کا بیان ہے کہ عنایت اللہ خاں عرف حمید خاں ثانی کے فرزند شکر اللہ خاں مذکور کی حیات تک پرگنات انچھا، گوہ اور منورہ حسب دستور سابق بطور جاگیر اس خاندان کے قبضہ و دخل میں رہے لیکن [illegible] میں جب انگریزی عملداری کا دار دورہ ہوا تو وقت بندوبست سرکار انگریزی نے خلاف امید نہ معلوم کیوں ان پرگنات کی جو کہ شاہی عطیہ تھے مالگذاری تشخیص کردی جسے اولاد و احفاد نواب داؤد خاں نے قبول و منظور نہ کیا چنانچہ گورنمنٹ نے یہ علاقے دوسرے زمینداروں کے ساتھ بندوبست کردئے اور صرف مبلغ پانچ سو روپے ماہانہ کا وظیفہ محض تین پشتوں تک مقرر کردیا اور حسب الحکم سرکار انگریزی صرف تین پشتوں تک (باقی صفحہ ۵۷ پر)

خاں عرف امام الدین خاں تھے ۔ امام الدین خاں کے محل اولیٰ سے ولایت اللہ خاں اور محل ثانی سے ولی اللہ خاں ہوئے ۔

نقیر اللہ خاں عرف احمد خاں کے محل اولیٰ سے ایک فرزند غلام غوث خاں اور محل ثانی سے دو لڑکے حیدر قلی خاں اور احسان علی خاں کا پتہ تاریخی کتابوں میں ملتا ہے۔

تاریخ وفات۔ نواب داؤد خاں کی تاریخ وفات کسی ہمعصر معتبر مورخ نے تو نہیں لکھی مگر تاریخ داؤدیہ میں داؤد خاں کے پر پوتے نواب عنایت اللہ خاں عرف حمید خاں ثانی کا مندرجہ ذیل قطعہ مندرج ہے جس سے اس کی وفات کی تاریخ ۱۰۸۱ھ ہجری (مطابق ۱۶۷۰ء) نکلتی ہے۔ آیا یہ تاریخ صحیح ہے اس کا کہنا دشوار ہے لیکن یہ قطعہ چونکہ خود اس کے پر پوتے کا ہے اس لئے اسکی صحت پر یک گونہ وثوق کیا جا سکتا ہے۔

(قطعہ)

چہ دل بندی دریں دنیا کہ افسون ست و افسانہ ۔۔۔ ہزاراں عاقل و فرزانہ را کردہ ست دیوانہ
بزیر گردش گردوں چہ امید بقا باشد ۔۔۔ کجا ماند سلامت در میان آسیا دانہ
اگر آید دم اول دم دیگر مجو از ... ۔۔۔ کہ آں بد آشنا اول در آخر گشت بیگانہ
مجا س از حشمت داؤد خاں کز ... یاہ او ۔۔۔ شدے آباد شہرے گر گزر کردے بہ ویرانہ
بے شمشیر ہا زد بر سر بنگالہ و د ... ۔۔۔ گزو شد داستان رستم دستاں بہ افسانہ
چو جاں بسپرد ایماں برد در راہ جواں مردی ۔۔۔ بتاریخش خرد گفتا، با ایماں رفت مردانہ

۱۰۸۱ھ

انا للہ و انا الیہ راجعون

ہے دلا کس کو دوام اس گردش ... میں ۔۔۔ خاک کے پتلے ہزاروں مل گئے ہیں خاک میں

(بقیہ ص ۵۶) اس خاندان کو مقررہ ماہانہ وظیفہ ملتا رہا۔ اسکے بعد نواب داؤد خاں کی اولاد و احفاد میں سے کسی کو بھی ایک پیسہ خزانہ سرکار سے عطا نہیں ہوا اور نواب داؤد خاں کی آل اولاد گورنمنٹ برطانیہ کے اس طرز عمل کی بدولت نان شبینہ کو محتاج ہو گئی۔ بنا چیز راقم السطور کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ آخر ماہانہ وظیفہ میں بہ تین پشت کی قید کیوں لگائی گئی تھی؟ حالانکہ شہنشاہ محی الدین اورنگزیب نے عموماً بعوض خدمت لائقہ و خصوصاً بعوض فتح پلاموں عمدۃ الملک نواب داؤد خاں قریشی فاتح پلاموں و بانی قصبہ داؤد نگر کو از روئے فرمان نسلاً بعد نسلٍ متذکرہ پرگنے بطور جاگیر التمغہ عطا کئے تھے۔ اگر علاقے دوسرے زمینداروں کو بندوبست کر دئے گئے تھے تو کم از کم مقرر کردہ وظیفہ بھی از روئے انصاف نسلاً بعد نسلٍ مقرر رہتا جیسا کہ گورنمنٹ نے پرگنہ بلونجا (پلاموں) کی نسبت اولاد و احفاد نواب ہدایت علی خاں اسد جنگ کے ساتھ قائم و برقرار رکھا ہے کہ پرگنہ بلونجا کی زمین تو دوسرے زمینداروں مثلاً بھوپ ناتھ ساہی و بھیا بھوانی سنگھ وغیرہ کے ساتھ گورنمنٹ نے بندوبست کر دی لیکن مبلغ نو ہزار روپیہ (۹۰۰۰) کی رقم سالانہ بطور وظیفہ پٹنہ کے سرکاری خزانہ سے نواب اسد جنگ کے ورثا کو ملا کرتی ہے نیز لوگوں کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے وثیقوں کو بیچ ڈالیں چنانچہ اولاد و احفاد نواب اسد جنگ نے تقریباً کل وظیفے فروخت کر دئے ہیں اور دوسرے اضلاع کے غیر متعلق حضرات انہیں خرید کر ہنوز مستفید و مستفیض ہو رہے ہیں۔

(۱) نواب داؤد خاں کی اولاد و احفاد کا ذکر کتاب دستور العمل مشتمل بر دستور بادشاہان سند قلمی نسخہ ص ۱۴ ب (مملوکہ بابو رام بہادر عرف بابو چھوٹے لال محلہ ہر مندر کی گلی پٹنہ سٹی) سے ماخوذ ہیں۔ اگر قارئین کرام نے ناچیز کی اس کاوش و سعی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور راقم السطور کو ہمت دلائی تو پھر ان شاء اللہ کسی آیندہ فرصت میں نواب داؤد خاں کی اولاد و احفاد کے متعلق ایک مستقل مضمون لکھنے کی بلیغ کوشش کروں گا۔

وما توفیقی الا باللہ وعلیہ التکلان۔

از پئے کار جہاں کارگذارے باشد
مرد کاراں کہ ہمہ وقت بہ کارے باشد

شیر شاہ کا کردار نئی روشنی میں

از جناب عبد الباقی خاں صاحب بی۔ اے جامعی

دنیا کا کیا کہنا، اخلاقیات کے بندھے بندھائے ضابطوں کی کسوٹی پر پرکھنے کی عام کوشش کچھ فلاطونوں ہی کا خاصہ نہ تھا، بلکہ طنزیات کے موجودہ ماہر اکسفورڈ کے استاد پروفیسر ناہلے کا بھی ایک خاص فن ہو گیا ہے جنھوں نے لندن کی مجلس ارتباط علمی میں تقریر کرتے ہوئے کہا:-

"شیر شاہ بڑا سے شاہ ہو لیکن جب تک اس کی شخصیت میں علیت اور ادبیت کی چاشنی نہیں ملتی، ہم تو اسے معمولی سا پٹھان ہی سمجھیں گے، جو چیزیں لوٹ بھی سکتا ہے، اور دنیا کی سب سے بڑی امپیریلزم کو ننگی کا ناچ بھی نچا سکتا ہے۔"

ہمیں خیال ہوا کہ پروفیسر صاحب کی تسکین کے لئے کچھ لکھا جائے، اور ندیم کا بہار نمبر ان کی خدمت میں ان تمہیدی فقروں کیساتھ بھیج دیا جائے

"مغرب کے لئے مشرق کو سمجھنا، طنزیات کا کام نہیں ہے ورنہ آپ ندیم کا بہار نمبر ضرور پڑھ سکتے، اور چونکہ آپ اردو نہیں پڑھ سکتے اس لئے طنزیات کی استادانہ مہارت کے باوجود آپ کو ہم دانا پور رجمنٹ کے اس گورے ٹامی سے زیادہ کیا سمجھ سکتے ہیں جو ہندوستان پر حکومت کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔"

ہمارے پاس شیر شاہ کے معتمد خاص اور رشتہ کے چچا ناظم خاں کا ایک مخطوطہ ہے۔ اس کی ایک نقل رام پور کے کتب خانہ میں دیکھنے کا اتفاق ہوا اور دوسری نقل امپیریل لائبریری کلکتہ میں بھی ہے۔ رام پور کا نسخہ ہمارے ذاتی نسخہ کی واقعی نقل معلوم ہوتا ہے۔ امپیریل لائبریری کا نسخہ بہت مسخ ہے اور کرم خوردہ بھی۔ صحافتی مصروفیتوں اور نجی جھمیلوں نے اب تک موقع نہ دیا کہ میں ان تینوں نسخوں کا موازنہ کروں اور اس اہم کام کی ترتیب کا وہ فرض انجام دوں جو ایک قیمتی امانت کے امین کی حیثیت سے مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ میں سر دست اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ وہ نسخہ جو میرے پاس ہے صحیح کیوں مانا جائے اور وہ مجھے کیسے ملا۔ یہ ایک مستقل بحث ہے۔ اور کسی دوسری فرصت کا محتاج۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ابھی تو اتنا ہی کیا جائے گا کہ اس نسخہ کے کچھ اقتباسات جو میرے موضوع کے لئے کافی ہیں پیش کئے جائیں گے۔ اس کتاب کا نام "شیر اللہ" ہے اور زبان کچھ تو فارسی اور کچھ اس زمانہ کی چالو ہندی ہے۔ یہ نسخہ کسی طرح چھپ سکے تو اس سے یہ اندازہ بھی ہو گا کہ عہد شیر شاہی کی زبان کیا تھی، اور خود شیر شاہ زبان کے بارے میں کیا رائے رکھتا تھا۔ اس مخطوطے میں مکالمے بڑی کثرت سے ہیں اور اس مضمون میں انہی مکالموں پر قناعت کی جائے گی۔ راقم الحروف نے زبان اپنی لکھی ہے، کہیں کہیں ہندی رہنے دی ہے۔ تاکہ زبان کے مسئلہ سے جو لوگ دلچسپی رکھتے ہوں وہ عہد شیر شاہی کے ایک اہم مسئلہ کا پس منظر دیکھ سکیں کوشش کی گئی ہے کہ مضمون کی دلچسپی باقی رہے اور یہ قارئین کے لئے بوجھل نہ ہو۔

شیر شاہ مابعد الطبیعاتی مسائل پر گفتگو کر رہا ہے۔ خدا کی صفات پر بحث کرتے کرتے، وہ جنت کا تصور کرتا ہے۔

شیر:- تو جنت کیا سچ مچ کوئی "عشرت خانہ" (یہ شیر شاہ کی اصطلاح ہے)

ناظم:- مسلمان تو اسے اعمال حسنہ کا انعام ہی جانتے ہیں۔

شیر:- تو مجھ ایسا خدا کا ایک عاجز بندہ بھی جنت کی تعمیر کر سکتا ہے اور تم ایسے نیک صفت غلاموں کو اس میں بند کر سکتا ہے۔

ناظم:- اسے زندیقیت کہیں گے جہاں پناہ!

شیر:- زندیقیت یہ ہے، یا وہ جو جنت کو ایک کھلونا بنائے۔

ناظم :- تو پھر کیا ہونا چاہئے -
شیر :- جنت ہر بندے کے دائیں ہاتھ میں ہے - بندہ دنیا ہی میں جنت اور دوزخ بنا لیتا ہے - ہر اچھے عمل کے صحیح نتیجہ کا نام جنت اور ہر برے عمل کے برے نتیجہ کا نام دوزخ ہے - پاکیزہ اور بلند روح کی انتہائی سرشاری جنت کی مثال ڈھونڈھتی ہے -

ناظم خاں خاموش ہو جاتا ہے - گفتگو کا موضوع بدلتا ہوا 'روح' پر سمٹ آتا ہے -

شیر :- بندے کو یہ جاننے کی خواہش تو ہونی چاہئے کہ روح کیا ہے ؟
ناظم :- نہ جاننا ہی اچھا ہے -
شیر :- میں "موفی خواہ" ہوں (یہ شیر شاہ کے الفاظ ہیں)، "ہندکوں پرانے پنڈتوں سوں پوچھو" (ہندوستان کے پرانے پنڈتوں سے پوچھو) -
ناظم :- وہ بھی کچھ ٹھیک جواب نہیں دیتے -
شیر :- جواب نا ہیں اتر کہو - (جواب نہیں - اتر (معنی جواب) کہو - اچھا ہم سے سنو - روح وہ شکتی (یہ شیر شاہ کا لفظ ہے) ہے جو آدمی میں کچھ کرنے کی طاقت دیتی ہے - یہ روح ہی تھی، جس نے ہم سے اتنا بڑا کام کرایا کہ میں آج بادشاہ ہوں - لیکن میری روح صاف نہیں ہے - ہمایوں کی روح زیادہ صاف ہوگی، مظلوم روحیں صاف ہوتی ہیں - اچھی ہوتی ہیں -

روح کی تعریف کتنی ہی ادھوری ہو لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ شیر شاہ نے ان مسئلوں پر سوچا اور شاید معقول بات کہی خصوصاً ہمایوں کا ذکر جس انداز سے کیا گیا ہے، وہ اس کی سیرت کی بلندی کا پتہ دیتا ہے - اپنے نفس کا اتنا کڑا محاسبہ کوئی سہل کام نہیں - ذرا شیر شاہ کی پوزیشن میں رہ کر اس بے لاگ تنقید کی داد دیجئے - یہ ایک فاتح انسان کا اپنی فتحمندیوں پر طنز ہے - تاریخ ایسی مثالیں کم پیش کر سکتی ہے -

---

ہندوستان کے علوم و فنون سے شیر شاہ کو کتنی دلچسپی تھی اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہوگا -

شیر :- مہا بھارت کی کہانیاں تم نے سنی ہیں ؟
ناظم :- بہت کم -
شیر :- تو پھر تم نے اس ملک پر رہ کر جانا ہی کیا -

ناظم خاموش رہا -

شیر شاہ کچھ سوچ کر بولا "میں چاہتا ہوں کہ مہا بھارت کے مضامین تمام دنیا تک پہنچ جائیں - اس میں فلسفہ اور حکمت کی بہت سی باتیں ہیں - اس کی بہت سی باتیں پرانے ایرانیوں کی کہانیوں سے ملتی جلتی ہیں - مجھے کچھ علما مل جائیں تو میں یہ ثابت کر دوں کہ ہند، ایران اور عرب میں بہت زمانہ سے میل جول چلا آتا ہے - دارا سے بھی پہلے پیش دادی اور کیانی خاندانوں تک کے زمانہ سے ہمارا سابقہ رہا ہے - ہندیوں کی مقدس کتاب رامائن بھی بہت خوب ہے - مہا بھارت میں جو دھشٹر کے تخت و تاج سے دست بردار ہونے کا واقعہ بالکل شاہنامہ میں کیخسرو کے عزل سلطنت کے واقعہ سے ملتا جلتا ہے - رامائن میں سیتا مہا رانی (یہ شیر شاہ کا انداز بیان ہے) اور راون کا قصہ شاہنامہ کے ہوماتی یہ آفرید اور ارجاسپ کے قصہ سے مشابہ ہے -

ناظم :- یہ کام تو بڑا مشکل ہے -
شیر :- آدمی مشکل کام کرنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے -

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ کی نظر کتنی وسیع تھی اور فن علم الانسان اور علم آثار قدیمہ پر اس کی فطرت صالح کو کتنا عبور تھا -

کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ اکبر نے مہا بھارت کے فارسی ترجمہ کا جو کام شروع کرایا - اور ابو الفضل، نسبت خاں، مولانا عبد القادر بدایونی، شیخ سلطان تھانیسری، ملا شیری اور شیخ فیضی وغیرہ نے جو کچھ کیا، وہ شیر شاہ ہی کے زرخیز دماغ کی اپج تھی - شیر شاہ نے رہنمائی کی دوسروں نے اس کی تقلید کی -

---

شیر شاہ کے پیش نظر شاید ہندوستان کی مکمل تمدنی تاریخ کی ترتیب تھی۔ اسے صرف ہند قدیم کی تمدنی تاریخ سے دلچسپی نہ تھی، بلکہ وہ قرون وسطیٰ اور اپنے زمانہ کی تاریخ کو بھی اتنا ہی ضروری جانتا تھا۔ اس لئے کہ ماضی اور حال کے رشتے جب تک جوڑے نہ جائیں تمام تحقیقات نہ صرف ارتقا کے بھی برعکس ہوگا اور انسانی زندگی کے لئے بھی کچھ مفید نہ ہوگا۔

ناظم خاں، شیر شاہ کی جدت طبع کی تعریف کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"شیر شاہ کم سخن آدمی نہ تھا، لیکن ایک دن خلاف معمول وہ بہت خاموش تھا۔ کئی پہر کی خاموشی کے بعد وہ بولا 'کتنا اچھا ہو کہ میں ہند کی ہر اس اینٹ کو بچا سکوں جو ہندوستان کے مسلمان تاجداروں نے تیار کرائی۔ فلک سب کچھ بھول جائے لیکن اسے یہ نہ بھولنا چاہئے کہ محمدؐ کی امت نے بھی ہند کو سجایا اور سنوارا۔ کاش! میں کوئی ایسی چیز بنا سکتا جسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے'!"

شیر شاہ شاعر نہ تھا، لیکن اس نے طبیعت موزوں پائی تھی۔ حسینی شاہ[1] کا بیان اگر صحیح مان لیا جائے اور اس کے مان لینے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی تو شیر شاہ کے یہ اشعار آج بھی سہسرام کی پہاڑیوں پر سیتا کنڈ کے قریب ملہار کے دھن میں گائے جاسکتے ہیں

برکھا شب کے ہوت ہیں   بھور بھی ہوگویں بھینک
دل مارا مضطر ہووے   سبزہ ڈولت پینگ
خوشتر ہووے سارا عالم
بدھنی بھی سو گوی نیند

(یعنی راتوں کو بارش ہوتی ہے۔ بھور بھی بھینگ گئی ہے۔ دل میرا بے چین ہے۔ سبزہ اس طرح ڈول رہا ہے جیسے کوئی پینگیں مار رہا ہو۔ سارے عالم کو خوش ہونا چاہئے۔ اس راحت بدھنیاں بھی گہری نیند سو گئی ہیں)۔

موضوع کا انتخاب کتنا انوکھا ہے، ہندوستان کی برسات دنیا کو متوالا بنا دے اور وہ تو پھر شیر شاہ ہی تھا! انداز بیان بھی بہت ستھرا ہے۔ ممکن ہے یہ اشعار فن عروض کی پابندیوں کی تاب نہ لا سکیں لیکن پھر بھی ایک سچے آدمی کے سچے تاثرات ہیں جو دل میں پیر جاتے ہیں غور طلب بات یہ بھی ہے کہ اس زمانہ کی ہندی یا اردو کی شکل کیا تھی اور اب تک اس نے کتنی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔

آکسفورڈ کے ماہر طنزیات کو شاید یہ جواب کافی ہو۔ لیکن اسی سلسلہ میں ایک موضوع اور بھی چھیڑ دیتا ہے اور اسے تشنہ بھی چھوڑ دیتا ہے۔ حکومت کے آجکل بہت سے طریقے علم السیاست نے مان لئے ہیں۔ جمہوریت، اشتراکیت، آمریت، شخصی اقتدار وغیرہ وغیرہ۔ شیر شاہ اس مسئلہ پر یوں سوچتا ہے:۔

حکمرانی پیدائشی ہے تو میری ہے لیکن یہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ خدا ایک ہے اور فردیت (یہ شیر شاہ کا لفظ ہے) اسی کی شان ہے۔ جو اس بارے میں اس کی نقالی کرتا ہے وہ مشرک ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے کہ کچھ کچھ میں بھی مشرک ہوں۔ حکومت تو اس کے بندوں کو کرنی چاہئے تاکہ وہ اپنی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ اپنی برائیوں سے بھی۔ ایک شخص میں بہت سی اچھائیاں بھی سمٹ آتی ہیں اور بہت سی برائیاں بھی۔ حکومت بہت لوگوں میں بانٹ دی جائے تو اچھائیاں اور برائیاں بھی بٹتے بٹتے نفی کے برابر ہو جائیں۔ خدا مجھے توفیق دے کہ میں اسکے عام بندوں کی حکمرانی میں ایک ادنیٰ غلام ثابت ہوں۔

... ہندوستان کے پٹھان بادشاہ سیدھے سادے طور سے سوچا تھا۔ کیا امید کی جائے کہ آکسفورڈ کے ماہرین ... شیر شاہ کے اس نظریہ کا اسی طرح تجزیہ کریں گے جس طرح افلاطون، روسو، ہابس، لاکس اور ہل کے نظریوں کا کرتے ہیں۔

---

[1] حسینی شاہ ... سہسرام کے پڑوس میں رہتے تھے اور شاعری ہی ان کا ذریعہ معاش تھی۔ انھوں نے اپنے تذکرے میں جو مخطوطہ ہے، یہ دعویٰ کیا ہے کہ شیر شاہ شاعر بھی تھا۔ ... سلسلہ بیان کی دلچسپی قائم رکھنے کے لئے راقم الحروف نے اس کا ذکر کر دینا بھی مناسب جانا۔ ع۔ ب۔

صوبۂ بہار کے آخری ہندوستانی گورنر

انتظام الملک ممتاز الدولہ مہاراجہ کلیان سنگھ بہادر تہور جنگ

(از جناب سید حسن عسکری ایم اے، بی ال، پروفیسر شعبہ تاریخ پٹنہ کالج)

تاریخ ہندوستان سے دلچسپی رکھنے والے **خلاصۃ التواریخ** اور **واردات قاسمی**[1] کے مصنف سے ناآشنا نہیں، لیکن اردو داں طبقہ مہاراجہ کلیان سنگھ **عاشق** کے حالات اور سیاسی و ادبی کارناموں سے بہت کم واقف ہے۔ اور جہاں تک راقم السطور کی محدود معلومات کا تعلق ہے شاید مرحوم مؤلف تاریخ شعرائے بہار اور **دیبی پرشاد** مرتب تذکرہ شعرائے ہنود سے زیادہ ہی **عاشق** ایسے سیاسی انسان اور لغزگو شاعر کی حالات پر کسی اور نے روشنی نہیں ڈالی ہے، مگر دو تین صفحات کی بساط ہی کیا۔ یوں کہنے کو تو اردو میں لکھی ہوئی بہار کی دو عدد تاریخیں بھی موجود ہیں مگر مہاراجہ کلیان سنگھ کا ذکر ان میں معقود ہے، ممکن ہے کہ تاریخ بہار کے مؤلفین کو مہاراجہ کلیان سنگھ کی تصنیفات کے مطالعہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

مہاراجہ موصوف نے اپنی تصنیف خلاصۃ التواریخ کے شروع میں اپنے والد بزرگوار کے "حالات و واردات" "سوانحات و واقعات" کے متعلق محض چند سطروں پر اکتفا کیا ہے اور اس "داستان معجز نشان اور امر خطیر" کو وقت فرصت کے لئے اٹھا رکھا۔ جو افسوس کہ میسر نہ ہو سکا۔ مگر ہماری خوش قسمتی سے آگے چل کر اسی کتاب میں جابجا اشارات بلکہ جزوی اور تفصیلی واقعات بھی کہیں کہیں مل جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے اوائل میں لکھی ہوئی فارسی تاریخیں بالخصوص سیر المتاخرین، تحفۂ تازہ وغیرہ، انڈیا گورنمنٹ دہلی کے دفاتر (جن تک دسترس بغیر دشواری اور خرچ کثیر ممکن نہیں) مسٹر ہینڈ مجسٹریٹ شاہ آباد (آرہ) کی مختصر کتاب سر ولیم ہنٹر کے مرتب کردہ بنگال اگزیکیٹو میں پٹنہ گزیٹر اور فارسی خطوط کی چھ بیش قیمت اور کارآمد جلدیں (جنہیں امپیریل ریکارڈ ڈپارٹمنٹ نے کلینڈر کے نام سے وقتاً فوقتاً شائع کر دیا ہے) اپنے دامن میں مہاراجہ کلیان سنگھ کے سیاسی اور کسی حد تک نجی سوانح زندگی کے متعلق بہت کچھ مفید معلومات رکھتی ہیں۔ فارسی تذکرہ کی کتابوں میں بھی خال خال حالات ملتے ہیں جو نہایت تشنہ ہیں، اور جن تذکروں میں نسبتاً زیادہ حالات پائے جاتے ہیں وہ لندن[3] اور پیرس کے کتب خانوں کی زینت ہیں، المختصر مہاراجہ کلیان سنگھ کے حالات پر بہت کچھ مواد موجود ہے مگر اکثر کتابیں کمیاب اور عسیر الحصول ہیں۔

اتنی تگ و دو کی کسے فرصت ہے کہ ان تمام دقت طلب ذرائع کی چھان بین کر سکے مگر خوش قسمتی سے راقم السطور کو شہر پٹنہ میں مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق کے چند نادر الوجود تصانیف کے اولین قلمی نسخوں کے دیکھنے اور انگریزی میں ان پر مختصر نوٹ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ چنانچہ ان اوراق کے سرسری مطالعہ سے اہمیت واضح ہو گئی اور یہ خیال پیدا ہوا کہ اس زریں موقعہ سے فائدہ نہ اٹھانا اور اب بھی عاشق ایسے باکمال کو منظر عام پر لانا انتہائی ظلم ہو گا، اس لئے سر دست پٹنہ میں جو مواد

راے تاراچند
راجہ ہمت سنگھ بہادر
رائے مہتاب رائے عرف منا لال خزانچی مہاراجہ شتاب رائے — مہاراجہ شتاب رائے
بیٹی = سندر لال برادر گوپال جی — بیٹی = گوپال جی دھوی
ایسری پرشاد — شام جی لاولد — رام جی
بابو علونی پرشاد — بابو راجہ بہادر
بابو [illegible] — بابو سورنا تھ مصنف

[1] اضلاع پٹنہ و شاہ آباد کے متعلق فرانسس بوکانن کا جرنل۔ [2] یہ دونوں دراصل ایک ہی کتاب کے دو حصے ہیں۔ عظیم آباد میں $\frac{19}{27}$ ۱۲ ف ۱۲ ھ مطابق سنہ ۱۸۱۹ء میں انکی تکمیل ہوئی۔ پیش نظر قلمی نسخہ نواب زادہ سید محمد مہدی صاحب چیرمین پٹنہ میونسپلٹی سے راقم الحروف کو مستعار ملا جسکے لئے موصوف کا شکریہ واجب ہے۔ [3] محترمی قاضی عبد الودود صاحب بیرسٹر پٹنہ کی نظر سے یہ تذکرے بالخصوص تذکرۂ شورش و تذکرۂ عشقی گذر چکے ہیں۔ [4] کلیان سنگھ کے چچا مہتاب رائے کا براہ راست سلسلہ اب بھی موجود ہے۔ انکے اخلاف میں ایک معمر بزرگ بابو بھگوتی پرشاد سے راقم السطور کو نیاز حاصل ہے، اور موصوف کے پوتے بابو رامیشر ناتھ بی۔ اے بی۔ ایل راقم کے کالج کے ساتھی اور دوست ہیں، کئی قلمی نسخے اور ضروری کاغذات موصوف کے پاس سے دستیاب ہوئے۔

بآسانی مل سکا اس کی مدد سے مہاراجہ کلیان سنگھ کے سوانح زندگی کا مختصر خاکہ کھینچنے کی سطور ذیل میں کوشش کی گئی ہے۔ مفصل سیر حاصل مقالہ جو کل ماخذات کا نچوڑ ہو، شاید انگریزی میں کبھی پیش کرنے کی نوبت آئے، السّعی مِنّی والاتمامُ مِنَ اللہِ،

مہاراجہ کلیان سنگھ المتخلص بہ عاشق شاہجہان آباد دہلی کے ایک مشہور سکینہ کا یستھ خاندان کے ممتاز فرد تھے، خاندانی امتیاز اس سے ظاہر ہے کہ مہاراجہ کے پردادا تارا چند[۱] نواب اسد خاں وزیر اعظم و وکیل مطلق اور اُن کے فرزند امیر الامرا ذوالفقار خاں کے[۲] ابتدائے عروج دولت "اسے" "زمانِ زوال"، (۱۷۱۳ء) تک "دیوان اور متصدی مہمات"، تھے - مہاراجہ کے دادا رائے ہمت[۳] سنگھ: خواجہ عاصم یعنی امیر الامرا صمصام الدولہ خاں دوران اور اُن کے بیٹے مرزا عاشق عاشوری یعنی صمصام الدولہ دوم کے نہایت خیر خواہ دیوان تھے، اور نادر شاہ جیسا مردم شناس حکمران رائے ہمت سنگھ کی وفاداری، لیاقت، جرأت اور کاردانی کا معترف تھا، چنانچہ مہاراجہ کلیان سنگھ کا ۵۱ اشعار کا قصیدہ[۴] جو صمصام الدولہ کی شان میں کہا گیا، اور خلاصۃ التواریخ کے صفحات پر موجود ہے، مذکرہ تعلقات پر کافی روشنی ڈالتا ہے - مہاراجہ موصوف کے نامور باپ ممتاز الدولہ مہاراجہ شتاب رائے منصور جنگ کے حالات زندگی رسالہ ندیم کے گذشتہ بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں شایع ہو چکے ہیں اگرچہ "کیلنڈر" انگریزی دفاتر اور بالخصوص خلاصۃ التواریخ سے اس جلیل القدر اور عظیم المرتبت شخصیت کی (جس نے انگریزی راج کے قایم کرنے میں ہندوستانیوں میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا) مفصل تاریخ پیش کرنے کی نہ معلوم کیوں ضرورت نہیں سمجھی گئی، بہرحال ہم دیکھتے ہیں کہ مہاراجہ کلیان سنگھ خاندانی اعتبار سے ایک موقر ہستی اور "عمدہ زادگان ہند" میں سے تھے، اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے دوسرے افراد کی مانند ان کا شمار نو دولتوں میں نہیں ہو سکتا، مگر بد قسمتی سے اوروں کی طرح ان کی ابتدائی زندگی بھی بڑی حد تک پردۂ خفا میں مستور ہے -

مہاراجہ موصوف کی پیدائش کے متعلق ان کی خاندانی روایات بتاتی ہے کہ مہاراجہ شتاب رائے کو رانی سے (جو ان کے کفو کی تھیں) بہت دنوں تک کوئی اولاد نہیں ہوئی، یہاں تک کہ ان کی دوسری غیر کفو کی بیوی چندا بائی نے (جو خود بھی لاولد تھی) ایک لڑکے مسمٰی خوشحال سنگھ کو گود لیا، اور اس کی پرورش و پرداخت بیٹے کی طرح ہونے لگی، مگر قدرت کے کرشموں سے کون واقف ہے، تھوڑے دنوں بعد رانی صاحبہ پر اللہ نے فضل کیا اور یکے بعد دیگرے دو فرزند کلیان سنگھ او بھوانی سنگھ عطا کیے اور ان دونوں بیٹوں کی پیدایش کے بعد مہاراجہ شتاب رائے کی مذکورۃ الصدر بیوی حاملہ مشہور ہوئیں اور ایک بچہ جو آگے چل کر بسنت رائے کے نام سے مشہور ہوا معرض ظہور میں آیا - قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو، بسنت رائے کی اولاد تو باقی ہے، نیز خوشحال سنگھ کا سلسلہ بھی خواہ وہ گود ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہو قایم رہے، لیکن کلیان سنگھ اور بھوانی سنگھ، جو مہاراجہ شتاب رائے کے حقیقی جانشین اور جائز وارث تھے اُن کا سلسلہ منقطع ہو گیا[۵] ، شاید اس عالم فانی کے کسی فرد کی "نسلاً بعد نسلٍ" "سالیانۂ مستمرہ" اور "جاگیرات بصیغۂ استمرار" کی پیہم تکرار تقدیر الٰہی کو ناگوار گذری فاعتبروا یا اولی الابصار

مہاراجہ کلیان سنگھ اپنے آبائی وطن دہلی میں پیدا ہوئے (معراج الخیال از عبرتی) پیدایش کی تاریخ کا اندازہ ایک آٹھ ہزار ابیات کی فارسی مثنوی "تاریخ زیبا" سے جو انہوں نے اپنے تیسرے بیٹے مسمٰی کنور حشمت سنگھ عرف راجہ ڈھولن کے لیے جو ایک بیگم کے بطن سے تھے اور جسے انہوں نے

۵

شتاب رائے = بی بی = چندا بائی

- کنور بھوانی سنگھ
- مہاراجہ کلیان سنگھ
  - کنور حشمت سنگھ عرف راجہ ڈھولن
    - ڈھولو راجہ
    - راجہ بندہ علی
    - راجہ برکت حسین
    - وغیرہ وغیرہ
  - کنور دولت سنگھ
    - سیتا بی بی = راجہ ٹیکیت راؤ
    - لکھنوی
    - مہاراجہ مہو سنگھ
      - کنور روپ سنگھ — لاولد — متوفی ۱۹۰۶ء
      - مہابت سنگھ D. 1877 — سری پت سنگھ — متوفی ۱۸۸۷ء — ٹھاکر لال صاحب
- رائے بسنت رائے
- مہاراجہ خوشحال سنگھ
  - راجہ نند لال
  - راجہ سلطان بہادر
  - بادشاہ بہادر
  - ملک شام بہادر

[۱] خلاصۃ التواریخ صفحہ ۱۱۴

[۲] " " صفحہ ۱۳۰

[۳] " " صفحہ ۱۳۰ - ۱۳۴

[۴] ان کے خاندان میں سب سے زیادہ وقیع شخصیت رائے سلطان بہادر (دیوان محکمہ پٹنہ) کی تھی، بہار و اڑیسہ ریسرچ جرنل دسمبر ۱۹۳۲ء میں راقم السطور کا ایک مقالہ رائے موصوف کی لائبریری اور اس کے ایک مخطوطہ کے متعلق شایع ہو چکا ہے -

[۵] خلاصۃ التواریخ میں یہ فقرے متعدد مواقع پر ملتے ہیں -

زمانہ قیام کلکتہ اور نابینا ہونے کے بعد لکھوائی تھی، ہو سکتا ہے اس تصنیف کے تتمہ میں مہاراجہ موصوف فرماتے ہیں ؎

تمام این مثنوی شد در دو سہ ماہ　　　شد آخر داستان الحمد للہ
تمامی داستاں چوں کردم انشار　　　نہادم نام او تاریخ زیبا
گذشت از عمرم اکنوں شصت و شش سال　　　بود ضعف و نقاہت عائد حال

پیش نظر نسخہ ۲۵ ر ذالحجہ سنہ ۱۲۳۱ہجری کو بمقام چیت پور کلکتہ اختتام کو پہنچا، نیز تاریخ "زیبا" کے الفاظ سے بھی یہی سال یعنی سنہ ۱۲۳۱ھ (مطابق سنہ ۱۸۱۵ء) نکلتا ہے، چنانچہ اس حساب سے مہاراجہ کلیان سنگھ کا سال پیدائش (۶۶ - ۱۲۳۱) سنہ ۱۱۶۵ہجری قرار پاتا ہے۔

جس شخص کا خاندان دربار دہلی سے منسلک اور امرائے عظیم الشان سے عرصۂ دراز تک متوسل رہا ہو، جسکے فضل و کمال کی نہ صرف اسکی تصانیف نظم و نثر بلکہ فقیر خیر الدین جیسا فاضل ہمعصر مورخ بھی شہادت دے، اور جو شتاب رائے ایسے شفیق چچا کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھا ہو اُس کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کی تحقیق و تفتیش تحصیل حاصل ہے۔

ابھی مہاراجہ کلیان سنگھ کا عہد طفولیت ہی تھا جب کہ سنہ ۱۱۶۷ہجری میں ان کے باپ راجہ شتاب رائے کو "فتنہ ساز"، غازی الدین عماد الملک نے صمصام الدولہ (دوم) میر آتش کا نائب مقرر کیا (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۱۶۶) اور چند سال بعد جب غالباً سنہ ۱۱۷۱ہجری میں بادشاہ و وزیر (عماد الملک) کی طرف سے راجہ شتاب رائے کو دیوانی خالصہ شریفہ بہار اور صمصام الدولہ کی جاگیرات بہار و بنگال کے انتظام و بندوبست کی خدمت تفویض ہوئی (سیر المتاخرین صفحہ ۷۹۱) تو اس وقت راجہ شتاب رائے نے اپنے کمسن بچے کلیان سنگھ کو عماد الملک کے حضور دہلی میں چھوڑ کر خود عظیم آباد کی راہ لی، بہار میں راجہ رام نرائن نائب بہار کی مزاحمت و مخاصمت کا اندیشہ تھا (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۱۷۱) لیکن خوش قسمتی سے راجہ شتاب رائے کے ورود عظیم آباد کے قبل ہی سے میر جعفر اور کرنل کلایو اس شہر میں موجود تھے، چنانچہ میر جعفر اور کرنل کلایو کی معاونت کام آئی، کرنل کے ساتھ راجہ شتاب رائے مرشد آباد پہنچے اور بعد مراجعت کاروبار دیوانی کا قرار واقعی انتظام کیا (سیر المتاخرین صفحہ ۶۸۵)

گھر کا حال گھر والے بہتر جانتے ہیں، اگرچہ کلیان سنگھ اس وقت کمسن تھے مگر اُس زمانے کی بعض بہت پتے کی باتیں لکھ گئے ہیں، مثلاً چند سال بعد شتاب رائے کی وطن مالوف کی طرف لوٹنے کی خواہش - مسٹر امیٹ صاحب کلاں عظیم آباد کی بہار کے منصب داروں سے بادشاہ ہند سے ان کے تقرب کا حال سنکر میر جعفر اور انگریزوں سے دوستی کا ڈورا ڈالنا اور خیر خواہی کی درخواست اور ان کا مندرجہ ذیل جواب

" من سررشتہ کارہائے کمپنی انگریزی بحضور بادشاہ ہندوستان آنچناں پختہ کردہ دہم کہ تمام ملک بنگالہ بے شرکت دیگرے بدخل و تصرف کمپنی انگریز در آئندہ سالہائے دراز قایم ماند "

کرنل کلایو (مختار جمیع کارہائے کمپنی انگریز) سے مرشد آباد میں ملاقات "رفاقت دائمی نواب صاحب و کمپنی انگریز" کا عہد و پیمان اور بطور مزد اس کام کے انجام دینے کے بعد " خدمت نیابت صوبہ و نیابت دیوانی صوبہ مع یک لک روپیہ سالیانہ بطریق استمرار اور بہار کی جاگیرات و التمغا کے شتاب رائے اور کنور کلیان سنگھ کو دئے جانے کا قول و قرار، یہ کل باتیں نہایت دلچسپ ہیں، چنانچہ جب مندرجہ بالا قول و قرار پختہ و پرز ہوگیا تو بقول کلیان سنگھ

" مہاراجہ شتاب رائے و بندہ ہم از اینجا (بہار) تا شاہجہاں آباد محنت ہائے فراواں و سعی ہائے بے پایاں بعمل آوردہ سند صوبہ داری صوبجات بنگالہ و بہار و اڑلیسہ بنام میر محمد جعفر خاں و سند دیوانی صوبجات مذکورہ بنام کمپنی انگریزی از حضور بادشاہ ہندوستان کہ در آں وقت عالمگیر ثانی بود حاصل نمودہ حوالہ نواب صاحب و کرنل کلایو صاحب نمودہ " (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۵۹)

یہ طویل اور بظاہر موضوع سے غیر متعلق داستان نہ صرف دلچسپ بلکہ بہت ہی اہم ہے، اور اس میں کئی باتیں غور طلب ہیں اس لئے کہ کلیان سنگھ کی ساری سیاسی زندگی کی عمارت اُسی بنیاد پر قایم ہوئی جو ان کے باپ مہاراجہ شتاب رائے کے ہاتھوں ڈالی گئی۔ چنانچہ اگر مصنف خلاصۃ التواریخ کا مندرجہ بالا بیان صحیح مان لیا جائے تو سنہ ۱۷۶۵ء کے کئی سال قبل ہی دیوانی بنگال و بہار کی بات پختہ ہو گئی تھی اور عہد عالمگیر ثانی ہی میں شتاب رائے کے ذریعہ شاطران مغرب کی چالیں شروع ہو گئی تھیں، بنگال و مدراس کے مراسلات کلایو کی جلد اول میں دو خطوط مورخہ ۱۷ اپریل سنہ ۱۷۵۸ء عالمگیر ثانی اور وزیر غازی الدین کے نام ملتے ہیں، جن میں کلایو اپنے گذشتہ خطوط کا حوالہ دیتا ہے جو "چند ماہ قبل" لکھے گئے تھے، ان میں "فدوی شاہنشاہ"

شتاب رائے کے ذریعہ خطوط کے ارسال کا ذکر موجود ہے، اس کے علاوہ ایک مراسلہ شتاب رائے کے مربی وزیر غازی الدین کا کرنل کلایو کے نام مؤخر الذکر کے عرائض کے جواب میں بھی ہمیں اس جگہ ملتا ہے جس میں میر جعفر خان کے لئے سند صوبہ داری کے ارسال کی خبر ہے، البتہ سند دیوانی کے حصول کے لئے "شتاب رائے کی سعی بے پایاں،، کا کوئی دوسرا تحریری ثبوت عہد عالمگیر ثانی میں نہیں ملتا ہے، لیکن یہ یقینی ہے کہ جب شاہزادہ عالی گوہر (شاہ عالم ابن عالمگیر ثانی) کی تسخیر بہار کی پیہم کوششیں ناکام رہیں (وزیر غازی الدین کے عہد کے متعدد مراسلات شاہزادہ کے اسیر کئے جانے اور اخراج کے احکامات پر مشتمل کیلنڈر جلد اول میں موجود ہیں، شتاب رائے کی نہ صرف حکمت عملی بلکہ زور بازو بھی ان مواقع پر نمایاں تھا) تو ۶۱-۱۷۶۰ء میں دیوانی کی گفتگو شتاب رائے کے توسط سے شروع ہوگئی تھی، کلایو اور گورنر وانسی ٹارٹ کے خطوط اس کے شاہد ہیں، چنانچہ کیلنڈر جلد اول میں کئی خطوط اس مبحث پر موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شتاب رائے نے شاہ عالم سے دیوانی کا عطیہ پیش کرایا مگر نواب میر قاسم کے سخت احتجاج نے اس امر کو دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھنے پر مجبور کر دیا (مراسلات نمبر ۹۲- ۱۲۹۱ و ۴۰- ۱۳۳۸، اس ضمن میں قابل ملاحظہ ہیں)

سطور بالا سے معلوم ہوا کہ کلیان سنگھ کا بیان کسی حد تک حقیقت پر مبنی ہے، اگرچہ ان کے سن کا لحاظ کرتے ہوئے "بندہ،، کا لفظ بالکل ہی بے معنی ہے اور وعدہ وعید اور قول و قرار کی نوعیت بھی شبہ سے خالی نہیں، مگر اتنا ضرور ہے کہ سابقہ پڑتے ہی شتاب رائے کی دور رس اور مردم شناس نگاہ نے انگریزوں سے دوستی کے نتائج کا اندازہ کر لیا تھا لہذا ان کی بہی خواہی میں ہر ممکن کوشش شروع کر دی تھیں۔ میر جعفر نے تو نہیں، البتہ میر قاسم نے ہر ممکن خطرات کا احساس کیا اور اوّلاً انہیں پوٹنے کی کوشش کی، عذر (جو سنا نہ گیا) پیش ہوا "بالفعل ہوائے وطن و دیدن زن و فرزند کہ از مدت چہار سال در بلاد شرقیہ گذاشتہ آمدہ ام بسر افتادہ،، اس اثنا میں نواب نے شتاب رائے کی خلوت کی ملاقاتوں (خصوص راجہ رام نراین سے) کا حال سنا "کاوش ہائے بیجا شروع نمود،، جان کے لالے پڑ گئے۔ بارے انگریز اس آڑے وقت میں کام آئے، پہلے تو کلکتہ بھجوا دیا۔ بعد ازاں آں مسٹر لشنگٹن صاحب کو جو عظیم آباد نے اپنی حفاظت میں دریائے کرمناسا کے پار سرحد شجاع الدولہ میں پہنچا دیا۔ اس وقت اودھ میں مہاراجہ بینی بہادر کا دار و رہ تھا، فوراً دو ہزار سوار و پیادہ کی رسالہ داری مل گئی "عقل خداداد اور لیاقت و حسن کار آئی،، جس کے باعث بینی بہادر کے "نفس ناطقہ،، اور شجاع الدولہ کے منظور نظر ہوگئے، (خلاصۃ التواریخ ص ۲۶۲-۲۶۹)

بقول کرم علی اوائل ۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۱ء میں شتاب رائے جان سلامت لیکر بہار سے اودھ پہنچے (مظفر نامہ صفحہ ۷۶ ب) کلیان سنگھ شکر نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ (؟) اپنا پہنچنا اس سے "دو نیم سال،، قبل (یعنی ۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء) میں بتلاتے ہیں (خلاصۃ التواریخ ص ۳۲۶) یہ وہ وقت تھا جب عالمگیر ثانی کی شہادت، مرہٹوں کی تاخت، مغلوں اور روہیلوں کی کشمکش اور ابدالی کی آمد نے دہلی اور اس کے نواح میں ایک خلفشار مچا رکھا تھا، بدامنی عالمگیر ہو رہی تھی، جان و مال محفوظ نہ تھا، چنانچہ شتاب رائے کی ذریات کو دہلی چھوڑنا پڑا۔ بہت ممکن ہے کہ جس وقت شجاع الدولہ کی فوج دتاجی سیندھیا کے خلاف نجیب الدولہ روہیلہ کی مدد کرکے سکرتال سے واپس ہوئی ہو تو اس وقت کلیان سنگھ اور ان کا سارا خاندان ساتھ ہو لیا ہو، مگر عقل کسی طرح باور نہیں کر سکتی کہ آٹھ نو سال کا لڑکا دو ہزار سوار اور پیادوں کا رسالہ دار اور چار ہزار روپیہ کا تنخواہ دار ہو جائے، (خلاصۃ التواریخ ص ۳۴۷) خصوصاً اس حالت میں کہ "جہاندیدہ اور دانائے عصر،، باپ کی اسی دربار میں ملازمت کا آغاز اتنے ہی بلکہ اس سے کمتر رتبہ سے ہو (خلاصۃ التواریخ ص ۳۳۳) چنانچہ تقریباً ایسی ہی دقت ہمیں اس تفصیلی سرگذشت کی صحت کو تسلیم کرنے میں بھی ہوتی ہے جس میں کلیان سنگھ جنگ بکسر کے قبل و بعد میر قاسم (شکست خوردہ معزول و مغرور نواب بنگال و بہار) کے خلاف جو سازشیں ہوئیں ان میں اپنے ذاتی کارہائے نمایاں کا تذکرہ کرتے ہیں، چنانچہ ہم پہلے تقریباً ۳۸ صفحات پر پھیلی ہوئی طویل داستان کو چند لفظوں میں سمیٹنے اور بعد ازاں اس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالنے کی کوشش کریں گے ———
(خلاصۃ التواریخ صفحات ۳۳۰ لغایت ۳۶۷)

(۱) مہاراجہ شتاب رائے کی امور کمپنی سے دلچسپی برابر قائم رہی، یہی وجہ ہے کہ جب میر قاسم شجاع الدولہ کے پاس بہ امید اعانت پہنچا تو مہاراجہ موصوف نے اپنے متصدی سادھو رام کے ذریعہ سلسلہ جنبانی شروع کر دی اور میر جعفر اور صاحبان انگریز نے اپنے دشمن جانی کے اخراج اور تخریب کے لئے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا، خطوط و عرائض بادشاہ و وزیر کے نام اور چھ لاکھ ہنڈی بطور پیشکش شتاب رائے کے پاس سادھو رام کے ذریعہ ارسال کی۔

(۲) شتاب رائے نے ایک وقتی عارضہ کے باعث کلیان سنگھ کے ہاتھ یہ کاغذات مہاراجہ بینی بہادر اور مؤخر الذکر کی وساطت سے

نواب وزیر کے پاس بھیجے۔

(۳) کمسن لیکن ہونہار بیٹے (کلیان سنگھ) نے یہ ذمہ دارانہ فرائض بہ حسن وخوبی انجام دیے۔ پہلے انہوں نے بینی بہادر سے ملاقات کی اور (چوں مہاراجہ موصوف سواد خواندن نداشت) مضامین مکتوب پڑھکر سُنائے، کل امور کے حسن وقبح پر تشفی بخش گفتگو کی اور بالآخر بینی بہادر کو میر جعفر اور صاحبان انگریز کا "مربی وخیر خواہ" بنا ڈالا، پھر دونوں نواب وزیر کے پاس پہنچے، پہلے بینی بہادر نے کچھ دیر تک نواب سے آہستہ آہستہ گفتگو کی اس کے بعد کلیان سنگھ کو پیش کیا۔ یہاں بھی موخر الذکر کی بن آئی اور نواب نے کہا "ملتمسات شمارا کہ بحسن تقریر ادا نمودند قبول نمودم" اس کے بعد دونوں رخصت ہوئے، نواب کا خواجہ سرا راستہ سے کلیان سنگھ کو واپس لے گیا، ان کی کمربند سے نواب نے کل کاغذات لیکے ہاتھ سے نکالے اور ان میں سے پچاس لاکھ کی ہنڈی لیکر اپنی جیب میں رکھ لی اور ساد ھورام کی عرضی میں ہنڈی مذکور کی عبارت پر اپنے ہاتھ سے روشنائی انڈیل دی تاکہ بادشاہ کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔ جب بینی بہادر نے یہ سُنا مبارکباد دی کہ اب تیر نشانہ پر لگا،

(۴) شتاب رائے ساری روئداد سُنکر خوش ہوئے اور دوسرے روز بھی بادشاہ ووزیر کے پاس وکالت کے لئے کلیان سنگھ ہی کو منتخب کیا، یہ مرحلہ بھی حسب خواہ انجام پذیر ہوا۔ چنانچہ خلاصۃ التواریخ کی متعلقہ عبارت قابل ملاحظہ ہے:

> "تا دو گھڑی کامل دریں باب فیما بین بندہ وحضرت بادشاہ و نواب وزیر جواب سوالہا وتکرار ہا ومناظرہا بمیان ماند، آخر الامر بفضل الٰہی درباب معاملہ صوبجات بنگالہ و بہار بر بست و چہار لک روپیہ سالیانہ و دو لک روپیہ سالیانہ نواب وزیر و دو لک روپیہ نقد یکمشت بطریق پیشکش وعطاے سند صوبہ داری صوبہ بنگالہ وصوبہ اڑیسہ وصوبہ بہار بنام میر محمد جعفر خاں وسند دیوانی مذکور بنام کمپنی انگریز بہادر مع خلاع فاخرہ براے نواب صاحب وسرداران جماعۃ انگلشیہ و تقرر عہد ومیثاق محبت ووداد بتجدید حکم حضور شرف نفاذ یافت" (صفحات ۳۴۵ و ۳۴۶)

اس کے بعد اسناد، عہدنامے اور جواب عرائض منشی خانہ میں تیار ہوئے اور کلیان سنگھ کو سپرد کئے گئے، موخر الذکر نے لالہ کشمیری مل سے شجاع الدولہ کو چھ لاکھ روپے دلوائے، رقم مذکور کی رسید نواب کے دستخط اور مہر کے ساتھ وقت تحریر مصنف خلاصۃ التواریخ کے پاس موجود تھی۔

(۵) ان اسناد، عہدناموں، جواب عرائض اور خلعت ہائے فاخرہ کو میر جعفر اور سرداران انگلشیہ کے پاس جو اس وقت کرمناسہ کے دوسری جانب خیمہ زن تھے، پہنچانے کی خدمت بھی کلیان سنگھ ہی کو تفویض ہوئی تاکہ وہاں بھی ان کی "عزت وحرمت" کی بنیاد قایم ہو۔ کلیان سنگھ نے ملازمت کا عذر کیا، نواب وزیر نے نہ صرف اجازت دی بلکہ خلعت شش پارچہ سرپیچ مرصع قبضہ شمشیر، پالکی جھالردار، ایک زنجیر فیل ونیز راجہ کا خطاب بھی عطا کیا۔ راجہ کلیان سنگھ نے اپنے چچا مہتاب رائے کو اپنی نیابت میں نواب وزیر کے حضور میں چھوڑا اور اپنے رسالہ کے دو سو سوار اور تین سو پیادوں کو ساتھ لیکر حشم وخدم کے ساتھ الہ آباد سے مشرق کی جانب روانہ ہوگئے۔

(۶) دو روز کے بعد بنارس پہنچے، راجہ بلونت سنگھ (کہ آشنائے قدیم من بود) سے سرسری ملاقات کی اور اس سے میجر کارنک کے نام ایک خط لیا اور آگے روانہ ہوگئے، دو روز کے بعد داخل لشکر میر جعفر ہوئے، سادھورام نے ملاقات کی اور میر جعفر اور انگریزوں کے حالات سے مطلع کیا۔

(۷) جس وقت کلیان سنگھ لشکر نواب میں پہنچے میجر کارنک، میجر ادم، میجر فلیچر، میجر نوکس اور دو تین دوسرے صاحبان نے سروقد اٹھ کر تعظیم کی، بغلگیر ہوئے، اس کے بعد جب رخصت ہوئے تخلیہ ہوا، میر جعفر، سادھورام، راجہ کلیان سنگھ اور انگریزوں کے درمیان رازدارانہ گفتگو ہونے لگی، خطوط پیش ہوئے، دو گھڑی کامل باتیں جاری رہیں اور مشورے ہوتے رہے، راجہ نے اودھ والہ آباد کے حالات بتائے، اوضاع واطوار، تعداد فوج اور مالی الضمیر کا انکشاف کیا، پھر صحبت تمام ہوئی۔ دوسرے روز تین گھڑی دن چڑھے نواب میر جعفر مع انگریزوں کے بایادہ بادشاہ ووزیر کے وکیل یعنی راجہ کلیان سنگھ کے پاس پہنچے، موافق ضابطہ سلاطین ووزرا میر جعفر اور انگریز سرداروں کو خلعتیں پہنائی گئیں، میر جعفر نے ایک ہزار ایک اور ہر انگریز سردار نے ایک سو ایک اشرفیاں بادشاہ کی نذر کے لئے پیش کیں، سند صوبہ داری اور سند دیوانی بنام کمپنی انگریز بآواز بلند پڑھ کر سنائی گئی، راجہ کلیان سنگھ کو بھی خلعت شش پارچہ، پچاس ہزار روپے نقد بطریق انعام، اکیس عدد خوان پستول وبندوق اور بعض دیگر تحفجات فرنگ پیش کئے گئے۔ راجہ موصوف نے بھی پانچ اشرفیاں بطور نذر میجر ادم کے ہاتھ پر رکھ دیں، ہر طرف سے مبارکباد کا غل ہوا، خلاصہ یہ کہ آدھے دن تک یہ جشن قایم رہا۔

(۸) بعد ازاں راجہ کلیان سنگھ نے سادھورام کو بھی خلعت دلوایا اور اس کو دیوانی بادشاہی اور اپنی جاگیرات کے بندوبست کے لیے عظیم آباد روانہ

کرنے کے بعد راجہ بلوند سنگھ (کہ بنائے دوستی راجہ مذکور با کمپنی انگریز درست گردانیدہ بودم) کے عریضہ کا جواب حاصل کیا - اور سات روز انگریزی لشکر میں رہنے (ہر روز دو وقت ملاقات کرکے کارخود بوجہ احسن ساختم) کے بعد رخصت ہوئے - اور کرمنا سا عبور کرکے رام نگر میں پہنچے، بلوند سنگھ سے ملاقات کی، جواب عریضہ حوالہ کیا، (او را در ہر حال مطیع و فرمابردار کمپنی و صاحبان انگریز ساختم) رات کو وہیں قیام کیا، پھر روانہ ہوئے، پانچ چھ روز میں بمقام جھوسی (الہ آباد) شجاع الدولہ کے لشکر میں پہنچے،

(۹) وہاں پہونچکر فی الفور مہاراجہ بینی بہادر سے خلوت میں ملاقات کی، سب ماجرا کہہ سنایا لیکن موخر الذکر سے جب یہاں کے حالات معلوم ہوئے (کیونکہ میر قاسم حصول سند اور درستگی معاملہ کی خبر سنکر نواب سالار جنگ کے ذریعہ نواب شجاع الدولہ کی خدمت میں حاضر ہوا، جزاع وفزع شروع کی، شتاب رائے کو جمیع فتنہ و فساد کا بانی اور اپنا جانی دشمن قرار دیا اور اپنی دستار نواب وزیر کے قدموں پر رکھ کر اور دس لاکھ کی رقم پیش کرکے درخواست کی کہ شتاب رائے کا خاتمہ کر دیا جائے، لیکن نواب وزیر نے بدنامی کے ڈر سے استمداد و کمک کا تو قول و قرار کیا مگر شتاب رائے کو محض پرتاب گڈھ بھیجدینے پر اکتفا کی) تو راجہ کلیان سنگھ کے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے، بینی بہادر نے تسلی دی اور وعدہ کیا کہ "سر رشتہ محبت و وداد صاحبان عالیشان انگریز در ہر صورت از دست نخواہند داد کہ آخر بکار آن صاحب خواہد آمد"، خود شتاب رائے نے پرتاب گڈھ کی طرف جانے سے قبل بینی بہادر سے ملاقات کی تھی، اور "گفتگوئے کہ بابت نمودہ و جمیع مراتب را فہمانیدہ مرخص شد"، یہی وجہ تھی کہ بینی بہادر اپنے عہد پر دل سے قائم رہا "کہ در جنگ بکسر تن نداد"

(۱۰) اس کے بعد کلیان سنگھ نواب وزیر کے مجرے کو حاضر ہوئے، بے رخی پائی، نہایت دلتنگ ہوئے، بارے جب تخلیہ ہوا تو نواب نے راجہ کو سینہ سے لپٹا لیا، خیر و عافیت پوچھی، اطمینان دلایا کہ بمصلحت شتاب رائے کو پرتاب گڈھ روانہ کیا گیا ہے، اور بدستور معمول کلیان سنگھ اپنی جگہ پر سرفراز رہیں گے، البتہ موذی میر قاسم کے سامنے حضور میں آنے کی ممانعت ہوئی، کلیان سنگھ نے موقع پاکر میر قاسم کی تلون مزاجی، انگریزوں کی راسخ الاعتقادی اور باوجود قلت فوج جنگ کے کاموں میں وحید روزگار ہونے پر ایک پرزور تقریر کردی جس کے جواب میں نواب نے بس اتنا کہا کہ "باید دید"

شتاب رائے کی انگریزوں کی خیر خواہی مسلسل رسل و رسائل اور سادھو رام کے ذریعہ سلسلہ جنبانیوں کا ثبوت کیلنڈر جلد اول میں موجود ہے - بیٹے کی سیاسی تعلیم کے لیے مواقع کی فراہمی کی خواہش و کوشش بھی ایک فطری اور قرین قیاس امر ہے، چنانچہ بینی بہادر کی حاکمانہ بنگال کی جانب نظر عنایت، بلوند سنگھ راجہ بنارس کا صاحبان انگلشیہ سے ارتباط، ان دونوں کی جنگ بکسر میں اپنے آقا نواب وزیر سے میر قاسم اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث غداری کے شواہد[۵] کی بھی کمی نہیں - سنڈی کا معاملہ بھی شجاع الدولہ کی طینت سے بعید نہ تھا اور نواب کی مہر و دستخط سمیت رسید کی مصنف خلاصۃ التواریخ کے پاس بروقت تحریر موجودگی نظرانداز نہیں کی جاسکتی، گورنر بنگال اور انگریز سرداروں کی نواب وزیر سے مراسلات، صوبہ داری کے اسناد اور میر قاسم کے خلاف کارروائیوں کی استدعا بھی مختلف دوسرے[۶] ذرایع سے ثابت ہے، شجاع الدولہ کا میر قاسم کو سبز باغ دکھانا، تعلقات کی کشیدگی، موخر الذکر کی بیچارگی، سالار جنگ کی وساطت سے نواب وزیر کا رام کیا جانا، شتاب رائے کا بمصلحت الگ کیا جانا، میر جعفر اور اس کے انگریز حامیوں کا میر قاسم کی اس جدوجہد کا سمجھنا، صوبہ جات مشرقی کی صوبہ داری کے اسناد اور غالباً ۲۲ لاکھ سالانہ خراج کی گفتگو، یہ سب باتیں بھی تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔

سیمینہ زیادہ اپنی تفصیلی سرگذشت، بیانات کے چشمدید اور بہر اوراق کے ذاتی مشاہدہ پتہ دیتی ہے مگر ان حقایق کے باوجود کلیان سنگھ کے بیانات خصوصاً ان کی ذاتی کارگذاریوں کی لمبی چوڑی فہرست کی حقیقت و صحت کو تمام تر تسلیم کرنے میں چند دقتیں حائل ہیں، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ۱۱۷۷ھ ۱۷۶۳-۶۴ء میں (جس وقت کے واقعات حوالہ قلم کیے گئے ہیں) ان کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی، ظاہر ہے کہ بادشاہ و وزیر اور انگریز ایسے ماہرین سیاست کے درمیان سفارت و وکالت کے اہم اور ذمہ دارانہ فرایض کا بار محض ایک نوخیز لڑکے خواہ وہ کتنا ہی بلا کا ذہین اور معاملہ فہم کیوں نہ ہو، کے کمزور کاندھوں پر ہرگز ڈالا نہیں جاسکتا، البتہ اس کا سیاست کے کسی ماہر شاطر کے ساتھ شمولیت و معیت کسی حد تک تسلیم کی جاسکتی ہے، نیز راجہ بلوند سنگھ کے "آشنائے قدیم" ہونے کا فقرہ بھی بحث طلب ہے، بلوند سنگھ اور مہاراجہ بینی بہادر جیسے جہاندیدہ معمر اور با اقتدار اشخاص اور کمپنی انگریز کے درمیان "بنائے دوستی"

---

[۵] ملاحظہ ہو کیلنڈر جلد اول کے خطوط نمبر ۲۴۵۹ - ۲۴۶۰ - ۲۴۶۸ - ۲۴۷۲ وغیرہ راجہ خیالی رام شتاب رائے کو لکھتے ہیں "راجہ بلوند سنگھ نے عہد و مواثیق کے مطابق جنگ میں شرکت نہیں کی اور دیا کو دس روز جانب جاری کا بہانہ کرکے پڑے رہے" نسخہ بلوند نامہ اور مثل لائبریری پٹنہ میں اسی ضمن میں قابل ملاحظہ ہے۔ [۶] کیلنڈر اور کلایو کے خطوط مندرجہ بنگال و اسد بہار پیپرس [۷] سیر المتاخرین۔ تحفہ تازہ کلایو کے خطوط مورخہ ماہ مارچ و فروری ۱۷۶۵ء اور ۱۷۶۶ء کی تاریخیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

گے قائم کرنے کا دعویٰ کوئی معنی نہیں رکھتا، جب ہم ان دونوں کو تین سال قبل شاہ عالم کے خلاف نواب صادق علی خاں عرف میرن (الپسر میر جعفر) راجہ رام نرائن اور کرنل کلایو سے خط و کتابت کرتے ہوئے پاتے ہیں[1]۔ ہم نے مانا کہ انگریزوں کے مرتب کردہ دفاتر ہر طرح جامع نہیں اور بہت ممکن ہے کہ کچھ بچے کی باتیں منظر عام پر لائی جانی مناسب نہ سمجھی گئی ہوں، مگر جبکہ شتاب رائے اور شاہ و وزیر کے دربار کے بہتیرے اشخاص کی خفیہ مراسلات کیلنڈر اور بنگال و مدراس پیپرس[2] میں موجود ہیں تو پھر کلیان سنگھ کی کارروائیوں کے درج کتب ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ کلیان سنگھ نے خلاصۃ التواریخ ایک انگریز کی فرمائش پر آخر عمر اور نابینا ہونے کے بعد[3] لکھوائی تھی، لیکن چونکہ اپنے متوسلین کی احسان ناشناسی اور انگریزوں کی ہمیشہ بڑھتی ہوئی لالچ کے باعث سب کچھ کھو چکے تھے، پھر بھی اقتدار و جاگیرات کی بحالی و واگذاشت کی فطری امید موہوم موجود تھی اس لئے تاریخ کے ساتھ لگے ہاتھوں "اپنے کیس" کی مسل بھی تیار کرنے گئے، لیکن افسوس کہ موصوف کی یہ سعی مشکور نہ ہو سکی۔

ہم عصر مورخین اور کیلنڈر کے خطوط ہمیں بتلاتے ہیں کہ شتاب رائے عظیم آباد سے نکل کر شجاع الدولہ کے نوکر ہوئے۔ آٹھ مہینہ لشکر شاہی میں رہے بعد ازاں بینی بہادر نائب وزیر کے پاس بھیج دیئے گئے، برابر اس کی رفاقت میں رہے، اور انگریزوں کے خطوط بادشاہ اور وزیر کے پاس پہنچاتے رہے۔ ایک خط میں جو ساتویں دسمبر ۱۷۶۳ء کو داخل دفتر ہوا شتاب رائے میجر ایڈم کے پاس اپنے وکیل سادھورام کے بھیجنے کا ذکر کرتے ہیں اور میر جعفر اور انگریزوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ مناسب عنوان سے بادشاہ و وزیر سے صوبہ داری کے اسناد کی درخواست کریں تاکہ میر قاسم کی حمایت کا خیال جاتا رہے اور اس "ظالم" کا بھی جی چھوٹ جائے (کیلنڈر جلد اول صفحہ ۲۵۶) نیز اسی تاریخ کا میجر ایڈم کے نام بینی بہادر کا بھی ایک خط ہے جس میں سند کا بھیجا جانا، شاہی پیشکش، نواب وزیر کا نذرانہ اور جاگیرات کے معاملات طے ہونے اور معاہدات کے پہنچنے پر منحصر رکھا گیا ہے، (کیلنڈر جلد اول صفحہ ۲۵۷) بقول کرم علی بینی بہادر سے جو نواب وزیر کے حکم سے سرحد کرمناسا پر موجود تھا شکست خوردہ میر قاسم نے ۸ رجمادی الاول ۱۱۷۷ھ کو ملاقات کی "صحبت بہم برہم خورد" بوجوہ چند کدورت بڑھتی گئی (مظفر نامہ صفحہ ۸۸) چنانچہ بینی بہادر "برہمن مطالب مرجوعۂ عالی جاہ و مرغب مصالحہ و معاملہ با محمد جعفر خان و فرقۂ انگلستان بود" (سیر المتاخرین صفحہ ۷۴۵) میر جعفر ہمراہ صاحبان انگریز کرمناسا کے پاس اپنی سرحد میں رودخانہ درگاوتی پر پہنچکر چار ماہ خیمہ زن رہا، "جواب و سوال خزانہ شاہی رو داد" لیکن بلا وجود "پیشکش و نذورات شجاع الدولہ "کہ در سر ہوائے تسخیر بنگالہ بود" کسی صورت راضی نہیں ہوا، (مظفر نامہ صفحہ ۸۵)۔ میجر ایڈم کے نام راجہ شتاب رائے کا خط مورخہ ۲۰ نومبر ۱۷۶۳ء میر قاسم کے کرمناسا پہنچنے، میجر اور میر جعفر کے لئے خلعت کی تیاری اور اسے پہنچانے کے لئے راجہ کا ایک سو سواروں کے ساتھ روانہ ہونے کا پتہ دیتا ہے، نیز اسی خط سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شجاع الدولہ کی نیت محض میر قاسم کی دولت حاصل کرنی تھی اور خوف شر سے اسے اپنے زیر نگرانی رکھنا تھا (کیلنڈر جلد اول صفحہ ۲۶۶) ماسوا اس کے سند کا شتاب رائے کو حوالہ کیا جانا۔ لیکن میر قاسم کے مکتوب کے باعث رک جانا، خطوط نمبر ۲۰۹۶۔ اور ۲۱۲۵ سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں مکتوب نمبر ۲۱۲۹ سے تو قطعی طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بکسر میں ہی سادھورام کے ذریعہ میجر کارنک سند پہنچ چکی تھی، نیز اس سے بھی واضح مکتوب نمبر ۲۱۵۴ ہے جس میں بنگال و بہار و اڑیسہ کی صوبہ داری کے اسناد کا ۲۴ر مارچ ۱۷۶۴ء کو راجہ شتاب رائے کے نائب سادھورام کے ہاتھ بکسر میں پہنچنے کا تذکرہ ہے، ممکن ہے کہ کلیان سنگھ سادھورام کے ساتھ کر دیئے گئے ہوں لیکن اس کا کوئی قطعی ثبوت ہمیں نہیں ملتا۔

میر قاسم اور بادشاہ و وزیر کے حملۂ بہار کے اسباب اور افواج ثلاثہ، میر جعفر اور انگریزوں کی تیج پہاڑی (عظیم آباد پٹنہ) اور بکسر میں جنگ کی تفصیل سے ہمیں زیادہ بحث نہیں، اس لئے کہ کلیان سنگھ اس ضمن میں اپنے کسی کارنمایاں کا ذکر نہیں کرتے، البتہ اتنا ضرور لکھتے ہیں کہ پھلواری کے پندرہ روزہ قیام میں لشکر شاہی میں یہ خود بھی موجود تھے اور سادھورام (متصدی راجہ شتاب رائے در عظیم آباد) کے ذریعہ بادشاہ کی درپردہ توجہ

---

[1] علاوہ کیلنڈر اور انگریزی دفتر کے ایک نہایت نادر الوجود قلمی نسخہ "کتابت راجہ رام نرائن" مشتمل موسوم بہ "دستور لال" راقم السطور کے پاس موجود ہے ان خطوط کے حوالے اور ضروری اقتباسات ایک انگریزی مقالہ میں جو ... بنگال ہسٹری کانگریس کلکتہ کے لئے لکھے گئے ہیں پائے جا سکتے ہیں۔ [2] صاحب مشفق مسٹر ابرھم ویلنڈ بہادر صاحب کلاں کورٹ اپیل عظیم آباد معرفت ... در پیشہ کنور دولت سنگھ تکلیف براین ہیچمدان دادند کہ مفصل حالات و واقعات سیر محمد قاسم خاں بالقید قلم درآمدہ بنظر ایشان درآورد (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۳۲۱) [3] اس میں سب سے زیادہ راجہ خیالی رام کی مہاراجہ کلیان سنگھ نے اپنی تصنیف میں خبر لی ہے۔ ملاحظہ ہو خلاصۃ التواریخ۔

اور ارتباط باطنی، بلوند سنگھ کے رسوخ اور اپنی اور اپنے والد بزرگوار (مقیم پرتاب گڈھ) کی دولتخواہی، لشکر کمپنی میں پیغام رسانی اور صاحبان انگریز کے کاموں کی بہتری میں حتی الوسع کوشاں رہے (خلاصۃ التواریخ صفحات ۳۷۳ و ۳۷۴) اور جنگ پہاڑی کی جنگ کے فوراً بعد (جس میں بینی بہادر اور بلوند سنگھ راجہ جانبیہ جنبید نبودند) یہ پوشیدہ طور پر میجر کارنک کے پاس پہنچے "انچہ گفتنی و پرسیدنی بود گفتہ و پرسیدہ ہمانوقت بر گشتم و بہ خیمہ کاہ خود رسیدم" (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۳۷۸)

جنگ پہاڑی کے بعد تقریباً ایک ماہ تک "جنگ زرگری و قراولی" ہوتی رہی، یہاں تک کہ بارش کا موسم آپہنچا، نواب وزیر نے براہ منیر شریف بکسر کی راہ لی اور وہاں پہنچکر پڑاؤ ڈالدیا۔ بینی بہادر کی دشمنی موعودہ اخراجات جنگ کی عدم ادائگی "تن ندادن بجنگ حصار عظیم آباد" بدگوئی اور دیگر وجوہات کے باعث میر قاسم مقید ہوا۔ اور اس کا مال و اسباب ضبط ہوا۔ پھر صلح کی سلسلہ جنبانی کے لیے بینی بہادر اور کلیان سنگھ کے مشورہ سے شتاب رائے پرتاب گڈھ سے بلوائے گئے اور ناقابل قبول شرایط (تیس لاکھ سالانہ خراج بنگال، تمامی صوبہ بہار الٰہ آباد تک مع ... لاکھ خرچ سفر) کو منوانے کے لئے عظیم آباد اور وہاں سے کلکتہ پہنچ گئے۔ (خلاصۃ التواریخ صفحات ۳۸۴ لغایت ۳۹۱)

یہاں کرم علی کا جشن مدید بیان نہایت دلچسپ ہے۔ "میر محمد جعفر خاں کہ بدقولی و بدعہدی انگریز مشاہدہ کردہ بود اکثر عرائض صلح فرستادہ ... ولد ان صوبہ عظیم آباد شریف آوردہ آنکہ بر تق و فتق مہمات صوبہ با اختیار او باشد مغلوبیت نواب وزیر مطلق نمی خواست" (مظفر نامہ صفحہ ۸۹) بنائی انگریز ... شجاع الدولہ کو بھی کثرت فوج پر زعم تھا جو جنگ بکسر میں میجر منرو کے ہاتھوں بلکہ اپنی غفلت بینی بہادر کے بے موقع فرار اور بلوند سنگھ کی غدارانہ کوتاہی کے باعث ٹوٹا۔ بقول کرم علی بدنام میر جعفر نے اپنی اور انگریزوں کی ان فتوحات کی نذر نہ لی "بلکہ بر زبان آورد کہ چہ فتح و چہ نذر اندک آبرو سے کہ بود آں ہم برباد رفت" (مظفر نامہ صفحہ ۹۱)

اس کے برعکس جانشین آب بادشاہ سلامت کا حال سنیئے "از جائے خود حرکت نہ کردہ بودند" بلکہ گورنر اور میجر کو اپنے خطوط میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے رہیں اور ان کی فتح خود اپنی فتح قرار دیتے ہیں، کمپنی اور انگریزوں کی بہتری میں کوشاں رہنے کا وعدہ فرماتے ہیں اور اس ضمن میں تفصیلی حالات کو راجہ شتاب رائے پر محمول کرتے ہیں۔ (کیلنڈر جلد اول مکتوبات نمبر ۲۴۶۷ و ۲۴۶۹) بعد جنگ شجاع الدولہ نے بینی بہادر اور کلیان سنگھ کو موقع سے پاس بھیجا کہ دریائے گنگا کو عبور کرکے نواب وزیر کے ساتھ الٰہ آباد کو روانہ ہو جائیں لیکن "آنحضرت بہ سبب اینکہ معرفت مہاراجہ شتاب رائے بہادر ... محبت و رفاقت جماعۂ انگلشیہ در کونسل کلکتہ مستحکم نمودند از ہمراہے خود نہ جنبیدند" کلیان سنگھ لشکر بادشاہ میں ٹھیر گئے اور "سرشقہ خاص بادشاہ" ... اپنے خطوط میں ملفوف کرکے میجر منرو سپہ سالار افواج (انگریزی) کے پاس بھیجا اور بادشاہ کی ملازمت پر آمادہ کیا، نواب منیر الدولہ (مورث خاندان نواب ان بھلنا پہاڑی پٹنہ) اور راجہ کلیان سنگھ پیشوائی کو بھیجے گئے (خلاصہ صفحہ ۴۰۱-۲) چنانچہ شاہ عالم کا ایک دستخطی خط میجر منرو اور کیپٹن اسٹیبلس کی ملازمت کی تصدیق کرتا ہے، جس میں غدار دشمن "شجاع الدولہ" (کہ دیدا نچہ دید) کو مہلت نہ دیئے جانے کا پرزور مشورہ دیا جاتا ہے (کیلنڈر جلد اول مکتوب نمبر ۲۴۸۵) کلیان سنگھ کیلا کیب تک نے والے تھے، میجر صاحب سے تخلیہ میں ملاقاتیں کیں "نتیجہ بموجب گفتہ پدر خود حضرت قدر قدرت راہ عہد میثاق کمپنی قایم داشتہ از ہمراہی نواب وزیر باز داشتہ بود اظہار نمود" میجر نے خوش ہو کر اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دی "من گفتم کہ ... در ہمینجا ماندہ ام پس رخصت شدہ بخیمہ خود کہ درلشکر بادشاہ بود آمدم ...... و دقیقہ از دقائق حسن خدمات کمپنی انگریز و اگذاشتہ نگذاشتم" (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۴۰۳)

شکست خوردہ نواب وزیر کا لکھنؤ اور وہاں سے روہیلوں کے علاقہ میں جانا، ان کی اعانت حاصل کرنے کی بے فائدہ کوشش کرنی، انگریزوں کا حملۂ اودھ، چنار و الٰہ آباد کی تسخیر، میر قاسم کے حوالہ کئے جانے بہ صلاح کا دارومدار، اور نواب وزیر کا پیہم انکار، نواح کوڑہ جہان آباد میں جنگ، نواب وزیر کو مرتبہ ثانی باسستہ دار شہار ... و عماد الملک غازی الدین خاں وزیر معزول، شکست کھانا بالآخر احمد خاں بنگش نواب فرخ آباد کے مشورہ سے صلح ... بانگریزان بوساطت مہاراجہ شتاب رائے بہادر و این خاکسار (کلیان سنگھ)" ان امور کی تفصیل میرے موضوع سے خارج ہے، البتہ اتنا کہنا ضروری ہے کہ جب شتاب رائے کلکتہ سے جنرل کارنک کے ہمراہ بنارس پہنچے تو کلیان سنگھ ان دونوں کی ملازمت سے فائز ہوئے اور ... بہ سائر ملازمان کمپنی انگریز بہادر گردید" (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۴۱۱) شتاب رائے کے ذریعہ نواب نجف خاں رفیق کمپنی اور ملازم بادشاہ ہوئے، الٰہ آباد اور جیلنہ کوڑہ جہان آباد کا بندوبست کیا گیا اور اس کے ۹ لاکھ روپے محاصل بادشاہ کے مصارف کے لئے مقرر ہوئے، اور بادشاہ کو

قلعہ الہ آباد میں مقیم کر دیا گیا - بینی بہادر کے فرار کے باعث کمپنی کی طرف سے شتاب رائے کو خلعت نیابت صوبہ نواب وزیر اور باپ کی نیابت بیٹے (کلیان سنگھ) کو عطا کی گئی - شتاب رائے، منیر الدولہ اور کلیان سنگھ تینوں، جنگ ثانی میں شجاع الدولہ کے خلاف انگریزوں کے ساتھ رہے، باپ اور بیٹے دونوں نے اس جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دیے، کلیان سنگھ کپتان سلیٹن کے ہمراہ پیش قدمی کر کے گولہ اندازی میں شریک رہے (خلاصۃ التواریخ صفحات ۱۲۴ - ۱۹۴) بالآخر شکست کھا کر جب شجاع الدولہ نے سپر ڈال دی اور انگریزوں کے رحم و کرم پر خود کو چھوڑ دیا تو شتاب رائے کی وساطت سعی و اہتمام سے صلحنامہ ہوا، اسناد صوبہ داری بنگالہ و بہار و اڑیسہ بنام نواب ناظم بنگالہ اور سند دیوانی صوبجات مذکور بنام کمپنی انگریز شاہ عالم بادشاہ کی طرف سے عطا ہوئی، صوبہ الہ آباد اور چکلہ کوڑہ جہان آباد مصارف بادشاہ کے لئے مخصوص کیا گیا، صوبۂ اودھ بدستور سابق نواب وزیر کے پاس بحال و برقرار رہا اور موخر الذکر نے پچاس لاکھ روپے نقد اخراجات جنگ کے لئے اور قلعہ چنار انگریزوں کو دیدیئے - بلاشبہ شتاب رائے نے شجاع الدولہ سے اس موقع پر نہایت خلوص اور وفاداری برتی اور کھویا ہوا ملک واپس دلایا، اگرچہ انگریزوں کی مصلحت اس وقت اسی کی مقتضی تھی ۔

میر جعفر کا انتقال، نجم الدولہ کی مسند نشینی، کلایو کا انگلستان سے مختار کار امور کمپنی ہو کر ہندوستان واپس آنا، میر محمد کاظم (برادر میر جعفر) کی نیابت صوبہ بہار، دھیرج نرائن (برادر راجہ رام نرائن) کا پہلے دیوانی سرکار بہار بعد ازاں میر کاظم کی جگہ نائب ناظم بہار ہونا، شتاب رائے کی دیوانی بادشاہی خالصہ شریفہ صوبہ بہار، کلیان سنگھ کی نیابت دیوانی خالصہ اور سادھو رام کی نائب مختاری، لارڈ کلایو کا سفر الہ آباد، استحکام بنائے صلح و آشتی، دیوانی کمپنی کا باضابطہ عہد نامہ لارڈ موصوف کی شتاب رائے اور کلیان سنگھ پر مہربانیاں، بحالی دیوانی و التمغا و جاگیرات اور کمپنی کی طرف سے قریب ایک لاکھ روپیہ کا سعانی محصول ...... بطریق استمرار بہ مہر و دستخط لارڈ موصوف کلیان سنگھ کے نام مقرر کیا جانا، سفر مشرق، شتاب رائے کا کلیان سنگھ کو عظیم آباد چھوڑ کر کلکتہ جانا، مسٹر مڈلٹن صاحب کلان عظیم آباد کی کلیان سنگھ پر نظر عنایت، شتاب رائے کا ۱۱۷۳ھ فصلی میں عظیم آباد آنا، چھپرہ میں کلایو، شجاع الدولہ اور بلونت سنگھ کا ۱۱۸۰ھ ۱۷۶۶ء میں اجتماع، راجہ بنارس اور نواب وزیر کے درمیان بذریعہ شتاب رائے صفائی معاملات، شتاب رائے کا پہلے دھیرج نرائن کے ساتھ بہار کا نائب ناظم اور نائب دیوان ہونا اور قلعہ عظیم آباد میں (کہ در آنوقت کچہری نظامت در آن مقرر شدہ بود) اپنے دولت خانہ (موجودہ بتیا ہاؤس) سے نہایت شکوہ و تجمل کے ساتھ پہنچکر دھیرج نرائن کے پہلو میں مسند نشین ہونا، پھر ۱۱۸۱ھ میں دھیرج نرائن کے تغلب بے شعوری اور طمع کے باعث معزولی اور مہاراجہ شتاب رائے کا "منصب بلند پایۂ نیابت صوبہ بہار" پر محمد رضا خاں مظفر جنگ کے معائنہ حساب و کتاب کے بعد فائز ہونا (مظفر نامہ صفحہ ۹۰)، کلیان سنگھ کا نیابت پر تقرر (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۱۵۶) [1]، شتاب رائے کا حسن انتظام، انصرام معاملات مالی و ملکی، انسداد خیانت، انفصال مقدمات اور ۱۱۸۳ھ کے قحط عظیم میں خلائق کثیر کی دستگیری اور ان کی قوت لایموت کی بہم رسانی ۱۷۶۹ء ۱۱۸۵ھ میں بعض عمال کی بے شعوری اور بد انتظامی کے باعث بنگال و بہار میں کونسل انگریزی کا قایم ہونا، شتاب رائے کے متعلق فتنہ اندازوں کا "بہتان تغلب و تصرف ...... کہ سراسر کذب و دروغ بود"، شتاب رائے کی نیابت صوبہ سے تغیری، کلکتہ میں مقدمات، کلیان سنگھ کا عاملان، مالگذاران [2] صوبہ بہار اور عمال نظامت سے جواب و سوال، کاغذات کی رو بکاری کا بہ مہر و دستخط نواب ہوشیار جنگ (جارج وانسی ٹارٹ برادر گورنر) حاصل کرنا اور ان کی نقل بھیجکر باپ کے استخلاص کی کامیاب کوشش، بالآخر شتاب رائے کی بریت لیکن رنج و غصہ کے باعث اسہال کے عارضہ میں مبتلا ہونا، کلکتہ سے نیابت صوبہ پر بحال ہو کر ۱۱۸۶ھ میں عظیم آباد پہنچنا، لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد بروز سہ شنبہ ۱۹ ار جمادی الثانی ۱۱۸۷ھ مطابق ۶ ر آسن ۱۱۸۱ فصلی کو وفات پانا اور پتھری گھاٹ میں داہ کرم [3] ہونا بوجہ رفع بدنامی کے خیال سے گورنر جنرل ہسٹنگ کا مہاراجہ کلیان سنگھ کو عین عالم شباب [4] میں باپ کی جگہ مامور کرنا اور جاگیرات وغیرہ کی بحالی " تا با شتاب رائے کینہ

---

[1] کیلنڈر جلد اول کے مکتوب نمبر ۲۸۱۲ مورخہ ۲۵ جنوری ۱۷۶۶ء میں راجہ کلیان سنگھ کی نیابت دیوانی صوبہ بہار کی پروانہ کا ذکر پایا جاتا ہے - [2] خلاصۃ التواریخ ۴۸۹ - ۴۹۰ اس ضمن میں کلیان سنگھ کی صاحب سیر المتاخرین (نواب غلام حسین) سے گفتگو سوال و جواب اور اول الذکر کے اشارات قابل ملاحظہ ہیں - [3] عقائد او و پرسش اگرچہ مطابق ہنود نہ بود بلکہ طرف اسلام غالب داشت اما بنا بر استرضائے اقارب اقوام و مصلحتہائے دیگر موافق مشرب ہنود جسد ش برادر آتش سوختند (سیر المتاخرین مطبوعہ نولکشور) موجودہ بتیا ہاؤس جس میں بادشاہ نواب گرلس اسکول قایم ہے پہلے مہاراجہ شتاب رائے کی ملکیت تھی، چونکہ راجہ بتیا نے کلیان سنگھ کو مہاراجہ کی صفائی کے ثبوت بہم پہنچانے میں بہت مدد دی تھی اسلئے یہ عمارت راجہ بتیا کو دیدی گئی تھی جہاں مہاراجہ کی لاش جلائی گئی - وہاں ایک چبوترہ اور ایک کالا پتھا جوگی اور ڈوم کی جھونپڑیاں بنادی گئی تھیں جو اب نا پید ہیں - [4] راجہ کلیان سنگھ پسر راجہ شتاب رائے اگرچہ لیاقت این منصب باعتبار و ..... بسن و سال کہ عنفوان شباب بود نداشت بکار ہائے ماموری ش مامور گردانید و جاگیرات و در ماہہ [illegible]

مظنون مردم نگردد"۔ یہ کُل باتیں دلچسپ لیکن تفصیل طلب ہیں اور موضوع سے زیادہ متعلق نہیں اسلئے محض تسلسل واقعات کے لئے صرف اشارات پر اکتفا کی گئی ہے۔ اور اب ہم سطور ذیل میں مہاراجہ کلیان سنگھ کے زمانِ نیابت صوبہ داری و دیوانی بہار (بلا شرکتِ غیرے) کے واقعات (سنہ ۱۱۸۰ فصلی لغایت سنہ ۱۱۸۸ فصلی سپرد قلم کرتے ہیں۔

خلاصۃ التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ شتاب رائے نے علالت کے باعث اپنی زندگی ہی میں صاحب کلان عظیم آباد کی اجازت سے کلیان سنگھ کو امور صوبہ کی انجام دہی کے لئے کونسل کا شریک کردیا تھا (ص ۵۲) لیکن ہمیں دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، البتہ مسٹر وارن ہسٹنگس کا شروع جمادی الاول ۱۱۸۷ھ (مطابق اوائل اگست ۱۷۷۳ء) میں بنارس جاتے ہوئے عظیم آباد میں قیام، علیل مہاراجہ شتاب رائے کی عیادت کو جانا، زندگی سے مایوس مہاراجہ کا اپنے بیٹے کی سفارش اور خدمات نیابت نظامت و دیوانی اور بحالی التمغا و جاگیرات کی استدعا کرنا، گورنر کا آبدیدہ ہوکر فرمانا "ایں پسر بزرگ شمار ایسر خود خواہم خواند و ہمیشہ متوجہ حال او و ممد و معاون او خواہم بود، صاحب بہمہ وجوہ ازیں امر خاطر جمع دارند" نیز گورنر مذکور کی تعزیت کے لئے کلیان سنگھ کے مکان پر جانا اور دوسرے دن اپنے جائے قیام باقی پور (بانکی پور) میں موخر الذکر کو بلا کر صاحبانِ کونسل کے ہمراہ کرسی نشین کرنا، نیابت صوبہ داری اور دیوانی خالصہ شریفہ کی خدمت تفویض کرنی اور نوبت و جلوس کے ساتھ ہاتھی پر سوار کرکے نائب ناظم کو پھیم دروازہ کی راہ سے ان کے مکان[1] تک پہنچوانا، مہاراجہ کلیان سنگھ کا اپنے دیوان خانہ میں باقاعدہ مسند نظامت و دیوانی پر بیٹھنا، رؤسائے شہر کی مبارکباد دینی اور نذریں پیش کرنی اور گورنر مذکور کے چند روزہ قیام کے دوران میں روزانہ مہاراجہ موصوف کا ملاقات کو حاضر ہوکر صاحبان کونسل کے ساتھ مشورہ میں شریک رہنا، معاملات ملکی و مالی کے بحسن وجوہ انجام دینے کی تاکیدیں اور ہدایتیں، یہ کُل باتیں نہ صرف قرین قیاس بلکہ حقیقت پر مبنی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اسناد نیابت و دیوانی اور خلعت ہفت پارچہ سرپیچ مرصع قبضہ شمشیر، یک زنجیر فیل اور عطائے خطاب انتظام الملک مختار الدولہ تہور جنگ (ص ۵۱۸) وغیرہ بعد کی باتیں ہیں، چنانچہ کیلنڈر جلد چہارم کے خطوط نمبر ۵۵۴-۵۵۹-۵۶۰ مورخہ اکتوبر ۱۷۷۳ء سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ گورنر کی سفارش پر نواب مبارک الدولہ کی طرف سے منی بیگم نے مجلس رائے وکیل کلیان سنگھ کی معرفت مرشد آباد سے دو مہریں ایک ہاتھی، خلعت، اسناد عہدہ جات اور مہاراجہ کا خطاب بھیجا تھا۔ کیلنڈر جلد پنجم کے ایک مکتوب مورخہ ۲۸ اپریل ۱۷۷۷ء سے معلوم ہوتا ہے کہ انتظام الملک تہور جنگ کا خطاب شاہ عالم بادشاہ کا عطا کردہ تھا، لیکن ان فقروں کے مہر پر کندہ کرنے اور استعمال کی اجازت گورنر سے بہت بعد کو ملی تھی، خلعت نیابت دیوانی صوبہ بہار دسمبر ۱۷۷۳ء میں بھیجی گئی تھی۔

مہاراجہ کلیان سنگھ فرماتے ہیں کہ ابتدائے سنہ ۱۱۸۱ فصلی (مطابق سنہ ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء) سے نصف سنہ ۱۱۸۸ فصلی (مطابق سنہ ۱۱۹۴-۵ھ / ۱۷۸۰-۱ء) تک موصوف ہمیشہ شریک صاحبان کونسل عظیم آباد اور بلا شرکت دیگرے نائب ناظم بہار اور دخیل امور و جمیع معاملات صوبہ رہے اور اس ہفت سالہ مدت میں نہایت حسن کاروائی، جزرسی، کفایت، صدر راستی و دیانت کا ثبوت دیا گیا، معاملات ملکی و مالی اور امور عدالت بحسن و خوبی انجام دیتے رہے، دن کو کونسل اور عدالت کونسل میں حاضر رہتے اور شب کو اپنے دیوان خانہ میں دربار کرتے اور اہالیان پٹنہ اور عاملان و مالگذاران صوبہ سے سرگرم گفتگو رہتے اور خرچ میں کفایت کی وجہ سے مقررہ کے علاوہ ایک خرمہرہ بھی کبھی بطور نذرانہ اور رشوت مخفی یا علانیہ نہیں لیا۔ اپنی حسن خدمت سے انگریزوں کو ہمیشہ خوش رکھا اور سائر الناس کی رفاہ میں کوشاں رہے، کبھی کسی کو آزار نہیں پہنچایا، کسی گھر کو باقی خزانہ یا محاسبہ کے لئے تباہ و برباد نہیں کیا، بہ سہولت زر سرکاری وصول کرتے رہے، بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا اسلئے گورنر جنرل اور صاحبان کونسل کی اسی عرصہ میں تفضلات شامل حال رہیں، غرضکہ یہ سات سال نہایت اطمینان اور جمعیت خاطر سے گذارے اور بہ کمال اقتدار و اختیار نائب ناظم کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کی مصیبت کی ابتدا (سنہ ۱۱۸۸ف / ۱۱۹۵ھ) اس وقت سے ہوئی جب عظیم آباد کی کونسل موقوف کی گئی اور "کافر نمکحرام" راجہ خیالی رام نے فتنہ برپا کرکے تمام صوبہ بہار کی مقرری ۳۴ لاکھ میں مہاراجہ اور اپنے اور گنگا گوبند کے نام لکھوائی، اور جمیع معاملات میں اپنے کو شریک

---

[1] مہاراجہ شتاب رائے کا اصلی جائے قیام اور نقش و نگار سے مزین وسیع و عالیشان مکان درگاہ شاہ ارزان کے نزدیک آج جہاں بھوانی خلیفہ کا اکھاڑہ اور کھنڈر پایا جاتا ہے واقع تھا، دیوان خانہ جو بعد کو ان کے خاندان کا مسکن قرار پایا دریائے گنگا کے کنارہ دیوان محلہ میں عرصہ تک موجود تھا، سیڑھی گھاٹ مہاراجہ کلیان سنگھ کی بلی بلی کا بنایا ہوا ہے۔ جو بجز مٹی کے ڈھیر اور عالیشان پھاٹکوں کے نشانات کے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ع چغد نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

مہاراجہ کردیا (خلاصتہ ص ۵۱۹ تا ص ۵۲۲)

کیلنڈر جلد چہارم میں گورنر کے نام ایک مراسلہ مورخہ یکم نومبر ۱۷۶۳ء موجود ہے جس میں مہاراجہ کلیان اور ان کے آنجہانی پدر بزرگوار کے اوقات و ضوابط اور انجام فرائض کے طریقوں کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے، ہفتہ میں دو بار کونسل کی حاضری، ممبران کونسل سے مشورت، ایک بار کچہری کرنی، مقدمات فیصل کرنے، تین روز اپنے مکان یا دیوان خانہ میں دربار کرنا، جمعہ کو تعطیل منانی، حضور کے اضلاع کا خود براہ راست انتظام و بندوبست کرنا، کسانوں کی زیادتیوں کے متعلق مناسب احکام جاری کرنے، فصل کی خرابی کے اسباب کی جلد تحقیق کرنی، اپنی ساری عملداری میں کبھی کبھی دورہ کرنا - یہ کل باتیں مہاراجہ کلیان سنگھ نے اپنے نامور باپ سے سیکھی تھیں اور ان ہی کے نقش قدم پر چلنے کی (کم از کم اوائل میں) کوشش کرتے رہے،

ایک دوسرے مکتوب مورخہ ۱۲ نومبر ۱۷۶۳ء سے معلوم ہوتا ہے کہ بھادوں ۱۱۷۱ فصلی میں صوبہ کو کمی آب یا زیادتی بارش کے باعث بہت نقصان پہنچا، مہاراجہ موصوف نے مسٹر لین ممبر کونسل کو ہدایت کی کہ مقامی معائنہ کریں، رعایا اور کسانوں کی حالت کی تحقیقات اور ان کی ہمت افزائی کریں، اور مالگذاری کی تشخیص پیداوار کی مناسبت سے کی جائے، نیز مہاراجہ گورنر سے استدعا کرتے ہیں کہ یہ طریقہ منظور کیا جائے تاکہ صوبہ کی خوشحالی اور زر سرکاری کے اضافہ کا باعث ہو۔

مہاراجہ موصوف کو شرفا پروری کا بہت خیال تھا، چنانچہ ایک خط میں نواب منیر الدولہ کے افراد خاندان خصوص ان کے صاحبزادے مسمی فرزند خاں کی کل جاگیرات بحکم کمپنی ضبط کیے جانے کے باعث ان کے حال زار کا نہایت افسوس کے ساتھ تذکرہ کرتے ہوئے گورنر سے پرزور سفارش کرتے ہیں کہ ان کی جاگیرات واگذاشت کردی جائیں تاکہ ان کی حالت کچھ درست ہو سکے[1] (کیلنڈر جلد چہارم مکتوب نمبر ۶۶۱)

معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ تک مہاراجہ نے نہایت انہماک سے فرائض انجام دینے کی کوشش کی اور گورنر کے احکامات کی تعمیل کرتے رہے، گورنر اور بادشاہ اور امراء کے درمیان اکثر امور میں واسطہ کا کام کیا، صوبے کے امن و امان کو برقرار رکھنے اور رہزنوں اور خون کرنے والوں کے قرار واقعی سزا دینے میں ہمیشہ انگریزوں کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ تحصیل وصول کا کام بھی چلتا رہا۔ گو اس امر میں اپنے باپ کے پرانے رفیق خیالی رام، سادھو رام و نیز دوسرے حضرات پیش پیش تھے۔ واقعہ[2] یہ ہے کہ جوں جوں نوجوان مہاراجہ دوسرے اشغال کی طرف متوجہ ہوتے گئے مہمات ملکی و مالی کا کل بار ان کے رفقا اور اہل کاران پر آپڑا اور وہ حاوی ہوتے گئے، یہاں تک کہ ان لوگوں کی بعض کارروائیاں شکایتیں پیدا کرنے لگیں اور صاحبان کونسل مہاراجہ سے بدظن ہونے لگے۔ مکتوب مرسلہ ۲ جون ۱۷۶۴ء[3] میں مہاراجہ موصوف نے گورنر سے ان "احسان ناشناس بے وفا نوکروں" کی جو ہمیشہ ان کے اور ممبران کونسل کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی فکر میں رہتے تھے شکایت کی ہے، مگر فی الحقیقت مہاراجہ موصوف زیادہ قابل الزام تھے۔

نوجوان کلیان سنگھ نے شروع شروع بست سالہ محمد شاہ کی طرح[4] جس نے بادشاہ گر سیدوں کا زور توڑنے اور قتل و قید کرنے کے بعد عیش و عشرت میں ڈوب کر "رنگیلا بادشاہ" کا خطاب حاصل کیا، اور جب سلطنت مغلیہ کی اینٹ سے اینٹ بجنے لگی تو اس وقت بھی کانوں پر جوئیں نہ رینگیں) تندہی اور مستعدی دکھلائی لیکن رفتہ رفتہ امور حکومت و دیوانی کی طرف[5] سے غفلت برتنے لگے، علمی ذوق، شعر و شاعری کا

---

[1] لیکن جہاں اپنا مفاد معرض خطر میں ہوتا مہاراجہ کسی کا خیال نہیں کرتے تھے، ایک مراسلہ مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۷۶۳ء میں نواب مہدی خاں نبیرہ نواب سربلند خاں سابق ناظم پٹنہ - گجرات، الہ آباد و کابل سے ایک حویلی کے متعلق جسے نواب سیف خاں سابق فوجدار مرہٹہ نے پٹنہ میں بنوائی تھی اور جس پر مہاراجہ دخیل تھے جھگڑا کا تذکرہ ہے۔

[2] یہ کل امور کیلنڈر جلد چہارم کے خطوط سے ماخوذ ہیں۔

[3] ایضاً

[4] سیر المتاخرین

[5] علاوہ سیر المتاخرین کے کیلنڈر کے خطوط بھی اس امر کے شاہد ہیں۔ ایک خط مورخہ ۸ مئی ۱۷۶۵ء میں مجلس برائے گورنر کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کو نوجوان آقا نے اپنی حرکتیں ترک کر دی ہیں اور زیادہ انہماک سے کاموں کو انجام دے رہے ہیں تاکہ ناتوجہی اور غفلت کا الزام دور ہو جائے۔ مسٹر رمبس (Ramus) اور دوسرے صاحبان انگریز سے اس امر کی تصدیق کرائی جاتی ہے۔

شوق، طبیعت کی رنگینی اور یاران ناتجربہ کار کی ہمنشینی آخر رنگ لائی۔ پانچ ہزار ماہانہ کی تنخواہ (جو تھوڑے ہی عرصہ میں ۱۱۹۶ھ ہوگئی) جو "رائے رایان صوبہ بہار" کی حیثیت سے انہیں کمپنی کی طرف سے ملتی تھی کہاں تک کفایت کرتی۔ صوبہ اودھ اور صوبہ الٰہ آباد، جونپور اور دہلی کی جاگیریں جو ان کے باپ نے حاصل کی تھیں شجاع الدولہ نے ضبط کر لیں اور باوجود ان کے متعدد عرائض اور گورنروں کی سفارش کے واپس نہ ملنا تھا نہ ملیں۔ مالدہ چمپارن اور دوسرے[۵۲] اضلاع بہار کی جاگیریں بھی آگے چل کر مقرری کے نذر ہوئیں۔ داد عیش کیسے دی جاتی، کیونکہ زر مال واجب سرکار بھی آخر مہیا ہونا چاہیے تھا، اگر ان کے نائبین عمال اور اہل کاران نے تحصیل زر میں سختی برتی، زمینداروں کو شکنجہ میں کسا اور کچھ الٹ پھیر کی تو ساری ذمہ داری ان پر کیسے عاید ہو سکتی ہے؟ غفلت و ناتجربہ کاری کے باعث کونسل والوں سے بنتی نہ تھی[۵۳]، اگر کونسل میں کچھ اقتدار تھا تو خیالی رام ایسے چلتے ہوئے ہوشیار طلیق اللسان کا۔

مہاراجہ کلیان سنگھ اور راجہ خیالی رام کے تعلقات کا مسئلہ مابہ النزاع اور تفصیل طلب ہے، مہاراجہ نے راجہ کو نمک حرام غدار مکار سب کچھ بنایا اور سارا الزام ان کے سر تھوپ دیا، لیکن بقول صاحب سیر[۵۴] راجہ سے "باوجود آنکہ نہایت دروغ گو و قول او لائق اعتماد نیست"، بغیر خواہی و حقوق شناسی و محنت و جانفشانی کچھ بھی ظہور پذیر نہیں ہوا، مہاراجہ کا لکھنا ایک حد تک صحیح ہے، سنہ ۱۱۸۰ فصلی میں راجہ نے (برخلاف مسٹر[۵۵] جان کونسل در ساختہ) چند محالات یعنی ترگمنا، چین پور و سہسرام و سرس کٹنہ اپنے اجارہ میں لے لئے، لیکن زر سرکاری ادا نہ کر سکے، اسلئے اپنے مکان میں نظر بند کر دئے گئے، مہاراجہ نے رہائی دلائی (خلاصہ ۲۴۵) اس کے بعد ہی راجہ نے مہاراجہ کو شیشہ میں اتارا، صرف استقلال کار اور جاگیرات مذرب کے واگذاشت کا ذکر کرکے گورنر کے نام سفارشی خط لیا کہ "آنچہ او ظاہر نماید بذیرا گنند" اور کلکتہ جا کر گورنر وارن ہسٹنگس کی ناک کے بال گنگا گوبند کے ذریعہ سے تمام صوبہ بہار کی مقرری ۲۴ لاکھ (بقول مسٹر ہنڈ ۲۹۲۱۰۷ چونکہ سال سابق کا بندوبست ۲۸۰۲۱۸۵ پر ہوا تھا ص[۳۱]) روپیہ سالیانہ کے عوض مہاراجہ اپنے اور گنگا گوبند کے نام سنہ ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۱ء) میں لکھوائی، یہ بھی صحیح ہے کہ مجلس رائے مہاراجہ کے وکیل نے بہت روکا، لیکن گورنر نے ایک نہ سنی۔ جب قبولیت و قسط بندی کے کاغذات پہونچے مہاراجہ نے گورنر کی مرضی دیکھ کر دستخط و مہر ثبت کر دیں۔ جب راجہ خیالی رام عظیم آباد پہونچے تو بقول صاحب سیر (ص۸۱) مہاراجہ باغوائے بعض مشعلہ فشاں و غرور جوانی از راجہ مذکور منحرف گردید و شکایت او بہ گورنر بہادر نوشتن و با مسٹر میکسویل نبر سعدیت نمودن آغاز نہاد" لیکن خلاصۃ التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ نے تین شقیں پیش کیں خواہ راجہ مختار جمیع کارہائے مالی و ملکی رہیں اور مہاراجہ کو کچھ بطور منافع دیکر مابقی خود لیں اور سرکاری مال گذاری کا ذمہ لیں۔ لیکن مہاراجہ کے رعب و اقتدار پر حرف نہ آنے دیں۔ خواہ یہ ہی صورت مہاراجہ سے متعلق کر دیں اور اگر یہ بھی پسند نہ ہو تو صرف اپنے نام کے محالات کا گذارہ علیحدہ کر کے اسکی پوری ذمہ داری لیں اور بقیہ مہاراجہ کے سر رہنے دیں۔ خیالی رام نے معاملہ کو گومگو میں ڈالدیا۔ مسٹر میکسویل سے بھکنا پہاڑی جا کر ملاقاتیں کرتے رہے، مہاراجہ کی حاضری سے قاصر رہے اور مشہور کیا کہ مہاراجہ تو برائے نام ہیں صوبہ کی زمام حکومت میرے ہاتھ میں ہے۔ مہاراجہ نے اپنے حصہ کی پہلی قسط ادا کر دی لیکن گنگا گوبند کی قسط بھی انہیں کو دینی پڑی اور باوجود قسم کھانے کے خیالی رام نے کچھ فکر نہ کی یہاں تک گورنر وارن ہسٹنگس نواب علی ابراہیم خاں "شیخ پوریہ" کو لیکر سنہ ۱۱۸۵ھ پٹنہ پہونچے۔ بھکنا پہاڑی میں ٹھیرے، مہاراجہ نے ملاقات کی، سارا ماجرا کہہ سنایا، چونکہ گورنر کو بنارس جانے کی جلدی تھی معاملہ مسٹر اینڈرسن کے سپرد ہوا۔ خیالی رام کی عدم ادائگی ثابت ہوئی دلسٹے گئے اور گورنر کی بنارس سے مراجعت پر تو حویلی بنگلیان میں سادھو رام کے ساتھ قید بھی کر دئے گئے۔ مہاراجہ قسط وار اپنے حصہ کا روپیہ سنہ ۱۱۸۹ھ اور سنہ ۱۱۹۰ھ تک ادا کرتے گئے۔

(خلاصہ ۴۴۰ - ۵۶۶)

مسٹر ہنڈ مسٹر روک کے مکتوب مورخہ ۲۴ نومبر سنہ ۱۷۸۱ء کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ خیالی رام کی گرفتاری (قید) نے مہاراجہ کلیان سنگھ کی آنکھیں کھول دیں، زر قسط بذریعہ ہنڈی ادا ہونے لگا مگر اس کے ساتھ ہی مسٹر ہنڈ مہاراجہ کی مطلق العنانی ریونیو چیف کو آنکھ نہ لگا نا خود کو ایک آزاد حاکم

---

۵۱ بہار میں انگریزوں کا ابتدائی نظم حکومت ۱۷۶۵ - ۱۷۸۱ - از ریجی نالڈ ہنڈ - ۵۲ تفصیل علاوہ خلاصۃ التواریخ کے کیلنڈر کے متعدد خطوط میں ملاحظہ ہو۔
۵۳ مسٹر سعیدی کی کتاب پٹنہ کا بنگال ریکارڈس اور کیلنڈر کے خطوط سے اس کا پتہ چلتا ہے۔
۵۴ سیر المتاخرین۔
۵۵ خلاصہ صفحہ ۵۴۱ - سیر المتاخرین سے بھی یک گونہ اس کی تصدیق ہوتی ہے خیالی رام مسٹر اون لا اور رام لوچن بنگالی کے تعلقات ملاحظہ ہوں۔

سمجھ کر بجز گورنر کے کسی کی بات نہ ماننا، زمینداروں اور عمال و محصلین سے مستبدانہ طور پر پیش آنا، اُنہیں قید و بند کرنا، اُن کی جائدادیں ضبط کرنی۔ راجگان ترہت و ٹکاری یعنی راجہ مادھو سنگھ اور راجہ متر جیت سنگھ ایسے بڑے زمینداروں کو بلاکر زیر حراست رکھنا، بلکہ موخر الذکر کو باوجود صاحبان کلان عظیم آباد کی فہمایش کے رہا نہ کرنا، ان باتوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس کیلنڈر جلد ششم اور بنگال ریکارڈ سیریز سنہ ۱۷۹۰ء جلد اول میں کلیان سنگھ کے متعدد خطوط کا خلاصہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مادھو سنگھ موجودہ مہاراج ادھیراج دربھنگہ کے مورث اور کلیان سنگھ کے چھوٹے بھائی کنور بھوانی سنگھ کے درمیان مالکانہ اور دستورات کے اضافہ کے بارہ میں جھگڑا ہوا۔ اور عدالت دربھنگہ نے خواہ مخواہ مذکورۃ الصدر کی حمایت کرنی شروع کی۔ اسی طرح متر جیت سنگھ راجہ ٹکاری کے ذمہ کئی لاکھ باقی رہ گیا، جب سختی کی گئی اور قطب علی بیگ سزاول ٹکاری نے مہاراجہ کے حکم سے ان کا ناطقہ بند کیا تو شکایتیں پہونچنے لگیں، صاحبان عظیم آباد نے دخل دینا چاہا بالآخر متر جیت سنگھ نے اپنے مالکانہ وغیرہ کا حصہ مکفول کرکے چھٹکارہ کی کوشش کی، لیکن انگریزی عدالت نے مہاجنان کو روک دیا جب مہاراجہ نے ادائگی زر قسط میں مجبوری ظاہر کی تو بدقت تمام مالکانہ کے رہن و مکفول کی اجازت ملی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مہاراجہ اپنے اور اپنے باپ کے حقوق خدمات اور کلائیو اور وارن ہسٹنگ سے رسوخ کے باعث اپنے رتبہ اور اقتدار کا ضرورت سے زیادہ اندازہ کرنے لگے تھے، اسلئے مسٹر سیکس ویل میرن یا مسٹر روکس یا مسٹر بروک کسی ریونیو چیف کا حکم اپنے حکم پر بالا نہیں سمجھتے تھے، فطرتاً یہ لوگ نوجوان مہاراجہ سے بدظن ہوگئے اور اکثر کاموں میں خلل انداز بھی ہوئے، یہاں تک کہ جب ہنگامہ جیت سنگھ راجہ بنارس سے بہار بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور نرائن سنگھ زمیندار مدیس کٹنہ۔ راجہ اکبر علی خاں زمیندار ترہٹ سمائے۔ بیننبر سنگھ زمینداری ٹکاری فتح شاہ زمیندار سارن نے بغاوت پر کمر باندھی اور شورش برپا کیں تو مہاراجہ کلیان سنگھ نے اپنی خدمات پیش کیں، فوج اکٹھا کرنے اور بہ نفس نفیس جنگ میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی، لیکن انہیں اس کا موقع نہ دیا گیا اور گورنر سے الٹے شکایت کی گئی کہ مہاراجہ اپنے دیوان سے اس بہانہ چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جب بہت اصرار ہوا تو مہاراجہ کی عرضیاں گورنر کے پاس مسٹر روس نے بھیجدیں، لیکن یہ فقرہ بھی تحریر کردیا کہ یہ مشکلات سے فائدہ اٹھانا اور خود ملک کو لوٹنا لیکن الزام جیت سنگھ کے آدمیوں پر رکھنا چاہتے ہیں۔ مہاراجہ خود لکھتے ہیں کہ مسٹر ہسٹنگ کی جنہیں گورنر باقی پور (چھجو باغ) کی کوٹھی میں چھوڑکر خود مارسر تشریف لے گئے تھے، انہوں نے ہنگامہ کے دوران میں برابر حفاظت کی، تسلی و دلاسا دیتے رہے۔ ہمیشہ ایک جوڑی ہرکارہ کے ذریعہ گورنر کی خبر منگواتے رہے، جب خود بنارس کا قصد کیا بی بی صاحبہ نے جانے نہ دیا۔ مسٹر گرام سارن کے کلکٹر کے لکھنے پر اپنے نئے اور پرانے سپاہیوں سے یک مختصر دستہ تیار کرکے فتح شاہ زمیندار ہولنی اور سارن سے جنگ کے لئے بھیجا، اور اسی طرح اقبال علی خاں پسر کامگار خاں مئی کی شورش کے دفعیہ میں حصہ لیا۔ سہ بندی میں کافی روپیہ خرچ ہوا۔ لیکن ایک خرمہرہ کمپنی سے بھرا نہ ہوا۔

زمانہ ہمیشہ کسی کا ساتھ نہیں دیتا، مہاراجہ کلیان سنگھ کا بھی دور حکومت و اقتدار عارضی ثابت ہوا۔ جب مہاراجہ شتاب رائے جیسا خیر خواہ کمپنی اور بانی سلطنت انگلشیہ تاجر پیشہ حکمرانوں کی مصلحت یا جذبۂ انصاف (حرص و آز) کے زد سے بچ نہ سکا تو کلیان سنگھ ایسے نوجوان مخمور المزاج رنگین طبع سہولت پسند اور تن آسان شخص کی کیسی نبھتی۔ پہلے تو خیالی رام کی مہربانی سے مقرری کی لعنت سر پر ڈالی گئی اور جب ادائگی زر سرکار میں دقتیں حائل ہوئیں تو مسٹر بتھرسٹ اور مسٹر جوناتھن ڈنکن سپرنٹنڈنٹ آف کلکشن کی حیثیت سے مہاراجہ پر تسلط کردئے گئے۔ موخر الذکر کو جو معزولی دفتر کے بھی انچارج تھے گورنر کا ایک خط مورخہ ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۷۸۶ء پہونچا ہے کہ انکا تقرر پٹنہ میں محض اسلئے ہوا ہے کہ کلیان سنگھ کو محالات سے بے دخل کرکے سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیں تو ۱۱ نومبر کو بے کس مہاراجہ اپنی بے دخلی اور نئے بندوبست پر رضامندی کا خط گورنر کو لکھتے ہیں (منہر بنگال ریکارڈس) یہ سب کب ہوا جب مہاراجہ اپنے جواہرات اپنے نقود و اسباب کو مہاجنوں کی نذر کرکے دیوان کو ادا کرنے کی کوشش کر چکے تھے، اپنی کتاب کے آخر میں ۱۴۴ - انگریزوں کا مجمل تذکرہ اور انسے اپنی خصوصیات کا ذکر کیا ہے مگر صرف تین اشخاص اول الذکر دو اور سر جان شور کے متعلق انکے فقرے قابل ملاحظہ ہیں۔ "بدولت ایشاں نقصان کلی ہمیں رو داد" (مسٹر بتھرسٹ) "در حساب و کتاب واجبی من غور ربی نکرو منافع خیلے من در آن وقت

۱؎ جلد اول اورینٹل لائبریری پٹنہ، یہ خطوط سب سنہ ۱۷۸۲ء کے ہیں۔ ۲؎ تفصیلات مسٹر ہنڈ کی کتاب میں ملاحظہ ہوں۔
۳؎ تفصیلات مسٹر ہنڈ کی کتاب میں ملاحظہ ہوں۔ ۴؎ خلاصہ ۵۶۴ - ۵۶۶

از ناتوجہی ایشاں بغارت رفت چنانچہ تمامت اسباب ملبوس و روپیہ و ظروف طلا و نقرہ نظر بپاس آبروئے خود طلائی بسیار و کم قیمتی فروختہ در باقی اخراجی ایشان دادم و تا حال برداشت کردم آخر چوں عذر نمودند تاسف خوردہ از من عذر خواستند لیکن چہ فائدہ کہ من تہیدست شدہ بودم ...... (مسٹر ڈنکن) "باوجود طاقت و توجہات ظاہری ہیچ درکار این خاکسار نیامد" (سر جان شور) اور تو اور گورنر وارن ہسٹنگ اور لارڈ کورنوالس نے بھی باوجود حقوق خدمات کے مہاراجہ کی قرار واقعی (بقول مہاراجہ) خبر نہ لی تفصیل پریشان اوراق خلاصۃ التواریخ موجود - پنشن پانے والے مہاراجہ (پچاس ہزار ماہانہ سے اٹھارہ ہزار اور بعد کو تو علے الحساب کبھی تیس ہزار روپیہ کبھی عید الضحیٰ اور عید الفطر کے مواقع پر چند مختصر رقمیں کافی سمجھی گئیں) نے باوجود اس احساس کے کہ "نوشتن نمی توانم زیرا کہ در نوشتن آن گنہگار می شوم" چھپے چھپے بہت کچھ لکھوا ڈالا ہے،

یوں تو نام کو کلیان سنگھ کی مہاراجگی اور مدار المہامی عرصہ تک قائم رہی، ستمبر سنہ ۱۷۸۲ء تک کے خطوط کلنڈر جلد ششم میں موجود ہیں، جن میں گورنر نے "مہاراجہ کلیان نائب ناظم صوبہ بہار" کے خطاب سے موصوف کو یاد کیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ مقرری کے معاملہ کے دو ایک سال بعد ہی ان کا دور حکومت ختم ہو گیا۔ عظیم آباد، بنارس، غازی پور اور کلکتہ کے دورے کچھ بھی مفید ثابت نہیں ہوئے۔ سنہ ۱۱۹۵ف (۱۲۰۲ھ) (۱۷۸۸) میں مہاراجہ عظیم آباد چھوڑ کر کلکتہ جا پہنچے۔ جاگیرات و التمغائے بیاد مغرب اور اسناد صوبہ بہار و بنگال کے واگذاشت اور عمل و دخل کی بے فائدہ کوششیں کرتے رہے۔ کبھی تو حساب کتاب ہوتا رہا۔ کبھی انگلینڈ سے احکامات کے انتظار میں رکھا گیا۔ غرضکہ اس وعدہ وعید اور لیت و لعل میں ۲۲ برس کلکتہ میں گذر گئے۔ آنکھیں جاتی رہیں سنہ ۱۲۰۱ف میں مختلف عوارض کا سامنا کرنا پڑا۔ ناچاری و عسرت میں تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ ملا - ۲/ربیع الاول سنہ ۱۲۱۸ف (۱۲۲۶ھ) میں کلکتہ سے عظیم آباد روانہ ہوئے۔ پہونچکر دیکھا کہ عمارات رنگین و منقش اور باغات دلکش ویران و مسمار پڑے ہیں، ناچار پتھری گھاٹ میں کرایہ کا مکان لیکر اتر پڑے، ساکنان دیار کی بے رخی و بے مروتی نے دل توڑ ڈالا، امراض نے بجائے کمی کے زیادتی پکڑی۔ اس شہر ناپرسان[۲] "جہنم آباد" سے کلکتہ پھر بھی غنیمت معلوم ہوا۔ قصد مراجعت کر ہی رہے تھے کہ مسٹر ابراہم اور مسٹر بلنڈ نے کنور دولت سنگھ کے ذریعہ واردات قاسمی کی تصنیف کی فرمائش کر دی۔ ایک برس میں شخصے مسمّے مہدی حسن کے مکان میں رہ کر ساری کتاب مع خلاصۃ التواریخ لکھوا دی۔ پھر کلکتہ واپس گئے۔ بصارت کا زوال جودت طبع پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔ دیوان پر دیوان[۳]، مثنوی پر مثنوی برگوشۂ خوشنویسوں کو لکھواتا گیا اور اسی شغل سے غم غلط کیا بالآخر ۳ سال[۴] کی عمر میں ۲۶ شوال سنہ ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) میں یہ باکمال ہمہ دان شیریں زبان" "عاشق مزاج رنگین تماشائی" ہندو و مسلمانان ہند کے مشترکہ تمدن کا بہترین نمونہ عقیدتاً مسلمان لیکن "ہندوم کافر نژادم من مسلمانم بہ تسلیم" کے مضمون کو دو زبردست قصاید کے ذریعہ ہمارے لئے چھوڑ جانے والا خیر الفیاض، قدردان علم و فن اور "صوبہ بہار کا آخری ہندوستانی گورنر" اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف ہمیشہ کے لئے کوچ کر گیا۔ ؏ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

---

۱ یہ کل باتیں خلاصۃ التواریخ سے ماخوذ ہیں، ملاحظہ ہوں مختلف اوراق۔

۲ "خراب عظیم آباد" کا فقرہ شیخ المتاخرین علی حزین رحمۃ اللہ کے ایک خط میں موجود ہے جس سے فیضیاب ہونے کا مہاراجہ اپنی ایک غزل کے مقطع میں اشارہ کرتے ہیں۔

۳ میر وزیر علی عبرتی مہاراجہ کے بیٹے کے نواسہ راجہ بھوپ سنگھ کے منشی تھے۔ معراج الخیال میں لکھتے ہیں "از افکار من خود بست دیوان، و مثنوی ہائے بے نہایت و دہ ہزار شعر در مدح ائمہ اطہار علیہم السلام و حبیب السیر منظومہ خود در صفحۂ روزگار گذاشت" اس میں اردو مثنوی اور کتاب صنیعہ الذاکرین جس کا حوالہ فقیر خیر الدین نے دیا ہے دو تصنیفات مہاراجہ کی نظر انداز ہو گئی ہیں۔

۴ معراج الخیال میں غلطی سے "سی" کا لفظ چھوٹ گیا ہے اسلئے ۱۲۰۷ کی تاریخ غلط ہو گئی ہے۔

مولانا سید عبدالغنی وارثی (علیگ) مرحوم

سابق مددگار صدر محاسب حکومت آصفیہ خلداللہ ملکہا

از حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی، صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

تمہید باوجود مسلمان ہونے یا نسل انسانی کے اس طبقے سے تعلق رکھنے کے جو محدود قوتوں والی مخلوقات سے آزاد ہو کر صرف ایک لامحدود اور ذرہ ذرہ کائنات کے ہر کرن میں مشہود ہونے والی طاقت کی پشت پناہی میں اپنی زندگی بلکہ ابدی پائندگی حاصل کئے ہوئے ہے جس کی حیات و ممات، صلاۃ و نسک، کسی گاؤں، کسی ضلع، کسی صوبہ، کسی ملک بلکہ سفلی یا علوی کرہ کے لئے نہیں، بلکہ صرف عالمین کی پالنے والی توانائی کے لئے ہے۔ وہی امت جو مخلوق سے الوہیت کا تاج اتار کر صرف خالق کو آسمان و زمین کی بادشاہت کا سزاوار قرار دینے پر مصر ہے۔ اسی توحیدی طبقہ و جماعت کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے مجھ پر طعنہ کیا جاتا ہے، کہ میں مسقط الراس سرزمین بہار کا نقارچی ہوں۔ مجھ پر تحریروں تقریروں میں طنز کیا گیا، دہلی ہنسی، اور لکھنو نے قہقہہ لگایا، دکن والوں نے غل مچایا، حالانکہ میں نے اگر کبھی کچھ لکھا، یا کبھی کچھ کہا، اس کا مقصد زمین کے کسی خاص خطہ کی جھوٹی حمایت نہیں، بلکہ ایک مظلوم قبیلہ اور ستم رسیدہ علاقہ کی داد رسی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جو عالم تھے، ان کو جاہل ٹھہرایا گیا تھا، جنھوں نے کام کیا تھا ان پر نکمے پن کا الزام تھوپا گیا تھا، جو زندہ ہیں ان کو مردہ مشہور کیا گیا تھا۔ یہی جھوٹ تھا جس کو میں نے سچ سے بدلا، یہی واقعہ تھا، جس کو چھپایا گیا تھا، حقیقت کے چہرہ سے نقاب اٹھانا، ناواقفوں کے لئے واقفیت کا بہم پہونچانا، اس سے توحید کے یقین پر کیا ضرب پڑتی ہے، آخر ایسا کہنے والوں نے اتنا بھی نہیں سوچا۔

بہار کی کیا خصوصیت ہے، حق کے حامیوں کا فرض ہے کہ جن کا حق چھینا گیا ہے اس کے دلانے میں وہ کوشش کریں اور بلاشبہہ اس سلسلہ میں حالانکہ جتنا چاہئے میں نے کچھ نہیں کیا ہے، اور جو کچھ بھی کیا ہے، محض اس پاک نیت کی بنیاد پر کیا ہے۔ بہار کے بزرگوں نے ہندی زبان کے الفاظ کا عربی اور فارسی کے الفاظ سے معانقہ کرایا، اور جیسا کہ پروفیسر شیرانی ٹونکی کا دعویٰ ہے کہ اس "ملاپ" کا سہرا سب سے پہلے منیر کے اس فرزند سعید کے سر تاریخی طور پر بندھتا ہے، جو بعد کو بہار کا قطب دوام اور ملک ہند کا مخدوم انام قرار پایا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ، بنیاد رکھ دینے کے بعد ہر چند کے شمال و جنوب کے علاقوں میں، ہلچل پیدا ہوئی۔ اس معانقہ و مصافحہ کا دامنا وسیع سے وسیع تر ہونا شروع ہوا۔ دکن سے اسی لے میں گانے کی آواز آنے لگی، دلی میں بھی اس کا راگ چھیڑا گیا۔ لیکن جاننے والوں نے جان کر اس حقیقت کو ظاہر ہونے نہ دیا۔ کہ ارتقاء و عروج کے ہر دور میں ہندوستان کی اس آخری اور ابدی قرار پانے والی زبان (جیسا کہ مقدر ہو چکا ہے اور شاید اس تقدیر مبرم کو وقتی ہنگامے مچانے والی نجائتیں ٹال نہیں سکتیں)۔ بہرحال ہندوستان کی اس زبان کے چڑھتے ہوئے دریا کی ہر موج میں بہار کا ہاتھ شریک رہا۔ لیکن کہا گیا ہے کہ اس کا سارا تلاطم دلی اور لکھنؤ کی شعری اور افسانوی حیثیتوں کی رہین منت ہے اور اب کہا جاتا ہے، کہ اس میں لکھنؤ و دلی کے سوا دکن کے مذہبی رسالہ نگاروں، اور غزل سراؤں کا بھی حصہ ہے۔ اس سے انکار نہیں ہے، جو کہا گیا، لیکن اس کے ساتھ وہ بھی کہا جاتا ہے جو نہ کہا گیا۔ اور جب کہنے والے اس کے کہنے

---

[1] سب سے زیادہ تعجب جامعہ ملیہ کے باوقار مجلہ "جامعہ" پر ہے کہ اس راہ میں اس نے بھی مجھ پر ملامت کی ۱۲

کے لئے اٹھے' تو ان پر صوبجاتی تعصب کا الزام دھر آجاتا ہے ۔

یہ بات کہ بہاری خاندان کے ایک فرزند بلند اختر نے اردو زبان کی سب سے زیادہ ضخیم لغت لکھی' یا بہار ہی میں سب سے پہلے مغربی فلسفہ اور یورپین حکماء کے حالات اردو زبان میں شائع ہوئے' بہار ہی نے سب سے پہلے یورپ کے شعرا ہومر' ورجل' دانتے' شکسپیر گیٹے کے ناموں سے داغ اور امیر کے شاگردوں کو مطلع کیا' بہار ہی نے سب سے پہلے یورپ کے جدید ترین کامیاب زود اثر طب ہومیوپیتھک طریقہ علاج کے متعلق لٹریچر کا ایک عظیم ذخیرہ مہیا کیا۔ بہار ہی نے ابتداءً یورپ کی جدید طریقہ زراعت و باغبانی کے اصول ونظریات کو عام اردو داں پبلک تک پہونچایا۔ اردو زبان بلکہ اب تو شاید مبالغہ نہ ہو تمام اسلامی زبانوں کی سب سے بہترین سیرت نبوی (علیٰ صاحبہا الف سلام و تحیہ) کے بڑے حصہ کی تدوین و تالیف کی سعادت بھی بہار ہی کے ایک مصنف اعظم کو میسر آئی' یہ اور اس کے سوا ان دوسری لمعہ صیتوں سے توجہ نظر کے جن کا تذکرہ میں نے اپنے بعض گذشتہ مقالوں میں کیا ہے' مجھے کس قدر حیرت ہوئی جب اس سوال کی تحقیق میں کہ " پادریوں کے مناظرانہ مباحث اور کتابوں' نے اردو زبان کی ترقی پر کس حد تک اثر ڈالا ہے' میں نے بعض حلقوں میں دعویٰ کیا کہ اس سلسلہ میں بھی بہار کے خدمات بہت زیادہ نمایاں ہیں۔ کیونکہ بائبل کے ترجمہ کے مواجس کے متعلق بوجوہ مختلف میرا خیال ہے' کہ مترجمین کی جماعت میں زیادہ تعداد بہار ہی کے اہل علم کی تھی' اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا' کہ پادریوں نے اپنی تبلیغی جد و جہد کے لئے بازار کی اس صرف شعری اور افسانوی زبان کو علمی رنگ میں تمکین کرنے کے لئے خاصی کوشش کی' ابتدا میں عیسائیوں نے فارسی زبان کو مسیحی دین کی اشاعت کا ذریعہ ہندوستان میں قرار دیا۔ لیکن ان کتابوں کے افادہ کا دامن صرف اہل علم تک محدود رہتا تھا عام باشندوں تک اپنی آواز کو پہونچانے کے لئے ضرورت ہوئی کہ اردو میں بھی رسالے لکھے جائیں' ان پادریوں کے اس اقدام نے علماء اسلام کو بھی مجبور کیا' اور جو اب تک اردو یا ہندوستانی زبان میں لکھنا اپنے لئے ننگ و عار خیال کرتے تھے۔ انھوں نے بھی اردو میں علمی مسائل کو ادا کرنے کا سلیقہ اپنے اندر پیدا کیا' اردو زبان کی بعض اہم ترین کتابیں مثلاً سرسید احمد خاں کی خطبات احمدیہ' یا تفسیرات بائبل یا ان کے علاوہ دوسرے رسائل نہ مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "پیغام محمدی" "ترانہ حجاز" ۔ پادری فنڈر کی کتاب "میزان الحق" "طریق الحیات" "مفتاح الاسرار" وغیرہ ازیں قبیل صفدر علی' عماد الدین' عبد اللہ آتھم' منشی محمد حنیف' ڈاکٹر برخوردار خاں وغیرہ جنھوں نے اسلام سے ارتداد اختیار کرکے مسیحی مذہب اختیار کیا تھا ان کے سینکڑوں رسائل و کتابیں نقلے ان ہی مذہبی مناظروں کی بدولت اردو زبان کے ذخیرہ میں داخل ہوئیں۔

لیکن کسی نے اس پر بھی غور کیا کہ ہندوستان کے علماء جو بالکلیہ عیسائی مذہب اور مسیحی دین سے ناواقف تھے' یکا یک انھوں نے کس کی امداد سے فارسی میں تو بہت کم لیکن اردو میں "رد عیسائیت" کے متعلق دفتر کے دفتر کہاں سے تیار کر دئے نہ صرف بائبل بلکہ اس کے متعلقہ واقعی و مشہور عیسائی مذہب کی تاریخ' علماء دین مسیحی ان کے حالات' ان کے عقائد' مسیحی فرقوں کے اختلافات الغرض یہ ساری چیزیں جہاں تک ایک ہندوستانی عالم کی رسائی اسی قدر مشکل تھی' جتنی کہ اس وقت چین' جاپان کے "شنٹو" یا "طاؤ" وغیرہ کے مذہبی خیالات سے علماء ہند ناواقف ہیں۔

ہندوستان کے علماء کی مجلسوں میں مولانا رحمت اللہ الہندی صاحب "دعوۃ الحق" کا نام لیا جاتا ہے۔ پادری فنڈر اور اس کے مناظروں کا ذکر کیا جاتا ہے یہ صحیح ہے کہ مولانا رحمت اللہ (حق تعالیٰ کی ان پر رحمت ہو) انھوں نے فنڈر کو ہندوستان میں بھی زک دی' اور جب غدر کے ہنگامہ میں فرار ہو کر وہ مکہ معظمہ پہونچے' تو قسطنطنیہ فرمان سلطان کی بنا پر وہ بلائے گئے۔ بھاگے ہوئے فنڈر نے ان کو قسطنطنیہ میں پا کر راہ فرار اختیار کی۔ یہ سب کچھ ہوا' لیکن ان تمام واقعات کی تہ میں کس کا ہاتھ کام کر رہا تھا' مولانا رحمت اللہ کو رحمۃ اللہ کس نے بنایا تھا۔

پھر مجھ پر خود نمائی کا الزام لگایا جائے گا۔ پھر مجھ کو صوبجاتی تنازعات کا بانی ٹھہرایا جائے گا۔ لیکن مظلوم کی داد رسی سے میں

لہ جس سے زیادہ کبھی دلیل ناطق ہماری الفاظ و محاوروں کا وہ ذخیرہ ہے جس سے انکار ردو بائبل معمور ہے۔ ان شاء اللہ کسی مستقل صحبت میں اس پر بحث کی جائے گی ۱۲

کس طرح باز آؤں۔ جو چھپایا گیا ہے اس حق کو میں بھی کس طرح چھپا رہنے دوں۔ واللّٰہ مخرج ما کنتم تکتمون (اور خدا کھول کر رہتا ہے اسکو جسے تم چھپاتے ہو) آخر وہ غریب بہاری ڈاکٹر جس کا نام ڈاکٹر وزیر تھا، جد و جہد کے تمام سلسلوں میں اس کا نام کیوں چھپا یا گیا، حالانکہ اب لوگ نہ جانتے ہوں، اس زمانہ کے مولویوں میں اس کا ذکر موجود نہ ہو، پر جب ہم میں حال کو ماضی سے اور ماضی سے مستقبل کو توڑنے کا عارضہ نہ پھیلا تھا۔ سلف کے کارناموں پر خلف فراموشی کے جالے نہ تنتے تھے۔ اس وقت کے علما تو جانتے ہیں یا جانتے تھے کہ "علمی جہاد" کی اس ساری صف آرائیوں میں جس نقاب پوش کمانڈر کا ہاتھ تھا، وہ بہار ہی کا پہلا انگریزی داں مسلمان تھا، جس نے ان حشراتی اسکولوں اور کالجوں سے بہت پہلے ایک خاص جذبہ کے تحت انگریزی زبان سیکھی۔ اور ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی، اور جیسا کہ مجھ سے حضرت خلیفہ مولانا محمد علی صاحب مونگیری نور اللہ مرقدہ نے بیان فرمایا تھا کہ ان کو کسی وجہ سے یورپ جانا پڑا، اور اندر ہی اندر انھوں نے "عیسائی مذہب" کے تمام مستندات و وثائق کا مطالعہ کرکے کتابوں کا ایک دفتر اپنے ساتھ ہندوستان لائے، اور یہی بے پناہ ہتھیار تھے جو تیار ہوئے بہاری دماغ کے کارخانہ میں، اور مشہور ہوئے یوپی کے بازاروں سے، جہاں سے اسے سب بھول گئے، لیکن جہاں سے یہ سب کو یاد رہا۔ حتیٰ کہ آج مصر کے الازہر اور قسطنطنیہ، بیروت، دمشق کے عام مدرسوں میں مولینا رحمۃ اللہ علیہ کی یہی کتاب ان لوگوں کے نصاب میں شریک ہے، جو عیسائیوں کے مقابلہ میں اپنے کو تیار کرتے ہیں۔

لیکن کیسی عجیب بات ہے، بدقسمت بہار کو اپنوں نے بھلا دیا۔ مولینا رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں میں ڈاکٹر وزیر کا کہیں ذکر نہیں ہے، اور ان کے تذکروں میں اگر کبھی ڈاکٹر مرحوم کا نام لیا بھی جاتا ہے، تو اس سے شاید ہی کوئی واقف ہو کہ اسلام کا یہ مخلص خادم بہار کا باشندہ تھا۔

مگر جس کو اپنوں نے بھلا یا، دیکھو اغیار نے اس کو کس طرح یاد رکھا ہے، حال میں ایک کتاب مصر سے چھپ کر آئی ہے جس کا نام "الغارۃ علی العالم الاسلامی" یعنی "اسلام پر دھاوا" ہے، یہ دراصل ایک فرانسیسی مصنف اور مسیحی مشنری اے۔ ل۔ شاتلیہ A. LE. CHATCLICR کی کتاب L'ALCONQUCTE DU MONDE MUSULMAN کا ترجمہ ہے۔

یہ کتاب دراصل دین عیسوی کے منادیوں کی ان کوششوں کی رپورٹ ہے جو اسلامی ممالک میں اٹھارہویں یا انیسویں صدی سے اس وقت تک مختلف شکلوں میں جاری رہی ہیں۔ ایشیا، افریقہ میں کلیسا کے سفیروں نے اب تک جتنے کام کئے ہیں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس ذیل میں ہندوستان کا بھی باب ہے۔ مولف مذکور نے فرانس کے مشہور تبلیغی رسالہ "مجلۃ العالم الاسلامی" سے انیسویں صدی کے ہندوستانی مشنریوں کی سرگرمیوں کے متعلق یہ لکھ کر کہ

"اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں ہزارہا مشنری جماعتیں سرگرم عمل ہیں۔ ان مسیحی مشنریوں کے تقریباً ایک ہزار مدارس ہیں، جن میں ۸۰ ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں، ان کے سالانہ مصارف چالیس لاکھ فرانک ہیں، ان جماعتوں اور ان کے معاہد کی کارروائیاں مختلف شکلوں میں اپنے مقصد برآری میں مصروف ہیں، ہر ملک میں اس کے حضری حالات کی بنا پر تبلیغی طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔" ان کے بعض منادیوں کا گروہ بنگال میں بھی کام کر رہا ہے جن کا کام اب صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہے۔"

آخر میں بھولے ہوئے بہار اور اس کے گمنام مخلص خادمان اسلام کی نام دنمود سے پاک خدمتوں کا اعتراف ان لفظوں میں کرتا ہے

سلہ "العبدۃ علی الرادی" مولینا رحمت اللہ علیہ کے جانشین اور خلیفہ مولوی محمد سعید صاحب کیرانوی مرحوم جن کا حال ہی میں انتقال ہوا، انھوں نے ڈاکٹر وزیر کے ان تمام کارناموں کی توثیق کی، اور میں نے ان ہی سے سنا کہ ڈاکٹر وزیر مرحوم کے انگریزی اور ڈاکٹری پڑھنے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ڈاکٹر مرحوم مرشدآبادی حکومت میں کسی عہدہ پر ملازم تھے، جب سراج الدولہ اور فورٹ ولیم میں جنگ ہوئی، پلاسی کے میدان میں آسمان نے مسلمانوں کے متعلق آخری فیصلہ کا اعلان کیا، اس جنگ میں اور اسکے بعد جن بے دردیوں سے گوروں نے کالوں کو مارا تھا، ڈاکٹر وزیر مرحوم کے دل میں ان واقعات نے بغض و عناد کی آگ بھر دی۔ اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے خواہ کچھ ہی رائے قائم کی جائے۔ لیکن اسی کا اثر ہے کہ اس بحران میں انکے جنون نے یہ رائے دی کہ وہ انگریزی پڑھیں، اور باضابطہ کسی میڈیکل اسکول میں داخل ہوکر ڈاکٹری کی سند حاصل کرکے گوروں سے کالوں کا بدلہ لیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں وہ کامیاب ہوئے۔

عربی زبان میں یہ اعتراف جن لفظوں میں ادا کیا گیا ہے میں بجنسہ اسے یہاں نقل کرتا ہوں۔

وقد تتفق حدوث مشاکل بینھم وبین المسلمین کما ھو الامر فی (بیحار)[1] حیث قام مشائخ القری واعترضوا علی المبشرین ولکن ھذہ الاعمال لم تحل دون انتشار التوراۃ باللغۃ الاوردیۃ۔

(الغارۃ علی الاسلام ص۱۳۵)

کبھی کبھی عیسائی علماء اور مسلمانوں کے درمیان مشکلات بھی پیش آئے ہیں جیسا کہ بہار کا حال ہے کہ وہاں دیہاتوں کے مشائخ (علماء) کھڑے ہو گئے اور انھوں نے عیسائی مشنریوں کی راہوں میں رکاوٹیں پیدا کیں لیکن یہ مخالفانہ کاروائیاں توراۃ کو اردو زبان میں منتقل ہونے میں حائل نہ ہو سکیں۔

یہ انیسویں صدی کے آغاز اور اٹھارہویں صدی کے اختتام کے عہد کی رپورٹ ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ابتداء میں عیسائی پادریوں میں ہندوستانی مسلمانوں کو عیسائی بنا لینے کی امیدیں کس قدر قوی تھیں انھوں نے یہ دیکھ کر کہ مسلمان اس ملک کی ایک ایسی قوم ہے جو بہ نسبت دوسری قوموں کی عیسائیت سے بالکل قریب ہے۔ اس کا ایمان توراۃ وانجیل پر بھی ہے وہ تمام توراتی وانجیلی انبیاء ورسل اور اس کے اصول ایمانی بلکہ اکثر وبیشتر عملی قانون پر ایمان رکھتی ہے۔ خود حضرت مسیح علیہ السلام کی بزرگی اور انتہائی تقدس کی معترف ہے۔ ایسوں کا عیسائی بنا لینا بہ نسبت ان لوگوں کے یقیناً آسان سمجھا جا سکتا تھا، جو مسیحی دین سے تو خیر اس دین کے ہادیوں اور پیشواؤں کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ خصوصاً ہندوستانی علماء کا عیسائی مذہب اور اسرائیلی دین کے ادبیات سے بالکلیہ ناواقف ہونا، اس نے اس توقع میں اور بھی قوت بہم پہونچائی۔ لیکن ہندوستان کے اس تر لقمہ کو داعیان مسیحیت کے لب ودنداں کے لئے لوہے کا چنا جن لوگوں نے بنا دیا ابتداءً وہ نہ دہلی کے علماء تھے اور نہ لکھنؤ کے مناطقہ، بلکہ وہی کس مپرس صوبہ جس کا نام مٹایا گیا ہے، اور اس حد تک مٹایا گیا ہے کہ اب اگر ان خدمات کے سلسلہ میں اس کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ تو پیشانیاں چڑھتی ہیں اور اظہار واقعہ کا نام "صوبجاتی عصبیت" رکھا جاتا ہے۔

بہار اور بہار میں بھی شہر کے باشندے نہیں بلکہ "قری" اور "دیہاتوں" کے مشائخ نے وہ کام کیا کہ آج پیرس کے علمی ایوانوں سے ان کے خدمات کی داد دیجاتی ہے، مسیحی علماء ان کا ذکر کر کے اپنا سر پیٹتے ہیں، "قری بہار" کے یہی مشائخ (علماء) تھے جنھوں نے بالآخر ان مشنریوں کو بجائے آباد علاقوں، اور متمدن شہروں کے رگید رگید کر بالآخر اس پر مجبور کیا کہ وہ رانچی کے جنگلوں اور ہزاری باغ کے بیابانوں، دکن کی ویران وادیوں، سنتھال پرگنہ کے کوہستانی علاقوں کو اپنے تبلیغی سرگرمیوں کا حلقۂ عمل قرار دیں، اسی کی طرف اس رپورٹ میں ان لفظوں سے اشارہ کیا گیا ہے کہ اب مشنریوں کا رخ صرف مسلمانوں کی طرف نہیں رہتا۔ یقیناً اس خصوصیت کو جس نے عمومیت سے بدلا وہ "مشائخ قری" کے ان دفاعی کارناموں کا نتیجہ ہے لیکن یہ بات کہ "مشائخ قری بہار" میں یہ طاقت کس راہ سے آئی؟ خیال گذرتا ہے کہ اس مقابلہ کی قوت اس بے رد ریا مخلص اسلام ڈاکٹر وزیر مرحوم کی اندرونی تائیدوں سے پیدا ہوئی ہوگی، لیکن تاریخ کی ان تمام کڑیوں کا اکثر حصہ ہماری نگاہوں سے ناپید ہے، کچھ نہیں معلوم کہ یہ ڈاکٹر وزیر مرحوم بہار کے کس علاقہ کے باشندے تھے، انھوں نے اپنے وطن کے کن کن مولویوں کو اندرونی طور پر اسلام کے اس علمی جہاد پر آمادہ کیا، بھولے بسرے قصوں میں کچھ بزرگوں کی زبانی مولینا نعمت اللہ صاحب ککراؤں (شیخ پورہ گیا) جو مظفرپور میں صدرالصدور تھے۔ مولانا شجاع الدین خاں بہادر مرحوم جو کسی زمانہ میں دہلی کے بھی صدر اعلیٰ رہے تھے۔ مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم کی چند کتابوں کا نام سنا جاتا ہے، جن میں سے مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم کی کتاب کا ذکر خاکسار نے "ندیم" ہی کے کسی گذشتہ بہار نمبر میں کیا تھا، اور جس کے بعض علمی نظریات کا ذکر دارالمصنفین

---

[1] عربی زبان میں یہ لفظ فرانسیسی زبان کی راہ سے منتقل ہوا ہے۔ ہمارے مصر والے ہندوستان کے اس اسلامی صوبہ سے اسی قدر ناواقف ہیں۔ کہ بجائے ہا، ہوز اس کا املاء حاء حطی سے کیا گیا۔ اگر واقعات کا علم پہلے سے ہوتا، تو شاید یہ سمجھنا بھی دشوار تھا کہ آخر یہ "بیحار" ہندوستان کا کون سا علاقہ ہے

کے مجلّہ علمیہ "معارف" میں بھی کچھ دن ہوئے کہ شائع ہوا تھا، ان چند گشتہ و شکستہ واقعات کے سوا "ہمارے مشائخ اثری" کے ان خدمات کی کوئی تفصیل معلوم نہیں ہوئی، بجز ماسٹر حسن علی مرحوم بانی انجمن حمایت الاسلام لاہور کے تاریخ نے ان مجاہدوں کے ناموں کو عہد ماضی کے شکنوں میں لپیٹ دیا۔

میرا ارادہ ہے والاتمام علی اللہ تعالیٰ کہ اگر موقعہ و فرصت بدست ہوئی تو کچھ دن بہار کے ان قریوں میں گھوم کر اسلاف کے ان گم شدہ تذکروں کو مہیا کر کے کسی کتاب کی شکل میں شائع کر دوں۔ لیکن اس مرتب و مسلسل تاریخ کی ترتیب کے لئے وقت و فرصت درکار ہے کاش مجھ فرسودہ دائمی بیمار کی جگہ کسی بہاری نوجوان تازہ کو اس کی توفیق رفیق ہو۔ بہرحال بالفعل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بہار کے جن علماء و اہل قلم کے حالات تک رسائی ہوئی ہے۔ ان کے حالات "ندیم" کے خاص و عام نمبروں میں شائع کر دئے جائیں۔ اور آج اس سلسلہ میں ناظرین کے سامنے مشرقی پٹنہ یا (گدھ) کے ایک مشہور گاؤں استھانواں کے ایک بزرگ عالم و صوفی مولانا عبد الغنی وارثی مرحوم کے کچھ حالات جو اب تک ہمیں ملے ہیں پیش کر دوں۔ اس سے مقصود صرف افسانہ خوانی اور "ذکر آبا" ہی نہیں ہے، بلکہ پچھلوں کے آگے پہلوں کے کارنامے اس لئے پیش کئے جاتے ہیں کہ ہو سکتا ہے اس ذریعہ سے بجھی ہوئی کجلائی چند کاریاں شاید پھر چمک اٹھیں جن کو آج کچھ نہیں سمجھا جاتا ہے، ان کو معلوم ہو کہ یہی کل کیا کچھ تھے، ان بزرگوں نے کن صعوبتوں اور تکلیفوں سے زندگی کی پرخار رہ اہوں میں خود اپنے لئے راہیں بنائیں۔ انھوں نے کس طرح علم و عمل کے آئین کو اپنی زندگی پر منطبق کیا، کس طرح انھوں نے دنیا کی بلندیوں کے ساتھ آخرت کی رفعتوں پر بھی اپنی آنکھیں برابر لگائے رکھیں، پر نشاط، آرام بخش نعمتوں سے بھری ہوئی زندگی میں بھی موت کی تیاریوں سے غافل نہ رہے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبد الغنی مرحوم کی زندگی جیسا کہ آئندہ پڑھنے سے معلوم ہو گا۔ اس قسم کی عبرتوں اور بصیرتوں کے بہترین سرمایہ کو پیش کرتی ہے۔ فاقصص القصص لعلھم یتفکرون۔ اور اسی سال کے بہار نمبر "ندیم" کے لئے میں نے ان ہی کے ترجمہ کا انتخاب کیا ہے، اس نمبر میں پوری سوانح عمری کا اندراج تو مشکل ہے لیکن اس سے ابتدا کی جاتی ہے۔

یوں تو مگدھا دیش جو بعد کو مہاتما بدھ کی وہاروں کے مرکز ہونے کی وجہ سے بہار کے نام سے مشہور ہوا عمومی طور پر ہندوستان کے ایک وسیع علاقہ کا نام ہے، لیکن یہی لفظ مگدھا جب مگدھ بنا، اور مگدھ کے بعد کثرت استعمال نے اس لفظ کو مگہ کی شکل میں بدل دیا، تو اب اس کا اطلاق بجائے پورے صوبہ بہار کے صوبہ کے ایک محدود خطہ پر ہونے لگا، دریائے گنگا کے جنوبی ساحل کی وادی کا وہ حصہ جو دریا سے کم و بیش سات آٹھ کوس کے فاصلہ پر شرقاً و غرباً پھیلا ہوا ہے، اور شمال میں جس کی حد بندی بہار، گریک، بھیکم پور، کوسی، شیخپورہ وغیرہ کی وہ پہاڑیاں کرتی ہیں جن کا شمار سلسلہ وندھاچل کے زنجیروں میں ہے، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ مشرقی پٹنہ اور ضلع مونگیر کا مغربی حصہ، گیا کا شمال علاقہ۔ ان کے مجموعہ کا خاص نام مگہ ہے۔ جس کا مرکزی شہر اب وہ قصبہ ہے، جو کسی زمانہ میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے تمام صوبہ کا نام تھا، یعنی سب ڈویژن بہار، المشہور بہ (بہار شریف)۔

یہ مگہ جو کچھ پہلے تھا، اس کی داستان سے قدیم ہند کی تاریخ معمور ہے، سیاسی، علمی، روحانی و اخلاقی حیثیت سے قرنہا قرن تک یہ سارے ہندوستان کا قلب و دماغ بنا ہوا تھا۔ ہندوستان کی سب سے بڑی سلطنت عہد قدیم میں یہیں قائم ہوئی،

---

۵۱ سرزمین بہار کے علمی غزاۃ میں ماسٹر مرحوم کا نام بہت نمایاں ہے، ان کا کارنامہ آج بھی انجمن حمایت اسلام لاہور اسکی کتابیں اس کے اسکول کالج وغیرہ کے ذریعہ سے زندہ ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ انجمن کا سارا کام از ابتدا تا انتہا ماسٹر مرحوم کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ لیکن اگر کسی مہم کی بنیاد رکھنے والوں کو کوئی عزت و امتیاز عطا ہو سکتا ہے تو انجمن کے تمام زندہ کارناموں میں ماسٹر مرحوم کی ہستی یقیناً بہت اہمیت رکھتی ہے۔ افسوس ہے کہ انکے بھی تفصیلی حالات کا مجھے علم نہیں، کاش! انکے دیکھنے والے بزرگوں میں سے کوئی صاحب انکے حالات شائع کر کے بہار کے نوجوانوں کو بیداری کا

ہندوستان کا سب سے بڑا مدرسہ بلکہ مبالغہ نہ سمجھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ پرانی دنیا کا سب سے بڑا مدرسہ اسی سرزمین سے علم و حکمت کی روشنی سارے مشرق میں تقسیم کر رہا تھا۔ مشرقی ایشیا کے سب سے بڑے واعظ اور مصلح کی عملی جد و جہد کا مرکز یہی علاقہ تھا، یہ اور اس قسم کے بیسوں امتیازات ہیں جن سے قدرت نے اس سرزمین کو نوازا تھا، اگرچہ یہ سارے کارنامے تاریخ میں بڑے مگدھ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کمالات کی بڑی مقدار کا سرچشمہ دراصل وہی مختصر سا قطعہ ہے، جس پر آج کل لفظ گیا کا اطلاق ہوتا ہے، راجگرہ کی راجدھانی ہو، یا نالندا کی یونیورسٹی، مہاتما بدھ ہوں، یا ان کے شاگردوں کی خانقاہیں، ان کی تعلیم گاہیں، تلاش کرو۔ ان میں اکثر کا سراغ اسی سب ڈویژن بہار یا اس کے اطراف کے علاقوں میں ملے گا۔

لیکن یہ اقبال اس وقت کا ہے، جب بہار "بہار" بہار کی مٹی، بہار کا پانی، بہار کی ہوا، بہار کی پیداوار سب بہاریوں کی تھی۔ پر جب آسمانی گردشوں نے رخ بدلا، جو بہار میں نہ بستے ہیں، ان کا اس ملک کے کسی جزو سے کوئی تعلق نہیں رہا، بوتے یہ ہیں، کاٹتے دوسرے ہیں، ظاہر ہے کہ جب کسی ملک کے اقبال کے گنبدوں پر اس قسم کی نحوستوں کے الّو بیٹھ جائیں اس کے باشندوں سے کس بات کی توقع کی جاسکتی ہے، اور اس حال میں بھی اگر کوئی کچھ کر گذرے تو سچ یہ ہے کہ اس نے بہت کچھ کیا۔ بدقسمتی سے آج ہم گیا بدبخت کے جس فرد کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، اس کا تعلق اسی عہد ادبار و نکبت سے ہے۔

سب جانتے ہیں کہ غلامی کا وہ طوق جس نے خود اپنے اوپر حکومت کرنے والے ہندوستان کو دوسروں کی محکومی میں داخل کر دیا۔ سب سے پہلے یہ طوق بنگال و بہار ہی کی گردن میں ڈالا گیا۔ گنگا و جمنا کے سنگم الہ آباد میں ہندوستان کے نابینا بادشاہ نے جب اپنا ملک غیر ملکی قوت کے ہاتھ میں سونپنا شروع کیا۔ تو اس کا آغاز اسی منحوس و سوختہ اختر علاقہ سے ہوا جس میں بہار بھی داخل تھا۔ حکومت کے اس انقلاب نے صرف حکومت ہی کو نہیں بدلا۔ بلکہ حکومت گیا بدلی سب کچھ بدل گیا، دماغ بدلے، دل بدلے، زبان بدلی، وضع بدلی، ہیئت بدلی، اندر بدلا باہر بدلا، اور بہ تدریج اس انقلاب کی چڑھائی اس حد کو پہونچی کہ مونچھوں اور ڈاڑھیوں، بلکہ سر کے بال بال تک اس کے اثرات پھیل گئے، پہلے جو عالم سمجھے جاتے تھے۔ وہ جاہل ٹھہرائے گئے۔ باکاروں کو بے کار قرار دیا گیا۔ دانشمندوں کو بیوقوفوں کے گروہ میں ڈھکیلا گیا۔ ملک ہر قسم کے معاشی، اقتصادی، معاشرتی، ذہنی، کشمکش میں جکڑ کر کراہ رہا تھا، کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے، ملک کے جن افراد کا کچھ نہیں گیا تھا، یا جن کے پاس اس انقلاب سے پیشتر کوئی سرمایہ نہیں تھا، ان کے لئے اگرچہ اس انقلاب میں زیادہ دشواریاں نہ تھیں۔ لیکن وطن کا وہ گروہ جو یکایک اپنا سب کچھ کھو بیٹھا تھا، اسکی عزت، حکومت، دولت، ذہنیت سب کچھ برباد ہو رہی تھی، اس کا حال عجیب تھا، وہ روتا تھا۔ لیکن رونا بے کار تھا، وہ روٹھتا تھا، لیکن کسی کو اس کے منانے کی پروا نہ تھی۔

یہی وقت ہوتا ہے، جب سب کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں، سب ہوش کھو بیٹھتے ہیں، اس وقت چند توفیق یافتہ افراد سب سے الگ ہو کر اپنی قوم، اپنی ملت، اپنے مذہب کے انجام پر غور کرتے ہیں، اور ان ہی نامرادیوں، ناکامیوں کے ہجوم میں بالآخر اپنے لئے، اپنی قوم کے لئے کوئی راہ بناتے ہیں، اگرچہ عہد غلامی میں ان کو وہ امتیاز میسر نہیں ہوتا، جس کے وہ اپنی آزادی کے دنوں میں صحیح طور پر مستحق تھے، لیکن سچ یہ ہے کہ ان کی کوششوں کی ایک رتی ایسے نامساعد عہد میں زمانہ اقبال کی پہاڑوں کا مقابلہ کرتی ہے۔

گیا کے اس عہد ادبار میں جن بزرگوں نے بجائے گریہ و بکا، ماتم اور سوگ کے کچھ کر گذرنے کا تہیہ کیا؟ ان میں جہاں چند اکابر کے نام سنہرے حروف میں لکھے جائیں گے۔ اسی میں ایک تابندہ و درخشندہ نام اس ہستی کا بھی ہے جن کا نام "مولوی عبدالغنی وارثی" مرحوم ہے۔ اور آج ہم جن کے حالات کا ایک سرسری خاکہ ناظرین کے آگے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اس وقت ہندوستان یا بہار کے بھی دوسرے ضلعوں سے مجھے بحث نہیں، بلکہ صرف گیا کا وہ خاص علاقہ پیش نظر ہے، جس کے مختلف قریے اور دیہات، استھانواں، دیسنہ، گیلانی، ڈمراواں، اگانواں، بازید پور، دیوکلی، رمضان پور، جانا کوئنڈ، معافی، بلچھی، سشکراواں وغیرہ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان بستیوں میں مسلمانوں کی مختلف قومیں آباد ہیں۔ بعضوں میں صرف

سادات ہیں مثلاً گیلانی۔ بعضوں میں برادران سادات کے ساتھ قوم ملک کے لوگ بھی رہتے ہیں جیسے استھانواں، دسنہ اور بعض میں شیوخ کرام کی آبادیاں ہیں جیسے رمضان پور، جانا۔ بعضوں میں شیوخ کے ساتھ سادات بھی رہتے ہیں جیسے کو سند۔

شرفاء مگہ کی یہی چند بستیاں ہیں جو اس عہد رست و خیز، دار و گیر میں بجائے رونے اور چلانے کے کچھ کرنے پر آمادہ ہوئیں۔ اٹھے اور بڑے زور و شور کے ساتھ اٹھے، کرنا سب چاہتے تھے، لیکن کیا کرنا چاہئے، اس میں مختلف بستیوں اور گروہوں کا خیال مختلف تھا، ایک عجیب ہنگامہ تھا، کچھ لوگ تھے، جو بے تحاشا انگریزوں کے کھولے ہوئے اسکولوں اور کالجوں کی طرف بھاگے جاتے تھے، اور ان کی راہوں سے وہ انگریزی دفتروں اور کچہریوں پر قبضہ کر رہے تھے، کوئی ان دفتروں میں ملازمت کی راہ سے جاتا تھا، اور کوئی وکالت و مختار کاری کے بھیس میں داخل ہوتا تھا، اس طبقہ میں زیادہ افراد ان لوگوں کے تھے جن کی نگاہوں میں سامنے کی زندگی کو آنے والی زندگی سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، جد و جہد کے اس سلسلہ میں انگریزی کتب خانوں کے پہلے کلاس سے کیمبرج اور آکسفورڈ تک کے ہالوں میں مگہ کے ان دیہاتوں کے مسلمان پھیلے ہوئے تھے، حتیٰ کہ انیسویں صدی کی پچھلے حصہ ہی میں گذشتہ بالا بستیوں میں سے شاید ہی کوئی بستی ایسی ہوگی جس کے ایک دو آدمی انگلینڈ تک نہ پہونچ گئے ہوں۔

دوسرا طبقہ ان کا تھا، جس کو کام سے انکار نہ تھا، لیکن آغاز سے زیادہ ان پر انجام کی بہتری کا خیال مسلط تھا، وہ مسلمانوں کی دولت، مسلمانوں کے روپے سے زیادہ ان کے دین کی حفاظت کو اہمیت دیتے تھے، تقریباً اس خیال کے لوگ بھی ہر گاؤں میں تھے، دیکھا جاتا تھا، کہ اس وقت جب کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریلوے ای-آئی-آر کی بھی ولادت نہ ہوئی تھی، مگہی دیہاتوں کے نوجوان مسلمان دہلی اور لکھنؤ پیادہ یا قافلہ در قافلہ کی شکل میں جارہے ہیں، انگریزی پڑھنے کا سامان تو بہار ہی میں موجود تھا۔ لیکن اسلامی علوم کے تشنہ کاموں کی سیرابی کے جتنے سامان مغلیہ عہد میں اس علاقہ میں موجود تھے۔ اس غیر اسلامی اجنبی حکومت نے مختلف تدبیروں سے ان کو برباد کر دیا تھا۔ مجبوراً ان لوگوں کو اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑتا تھا۔ اس زمانہ کے دشوار گذار، خصوصاً عہد طوائف الملوکی کی بد امنیاں جس کا مرکز زیادہ تر ہندوستان کا بالائی علاقہ تھا۔ یکہ و تنہا صرف علم کے شوق میں نکل جانا، اور سالہا سال بے سر و سامانی کے ساتھ ہر علم کے مشہور استادوں سے اپنے لئے علمی سرمایہ مہیا کرنا، حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کے یہی وہ زرین کارنامے ہیں جو ان کے خاندانوں میں آج تک طلب علم کی ان دلچسپ دشواریوں کے قصوں کی شکل میں نقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔

بہر حال یہ دونوں جماعتیں یکطرفہ تھیں، ایک صرف دنیا کا طالب تھا۔ اور دوسرا صرف دین کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے تھا۔ لیکن زمانہ کے صادق مطالبہ پر دونوں منطبق نہیں تھے، پہلوں کی دنیاوی شادابیاں دیکھ کر مسلمان خوش ہوتے تھے۔ لیکن ٹھیک جس طرح طاؤس اپنی ٹانگ کو دیکھ کر سر بگریبان ہو جاتا ہے، ان کی دینی لاپروائیوں کو دیکھ کر نہ صرف دوسرے بلکہ خود ان کے گھر والے ان کے ماں باپ شرما جاتے اور سرد آہ کھینچ کر رہ جاتے تھے، تقریباً کچھ یہی حال دوسرے گروہ کا بھی تھا، ان کے مذہبی جوش و خروش، دینی زندگی، روحانی بلندیاں، دلوں میں مسرت کی لہریں پیدا کرتیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ان کی معاشی تنگ حالیاں اور پھر اس تنگ حالی سے نکلنے کے لئے تنگ مایہ شخصیتوں کا ناگفتنیہا و ناکردنیہا میں مبتلا ملت کے عام افراد کو عرق ندامت میں غرق کر دیتا تھا، ممبر و محراب کی لن ترانیاں، جب خلوت و خانہ خالی کی لاپروائیوں میں بدل جاتی تھیں، تو واقعہ یہ ہے کہ بسا اوقات مخلصوں کے دل سے یہ آواز نکل پڑتی تھی، کہ

بہ قمارخانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم چو بصومعہ رسیدم ہمہ یافتم دغالی

کس قدر عجیب بات ہے کہ محسوس سب کر رہے تھے، لیکن کر گذرنے کی جرأت کسی میں نہ ہوتی تھی، بات کچھ بھی نہ تھی، ایک پایہ پر بندوق کا گھوڑا کھڑا تھا۔ سب حیران تھے کہ فائر کیوں نہیں ہوتا، حالانکہ بادنیٰ جنبش اسی گھوڑے کو دو پاؤں پر چڑھا دو۔ پھر دیکھو کہ شکاروں کا انبار تمہارے سامنے پڑا ہے یا نہیں، صاف لفظوں میں زمانہ پکار رہا تھا کہ اب اسلامی اور

دینی علوم کے ساتھ معقول دربار کے عقل اور دنیوی فنون کی تعلیم و ترویج نہ صرف غیر مفید بلکہ مضر ہے' لیکن باوجود سمجھنے کے کوئی اس آواز پر کان دھرنا نہیں چاہتا تھا - عام پبلک بھی چاہتی تھی - لیکن پبلک تھی تو اہمتوں سے اغماض کرتے ہوئے ہر شخص اپنی خواہشوں کی تکمیل میں مصروف تھا - اور اس کا نتیجہ تھا کہ جس مقبولیت کی توقع عام مسلمانوں کے ہر گروہ سے اُن دینی علم کے علم برداروں کو ہو سکتی تھی' روز بروز وہ سرد پڑتی جاتی تھی۔

یوں تو ملت کے اس عام مطالبہ کی تشخیص اور اس کا اعتراف بعد کو علماء کی اس جماعت نے ضرور کیا جس کا نام "ندوۃ العلماء" ہے اور گو عملی طور پر اس حد تک جس حد تک زمانہ کا مطالبہ تھا' وہ پورا نہ کر سکی اور اب تک اس سلسلہ میں اس کی کوششوں کا دائرہ بہت تنگ ہے' لیکن انفرادی طور پر جہاں تک میرے حقیر معلومات ہیں' اس بات میں کم از کم ہمارے علاقہ مگہ میں عملی اقدام اس کی طرف جن گاؤں کے باشندوں نے کیا' اس کے ناصیہ فہرست میں سب سے پہلے جس بستی کا نام درج ہو سکتا ہے - وہ استھانواں ہے استھانواں کے ان ہی ارباب فکر و بصیرت عزم و عمل میں نمایاں ہستی جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا مولانا عبدالغنی وارثی مرحوم کی بھی ہے - یہ استھانواں ضلع پٹنہ عظیم آباد کے تعلقہ (سب ڈویژن) بہار سے تین کوس پورب ایک متوسط درجہ کا گاؤں ہے - آبادی کے لحاظ سے اسکو اپنے نواح کے دیہاتوں میں تو اہمیت حاصل ہے' اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے اس علاقہ کا تھانہ' ہسپتال' برانچ ڈاک خانہ استھانواں ہی میں قائم ہے' اگرچہ یہاں کوئی مستقل بازار نہیں ہے لیکن مختلف ٹولوں اور گلیوں میں بنیوں حلوائیوں کی کچھ دکانیں پائی جاتی ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں بھی مل جاتی ہیں - یہ اس شاہراہ پر واقع ہے جو اسٹیشن بہار کو شیخپورہ اسٹیشن سے ڈسٹرکٹ بورڈ کی اسی سڑک پر شیوخ کرام کی مشہور بستی تہانا اور سادات کرام کا پاک قریہ محی الدین پور گیلانی (جس کا عام نام گیلانی ہے) واقع ہے اسی پر علاقہ مگہ مشہور بازار بارنگھا (یا بقول بعض بہار بازار) آباد ہے۔

محمد بن بختیار خلجی کے مفتوحہ علاقہ سے نکھی مہرا کے راجہ نے مسلمانوں کو جب بے دخل کر دیا تو قطب الدین ایبک کے حکم سے سادات اور ملوک کی ایک فوج پھر یہاں آئی' اسی فوج میں جاجنیری سادات کے ایک بزرگ حضرت مولانا سید احمد جاجنیری رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے جن کو وندھاچل کی ایک شاخ جس کا نام بزرگوں سے "کوہ بہار" سنتے چلے آئے ہیں کے دامن میں جاگیر ملی - اس جاگیر کا مرکزی گاؤں اکساری تھا' جہاں حال میں سوتھ بہار ریلوے نے اب اسٹیشن بھی بنا دیا ہے - اکساری کے آس پاس میں ان سیدوں نے اور بھی آبادیاں بسائیں جو تعداد میں غالباً "بارہ" تھیں - اسی بنیاد پر سادات کی ان بارہ بستیوں کا نام بارہ گانواں ہوا جن میں مانہ گنڈ' ابت رنیٹھ' ہموازہ کنٹی کوڑی' جوارہ وغیرہ اب تک مشہور بستیاں ہیں۔ لیکن ان بارہ گاؤں میں اکساری کو سب میں اہمیت حاصل تھی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارباب عز و سعادت کی قیامگاہ کا شرف اسی قریہ کو حاصل تھا - کثرت آبادی یا بوجوہ دیگر مختلف اوقات میں اکساری کے سادات بارہ گانواں سے نکل نکل کر دوسری بستیوں میں آباد ہونے لگے' محی الدین پور گیلانی جو تاریخی طور پر پٹھانوں کا گاؤں تھا' یہاں اکساری ہی کے ایک سید میر محمد مقیم تشریف لا کر آباد ہوئے - اور ایسے جمے کہ اب اس گاؤں میں بجز ان کی اولاد کے غریب پٹھانوں کا نام و نشان بھی باقی نہیں' اسی طرح اکساری کے کوئی بزرگ جن کا نام مجھے معلوم نہ ہو سکا - استھانواں میں بھی قیام پذیر ہوئے۔

جاجنیری سادات کے اس خاندان سے جو اکساری سے منتقل ہو کر استھانواں میں آباد ہوا' ہمارے مولانا عبدالغنی وارثی مرحوم کا جدی تعلق ہے - آپکے والد کا نام سید واحد علی بن سید فرزند علی بن سید کرم علی تھا - اور آپ کی والدہ ماجدہ سیدی کی تھیں جو سب ڈویژن بہار ہی کا ایک مشہور گاؤں ہے - اور سادات و ملوک کا وطن ہے' ان کے والد کا نام میر رحیم بخش تھا۔

۱۲۷۷ھ ہجری مطابق سنہ ۱۲۶۱ف ۱۸۶۰ء میں بہ مقام استھانواں آپ کی ولادت ہوئی۔

مادرِ مہربان کی جدائی

کسی خاص ملک یا عصر کے ساتھ خدا کی نشانیاں مخصوص نہیں ہوتیں' بلکہ جیسا کہ آسمانی بیان میں اعلان کیا گیا ہے کہ کأین من آیۃ یمرون علیہا وھم عنہا معرضون (کتنی نشانیاں ہیں جن پر لوگ گذرتے ہیں اور وہ ان سے بے توجہی برتتے ہیں) ورنہ زمانہ کی صدیوں' سالوں اسکے مہینوں بلکہ ہفتوں' دنوں اور سچ تو یہ ہے کہ گھنٹوں اور پلوں میں زمین کے ہر خطہ پر ہر

شہر شہر قصبہ قصبہ گاؤں گاؤں بلکہ گھر گھر میں جو جو نکلنا چاہتے ہیں ان کے لئے جو نکالنے والی آوازیں ہر لحظہ بلند ہوتی ہیں اصلی طاقت سے نظر ہٹا کر جنھوں نے محسوس قوتوں کے ساتھ اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا رشتہ جوڑا ہے وہ کانپ جاتے ہیں جب ان کے ہاتھ کے گڑھے ہوئے بتوں میں سے کوئی بت سرنگوں ہوتا ہے۔ ہوش اڑجاتے ہیں جب ان اختراعی بھروسوں میں سے کوئی بھروسہ ان کو بے بھروسہ کرکے ناپید ہوجاتا ہے۔ رب نہیں بلکہ جو خود مربوب ہے اور دوسرے کا پروردہ ہے۔ جوان کو رب ٹھہراتے ہیں انکا کیا خیال ہوتا ہے جب کسی شیر خوار بچہ کی ماں مرجاتی ہے۔ چیختے ہیں کہ اب اسکو کون پالے گا۔ حالانکہ جو یہ کہہ رہا ہے وہ یہ بھول جاتا ہے کہ خود اسکو کون پال رہا ہے۔ کیا واقعی ہوش والوں کا پالنے والا ان کا ہوش ہے یا عقل رکھنے والوں کا رکھوالا ان کا دماغ ہے۔ کتنی بدعقلیاں پوشیدہ ہیں ان عقلوں میں جو رکھنے کے باوجود عقل سے کام نہیں لیتی۔ جب مسلم ہے کہ ہوش وگوش والوں کے نگہدار یہی صاحبان عقل وہوش نہیں ہیں تو بے ہوش وہواس بچوں کے متعلق کیوں اضطراب ظاہر کیا گیا کہ اسکی پاسبانی کون کریگا۔ صرف ایک اس ایمانی غلطی جو ایمانی کے ساتھ عقلی بھی ہے اسکی تصحیح کے لئے مشاہدات کے کتنے جنگل ہیں۔ جو تاریخ کے ناپیدا کنار وادیوں میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن دیکھنے کے بعد بھی لوگ دیکھنا نہیں چاہتے دیکھئے یہی مولانا عبد الغنی وارثی مرحوم ہیں پیدا ہوئے۔ پیدا ہونے کے کچھ ہی دن بعد یعنی ان فرضی خداؤں کے ظہور سے پہلے جس کا نام ہوش وحواس، عقل و دانش رکھا گیا ہے۔ اپنی پرورش کے سب سے بڑے ذریعہ یعنی مادر مشفقہ کی آغوش رحمت سے محروم ہوجاتے ہیں اور بات یہیں پر ختم نہیں ہوجاتی ہے آپ کے والد کی جوانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی چند دنوں کے بعد مولوی صاحب کی سوتیلی ماں کو لاکر انھوں نے آپ کو مہر پدری کے بھی ایک بڑے حصہ سے محروم کردیا۔ ہندی کی مثل "ماں مری باپ بیتیا" کی کلیت یہاں بھی ٹوٹنے نہ پائی۔ اب مولوی عبد الغنی صاحب مرحوم ہیں جو اس وقت بیماروں کی اصطلاح میں نوازِ عبد الغنی تھے اور ان کے ساتھ ان کی غالباً دو چھوٹی بہنیں سب کہہ رہے تھے کہ ان کو کون پالے گا۔ ماں کو تو خدا نے اٹھالیا اور باپ کو سوتیلی ماں نے چھڑالیا۔ لیکن اس نوازِ عبد الغنی کو ان ہی کہنے والوں نے دیکھا کہ وہ حیدرآباد سے تقریباً ہر سال اسی نواب نظام الملک آصف جاہ خلد اللہ ملکہ کے ایک رفیع القدر عہدہ کی حیثیت سے نوابانہ تزک و احتشام کے ساتھ آتا ہے اور اپنی دین ودنیا کی دولت سے ہر کہ ومہ کو مالامال کررہا ہے۔ اس تماشے کو لوگوں نے نصف صدی سے بھی کم حصہ میں دیکھا۔ اسکی ابتدا کو بھی دیکھا اور انتہا کو بھی دیکھا۔ لیکن اس دیکھنے کے بعد کتنی گردنیں ایسی خوش نصیب ثابت ہوئیں جو چھوٹی قوتوں سے ٹوٹ کر اس قوت کے آگے جھک جاتیں جسکی ربوبیت کی یکتائی کے اعلان کے لئے خدا نے انسانوں کی سب سے زیادہ برگزیدہ جماعت انبیاء علیہم السلام کو منتخب فرمایا۔

بہر حال مولینا مرحوم کی طفولیت کا وہ زمانہ ظاہر بینوں کے لئے یقیناً دردناک تھا۔ گھر جاتے ہیں تو اس ماں سے وہ خالی ہے جسکی گود میں پہونچکر بچہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ باہر نکلتے ہیں تو جو گھر میں نہیں پوچھا گیا اسے باہر والے کیا منہ لگاتے۔ خود کبھی کبھی زندگی کے ان بیتے ہوئے دنوں کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے :-

"سرما کا موسم ہم پر یوں بھی گذرا ہے کہ کھدر کی صرف ایک دوہر ہوتی جس میں ہم تینوں بھائی بہن نے جاڑے کے چار چار مہینوں کو کاٹا۔"

یہ سب کچھ تھا لیکن جسکو پالنے والا پالنا چاہتا تھا وہ پل رہا تھا بڑھ رہا تھا۔ اسکے قدرتی ملکات اور فطری صفات روز بروز شگفتہ ہو رہے تھے شرفاء سادات کے گھرانے سے آپ کا تعلق تھا۔ کچھ ہی دن کے بعد ہر طرف سے حتی کہ خود اپنے اندر سے مطالبہ پیدا ہونے لگا کہ اب اس بچہ کو پڑھنا چاہیئے۔

آغاز تعلیم

میکالے کی رپورٹ کے بعد شور برپا کیا گیا ہے کہ جاہل ہندوستان علم سے بھر گیا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ آج پاٹشالوں، مکتبوں، اسکولوں، کالجوں، مدرسوں اور اسکے ساتھ دوسرے علمی تعلیمی اداروں سے ملک کا گوشہ گوشہ پٹا ہوا ہے اور ان کی راہوں سے مغربی کارخانوں کے بنائے ہوئے قلم، پنسل، کاغذ، پریسوں کی چھپی ہوئی وہ کتابیں جن کی نصابی عمر برسات کے کیڑوں سے بھی کم ہوتی ہے اپنی تجارت ہورہی ہے۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ جس وقت یہ سب کچھ نہ تھا لیکن ایک شخص چاہتا تھا کہ اس کا بچہ قرآن ناظرہ پڑھے یا حفظ کرے اسکو لکھنا آجائے خوشنویس ہوجائے۔ ہندوستان کے تمام معاشی وسیلہ یعنی زراعت کی راہ سے جو آمدنی ہوتی ہے۔ اس کی تحصیل وصول جمع وخرچ جیسے پیچیدہ کاروبار میں مہارت حاصل ہوجائے۔ عام دنیاوی مشاغل میں جس حد تک حساب کی ضرورت ہے اس میں ماہر ہوجائے اور

ہی کے ساتھ اردو آجائے۔ اتنی اردو آجائے کہ نہ صرف میر و مرزا امیر و داغ کے کلام سمجھنے کی بلکہ میر و مرزا بننے تک کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ فارسی آجائے اور اتنی فارسی آجائے کہ سعدی حافظ عرفی نظامی جامی خاقانی قاآنی وغیرہم اساتذہ کے نظم و نثر کی افہام و تفہیم کی پوری قدرت پیدا ہو جائے۔ بلکہ اگر کسی کا جی چاہتا تھا کہ میرے بچہ کو بقدر ضرورت اتنی عربی آجائے کہ با آسانی قرآن و حدیث سمجھ میں آسکنے لگے تو شہروں اور قصبوں ہی میں نہیں، بلکہ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں علم و فن کی ان گوناگوں منزلوں کو طے کرانے کا وافر سامان تقریباً ہندوستان کے ان تمام دیہاتوں میں موجود تھا، جہاں تھوڑے بہت بھی شرفاء آباد تھے صرف اسیقدر نہیں، بلکہ ان ساری قیمتی صلاحیتوں کے حصول میں ماں باپ کو نہ اپنا پیٹ کاٹنا پڑتا تھا، اور نہ اس کے لئے شہر میں رہنے والے وکیلوں مختاروں یا سرکاری حکاموں کی اسی لئے خوشامد کرنی پڑتی تھی کہ کسی طرح اپنے باورچی خانہ سے لڑکے کے لئے کھانا جاری کر دیں نہ اسکول کی فیس اور یونیورسٹی کے مطالبوں کی تکمیل کے لئے ماں بہنوں کا زیور ان کا پاندان گرو کرنا پڑتا تھا، بلکہ سب جانتے ہیں کہ جن دنوں کا نام "ایام جاہلیت" رکھا گیا ہے ان میں اس قسم کے اکثر قریوں میں جو صاحب حیثیت آدمی ہوتا تھا، دس پانچ روپیہ کا کوئی معلم اپنے دروازہ پر رکھ دیتا تھا، معلم کی سب سے بڑی تنخواہ یہی ہوتی تھی جو شاہ مکتب کا باپ ادا کرتا تھا۔ اس کے سوا بستی کے تمام لڑکے بغیر کسی تخصیص کے ہر سہ اور بسا اوقات مفت ہی مکتب کے اس معلم سے تعلیم حاصل کرتے تھے، اور ان میں ہر ایک پندرہ سولہ کی عمر تک تعلیم کے گذشتہ سارے مراحل طے کر کے اپنی اپنی قدرتی صلاحیتوں کے لحاظ سے ملک و قوم کی خدمت میں مصروف ہو جاتا تھا۔ آج مسلمان اپنے اس "مکتبی نظام" کو توڑ کر جن تعلیمی پریشانیوں میں سرگرداں ہیں، ان کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو صاحب اولاد ہیں، کن کن مشقتوں اور کن کن مصیبتوں کے ساتھ ایک متوسط درجہ کا آدمی اپنی اولاد کو میٹرک تک پہونچاتا ہے۔ اور میٹرک پاس ہونے کے بعد بھی اسی نوے فی صدی کا یہ حال ہے کہ نہ ان کو قرآن پڑھنا آتا ہے، نہ اپنی مادری زبان کا ان میں معتد بہ مذاق پیدا ہوتا ہے۔ اور جب مادری زبان کا یہ حال ہو تو بیچاری فارسی اور عربی کس شمار میں ہے۔

در پئے دنیا دیں ہم رفت　　　ایں ہم رفت و آں ہم رفت

بہر حال جس طرح اس زمانہ میں تقریباً ہر اسلامی شریف آبادی میں ان "قدیم مکاتب" کا سلسلہ جاری تھا، استھانواں میں بھی متعدد رئیسوں کے دروازوں پر مکتب قائم تھے۔ نہایت آسانی کے ساتھ اس بے مادر اور گویا لاوارث بچہ کو اپنے تعلیمی تشنگی کے بجھانے کا موقعہ میسر آیا، اپنی خود نوشت سوانح عمری میں خود ارقام فرماتے ہیں :-

"میری ابتدائی تعلیم بستی ہی کے مختلف مکتبوں میں ہوئی۔"

لیکن اس ابتدائی تعلیم کے کیا معنی تھے، کیا صرف حرف شناسی اور چند پہاڑوں کے علم تک اس کا دائرہ محدود تھا، ان ہی کا بیان ہے کہ گلستاں و بوستاں تک کی اعلیٰ فارسی کی قابلیت انکو بستی کے ان ہی مکاتب میں میسر آگئی، جو اب یونیورسٹی کالجوں میں بھی میسر نہیں آتی۔

لہ یہ سچ ہے کہ عصر حاضر کی سیاسی حالات نے اہل ہند کو جزیرہ برطانیہ کی زبان سیکھنے پر ضرور مجبور کر دیا ہے۔ لیکن صرف اسی ایک زبان کا حصول کیا اتنا دشوار تھا کہ اس کے لئے اپنی ساری قومی خصوصیتوں کی جو تعلیم ضامن تھی اسکو اس بے دردی کیساتھ کچل دیا جائے۔ آج بھی اگر ہم اپنے پرانے "مکتبی نظام" کو قدیم اصول پر زندہ کر لیں گاؤں کے زمیندار یا قصبوں اور شہروں کے ارباب ثروت دوسروں کیلئے نہیں اپنے بچوں ہی کیلئے ایک عربی داں مولوی اور ایک گریجویٹ یا انڈر گریجویٹ ماسٹر مقرر کر دیں اور بستی والوں یا محلہ ٹولے کے بچوں کو ان سے استفادہ کا موقعہ اسی طرح دیں جس طرح ہمارے اسلاف دیا کرتے تھے تو با آسانی ہماری تمام معاشی اور قومی ضرورتوں کی تکمیل کرنیوالی تعلیم مہیا ہو سکتی ہے مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری ساری قومی، اور دینی زندگی کی بنیاد اب اردو پر قائم ہے اور اردو کی اعلیٰ قابلیت اردو ہی کی کتابوں سے پیدا نہیں ہو سکتی، بلکہ جو اردو کو قوی کرنا چاہتا ہے اسکو فارسی میں بصیرت حاصل کرنا چاہیئے اور جو فارسی میں بلند ہونا چاہتا ہے اسکو عربی سیکھنی چاہیئے۔ ان تینوں زبانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بجائے اسکے کہ بچوں کا سالہا سال اردو کے پڑھانے میں صرف کیا جاتا ہے اگر ایک سال اردو دوسرے سال فارسی اور دو تین سال قرآن و حدیث کے ذریعہ سے عربی پڑھائی جائے تو تینوں زبانوں کی اعلیٰ قابلیت بھی لڑکوں میں پیدا ہو جائیگی اور دین کی تعلیم اس ذیل میں خود بخود ہو جائیگی ان زبانوں کا کام مولوی سے لیا جا سکتا ہے انگریزی حساب، اقلیدس، جغرافیہ، تاریخ کا کام ماسٹر انجام دے سکتا ہے موجودہ زمانہ میں مولویوں اور گریجوٹوں کی جو ارزانی ہے تھوڑے دانے گھاس میں ایسے مکاتب قائم ہو سکتے ہیں۔ زمانہ اور عام مسلمانوں کا قومی مطالبہ اسی تعلیم کا ہے۔ اسی قسم کے مکاتب انگریزی کالجوں کی اعلیٰ تعلیم اور عربی مدرسوں کی اعلیٰ تعلیم دونوں کیلئے مقدمہ اور بنیادی کام دے سکتی ہیں۔

عم محترم کی توجہ اور تعلیمی سفر کا آغاز

جیسا کہ میں نے لکھا ہے سوتیلی ماں کے آنے کے بعد والد مرحوم کی توجہ آپ کی طرف اتنی باقی نہ رہی تھی جتنی کہ چاہئے لیکن آپ کے ایک چچا مولوی مسیح اللہ مرحوم بہار سب ڈویژن کے ایک ممتاز اور سربرآوردہ وکیل تھے، انھوں نے اپنے بھتیجے کی بلند پیشانی پر اقبال و ترقی کے ستاروں کو چمکتا ہوا محسوس کیا۔ ہونے والے پودے کے چکنے چکنے پتوں سے انھوں نے کچھ اندازہ لگا لیا۔ تعطیل کے دنوں میں گھر آئے ہوئے تھے، بھتیجے نے دیہاتی مکتب میں جو کچھ سیکھا تھا اس کے نمایاں آثار کو محسوس کر کے انھوں نے مشورہ ہی نہیں بلکہ حکم دیا کہ تم میرے ساتھ اب بہار چلو، میرے ساتھ رہو، تمہاری تعلیم کا خاطر خواہ انتظام وہاں ہو جائے گا۔ جس کا کوئی مددگار نہ تھا، حق تعالیٰ کی رحمت مولوی مسیح اللہ مرحوم کی شکل میں جلوہ گر ہوئی۔ اور اس وقت سے آخر تک وہ ایسے مددگار ثابت ہوئے، کہ جب تک مولانا عبدالغنی مرحوم علم کے انتہائی بلندیوں تک نہ پہونچے، انھوں نے اپنی مشفقانہ سلوکوں کا سلسلہ منقطع نہیں کیا، بلکہ جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، مولوی مسیح اللہ مرحوم نے بوجہ لاولد ہونے کے گویا مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم کو اپنا منہ بولا بیٹا ہی بنا لیا، آپ جس کے سامنے مستقبل کے بھیانک دن اور تاریک راتیں تھیں، چشم زدن میں روشنی سے بدل گئیں۔ بیرونی سامانوں کی جس حد تک ضرورت تھی، قدرت کی غیبی لطائف نے ان سب کو آپ کے سامنے اکٹھا کر دیا۔ اب صرف آپکے اندرونی شوق و ذوق، جد وجہد، خدمت و اطاعت کی ضرورت تھی، حق تعالیٰ نے فطرۃً ان تمام کمالات سے آپ کو مالا مال کیا تھا، جب بیرونی اور اندرونی ہر قسم کے موافق اسباب جمع ہو جاتے ہیں، تو اب چلنے والوں کو کون روک سکتا ہے۔ مولوی مسیح اللہ صاحب مرحوم کے غیر معمولی توجہات کا ذکر مولینا مرحوم خود ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

"وہ (مولوی مسیح اللہ مرحوم) جملہ امور کے متکفل ہوگئے، ان کے ظل عاطفت اور پدرانہ و مادرانہ شفقت میں بہار دانش، سکندر نامہ تک فارسی اور ہدایۃ النحو تک عربی بہار ہی میں پڑھی۔"

اس میں شک نہیں کہ مولوی مسیح اللہ مرحوم نے صلہ رحمی کا یہ بڑا کام انجام کیا۔ لیکن صرف ان کی توجہ و شفقت قطعاً بارآور نہیں ہو سکتی تھی، اگر مولوی عبدالغنی مرحوم بھی اپنے تمام ارادات، وجذبات سے دست بردار ہو کر ان کے قدموں پر اپنے کو نہ ڈال دیتے، ادھر سے لطف و کرم بڑھ رہا تھا، ادھر سے وفاداری و اطاعت اس کا جواب دے رہی تھی۔ کام جب پورا ہونے والا ہوتا ہے، تو اسکی یہی صورتیں ہوتی ہیں۔

فارسی کا اختتام اور عربی کا اہتمام

اگرچہ استھانواں کے اعتبار سے بہار بھی آپ کے لئے ایک اجنبی جگہ تھی، اور بجائے حضر کے اسکو بھی سفر ہی شمار کرنا چاہئے۔ لیکن وطن سے اسکی دوری کل چند میلوں کی تھی، پھر یہاں آپ کا قیام ایسے چچا کے گھر تھا جو باپ سے بھی زیادہ مہربان تھا، گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ باوجود بے وطن ہونے کے اب تک آپ وطن ہی میں تھے، بلکہ استھانواں تک آپ کی زندگی جس کس مپرسی میں گذر رہی تھی، بہار آکر ہر قسم کی رفاہیت اور تنعم سے بدل گئی۔ مولوی مسیح اللہ صاحب مرحوم کی آمدنی اچھی خاصی تھی اور انھوں نے آپ کو اسی شان و آن کے ساتھ رکھنا شروع کیا۔ جس طرح کسی وکیل کا لڑکا رہ سکتا ہے۔ لیکن علم کی بڑھتی ہوئی پیاس کے سامنے گھر کی یہ ساری راحتیں آپ کو زحمت معلوم ہوتی تھیں۔ پڑھنا چاہتے تھے، نکلنا چاہتے تھے، لیکن اس کے لئے بظاہر کوئی سامان نہ تھا، اور اسی لئے فارسی کی تکمیل کے بعد آپنے بالآخر عربی کی تعلیم کا آغاز بہار ہی میں ایک مشہور عالم مولوی تفضل حسین صاحب سے شروع کر دیا۔ مولوی تفضل حسین صاحب بہار کے طبیب تھے، اور مولوی مسیح اللہ مرحوم کے حقیقی سالے بھی تھے۔ اس تعلق کی وجہ سے انھوں نے مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم کو توجہ خاص کے ساتھ پڑھانا شروع کیا۔ کچھ نہیں معلوم کہ کیا اسباب پیش آئے کہ یکایک بجائے بہار کے مولوی تفضل حسین گیا (جس کو اس زمانہ میں صاحب گنج کہتے تھے) تشریف لے جانے پر مجبور ہوئے، مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم کے لئے یہ وقت نہایت سخت تھا، مولوی حکیم تفضل حسین صاحب کی تعلیم و درس سے وہ مانوس ہو چکے تھے، امن و عافیت کے ساتھ کتابیں نکل رہی تھیں کہ یکایک اس انقلاب نے ان کے تعلیمی پروگرام کو درہم و برہم کر دیا۔ ادھر چچا مرحوم کی محبت اس درجہ شدت پذیر ہو چکی تھی۔ کہ ایک دن کے لئے آنکھوں سے جدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشتی و سفارش سے وکیل صاحب اس پر راضی ہو گئے، کہ حکیم صاحب کے ساتھ وہ بھی گیا چلے جائیں، خود ارقام فرماتے ہیں کہ۔

"مولوی تفضل حسین صاحب . . . . جب صاحب گنج تشریف لے گئے، تو میں بھی باجازت عم محترم کے وہاں پہونچا۔"

اس زمانہ کا صاحب گنج موجودہ عہد کا گیا نہ تھا، کہ کسی مفصلاتی اسٹیشن سے ریل پر بیٹھے اور چند گھنٹوں میں گیا پہونچ گئے، بلکہ خود مولانا عبدالغنی

مرحوم کے الفاظ میں جب خاکسار کو وہ حیدر آباد جانے پر ابھار رہے تھے کہ اس وقت صاحب گنج بہار کا مسافر تین دن میں پہونچتا تھا' ایک رات اکری بازار اور دوسری رات پتھر کٹی یا کسی اور گاؤں میں گذارنے کے بعد تیسری رات میں گیا ملتا تھا" گویا جتنے دنوں آج بہار کا مسافر دکن پہونچتا ہے۔ بہرحال گیا میں ابھی دس ہی مہینے گذرے تھے کہ محبت کرنے والے چچا کے دل میں فراق و ہجر کی سختیوں کی برداشت کی قوت باقی نہ رہی تقاضوں کے بعد آخر پھر بہار بلا لیا۔ بہار میں اس وقت مولوی ناظر حسین صاحب مرحوم میرداد والے درس و تدریس کا بازار گرم کئے ہوئے تھے' چچا کے حکم سے ان ہی کے حلقہ درس میں مولوی عبدالغنی صاحب شریک ہو گئے' لیکن یہاں ان کا جی نہیں لگتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ علمی حیثیت سے تشفی نہیں ہوتی تھی' بلکہ جیسا کہ خود آپ کا بیان ہے "یہاں سبق ناغہ ہوتا تھا"!

آج اسکولوں اور کالجوں کے ان طلبہ کے لئے یہ "ناغہ" کی شکایت حیرت انگیز ہوگی' جن کی تعلیمی مدت کا زیادہ حصہ تعطیلوں' جلسوں اور ٹورنمنٹوں' ازیں قبیل دیگر سرکاری و قومی تقریبوں کی نذر ہوتا ہے' بمشکل ایک سال میں دو تین مہینے سبق خوانی اور لکچر کے ہوتے ہیں' لیکن کبھی وہ دن بھی تھے کہ ایک ایک دن کا "ناغہ" برسوں کے مساوی سمجھا جاتا تھا' کیونکہ اس وقت پچھتر فی صدی کی حاضری اور ۳۳ فی صدی نمبر میں کامیابی کا مغالطہ پھیلایا نہیں گیا تھا۔

بہرحال وہ ذہنیت غلط تھی یا صحیح مگر مولوی عبدالغنی مرحوم پر اس ناغہ کا اثر بہت سخت ہوا' حالانکہ چچا کی شفقتوں اور مہربانیوں نے خود ان کے دل کو انکی محبت اور اطاعت کے جذبات سے لبریز کر دیا تھا۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ ان کو چھوڑ کر کہیں باہر جائیں' لیکن علم کا شوق سے پیدا ہر جبر سے بے پرواہ ہونے پر آمادہ کر رہا تھا' کچھ دن اسی کشمکش میں گذرے۔ دیکھ چکے تھے کہ سفر گیا کی اجازت چچا نے بڑی مشکل سے دی تھی۔ حالانکہ گیا میں بھی اپنے قریب ترین رشتہ دار بزرگ ہی کے پاس ان کا قیام تھا۔ پھر وہ کسی ایسی جگہ کے لئے کیا اجازت دیتے' جہاں نہ کسی سے جان تھی نہ پہچان۔ اس پر دوسری دقت یہ تھی' کہ پاس میں کچھ سرمایہ بھی نہ تھا' غیور طبیعت اس پر بھی آمادہ نہ ہوئی کہ چپ چاپ چچا ہی کے صندوق سے کرایہ نکال لیا جائے جیسا کہ ایسے مواقع پر عموماً لڑکے کیا کرتے ہیں' لیکن ان تمام موانع کے آگے تلاش علم کی حرارت بجھنے نہ پائی تھی' آخری درجہ اس کی حرارت کا یہ پہونچا کہ آخر ایک دن گھر بار' دوست احباب' اعزہ و اقربا' دیار و دیار سب خس و خاشاک جل کر بھسم ہو گئے' اور آپ بہ تقدیر جیسا کہ خود فرماتے ہیں :-

"جب چاپ پیادہ پا چار دن میں آرہ پہونچا۔"

ابن ا مولوی مسیح اللہ وکیل کا بھتیجہ بلکہ بیٹا جس نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ بہار میں ناز و نعمت میں گذارا تھا' اور جو شاید بہار سے استھانواں تک بھی سواری کے بغیر کبھی گیا ہو' آج جنون علم کے ہاتھوں سر پر گٹھری بغل میں کتابیں دبائے' پیادہ پا جا رہا ہے' دن بھی گذرتا ہے اور رات بھی گذرتی ہے۔ ایک دن دو دن کا سفر نہ تھا' کامل چار دن کا پیادہ پا سفر تھا' خدا ہی جانتا ہے کہ کن صعوبتوں سے راہ کی ان دشواریوں کو مولوی صاحب نے قطع کیا' کہاں کہاں گاؤں کی مسجدوں میں ٹھہرے' وہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ کیا کیا سلوک کیا' افسوس ہے کہ ان کی یادداشت میں اسکی کوئی تفصیل نہ مل سکی۔ بہرحال چوتھے دن کا آفتاب جب ان کے سامنے نکلا تو شہر آرہ کا سواد تھا۔

آرہ جس کا نام شاہ آباد بھی ہے آج سے کچھ دن پہلے بعض مقامی خصوصیتوں کی بنیاد پر صوبہ بہار کے اسلامی علوم کا مرکز بن گیا تھا۔ اسکی یہی مرکزیت تھی جس نے بہ تدریج ترقی کرتے کرتے ہندوستان کے اس عظیم و عجیب مدرسہ جس کا نام مدرسہ احمدیہ آرہ تھا اس کا محل وقوع بنا دیا' آج وہ مدرسہ معمولی حالت میں ہے لیکن گذشتہ نصف صدی میں چند مخلص صاحبان کی عزم و عمل علما جن میں مولینا ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی سب سے نمایاں ہے' اس مدرسہ نے ہندوستان کے تمام عربی مدارس کے مقابلہ میں اپنی شہرت و عظمت کا علم بلند کیا تھا' اسی مدرسہ نے قدیم درس نظامیہ کے نصاب پر ندوہ سے پہلے یا ندوہ کے ساتھ ساتھ غور کیا' منطق' فلسفہ' صرف و نحو اور متعدد اسلامی علوم کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرا کے ایک نیا نصاب کیا۔ اس مدرسہ میں صرف بہار ہی کے طلبہ نہیں پڑھتے تھے بلکہ ہندوستان کے جنوب و شمال کے دور افتادہ علاقوں سے کھنچ کھنچ کر یہاں آ گئے تھے' جن کی تعداد کسی زمانہ میں پانچ چھ سو تک

۔ غالباً یہ وہی مولوی ناظر حسین صاحب ہیں جن کے پوتے مولوی عبدالرحیم (فاضل دیوبند) ہیں اور آج کل بی ایم کالج میں کامیاب ہیڈ مولوی ہیں۔

پہونچ گئی تھی' اسی مدرسہ کے فارغ التحصیل حیدرآباد کے ایک مشہور نواب اظہر جنگ بہادر تھے' جو اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے پرائیوٹ سکرٹری کے عہدہ پر سرفراز تھے' اور جن کی بدولت گذشتہ آرہ رائٹ میں حضور نظام خلد اللہ ملکہ نے ایک لاکھ کا گراں قدر عطیہ ستم زدوں کی امداد کے لئے عطا فرمایا تھا۔ اس مدرسہ کی ایک علمی مجلس "مجلس مذاکرہ علماء" کی یادگار کے دنوں سے اب تک محو نہ ہوئی ہوگی' خصوصاً مولینا عبداللہ غازی پوری جو اس مدرسہ کے صدر تھے انکی تحریر و تقریر کی اسی مجلس کی بدولت ہندوستان میں دھوم مچی ہوئی تھی' اسی مدرسہ اور مجلس کے تعلق سے یہاں عربی زبان کی کتابوں کے چھاپنے کے لئے بڑے پیمانہ پر مطبع بھی قائم ہوا تھا۔ جس میں بعض نادر کتابیں شائع ہوئیں' خصوصاً تفسیر ابن کثیر کی اشاعت کا فخر غالباً سب سے پہلے اسی مطبع کو حاصل ہوا۔ آرہ کی یہ علمی سرگرمیاں بعد کی چیزیں ہیں لیکن اس سے پہلے بھی وہاں جید صاحب درس علماء موجود تھے ان ہی میں سے کسی کے حلقہ درس میں شریک ہوگئے' یہاں پہونچ کر آپ کو محسوس ہوا جیسا کہ خود لکھتے ہیں "جو کچھ اب تک پڑھا تھا بغیر سمجھے پڑھا تھا۔"

مطالعہ کی عادت

آرہ سے پہلے اب تک انکی تعلیم صرف سبق پڑھنے اور ایک حد تک اسکو یاد کرلینے تک محدود تھی' لیکن یہاں پہنچ کر قدیم اصول تعلیم کے ایک جدید ضابطہ سے روشناس ہوئے۔ اور اسی ضابطہ کے التزام نے آخر عمر تک ہمیشہ علمی جد و جہد میں ان کا ساتھ دیا۔ کالج اور اسکول میں تعلیم پانے والے شائد اس سے واقف نہ ہوں لیکن پرانے زمانے کا دستور تھا' کہ طالب العلم کل جس سبق کو استاد سے پڑھنے والا ہوتا۔ رات کو اطمینان کے ساتھ اپنی استعداد اور قابلیت کی آخری حد تک اس پر زور لگاتا کہ جہاں تک ممکن ہو اس سبق اور اس کے تعلقات کی واقفیت خود حاصل کروں۔ سبق کے مفردات کا حل پھر جملوں کا مطلب ان جملوں سے جو عبارت بنتی اس کا مطلب سب کو گھر پر خود ہی حل کرنا' طلبہ کے اسی کام کا نام "مطالعہ" تھا' اساتذہ اسکی سخت نگرانی رکھتے تھے' کہ درس میں کوئی طالب العلم بغیر مطالعہ کے شریک نہ ہو۔ وقتاً فوقتاً طلبہ کا امتحان لیا جاتا تھا' کہ اس نے گھر پر اپنے سبق کا مطالعہ کرلیا ہے یا نہیں۔ اسکی ایسی سخت تاکید ہوتی تھی کہ جہاں تک یہ مطالعہ ہو کسی شرح و حاشیہ وحل کی امداد سے نہ ہو' خدانخواستہ اگر کسی بدقسمت طالب العلم کے متعلق استاد کو معلوم ہوجاتا کہ اس نے حاشیہ یا شرح کی مدد سے مطالعہ دیکھا ہے تو پھر اسکی خیر نہ تھی' واقعہ یہ ہے "درس قدیم" کا یہ ایسا قیمتی جزو تھا کہ چند ہی کتابوں کے بعد طلبہ اساتذہ سے بے نیاز ہوجاتے تھے' ان میں خود بالغ استعداد پیدا ہوجاتی تھی' اور عمر بھر ایک عالم کو جو چیز کام دے سکتی ہے' وہ صرف یہی مطالعہ کی قوت ہوتی ہے۔ ورنہ استاذوں کی باتیں کسے یاد رہتی ہیں' اور یاد رہتیں بھی تو آدمی کہاں تک دوسروں کے بھروسہ جی سکتا ہے۔ مطالعہ کی عادت آرہ میں جو پیدا ہوئی اس کے متعلق فرماتے ہیں:-

"اس وقت سے (یعنی جب سے آرہ میں پڑھنا شروع کیا) آئندہ بغیر مطالعہ اور پورے طور سے سمجھے بغیر نہ پڑھتا تھا"

خود درس دینے کی ابتدا

لیکن یہ کام تو ان ہی کتابوں کے متعلق کرسکتے تھے' جنھیں پڑھ رہے تھے' مگر جو کتابیں اب تک بہار وغیرہ میں پڑھ چکے تھے' اور جن کے متعلق ان کو اطمینان نہ تھا۔ ان پر عبور حاصل کرنے کے لئے کیا کریں۔ اس مشکل کے حل کرنے کے لئے بھی ان کے سامنے "درس قدیم" کی دوسری چیز کارآمد ثابت ہوئی۔

اس زمانہ میں عموماً تعلیم و تعلم کے لئے خواہ وہ اعلیٰ تعلیم ہی کیوں نہ ہو' مدارس کا بہت کم رواج تھا' بلکہ عام قاعدہ یہ تھا کسی جگہ کوئی ممتاز عالم بیٹھ گیا' اور اس کے اردگرد طلبہ جمع ہونے شروع ہوئے' رفتہ رفتہ اس عالم کی شخصیت ایک مدرسہ کی شکل میں تبدیل ہوجاتی تھی' یہ بظاہر عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک عالم نیچے سے اوپر تک کی تمام جماعتوں کی تعلیم کا کام کس طرح انجام دیتا تھا' لیکن صورت یہ ہوتی تھی کہ ابتداءً یہ عالم چھوٹی کتابوں کی کسی جماعت کو پڑھانا شروع کرتا تھا' جوں جوں اس جماعت کے لوگ اوپر کے درجوں تک ترقی کرتے جاتے' پڑھنے کے ساتھ ان ہی کا فریضہ ہوتا تھا کہ آئندہ چھوٹی کتابوں کے طلبہ کے پڑھانے کا کام بھی انجام دیں' اور اس طرح بغیر کسی جدید مدرس کے اضافہ کے ایک ہی عالم کے زیر تعلیم طلبا نیچی جماعتوں کے معلم بن جاتے تھے' علاوہ مالی سہولت کے اس میں سب سے بڑا علمی فائدہ یہ ہوتا تھا' کہ اوپر کی جماعت کے طلبہ کا علم روز بروز تازہ سے تازہ تر ہوتا جاتا تھا۔ گویا فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ میں اس تدبیر سے ایسے علماء اکثر ہوتے تھے' جو درس کی اکثر و بیشتر کتابیں ایام تعلیم ہی میں پڑھا کر اس کے پورے ماہر بنتے تھے اس عرصہ میں ایک ایک کتاب کو متعدد بار پڑھانے کا موقعہ مل جاتا تھا۔ اسی لئے ان کا علم مستحکم و مضبوط ہوتا تھا' یہ صورت نہ ہوتی تھی'

کہ ایک طرف سے پڑھتے جاتے ہیں اور دوسری طرف سے تے کرتے جا رہے ہیں " تا آنکہ ادھر طالب العلم بی۔ اے سے فارغ ہو کر کالج سے نکلا' اور ادھر جو کچھ پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے ایکدم میں بھلا دیا۔ یا بقول مولانا شبلی مرحوم " ادھر کالج سے نکلے ادھر جو کچھ پڑھا تھا سب کو تے کر دیا" مولانا عبدالغنی مرحوم کو بھی اپنی گذشتہ کتابوں کے تازہ کرنے کا موقعہ اسی صورت سے ہاتھ آیا' خود فرماتے ہیں :۔

" پچھلی کتابوں کو بذریعہ مطالعہ اور تدریس صاف کرنے کا مصمم ارادہ ہوا" ۔

اور اس ارادہ پر پورے استقلال کے ساتھ عمل کرتے رہے فرماتے ہیں :۔

" اسی زمانہ میں نیچے کی کل درسی کتابیں شرح جامی و شرح تہذیب تک کرات و مرات پڑھائیں "۔

ایک غیبی امانت اور آرہ سے پٹنہ آنا

آرہ میں ابھی پورا سال بھی نہیں گذرنے پایا تھا بلکہ خود ارقام فرماتے ہیں کہ " تقریباً نصف سال وہاں پڑھنے کے بعد" ایک زندہ کتاب جس کے بغیر انسان کی زندگی میں انقلاب نہیں ہوتا' اس کے مطالعہ کا قدرت نے موقعہ فراہم کیا' آپ کے وطن مالوف استھانواں کے ایک نوجوان عالم جو بعد کو بہار کے ممتاز ترین علماء کی صف میں شمار کئے گئے' بلکہ سچ یہ ہے کہ بلا مبالغہ اس وقت بھی بہار کی علمی اور دینی ہلچل کا مختلف حیثیتوں سے آپ ہی کا وجود باسعود سرچشمہ ہے ان کا نام مولانا سید وحید الحق رحمۃ اللہ علیہ تھا' قصبہ بہار کا مشہور اسلامی مدرسہ جو بحمد اللہ اب تک باقی ہے آپ ہی کا قائم کیا ہوا ہے' اور آج بہار میں دین کی سرکاری تعلیم کا سرشتہ جس بزرگ کے ہاتھ میں ہے یعنی مولانا خان بہادر مبارک کریم اور جس کی ذات غیر سرکاری اسلامی تحریکوں کی اسی بہار میں ماوی و ملجا ہے یعنی حضرت ابوالمحاسن مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار' یہ دونوں سرکاری و غیر سرکاری ہستیاں اسی آسمان علم کے دو مختلف الجہات تارے ہیں' بہرحال مولانا عبدالغنی مرحوم ارقام فرماتے ہیں کہ میں آرہ سے :۔

" مولانا المولوی وحید الحق جو فارغ التحصیل ہو کر پٹنہ میں ایک امیر کے یہاں ملازم ہوئے تھے چلا آیا"

مولانا وحید الحق مرحوم جیسا کہ اشارۃً میں نے پہلے ہی ذکر کیا' ایک خاموش انقلابی وجود کے مالک تھے' خاکسار کی والدہ[1] مرحومہ چونکہ استھانواں ہی کی تھیں۔ بچپن میں ان سے " وحید الحق بھائی " (کہ اسی لقب سے والدہ مرحومہ ان کو یاد فرماتی تھیں) کے متعلق جو واقعات میں نے سنے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ کر گذرنا چاہتے ہیں' انھوں نے بجائے شہر کے ممبروں لیڈری کے اسٹیجوں کے دیہات کی گلیوں اور عورتوں کے چھپروں میں اپنے مقصد کو تلاش کیا ہے' مشرکانہ عقائد و رسوم جن میں مسلمانوں کی جاہلی نسلیں غیر اقوام کی صحبت اور عورت کی نفاست کی بدولت مبتلا ہو گئی تھی۔ مولانا نے عورتوں اور جاہل مردوں کو کن خاموش راہوں سے ان غافلوں کے اس قافلہ کو حرم تک لے جانے کی کوشش فرمائی ہے۔ آب دیدہ ہو کر اماں مرحومہ یاد کرتی تھیں کہ موٹیا کا لانبا کرتہ اور موٹیا کا پائجامہ موٹیا کی ٹوپی میں اسلام کا یہ مخلص خادم گھر گھر مسلمان خواتین کو نرمی اور دل دہی کے ساتھ بدعات اور مشرکانہ رسوم کے چھوڑنے کی ہدایت کرتا تھا' ان کی تدبیریں [illegible] خدا نے ان کی باتوں میں تاثیر بخشی تھی ان شاء اللہ آئندہ کسی خاص مقالہ کے ذریعہ سے ان کے حالات بھی " ندیم " میں شائع ہوں گے۔

بہرحال یہ خدا کی ایک غیبی تائید تھی کہ وہی لڑکا عبدالغنی جو اپنے زندہ باپ کی نگاہ لطف و کرم سے بھی ایک مدت تک محروم ہو چکا تھا' اب قدرت نے اس کو ایک ایسی جگہ پہونچا دیا۔ جہاں پہونچنے کے بعد آدمی پر ان مقاصد تک پہونچنے کی راہیں کھل جاتی ہیں' جن تک پہونچنے کے لئے کائنات کا سارا نظام قائم کیا گیا ہے۔ یہ مولوی وحید الحق رحمۃ اللہ علیہ مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم کے صرف ہم قریہ اور ہم وطن ہی نہ تھے' بلکہ برادری کا بھی رشتہ تھا' اور سچ تو یہ ہے کہ جس کے پاس وہ پہونچے تھے اس کی حقیقت اس نگاہ میں صرف وہی رشتہ جو ایک عربی کو عجمی سے ایک مغربی کو ایک مشرقی سے بھائی بنا کر ملاتا ہے' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کیا ہوا ایمانی ناتہ' ان تمام شفقتوں اور رعنائیوں کے لئے کافی تھا۔ جن کا تذکرہ مولانا عبدالغنی مرحوم جب زبانی

---

[1] میری والدہ مرحومہ کا نام "کبریٰ خاتون" تھا' ان کا میکہ استھانواں تھا' کبھی کبھی اپنے بعض مضامین و مقالات کو میں نے "ابن کبریٰ" یا "کبریٰ زادہ" کے نام سے لکھا ہے یہ انتساب گرامی انہی کی ذات کی طرف ہے خاکسار پر ان کے خاص عادات و خصائل کا خاص اثر ہے۔ رحمہا اللہ تعالیٰ و غفر لہا کما ربنی صغیرا

کرتے تو بیان کرنے سے نہیں تھکتے تھے اور اپنی زندگی کی مختصر یادداشت میں خزینہ ہیں۔ اس کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"انھوں نے (مولوی وحید الحق مرحوم) نے جس محنت و شفقت کے ساتھ اور جس جاں فشانی اور دل سوزی کے ساتھ میرا پڑھانا اپنے ذمہ لیا اس کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہئے۔"

ایک خاص علم کا ذوق

مولینا وحید الحق مرحوم جیسا کہ اس زمانہ کا عام دستور تھا، تمام علوم متداولہ میں کافی دستگاہ رکھتے تھے لیکن عموماً اس عہد کے علماء میں جس فن کا عام چرچا نہ تھا وہ "عربی علم ادب" تھا۔ بڑے بڑے عالم معمولی عربی شعر کے ترجمہ پر قادر نہ تھے، عموماً عربی لکھنے خصوصاً بولنے کی قابلیت تو شاید ہی کسی میں ہوتی تھی۔ چند خاص لوگوں کو کچھ لکھنے کی مشق بھی تھی، تو قریب قریب وہ ایک قسم کی اردو عربی ہوتی تھی، زیادہ تر معقولات کی کتابوں پر وہ عربی زبان میں حواشی لکھتے تھے، ان فنون کے مسائل کی تعبیر کے لئے چند مقررہ اصطلاحیں معین تھیں، چند رابطی افعال و حروف کو ملا کر عبارت بنالی جاتی تھی، خود اس زمانہ میں اس عربی کا نام "کان یکون" کی عربی تھی جس وقت ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا رواج شروع ہوا، اور انگریزی مدرسوں میں تمام چیزوں سے زیادہ انگریزی ادب ہی پر زور دیا جاتا تھا، کوشش کی جاتی تھی کہ طلبہ میں انگریزی کا ذوق اتنا پیدا ہو جائے کہ بے ساختہ اس زبان میں لکھنے پڑھنے پر وہ قادر ہو جائیں، یہی ذوق اتنا بڑھا کہ کچھ ہی دنوں کے بعد ہندوستانی باپ فادر اور ہندوستانی ماں مدر، ہندوستانی بیوی "فیملی" کے نام سے موسوم ہونے لگی سنا جاتا ہے کہ موت کے وقت تو نہیں، لیکن خواب تو عموماً لوگ انگریزی ہی میں دیکھنے لگے، انگریزی زبان میں اس غلو پیدا کرنے کا کیا مقصد تھا، علم اور ہر فن کو ایک مغربی جزیرہ کی زبان میں ہندوستانیوں کو پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جارہا تھا، اس کا راز کچھ تو کھل چکا ہے اور آئندہ کھلے گا۔ لیکن اس کی وجہ سے مصیبت ان غریب مولویوں پر آگئی۔ بیس بیس سال عربی پڑھنے کے بعد جب انگریزی خوانوں کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بچارا مولوی عربی کے دو صحیح فقرے نہ لکھ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے، تو ان کو انکی تجہیل و تحمیق کا یہ اچھا آلہ ہاتھ آگیا، انھوں نے ان کے علم و فضل کا انکار کیا۔ بیچارے مولوی لاکھ کہتے تھے کہ بھائی ہم عربی میں لکھ پڑھ نہ سکتے ہوں۔ لیکن قرآن و حدیث و فقہ جس عربی میں ہے اس کا صحیح مطلب سمجھتے ہیں، لیکن اس گروہ کا مطالبہ تھا کہ تم عربی میں ہمارے سامنے تقریر کرو، ورنہ ہم تمھیں عالم نہیں مانیں گے، کہا جاتا تھا کہ بھینس کے آگے بین باجہ بجانے کا کیا نفع ہوگا۔ لیکن ادھر سے برابر یہی اصرار ہوتا رہا اور دوسری طرف لطف یہ تھا۔ کہ جمعہ کے دن بچارا مولوی عربی زبان کا لکھا ہوا کوئی خطبہ اگر سناتا تھا تو اسی جماعت کی طرف سے ہنگامہ برپا کیا جاتا تھا، کہ جس کے یار کی زبان ترکی نہیں ہے۔ دیکھئے جناب اس کے آگے یہ ترکی خطبہ پڑھتے ہیں، بہرحال فہمیدہ علماء کو اس طفلانہ مطالبہ کا جب احساس ہوا، تو انھوں نے محنت پوری کرنے کے لئے بہ تدریج عربی زبان کے انشاء و گفتگو میں مہارت پیدا کرنے کی کوشش شروع کردی۔ یہاں تک کہ ندوۃ العلماء کے دار العلوم کا تو ایک اہم نصب العین ہی یہ رکھا گیا، کہ یہاں کے طلبہ کی خاص خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عربی ہی میں بولیں گے، اور عربی میں لکھیں گے۔ اگرچہ جب تجربات کے انجام کا وقت آیا، تو یہ توقع کہ اب تو منکرین کا گروہ علماء کی فضیلت کا انکار نہ کریگا۔ پوری نہ ہوئی۔ ندوی طلبہ میں سے کتنوں نے بڑے بڑے جلسوں میں فی البدیہ فصیح و بلیغ معیاری عربی کی تقریروں کا مظاہرہ کیا، لیکن مولوی بہرحال منکرین کی نگاہوں میں وہی مولوی باقی رہا[1]، بلکہ ادھر اجنبی دباؤ سے متاثر ہو کر مولویوں پر یہ نیا الزام تراشا گیا کہ انہیں لوگوں نے اردو زبان کو عربی کے موٹے موٹے ثقیل الفاظ سے بھر کر بوجھل بنا دیا ہے[2]۔

بہرحال اس جدید مطالبہ سے متاثر ہو کر ندوی تحریک سے پہلے ہی جن بزرگوں نے ادھر توجہ کی ان میں ایک مولوی وحید الحق صاحب استھانوی مرحوم بھی تھے، مولینا عبد الغنی صاحب مرحوم ارقام فرماتے ہیں:۔

"ادب عربی جس میں ان (مولوی وحید الحق) کو بہت اچھی مداخلت تھی۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ہونہار سعید شاگرد میں بھی انھوں نے اسی ذوق کو پیدا کرنا شروع کیا، اور یہ بھی مولانا عبد الغنی صاحب کے ساتھ خدا کی مدد تھی کہ آئندہ جو کچھ وہ ہونے والے تھے، اس میں اس جدید ذوق سے انکو بہت مدد ملی، ورنہ اگر وہ بھی "قبل الندوت" والے دور کے صرف معقولی مولوی ہو کر رہ جاتے، تو یقیناً جو کام آئندہ ان سے بن پڑا، شاید اتنی خوبی کے ساتھ وہ انجام نہیں دے سکتے تھے، خود لکھتے ہیں کہ:۔

"مولوی وحید الحق صاحب مرحوم نے علاوہ معمولی درسی کتابوں کے ادب عربی کا مختلف طور پر سبق دینا آغاز کیا۔"

[1] ندیم ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل علماء نے تو نئی نسل سے شاید اپنی عربی دانی کا لوہا منوالیا۔ موتمر اسلامی کی صدارت: الجامعہ والضیاء وغیرہ اسکی شہادتیں ہیں [2] زبان کو ہلکا کرنے کی تحریک بھی ایک ندوی عالم نے پیش کی ہے۔

علم کے ساتھ عمل کا شوق

اور یہ تو صرف علم کا حال تھا، لیکن ظاہر ہے کہ صرف علم کی بار برداری نے کتنوں کو سب کچھ پڑھنے اور سب کچھ سیکھنے کے بعد چار پاؤں والوں سے آگے بلند ہونے نہ دیا۔ ان میں کتنوں کو قرآن کی زبان میں اس گدھے کا ہم قدم و ہمدم قرار دیا گیا ہے جو اپنی پیٹھ پر کتابوں کو لادے پھرتا ہو۔ مولانا عبد الغنی کی خوش اختراعی پہ چار چاند لگ گئے، کہ ان کو ایسے برگزیدہ پاک روح کی رفاقت اور صحبت کا موقعہ میسر آیا، اور اپنے وطن ہی میں گھر سے نکلے بغیر ہی میسر آیا۔ اسی صحبت کی برکت تھی کہ عروس دنیا ان کے سامنے زندگی کے مختلف ادوار میں بن ٹھن کر مختلف راہوں سے آئی جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، لیکن عنفوان شباب کا یہ ایسا گہرا نقش ان کے دل پر مولوی وحید الحق صاحب نے بٹھا دیا تھا، کہ سب کچھ گذرتا رہا لیکن جس قسم کی بلند نظری اور ژرف نگاہی ان میں پیدا ہو چکی تھی، اس نے ایک لمحہ کے لئے ان کو اس مغالطہ میں مبتلا ہونے پر آمادہ نہ کیا، کہ جو چیز فانی ہے اسکو بلا وجہ باقی باور کر لیا جائے جو مرنے والے ہیں انہیں نہ مرنے والا یقین کیا جائے۔ انکی بلند فطرت نے ہمیشہ انکی نگاہ اونچی رکھی۔ ارقام فرماتے ہیں :-

"علاوہ کتابی تعلیم کے شب و روز انکی صحبت با برکت میں رہنے کی وجہ سے انکی پاک اور بے ریا زندگی سے بے شمار فوائد حاصل ہوں گے۔"

مولانا وحید الحق کا پٹنہ چھوڑنا اور سعید شاگرد کی رفاقت میں وفاداری

صحیح طور پر مجھے اس کا پتہ نہ چل سکا کہ اس پٹنہ کی ملازمت میں مولانا وحید الحق اور ان کے ساتھ مولوی عبد الغنی مرحوم کب تک رہے، بہر حال کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ استاد کو پٹنہ چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا پٹنہ چھوڑنے کے بعد بظاہر مولوی وحید الحق صاحب کے لئے کوئی ایسا مستقل ٹھکانہ بھی نہ تھا۔ جہاں جم کر وہ بیٹھ جاتے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پٹنہ سے جدا ہو جانے کے بعد ان کو چندے معاشی دشواریوں میں مبتلا ہونا پڑا۔ اور اسی لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ دوسری سے تیسری جگہ وہ منتقل ہوتے رہے، ابتلا و آزمائش کا یہ دور کب تک جاری رہا۔ اس کا بھی مجھے صحیح علم نہ ہو سکا۔ البتہ مولوی عبد الغنی صاحب کے بیان سے جیسا کہ آئندہ ذکر آئے گا۔ "سالہا سال تک" کی مدت اس حال میں گذارنی پڑی مولوی وحید الحق مرحوم کسی مستقل ٹھکانہ کی تلاش میں تھے۔ تاکہ باطمینان وہاں بیٹھ کر دل کے حوصلوں کی تکمیل کریں۔ لیکن ابھی قدرت انکو گرمی و سردی کے مختلف حالات سے گذار کر کچھ اور پختہ کرنا چاہتی تھی، خیر مولوی وحید الحق صاحب پر تو جو کچھ گذر رہی تھی، وہ اسکی برداشت کی قوت اپنے اندر پیدا کر چکے تھے، لیکن حیرت ہے اس نوجوان پر جو ابھی اس راہ کے نوگرفتاروں میں تھا، اور جس پیشہ کا آخر وہ شیر بگردنیا سے رخصت ہوا، اس کی دشت پیمائی کی ابھی بسم اللہ ہوئی تھی۔ علم اور علم کے ساتھ شب و روز اپنے استاد کی صحبت با برکت سے ان کو جو بے شمار فوائد حاصل ہو رہے تھے، اس کا ذوق اس کمسنی کے زمانہ ہی میں ان پر کچھ اس طرح مسلط ہو گیا تھا کہ ہر حال میں استاد کی رفاقت دینے کیلئے تیار ہو گئے، جہاں جہاں وہ جاتے تھے پیچھے پیچھے ان کا دامن تھامے مولوی مسیح اللہ وکیل کا یہ چہیتا ناز و نعمت میں پلا ہوا بھتیجہ ساتھ جاتا تھا۔ خود فرماتے ہیں :-

"اس زمانہ سے (یعنی پٹنہ کی رفاقت کے عہد سے) سالہا سال تک مختلف مقامات یعنی پٹنہ کے سوا نگرنہسہ، آرہ، وغیرہ میں برابر ان کے ساتھ رہا۔"

مولوی عبد الغنی مرحوم کا یہ عجیب علمی ذوق تھا، کہ شہر گردی کے اس دور میں بھی پڑھنے اور سیکھنے کے ساتھ دوسروں کے پڑھانے اور بنانے کا جذبہ بھی ان پر پراگندہ خاطری کے ان دنوں میں بھی بڑی حد تک طاری تھا۔ جیسا کہ خود لکھتے ہیں :-

"اسی زمانے میں (یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے دنوں میں) نیچے کی کل درسی کتابیں شرح جامی و شرح تہذیب تک کرات و مرات پڑھائیں تھیں۔"

تقدیر کی نئی گردش استاد و شاگرد کی جدائی۔

دربدر، شہر بشہر پھرنے کی آخری منزل پھر شہر آرہ شاہ آباد ہی ہوئی، قصہ یہ ہوا کہ مختلف مقامات کے قیام کے بعد مولوی وحید الحق مرحوم کو آرہ کے مسلمانوں نے دعوت دی، یا خود ہی وہ وہاں پہونچے۔ بہر حال کسی طرح وہ آرہ پہونچے، جیسا کہ پہلے بھی لکھ چکا ہوں، شہر آرہ کو صوبہ بہار کے مختلف شہروں پر یہ فوقیت اس

وقت بھی حاصل ہوا اور اس زمانہ میں بھی تھی' بلکہ جیسا کہ اجمالاً آپ سن چکے کہ اسی شہر میں مسلمانوں نے صوبہ بہار کا سب سے بڑا عربی مدرسہ احمدیہ قائم کیا تھا
مدرسہ سے مولوی وحیدالحق مرحوم کو اس شہر میں اپنے در مقصود کے حصول کی امید قائم ہوئی' وہ بہار میں عربی تعلیم کے لئے ایک مستقل دارالعلوم قائم
کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ قدیم شخصی تعلیم گاہوں کی بربادی کے بعد اس صوبہ میں عربی تعلیم کا جو نظام منتشر اور پراگندہ ہوگیا ہے۔ پھر اسکی شیرازہ
بندی ہو جائے' یہاں کے مسلمانوں پر ان کے علم و تقویٰ کا اچھا اثر مرتب ہوا۔ اور یہ طے ہوا کہ اسی مقام کو صوبہ کی عربی تعلیم کا مرکز قرار
دیا جائے۔ شاید صوبہ بہار میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ مدرسائی اصول پر ایک تعلیم گاہ کی بنیاد فخر المدارس کے نام سے رکھی گئی' صوبہ کے مختلف حصوں
میں تجربہ کار کہنہ مشق اساتذہ اپنی ناقدریوں کے ہاتھوں پریشان حال تھے' انہیں اس مدرسہ میں کام کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس مدرسہ میں کن کن
مدرسین کا تقرر عمل میں آیا' ابھی یہ مسئلہ تشنۂ تحقیق ہے لیکن سردست اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ "ناورا اہنگک" (دریا پار) کے مشہور عالم مولوی فداحسین صاحب
محی الدین نگری قدس اللہ سرہ العزیز جو اپنے عہد کے مسلم الثبوت اساتذہ اور بڑے مشاق مدرسوں میں شمار کئے جاتے تھے' جہاں تک مجھے یاد
پڑتا ہے مولانا مرحوم کا تذکرہ ان کے کسی شاگرد نے معارف (اعظم گڈہ) میں چند سال قبل شائع بھی کرایا ہے۔ بہرکیف اس مدرسہ کی خدمت جن لوگوں کو
سپرد کی گئی' ان میں ایک تو خود مولانا وحیدالحق استھانوی مرحوم اور دوسرے مولانا فداحسین محی الدین نگری تھے' بلکہ مولوی عبدالغنی مرحوم کی یادداشت
کے ایک مقام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آرہ کے فخر المدارس کی تاسیس و قیام میں مولانا وحیدالحق کے ساتھ مولوی فداحسین بھی شریک تھے۔ فرماتے ہیں:-

"فخر المدارس جس کے بانی مولانا وحیدالحق و مولانا فداحسین محی الدین نگری تھے"

یہ مدرسہ کب تک جاری رہا۔ میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا' لیکن اتنا قطعی ہے کہ مولانا عبدالغنی مرحوم کی مدت تعلیم کے "سالہا سال" کا ایک بڑا حصہ
اسی مدرسہ میں گذرا۔ آخر کیا صورت پیش آئی۔ کہ اچانک مولوی وحیدالحق مرحوم کے اس آشیانہ پر بھی بجلی گری' مولوی عبدالغنی صاحب کا بیان ہے
کہ:-

میرزاہد ملا جلال آ پہنچا تھا کہ یکایک زمانہ نے کروٹ بدلی اور فخر المدارس کے ذریعہ سے جس تعلیم کی شیرازہ بندی کی گئی تھی
اس کا شیرازہ ٹوٹا' (اس بری طرح ٹوٹا کہ) فخر المدارس کے بالکل اٹھ جانے کی وجہ سے میں پٹنہ چلا آیا۔
اور مولانا وحیدالحق رونق افروز بہار ہوئے"۔

اور یوں سالہا سال کی رفاقت کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ شاگرد استاد سے اور استاد شاگرد سے جدا ہو گئے'

(باقی انشاء اللہ آئندہ کبھی)

سلہ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس وقت بھی حنفیوں' اور اہل حدیث کے متعدد مدارس اس شہر میں اب تک قائم ہیں چند سال ہوئے ایک وظیفہ یاب مسلمان ڈپٹی کلکٹر
نے کوئی نیا مدرسہ یہاں جاری فرمایا اس سے اس شہر کے مسلمانوں کے اس ذوق اور تعلق کا پتہ چلتا ہے جو اسلامی و مشرقی علوم سے انہیں ہے۔

سلہ ——— یہ اس زمانہ میں تعلیمی اسٹنڈرڈ کے اظہار کا ایک طریقہ تھا۔ بی۔اے اور ایم اے کی اصطلاحیں اس زمانہ میں
کہاں تھیں۔ مختلف کتابوں کو ان مراتب کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا گیا تھا۔ منطق کا مشہور متن تہذیب جس کے مصنف علامہ تفتازانی
اسکی شرح جلال الدین دوانی نے لکھی تھی' ان ہی کو "ملا جلال" بھی کہتے ہیں۔ اور اب انکی اس شرح ہی کا نام "ملا جلال" ہوگیا ہے جیسے شکسپیر وغیرہ
کے بعض ڈراموں ہی کو لوگ شکسپیر کہنے لگے' اسی کتاب پر عالمگیری فوج کے صدر محاسب (اکاؤنٹنٹ جنرل) سید زاہد جن کے والد ہرات کے تھے
اس کے باوجود ہندوستان لاہور میں پیدا ہونے کے وہ "میرزاہد ہروی" کے نام سے مشہور ہوئے یہ شخص باوجودیکہ حکومت کے انتظامی صیغہ کا
ایک ممتاز عہدہ دار تھا' لیکن درس و تدریس تصنیف و تالیف کا بھی شوق رکھتا تھا۔ طبیعت میں اپج اور جدت تھی' تین کتابوں پر انھوں
نے حواشی لکھکر اپنے خاص خیالات کا اظہار کیا ہے' جو تقریباً دو سو سال تک ہندوستان کے علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے
ان تینوں حاشیوں کے مجموعہ کا نام "زواہد ثلثہ" ہوگیا تھا' پچھلے دور میں بڑے عالم ہونے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان تین کتابوں میں سے
کسی پر یا کسی ایک پر حاشیہ لکھا جائے' اسی لئے ان تین کتابوں کے حاشیوں کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے' ادھر بیس پچیس سال سے
اب "زواہد ثلثہ" کا زور عربی مدرسوں میں کم ہوگیا ہے' ورنہ عالم عالم ہی شمار نہیں ہو سکتا تھا' جب تک ان کتابوں کو کم از کم اس نے نہ پڑھ
لیا ہو۔ بہرحال ان تین حاشیوں میں سے بجز شرح مواقف کے میرزاہد کے اور دو حاشیے یعنی قطبیہ اور ملا جلال کے حاشیوں کا شمار متوسطات
درمیانی درجہ کی کتابوں میں تھا' مولانا عبدالغنی مرحوم کی یادداشت بالا فقرہ سے یہی ہے کہ اس زمانہ کے تعلیمی نصاب کے وسط تک وہ پہنچ چکے تھے گویا

فردوسی اور دقیقی

از جناب پروفیسر طاہر رضوی ایم اے

فردوسی اور اُس کا "شاہنامہ" بے شک ایسی ہی قدر افزائی کا مستحق تھا کہ صدہا پر از تحقیقات و معلومات کتابیں اور مقالے خود شاعر اور اس کے کلام کے متعلق لکھے اور ترتیب دئے جائیں۔ چنانچہ ان تحقیقات میں تقریباً تمام ممالک نے بلا تفریق مذہب ملت حصہ لیا اور ہمارے معلومات میں کافی اضافہ کیا۔ ہم اس جگہ شاہنامہ فردوسی کے اُن مخصوص ہزار اشعار کے متعلق جن کو فردوسی نے دقیقی شاعر سے منسوب کیا ہے، اپنا خاص نظریہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اپنے ذاتی مطالعہ اور تحقیقات سے ہم اب تک جس نتیجہ پر پہونچے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ ہزار اشعار بھی حقیقۃً فردوسی ہی کی فکر رسا کا نتیجہ تھے لیکن بوجوہ چند اُس نے یہ ابیات اپنے پیشرو شاعر دقیقی کے نام منسوب کر دئے ہیں۔ اپنی اس جدید تحقیق کے ثبوت میں ہم دلیل بھی رکھتے ہیں جسے فی الحال مختصر طور پر پیش کریں گے۔ چونکہ یہ نظریہ سیکڑوں برس سے قایم شدہ عقیدہ کے خلاف پڑیگا لہذا اکثر و بیشتر حضرات کو حیرت ہوگی اور وہ اسے نظریۂ عجیب کہکر ٹال جائیں گے۔ مگر یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ ایسے ایسے اکثر غلط عقاید اب چند سال کے اندر علماء کی تحقیقات کی بدولت باطل ہو چکے ہیں۔ مثلاً کچھ عرصہ قبل تک ایک مثنوی موسومہ بہ یوسف زلیخا کو لوگ فردوسی کی تصنیف سمجھتے رہے اور اس کی نظم کے اسباب بھی بڑی شد و مد کے ساتھ بیان کئے جاتے تھے، مگر آج ہندوستان کے مایۂ ناز مستشرق اور محقق پروفیسر حافظ محمود شیرانی مدظلہ (پنجاب یونیورسٹی) نے ثابت فرما دیا کہ یہ خیال محض لغو ہے اور یوسف زلیخا کسی صورت میں بھی فردوسی کی منظومہ تصنیف نہیں ہو سکتی، اس طرح "چہار مقالہ نظامی عروضی" اور "تذکرۂ دولت شاہی" میں ایسے خلاف عقل روایات کا طومار ہے جسے عقل سلیم رکھنے والا انسان آج قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اب ہم اپنے ان دلائل کو جن کی بنا پر شاہنامہ کے ان ہزار اشعار کو شاعر دقیقی کی تصنیف سمجھنے سے معذور ہیں گوش گذار کرتے ہیں۔

ہر وہ شخص جس نے عہد فردوسی کی معاشرت کا بغور مطالعہ کیا ہے، آج اس حقیقت کا اقرار کریگا کہ اس زمانہ کے لوگ بوجوہ گوناگوں تنگ نظر اور متعصب تھے اور ان میں فردوسی جیسی آزاد خیالی اور عالی ظرفی مطلقاً نہ تھی، چنانچہ اس کا مظاہرہ فردوسی کی رحلت کے بعد یوں ہوا کہ اس کی میت کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے نہ دیا گیا۔ مولانا شبلی مرحوم نے شعر العجم میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ فردوسی کے معاصرین میں سے ایک مسلمان بزرگ اور عالم نے شاہنامہ کے جواب میں محض تعصباً ایک کتاب معصوم بہ "عمر نامہ"[1] تصنیف کی تھی کہ جس میں خلفائے راشدین کے کارنامے اور عربوں کی فتوحات کا تذکرہ تھا۔ اور غرض صرف اس قدر تھی کہ لوگوں کو شاہنامہ سے اور غیر مسلم بادشاہوں اور ان کے کارناموں سے نفرت ہو جائے۔ مسلمانوں نے شاہنامہ نظم کرنے کا صلہ فردوسی کو جو کچھ دیا ہے وہ اس مصرع سے صاف ظاہر ہے کہ

ع دلش گبر و جاں گبر و گبری زبان ۔

فردوسی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ شاہنامہ کے اکثر حصص پر اس کے ہمعصر سختی سے معترض ہوں گے اور اسے طرح طرح پر متہم کریں گے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے یہ ہزار اشعار متعصب مسلمانوں کو محض اسلئے ناپسند ہوں گے کہ ان میں قدیم پیغمبر ایران زرتشت کے ظہور کا حال خالص زرتشتی اور ایرانی نقطۂ نگاہ سے بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ بات فردوسی کے لئے ناممکن تھی کہ تاریخ ایران کے اس اہم ترین باب کو بالکل فراموش کر دے یا لکھے بھی تو ادھورے دل سے۔ لہذا فردوسی نے اُسی شد و مد کے ساتھ جیسا کہ اس واقعہ کے شایان شان تھا۔ ان ہزار اشعار کو بھی نظم کیا مگر اپنے تئیں طعن و تشنیع سے محفوظ رکھنے کے لئے اس نے شاہنامہ کے اس پورے باب کو دقیقی کے نام سے منسوب کر دیا، اس طرح پر اپنے اصول کی پابندی کرتے ہوئے اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا اور کوئی اس پر اعتراض بھی کرنے کی جرأت نہ کر سکا، اس لئے کہ اب جبکہ دقیقی بقید حیات نہ تھا اس کی تردید کرنے

[1] ندیم "عمر نامہ" کی تاریخی تحقیق پر مدیر ندیم کا ایک مفصل مضمون "معارف" بابت ماہ ستمبر سنہ ۴۰ء میں شائع ہو چکا ہے اس کا مطالعہ اس صنف کے مباحث میں دلچسپی رکھنے والے اہل علم کیلئے دلچسپ ثابت

والا کون تھا وہ جانتا تھا کہ لوگ مشہور عوام روایت سے باخبر ہیں کہ دقیقی قدیم تاریخ ایران کو نظم کا جامہ پہنانے کا ارادہ رکھتا تھا بلکہ کچھ اجزا نظم بھی کر چکا تھا لیکن قبل اس کے کہ اپنے اس کارنامہ کی تکمیل کر سکے اس کی موت واقع ہو گئی۔

فردوسی نے زیر بحث باب کا آغاز حسب ذیل طور پر کیا ہے:-

چناں دید گویندہ یک شب بخواب | کہ یک جام مے داشتے چوں گلاب
دقیقی ز جائے پدید آمدے | بداں جام مے داستانہا زدے
بہ فردوسی آواز داد کہ مے | مخور جز بآئین کاؤس و کے
بدیں نامہ ہرچند بشتافتے | کنوں ہرچہ جستی ہمہ یافتے
از اندازہ من بیش گفتم سخن | اگر باز یابی بخیلی مکن
ز گشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار | بگفتم سر آمد مرا روزگار
گر آں مایہ نزد شہنشہ رسد | رواں من از خاک بر مہ رسد
پذیرفتم آں گفت او را بخواب | بخوبی و نرمیش دادم جواب
کہ من ہم بہ پیشِ تو خواہم رسید | ازیں شربتم مے بباید چشید
کنوں من بگویم سخن کو بگفت | منم زندہ او گشتہ با خاک جفت

یہ یاد رہے کہ دقیقی کو خواب میں دیکھنا بالکل اسی طرح ہے جس طرح آغاز شاہنامہ میں سلطان محمود کو فردوسی نے خواب میں دیکھنے کا واقعہ نظم کیا ہے۔

چناں دید روشن روانم بخواب | کہ رخشندہ شمعے برآمد ز آب
ہمہ روئے گیتی شب لاجورد | ازاں شمع گشتے چو یاقوت زرد
در و دشت برساں دیبا شدے | یکے تخت پیروزہ پیدا شدے
نشستہ برو شہریارے چو ماہ | یکے تاج بر سر بجائے کلاہ
یکے پاک دستور پیشش بپائے | بداد و بدیں شاہ را رہنمائے
چو آں چہرِ خسرو بدیدے | ز آں نامداراں بپرسیدمے
یکے گفت ایں شاہ روم است و ہند | ز قنوج تا پیش دریائے سند
بایران و توران ورا بندہ اند | برای و بفرمان او زندہ اند
جہاندار محمود شاہ بزرگ | بہ آبشخور آرد ہمی میش و گرگ
تو نیز آفریں کن کہ گویندہ | بدو نام جاوید جویندہ

یہ مخصوص خواب شاہنامہ کے عین آغاز ہی میں ہے۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ شاہنامہ تکمیل ہو جانے کے بعد فردوسی نے دربار غزنوی کا قصد کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب شاعر شاہی دربار میں باریابی کی عزت حاصل کر چکا تو اس نے شاہنامہ کے اندر مختلف مقامات پر سلطان محمود کی مدح سرائی کر کے اپنی گراں قدر کتاب کو سلطان کے نام نامی سے معنون کرنے کی کوشش کی۔ فردوسی خواب دیکھنے اور دکھلانے کا بہت زیادہ عادی نظر آتا ہے۔ شاہنامہ کے دوران نظم میں اکثر و بیشتر کسی اہم واقعہ کے سلسلہ میں وہ کسی نہ کسی کا خواب دیکھنا ضرور نظم کرتا ہے۔

سلطان محمود کو خواب میں دیکھنے کا واقعہ جو نظم کیا گیا تھا اس سے غرض یہ تھی کہ سلطان کی خوشنودی حاصل ہو، اور دقیقی کو خواب میں دیکھنے سے یہ غرض تھی کہ درباری امرا ایران اشعار کے سبب اُن متعصب مسلمانوں کی ہمنوائی نہ کرنے لگیں جو فردوسی پہ گبر ہونے کا الزام رکھتے تھے، بلکہ وہ یہی سمجھیں کہ یہ سارے ابیات دقیقی نے نظم کیے تھے اور فردوسی نے انہیں اس مقام پر صرف نقل کر دیا ہے۔

ذرا سوچنا چاہیئے کہ آخر فردوسی جیسے پُرگو اور پُرمایہ شاعر کو کون سی ایسی دقت آن پڑی تھی کہ نئے اشعار نظم نہ کر کے دقیقی کے یہ ہزار اشعار شاہنامہ میں شامل کرے۔ اگر فردوسی کو دقیقی سے کچھ اشعار یا شاہنامہ کا کچھ منظوم حصہ لینا ہی تھا تو اس نے احوال دولت گشتاسپ اور ظہور پیغمبر ایران ہی کے واقعہ کو کیوں نقل کیا۔ کیونکہ دقیقی کے متعلق بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ اس نے شاہنامہ کے تقریباً بیس۲ ہزار اشعار نظم کیئے تھے، اگر یہ کہا جائے کہ دقیقی نے محض یہی ہزار بیت نظم کئے ہونگے تو پھر یہ سوچنا چاہیئے کہ آخر اس واقعہ میں کون سی ایسی بات دلچسپ تھی کہ دقیقی جیسے مرد مسلمان نے اسی واقعہ پر سب سے پہلے قلم اٹھانا اپنا فرض سمجھا۔ دقیقی کو یا تو بالکل ابتدائے تاریخ ایران سے اپنی نظم کا آغاز کرنا تھا۔ یا پھر داستان گشتاسپ ہی اگر اسے بہت زیادہ پسند خاطر تھی تو تخت نشینی گشتاسپ سے قبل کے واقعات بھی جو نسبتہً زیادہ دلچسپ تھے نظم کرنا تھا، برعکس اسکے گشتاسپ کی تخت نشینی سے کچھ مدت بعد عین جب کہ زرتشت کا ظہور ہوا دقیقی نے اپنے شاہنامہ کا آغاز کیا۔

یہ لطیفہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں کہ شاہنامہ کی اس داستان گشتاسپ اور ظہور زرتشت کے متعلق فردوسی کی خواب دیدہ روایت کی بدولت نیز دقیقی کے اس قطعۂ منظومہ کے سبب کہ :-

دقیقی چار خصلت برگزیدہ، بگیتی از ہمہ خوبی و زشتی،
لب یاقوت رنگ و نالۂ چنگ مئے خوں رنگ و دین زردہشتی

یہ بیچارا بیشتر و فردوسی آج اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگوں کے نزدیک مجوسی اور پیرو زرتشت سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ایک معمولی سی معمولی عقل رکھنے والا شخص بھی اس قطعہ کو پڑھ کر یہی کہیگا کہ یہ صرف شاعرانہ خیالات ہیں اور انہیں مذہبی عقاید سے کچھ بھی واسطہ نہیں۔

اب ذرا یہاں اس بات پر غور کیجیئے کہ فردوسی جس نے اپنی ساری عمر غیر مسلم بادشاہوں اور پہلوانوں اور مجوسیوں کے کارناموں کے سراہنے میں بسر کی ہو اگر ان مجوسیوں کے پیغمبر اور ایرانیوں کے ریفارمر یعنی زرتشت اور اس کے سرپرست گشتاسپ کی مذہبی تبلیغ اور دینی کارنامے بھی ظاہراً اپنے ہی قلم سے نظم کرتا تو ایسے مسلمان جو دقیقی کو اس کے مرنے کے بعد مجوسی کہیں اور فردوسی کا مردہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ ہونے دیں، فردوسی کے ساتھ اس کی زندگی میں کیسا سلوک کرتے۔ یہاں پر فردوسی کی مصلحت بینی اور دور اندیشی پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے کہ اس نے ایسی مناسب شخصیت کے نام وہ مخصوص اشعار منسوب کیئے جو متعصبین کی گرفت سے باہر ہو چکی تھی۔

عام طور پر لوگوں نے دقیقی شاعر کو جس کا نام ابو منصور محمد تھا مجوسی اور کیش زرتشت کا پیرو سمجھا۔ یوروپین مستشرقین تو خیر قابل معافی ہیں خود ایران کے فضلا اب تک اس بات کے قائل ہیں کہ دقیقی مسلمان نہ تھا۔

پروفیسر "نولدیکی" نے بجا طور پر اظہار خیال فرمایا ہے اور اس کے مبنی بر حقیقت ہونے کا ہر وہ شخص جس نے ادبیات ایران کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، اقرار کرے گا کہ اگر فردوسی اپنے شاہنامہ میں ان ہزار اشعار کو دقیقی سے منسوب نہ کرتا تو شاید ہی کوئی شخص یقین کر سکتا تھا کہ دقیقی ایسے ابیات کے نظم پر بھی قدرت رکھتا تھا، ان ہزار بیت کے علاوہ دقیقی کے افکار عالیہ جو ہم تک پہونچے ہیں وہ محض چند مدحیہ قصاید اور بیت ہائے رندانہ ہیں پروفیسر موصوف کے اس خیال پر ہمیں اس اضافہ کی اجازت دیجئے کہ اگر فردوسی اس قسم کا اشارہ نہ کرتا تو شاید ہی کوئی تمیز کر سکتا کہ ان اشعار میں اور شاہنامہ کے بقیہ اجزا میں کسی قسم کا اختلاف ہے۔ اب جبکہ فردوسی نے اس طرح کا اشارہ کر دیا تو بعد وفات فردوسی ہمارے تذکرہ نویسوں کو دور دور کی سوجھنے لگی۔ اور پھر کیا تھا فردوسی تو خود ایک ہزار ابیات کا اقرار کرے اور انہیں شاہنامہ میں بیس ہزار اشعار نظر آئیں۔ دنیا جانتی ہے کہ ان سارے طومار کی بنیاد صرف فردوسی ہی کی مصلحت آمیز تنہا روایت ہے، ورنہ کسی دوسرے راوی کا سرے سے پتہ بھی نہیں جو دقیقی کے اشعار شاہنامہ کا بطور واقعی نشان بتلا سکے۔

فردوسی کے زمانہ اور اقرار سے قبل کے ادبیات اور تذکروں میں کسی جگہ بھی دقیقی کے ان ہزار اشعار کے عالم وجود میں ہونے کا تذکرہ نہیں ملتا جب فردوسی نے اس طرف مصلحتہً اشارہ کیا تو پھر بعد کے ہر تذکرہ نویس نے فردوسی کے بیان کو سند سمجھ کر شاہنامہ کے ناظموں میں دقیقی کا بھی شمار کیا۔ اور جو اشعار نمونے کے طور پر دقیقی کے پیش کیئے وہ بھی انہیں ہزار اشعار سے، اس کے علاوہ انہیں کوئی اور شعر نہ مل سکا۔

"اسدی طوسی" ناظم گرشاسپ نامہ" جس کا زمانہ بھی فردوسی کی وفات سے قریب تر ہے، اپنی تالیف "لغات الفرس" میں دقیقی کے جن اشعار کو نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہے وہ وہی ہیں جن کو فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں دقیقی سے منسوب کیا تھا۔ آخر بھلا کیا یہ ممکن تھا کہ دقیقی کے اجزائے شاہنامہ

منظوم کا وجود ہو اور ان لوگوں کی دسترس تک ان ہزار اشعار کے سوا اور کوئی شعر نہ پہونچے۔ کتاب معروف "المعجم فی معیار اشعار العجم"، دقیقی کے شاہنامہ کے تذکرہ سے قطعی خالی ہے۔ تذکرہ "لباب الالباب" مؤلفہ محمد عوفی میں جو اس وقت قدیم ترین تذکرۂ شعرائے فارسی سمجھا جاتا ہے فردوسی کے حال میں لکھا ہے کہ شاہنامہ کی ابتدا دقیقی نے کی اور شاہنامۂ فردوسی میں بیس ہزار اشعار دقیقی کے ہیں۔ بقیہ ساٹھ ہزار اشعار فردوسی کے ہیں۔ مگر لطیفہ یہ ہے کہ کم و بیش ساٹھ ہزار اشعار تو شاہنامہ میں پائے جاتے ہیں، باقی بیس ہزار شعر کا کہیں پتہ ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان تذکرہ نویسوں کے ایسے بیانات خود ان کے اقوال کے ضعیف اور غیر مستند ہونے پر کافی دلالت کرتے ہیں۔

اب معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ داستان گشتاسپ کی نظم اور شاہنامہ کے بقیہ اجزا میں بلحاظ زورِ کلام اور طرزِ بیان کافی فرق ہے جیسا کہ خود فردوسی نے کہا ہے:۔ ؎

نگہ کردم این نظم سست آمدم — بسے بیت ناتندرست آمدم
من این را نوشتم کہ تا شہریار — بداند سخن گفتن نابکار ؎

لیکن اگر "ز گشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار" کا مطالعہ کرتے وقت ہم فردوسی کے بیان سے مرعوب نہ ہوں تو کوئی بیت "ناتندرست" نہ ملیگی۔ نفسیات سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ جب لوگوں نے فردوسی کے اس بیان سے متاثر ہو کر داستان گشتاسپ کا مطالعہ کیا تو انہیں دھوکہ ہوا اور سچ مچ ابیات "سست" نظر آنے لگے۔ "نولدیکی"، جیسے جفاکش عالم اور مستشرق نے جب فردوسی کے اس بیان کو سچ ثابت کرنے پر کمر باندھی تو ان ہزار ابیات میں انہیں طرح طرح کے ضعف اور نقائص نظر آنے لگے اور جن کا انہوں نے اپنی کتاب "رزمیات ایران" میں مبسوط تذکرہ بھی کیا ہے۔ لیکن یہ تمام زحمتیں بے سود تھیں اسلیئے کہ ان ہزار ابیات سے ہٹکر جب "نولدیکی" صاحب بقیہ اشعار شاہنامہ کا بھی اس کاوش سے مطالعہ کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ وہ تمام نقائص اور اغلاط جو انہیں ان ہزار ابیات میں نظر آئے تھے، پورے شاہنامہ میں بھرے پڑے ہیں۔ اگر ہم بنظر انصاف پڑھیں گے تو جو نقائص اور محاسن ان ہزار اشعار میں ملیں گے وہی نقائص اور محاسن بقیہ ابیات شاہنامہ میں بھی نظر آئیں گے۔ فردوسی کی مشہور عادت ہے کہ وہ اپنے اشعار کی بکثرت تکرار کرتا ہے۔ جب ہم شاہنامہ پڑھتے ہیں تو دیکھتے کہ ان ہزار ابیات اشعار کے اکثر اشعار کی فردوسی نے دوسرے اجزا میں بصورت شعر اور مصرع تکرار کی ہے۔ اگر یہ اشعار بصورت بیان اور تخیل "سست و ناتندرست" تھے اور اس نے داستان گشتاسپ میں محض اس خیال سے کہ دقیقی کا نام زندہ رہے اور اسے ممنون احسان کرے، انہیں نقل بھی کیا تھا تو پھر دوسری جگہوں پر خود ان کی تکرار کیوں کی؟ آخر اس میں کیا مجبوری تھی۔

اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ ان ہزار ابیات میں خامیاں ہیں تو اسے ہم فردوسی کی نو مشقی کی مثال سمجھیں گے۔ اس وقت فردوسی کے کلام میں بہت ممکن ہے کہ اس قدر پختگی نہ ہو جیسی آخری حصص و اجزا میں ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمیں اوائل اجزائے شاہنامہ اور ان ہزار ابیات میں بحیثیت کلام زیادہ قربت نظر آتی ہے۔ بخلاف اس کے آخری حصص میں کلام کی پختگی زیادہ نمایاں ہے۔ کہنے والا تو کہہ سکتا ہے کہ یا تو ابتدائی اجزا یا آخری دونوں میں کوئی ایک صرف فردوسی کے نظم کیے ہوئے ہیں۔ مگر بھلا یہ کون سی سمجھ کی بات ہوگی۔ عموماً یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ عمر کے مختلف دور کے کلام اور تحریر میں یکسانی نہیں ہوتی۔

فردوسی کی بالعموم یہ عادت معلوم ہوتی ہے کہ "دانش و خرد" کا ذکر وہ مختلف صورتوں میں اور چند معروف طریقوں کے ساتھ نفس پیرایہ میں ایسے مقام پر لاتا ہے جو کسی خاص سلسلہ میں اہمیت رکھتا ہو۔ اسی طرح "درخت و شاخ" یا "سرو" کی تشبیہ کا بکثرت استعمال انسانی زندگی یا کسی اہم واقعہ کے سلسلہ میں کیا کرتا ہے۔ شاہنامہ کے آغاز ہی میں "گفتار اندر ستایش خرد" کا ایک مستقل باب نظر آتا ہے اور اس "گفتار" کا خاتمہ جس شعر پر ہوتا ہے وہ یہ ہے ؎ چو دیدار یابی بشاخ سخن ٭ بدانی کہ دانش نیاید بہ بن ـــ اسی طرح "آفرینش مردم" کے سلسلہ میں یوں گہر افشانی ہوتی ہے۔

چو زیں بگذری مردم آمد پدید ٭ شد ایں بندہا را سراسر کلید
سرش راست بر شد چو سرو بلند ٭ بگفتار خوب و خرد کاربند

پھر "گفتار اندر فراہم آوردن شاہنامہ"، میں حسب ذیل اشعار ملتے ہیں۔ ؎

سخن ہر چہ گویم ہمہ گفتہ اند، ٭ بر باغ دانش ہمہ رفتہ اند
اگر بر درخت برومند جائے ٭ نیابم کہ از بر شدن نیست رائے
کسے، کو شود زیر نخل بلند ٭ ہماں سایہ زو باز دارد گزند ٭

توانم مگر پایگہ ساختن ، بر شاخ آں سرو سایہ فگن
کزیں نامہ نامور شہریار ، بگیتی بمانم یکے یادگار

شاہزادہ منوچہر کی پیدائش پر بادشاہ فریدوں کی زبان سے فردوسی اس طرح خوشی کا اظہار کرتا ہے ۔ ؎

چنیں گفت کز پاک مام و پدر ، یکے شاخ شایستہ آمد ببر

پھر فریدوں کی موت کا یوں ذکر کرتا ہے ۔ ؎

چو آں کردہ شد روز برگشت وبخت ، بپژمردہ برگ کیانی درخت

رستم کے پیدا ہونے پر اس کے متعلق سیمرغ یہ پیشین گوئی کرتا ہے کہ : ؎

برای و خرد سام سنگی بود ، بخشم اندروں شیر جنگی بود

اور یہی سیمرغ پھر زال کو اس طرح مخاطب کرتا نظر آتا ہے ۔ ؎

ترا زیں سخن شاید باید بدن ، بہ بیشش جہاندار باید شدن
کہ او دادت ایں خسروانی درخت ، کہ ہر روز نو بشگفاندت بخت
بدیں کار دل ہیچ غمگیں مدار ، کہ شاخ برومندت آمد ببار

پادشاہی کیخسرو کی داستان کے آغاز میں یہ اشعار نظر آتے ہیں ۔ ؎

ببالید چو برکشد سرو شاخ ، سر سبز شاخش برآید بکاخ
ببالای او شاد باشد درخت ، چو بیندش بینادل و نیکبخت
دل روزگارش ہمی پرورد ، جہانے ز کردار او بر خورد
اگر پادشاہی بود در گہر ، بباید کہ نیکی کند تاجور
سزد گر گمانے برد بر سہ چیز ، کزیں سہ گذشتی چہارست نیز
ہنر با نژادست و با گوہرست ، سہ چیزست وہر سہ بہ بند اندرست

× × × × × × × × × × × × × × × × × ×

چو ایں ہر سہ یابی خرد بایدت ، شناسندہ نیک و بد بایدت
چو ایں چار با یکتن آید بہم ، بیاساید از آز و از رنج و غم

اس طرح کی تشبیہات سے سارے کا سارا شاہنامہ بھرا پڑا ہے ـــــ اب ذرا ہزار اشعار منسوب بہ دقیقی کے آغاز ہی میں " پیدا شدن زردوشت و پذیرفتن گشتاسپ دین او " کا تذکرہ جس طرح پر ہوتا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ یہاں بھی یہی تشبیہیں ، جا بجا نظر آئیں گی اور ان ہزار ابیات میں بھی " دانش و خرد " کا تقریباً اسی طرز میں ذکر ملے گا جس طرح کہ شاہنامہ کے کل بقیہ اشعار میں تذکرہ ہوتا ہے ۔ ؎

چو یکچند گاہے برآمد بریں ، درختے پدید آمد اندر زمیں
از ایوان گشتاسپ تا پیش کاخ ، درختے گشن بیخ و بسیار شاخ
ہمہ برگ او پند و بارش خرد ، کسے کو چناں بر خورد کے مرد
بدست اندرش مجمر عود یاں ، یکے پاک پیدا شد اندر زماں
خجستہ پئے و نام او زردہشت ، کہ آہرمن بدکنش را بکشت

× × × × × × × × × × × × × × × × × ×

نگہ تا چہ گوید براں کار کن ؛ خرد برگزیں ایں جہاں خوار کن
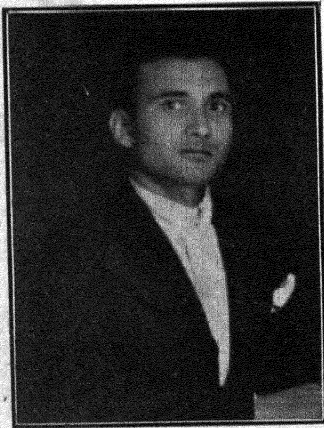
جناب اظہر الحق قادری
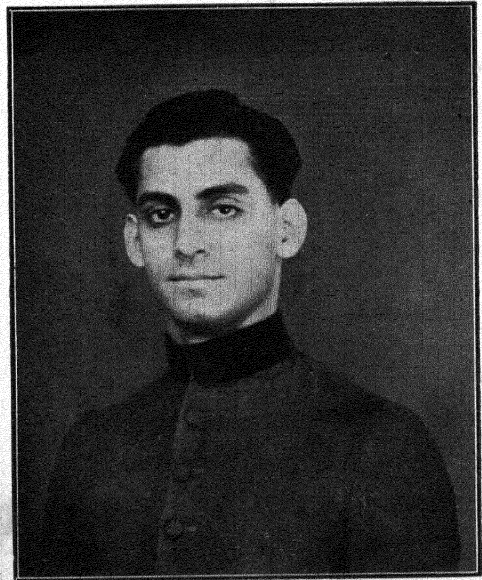
جناب سید علی حیدر

جناب شاہ ولی الرحمٰن ولیؔ
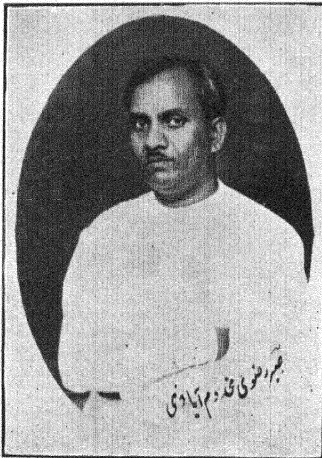
جناب حمید عظیم آبادی

جناب جی۔ آر قیس

نجم رضوی مخدوم آبادی

× × × × × × × × × × × × × × × × × ×
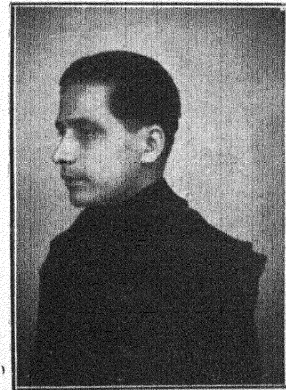
یکے سرو آزادہ را زد ہشت ‏ ‏ ‏ بہ پیش درِ آذر اندر بکشت
نشتنش بران زاد سرو سہی ‏ ‏ ‏ کہ پذرفت گشتاسپ دینِ بہی ،
گو اکرد مر سروِ آزاد را ؛ ‏ ‏ ‏ چنیں گشتر اند خرد داد را

اسی طرح ان ہزار ابیات کے اور بھی مقامات پر غور کیجیے۔ بادشاہ لہراسپ کی گوشہ نشینی اور عبادت گذاری کے متعلق یہ شعر نظر آتا ہے۔ ؎

بہ پوشید جامہ پرستش پلاس ؛ ‏ ‏ ‏ خرد را بر ینگونہ باید سپاس ؛

بُت پرست شاہ توران ارجاسپ اپنے مکتوب بنام بادشاہ گشتاسپ میں اُسے اس طرح دھمکی دیتا ہے۔ ؎

بسوزم نگارید کاخ ترا ؛ ‏ ‏ ‏ ز بُن بر کنم بیخ و شاخ ترا ؛

بادشاہ گشتاسپ اپنے درباریوں کے سامنے بت پرست ارجاسپ تورانی اور اپنے درمیان کے تعلقات پر جب اظہار خیال کرتا ہے تو یوں کہتا ہے۔ ؎

چہ ناخوش بود دوستی با کسے ‏ ‏ ‏ کہ مایہ ندارد ز دانش بسے

اسی طرح جاماسپ وزیر گشتاسپ کی تعریف میں یہ ابیات نظر آتے ہیں۔ ؎

چنان پاک تن بود و پاکیزہ جاں ‏ ‏ ‏ کہ بودے برو آشکار انہاں
ستارہ شناسی گرانمایہ بود ‏ ‏ ‏ ابا او بدانش گراں پایہ بود ؛

میدان جنگ میں شاہزادہ زریر برادر گشتاسپ کی موت واقع ہونے کے سلسلہ میں یوں ذکر ہوتا ہے۔ ؎

سرانجام گرد د بر و تیرہ بخت ‏ ‏ ‏ بریدہ شود آں گزیدہ درخت ؛

گرزم اور گشتاسپ کے درمیان جو گفتگو شاہزادہ اسفندیار کے متعلق ہوتی ہے۔ اُس میں یہ شعر ملتا ہے۔ ؎

گرزم بد آہوش گفت از خرد ‏ ‏ ‏ نباید جز آں چیز کاندر خورد

اس جگہ ایک اور بات قابل غور ہے۔ تیس پینتیس سال کے عرصۂ دراز میں پچاس ساٹھ ہزار اشعار کی ایک بڑی کتاب ترتیب دینے میں جب کہ رزم و بزم وغیرہ کے مناظر مختلف اور متعدد موقعوں پر بار بار پیش کرنے کی ضرورت لاحق ہوگی تو ایک شاعر کے لئے فطری طور پر اکثر پورا شعر کا شعر یا کم از کم ایک دو مصرعے جسے وہ پہلے کسی وقت چند سال قبل کسی دوسری تیسری داستان کے سلسلہ میں نظم کر چکا ہے۔ دوبارہ سہ بارہ نظم کر دینا لازمی ہو جائے گا۔ یعنی قبل کے کہے ہوئے اشعار یا مصرعوں کی تکرار ہونی ضروری بات ہے۔ شاہنامہ فردوسی میں اس طرح کی تکرار بکثرت دیکھنے میں آتی ہے۔ برعکس اس کے اگر کوئی شاعر محض تھوڑی مدت میں چند سو شعر یا ہزار دو ہزار ابیات نظم کرے گا کہ جس کا سرمایہ صرف چند صفحۂ قرطاس پر مشتمل ہو تو اس میں اس قسم کی تکرار ذرا غیر معمولی اور نامناسب بات ہوگی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ دقیقی سے منسوب کئے ہوئے اشعار میں بھی بہت سے شعر دوبارہ سہ بارہ نظم ہو گئے ہیں۔ بلکہ اکثر تو ایسے شعروں کی بھی تکرار ہو گئی ہے جنہیں بلاشبہ فردوسی نے شاہنامہ کے دوسرے مقامات پر نظم کیا ہے۔ اور مصرعوں کی تکرار تو بے انتہا ہے۔

پھر فردوسی کی بیان کردہ روایت کے مطابق جس میں دقیقی نے اُس سے خواب میں اپنے ہزار شعر کہنے کا ذکر کیا تھا کہ ؎

ز گشتاسپ و ارجاسپ بیتی ہزار ‏ ‏ ‏ بگفتم سرآمد مرا روزگار ؛ ؛ ؛

اگر ان کا شمار کیا جائے تو اس سے بھی مسئلہ زیر بحث پر کافی روشنی پڑے گی۔ دقیقی سے منسوب شدہ اشعار جنہیں فردوسی خود لکھا ہے کہ میں نے اول سے آخر تک نقل کر دیے ہیں پورے ہزار شعر نہیں نکلتے۔ نو سو ستاسی (۹۸۷) شعر تو گنتی کے ہیں اور ان میں بھی اکثر اشعار دو دو تین تین بار مختلف مقامات پر نظم ہو گئے ہیں جس کے سبب پورے ہزار ابیات کا پتہ تک نہیں ملتا۔

فردوسی کے متعلق چند اور بھی مستقل غلط فہمیاں ہو گئی ہیں اور ان پر اکثر و بیشتر حضرات طبع آزمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سمبر [illegible] کے زمانہ (کانپور) میں صوبہ بہار کے مشہور اہل قلم سید رضا قاسم صاحب مختار (حسین آباد) نے ایک مضمون فردوسی اور سلطان محمود کے تعلقات پر تحریر فرمایا تھا

کہ جس کا ایک تردیدی جواب مارچ سنہ ۳۹ء کے زمانہ میں مسٹر محمد یحییٰ تنہا ایم۔ اے کے قلم سے شائع ہوا تھا۔ دونوں مقالے میری نظر سے گذرے۔ تاریخ و ادب کے ایک افسوسناک اور مسلم الثبوت واقعہ سے انکار حقیقتہً حیرت خیز بات معلوم ہوتی ہے۔ سلطان محمود کے دربار میں فردوسی بڑی بڑی امیدیں لیکر آیا تھا۔ اور اگرچہ یہ امر متحقق نہیں کہ فردوسی سے محمود نے کسی قسم کا وعدہ بھی کیا تھا، تاہم اس بات کا تو کم از کم ضروری ہی اقرار کرنا پڑے گا کہ دربار غزنوی میں فردوسی کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں ہوا۔ شاہنامہ جیسی عظیم المرتبت کتاب کو سلطان محمود کے نام سے معنون کرنے کا صلہ فردوسی کو امید سے زیادہ ملنا چاہیئے تھا۔ خلاف توقع برتاؤ نے شاعر کا دل ضرور دکھایا۔ اور اُس نے چند ابیات ہجویہ ملیحہ کے یقیناً نظم کئے۔ ہاں ہجو یہ اشعار کا طومار بلاشبہ بعد کی چیز ہے، مگر فردوسی کے قلم سے ہجو محمود کے متعلق سرے سے انکار ایک تاریخی حقیقت سے دانستہ چشم پوشی ہوگی۔ محمود غزنوی کی علم دوستی اور اُس کے دربار میں شعرائے باکمال اور فضلائے عصر کی سرپرستی مسلم۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ فردوسی کی بدقسمتی سے چند تنگ حوصلہ اور حاسد لوگوں کو اس بات کا موقع مل گیا کہ سیاسی اسباب اور مذہبی رنگ نمایاں کرکے سلطان کی نظر میں فردوسی کی شخصیت کو گھٹا دیں۔ اور سلطان کے نام شاہنامہ معنون کرنے کا صلہ مصنف شاہنامہ کو اس درجہ کم دلوانے کا بندوبست کریں کہ جس سے شاعر برداشتہ خاطر ہوکر دربار سلطانی سے کنارہ کش ہوجائے اور چند ہجویہ اشعار کہہ کے اپنے جلے دل کے پھپھولے توڑے۔

بغداد کے مشہور شاعر صنحاوی (مرحوم) نے جشن ہزار سالہ فردوسی کے موقع پر طہران میں شاعر ملی ایران کو مخاطب کرتے ہوئے ایک فارسی نظم پڑھی تھی جس کا ایک شعر ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے یہاں پر نقل کرنا نہایت برمحل ہوگا۔

ندانست قدرے تو گر غزنوی
بگویش سبق گیر از پہلوی

ہجو محمود سے قطعی انکار کے سلسلہ میں ہمارے ملک کے محققوں نے فردوسی کے مذہب کے متعلق بھی طرح طرح کی خیال آرائیاں کی ہیں، اور یہ بھی صرف اس وجہ سے کہ ہجو کے الحاقی اشعار میں جو بعد وفات فردوسی وجود میں آئے، شاعر کے دین و مسلک پر کافی سے زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور سلطان محمود کا متعصب ہونا دکھلایا گیا ہے۔ طرفداران محمود نے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہ فردوسی اور محمود کے مذہب کی بنا پر کوئی اختلاف نہ تھا، سرے سے فردوسی کو ایک عام حقیقت کے خلاف کچھ اور ثابت کرنا چاہا ہے، اور دلیل میں آغاز شاہنامہ میں سے چند شعر پیش کئے ہیں میرے اصل مضمون کو اس بحث سے تعلق نہیں۔ ہاں مختصر طور پر اس قدر کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کے دو ایک شعر کی بنا پر جو یقیناً اُس کے دربار محمود میں آنے کے بعد نظم ہوکر شاہنامہ میں شامل کئے گئے، اُس کے مذہب کے متعلق خلاف واقعہ کچھ کہنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ دقیقی کے منظومہ قطعہ متذکرہ بالا کو اُس کے گبر اور زرتشتی ہونے کی دلیل میں پیش کیا جاتا ہے، یا جس طرح کہ حافظ شیراز کی غزلوں میں "پیر مغان" کی تعریف و توصیف دیکھ کر بمبئی کے ایک پارسی نژاد مشہور اہل قلم نے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ حافظ کو مجوسی ثابت کرنے میں صفحے کے صفحے سیاہ کئے تھے۔

کیا موجودہ پیرانِ ہند کا "تصوّف" اسلامی ہے؟

پیری و مریدی پر ایک مذہبی تبصرہ

از جناب پروفیسر سید مظفر الدین صاحب ندوی ایم۔ اے

جب ہم اگلے صوفیائے کرام کے سوانح عمری اور ان کی تعلیمات و ہدایات پر نظر ڈالتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ان کی زندگی کا ہر شعبہ اسلامی رنگ میں رنگا ہوا تھا، ان کو خدا و رسول کی خوشنودی کا بھی خیال تھا اور قوم کی اصلاح کی بھی کد تھی، وہ جسمانی محنت بھی کرتے تھے اور روحانی ریاضت بھی، وہ اسلام کے ظاہری اور باطنی ہر دو صیغوں کو مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اسلام سے ایک طرف ہمارے ظاہری حالات، اخلاق و عادات اور اوضاع و اطوار سدھرتے ہیں۔ تو دوسری طرف اس سے ہمارے دلوں میں صفائی، روحوں میں پاکیزگی اور عقلوں میں جلا آتی ہے۔ ان کی تعلیم تھی کہ ہر مسلمان پہلے اپنے آپ کو سنوارے اور ظاہری احکام کے مطابق سچا مسلمان ہو جائے، اس کے بعد اگر اسے ذوق ہو تو باطنی احکام کی طرف رجوع کرے، یعنی جب تک ایک مسلمان اسلام کے ظاہری شعبے میں (جس کو صوفیوں کی اصطلاح میں شریعت کہا جاتا ہے) کمال حاصل نہ کرے وہ باطنی شعبے میں (جس کا نام انہوں نے طریقت رکھا ہے) ہاتھ نہ لگائے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم کسی مذہب یا مسلک کی ظاہری باتوں کو پہلے اچھی طرح نہ سمجھ لیں اور ان پر عمل نہ کر لیں تو پھر اس کے اندرونی رموز و اسرار تک کیونکر پہونچ سکتے ہیں

یہ تو اگلے صوفیوں کا عقیدہ اور عمل تھا، مگر جب ہم موجودہ پیرانِ ہند کے اقوال و افعال پر نظر ڈالتے ہیں تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ آیا یہ دونوں ایک ہی جڑ کی دو شاخیں ہیں یا دونوں مختلف الاصل ہیں۔ اور یہ فیصلہ کرنا نہایت مشکل ہے کہ آیا ہندوستان کی موجودہ پیری و مریدی اوائل اسلام کے سلسلہ تصوف کی کوئی کڑی ہے یا کوئی علحدہ چیز ہے۔ پیر صاحبان کے زبانی دعووں اور مریدوں کے اشتہاروں سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پیری و مریدی "تصوف اسلام" کا دوسرا نام ہے۔ مگر جب ۹۵ فی صدی پیرانِ ہند کے افعال و اعمال اور اخلاق و عادات پر غور کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں کوئی وصف مشترک نہیں، اور ان کو صوفی کہنا کیسا معمولی درجہ کا مسلمان سمجھنا بھی قلب ماہیت سے کم نہیں۔ آپ خانقاہوں کی سیر کریں، شاہوں کی گدیوں میں تشریف لیجائیں یا مشہور مزاروں کی زیارت کریں (خاص کر عرس کے موقعوں پر) تو یہ تلخ حقیقت نمایاں اور واضح طور پر آپ کی آنکھوں کے سامنے آجائیگی۔

میں اس مضمون میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ملک کی موجودہ پیری و مریدی کو تصوفِ اسلام سے کوئی واسطہ نہیں اور یہ کہ جس چیز کو ہم اسلام کا جوہر سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت اسلام کے لئے ننگ و عار ہے۔ مضمون شروع کرنے کے قبل یہ لکھ دینا ضروری ہے کہ آجکل اہل اسلم ان معاملات پر اس ڈر سے قلم نہیں اٹھاتے کہ جہلا اور عوام (اپنے پیروں کی تعلیم کے مطابق) ان کو فوراً وہابی، ملحد، دہریہ وغیرہ کے لقب سے پکارنے لگتے ہیں، گویا حق بات کہنا، یا گمراہوں کو راستہ بتانا، یا قوم کی اصلاح کرنا شدید جرم ہے، لوگ پیروں اور مریدوں کے غیر اسلامی بلکہ مشرکانہ اعتقادات و حرکات کو دیکھتے ہیں اور برداشت کرتے ہیں، بہر حال غلط فہمی دور کرنے کے لئے میں ابتدا ہی میں یہ کہہ دیتا ہوں کہ میں حنفی ہوں اور اصلی تصوف کا قائل ہوں بلکہ مداح، اور میرے متعدد مضامین اس کی حمایت میں شایع ہو چکے ہیں۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں مذہبی حیثیت سے اور خالصتہً للّٰہ لکھ رہا ہوں، اگر کوئی صاحب قرآن و حدیث سے، یا امام ابو حنیفہؒ کے قول سے، یا کسی اور امام یا فقیہ کے بیان سے یہ ثابت کر دیں کہ ہندوستان کی خانقاہوں میں تصوّف کے نام سے جو مشرکانہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے، اور عرس کی محفلوں میں مذہب کے قالب میں ناچ و گانے کا جو تماشا دیکھا جاتا ہے اور مقبروں میں زیارت اور فاتحہ کے نام سے قبر پرستی کا جو منظر پیش کیا جاتا ہے وہ شرعاً جائز اور درست ہے تو میں نہایت خوشی کے ساتھ اپنی غلطی تسلیم کروں گا اور اپنی رائے بدل دونگا۔

اب میں اصل مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں، یوں تو بہت سے غیر اسلامی امور موجودہ سلسلۂ پیری و مریدی میں داخل ہو گئے ہیں مگر میں صرف چند اہم باتوں کو مختلف عنوانوں کے ماتحت درج کرتا ہوں۔:-

نمبر ۱ - استعانت

تعلیماتِ اسلامی کا اصل اصول یہ ہے کہ ہم خدا ہی کو قبلۂ حاجات سمجھیں، اسی سے اپنا مدعا طلب کریں، اور اسی کے سامنے دستِ سوال پھیلائیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" (یعنی ہم صرف تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مانگتے ہیں) لیکن آجکل اکثر مریدانِ ہند اپنی تمنائیں اور آرزوئیں پیروں کے سامنے پیش کرتے ہیں، اور ان ہی کے سامنے دستِ حاجت دراز کرتے ہیں۔ ہزاروں اور لاکھوں مسلمان ہر سال عرس کی محفلوں میں اس غرض سے جاتے ہیں کہ بیماروں کو وہاں شفا مل جائے، بے روزگاروں کو روزی نصیب ہو، بے اولاد لوگوں کو اولاد میسر ہو۔ حاجتمندوں کی حاجتیں پوری ہوں، خدا ہی جانتا ہے کہ ان "پیرزدہ" گمراہوں کی تشنگیٔ ذوق وہاں بجھتی ہے یا نہیں، مگر میرا سوال یہ ہے کہ خدائے حاضر و ناظر کو چھوڑ کر کسی انسان سے مرادیں طلب کرنی شرک ہے یا نہیں؟ کیا انسان کو شافی سمجھنا اور قاضی الحاجات قرار دینا شرعاً جائز ہے یا عقلاً درست ہے؟

اگلے صوفیائے کرام کے ہاتھ کبھی بھی ان مشرکانہ رسوم اور لغو حرکات سے آلودہ نہ ہوئے۔ پھر موجودہ پیرانِ ہند نے یہ عادتیں کہاں سے سیکھیں؟ اگر وہ ان عادات سے باز آجائیں تو دشمنانِ اسلام کا ایک بہت بڑا اعتراض اٹھ جائے گا۔

نمبر ۲ - خدا سے بلا واسطہ مانگنا

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان اپنے خالق کو اپنے سے بہت قریب سمجھے اور ہر موقع پر اپنی ضروریات بے تکلف اور بلا واسطہ اس کے سامنے پیش کرے، جیسا کہ کلام مجید میں وارد ہے "وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ، اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ، فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ"

(ترجمہ:۔ اور جب تجھ سے (اے پیغمبرؐ) میرے بندے میرے بارہ میں پوچھیں (تو کہدے کہ) میں قریب ہوں، میں دعا مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا مانگتا ہے، پس چاہیئے کہ لوگ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت پائیں)

دوسری جگہ ارشاد ہے "فَاذْكُرُوْنِیْ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ" (ترجمہ: پس تم مجھے یاد رکھو، میں تم کو یاد رکھونگا، اور میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو)

اگلے صوفیائے کرام بلکہ عموماً تمام مسلمان خدائے پاک کے ان ہدایات پر دل و جان سے عمل پیرا رہتے تھے اور ہر موقع پر خداوند کریم کو حاضر و ناظر اور سب کا رکھنے والا سمجھتے تھے، لیکن اب تو دنیائے اسلام کی کایا پلٹ ہو گئی ہے اور خاصکر حاملانِ لوائے طریقت نے تو اسلام کی تعلیم مسخ کر دی ہے۔ ان کا فرمان یہ ہے کہ کوئی شخص بغیر پیر کی وساطت کے خدا تک پہونچ نہیں سکتا، اور ہر مرید پہلے اپنی ضروریات اپنے مرشد کے سامنے پیش کرے، اور مرشد صاحب اگر مناسب سمجھیں تو وہ ضروریات مالکِ حقیقی تک پہونچا دیں۔ مثال میں یہ لوگ ملک اور حکومت کا دستور پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح ایک معمولی شخص بغیر کلکٹر کے ذریعہ سے گورنر کے ہاں اور گورنر کے وسیلے کے بغیر وسیرائے یا بادشاہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا، اسی طرح کوئی مسلمان بغیر پیر و مرشد کی وساطت کے اپنے خالق کے ہاں نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس کے سامنے اپنا مدعا پیش کر سکتا ہے۔

ان بندگانِ خدا سے کوئی پوچھے کہ تصوف کا تعلق معاملاتِ قلب سے ہے یا پیر پرستی سے، اور روحانیت کی بنیاد قرآنی ہدایات پر قائم ہے یا ملک کے رواج پر؟ یہ کون ان لوگوں کو سمجھائے کہ خدا حاضر و ناظر ہے "عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ" ہے اور مختارِ مطلق ہے (فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ) لیکن ملک کا بادشاہ معمولی انسان کی طرح مجبور ہے، وہ بغیر اپنے حکام کے مشورہ یا سفارش کے کچھ کر نہیں سکتا، اور نہ اسے ملک کے طول و عرض کی خبر ہو سکتی ہے جب تک اس کے ملازمین اسے مطلع نہ کریں، پس پیر صاحبان کی یہ مثال نہایت مہمل، اور عقل و نقل کے خلاف ہے۔ بادشاہِ ملک ملازمین کا محتاج ہے اور پروردگارِ عالم بے نیاز"

معلوم ہوتا ہے کہ پیرانِ ہند نے یہ مراسم پادریوں اور پنڈتوں کے اقوال و افعال سے حاصل کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ تصوف کا قالب تو اسلامی ہے، مگر اس کی روح میں عیسائیوں کی رہبانیت اور ہندوؤں کا فلسفہ حلول کئے ہوئے ہے۔ یہ ایک نیا مسلک معلوم ہوتا ہے۔ جس میں اسلامی عنصر بہت کم ہے۔ اور بیرونی عناصر بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ راہبوں نے اسلام کے پہلے خدائی اختیارات کا دعویٰ کیا تھا، اور عام عیسائیوں نے اسے تسلیم کر لیا تھا۔ یہ شرک ہے اور قرآن مجید میں ایسے راہبوں کو "ارباب" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ بہت سے مرشدانِ ہند ان راہبوں کی طرح "ارباب" بن گئے ہیں، نعوذ باللہ۔

نمبر ۳ - اسلام کی جامعیت

مسیحیت اور یہودیت کی طرح اسلام کسی محدود مذہب کا نام نہیں ہے، جن لوگوں نے اسلام کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے، ان سے یہ مخفی نہیں کہ اسلام مذہب بھی ہے سیاست بھی۔ دین بھی ہے دنیا بھی، شریعت بھی ہے حکومت بھی، ظاہر بھی ہے باطن بھی، جسم بھی ہے روح بھی، یہ ایک جامع مانع ادارہ ہے جس میں حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ اگلے مردانِ خدا نے اپنے طرزِ زندگی سے اسلام کی اس جامعیت کو برقرار رکھا، وہ دنیاوی کام بھی کرتے تھے اور خدا کو یاد بھی، وہ تصفیۂ قلب میں بھی مشغول رہتے تھے اور قوم کی اصلاح میں بھی۔ وہ تصوف کی مشق کے ساتھ غیر مسلموں میں اشاعتِ مذہب بھی کرتے تھے۔ لیکن موجودہ مرشدانِ ہند کی زندگی کا انحصار اس اصول پر ہے کہ اسلام کا باطن (طریقت) ان کے حصے میں ہے اور ظاہر (شریعت) دنیاداروں کے حصے میں، اس اصول کے ماتحت ملک کے اکثر بلکہ تمام تر پیر و مرشد اپنی زندگی خانقاہوں اور حجروں میں گذارتے ہیں۔ دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں رکھتے۔ قوم پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹے تو ان کو حس تک نہیں ہوتی، ملک تہ و بالا ہو جائے تو ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ سیلاب ہو یا طوفان، آتش زدگی ہو یا زلزلہ، نہ ان کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی ہے اور نہ ان کی نبض کی رفتار۔ حال میں ہندوستان میں کتنے مذہبی انقلابات سیاسی حوادث اور معاشرتی تغیرات واقع ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ مگر ان کی دنیائے خلوت میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ قطب جامع مجدد مرشدوں کی زندگی میں ہر سال ایک شاندار تقریب منعقد ہوتی ہے جس کا نام عرس رکھا گیا ہے، اس موقع پر جشن کے تمام لوازم مہیا رہتے ہیں اور دھوم دھام سے محفلِ رقص و سرود رچائی جاتی ہے۔ دور و دراز سے مریدانِ سادہ لوح آتے ہیں۔ اور اپنی گاڑھی کمائی کا سرمایہ پیر و مرشد پر نچھاور کر کے چلے جاتے ہیں، عرس کے موقع پر جو مشرکانہ رسوم انجام پاتے ہیں ان سے قطع نظر حجرہ نشینی اور خلوت نشینی بذاتِ خود روحِ اسلام کے منافی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی زندگی (یعنی ترکِ دنیا اور کنارہ کشی) کو ممنوع قرار دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے "لا رهبانية في الإسلام" قرآن مجید میں سورۂ حدید میں صاف طور سے مذکور ہے کہ عیسائیوں نے رہبانیت ایجاد کی۔ اگرچہ خدا نے ان پر اسے فرض نہیں کیا تھا، مگر وہ اسے اچھی طرح نباہ نہ سکے، بعینہٖ یہی حال مرشدانِ ہند کا ہے کہ تعلیمِ اسلام کے خلاف حجرہ نشینی اور ترکِ دنیا کی رسم نکالی، گر اسے نباہنا تو دور کی بات ہے، وہ دنیاداروں سے بھی بدتر ہو گئے، مذہب کا ظاہر بھی گیا باطن بھی، خدا رحم کرے۔

نمبر ۴ - تصوف کی پہلی شرط

ہر شخص جانتا ہے کہ تصوف کی راہ میں قدم رکھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ سالک اپنے مذہب کو جانتا ہو اور اس پر کما حقہٗ عمل کرتا ہو۔ یعنی ایک طرف وہ شریعت کا عالم ہو، قرآن و حدیث سے واقف ہو، خدا اور رسول کے اوامر و نواہی سے باخبر ہو، اور اچھے بُرے کی تمیز رکھتا ہو اور دوسری طرف اس کے دل میں خوفِ خدا ہو، وہ مذہب کے احکام پر پوری طرح عامل ہو، اس کے اخلاق و عادات اچھے ہوں اور اس کی زندگی تمام مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل اور دلیلِ راہ ہو۔

اگلے صوفیوں کے سوانحِ عمری پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرط (جامعیتِ علم و عمل) تمام صوفیوں میں بدرجۂ اتم موجود تھی، اس زمانہ میں مشکل سے ایسا صوفی ملے گا جو جاہل ہو یا بے عمل ہو، علم و عمل کے بغیر صوفی ہونا تو بڑی بات ہے، کوئی اچھا مسلمان بھی نہیں ہو سکتا۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا اعلان کیا کہ شریعت پر عمل کئے بغیر کوئی طریقت کی راہ پر چل نہیں سکتا۔ ہندوستان کے مشہور صوفی شیخ شرف الدین یحییٰ منیری مخدوم بہار نے اپنے "مکتوبات" میں کئی جگہ لکھا ہے کہ جب تک انسان ظاہرِ اسلام (شریعت) میں کامل نہ ہو وہ باطنِ اسلام (طریقت) کا اہل نہیں ہو سکتا۔ یہ تعلیم تمام صوفیائے متقدمین کی کتابوں میں ملے گی اور اسی پر ان کا عمل تھا۔

لیکن موجودہ مرشدانِ ہند کا جائزہ لیجئے، عجب تماشا نظر آئے گا۔ تصوف کی ابتدائی شرط (علم و عمل) ۹۰ فیصدی میں مفقود ہے۔ اکثر سجادہ نشین جاہل اور نااہل ہیں، نہ شریعت سے واقف ہیں اور نہ طریقت سے۔ وہ صرف اس وجہ سے صوفی بن گئے ہیں کہ ان کے باپ دادا صوفی تھے، یہ عجیب مسلک ہے جس میں مال و دولت کے ساتھ ساتھ تصوف اور تقدس بھی ترکے میں ملتا ہے، لائق اسلاف کی گدیاں نالائق اخلاف کو مل گئیں، نتیجہ ظاہر ہے، عمل کا یہ حال ہے کہ بعض سجادہ نشین نماز تک نہیں پڑھتے اور جو پڑھتے بھی ہیں تو حجروں میں (یا بقول مریدان کعبۂ معظمہ میں) مسجدوں میں جماعت کے ساتھ شاید سیکڑے میں ایک نماز پڑھتے ہوں، زکوٰۃ دینے کی عادت نہیں کیونکہ ان کی زندگی کا دارومدار زکوٰۃ اور صدقہ لینے پر ہے، نہ کہ دینے پر، باوجود استطاعت کے اکثر حج نہیں کرتے، الغرض اوامر کی تعمیل بہت کم کرتے ہیں اور نواہی

احتراز کرنے کی بہت زیادہ کد نہیں رکھتے۔

ایسی حالت میں تصوف کا ادعا مذاق نہیں ہے تو کیا؟ اس سے بڑھکر شریعت کی توہین اور کیا ہوسکتی ہے؟ اسلام کے مخالف ہر زمانہ میں رہے اور رہیں گے، مگر سب سے بڑا دشمن اسلام وہ ہے جو اسلام کے نام سے اسلام کی عزت خاک میں ملانا چاہتا ہے، خدا اور رسول کی ناقدری کرنیوالے ہر وقت موجود تھے اور رہیں گے، لیکن اس سے بڑھکر ناقدری اور بے حرمتی کیا ہوگی کہ خدا اور رسول کے نام سے خدا و رسول کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

خداوند کریم تصوف اور تقدس کو موروثی چیز نہیں سمجھتا، اس کا فرمان عالی یہ ہے "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ" (یعنی بیشک تم میں سب سے زیادہ عزت دار خدا کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے) خوفِ خدا علماء (یعنی علماء باعمل) ہی کو ہوتا ہے، جاہلوں کو نہیں ہوتا، جیسا کہ کلام مجید میں ہے "اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا" (یعنی خدا سے اُس کے بندوں میں علماء ہی ڈرتے ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم کی معمولی عبادت کو جاہل کی شب بیداری پر فوقیت دی ہے، آپ نے علم و عمل دونوں کو مسلمانوں کیلئے ضروری قرار دیا ہے، آپ کا ارشاد ہے "العلم بلا عمل کشجر بلا ثمر" (یعنی علم بغیر عمل کے ایک ایسا درخت ہے جس میں پھل نہیں) آپ نے علم بے عمل کو وبال قرار دیا ہے۔ پس اکثر مرشدانِ ہند دراصل صوفی نہیں ہیں بلکہ متصوف ہیں، وہ تعلیم اسلام کی رو سے ادنیٰ درجہ کے مسلمان مشکل سے ہونگے راہِ طریقت کیا خاک دکھائیں گے؟

نمبر ۵۔ زیارتِ قبر زیارتِ قبر یا فاتحہ خوانی کا مقصد اسلام کی تعلیم کے مطابق یہ ہے کہ جو مسلمان بھائی بھی دنیا سے گذر گئے ہیں ان کا ذکر خیر کیا جائے، ان پر رحمتِ خدا نازل ہونیکی دعا کیجائے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے آنیوالے وقت (موت) کو بھی یاد کیا جائے، مگر آجکل مقصد بدل گیا ہے، آپ مقبروں کی سیر کریں خاصکر اولیاء اللہ کے مزاروں پر تشریف لیجائیں تو عجب نظر آنکھوں کے سامنے آئیگا۔ قبر پرستی یا بت پرستی کا پورا سماں آپکے سامنے کھنچ جائیگا۔ جس طرح مندر والا اپنے بتوں کی زینت و آرائش میں مشغول رہتا ہے، پھول چڑھاتا ہے، مٹھائیاں نثار کرتا ہے، اسی طرح مجاور قبروں کی سجاوٹ اور آراستگی میں اہتمام کرتا ہے، پھول بھی چڑھاتا ہے اور مٹھائیاں بھی تقسیم کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ رسوم (جو آجکل پیری مریدی کا جزو لاینفک ہو گئی ہیں) اسلامی ہیں؟ کیا ابتدائے اسلام میں صوفیوں یا عام مسلمانوں کے ہاتھ ان بدعات ولغویات سے کبھی بھی آلودہ ہوئے تھے؟ اور تماشا یہ ہے کہ جس طرح ایک پجاری بت کے سامنے عقیدت مندانہ کبھی کھڑا ہوتا ہے، کبھی بیٹھتا ہے، کبھی سجدہ کرتا ہے، بت کو ہاتھ سے چھوتا ہے، آنکھوں سے لگاتا ہے اور منہ سے چومتا ہے۔ اسی طرح ایک زائر قبر کے سامنے پیش آتا ہے۔ زیارت کا مقصد ملاحظہ فرمایئے:۔ کوئی مزار پر بچہ مانگنے کے لئے جاتا ہے، کوئی روزی طلب کرنیکے لئے، کوئی مرض کی شفا وہاں تلاش کرتا ہے۔ کوئی مقدمہ کی جیت وہاں چاہتا ہے، الغرض مختلف لوگ مختلف مرادیں مانگنے جاتے ہیں اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ ان بزرگانِ دین نے جس ہستی سے برابر مانگا (یعنی خدائے پاک سے) اسی سے تم کیوں نہیں مانگتے ہو تو وہ یہی جواب دینگے کہ ہم دنیا دار گنہگار خدا کے ہاں براہ راست نہیں جاسکتے اسلیئے ان بزرگوں کے ذریعہ سے مرادیں طلب کرتے ہیں، اگر آپ ان سے کہیں کہ یہ بزرگانِ دین اب زندہ نہیں ہیں بلکہ خدائے پاک کے ارشاد "اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ" (یعنی تو مرنے والا ہے) اور وہ لوگ مرنے والے ہیں) کے مطابق وہ مرگئے ہیں تو وہ کبھی یقین نہیں کرینگے اور یہی کہے جائیں گے یہ لوگ غیر فانی ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ تعجب ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کو فانی قرار دیتا ہے اور مرید سب اپنے پیروں کو غیر فانی، نعوذ باللہ، کیا پیروں کا درجہ پیغمبروں سے بلند ہے؟ یہاں ایک واقعہ یاد آیا مولوی غلام محمد صاحب شملوی مرحوم سفیر ندوۃ العلماء ایک موقع پر بڑودہ میں نواب صدر الدین صاحب مرحوم کے مہمان تھے، نواب صاحب کے مذہبی گفتگو کے دوران میں چند معزز میمن تاجروں نے سفیر ندوہ کے سامنے یہ سوال کیا کہ رسول اللہ بڑے ہیں یا پیر صاحب؟ تاجروں کا متفقہ جواب یہ تھا "پیر صاحب بڑے ہیں کیونکہ رسول اللہ کا ختم سال میں ایک بار ہوتا ہے اور بڑے پیر صاحب کا ہر مہینے (گیارہویں)"۔ خدا مسلمانوں کی اصلاح کرے،

اب قارئین کرام فرمائیں کہ کیا اس قسم کی روحانی تعلیم خدا و رسول کے احکام کے مطابق ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ہمارے آقائے نامدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پختہ بنانے سے منع فرمایا، آپ کو یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ بعد کو آنے والے مسلمان اپنے بزرگوں کو ضرورت سے زیادہ درجہ دیکر یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح ایک رب العالمین کو چھوڑ دینگے اور بہت سے "ارباب" کے قائل ہوجائیں گے۔ اور رفتہ رفتہ قبر پرستی کی شکل میں بت پرستی پھر نمودار ہوجائے گی۔

نمبر ۶۔ تعلیم و تعلم اسلام نے تعلیم و تعلم تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ تمام مسجدیں اور عبادت خانے کم و بیش تعلیم گاہیں ہیں، جہاں مسلمان لڑکے اور لڑکیاں بے دھڑک علم حاصل کرنے کے لئے جاتی ہیں۔ پہلے بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے مکانات بھی درسگاہوں کا کام دیتے تھے۔ ہر عالم و صوفی اپنے وقت کا کافی حصہ اشاعتِ علم اور ازالۂ جاہلیت میں خرچ کرتا تھا، وہ تعلیم و تعلم کو اپنی زندگی کا ایک فریضہ سمجھتا تھا۔ اور اس کیلئے جاں و دل سے وقف کرتا تھا۔ علمی مذاکرے اور تعلیمی مباحث کسی طرح عبادت سے کم نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ ایک دن مسجد تشریف لے گئے

ایک جماعت کو عبادت و ریاضت میں مشغول، اور ایک جماعت کو علمی تذکروں میں مصروف پایا، آپ نے فرمایا کہ دونوں جماعتیں کارِ خیر میں لگی ہوئی ہیں، مگر میں علمی محفل کو ترجیح دیتا ہوں، چنانچہ آپ دوسری جماعت کے ساتھ شریک ہو گئے۔ پس استطاعت رکھتے ہوئے تعلیم و تعلم سے منہ موڑنا یا اشاعت علم کی مخالفت کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ کیونکہ تمام امراض کی جڑ جہالت ہے اور تمام محاسن کا سرچشمہ تعلیم۔

آجکل پیر و مرشد صاحبان تعلیم پھیلانے میں بہت سست ہیں، اور باوجود اوقاف موروثی کے مسلمان بچوں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت میں بہت کم خرچ کرتے ہیں۔ بجز معدودے چند اکثر پیروں کا خیال ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم عام ہونے سے ان کا بازار سرد ہو جائے گا۔ اور ان کی آمدنی گھٹ جائے گی لوگ جب خدا اور رسول کو پہچاننے لگیں گے اور قرآن و حدیث سے واقف ہو جائیں گے تو پیروں کے دامِ بلا میں گرفتار کم ہونگے۔ اگر ہر شہر یا قصبہ کا پیر اوقاف کی آمدنی سے مخلصانہ طور پر ایک تعلیم گاہ کھولدے تو میری رائے میں ایک مسلمان بھی جاہل نہیں رہیگا، اور مسلمانوں کا مستقبل شاندار ہو جائیگا۔ آخر پیر صاحبان کو خیال کرنا چاہیئے کہ جہالت بہت بُری بلا ہے۔ ع کہ بے علم نتواں خدا را شناخت ،

نمبر ۷۔ تبلیغ اسلام

اسلام نے تبلیغ اسلام کو مسلمانوں کے لئے فرضِ کفایہ قرار دیا ہے، خداوند کریم کا فرمان ہے "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (ترجمہ:۔ اور چاہیئے کہ تم لوگوں میں ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم کرے، اور برائی سے روکے) اوائل اسلام میں مسلمانوں نے عموماً اور صوفیائے کرام نے خصوصاً اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تبلیغ حق اور اشاعتِ مذہب میں گذارا، ہندوستان میں آج اسلام کی جو روشنی نظر آ رہی ہے وہ لشکر جرار یا بادشاہ کرار کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اللہ والوں کی مساعی جمیلہ کا صدقہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ بنگال جو عموماً مسلمان بادشاہوں کے صدر مقام (دہلی و آگرہ) سے آزاد رہا۔ وہاں مسلمانوں کی تعداد ۵۵ فی صدی سے زیادہ ہے، اور جہاں مسلمان حکمرانوں کا مستقر رہا وہاں مسلم آبادی ۱۵ء۲۰ فی صدی سے زیادہ نہ ہوئی۔ عام لوگ خواجہ معین الدین چشتی رح کے کرامات بیان کرنے میں رطب اللسان رہتے ہیں مگر ان کا سب سے بڑا احسان اور ان کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت بہت کم لوگ بیان کرتے ہیں، یعنی خواجہ صاحب رح کے ہاتھ ایک زبردست گروہ باطل پرستوں کا حق کی طرف مائل ہوا اور بہت بڑی تعداد میں گمراہ لوگ مسلمان ہوئے اور خدا کی روشنی سے منوّر ہوئے۔

اب موجودہ پیرانِ ہند کا حال بھی ملاحظہ فرمائیے، اشاعتِ اسلام کا تصوّر بھی شاید ان کے دماغ میں نہ آتا ہوگا، غیر مسلموں کا مسلمان بنانا ایک طرف، وہ مسلمانوں کو غیر مسلم بنانے میں اُستاد ہیں۔ جہاں کسی نے حق بات ان کے خلاف کہی، اس کی تکفیر کا اعلان کر دیا گیا۔ ان کی زندگی کا مطمح نظر یہ ہے کہ مسلمانوں کو (خصوصاً جہلا کو) کافی تعداد میں مرید کر لیا جائے اور اپنے سلسلۂ ارادت میں جکڑ دیا جائے۔ تاکہ ان کی رونق میں زیادتی ہو اور آمدنی میں اضافہ، وہ غیر مسلموں کے پاس اظہارِ حق اور اعلان کلمتہ اللہ کے لئے کبھی نہیں جائیں گے، وہ استطاعت کے باوجود اشاعتِ اسلام کو اپنے لئے بیکار اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہ کہہ کر قارئین کو غلط فہمی میں ڈالا جا سکتا ہے کہ اگر آجکل کے پیر و مرشد ترکِ تصوّف کی وجہ سے صوفی نہیں رہے تو عام مسلمان بھی ترکِ اسلام کے باعث مسلمان نہ رہے، پس مذکورہ بالا اعتراضات کم و بیش عام مسلمانوں پر بھی وارد ہوتے ہیں، صرف پیرانِ ہند سے مخصوص نہیں۔ ایسا کہنا ایک حد تک صحیح ہے، مگر ان دونوں کے درمیان جو فرق عظیم ہے اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے، عام مسلمانوں کی حالت جداگانہ ہے، اعتقاد کی حیثیت سے ہر شخص جو "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہے مسلمان ہے اس کلمۂ طیبہ کے اقرار کے بعد کوئی طاقت اسے دائرہ اسلام سے خارج نہیں کر سکتی، ہاں اگر کسی کے اعمال اچھے ہیں تو وہ اچھا مسلمان ہے اور اگر کسی کے اعمال بُرے ہیں تو وہ بُرا مسلمان ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ جو پیر و مرشد دیندار اور متقی ہو وہ اچھا پیر و مرشد ہے، اور جو فاسق و فاجر ہے وہ خراب پیر و مرشد ہے؟ فاسق صوفی نہیں ہو سکتا، پیر و مرشد ہونا اور فاسق و فاجر ہونا یہ دونوں متضاد الفاظ ہیں، جو کسی طرح یکجا جمع نہیں ہو سکتے، ایک گنہگار مسلمان رہ سکتا ہے، مگر ایک فاسق شیخ طریقت یا رہبرِ منزل نہیں ہو سکتا، رہنما کے بغیر چلنا بہ نسبت اس کے زیادہ محفوظ ہے کہ خطرناک رہبر کے ماتحت چلا جائے۔ عام مسلمانوں کی حیثیت انفرادی ہے ان کا خیر و شر ان کے ساتھ ہے۔ اور ثواب و عذاب کا تعلق صرف ان کی ذات سے ہے مگر رہبرانِ شریعت یا مرشدانِ طریقت کی پوزیشن مختلف ہے، ان کے بننے سے قوم بنتی ہے اور ان کے بگڑنے سے قوم بگڑتی ہے، اگر وہی لوگ تعلیم اسلام کی مخالفت کرنے لگیں

یا عظمتِ اسلام کی بیخکنی کرنے لگیں یا اپنی زندگی کا نمونہ قوم کے سامنے مکروہ شکل میں پیش کرنے لگیں تو پھر کشتیِ اسلام کا خدا ہی حافظ،

ع چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

خاتمہ

میں خالصۃً للہ حاملانِ لوائے طریقت کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ وہ مندرجہ بالا باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کریں، اور تمام مشرکانہ رسوم اور جاہلانہ بدعات کو مٹانے کی کوشش کریں، میرا مدعا حاشا و کلا اُن کی عظمت گھٹانا نہیں ہے بلکہ اسلام کی عظمت قایم رکھنا ہے، میں تمام صوفیانِ باصفا کی بزرگی کا قائل ہوں مگر خدارا مجھے کوئی بتائے کہ انہوں نے یہ کہاں لکھا ہے کہ ہمارے مرنے کے بعد ہمارے جسم کو قبلۂ حاجات اور مزار کو حرم پاک سمجھا جائے، کیا مسلمانوں کو یہ نہیں معلوم کہ ان کا خاکی بدن خاک سے مل گیا ہے اور ان کی روح عالم ارواح میں پہونچ گئی ہے، پھر مزار کی مشرکانہ تعظیم کیوں کیجاتی ہے، بعض لوگوں کو یہ دھوکے میں رکھا گیا ہے کہ پیر و مرشد مرے نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ زندہ ہیں، اور دلیل میں یہ پیش کرتے ہیں کہ خدا نے پاک نے قرآن مجید میں بعض برگزیدہ ہستیوں مثلاً شہدا وغیرہ کو زندہ کہا ہے، حالانکہ ان آیتوں کا لفظی ترجمہ مقصود نہیں ہے بلکہ اصلی مفہوم مطلوب ہے۔ یعنی اُن کی شہرت زندہ ہے، اُن کی عظمت غیر فانی ہے اور اُن کے کارنامے ہمیشہ کی یادگار ہیں، نہ یہ کہ ان کا جسم زندہ ہے، ان کا گوشت پوست غیر فانی ہے اور ان کی ظاہری حالت دائمی ہے، اور اگر یہی مانا جائے کہ وہ اسی معنی میں زندہ ہیں، جس معنی میں ہم زندہ ہیں اور ان کا جسم اور ان کا گوشت پوست غیر فانی ہے، تو بھی یہ سمجھنے کی بات ہے کہ وہ اپنی ابدی زندگی کے دن قبر کی تاریک کوٹھریوں میں نہیں کاٹ رہے ہیں، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس ہیں وَعِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ (اور وہ اپنے رب کے پاس روزی پا رہے ہیں)

اختتام مضمون پر یہ لکھنا ضروری ہے کہ تصوف کا سرچشمہ طریقت کا منبع اور روحانیت کا مخزن ہمارے آقائے نامدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ آپ سب سے بڑے صوفی، سب سے بڑے مرشد اور سب سے بڑے رہبر تھے۔ مگر آپ کی حالت کیا تھی؟ آپ دیندار بھی تھے، دنیادار بھی، عبادت گذار بھی تھے عیالدار بھی، خدا کو بھی یاد کرتے تھے اور قوم کو بھی، آپ کو اپنے خالق کی خوشنودی کا بھی خیال رہتا تھا اور اُمت کی اصلاح کا بھی، جنگ بھی کرتے تھے صلح بھی، مذہبی تذکرے بھی کرتے تھے سیاسی مشورے بھی، حکمرانی بھی کرتے تھے گلہ بانی بھی، خلاصہ یہ کہ آپ تمام کاموں میں جو انسان کے لئے انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ضروری اور مفید ہیں بنفس نفیس حصہ لیتے تھے، آپ کو صحابہ کرام ہمیشہ آپ کے نقش قدم پر چلے اور دین و دنیا اور ظاہر و باطن دونوں کا خیال کرتے رہے۔ کیا وجہ ہے کہ آجکل پیرانِ ہند اپنے سردار (روحی فداہٗ) کے اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کی دلیل راہ نہیں سمجھتے؟ یہ کہاں کا تصوف ٹھیرا کہ خود قوم سے الگ رہیں اور قوم کے امراض کی خبر نہ رکھیں اور پھر قوم کی روحانی اصلاح کا دم بھرتے رہیں، یہ کیسی طریقت ہے کہ خود کشمکشِ حیات سے دور ہیں اور سکون کے ساتھ حجرہ نشین ہیں اور امت مرحومہ زندگی کے آخری وقت سے گذر رہی ہے، اصلاحِ قوم خواہ ظاہری ہو خواہ باطنی اعلانیہ اور رہگذر عام پر ہونی چاہئے، نہ کہ پوشیدہ اور منزل خاص پر، پس سجادہ نشینانِ ہند کو چاہیئے کہ وہ اپنے حجروں سے نکل آئیں اور قوم کی مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی علمی، اور تعلیمی اصلاح کے لئے کوشش کریں۔ وما علینا الا البلاغ۔

"اقبال کی شاعری"

مرتبہ

جناب عبدالمالک صاحب آروی

پر

دیو جانس بہاری کی ایک نظر

علامۂ عصر جناب عبدالمالک صاحب آروی ان مشاہیر علماء اور اکابر فضلاء میں ہیں جن پر نہ صرف ہمارے صوبہ بہار کو ناز ہے بلکہ دوسرے صوبے کے ادباء وشعراء ان کی روح پرور علمی صحبتوں میں شریک ہو کر عزت وافتخار حاصل کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو "خواب کی دنیا" میں مثل لفظ از ادیب عصر حضرت نیاز فتحپوری) ملک کی کجرفتاری اور ناشناسان علوم ومعارف کی ناقدردانی کے سبب سے گو وہ اپنی حیثیت سے فروتر ملازمت میں مشغول اور پراگندہ خاطر رہتے ہیں مگر اپنی طبیعت کے "تخلیقی رجحان (Productive)" اور "ذوق و وجدان (intulton)" کے باعث غیر معمولی علمی احساس فریضہ (Sense OF DutY)" رکھتے ہیں، اسی لئے فروتر ملازمت کی خشکی اور بیزاری سے ذہنی تشاؤم میں مبتلا ہونے یا ایک علیحدہ (isolated)" زندگی بسر کرنے کے بجائے اپنی "نفسیاتی ابتہاجیت (Psychological HeDonism)" سے کام لیکر اور میکڈاؤگل (یا میکڈوگل) کے "اصول عمل (Theories OF action)" پر کار فرما ہو کر "حدیث وانساب، شعر وادب، تاریخ وتنقید، فلسفہ وتصوف، لسانیات ونفسیات، نجوم ومصوری" کی علمی خدمت کرتے رہتے ہیں، اس میں ان کی غرض کوئی "ستفضی شہرت ونمود" اور "ذاتی تشخصات وامتیازات" نہیں، بلکہ اپنی تخلیقیت (Originality)" اور "تبعیت (Suggestibility)" سے نہ صرف ریسرچ، تحقیق، تنقید اور تبصرہ کی "لطیف تصوریت (Transcendental idealism)" پیش کرنا چاہتے ہیں، بلکہ بہار کے "جمود وتعطل" اور اس کے ارباب علم کے "سکر وخمول" کو دور کرکے اس کی علمی زندگی کا "دور نہضت (Renaissance)" پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف ان کے بلکہ بہار کے نام میں "چار چاند" لگ جائیں گے، چنانچہ اب علامہ ممدوح نے بلند پایہ رسالوں میں مضمون نگاری کی "فلسفیانہ نکتہ سنجی" اور "محققانہ دقت پسندی" سے علیحدہ ہو کر ایک "ادارۂ نشر وشیوع" قایم کیا ہے جس کا نام شاید "کیٹس" یا "گوئٹے" یا "فریڈرک ونٹرنز" یا "اسپینوزا" یا "شوپنہار" یا "ڈیکارٹ" یا "سوفقلس" یا "ٹامس وِیٹاکر" یا ممکن ہے "ابن سینا" "ابن باجہ" "فارابی" "ابن عربی" "ابو العلا معری" کی کسی اصطلاح سے مستعار لیا گیا ہے، ورنہ ہم جیسے طلبہ معنی کے لحاظ سے اس ترکیب میں کوئی "وفق وربط" یا "مرابطت" نہیں پاتے، پٹنہ یونیورسٹی کے اساتذہ نے ہم کو طاق ابرو، طاق ایوان، طاق بل، طاق خضرا، طاق مدنی، طاق نگون، طاق مزار، طاق طارم، طاق فیروزہ، طاق کحلی، طاق لاجوردی، طاق مقرنس، طاق نیلوفری، طاق نیم خایہ، طاق شکر پورہ اور طاق نسیان تو بتایا ہے، مگر طاق بستان نہیں بتایا، اور وہ بتاتے کیسے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بستان (باغ) میں طاق (محراب) نہیں ہوتا ہے، ممکن ہے کہ کاتب نے طاق نسیان کو طاق بستان لکھ دیا ہے، تو پھر کسی اعتراض کی گنجایش نہیں، اور اگر واقعی طاق بستان ہے تو "ارسطو" جس کی طرف "فلسفہ مشائیں" منسوب ہے یا "زینو" جو فلسفہ "اشراقیون" کا بانی ہے یا

سلہ واوین اور قوسین میں لکھے ہوئے الفاظ اور جملے علامہ موصوف کے ہیں جو راقم السطور نے بطور استفادہ جابجا استعمال کئے ہیں۔

"قارنیادس" جو "فلسفۂ مشککین" کا موجد ہے۔ بیسویں صدی میں ہوتا تو طاق لبستان کو کسی علمی ادارہ کا نام نہ سمجھتا بلکہ "گا تھک فن تعمیر" کی کوئی اصطلاح تصور کرتا، البتہ "ڈی ولف" ہوتا تو ممکن ہے کہ اس کو "مستیقنین (Scholastics)" کا ادارہ سمجھتا، مگر ہم بہاریوں کو عموماً نام سے کم اور کام سے زیادہ غرض ہوتی ہے اسلئے بہار کی بنجر اور شور زمین میں ایک "ادارۂ نشر و شیوع" کا قایم ہوجانا ہی ہمارے "فخر و ابتہاج" کے لئے کافی ہے، اور جس طرح اہل یونان ارسطو کی اکاڈمی سے مستفیض ہوتے رہے تھے، اسی طرح ہم کو امید ہے کہ طاق لبستان کے علمی "مہبط انوار کی مختلف کرنوں" سے ہمارا دل منور اور دماغ روشن ہوتے رہیں گے۔

ابھی طاق لبستان کو قایم ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ہمارے "فخر و ابتہاج کی کوئی حد" نہ رہی، جب اس کی طرف سے علامہ ممدوح کا ایک بے مثل مقالہ "اقبال کی شاعری" کے عنوان سے شایع ہوا۔ جس میں نقادان فن کی رائے ہے کہ "انکزاغورس" کی طرح "جذبات کی اثیریت" "دیاغوس" کی طرح "اہتزاز فکر" "قارنیادس" کی طرح "طرز استدلال" اور "فلاطینوس" کی طرح "فلسفیانہ نکات" اور "تھیاڈائس" کی طرح "منطقیانہ رموز" ہیں، کتاب کے ان ہی "غیر ارادی محاسن کی جلوہ ریزیوں" کے باعث پٹنہ یونیورسٹی کے اُردو کے ایم اے کورس میں داخل ہوگئی ہے جو ہم بہاریوں کے "سکر و خمول" کے علیحدہ ہونے کی پہلی دلیل ہے۔ کیونکہ یہ ایک بہاری کی پہلی کتاب ہے جو اُردو کے نصاب میں داخل ہوئی ہے۔ "یہی کیا کم فخر کی بات ہے۔"

"ہیگل" اور "برگسان" کی تقلید و تتبع کرتے ہوئے علامۂ موصوف نے اقبال کے فلسفۂ شاعری کے "غموض و دقایق" کی "تنقیح و تحلیل" کرکے اور اپنے "دلنواز ادب و انشاء" کے "اختراعات فایقہ" کی "ایجادات رائقہ" اور "رشحات فکر" سے اپنی ذات بابرکات کو آیندہ نسل کے "تاثرات و تہیجات" پرتو "مرتسم" کرلیا ہے، مگر اقبال کی شاعری کی گہری معنویت" اور "سنگین حقیقت" کو سمجھانے کی جو "عالمانہ کاوشیں" کی ہیں یا ان کے اسلوب و انداز بیان میں اقبال کی ذات سے جو "ولولۂ ارادت کی کارفرمائیاں" ہیں یا مقالہ میں شروع سے لیکر آخر تک جو ان کے "تصورات کی بلندی، تخیل کی نزاکت، بلیغ معنی آفرینی اور فلسفیانہ نکتہ سنجی" ہے یا ان کے "معتقدات کے ماتحت غیر ارادی بلکہ غیر شعوری طور پر جو رفعت خیال متمائز" نظر آتی ہے۔ ان کی بنا پر راقم السطور اپنا ایک علمی "احساس فریضہ" سمجھتا ہے کہ ایم اے کے طلبہ کے لئے زیر نظر رسالہ پر تمام مشکل اور پیچیدہ سوالات کے جوابات لکھدے تاکہ امتحان میں شریک ہونے والوں کیلئے یہ رسالہ "ارسطو کی ارغنون" یا "فارفیری کی ایساغوجی" یا "ہیسیوڈ و ڈیانوسیس" کی تصانیف کی طرح ایک عقدۂ لاینحل نہ رہ جائے، اگر یہ کام علامہ ممدوح کی حیات مستعار میں طے پاگیا تو نہ صرف میکڈوگل کی اس بحث کی تکمیل ہوجائے گی جو ان نے "جبلت عایلہ (Family instinct)" کے سلسلہ میں "اسلاف پرستی (Ancestor worship)" پر کی ہے بلکہ علامہ کی موجودگی کی وجہ سے جو "ہماری خوش قسمتی سے شعور و ذوق کے لحاظ سے اسی عہد کے پیداوار ہیں" ان کے مقالہ پر تنقیدی نظر ڈالنے میں نہ "مفروضات" نہ "بُعد زمان و مکان کے بعد" اور نہ "ظن و اعتبار" کا کوئی جھگڑا باقی رہیگا۔

پہلا سوال علامہ ممدوح کے الفاظ میں یہ ہوسکتا ہے "اقبال کی شاعری اردو شعراء کے کس دور سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی میں کتنے قدیم عناصر ہیں"۔ علامۂ موصوف نے یہ سوال قایم کرکے خود ہی جواب لکھنے کی کوشش کی جو طلبہ کی سہولت کے لئے اختصار کے ساتھ ذیل میں درج ہے:

"مولانا محمد حسین نے اُردو شاعری کے پانچ دور قایم کئے ہیں۔ اول .... دوم .... سوم، تحقیق و نظر نے اب یہ بات پایۂ ثبوت تک پہونچادی کہ ولی اُردو کا پہلا شاعر نہ تھا، قایم کے نزدیک عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ریختہ کو بہت زیادہ رواج ہوا۔ مولانا عبدالحق صاحب کو اس پر اعتراض ہے، مگر ان کا اعتراض بے محل ہے۔ قایم نے اُردو کا سب سے پہلا شاعر سعدی کو بتایا ہے۔ قایم کا مطلب سعدی سے سعدی شیرازی ہے۔ مگر میر تقی نے اس کی تردید کی ہے۔ دکھن میں کوئی سعدی تھے جو ریختہ کہا کرتے تھے، قایم نے اُردو شاعری کے تین طبقات قایم کئے ہیں۔ اول .... دوم ...... سوم، صفیر بلگرامی نے بھی دکنی شعراء کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے، محمد حسین آزاد نے پانچ دور پر اُردو شاعری کو ختم کیا ہے، مگر دور اول کے متعلق ان کی رائے ساقط الاعتبار ہے، حالی کو غالب کی باقیات الصالحات میں گنا جاسکتا ہے۔ وہ ایک جدید اسکول کے بانی ہیں، اور یہیں سے اس کا دور نہضت شروع ہوتا ہے، ان کی مسدس اُردو زبان کا ایک غیر فانی شاہکار ہے، یہ حالی ہی کا

فیض تھا کہ اس نے اُردو زبان میں اکبر الہ آبادی جیسا نادر الوجود شاعر پیدا کیا، اسمٰعیل میرٹھی وغیرہ اسی سلسلۂ ارتقا کی کڑی ہیں، حالی کے بعد اُردو شاعری نے کوئی انقلابی صورت اختیار نہ کی، ہندوستانیوں نے مغرب کی تقلید میں اپنا مشرقی ناموس کھو دیا، اب ضرورت تھی کہ کوئی پیمبر سخن پیدا ہو، چنانچہ قدرت نے اس کے لئے اقبال کا انتخاب کیا "

طلبا نے اقبال کی شاعری کے قدیم عناصر کے اجزائے ترکیبی کی تحلیل و تنقیح میں یہ مربوط، مرتب اور مدلل جواب سپرد قلم کیا تو علی گڈھ یونیورسٹی کے پروفیسر رشید احمد صدیقی ممتحن ہوئے تو وہ خوش ہو نگے کہ ان کو ریڈیو پر ایک تقریر کرنے کے لئے مواد مل گیا - یا ڈاکٹر عبدالحق (انجمن ترقی اُردو) ممتحن ہوئے۔ تو ان کو مسرت ہوگی کہ رسالہ اُردو کے اقبال نمبر میں ایک اہم موضوع رہ گیا تھا، جو الحمدللہ علامہ عصر عبدالمالک آروی کے مقالا "اقبال کی شاعری" سے پورا ہو گیا، یا پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سچیتانند سنہا ممتحن ہوئے تو ان کے "فخر وابتہاج" کی کوئی انتہا نہ ہوگی کہ ان کی یونیورسٹی کے طلبا کے جوابات کا معیار کس قدر بلند ہو گیا ہے"

اس کے بعد علامہ ممدوح نے دوسرا سوال پھر خود ہی قایم کیا ہے کہ "اقبال کی شاعری کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟"، مولانا نے اس کا جو جواب لکھا ہے، اس کا خلاصہ ان ہی کے الفاظ میں ہم پیش کرتے ہیں۔

(۱) نہ تو فارسی میں اقبال کے رنگ کا کوئی شاعر پایا جاتا ہے اور نہ اُردو میں ان سے قبل کوئی اس انداز کا شاعر گذرا ہے۔

(۲) اُردو میں وہ حالی اسکول کی پیداوار ہیں، یقیناً حالی، اسمٰعیل میرٹھی، اور اکبر الہ آبادی کے تاثرات سے بڑی حد تک اثر پذیر ہیں،

(۳) ہندوستان کا کوئی ایسا نظم نگار نہیں جس کے افکار شعریہ کی تنقیح و تحلیل کی جائے تو اس کا انتساب حالی اسکول سے نہ ہو، پھر بھی اقبال اپنی نظیر آپ ہیں۔

(۴) اقبال نے فارسی شعرا، بالخصوص صوفیانہ شاعری سے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سنائی، عطار، رومی اور خاقانی کا نام لیا جا سکتا ہے،

(۵) ان کی شاعری پر زبان فارسی کے اور ہندی اور ایرانی شعرا کا بھی اثر پڑا ہے، مثلاً حافظ، صائب، طالب، آملی، بیدل وغیرہ کا کلام بھی ان کے زیر مطالعہ رہا ہے،

(۶) انگلستان اور جرمنی کی شاعری نے ان پر گہرا اثر کیا ہے، لانگ فیلو کی اخلاقیات، ورڈسورتھ کی راہبانہ اور صوفیانہ نگارش، کیٹس کی عشقیہ اور دل فروشانہ آہنگ اور گوئٹے کے فلسفیانہ اور متین پیام و تلقین نے اقبال کو اثر پذیر کیا،

(۷) اقبال یورپ کے قدیم و جدید فلسفہ سے متاثر ہیں، انہوں نے اسپینوزا، افلاطون، نطشے اور ہیگل کا مطالعہ کیا ہے، چینی فلاسفر و رہنما کنفیوشس کی تعلیمات ان کی نظر سے گزری ہیں۔

(۸) وہ ہیگل اور برگساں کی طرح فلسفہ کے غموض و دقایق بیان کرتے ہیں،

(۹) ابن عربی، سنائی، رومی اور عطار کی طرح اسرار و نکات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

(۱۰) اقبال نے رومی کا مطالعہ مریدانہ اعتقاد سے کیا تھا، اور وہ رومی کو اپنا روحانی رہبر سمجھتے تھے،

(۱۱) حضرت حسان اور ابن رواحہ کی طرح ان کا موضوع شعر مسلم قوم، ممالک اسلامیہ، بنی اسلام اور شان اسلامی ہے۔

(۱۲) اقبال خاقانی سے متاثر تھے،

(۱۳) اقبال نے بیدل کا بھی مطالعہ کیا اور ان کی تقلید و تتبع کی سعی کی، لیکن بیدل کے تصورات کی بلندی، تخیلی نزاکت، بلیغ معنی آفرینی، اور فلسفیانہ نکتہ سنجی اس سطح کی چیز نہیں کہ ہر شخص آسانی سے اس کی تتبع کر سکے،

(۱۴) اقبال نظامی سے بھی متاثر تھے۔

(۱۵) اقبال کی شاعری پر عربی ادب کا اثر نہیں، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہمارے شاعر نے عربی زبان کی طرف توجہ نہ کی،

(۱۶) ان کے کلام پر کبھی ابن عربی اور رومی کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ ان کی نظم "تقدیر" ابن عربی ہی سے ماخوذ ہے،

(۱۰) اقبال شاعر ہیں میر و ضیا کی طرح ، ان کے کلام میں درد و الم کی چاشنی ہے ،

اس جواب میں تضاد اور تناقض ضرور پیدا ہو گئے ہیں ، مگر انگلستان کا کوئی "دکتور" ممتحن ہوا تو طلبہ کی کثرت مطالعہ ، وسعت نظر اور عالمانہ بلکہ "شاعرانہ تخیل زار" سے متاثر ہو کر امید ہے کہ پورا نمبر دے گا۔

آگے چل کر علامہ اجل نے "اقبال اور اسلامیات" اور "اقبال کے بین الاقوامی تاثرات" کی جلی سرخیاں قایم کی ہیں ، مگر طلبہ خوش ہوں گے کہ جس طرح ویسٹر مارک اپنی کتاب اخلاقی تخیلات کی ابتدا اور نشو و نما (The origin and Development of The moral idea) اور پروفیسر کاڈول نے اپنی تصنیف شوپنہار کا نظام اپنی فلسفیانہ اہمیت میں (Schopenhauer's system in its philosophical significance) یا ان ہٹے نے اپنی کتاب فلسفۂ برگسان (The philosophy of Bergson) میں بعض مباحثات کو مختصر طور پر لکھ کر آگے بڑھ گئے ہیں ، اس طرح ہمارے علامہ مد فیوضہ نے بھی مذکورہ بالا بحث پر ایک سرسری نظر ڈال کر کے "جادہ پیما" ہو گئے ہیں ، تاکہ ان کے "افکار و تصورات" اقبال کی شاعری کے اہم پہلو کو واضح کرنے کے لئے محفوظ اور مصئون رہیں ،

اس کے بعد علامہ مذکور کے رسالہ کا وہ باب آتا ہے جس کو میکس مولر کی اصطلاح میں علمی Psycho-metry اور Fichte کے الفاظ میں Quantum of Reality یا مہدی مرحوم کے نقطۂ نظر سے ادب العالیہ کہا جا سکتا ہے ، مگر جس طرح کینٹ نے بعض حقایق کو صریحی اور بدیہی (Anodictic) سمجھ رکھا ہے ، اسی طرح علامہ موصوف نے اقبال کے اصلی فلسفہ خودی اور رموز بیخودی کو اظہر من الشمس سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے ، اور مشہور سائنس دان آئنسٹائن کے نظریۂ اضافیت کی طرح اقبال کے فلسفہ کے اجزائے ترکیبی میں یونانی فلسفہ ، عربی فلسفہ ، یہودی فلسفہ اور یوروپین فلسفہ میں جو "مراجعت" ہے اس کو دکھانے کی کوشش کی ہے ، البتہ ہیگل ، برگسان اور شپنگلر کی طرح نفس موضوع کے پابند تو نہ ہو سکے ہیں لیکن ہوب ہوس کی طرح جو اپنی ضخیم تصنیف اخلاق اپنی ارتقا میں (Morals in Evolution) کی باعث حیات جلوداں کا مالک ہو چکا ہے ، علامہ ممدوح نے بعض مباحث ایسے پیدا کر دئے ہیں جن کا تعلق گو ان کی موضوع سے نہ ہو لیکن ایم ۔ اے کے طلبہ میں "فلسفیانہ عمق نظر" اور "حکیمانہ رفعت خیال" "جاری و ساری" کرنے کے لئے کافی و شافی ہے ، تاکہ وہ اپنا ذہنی جمود و تعطل "دور کر کے" "ہیوی کی اصطلاح میں Representative Thinker" ہو سکیں۔

اس باب میں علامہ عصر نے جابجا سوالات قایم کئے ہیں ، ہم محض طلبہ کے مفاد کی خاطر ان کے جوابات حتی الوسع سلیس اردو میں لکھ دیتے ہیں ، تاکہ مولانا کے حقایق و دقایق کو آسانی سے سمجھ کر امتحان کے پرچوں میں لکھ سکیں ،

سوال نمبر۱ اقبال کی شاعری پر کس نظام فلسفہ کا اثر ہے ؟

جواب :۔ "یہ نہایت اہم سوال ہے ، ان کے افکار و تخیلات پر قدیم ، وسطی اور جدید تینوں دور کے فلسفہ نے اثر کیا ہے ، اس وقت یہ موقع نہیں کہ ادوار ثلاثہ کے مختلف اسکول کا تجزیہ کر کے یہ بتایا جائے کہ اقبال کو کس اسکول نے اثر پذیر کیا ، کیونکہ مجھ کو ابھی اپنے پرچے کے بہت سے سوالات لکھنے ہیں ، پھر بھی مختصراً تینوں ادوار پر بحث کر کے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اقبال فلسفہ کے کس اسکول سے علاقہ رکھتے ہیں۔

عام طور سے فلسفہ قدیم سے فلسفہ یونان ہی مراد لیا جاتا ہے ، اس فلسفہ کا بانی سالیس ملیطی تھا ، مگر افسوس ہے کہ اس کے بال بچوں کا حال معلوم نہ ہو سکا ، البتہ یہ معلوم ہوا کہ اس کے زمانہ میں ایک بہت بڑا سورج گرہن ہوا تھا ، اس کے بعد فیثاغورث ، ہرقلیطوس ، زینوفنس کا زمانہ آتا ہے ، ان میں ہر ایک مقررہ وقت پر اپنی اپنی موت سے مر گئے معلوم نہیں ان لوگوں نے کوئی اولاد چھوڑی کہ نہیں ، اس دور کے بعد انکساغورس ، دیاغنوس ، اور امقیداسلس ہوئے یہ مرے تو قبر میں دفنائے گئے یا شاید جلا کر خاک سیاہ کر دئے گئے ، ان کے بعد سقراط ، افلاطون ، ارسطو ، ابیقورس ، فلاریناس ، اور فلاطینوس ہوئے ، یہ سب بڑے اچھے آدمی تھے ، ان کے زمانہ میں فلسفہ کو بڑا فروغ ہوا ،

عہد قدیم ختم ہوا تو عہد وسطیٰ شروع ہوا ، اسی زمانہ میں گو تھک طرز تعمیرات کا آغاز ہوا ، اس عہد میں ایک اہم واقعہ ہے ، اس دور میں بہت سے فلسفی گذرے جن میں ہر ایک بال بچے والے تھے ۔

یہودی فلسفہ، عربی فلسفہ، ایرانی فلسفہ، عیسائی فلسفہ، تورانی فلسفہ، چینی فلسفہ، شامی فلسفہ، حبشی فلسفہ اسی عہد کے پیداوار ہیں، اس زمانہ میں یونانی سے شامی زبان میں بہت سی کتابیں ترجمہ کی گئیں، افسوس ہے کہ میرے پاس وقت نہیں ورنہ میں بتاتا کہ ایرانی اسکول اور شامی اسکول کو یونانی افکار نے کہاں تک اثر پذیر کیا تھا، مگر اتنا لکھے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں کہ عربوں کے فلسفیانہ تخیلات پر صرف شامی مسیحیوں کے یونانی فلسفہ نے اثر نہیں کیا ہے بلکہ عربی فلسفہ کے اجزائے ترکیبی میں ہندی، ایرانی، تورانی، چینی، جاپانی، ترکستانی، یونانی، مراکشی، مصری اور شامی افکار بھی شامل ہیں، عربی کے اکابر فلاسفہ کے نام یہ ہیں :- ابن مسکویہ، ابن سینا، غزالی، ابن ماجہ، ابن حزم ابن طفیل، ابن رشد وغیرہ، یہ سب کے سب اللہ والے تھے اور صوم وصلوٰۃ کے بےحد پابند تھے،

اس کے بعد وہ دور آتا ہے جس کو ہم دورِ جدید کہتے ہیں، اس عہد میں کینٹ، شوپنہار، ہیگل، ڈیکارٹ، سپینوزا، برکلے، ہیوم، ہوبس، جان لاک، ایڈم اسمتھ، ہارٹلے، ڈارون، والٹر، روسو، کونٹ، سپنسر، ہرمن لوٹزے، ہارٹمن، فریڈرک البرٹ اور مختلف ممالک کے مختلف شہروں اور مختلف قصبوں اور گاؤں کے مختلف مفکرین نے فلسفہ جدید کو چار چاند لگا دئے۔

مختصر یہ کہ اقبال نے فلسفہ کے ان تینوں ادوار کا مطالعہ کیا، اور انہوں نے اپنی شاعری شروع کی، شکوہ، جواب شکوہ، اور بانگ درا لکھی، مگر ان کتابوں میں گہرائی نہیں، کیونکہ ان کی شاعری پر اس وقت تک فلسفہ کا رنگ نہیں چڑھا، " اسرار خودی اور پیام مشرق تو میرے خیال میں یورپ کی تقلید کا نتیجہ ہیں - ان کتابوں میں تخلیقیت سے زیادہ میک ڈاؤگل کی اصطلاح میں تبعیت کا غلبہ ہے " (طلبہ توسین کے سطور کو ازبر کرلیں تاکہ اپنے پرچوں میں ان کو لفظ بہ لفظ نقل کرسکیں)

بال جبریل زمیلنشینی کا نتیجہ ہے، مگر خوب چیز ہے، اس سے بڑھیا خدا کی قسم ضرب کلیم ہے، ضرورت ہے کہ اس کا ترجمہ ہر زبان میں ہو "

– " اقبال زندگی اور موت کو کیا سمجھتے ہیں" اس پر علامہ عمر عبدالمالک صاحب آروی کے طرز میں اقبال کے فلسفیانہ خیالات لکھئے

– زندگی اور موت ایسے مسائل ہیں جن پر فلاسفہ نے بہت کچھ پرفشانیاں کی ہیں، برگساں نے اس مسئلہ پر Soul and Rationaleg کی بحث میں خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں، اور وہ زندگی کو ظل ممدود (!!!!) سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا، کینٹ نے بھی اپنی کتاب Critique of Pure Reason میں Solution of The Cosmological ideas with regard to The Totalily of The Derivation of Cosmical events from their Causes کی بحث میں اس موضوع پر بہت ہی فاضلانہ تبصرہ کیا ہے، جس کو پڑھنے کے بعد غش غش کرنے کو جی چاہتا ہے، شوپنہار نے تو اس مسئلہ پر قلم ہی توڑ دیا ہے، وہ بڑا ہی انوکھا انسان گذرا ہے، عجیب غریب آدمی تھا، وہ فلسفہ کے ایک نئے نظام کا بانی ہے، اس نے تصوریت (Idealism) نظریہ علم (Theory of knowledge) اور انسان کی غلامی کے سلسلہ میں ثبوتیت (Positivism) اور جبریت (Determinism) آرٹ، اخلاق، مذہب، اور مابعد الطبیعات کے متعلق بالکل اچھوتا اور انوکھا خیال پیش کیا ہے، شوپنہار نے "عالم بہ حیثیت تصور" میں ایک بحث چھیڑی ہے جو غالب کے " عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے " سے ملتا جلتا ہے اگرچہ یہ کوئی نئی حقیقت نہیں بلکہ تمام فلاسفہ نے یہی بات لکھی ہے، چنانچہ ڈیکارٹ جو ۱۵۹۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۵۰ء میں مر گیا اور جس نے اوائل عمر میں (۱) Mosicae Commendium (۲) The World اور پھر آگے چل کر (۳) Principii (۴) Le Monde (۵) Lenttomme

(۶) La Formation du foetus

(۷) Meditation on The first Philosophy.

(۸) Discourse of Method

(۹) Rules for The Direction of Mind

دغیرہ وغیرہ لکھی، بالکل یہی بات لکھتا ہے، برکلے جس کی کتاب (۱) New Theory of Vision

(۲) Principles of Human Knowledge

اور Passive obedience پر مکالمات عام طور سے بہت پسند کئے جاتے ہیں، اگر نہ جانے کینٹ کو کیا ہوا تھا کہ اس اصول سے اس نے تغافل کیا، یہ اس کی سخت غلطی تھی،

یہ مسئلہ ویدانت میں بھی ہے، جس پر سر ولیم جونس نے اپنے آخری مقالہ "ایشیا والوں کا فلسفہ" میں خوب خوب روشنی ڈالی ہے، غرضیکہ ارسطو، سوفقلس، سٹلکسپیر، حتیٰ کہ ارنسٹ ہیکل (واضح رہے کہ یہ ہیگل نہیں ہیکل ہے جس کی کتاب Riddle of The Univeree پر بہت سے حلقوں سے ملامت طعن کی بوچھاڑ پڑی) نے بھی یہی کہا، پھر اقبال کیوں کسی سے پیچھے رہتے، انہوں نے بھی اپنی نظم مقصود میں اس مسئلہ پر خوب خوب روشنی ڈالی ہے، پہلے انہوں نے افلاطون اور اسپنوزا کے نظریے لکھے ہیں، اسپنوزا کا نام آگیا تو ذرا اس کا بھی ذکر سن لیجئے، گو جواب طویل ہو رہا ہے اور وقت نکلتا جا رہا ہے، مگر کیا کیا جائے، جواب کو بہرحال ٹھوس بنانا ہے اسپنوزا اپنے وقت کا عجیب انسان تھا، اس کی مادیت اور لامذہبیت کی گہرائی سے لوگ کانپتے تھے، ہیوم نے لکھا ہے وہ کس طرح مطعون بنا، اس کو ضرور پڑھ لیجئے، اس کا فلسفہ ابیقورس سے ملتا جلتا تھا، وہ حیات کو سرمایۂ نشاط سمجھتا تھا، افلاطون زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے، اب دیکھئے ہمارا ہندوستانی فلسفی کیا کہتا ہے،

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

اقبال نے یہ خیال کہاں سے لیا، افسوس اس پر بحث کرنے کا موقع نہیں، کیونکہ وقت ختم ہو رہا اور ابھی بہت سے سوالات باقی رہ گئے ہیں"

اس سال تو ہم علامہ ممدوح کی کتاب پر یہی چار سوالات کے جوابات لکھ کر اکتفا کرتے ہیں، آیندہ سال انشاء اللہ العزیز اور جوابات لکھے جائیں گے، مگر طلبہ مطمئن رہیں کہ ان سوالات میں دو تو ضرور امتحان میں آئیں گے، اور اگر یہی جوابات لکھ دئے گئے تو پھر ان کا بیڑا پار ہے، ہاں ایک یقینی سوال اور رہ گیا ہے جس کا جواب ہم اسی سال کے طلبہ کے لئے لکھ دیتے ہیں،

سوال - علامہ عبدالمالک آروی کی کتاب "اقبال کی شاعری" پر ایک مفصل ناقدانہ تبصرہ لکھئے،

جواب - "اقبال کی شاعری" کا آغاز پروفیسر میکڈوگل کے ایک قول سے ہوتا ہے جو بظاہر بڑی عجلت میں کہیں سے منتخب کر لیا گیا ہے یہ قول قوموں کی اسلاف پرستی سے متعلق ہے، جس سے یہ مراد ہے کہ وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو اپنے اسلاف کی پرستش کرتی ہیں، اقبال کی شاعری کے مؤلف اس قول کو نقل کر کے خوش ہیں کہ اسی اسلاف پرستی کے جذبہ میں یوم اقبال منایا جا رہا ہے، مگر یوم اقبال کی تقریب اس وقت منائی گئی تھی جب اقبال مرحوم زندہ تھے، اور ابھی ہم لوگوں کے اسلاف میں سے نہ تھے، پھر اسلاف پرستی کی مدح و ستایش سے اقبال کی شاعری پر ایک مقالہ لکھنا کیسا نامبارک اور غیر مستحسن کام تھا۔

اقبال کی شاعری پر نقد و تبصرہ کرنے سے پہلے مؤلف نے ان کی شاعری میں اردو شاعری کے قدیم عناصر بتانے کی کوشش کی ہے، اس کے لئے ساڑھے چار صفحے لکھے ہیں، ہم ان کو بار بار پڑھتے ہیں، جن سے ہم کو یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ "مولانا محمد حسین آزاد نے اردو شاعری کے پانچ دور قایم کئے ہیں، ولی اردو کا پہلا شاعر نہ تھا۔ میر تقی نے دکنی شعرا کے حالات اہتمام سے نہیں لکھے ہیں، قایم نے دکنی شعرا کی زندگی کے واقعات بڑی

کاوش سے ترتیب دئے ہیں، عبدالحق صاحب قایم کو غلط سمجھتے ہیں، اور قایم پر ان کا اعتراض بالکل بے محل ہے، ولی کے بجائے سعدی دکھنی اُردو شاعری کے پہلے شاعر تھے، قایم نے اُردو شاعری کے جو تین طبقات قایم کئے ہیں، وہی اصل میں صحیح ہیں، اُردو شاعری کے دور اول کے متعلق محمد حسین آزاد کی رائے بالکل ساقط الاعتبار ہے، بہادر شاہ ظفر کے زمانہ میں اُردو شاعری کو بڑی ترقی ہوئی، حالی کو غالب کی باقیات الصالحات میں گنایا جاسکتا ہے، حالی کی مسدس اُردو زبان کا ایک شاہکار ہے، اکبر اور اسمٰعیل میرٹھی حالی اسکول کے مقلد تھے" مگر ہم کو کہیں سے اس کی واقفیت نہیں ہوتی کہ اقبال کی شاعری کے اجزائے ترکیبی میں قدیم عناصر تھے کہ نہیں، یا تو ہم اپنی قلت لیاقت کی وجہ سے سمجھنے سے معذور ہیں، یا مولف نے محض اپنی معلومات کی نشر و اشاعت میں اس مسئلہ کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، بہر حال ہم مولف کی فہم ولیاقت سے مرعوب ہو کر تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان کی شاعری میں قدیم عناصر تھے، مگر فاضل مولف نے اپنی کتاب کے آخر حصہ میں ہم کو یہ بتایا ہے کہ اقبال اُردو شاعری میں جدید طرز کے بے مثل شاعر تھے (صـ۶۴) اگر اقبال واقعی جدید طرز کے بے مثل شاعر تھے تو پھر ان کی شاعری میں قدیم عناصر کی تلاش کیوں تھی؟ اور اگر ان کی شاعری میں قدیم عناصر ہیں تو جدید طرز سے ان کی مماثلت کیسی؟

علامہ موصوف کے خیال اور تحریر کی پراگندگی اور ژولیدگی اپنے منتہائے کمال پر اس وقت پہونچی ہے جب کہ انہوں نے اقبال کی شاعری کے اجزائے ترکیبی میں سنائی، عطار، رومی، خاقانی، حافظ، صائب، طالب املی، بیدل، نظامی، میر، ضیا، حالی، ابن عربی، ابو العلا معری، حسان ابن ثابت، لانگ فیلو، ورڈسورتھ، کیٹس اور گوئٹے کے اثرات کا ذکر ایک سانس میں کر دیا ہے، اگر یہ تحریر کسی ذہنی انتشار اور خلجان کا نتیجہ نہیں ہے تو پھر ہم یہ تصور کر لیں کہ اقبال چور تھے جو اپنے تمام خیالات مختلف شعراء سے سرقہ کرتے رہے، مگر علامہ کی تحریریں خود پراگندگی اور ژولیدگی کا ثبوت پیش کرتی ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ اُردو میں اقبال سے قبل کوئی اس انداز (؟) کا شاعر نہیں گذرا ہے (صـ۱۰) مگر اپنے مقالہ میں جابجا جو جملہ انہوں نے لکھے ہیں وہ ملاحظہ ہوں :۔

"اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اُردو میں وہ حالی اسکول کی پیداوار ہیں، یقیناً حالی، اسمٰعیل میرٹھی اور اکبر الہ آبادی کے تاثرات سے بڑی حد تک اثر پذیر ہیں (صـ۱۰)

"میرا خیال ہے کہ ہندوستان کا کوئی ایسا نظم نگار نہیں جس کے افکار شعریہ کی تنقیح و تحلیل کی جائے تو اس کا انتساب حالی اسکول سے نہ ہو، پھر بھی اقبال اپنی نظیر آپ ہیں" (صـ۱۰)

"اقبال حالی اسکول کی پیداوار ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر بھی وہ اپنے طرز کے یگانہ شاعر ہیں" (صـ۱۳)

"اقبال کی شاعری حالی اسکول کی خصوصیات کا کمال پیش کرتی ہے" (صـ۱۶)

"اقبال شاعر ہیں میر و ضیا کی طرح، ان کے کلام میں درد و آہ کی چاشنی ہے" (صـ۱۸)

اسی طرح علامہ موصوف نے ارشاد فرمایا ہے کہ فارسی میں اقبال کے رنگ کا کوئی شاعر نہیں (صـ۱۰) مگر بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں :۔

"اقبال نے فارسی شعراء بالخصوص صوفیانہ شاعری سے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے، اس سلسلہ میں سنائی و عطار رومی و خاقانی کا نام لیا جاسکتا ہے، ان کی شاعری پر زبان فارسی کے اور ہندی اور ایرانی شعراء کا بھی اثر پڑا ہے، مثلاً حافظ و صائب، طالب آملی و بیدل وغیرہ کا کلام ان کے زیر مطالعہ رہا ہے" (صـ۱۹)

"حدیقہ ان کے زیر مطالعہ رہی ہے" (صـ۲۰)

"اقبال نے رومی کا گہرا مطالعہ کیا ہے" (صـ۲۱)

"اقبال نے رومی کا مطالعہ مریدانہ اعتقاد کے ساتھ کیا تھا" (صـ۲۳)

"اقبال نے خاقانی کی مشہور مثنوی تحفۃ العراقین ۔ ۔ ۔ کا مطالعہ کیا ہے" (صـ۲۲)

"اقبال نے اپنی ایک نظم میں نظامی کا بھی اقتباس دیا ہے" (صـ۲۴)

ان تحریروں سے یا تو اپنی قلت بصیرت سے ہم یہ سمجھیں کہ اقبال نے سنائی، عطار، رومی، خاقانی، صائب، طالب آملی، اور بیدل کے دواوین کو صرف درسی طور پر مطالعہ کیا تھا، اگر یہی امر واقعہ ہے تو پھر فاضل مولف نے قاعدہ بغدادی، اُردو کا قاعدہ، گلستان، بوستان، کریما، مقیما، اور کیمیا سعادت

کے نام سہواً چھوڑ دیے، کیونکہ یہ کتابیں بھی اقبال کے مطالعہ میں ضرور رہیں، یا نہیں تو پھر ہم یہ سمجھیں کہ ان کے مطالعہ بلکہ مریدانہ اعتقاد کے ساتھ مطالعہ و استفادہ کے یہ معنی ہیں کہ اقبال نے ان میں سے ہر ایک کا رنگ کچھ نہ کچھ ضرور قبول کیا، تو پھر یہ دعویٰ کہاں قایم رہتا ہے کہ فارسی میں اقبال کے رنگ کا کوئی شاعر نہیں،

دلائل و براہین کے تضاد، تناقص اور بے ربطگی کے ساتھ علامہ ممدوح نے غیر متعلق اور غیر ضروری عبارتوں کا ایک ڈھیر لگا دیا ہے، مثلاً

"اقبال نے فارسی شعرا، بالخصوص صوفیانہ شاعری سے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے، اس سلسلہ میں سنائی و عطار رومی و خاقانی کا نام لیا جا سکتا ہے، ان کی شاعری پر زبان فارسی کے اور ہندی اور ایرانی شعرا کا بھی اثر پڑا ہے، مثلاً حافظ و صائب، طالب آملی و بیدل وغیرہ کا کلام بھی ان کے زیر مطالعہ رہا ہے، اقبال نے اپنی مایۂ ناز کتاب "ضرب کلیم" نواب سر حمید اللہ خان فرمانروائے بھوپال کے نام معنون کی ہے، اسی ضمن میں نواب صاحب کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

تو صاحب نظری آنچہ در ضمیر من است ۔۔۔ دل تو بیند و اندیشۂ تو می داند
بگیر این ہمہ سرمایۂ بہار از من، ۔۔۔ "کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند"

چوتھا مصرعہ طالب آملی کے ایک مشہور شعر کا آخری مصرعہ ہے، گو ضرب کلیم میں اس کا حوالہ نہیں دیا جا سکا، معتمد خاں کی روایت ہے کہ طالب آملی نے چھ ماہ تک فکر کی لیکن کوئی بیش مصرعہ فکر میں نہ آتا تھا۔ آخر میں انہوں نے یہ مصرعہ کہا:-

ز غارت چمنت بر بہار منہاست

میر حسن جیسا نقاد اور سخن شناس قایم چاند پوری کو طالب آملی کا ہمرنگ بتاتا ہے جو بالکل بے جوڑ سی بات ہے، قایم کی آشفتہ سامانی اور سوز جگری کو طالب آملی کی اس کاوش مژہ سے کوئی سروکار نہیں، پہلے وہ خواجہ میر درد کے شاگرد تھے، پھر سودا سے شرف تلمذ حاصل کیا، اگر درد ہی سے وابستہ ہوتے تو آج ان کا پایہ اردو شاعری میں کچھ اور ہی ہوتا، بہر حال اقبال باوجود اس کے کہ حالی اسکول کی پیداوار ہیں اور انہوں نے فارسی شاعری سے بھی بڑی حد تک استفادہ کیا ہے پھر بھی وہ اپنی طرز کے یگانہ شاعر ہیں۔"

بحث تھی کہ اقبال نے فارسی شعرا سے کہاں تک استفادہ کیا، علامہ موصوف کی منطقیانہ دلائل کے کبریٰ، صغریٰ اور نتیجہ کو غور سے پڑھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ ان میں معتمد خاں کی روایت، میر حسن کی نقادی اور سخن شناسی، قایم کی آشفتہ سامانی اور سوز جگری اور میر درد اور سودا سے ان کے شرف تلمذ اور طالب آملی کی کاوش مژہ کا یہاں کیا "جوڑ" تھا، اور یہ جوڑ علامہ ممدوح کے گریز سے اور بھی بے معنی اور بے ربط ہو گیا ہے،

ایک اقتباس اور ملاحظہ ہو،

"اقبال نے خاقانی کی مشہور مثنوی "تحفۃ العراقین" کے دو شعر کا اقتباس اپنی نظم "ایک فلسفہ سید زادہ" میں درج کیا ہے، دولت شاہ کا بیان ہے کہ خاقانی نے شروان شاہ کے سامنے درباری زندگی سے علیحدگی کے لئے استعفا پیش کیا، لیکن اس نے قبول نہ کیا، آپ بلا اجازت بیلقان کی طرف چلے گئے، گرفتاری ہوئی، سات ماہ تک قید ہوئے۔ عبادت و یاد الٰہی کا غلبہ ہوا، قید سے چھوٹے تو پھر ملازمت نہ کی، مکہ کا رخ کیا، رستہ میں ایک قصیدہ کہا جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے،

صبح از حمایل فلک آہیخت خنجرش

طالب بن محمد اصفہانی کی روایت ہے کہ شرفائے مکہ نے اس کو آب زر سے لکھ کر خانہ کعبہ میں آویزاں کیا، اقبال نے خاقانی پر ایک نظم بھی لکھی ہے، اسی میں فرماتے ہیں،

وہ محرم عالم مکافات، ۔۔۔ ایک بات میں کہہ گیا ہے سو بات،
خود بوئے چنیں جہاں تواں برد ۔۔۔ کابلیس بماند و بوالبشر مرد

(ص ۲۳)

مذکورہ بالا اقتباس کی سطروں میں ربط اور تسلسل طلبا یا تو اپنے "اہتزاز فکر" سے خود پیدا کرلیں یا نہیں تو پٹنہ یونیورسٹی کے مشہور نوٹس رائٹر پروفیسر بنرجی گولڈ مڈلسٹ کی طرف رجوع کریں،

علامہ موصوف کی "بے جوڑ" "بے محل" اور "بے سرو پا" عبارتوں کی "دلنواز بہاریں" تو "اقبال کی فلسفیانہ شاعری" کے عنوان میں نظر آتی ہیں، اس کی تمہید میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تصوف، شعر اور فلسفہ ایک ہی "مہبط انوار کی مختلف کرنیں" ہیں اس پر علامہ ممدوح نے جو اپنی "فلسفہ طرازیاں" اور "رشحات فکر" کے نمونے دکھائے ہیں، ان کے بارہ میں یا تو راقم السطور یا علامہ عصری کو کچھ معلوم ہے کہ یہ "بلند پروازیاں" کس کی ہیں، مگر مولانا شاید اپنے ان فلسفیانہ خیالات کے بارگراں کو سنبھال نہ سکے، اور آخر میں یہ لکھ کر مطمئن ہوگئے ہیں کہ شعر میں فلسفہ بھی ہو سکتا ہے اور تصوف بھی، یہ تو کوئی نئی بات نہیں، یا یہ کون نہیں جانتا کہ ایک شاعر کا فلسفی اور صوفی ہونا ممکن ہے، یا ایک فلسفی یا ایک صوفی شاعر بھی ہو سکتا ہے، ہاں اگر علامہ موصوف نے اپنے ناظرین کو یہ مرعوب کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ نہ صرف ابن سینا، ابن باجہ، اسحٰق اسرائیلی، اور داؤد بن مروان، سری سقطی، رابعہ بصریہ، ابوسعید، ابن ابی الخیر، اور عراقی کے نام جانتے ہیں، بلکہ ابیقورس، شوپنہار، ٹامس وٹاکر، شکسپیر، بیدار، سوفقلس، اور اس ڈی۔ ولف کے نام اور ان کی تصانیف سے بھی واقف ہیں، تو ہم بہاری ہونے کی حیثیت سے ان کی وسعت نظر پر فخر کرتے ہیں۔ مگر اس کا افسوس ضرور ہے کہ علامۂ اجل کی معلومات کے سمندر کے سیلاب میں غریب مجنوں گورکھپوری اپنی شومی قسمت سے غرقاب ہوگئے،

معلوم نہیں مجنوں گورکھپوری سے کون سی شوخی، گستاخی اور بے ادبی سرزد ہوگئی تھی کہ مولوی عبدالحق (ملاحظہ ہو ص۸) محمد حسین آزاد (ملاحظہ ہو ص۸) میر حسن (ملاحظہ ہو ص۱۳) اور شیخ عبدالقادر (ملاحظہ ہو ص۵۹) کی طرح بہار کے علم و ادب کی لیلیٰ کے بے پناہ غمزوں اور عشووں سے نیم جان اور بسمل بنا کر چھوڑ دئے گئے ہیں، مگر ہم جیسے عشق و عاشقی سے کورے اور الھڑ مسلمان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ اس مختصر رسالہ میں شوپنہار کے فلسفہ پر بحث و تمحیص کی آخر کیا ضرورت تھی، علامہ ممدوح کو وقت کی قلت کی وجہ سے اس کا موقع نہ ملا کہ وہ بتائیں کہ "فلسفہ کے ادوار ثلاثہ کے کس اسکول نے اقبال کو اثر پذیر کیا" (ص۳۹) یا فلاں شعر کا خیال اقبال نے کہاں سے لیا (ص۵)" مگر چھوٹی تقطیع کے ۶۶ صفحے کے مختصر رسالہ کے ۵ صفحے میں یہ بتانے کے لئے وقت اور موقع میسر تھا کہ مجنوں کی کتاب شوپنہار ٹامس ویٹکر کی تصنیف سے سرقہ ہے .... اور شوپنہار کا باپ تجارت پیشہ تھا، اس پیشہ میں اس کو سخت خسارہ ہوا، اور وہ مرا تو ہیمرگ کی نہر میں اس کی لاش پائی گئی، شوپنہار یکسر قنوطی نہ تھا، اس نے اپنی مشہور کتاب "عالم بہ حیثیت ارادہ تصور" کو اپنے باپ ہی کے نام سے معنون کیا .... اسی طرح کے اور بھی معلومات ہیں، جن کے بارے میں علامۂ عصر نے لکھا ہے،

"آج کل چونکہ ان موضوع پر بہت توجہ مبذول کی جارہی ہے، اس لئے میرا خیال ہوا کہ لطیف تصوریت کی توضیح مع شوپنہار کی تعمیری اور تخریبی تنقید کے ان لوگوں کے لئے مفید ہوگی جو در اصل زبان میں کینٹ اور شوپنہار کا بہ یک وقت مطالعہ نہیں کر سکتے"

آج کل تو ہم لوگوں کی توجہ اشتراکیت، اجتماعیت، شہنشاہیت، آمریت، فاشزم، نازی ازم، تشدد، عدم تشدد، کانگریس، مسلم لیگ، احرار، اور خاکسار کی تحریک کی طرف بھی مبذول ہے، علامہ موصوف کا احسان ہوتا اگر کسی صفحہ کے حواشی میں ان مسائل پر لکھ کر ہم کو مستفیض فرماتے، پھر لطیف تصوریت کی جو توضیح یا شوپنہار کی جو تعمیری اور تخریبی تنقید انہوں نے سپرد قلم کی ہے ان کو پڑھ کر ہم نے علامہ ممدوح کے لیکن شوپنہار اور اس کی لطیف تصوریت کی اہمیت الحمد للہ ذہن سے جاتی رہی، البتہ علامۂ اجل کی تیسری وجہ ضرور قابل توجہ ہے، انہوں نے اقبال کی شاعری پر مقالہ لکھنے کے سلسلہ میں شوپنہار پر محض اس لئے خامہ فرسائی کی ہے کہ ان کے نالایق ناظرین اصل زبان میں مطالعہ نہیں کر سکتے، مگر ہم جیسے نا اہل ناظرین تو زرتشت، کنفیوشس، سوفقلس، فیثاغورث، انغزاغورس، کو اصل زبان میں کیا اپنی مادری زبان میں بھی مطالعہ نہیں کر سکتے، علامہ موصوف کی یہ "مخصوص بارش کرم" (ص۹۵) ہوتی اگر نہ صرف ان ارباب عقل و دانش بلکہ اُن تمام اصحاب علم اور اکابر فلسفہ کے حالات اپنے اس رسالہ میں کچھ نہ کچھ لکھ دیتے، جن کے متعلق ہم اصل زبان میں بہ یک وقت مطالعہ نہیں کر سکتے ہیں،

مگر یہ استدعا محض سوء ادب ہے، کیونکہ اس کی تکمیل اظہار سے پہلے فلسفہ کے ادوار ثلاثہ کی بحث میں ہو چکی ہے، علامہ کے اس مقصد کی برآری سے ہم خوش تو ضرور ہوئے لیکن انہوں نے ان مباحث کی ابتدا میں جو عنوانات اور سوالات قایم کئے ہیں، ان کو خلط ملط بلکہ بے ربط ہوتے دیکھ کر افسوس ہوا، مثلاً علامہ ممدوح نے ص۳۹ سے ص۴۶ تک یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ فلسفہ کے قدیم، وسطی، اور جدید دور میں اقبال کی شاعری کس اسکول سے علاقہ رکھتی ہے، مگر ہر دور کے فلسفیانہ خیالات و نظریے پر بحث کرنے کے بجائے علامہ عصر نے تینوں دور کے فلسفیوں کے صرف نام گنا دئے ہیں، اور اپنی بحث سے مطمئن ہو کر اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ "اقبال نے تینوں ادوار کے فلسفہ کا مطالعہ کیا" صرف اتنی ہی بات لکھنی تھی تو مودبانہ عرض ہے کہ علامہ موصوف کا جہاں پر جی چاہتا، یہ لکھ کر آگے بڑھ جاتے، ہم اقبال کی طرف سے کب ازالۂ حیثیت عرفی کا دعوی کرنے بیٹھے تھے جو پانچ صفحے کی دقیق اور غامض بحث کے پڑھنے کی خواہ مخواہ زحمت دی گئی البتہ اب ہم کو یہ خوف ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں فرو تاغورس، زینوفنس، سقراط، زینوڈس، ارسطو، فارابی، کندی، ابن سینا، ابن حزم، اسپنوزا، ہگلے، ہیوم، اور ہوبس، پرستار اور حامی اب علامۂ بہاری کو قانونی گرفت میں نہ لے آئیں کہ انہوں نے بے محل اور غیر ضروری طور پر ان کے اسمائے گرامی کیوں استعمال کئے۔

پھر ہم ایسے بد مذاق ناظرین کو صرف یہ کہہ کر کیسے مطمئن کیا جا سکتا ہے کہ اقبال صوفیانہ شاعری میں سنائی، عطار، رومی، خاقانی، الخ، فلسفہ میں نطشے، اسپنوزا، شوپنہار وغیرہ، اخلاقیات میں لانگ فیلو، عشقیہ خیالات میں کیٹس وغیرہ سے متاثر تھے، دلائل و شواہد پیش کئے جاتے تو ہم کو تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ تھا، مگر صرف لکھ دینا کافی ہے تو ہم بھی بہانگ دہل کہتے ہیں کہ اقبال نے فارسی زبان میں منہاج سراج، ضیاء الدین برنی، شمس سراج عفیف، یحیی سرہندی، عباس خاں شروانی، میر خوند، بابر، میرزا حیدر دوغلت، جوہر، ابوالفضل، عبد القادر بدایونی، جہانگیر، معتمد خان، ملا محمد صالح کنبوہ، عبد الحمید لاہوری، میرزا کاظم، سبحان رائے کھتری اور دارستہ سے استفادہ کیا، صوفیانہ رموز و نکات کے لئے ابو الحسن علی عثمان ہجویری رح، حضرت معین الدین چشتی رح، شہاب الدین علی بن ہمدانی رح حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح، حضرت فرید الدین گنج شکر رح، حضرت نظام الدین اولیا رح، حضرت نصیر الدین چراغ رح، بو علی قلندر رح، ضیاء الدین بخشی رح خواجہ رکن الدین عماد کاشانی رح، شرف الدین یحیی منیری رح، نظام حاجی غریب یمنی رح، خواجہ بہاء الدین نقشبندی رح، خواجہ گیسو دراز رح، شیخ عبد الحق رودولوی رح عبد القدوس گنگوہی رح، اشرف جہانگیر سمنانی رح، حضرت مجدد الف ثانی رح اور حضرت شاہ ولی اللہ رح کی کتابوں کا مریدانہ اعتقاد سے مطالعہ کیا، غزل گوئی میں نکاتی، ابو الفرج رونی، شہاب الدین بدایونی، امین الدین سنائی، امیر خسرو، میر حسن، فیضی، شکیبی، نظیری، حیاتی گیلانی، اور انہی سے متاثر تھے، اور فلسفیانہ حقایق و دقایق کے لئے مہابیر، گوتم بودھ، گرونانک، کبیر داس، گرو گوبند سنگھ، جیسانہ، تلسی داس، سور داس، اور رام موہن رائے کے رہین منت رہے۔ شاید میرے اس دعوی سے بعض اصحاب علم کے زیر لب مسکراہٹ آجائے۔ مگر کیوں؟ محض اس لئے کہ مذکورہ بالا افراد ٹھیٹھ ہندوستانی ہیں، اور علامہ موصوف کے گنائے ہوئے اکابر سے زیادہ وزنی اور مقتدر نہیں؟

گستاخی نہ ہوتی تو یہ ضرور کہتا کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامۂ بہاری نے زیر نظر رسالہ یا تو آرہ کے کلکٹری آفس میں بیٹھ کر یا کچہری سے فوراً آکر، یا رات کے آخری حصہ میں اونگھ اونگھ کر لکھا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ خاقانی کو صوفی شاعر، ابو العلا معری کو فارسی زبان کا بلند پایہ شاعر، اور اسپنوزا کو یونان کا فلسفی نہ کہتے، حتی کہ قرآن مجید کے الفاظ بھی صحیح نہیں لکھ سکے، "ظل منضود" (ص۴۶) کے کیا معنی ہوئے، جس آیت کا ٹکڑا علامہ عصر نقل کرنا چاہتے ہیں، وہاں "طلح منضود" اور "ظل ممدود" مذکور ہے، اسی طرح علامہ موصوف نے "مئات الفروق"، (ص۱۱) کے معنی "سیکڑوں برس کا فرق" لکھ دیا ہے،

پھر معلوم نہیں علامہ بہاری نے اس کا التزام کیوں رکھا ہے کہ ایک پیرا دوسرا پیرا کے مطالب و معانی سے ملنے نہ پائے، شروع سے آخر تک ایسے جملے بکثرت ملیں گے جن میں تسلسل بالکل قایم نہ رہ سکا ہے، قابل اصلاح جملے تو بکثرت ہیں، مثلاً

"اقبال نے پوری نظم بڑے جوش و خروش میں کہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات کا سیلاب ان کی پوری ہستی کو اپنے اندر جذب کر چکا ہے"

سیلاب بہائے جاتا ہے یا جذب کرتا ہے؟ یا ممکن ہے کہ فرو تاغورس نے جذب کرنا ہی لکھا ہو، ؟

" اقبال نے اُن مسائل پر بھی شعر کہے ہیں جن کا تعلق نہ تو ان کے وطن ہند سے ہے اور نہ ان کی مذہب اسلام سے، اس سلسلہ میں انہوں نے جو نظمیں کہی ہیں وہ زیادہ تر ضرب کلیم میں پائی جاتی ہیں "

اس قسم کے غیر فصیح جملوں کا تو انبار ہے ،

" اقبال فلسفی ہیں، انہوں نے یورپ جاکر باضابطہ اس کی تکمیل کی، اور " ڈکتور فلسفہ " کی ڈگری لائے، انگریزی زبان میں آپ کی کتاب " ایران میں علم مابعد الطبیعہ کی ترقی " بہت مشہور ہو چکی ہے، آپ کی شاعری پر بھی فلسفہ کا گہرا اثر ہے "

علامہ بہاری ان جملوں کی شتر گربگی خود ملاحظہ فرمالیں، صرف توجہ مبذول کرانے کی ضرورت ہے ۔

"زندگی اور موت ایسے مسائل ہیں جن پر فلسفہ نے بہت کچھ پر افشانیاں کی ہیں ، زندگی اور موت کے متعلق فلاسفہ کے مختلف نظریے ہیں "

" پر افشانیاں " اور زندگی اور موت کی تکرار سمجھ میں نہ آئی ،

" دوسرے لوگ اس کی مادیت اور لا مذہبیت کی گہرائی سے کانپتے تھے "

گہرائی سے کانپنا شاید اسپنوزا سے مستعار لیا ہو ؟

" وہ مرغ زریں بنے خانقاہ میں جلوہ فروش رہا کرتے ہیں "

دیا غورس کے محاورہ میں شاید " جلوہ فروش رہنا " ہی ہو ،

" پوری غزل اقبال نے گہری معنویت اور بلندی انشا ، کے ساتھ ختم کی ہے "

فارسی اور اردو اضافتوں کی شتر گربگی معلوم نہیں علامہ بہاری نے کس مصلحت سے پسند کی ہے ،

" ان کے خیال میں نزاکت خیالی .... "

" نزاکت خیالی " شاید بدخیالی میں لکھا گیا ہو ،

" ہندوستان کے نوجوانوں میں ایک رسم سی چلی آتی ہے کہ فلسفہ پڑھا اور گمراہ ہی ہوئے "

" ہی " معلوم نہیں " کن جذبات کی اثر بیت " میں لکھا گیا ہے ؟

" اس کو خوشگوار بنانے کے لئے کوئی جسمانی قربانی یا سنجیدہ دوا دوش نہیں کر سکتے "

" سنجیدہ دوا دوش " سے نہ جانے کیا مراد ہے ؟

پھر موضوع الفاظ کے مہمل مجموعے کے " اجزاے ترکیبی " کی بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں ،

" اقبال کے یہاں عہد ظفر اور اس سے قبل کے اردو شعرا کی طرح شعر گوئی نفسیاتی ابتہاجیت کا نتیجہ نہیں "

" اردو میں غالب اور مومن ایسے شعراء گذرے ہیں جن کے یہاں شعر گوئی کی محرکات میں نفسیاتی ابتہاجیت اور تصوریت کے ساتھ احساس فریضہ بھی تھا ، اقبال کے کلام میں اسی نوع کی ترنم ریزیاں ہیں "

" زندگی کی حقیقت ایسی ہی ہے جیسے تاریکی میں ایک چنگاری کا جلوہ گریزپا "

" ہماری خوش قسمتی ہے کہ اقبال ہمارے دور کے شاعر ہیں اور شعور و ذوق کے لحاظ سے اسی عہد کے پیداوار ہیں ، بنابریں ہمیں ان کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالنے میں کچھ زیادہ وقت بھی نہیں، کیونکہ ظن و خیال کے مقابلہ میں ہمارے سامنے مشاہدات کی دنیا ہے "

" وہ اپنے استاد کی طرح شباب کی معصیت کوشاں اور ابیقورین ذوق کے ماتحت رنگ رلیاں

بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں "

" اسرار خودی اور پیغام مشرق میرے خیال میں یورپ کی تقلید کا نتیجہ ہیں، ان کتابوں میں تخلیقیت سے زیادہ میک ڈاؤگل کی اصطلاح میں تبعیت کا غلبہ ہے "

" مریدان وفاکیش کے نذرانے صوفی اور خواجہ صاحب کی کارگاہ تجارت قایم ہے "

" اقبال کا سیاسی نظریہ .... شتر بان نواز ہے "

" ایک شاعر کو مورد الزام بنانے سے زیادہ اہل دنیا کی پرورش تمنا قابل الزام ہے "

" (اقبال نے) جرمن شاعر شوپنہار کی طرح فلسفہ و شعر کے اختلاط سے ایک دل نواز ادب کی تخلیق کی "

"تخلیق" کے لفظی معنی اگر علامۂ ممدوح کو معلوم ہوتا تو اپنے دلنواز ادب میں یہ کفریات رائج نہ کرتے، علامۂ بہاری کو اپنے جواہر ریزے مثلاً آہنگ حیات، فخر و ابتہاج، دل فروشانہ آہنگ، جذبات کی اثرمیت، آمیزاز فکر و روح، تنقیح و تحلیل، طعن و اعتبار، غیر ماہرانہ تنقید، ولولہ ارادات کی کارفرمائیاں، تدین و تشرع، غیر مخلصانہ، اور حریفانہ شورش، مہبط انوار، ذوق و مرابطت، طبیعت کا تخلیقی رجحان، برفشانیاں، سنگین حقیقت، سکر و خمول، تشرو شیوع پر ناز ہوگا، مگر بے ادبی اور شوخی نہ ہوتی تو کہتا کہ ہم جیسے بد مذاق اور ادب و انشا سے نا آشنا ناظرین علامہ ممدوح کے بے مثل مقالہ کی تحریر کے لئے سنگریزے بلکہ روڑے اور کھپڑے سمجھتے ہیں،

علامۂ موصوف نے جابجا انگریزی الفاظ لکھنے میں بڑی فیاضی کی ہے، معلوم نہیں یہ فیاضی احساس برتری یا احساس کمتری کا نتیجہ ہے، اگر احساس برتری میں انگریزی الفاظ لکھے گئے ہیں تو مودبانہ گذارش ہے کہ Ancestor Worship, Intuition, Communal, Sense of Duty, Action; Idea, Conservative, Shades, originality وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کے اردو مترادف مجھ جیسا نالایق اور نا اہل بہاری بھی جانتا ہے، اور اگر اس احساس کمتری میں یہ الفاظ سپرد قلم کئے گئے ہیں کہ ناظرین ذہن نشیں کرلیں کہ علامۂ موصوف نے گو انگریزی میں صرف اسکول تک کی تعلیم پائی ہے، لیکن وہ ایسے تمام الفاظ سے بھی واقف ہیں جو عام طور سے پٹنہ یونیورسٹی کے بی اے - اور ایم - اے کے طلبہ جانتے ہیں تو ہم دعا گو ہیں کہ خدا کرے ناظرین کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں ہوجائے - آمین،

احساس برتری اور احساس کمتری کے ملے جلے جذبے میں علامہ ممدوح کے ادب شناس قلم نے جو گہر افشانیاں بلکہ پر افشانیاں کی ہیں، وہ بھی ملاحظہ ہوں،

" قایم کے نزدیک عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں ریختہ کو بہت زیادہ رواج ہوا - مولانا عبد الحق صاحب کو اس پر اعتراض ہے .... مگر عبد الحق صاحب کا اعتراض بے محل ہے "

" دور اول کے متعلق ان کی (یعنی محمد حسین) کی رائے بالکل ساقط الاعتبار ہے "

" میر حسن جیسا نقاد اور سخن شناس قایم چاندپوری کو طالب آملی کا ہم رنگ بتاتا ہے جو بالکل بے جوڑ سی بات ہے "

" یہاں ہمیں اقبال سے اختلاف ہے، انھوں نے صوفیا کے والہانہ انداز میں عقل کو حضور کے منافی سمجھا، اور فلسفہ چونکہ عقل ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، اس لئے حقیقتاً فلسفہ نام ہے زندگی سے دوری کا، درانحالیکہ فلسفہ طرازیوں ہی نے اقبال کو ایک غیر فانی زندگی بخشی "

" شیخ عبد القادر .... کے اس بیان پر بے اختیار ہنسی آگئی، اور صفیر و شاد کی اُستادی شاگردی اس کی نزاع و مناقشہ کا منظر اور اس کی نوعیت و رکاکت کا نقشہ سامنے آگیا، حقیقت یہ ہے کہ علم حاصل کرنا دوسری چیز ہے، اور ذوق تنقید بالکل دوسری شے ہے، یہ قدرت کا محض عطیہ ہے، جس کو مل جائے، ....

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ علم و معارف کے حاصل ہونے کے باوجود بعض اوقات انسان کے اندر ستم ظریفانہ اپچ کیوں پیدا ہو جاتی ہے ؟"

راقم السطور بھی علامۂ ممدوح بہاری سے یہی سوال کرتا ہے ، امید ہے کہ اس کا جواب دیکر ہم جیسے نا اہل نقاد کو بھی مستفیض فرمائیں گے ، ہم جیسے "علم و معارف" سے بے بہرہ ناظرین علامۂ ممدوح کے رسالہ "اقبال کی شاعری" کو بار بار پڑھتے ہیں اور اپنے "اہتزاز فکر" سے سمجھنے کی حتی الوسع کوشش کرتے ہیں کہ یہ رسالہ اقبال کی شاعری کی مخالفت یا حمایت میں لکھا گیا ہے ، اس رسالہ کو پڑھنے کے بعد ہم اپنی "قلت بصیرت" سے اقبال کو جو سمجھتے ہیں وہ علامہ ممدوح کے الفاظ میں از سر نو ترتیب دیتے ہیں :

(۱) اقبال کی شاعری میں اردو شاعری کے قدیم عناصر ہیں (ص ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴)

(۲) اقبال حالی اسکول کی پیداوار ہیں ، (ص ۱۰)

(۳) اقبال یقیناً حالی ، اسمٰعیل میرٹھی اور اکبر الہ آبادی کے تاثرات سے بڑی حد تک اثر پذیر ہیں ، (ص ۱۰)

(۴) اقبال سنائی ، عطار ، رومی ، خاقانی ، حافظ ، صائب ، طالب آملی ، نظامی ، بیدل ، لانگ فیلو ، ورڈسورتھ ، کیٹس ، گوئٹے ، سپنوزا ، افلاطون ، نطشہ ، شوپنہار ، ہیگل ، برگساں ، ابن عربی ، وغیرہ وغیرہ سے متاثر تھے ، (ص ۱۲ ص ۱۳ ص ۱۶ ص ۱۸ ص ۲۵ ص ۹۴) گویا انہوں نے اپنی طرف سے کوئی نئی چیز پیش نہ کی ، اور وہ بیچ میل شاعر اور فلسفی تھے ،

(۵) اقبال شاعر ہیں میر و ضیا کی طرح (ص ۵۷)

(۶) اقبال کی اسرار خودی اور پیام مشرق یورپ کی تقلید کا نتیجہ ہیں (ص ۴۵)

(۷) اقبال جب اسلامیاتی شاعری پر اترتے ہیں تو ان کے اندر ایک سخت قسم کا فرقہ وارانہ رجحان پیدا ہو جاتا ہے جس کو ہم شعر نہیں کہہ سکتے ، (ص ۲۸)

(۸) بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اقبال کی اسلامیات پرستی نے ان کو قدامت پرست بنا دیا ہے ، ناقدوں کا یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے ، (ص ۵۱)

(۹) اقبال فلسفہ ، شعر اور تصوف کے امتزاج سے کچھ عجیب چیز بن گئے ہیں ، میری رائے ہے جوش کے کلام میں اقبال سے زیادہ ادب و انشا کی شگفتگی ہے ، (ص ۳۴)

(۱۰) اقبال عملی دنیا میں اس قدر تن آسان اور عافیت کوش ہیں کہ ان کو حق و باطل میں کوئی تمیز ہی نہیں ، اقبال کے اس تضاد فکر و عمل پر حامیان آزادی نے خوب خوب پھبتیاں اڑائی ہیں (ص ۵۷)

(۱۱) اقبال کو ڈاکٹر نکلس نے فلسفہ اور تصوف کی طرف متوجہ کیا ، (ص ۲۷)

(۱۲) اقبال کے کلام کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ایک نقاد ادب اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ان کے یہاں ادب و انشا کی خامیاں ضرور ہیں ، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا وطن مرکز زبان سے بہت دور سیالکوٹ میں واقع ہوا ہے ، اس لئے ان کی روزمرہ کی زبان میں ادب و انشاء کے غیر ارادی محاسن کی جلوہ ریزیاں نہیں پائی جاتی ہیں ، یہی سبب ہے کہ ان کی تحریروں میں بعض جگہ زبان کی خامیاں ہیں ، (ص ۶۴)

(۱۴) ہندوستان کے لوگوں کو خوش ہونا چاہیئے کہ اقبال کا صحیح جانشین شاعر ہے ، (ص ۶۵)

(۱۵) وطنی ماحول اور مرکزیت زبان کے لحاظ سے جوش اقبال سے آگے ہیں ، اور وہ زمانہ بہت جلد آئیگا جب کہ جوش کا کلام اقبال سے بھی زیادہ سنگین حقیقت اور معنویت کا حامل ہوگا کیونکہ جوش کے کلام میں شگفتگی و نشاط اب بھی اقبال سے زیادہ ہے (صفحہ ۶۵)

(۱۶) پنجاب کے ارباب علم "اقبال کی شاعری کے اجزائے ترکیبی" کی اس "تنقیح و تحلیل" کے بعد معلوم نہیں کیا رائے قائم کریں گے ، ابھی حال ہی میں بہار کے اہل قلم نے "سکر و خمول" سے نکل کر صوبہ کے "علمی جمود و تعطل" کو دور کرنے کے جذبہ سے راجگیر کے ایک پرچہ میں اقبال پر ایک تنقیدی مضمون لکھا تھا ، اس کا جواب احسان لاہور نے اپنی ایک اشاعت میں "راجگیر کے ادبی گھسیارے" کے

عنوان سے دیا تھا، سُرخی پڑھکر ہنسی تو آئی مگر بہاری ہونے کی حیثیت سے آنکھیں شرم سے جُھک گئیں۔ اب خوف یہ ہے کہ پنجاب والے ہمارے علامہ بہاری کے مذکورہ بالا "علمی شہ پارے" کے غموض و دقایق کو تو سمجھ نہ سکیں گے، پھر نہ جانے مولانا کے علم و معارف اور اس ذوق تنقید پر جو قدرت سے ان کو "محض عطیہ" ملا ہے، کون کون سی سُرخیاں قایم کر کے نقد و تبصرہ کرنے کی کوشش کریں گے، مگر وہ اس مقالہ پر خواہ کچھ بھی لکھیں، مگر ہم بہاری ہونے کی حیثیت سے علامہ بہاری کو یقین دلاتے ہیں کہ پنجاب والوں کی تنقید و تنقیص سے متاثر ہونے کے بجائے ان کے "بے مثل مقالہ" کو بار بار پڑھیں گے، کیونکہ ان ہی کے عالمانہ اونچ کے ذریعہ سے نہ صرف "بہار کا ادب و اشعار منظر عام پر" (ص۶۶) آرہا ہے، بلکہ حدیث و انساب، شعر و ادب، تاریخ و تنقید، فلسفہ و تصوف، نجوم و مصوری، ریاضی و موسیقی، لسانیات و نفسیات، کیمیا و طبعیات، عقلیات و احشائیات، مفلیات و عضویات، عصبیات و عروقیات پر علامہ موصوف کے محققانہ اور مبسوط مباحث سے ہم جیسے گمنام اور زاویہ نشین بہاری مستفید اور متمتع ہو رہے ہیں،

غالب کی خودداری

از جناب سید علی حیدر صاحب حسنین منزل گیا

مرحوم عبدالرحمن بجنوری آج بھی زندہ ہیں تو اپنی معرکۃ الآرا تحریر "محاسن کلام غالب" سے۔ لیکن کسی نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ کلام غالب کو ہمیشگی اور قبولیت عام بخشنے والی یہی تحریر تھی؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب غالب خود فرما گئے تھے ؎

غالب اگر فن سخن دیں بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

اور یہ بھی فرمایا تھا کہ ؎

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

مولانا حالی نے "یادگار غالب" لکھ کر حق شاگردی ادا کر دیا تھا۔ مگر انگریزی داں طبقہ اور کالج اور مدارس کے طلبا و اساتذہ نے کلام غالب کی قدر "محاسن کلام غالب" ہی پڑھ کر زیادت محسوس کی۔ بجنوری مرحوم نے غالب کو اتنا اونچا اچھالا کہ بعد والوں کو بہت دنوں تک صرف وہی کچھ نظر آتا رہا جس کی طرف بجنوری مرحوم اشارہ کر چکے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ جہاں بجنوری مرحوم نے جگنو دکھلایا تھا وہاں یاروں نے تاروں و سیاروں کا پتہ لگایا۔ پھر تو چودھویں کا چاند، دوپہر کا آفتاب بننے کیا دیر لگتی تھی۔ اس طرح ہندوستان کی روایتی "دیوتا پوجن" تو ہو گئی مگر غالب خود اپنے ہی اس شعر کا ہیولہ بن کر رہ گئے ؎

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن
دست مرہون حنا رخسار رہن غازہ تھا

اس کا ردعمل ضروری تھا چنانچہ ہو کر رہا۔ ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جس کی رہنمائی کے لئے غالب کے زمانہ ہی میں یہ ہدالشعرا منقار جنگ پیدا ہو چکے تھے۔ خلاصہ یہ کہ اس نقار خانہ میں ضرب المثل "طوطی" کی آواز بھی بلند ہوئی کہ اس افراتفری کے بارہ میں غور و فکر کی دعوت دی جا سکے۔ غالب کے فلسفی ہونے سے انکار نہیں اور بھی جتنی خوبیاں انکی بتائی جاتی ہیں سب کا اقرار ہے لیکن میں غالب کی اس خصوصیت کو پیش کرنا چاہتا ہوں جو انکو اور شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبان کی شاعری چونکہ شاہی درباروں اور امرا کے محلات کی پیداوار ہے۔ اس لئے شعرا میں "خودداری" کی تلاش ہی بیکار ہے۔ لیکن غالب کا فارسی کلام ہو یا اردو دونوں میں یہ خاص چیز یعنی "خودداری" پورے طور پر جا بجا پائیں گے۔ یہ زمانہ کا ستایا ہوا اکثر پیسے پیسے کو محتاج مگر غیرت مند شاعر کس طرح نازک سے نازک موقعہ پر بھی نہیں چوکا اور اپنے کو لئے دئے آن بان سے گذر گیا۔ آئیے میں آپ کو چند مثالیں دے کر بتلاؤں۔

(۱)

موقعہ یہ ہے کہ غالب کی پنشن بند ہو چکی ہے۔ بھائی دیوانہ ہو گیا ہے۔ نہایت سخت پریشانی کی حالت میں دہلی سے کلکتہ چلے ہیں راستے میں لکھنؤ پڑا اس وقت نصیر الدین حیدر اودھ کے بادشاہ تھے۔ مگر دربار مغلیہ میں انکی حیثیت ایک وزیر یا صوبہ دار سے زیادہ نہ مانی جاتی تھی اور جناب غالب "نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ" مصاحب و استاد شہنشاہ ہندوستان ہونے کے دعویدار تھے۔ اس پر بھی بڑی امید کے ساتھ شاہ اودھ کی شان میں وہ لاجواب قصیدہ لکھا جس کا جواب سوائے عرفی شیرازی کے اور کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ یہ غالب ہی کا کام تھا کہ شاہ اودھ کے روبرو مدح و ثنا کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ گئے ؎

نیستم مبرم و بر طبع گرانی نکنم
از تو فرمان عطا وز روے احساں رفتم

نازپرورده خلوت گہ آزادگیم
کافرم گر بہ سرا پردۂ سلطاں رفتم

صید جو نیستم و شعر فروشی نکنم
راہ مدح تو بسر گر نئے ایماں رفتم

من ہم از خیل کریمانم و خجلت نہ بود
گر بدریوزہ بدرگاہ کریماں رفتم

آمدم بر درِ گنجور علی مدح سرائے
نہ بدرکوئی گنجینۂ خاقاں رفتم

مدحت نائبِ مہدی ز محبت باشد
شادمانم کہ بہنجار محباں رفتم

اب ملاحظہ فرمائیے کہ افلاس نے تو یہاں تک نوبت پہونچادی کہ کھلے بندوں سوال کے سوا چارہ نظر نہیں آیا۔ مگر اس پر بھی کہا تو یہی کہا کہ بارِ خاطر ہونا نہیں چاہتا۔ آزادگی کی خلوت نازکا پروردہ ہو کر اگر بار پر دہ سلطانی سمجھ کر آیا ہوں تو کافر۔ صلہ نہیں چاہتا۔ شعر فروشی نہیں کرتا بلکہ محض ایمان کا مقتضا تھا جو آپ کی تعریف کی۔ میں بھی بے منت بخشش کرنے والوں کا نام لیوا ہوں لہذا آپ کو بھی ایسا ہی سمجھ کر اگر آپ سے طالب امداد ہوا تو اس میں شرم کی کوئی بات نہیں جب آپ مولائے علی کے خزانچی ٹھہرے تو آپ سے مدد چاہنی کسی دنیاوی شاہی خزانے کی زنجیر ہلانے کے مرادف نہیں ہوسکتی! نائب مہدی کی مدح محض بربنائے محبت ہوسکتی ہے۔ لہذا خوش ہوں کہ میری حاضری از راہ دوستی ہے۔

کیا اس کے بعد بھی غالب کی خودداری پر شک ہوسکتا ہے؟

(۲)

آئیے ایک واقعہ اور آپ کو سناتا ہوں متقدمین میں سے کسی سے مضمون لڑگیا۔ مخالفوں کو نظر انداز کیجئے۔ احباب درمغز دل نے اسکو توارد سے تعبیر کیا۔ جناب غالب اسکو بھی برداشت نہ کرسکے۔ اور اپنے ندرت آفرین تخیل سے شاعر متقدم کو "دزدِ متاعِ خویش" بنا چھوڑا۔ فرماتے ہیں ؎

مبر گمانِ توارد یقین شناس کہ دزد
متاعِ من ز نہاں خانۂ ازل برداشت

(۳)

انتہا یہ ہے کہ حضور خداوند جلیل بوجب مناجات عرض کرتے ہیں تو وہاں بھی نہیں چوکتے۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

دگر ہم چنیں ست فرجام کار
کہ می باید از کردہ راندن شمار

مرا نیز یارائے گفتار دہ
چو گویم بر آں گفتہ زنہار دہ

درین خستگی پوزش از من مجوئے
بود سندہ خستہ گستاخ گوئے

دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود
چو ناگفتہ داں نہ گفتن چہ سود

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم
پرستارِ خورشید و آذر نیم

نہ کشتم کسے را بہ اہریمنے
نہ بردم ز کس مایہ در رہزنی

مگر مے کہ آتش بگورم از وست
بہ ہنگامہ پرواز مورم از وست

من اندوہ گیں و مے اندہ ربائے
چہ می کردم اے بندہ پرور خدائے

حساب مے و رامش و رنگ و بوئے
ز جمشید و بہرام و پرویز جوئے

کہ از بادہ تا چہرہ افروختند
دلِ دشمن و چشم بدسوختند

نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ
بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ

نہ بستاں سرائے نہ میخانۂ
نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ

نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط
نہ غوغائے رامش گراں در رباط

شب انگہ بہ مے رہ نمونم شدے
سحر گہ طلبگار خونم شدے

تمنائے معشوق و بادہ نوش
تقاضائے بیہودہ ہائے فروش

چہ گویم چوں ہنگام گفتن گذشت
ز عمرِ گراں مایہ بر من گذشت

بسا روزگاں بدل دادگی!
بسا نوبہاراں بہ بے بادگی!

بسا روز باران و شب ہائے ماہ
کہ بود است بے مے بہ چشم سیاہ

افقہا پر از ابر بہمن بہی
سفالینہ جام من از مے تہی

بہاران و من در غم برگ و ساز
در خانہ از بے نوائی فراز

جہان از گل و لالہ پر بوئے و رنگ
من و حجرہ و دامنے زیر سنگ

دم عیش جز رقص بسمل نہ بود
بہ اندازہ خواہش دل نبود

اگر تافتم رشتہ گوہر شکست
وگر یافتم بادہ ساغر شکست

چہ خواہی ز دلق مے آلود من
ببیں چشم خمیازہ فرسود من!

ز بالیدگیہا بہارم گذشت
ز مے بگذرم روزگارم گذشت

نیا ساز گاری ز ہمسایگاں
بہ سرمایہ جوئی ز ہم پایگان

سر از منت ناکساں زیر خاک
لب از خاک بوس خساں چاک چاک

بگیتی درم بے نوا داشتے
دلم را اسیر ہوا داشتے

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد
بہ ہر بار زنبیل بارم دہد

کہ چوں بیل زاں جا برانگیزمے
زرش بر گدایاں فرو ریزمے

نہ نازک نگارے کہ نازش کشم
بہ ہر بوسہ زلف درازش کشم

چو زاں غمزہ نیشے بدل خوردمے
رگ جاں غم نوک نشتر خوردمے

بدآں عمر ناخوش کہ می داشتم
ز جاں خار در پیرہن داشتم

چو دل زیں ہوسہا بہ جوش آمدے
ز دل بانگ خونم بہ گوش آمدے

ہنوزم ہماں دل بہ جوش اندر است
ز دل بانگ خونم بہ گوش اندر است

چو آں نامرادی بہ یاد آیدم
بہ فردوس ہم دل نیاسایدم

دلے را کہ حسرت کشید بہ باغ
در آتش چہ سوزی بہ سوزندہ داغ

صبوحی خورم گر شراب طہور
کجا زہرہ صبح و جام بلور

دم شب روی ہائے مستانہ کو
بہ ہنگامہ غوغائے مستانہ کو

درآں پاک میخانہ بے خروش
چہ گنجائے شورش نائے و نوش

سیہ مستی ابر و باراں کجا
خزاں چوں نباشد بہاراں کجا

اگر حور در دل خیالش کہ چہ
غم ہجر و ذوق وصالش کہ چہ

چہ منت نہد ناشناسا نگار
چہ لذت دہد وصل بے انتظار

گریزد دوم بوسہ اینش کجا
فریبد بہ سوگند دینش کجا

برد حکم و نبود لبش تلخ گوئے
دہد کام و نبود دلش کام جوئے

نظر بازی و ذوق دیدار کو
بفردوس روزن بہ دیوار کو

نہ چشم آرزومند دلالۂ
نہ دل تشنہ ماہ پرکالہ کو

ازیں ہا کہ پیوستہ می خواست دل
ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل

چو پرسش رقیبے را بکاود ز دل
دو صد دجلہ خونم تراود ز دل

بہ ہر جرم کز روئے دفتر رسد
ز من حسرتے در برابر رسد

بہ فرمائے کایں داوری چوں بود
کہ از جرم من حسرت افزوں بود

هرآئینہ ہم چوں منے را بہ بند — تلافی فراخور بود نے گزند
بدیں مویہ در روز امید و بیم — بگریم بہ آئساں کہ عرش عظیم
شود از تو سیلاب آچارہ جوئے — تو بخشی بداں گریہ ام آبروئے
وگر خون حسرت ہدر کردۂ — زیاد آتشش قطع نظر کردۂ
گذشتم ز حسرت امیدیم ہست — سفید آبروئے سفیدیم ہست
کہ البتہ ایں رند ناپارسا — کج اندیشہ گبر مسلماں نما
پرستار فرخندہ منشور تست — ہوادار فرزانہ دستور تست
بہ بند امید استواری فرست — بہ غالب خط رستگاری فرست

غور فرمائیے کیا کیا کہہ گئے اور کس کس پیرائے سے کہہ گئے۔ شراب نوشی کا اقرار ہی نہیں بلکہ اس کا جواز اپنے ایک شعر میں کس طرح بیان کرکے رحم و کرم ستار عیوب کو مخاطب کیا ہے ؎

من اندوہ گیں و مے اندہ ربائے — چہ می کردم اے بندہ پرور خدائے

پھر اس پر زور دیتے ہیں کہ "جمشید و بہرام و پرویز" کی طرح عیش کوشی کے لئے شراب تھوڑا ہی پی تھی۔ یہاں وہ ساز و سامان ہی میسر کہاں تھا؟ یہ تو محض "غم غلط" کرنے کی سبیل تھی۔ کیونکہ حال تو یہ رہا کہ ؎

بہ آں عمر ناخوش کہ من داشتم — ز جاں خار در پیرہن داشتم

یعنی جسم کو اگر ایک ملبوس تصور کیا جائے تو اس جامے میں جان یوں تھی جیسے کسی کپڑے میں کوئی کانٹا پیوست ہو کر رہ گیا ہو۔ جنت کی ہجو ملیح۔ اس ماحول کی دل کو گھبرا دینے والی یکسانی۔ حوروں کا جذبات سے عاری ہونا۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے صرف زور قلم دکھانے کی غرض سے نہیں ہے بلکہ دنیا میں "تحریک معاصی" کے موثر ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ نظر سے اوجھل جنت جو عیش و عشرت کی آخری تخئیل سمجھی جاتی ہے اس کے بالمقابل دنیا بالفاظ دیگر پیش منظر ماحول کس کس رخ سے زیادہ اثر انداز ہے۔ قدم قدم پر دعوت نگاہ و گوش اور طلب و تقاضائے نقد ہوش کی فراوانیوں میں انسان کھو جا سکتا ہے۔ چہ جائیکہ محروم و تشنہ رہنے پر بھی داد و ستد کے لئے پکڑا جائے ؟ ؎

بفرمائے کایں داوری چوں بود — کہ از جرم من حسرت افزوں بود

اسی عذر کو اردو میں اس سے بھی نادر پہلو سے پیش کرتے ہیں ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اس مثنوی "گہربار" کا ایک شعر ہے کہ ؎

بہر جرم کز روئے دفتر رسد — ز من حسرتے در برابر رسد

اس مضمون کو اردو میں یوں ادا کیا ہے ؎

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ممکن ہے احباب فرمائیں کہ اس مثنوی میں سوائے گستاخی اور ڈھٹائی کے کیا دھرا ہے تو ایسے حضرات کی توجہ کا انعطاف غالب کے دو شعروں کی طرف چاہتا ہوں۔ جن میں اونھوں نے اس "گستاخی و بے باکی" کا فلسفہ اپنی خودداری قائم رکھتے ہوئے بیان کر دیا ہے

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
جب کرم رخصت گستاخی و بیباکی دے — کوئی تقصیر بجز خجلت تقصیر نہیں

ہر چند کاربار عالم اثر پذیر مصالح ایزدی ہیں۔ مگر انسان پر اس حیات ظاہری میں جو کچھ گذر رہا ہے وہ بسا اوقات اس کے ایمان کو متزلزل کئے بغیر نہیں رہتا۔ کشمکش حیات میں پڑنے والے جانتے ہیں اور تلخ کامان زندگی مانتے ہیں کہ تقسیم نعمائے الہی بظاہر کسی اصول کی پابند نہیں ہے۔ بقولے ؎

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال — کہ آگ لانے کو جائیں پیمبری مل جائے

"ن" کا منظر
باوجود اس کے پروانہ شمع طور بننے کی خواہش کی کوئی روک تھام نہیں ہے۔ اس "جذبہ بے اختیار شوق" کا رد عمل کیا کچھ نہیں ہو سکتا ہے بعور

غم ناامیدی من نگر آں زماں بدانی — کہ بروں ز باغ آئی و گلے نہ چیدہ باشی

غالب دعوت دیتے ہیں کہ ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

بات میں بات نکل آتی ہے۔ اسی شعر کو لیجئے۔ طور اور موسیٰ کے تلازمہ کے ساتھ داد سخن گوئی ہر شاعر دیتا آیا ہے مگر یا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بزرگ داشت سے قطع نظر کی یا پھر سپر افگنی اور پسپائی۔ برخلاف اس کے غالب نے بھی کہا سب ہی کچھ مگر نہ خودداری ہاتھ سے جانے دی نہ حضرت موسیٰ کا بظاہر کہیں نام بھی آنے دیا۔ اسی کو کہا ہے الکنایۃ ابلغ من الاشارہ۔ کہ میرا یہ غرض نہیں ہے کہ کلام غالب ہر قسم کی لغزشوں سے پاک ہے۔ مگر جس حمام میں سب ننگے نظر آئیں وہاں کسی موقعہ پر بھی کوئی ستر چھپائے ہو تو اسکی داد دینی چاہیئے۔

اب مثنوی گہربار کے اس شعر پر غور فرمایئے ؎

دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود — چو ناگفتہ دانی نہ گفتن چہ سود

انسان مجبور ہے۔ واردات و ماحول کا اثر دل و دماغ پر مترتب ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ خود فروش زاہدان ریاکار چاہے انکار کریں لیکن شاعر تلخ سے تلخ حقیقت بھی بیان کر دیتا ہے۔ خدا کے حضور "دل از غصہ خوں شد" کے اظہار کی اس سے زیادہ اور کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے کہ۔ ع۔ چو ناگفتہ دانی نہ گفتن چہ سود؟ دوسرا خوبصورت پہلو یہ بھی ہے کہ دل میں رکھ کر اس جذبہ کی پرورش سے یقینی یہ بہتر ہے کہ جلی کٹی سنا کر جذبہ قابل گرفت کو ہلکا کر لیا جائے اس بارہ میں غالب ایک خاص "مذہب" رکھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:- ؎

ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ — جس کے جلوہ سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

اب "خودداری" کے چند شواہد اردو فارسی کلام غالب سے مختصراً عرض کئے جاتے ہیں۔ اہل ذوق لطف اندوز ہوں۔

(۴)

اپنی باتوں کی طرف خلق کی ناتوجہی سے شاعر کو اپنی ذلت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے اظہار سے "خودداری" باز رکھنا چاہتی ہے۔ مگر غالب ندرت آفریں نہ تو واقعہ کو چھپاتے ہیں نہ خودداری کا خون کرتے ہیں۔ ؎

محرم راز نہاں روزگارم کردہ اند — تا بجرم گوش ننہد خلق خوارم کردہ اند

(۵)

اصول تواضع کے سمجھنے میں عموماً غلطی ہوا کرتی ہے۔ ع۔ نہد شاخ پر میوہ سر بر زمیں۔ صحیح سہی مگر۔ ع۔ ہر سخن جائے و ہر نکتہ مقامے دارد۔ عاشق کی معراج ہے تیغ نیم باز پر قربان ہو جانا۔ گرچہ عرفی کو اس انتہا پر پہونچکر ابتدا نظر آئی ہے بقولہ۔ ع۔ شہادت ابتدائی جنگ عشق است۔ بہرکیف عامۃ الورود تخئیل یہی ہے چنانچہ خود غالب ایک غزل میں یوں بھی فرما چکے ہیں کہ ؎

شہادت تھی مری قسمت میں۔ جو دی تھی یہ خو مجھکو — جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

مگر معلوم ہوتا ہے کہ جب تنبہ ہوا تو تواضع کے اصول معیار کو درست کرنے کے لئے کہا ؎

تواضعے نہ کنم بے تواضعے غالب — بسا بہ خم تیغش خمیدہ ام بنگر

دیکھا آپ نے تیغ کو جھکا ہوا (خم) دیکھ لیا تب سر جھکایا ہے۔ چنانچہ سیدھے سپاٹ ہاتھ سے گردن کٹنے کو ذلت کا ثبوت بتلاتے ہیں ؎

چہ ناکس شمرد آنکہ می کشت مارا — بہ تیغے کہ ترکیب او خم ندارد

(۶)

کسی موقعہ پر معشوق صاحب رقیب کی طرف آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہوں اور غریب عاشق کی طرف ع۔ وہ اک نگہ کہ بظاہر

نگاہ سے کم ہے۔ یہی دریغ رکھتے ہوں۔ تو کہیئے غیرت مند عاشق اس حالت میں خاک خودداری کا لحاظ رکھ سکتا ہے؟ مگر اس سخت جاں غالب سے یہ امید نہ رکھیئے کہ وہ عام شاعروں کی طرح بلبلا اٹھے گا۔ اس موقعہ کے صرف دو شعر سن لیجئے ؎

میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا   تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز

کہہ تو ڈالا "مژہ ہائے دراز" مگر غور فرمایئے تو "مژہ" نے حسن کو برما یا جائے۔ وہ قریب ثابت ہوتا ہے یا جو "تیز تیز" نظروں کے وار پر لیا جائے؟ یہی غالب کا اصلی رنگ ہے۔ جو اردو میں بہ تکلف ادا ہوا ہے۔ مگر اسی کو فارسی میں کتنا صاف صاف منظم کرتے ہیں ؎

از و باور ندارد دعوئ ذوق شہادت را   نگاہش با رقیب و خاطرش با ماست۔ پنداری!

(۷)

غالب کے ایک شعر کے متعلق عجیب غلط فہمی ہوری ہے۔ بظاہر وہ "خودداری" کے بالکل منافی معلوم ہوتا ہے اگر محض لفظی معنی کے اعتبار سے دیکھا جائے۔ لیکن معاملہ بالکل برعکس ہے۔ جس طرح واسوخت میں فرضی دوسرا معشوق کھڑا کرکے اصلی "منظور نظر" کو جلی کٹی سنائی جاتی ہے۔ درانحالیکہ منقوش خاطر ہوتی ہے صفائی اور تعلقات کی بہتری۔ بعض اشعار غالب نے بھی اسی طرز کے لکھے ہیں۔ پہلے شعر زیر بحث کو سن لیجئے پھر دوسرے اشعار اپنے بیان کے ثبوت میں پیش کرونگا۔ وہ شعر جس پر منافی خودداری ہونے کا اعتراض وارد ہوتا ہے وہ یہ ہے ؎

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں   تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

ایک مطلب تو اس کا یہ ہو سکتا ہے کہ جس کو غالب ہی دوسرے موقعہ پر فرما چکے ہیں کہ ؎

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر   آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

لیکن اگر اس سے تشفی نہ ہو تو یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ وہ ایک شعر میں "واسوخت" لکھ رہے ہیں۔ طبیعت کی بذلہ سنجی نے اس قسم کے شعر لکھنے پر انکو بارہا مجبور کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

(۱) طاق شد طاقت ز عشقت بر گراں خواہم شدن   مہرباں شو ورنہ بر خود مہرباں خواہم شدن

(۲) من آں نیم کہ دگر میتواں فریفت مرا   فریبمش کہ مگر میتواں فریفت مرا

(۳) خدا را اے بتاں گرد دلش گردیدنی دارد   دریغا آبروئے دیر گر غالب مسلماں شد

(۴) گفتم ز شادی نبودم گنجیدن آساں در بغل   تنگم کشید از سادگی در وصل جاناں در بغل

(۵) ہمچنیں بیگانہ زی با من۔ دل و جاں کسے   بدگماں گردم اگر دانم کہ می دانی مرا

(۶) ایں سخن حق بود و گاہے بر زباں ما نہ رفت   چوں تو خود گفتی کہ خوباں را دل از خارا ست ہست

(۸)

معشوق مہ پیشہ کے جور و جفا نے مجبور کردیا ہے کہ "رحم۔ رحم" پکار اٹھیں۔ مگر۔ ع۔ اے یکیم از جماعہ اتراک۔ کہیں اس آسانی سے زیر ہوتے ہیں۔ کرتے تو ہیں وہی جو ایسے موقعہ پر ناگزیر ہے مگر اس طرح نہیں جیسا سب کرتے آئے ہیں۔ اس ترک کے پیتر سے ہی اور ہیں ؎

ہے دل شوریدۂ غالب طلسم پیچ و تاب   رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

دیکھ لیا آپ نے؟ اپنے پر رحم غالب کیوں چاہنے لگے؟ خدا ان کے دشمن کو نصیب نہ کرے!

(۹)

خودداری کی کوئی انتہا ہے۔ اپنی طرف سے کسی کی شہادت بھی پیش کرنا گوارا نہیں ؎

غالب آزادۂ موحد کیشم   بر پاکی خویشتن گواہ خویشم

اردو میں سہرے کی معذرت کے موقعہ پر کہتے ہیں ؎

جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر   سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

(۱۰)

حضرت حسن سنجری قدس سرہ کا ایک مقطع ہے جس پر آجتک خانقاہوں میں بقول غالب "چاکہا اتیاز جیب و پیرہن خواہد شدن" کا منظر پیش ہوا کرتا ہے۔

اے حسن بوسہ بپالیش زدن از بے ادبی ست　　پائے نازک نشود رنجہ ز بوسیدن من

کوئی اور پیش رو شاعر اس سے زیادہ قریب المعنی شعر کہتا ہے

تو بخواب ناز بودی و من از رقیب پنہاں　　کف پائت بوسہ دادم زحنا شنیدہ باشی

مگر اب یہ بھی دیکھ لیجئے کہ ایسے موقعہ پر غالب کے جذبات "گنجینۂ معنی کا طلسم" بنکر کس پیرائے میں ظاہر ہوتے ہیں

لے تو لوں سوتے میں اسکے پاؤں کا بوسہ مگر　　ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

مابہ الامتیاز اظہر من الشمس ہے!

(۱۱)

"ہوا میرے بعد" "جفا میرے بعد" کی مشہور طرح میں خدائے سخن میر تقی میر کے وقت سے اس وقت تک جتنے شعراء نے طبع آزمائی کی ہے ان کے کلام دستیاب ہو سکتے ہیں سب کو یکجا کیجئے۔ اور غالب کی پوری غزل اس زمین میں موجود ہے اس سے مقابلہ کیجئے "خودداری" ہی خصوصی امتیاز نظر آئے گی۔ مجھے صرف ایک مطلع کسی متقدم شاعر کا یاد ہے

اٹھ کے سجادہ نشین قیس ہوا میرے بعد　　نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد

مجھے اسی پر ندامت محسوس ہو رہی ہے کہ ایسے موقعہ پر جب غالب کی اسی زمین کی غزل کی طرف خیال کر چکا ہوں تو یہ مطلع یاد ہی کیوں آیا۔ غالبِ خوددار کی روح مجھے معاف کرے! غالب کی اس غزل کے چند شعر یہ ہیں:-

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد　　بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا!　　ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے　　شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر یعنی　　ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق　　ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی　　کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد
آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب!　　کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

(۱۲)

جہاں کہیں موقعہ پایا ہے معشوق کے حسن بےنظیر کی مدح سرائی کرتے ہوئے اپنے عشق ناگزیر کو بھی دست و گریبان کر لیا ہے جو بطور خود شاہکار خودداری ہے

از عشق و حسن ما و تو، با ہمدگر در گفتگو　　خسرو بمجنوں یکطرف شیریں بہ لیلیٰ یکطرف

(۱۳)

انتہائے خودداری ملاحظہ ہو کہ معشوق کے ہاتھوں قتل رقیب بھی گوارا نہیں رکھتے۔ وہ بھی اس طرح نہیں کہ۔ ع۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی۔ یا کہ۔ ع۔ رہے تو دست قاتل میں پہنچے تو میری گردن پر۔ بلکہ یہاں تو بات ہی کچھ اور آہنگ سے کہی جاتی ہے سنئے

سعی در مرگ رقیبان گرانجاں کردی　　می شناسم کہ چہ از ناز و ادا گشت تلف

(۱۴)

"وعدۂ فردا" پر جہاں تک میری نظر پہونچ سکی ہے کسی نے اظہار خوشنودی نہیں کیا ہے۔ بلکہ بیشتر عموماً احتجاج ہی ہوا کیا ہے جو

بجائے خود منافی خودداری ہے۔ چونکہ اس میں ردوبدل کا جب امکان ہی نہیں تو پھر۔ ع۔ بات بھی کھوئی التجا کرکے۔ "احتجاج فضول" کے سوا اور کیا ہے؟ غالب سے اسی موضوع پر بھی کچھ سن لیجئے ۔

مژدہ بادآں راکہ محو ذوق فردا کردہ   صدکشاد آں راکہ ہم امروز رخ بنمودہ

(۱۵)

کفر و اسلام کے امتیاز کو خودداری کے تحت کس طرح مٹاتے ہیں ملاحظہ فرمائیے ۔

گرز خود فروشیہائے دیں بخشش ز یزداں خوش نکرد   گو سند صنعا تو بہ کرد از کفر ناداں بندہ

ذرا "خود فروشی" کی ترکیب پر بھی نظر رہے !

(۱۶)

میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ "وفا" سے دور بھاگنے کا کوئی اعتراف کرنے والا ہے؟ شاعروں اور عاشقوں میں عملاً چاہے سب بیوفا ثابت ہو جائیں مگر اپنے منھ سے کوئی اقرار بیوفائی نہیں کرسکتا۔ چہ جائیکہ وفاداری کو منافی خودداری ثابت کرنے کے لئے کوئی آمادہ ہو۔ ع۔ ایں خیال ست و محال است و جنوں۔ لیکن حضرت غالب کس صفائی کے ساتھ غریب کوہکن کے سر پر "زہرۂ آہن گداز" تیشہ لگاتے ہیں۔ حضرت عشق پر بھی لگے ہاتھوں وار کئے بغیر نہیں رہتے ۔

عشق کا فرشغل جاں دادن بمزدور افگند   ننگ فرہادم بفرسنگ از وفا دور افگند

(۱۷)

کہاں تک خودداری کے لطائف و ظرائف بیان کئے جائیں۔ غالب کے اس شعر سے جس کو خودداری کا درس نہ ملتا ہو وہ اپنے فہم و ادراک کا ماتم کرے ۔

لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست   رند ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نبود

جس غزل کا یہ شعر ہے اس کا مطلع بھی خودداری کا آئینہ ہے ۔

ظرف فقیہ مئے نجست بادہ ما گزک نخواست   انچہ فلک نخواست است ہیچ کس از فلک نخواست

(۱۸)

اپنے قدرداں کی پذیرائی میں انسان کے لئے لازمہ بشری ہے کہ خودداری کی گرفت کو ڈھیلی ہو جانے دے۔ اسکو مستحسن بھی سمجھا جاتا ہے۔ غالب اس استحسان کو اسی حد تک پہونچا کر بھی خودداری برقرار رکھتے ہیں ۔

لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر   بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کیساتھ

(۱۹)

بس حد ہوگئی کہ "فاعتبروا یا اولی الابصار" کی تاثیر انفعال پر بھی حرف زن ہو کر رہی ۔

حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو   ہنگامہ زبونی ہمت ہے انفعال !

دوسری جگہ ذرا اس سے کم زور مگر خوب فرمایا ہے ۔

اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے   دیوار بار منت مزدور سے ہے خم

(۲۰)

اب ذیل میں چند متفرق اشعار پیش ہیں۔ جن میں غالب کی شان خودداری خود آشکارا ہے ۔

کاندر دلم گذشتن با یار ہمنشینی ست   یاد از عدو نیارم و آں ہم ز دور بینی ست

اما بشرط آنکہ ہماں صبحدم کشد   صہبا حلال زاہد خشک زندہ دار را

گر بموج افتد گماں چین پیشانی مرا   تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جاں دہم

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا

بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہم پر جفا سے ترک وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

رنج نومیدی جاوید گوارا رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کش تاثیر نہیں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اسی خیال کو فارسی میں دیکھئے کس طرح ادا کرتے ہیں ؎

بیس از عمرے کہ فرسودم بعشق پارسائیہا
گدا گفت و بمن تن در نداد از خود نمائیہا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

(۲۱)

میں نے جو آپ حضرات کو غالب کی خوددارانہ روش کی طرف توجہ دلائی ہے ۔ یہ بھی غالب غیور کو گوارا ہونا یقینی نہیں ہے اسلئے خود انکی زبان سے جو کچھ بطور معذرت عرض کرتا ہوں وہ اپنی جگہ خود ہی خودداری کا شاہکار ہے ؎

وکیل غالب خونیں دلم سفارش نیست
شکوہ تو زباں را مجاز می خواہم

ایک اعتراض اور اس کا ازالہ

غالب پر اعتراض کرنے والے یوں بجا معلوم ہوتے ہیں کہ انکے تمام مجموعۂ کلام میں "لال قلعہ" سے انتقال شاہی پر واحسی نوحہ خوانی بھی نہیں ۔ بلکہ بجائے اس کے حکام انگریزی کی خوشامدیں اور انہی بریت پر کافی زور قلم صرف ہوا ہے ۔ اگر حقیقت حال بھی یہی ہے تو مندرجہ بالا نمونہ ہائے خودداری کا ماحصل "نری بکواس" سے زیادہ نہیں ۔ اور بقول خود حضرت غالب ع ۔ ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا ۔ گویا میری تعمیر کردہ عمارت اپنی سربلندی اور سپہر شکوہی کے باوجود صرف اس اعتراض کے بم سے تودۂ خاکستر ہو کر رہ جاتی ہے ۔

لیکن میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہنے کو تیار ہوں کہ غالب کی خودداری اس اعتراض پر غور کر لینے کے بعد بھی محفوظ ہے وہ پہلی بات تو یہ ذہن نشیں فرمائیے کہ غالب خود ضرور متوسل دربار مغلیہ تھا مگر باعزّ جد وہ اوروں کا وظیفہ خوار تھا ۔ درمیانی واسطہ قلعہ سے اس کا ذاتی تھا ۔ لہذا اگر اس نے اصل کی طرف رخ کیا اور ہنگامی سلسلہ کی فروگذاشت کو جائز رکھا تو ابتذال لازم نہیں آتا ۔ علاوہ ازیں ماحول کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے ۔ جس عالم رستاخیز میں کہ ۔ ع ۔ پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق ! اور ؎

بسکہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستان کا

عام مسلمان آبادی پر سر دار دتہ تیغ بیدریغ ہو رہی تھی - غالب بحیثیت متوسل قلعہ سب کی نظروں پہ چڑھے ہوئے تھے - حفاظت خود اختیاری پر کاربند ہو کر اگر بچ نکلے تو کسی اخلاقی جرم کے مرتکب نہیں کہے جا سکتے۔

تاہم اس سے اہم سوال دوسرا ہے کہ غریب بہادر شاہ کے ساتھ " درفش کاویانی " جو سرنگوں ہو گیا اور " وقار اسلامی " جو خاک میں مل گیا اس پر ایک غیور فرد ملت اور " ترک ایبک " ہو کر حضرت غالب کی خاموشی چہ معنی دارد؟ سیدھا سا جواب تو اس کا یہی کافی ہے کہ ؏

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید!

لیکن اس سے طبایع صرف مشتعل ہو سکتے ہیں۔ تسکین و تشفی کے لئے یہ کہہ کر کوئی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا - لہذا اس کے متعلق ذرا ٹھنڈے دل سے معروضات ذیل پر انعطاف توجہ چاہتا ہوں۔

(۱) " درفش کاویانی " تو اسی دن سرنگوں ہو چکا تھا جب " شاہ عالم " نے غلام قادر خاں کی دست درازیوں کی منظوم فریاد - " مادھوجی سندھیا " فرزند جگر بند آصف الدولہ و انگریز " کہ دستور من اند " کے حضور پیش کی تھی - احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ درانی کی تاخت و تاراج مرہٹوں اور سکھوں کی چیرہ دستیاں اپنا اپنا کام کر چکی تھیں - دکن کی " آصف تشاہی " اور اودھ کی " ظل اللہی " اپنی بے نیازیوں سے نام نہاد " شہنشاہ " ہندوستان کو انگریزوں کے حوالہ کر چکے تھے - اس شطرنج کے بادشاہ کو صحیح معنوں میں کون بادشاہ تسلیم کرتا تھا؟ کیا آپنے سنا نہیں کہ - ؏ سلطنت تخشی ہوئی اتری ہوئی پاپوش ہے؟

(۲) " وقار اسلامی " کی بھی خوب رہی - " اورنگ زیب عالمگیر " کے سوا صحیح معنوں میں اس کا ادراک بھی " تخت طاؤس " کی زینت بننے والوں میں تھا؟ " رنگیلے پیا " اور ان کے اخلاف غریب کیا جانیں " وقار اسلامی " کا کیا مفہوم ہے - یہ استخفاف وقار اسلامی ہی کے لئے تھا کہ منتقم حقیقی کی مشیت بے پروا نے ان الارض یرثہا عبادی الصالحون کی مشروط دفعہ کے تحت مغلوں کا تختہ الٹ دیا۔

کیا غالب کی چشم حقیقت شناس سے یہ باتیں چھپی ہوئی تھیں؟ ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل　　　کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اب بھی غالب سے مطالبہ جاری رہے کہ " فغان دہلی " میں وہ بھی گلا ملائیں تو اس کا تو جواب ہی نہیں، اس پر بھی اگر اصرار ہو تو میں یہی کہونگا - کہ اگر واقعی اس واقعہ کی اہمیت کے کچھ لوگ شدت کے ساتھ قایل ہیں تو وہ غالب کی خاموشی ہی سے درس عبرت لیں کہ اس میں " خودداری " اپنی آخری حدوں کو پہونچ گئی ہے - بقولہ ؎

دوستاں زینہار غم مخورید　　　شادی دشمناں نمی خواہم!

اس بحث کو غالب کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں - سمجھنے والے کے لئے اس میں سب کچھ ہے ؎

بزم سوختن دود از چراغاں برنمی خیزد　　　بباغ خوں شدن بو از گلستاں برنمی آید

لیکن آخر میں اس سلسلہ بحث میں بے موقعہ نہ ہوگا اگر حضرت غالب کی ایک خاص غزل کے متعلق اپنے ایک عجیب و غریب تاثر کا اظہار کروں - گرچہ اس تاثر کے ثبوت میں پیش کرنے کے لئے مجھے کہیں کوئی مواد نہیں ملتا ہے اور میں اسکو فی الحال " اختراع ذاتی " کے سوا اور کسی نام سے تعبیر نہیں کر سکتا امکان چاہے نہ ہو مگر تقاضائے دلی یہی ہے کہ غالب کے متعلق اس بحث میں میرے تاثر کا ثبوت بہم پہنچ جائے۔

اب غزل ملاحظہ ہو :-

در گریہ از بس نازکی رخ ماندہ بر خاکش نگر　　　وان سینہ سودن از تپش بر خاک نمناکش نگر
بستے کہ جا ہا سوختے دل از جفا سر دش بہ بیں　　　شوخے کہ خونہا ریختے دشت از حنا پاکش نگر
آں کو بخلوت با خدا ہرگز نہ کردے التجا　　　نالاں بہ پیش ہر کسے از جور افلاکش نگر
تا نام غم بردے زباں می گفت دریا در میاں　　　دریائے خوں اکنوں رواں از چشم سفاکش نگر
آں سینہ کز چشم جہاں مانند جاں بودے نہاں　　　اینک بہ پیراہن عیاں از روزن چاکش نگر
ناگشتہ خود نفریں خشنو نخست بر لب خندہ اش　　　زہرے کہ پنہاں می خورد پیدا ز تریاکش نگر

خواند بامید اثر اشعار غالب ہر سحر — از نکتہ چینی در گذر فرہنگ واداکش نگر

اس غزل کو جب میں نے پڑھا ہے تو یہی محسوس کیا ہے کہ لال قلعہ کی تباہی کے بعد کوئی کم سن شاہزادہ ہوگا جس کا گہرا تعلق آخری تاجدار مغلیہ کے ساتھ جناب غالب کے علم میں تھا۔ مگر خود اس فرضی شاہزادہ کے بقاء آزادی وحیات کے لئے اس کا ظاہر کردینا مناسب نہ تھا۔ تقاضائے وقت یہی تھا کہ جس قابل عبرت دریوزہ گری میں غریب کی بسر ہوتی تھی، اُسکو دل پر جبر دیکر برداشت کرلیا جائے۔ لیکن اگر ایسا واقعہ پیش آیا تھا تو اس نے متاثر نا گزیر تھا۔ اور اس کا قلمبند کرنا دلپذیر تھا۔ پھر بھی کس قدر دشوار کام تھا۔ ظاہر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت غالب کا نادرہ کار قلم ہی کا اعجاز ہے کہ فراوانی سوز وگداز کے ساتھ ساتھ ممدوح کی علوئے شان کو بھی اس ندرت سے بیان کر جائیں کہ سمجھنے والے ہی سمجھیں اور اغیار کی خاک سمجھ میں نہ آئے۔ جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں۔ کہ میرے پاس اس تاثر کا ثبوت نہیں ہے لیکن میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کس معشوق کی صنعت ہوسکتی ہے ؎

آں کو بخلوت با خدا ہرگز نہ کردے التجا — نالاں بہ پیش ہر کسے از جور افلاکش نگر

تا گشتہ خود نفریں شنو تلخست برلب خندہ اش — زہرے کہ پنہاں می خورد پیداز ترپاکش نگر

اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ کہ شاعروں نے معشوقوں کا مرثیہ تک لکھا ہے۔ واسوختوں میں ہجو سے بھی باز نہ آئے ہیں۔ مگر خدا کے لئے مجھے بتائیے کہ اس غزل میں جس معشوق کو پیش کیا گیا ہے وہ عامۃ الورود "ذہنی پیداوار" ہوسکتا ہے؟ غزل کا ہر شعر غمازی کررہا ہے کہ ؎

سراسر محز ہایت لاجوردی بود من عمرے — معشوقی پرستیدم بلائے آسمانی را (غالب)

ایک اور غزل حضرت غالب نے ایسی ہی مرصع لکھی ہے۔ مگر اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ عام شاعرانہ تخیل آفرینی سے زائد کچھ اور بھی مفہوم ہے۔ حالانکہ خامۂ غالب اس غزل میں بھی اوسی طرح درافشاں ہے ؎

سرشک افشانی چشم ترستش بیں — نشۂ خوبان وگنج گوہرشش بیں

ادائے دلستانی رفتہ از یاد — ہوائے جاں ستانی در سرش بیں

بجا ماندہ عتاب وغمزہ وناز — متاع ناروائے کشورش بیں

گزشت آں کز غم ما بیخبر بود — بہ خویش از خویش بے پرواترش بیں

مہ نو کردہ کاہش پیکرش را — بچشم کم ہماں مہ پیکرش بیں

چکد در سجدہ خوں از چشم مستش — گدازشہائے نقش آں درش بیں

خدا ندش بخون ما نگہ او — بہ بیتابی نگہ بر خنجرش بیں

بہ رسم چارہ جوئی پیش غالب — شکایت سنج چرخ و اخترش بیں

مطلع اور دو بعد کے شعروں سے کچھ شبہہ سا ہوتا ہے کہ اس غزل کا معشوق بھی کوئی غیر معمولی جنس ہے مگر بعد کے اشعار اس معاملہ کو صاف کردیتے ہیں۔ ممکن ہے یہ میرا ذاتی خیال سمجھا جائے۔ لیکن فی الحال میرے لئے سوائے اس کے چارہ ہی کیا ہے۔ کہ ؎

باکہ گویم سر ایں معنی کہ نور حسن دوست — در دماغ ما گل و در چشم موسیٰ آتش است

مجھے افسوس ہے کہ۔ ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم ؎ کے مصداق مضمون کافی طویل ہوگیا۔ لیکن میرے علم بے لا حاصل سے بحث بردے کار نہیں آئے۔ اب میں اس مضمون کو اس گذارش پر ختم کرتا ہوں کہ اس خوددار شاعر سے اور کچھ نہیں تو یہ سبق ضرور ملتا ہے کہ ہم اگر اپنی خودداری برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ تو غالب کو اردو شاعری کی حیثیت سے اتنا ہی مرتبہ دیں جتنا غیرت برداشت کرسکے۔ عام ازیں کہ علامہ اقبال مغفور اور عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے غالب پرستی میں انتہائی غلو کیا ہے۔ اپنی اس گذارش کیلئے میری معذرت یہ ہے ؎

ندانم سلسبیل داد یا کوثر ندانم
کہ ساقی ریخت آبے در دلم کاتش بجوش آمد

موجودہ طرز آفرینش اور اسکے اجزاء

از جناب محمد مظفر حسین صاحب ایڈوکیٹ

کسی چیز کی "آفرینش" یعنی صنعتی چیزوں کے بنانے اور زراعتی چیزوں کے پیدا کرنے یا فطری اور معدنی چیزوں کے حاصل کرنے کے طریقے کی اگر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا بنکر تیار ہونا یا پیدا کیا جانا یا حاصل ہونا چند اجزاء کے اشتراک عمل کا نتیجہ ہے۔ جن چیزوں کے اشتراک عمل کا یہ نتیجہ ہے۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو مختلف حصوں میں نظر آئیں گی۔ اول تو وہ مادی چیز یا چیزیں جو اس مخصوص چیز کے بنانے یا پیدا کرنے یا حاصل کرنے میں کام میں لائی گئیں۔ دوئم وہ آدمی جو اس مادی چیز کو اس طرح کام میں لایا۔ بنیادی طور پر ان دو اجزاء کا اشتراک عمل چیزوں کے بنانے پیدا کرنے اور حاصل کرنے کے لئے کافی ہے۔ مثلاً ایک جنگلی آدمی کے غذا حاصل کرنے کا طریقہ درختوں کے پھل یا پتے اپنی ضرورت کے لئے توڑ لینا ہے۔ یا جنگلی جانوروں کو بلا کسی ہتھیار کی مدد کے پکڑ لینا ہے ظاہر ہے کہ اس طریقے سے محض معمولی ضرورتیں محض معمولی طور پر پوری ہو سکتی ہیں۔ اور جنگلیوں کو بہت جلد کسی ایسی چیز کی تلاش شروع ہو جائے گی جو ان کے کام میں مدد دے سکے۔ مثلاً جانوروں کے پھنسانے کے پھندے یا اوپر کے پھلوں تک پہونچ سکنے کے لئے بانس وغیرہ۔ اب پھل زیادہ ٹوٹ سکیں گے اور جانور زیادہ آسانی سے پکڑے جا سکیں گے۔ مگر اس زیادتی تحصیل میں ایک اور تیسری چیز کا اشتراک عمل شامل ہوا۔ یعنی مادی چیز جو حاصل کی جائے یا جس پر کوئی عمل کیا جائے اور وہ جو اس چیز کو حاصل کرے یا اس پر عمل کرے اس کے علاوہ ایک اور چیز مثل اوزار یا ہتھیار کے جو اس کے کام میں مدد دے اور اس کی کوشش اور محنت کے پھل کو بڑھا دے۔

اس تجزیہ سے یہ معلوم ہوا کہ کسی چیز کو بنانا پیدا کرنا یا حاصل کرنا حقیقتاً نام ہے کسی موجودہ مادی چیز پر کچھ عمل کرکے اس پر اختیار حاصل کرنے کا یا اس کو پہلے سے زیادہ مفید بنا دینے کا ورنہ انسان خود کوئی مادی چیز پیدا نہیں کر سکتا۔ جب ہم کہتے ہیں کہ بڑھئی نے کرسی بنائی تو اس کا محض یہ مفہوم ہوتا ہے کہ لکڑی یا کاٹھ پہلے ایک کم مفید صورت میں تھا۔ بڑھئی نے اس پر عمل کرکے اس کے فائدہ میں اضافہ کر دیا اور وہ اب پہلے سے زیادہ مفید اور کار آمد ہو گئی۔ ہر اس قسم کی مادی چیز جس پر عمل کرکے اس کو اور زیادہ مفید بنا دیا جا سکے "لینڈ" کہلاتی ہے۔ مثلاً خود زمین یا خام چیزیں مثلاً اناج یا زمین کی اور پیداوار مثلاً روئی۔ سن۔ جوٹ وغیرہ وغیرہ۔

اسی تجزیہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی مادی چیز کا زیادہ مفید ہو جانا حقیقتاً کرشمہ ہے انسان کے عمل کا ورنہ کم مفید صورت میں تو چیز پہلے سے موجود ہی تھی۔ تو یہ زیادہ مفید بنا دینے کی طاقت اور قوت جو انسان میں ہے وہ اصطلاح میں "لیبر" یا محنت کہلاتی ہے۔ اور کل چیزوں کا حصول یا افزائش فائدہ مندی بالکل اسی پر منحصر ہے۔ یہی سرچشمہ ہے کل چیزوں کے حصول کا۔ کل "دولت" کا یہ بھی معلوم ہوا کہ "لیبر" کی یہ قوت اور صلاحیت اوزار یا ساز و سامان کی مدد سے بڑھ جاتی ہے۔ اور یہ اوزار یا ساز و سامان ایک بہت ضروری چیز ہے پیداوار کے بڑھانے کے لئے یا پیداوار کو اور زیادہ مفید بنانے کے لئے۔

اگر ہر شخص ہر وہ چیز جس کی اسکو ضرورت ہو خود بنالے اور اپنی ضرورت آپ پوری کرلے تو معاملہ بالکل اسی کی ذات تک محدود رہے۔ کسی دوسرے آدمی اور اس کے درمیان میں کسی قسم کے معاملہ کی ضرورت نہیں۔ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ کا معاملہ ہو۔ وہی کارندہ بھی ہو وہی مصرف لینے والا بھی۔ وہی پیدا کرنے والا محنت کرنے والا اور خرچ کرنے والا۔ الغرض کل معاشی معاملات کا وہ خود مرکز ہو۔ نہ اسکو کسی اور کو کچھ دینا ہو اور نہ کسی غیر کو کچھ اس کو دینا پڑے۔ "حق المحنت"۔ "معاوضہ"۔ "تبادلہ" کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ مگر جب صورت حال یہ نہ ہو۔ کیوں نہ ہو کی بحث نہیں۔ یعنی یہاں پر اسکی ضرورت نہیں۔ یہاں پر اس بحث کی بھی ضرورت نہیں کہ صورت حال ایسا نہ ہونا مناسب ہوا یا نامناسب۔ جائز طور پر ہوا یا ناجائز طور پر۔ کہنا صرف یہ ہے کہ جہاں صورت حال یہ نہ ہو اور بدل کر یہ صورت اختیار کرے کہ اپنی ضرورت کی کل چیزوں کو بجائے خود بنا لینے کے وہ محض دو ایک چیز بنانے لگے مثلاً جوتے یا کپڑے اور اپنی اور کل ضرورتوں کے پورا کرنے کا یہ طریقہ نکالے کہ اور اور چیزوں کے پیدا کرنے والوں

اور بنانے والوں کو اپنی بنائی اور حاصل کی ہوئی چیز دے اور اس کے عوض میں اُن سے انکی بنائی ہوئی چیزیں لے ۔ اس صورت میں معاملات ذرا پیچیدہ ہو جائیں گے ۔ اپنی کل ضرورتوں کو وہ پہلے کی طرح خود پورا نہیں کر سکے گا ۔ اور اس کو کسی اور سے مدد لینا ہو گا ۔ ساتھ ہی ساتھ ایک نیا معاشی عمل یعنی "تبادلہ" بھی رونما ہو گا ۔ تبادلے کے ساتھ ساتھ ہلکے انداز میں یہ بھی سوال ہو گا کہ دو چیزوں میں شرح تبادلہ کیا ہو گی مثلاً جوتے اور کپڑے میں کیا نسبت ہو گی ۔ جوتوں اور غلوں میں کیا نسبت ہو گی وغیرہ وغیرہ ۔ بہرکیف باوجود ایک نئے معاشی عمل "تبادلہ" کے رواج پا جانے کے معاملات پھر بھی بہت کچھ سدھرے ہوئے اور صاف ہوں گے ۔ مگر فرض کیجئے کہ کسی چیز کی "آفرینش" کا طریقہ ذرا اور پیچیدہ ہو جائے یعنی چیزوں کے بنانے پیدا کرنے اور حاصل کرنے میں ایک نہیں دو نہیں بلکہ متعدد اشخاص حصہ لینے لگیں اور یہ تیار شدہ مال مصرف لینے اور خرچ کرنے والوں تک پہونچانے میں ان کے علاوہ اور بھی چند اشخاص شامل ہو جائیں ۔ اب معاشیات کی پہلی سادہ صورت اور بدل جائے گی ۔ ایک ہی شخص کل معاشی معاملات کا مرکز نہ رہ سکے گا ۔ کام ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا ۔ مثلاً کوئی صرف جوتے بنائے گا کوئی صرف کپڑے بنائے گا کوئی صرف غلے اگائے گا اور اکیلے نہیں بلکہ اور شرکا کی مدد سے معاملات اور اس سے بھی پیچیدہ صورت اختیار کر لے سکتے ہیں یعنی یہ کہ جوتے بنانے والے خود اپنی خواہش اور مرضی سے نہیں ۔ اپنے ذاتی طور پر نہیں ۔ براہ راست جوتا بنانے کے کام کو اپنی روزی کا ذریعہ بنانے کے لئے نہیں بلکہ ایک دوسرے کی فرمائش سے یا حکم سے اس کے لئے جوتے بنانے یا کپڑے بنانے لگیں یا اناج اگانے لگیں اور فرمایش کرنے والے اور حکم دینے والے کی چیز مصرف میں لینے والے کہیں دور و دراز ملک میں رہتے ہوں جہاں انکو پہونچانا خود اس کے لئے ناممکن ہو اور محض اس قسم کا کام انجام دینے کا کام کچھ لوگ کرنے لگیں ۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی فی نفسہ بات تو وہی رہی یعنی ایک شخص نے بنایا اور ایک شخص مصرف میں لایا مگر اس بدلی ہوئی حالت کے اعتبار سے اب پھر ایک نئے تجزیے کی ضرورت ہو گئی یعنی ان اتنے کے بیچ میں آ جانے والوں اور ان کی خدمت کی ۔ اس پیچیدہ معاشی معاملے اور پہلے والے سادہ کیفیت میں تین فرق ہوئے ۔ ایک تو یہ کہ بنیادی بنانے والا جو بالکل شروع میں محض اپنی ضرورت پوری کرنے کیلئے بناتا تھا اور بعد میں بھی گو محض اپنی ضرورت پوری کرنے کیلئے نہیں مگر پھر بھی اپنے طور پر ضرور بناتا تھا ۔ اب کسی اور کیلئے اور اسکے حکم سے بنانے لگا ۔ دوسرے ایک قسم کا گروہ پیدا ہو گیا جو دور و دراز کے لوگوں کی ضرورت محسوس کر کے چیزوں کے بنائے جانے کا حکم دینے لگا ۔ غالباً اس حکم کی تعمیل کیلئے کچھ خرچ بھی بنانے والے کو دینے لگا اور بنائے ہوئے مال کی بکری اور نکاس کا جزو کل ذمہ دار ہو گیا ۔ تیسرے ایک اور گروہ پیدا ہوا جو محض باربرداری اور نقل و حمل کا ذمہ دار ہوا ۔ سوال یہ ہے کہ نفس "آفرینش" میں ان کا کیا حصہ ہے ؟ یہ کوئی مفید اور کارآمد کام کرتے ہیں یا نہیں ؟ انکی وجہ سے فائدہ مندی میں افزائش ہوتی یا نہیں ؟ یہ کسی معاوضہ کے مستحق ہیں یا نہیں ؟ خود بنانے والے کا اب کیا حصہ رہا ؟ وہ کس معاوضہ کا مستحق ہے ؟ غرض "حق المحنت" ۔ "معاوضہ" اور "منافع" کا سوال پیدا ہوا ۔

پہلی والی سادہ شکل میں خود محنت کرنے والا ہی مصرف میں لانے والا بھی تھا اور محنت کرنے کی غرض ہی ذاتی ضرورت دور کرنی تھی جب محنت کرنیوالے نے اپنی کمل ذاتی ضرورتوں کو آپ اپنی محنت سے دور کرنے کی کوشش چھوڑ دی اور محض ایک ہی چیز کے بنانے میں مصروف ہو گیا تو وہ ہر اس چیز کیلئے جسکو وہ خود نہ بناتا تھا کسی اور کی بنائی ہوئی چیز کا محتاج ہو گیا اور اسکی یہ ضرورت "تبادلہ" کے ذریعہ سے پوری ہو گی مثلاً دو آدمیوں نے جوتے اور کپڑے بنائے ۔ جوتے بنانے والے نے اپنی ضرورت سے بہت فاضل جوتے بنائے اور فاضل محض اسلئے بنائے کہ جسکو جوتوں کی ضرورت ہو اسکو جوتے دے دے اور اس سے اسکی بنائی ہوئی چیز مثلاً کپڑے لے ۔ اسی طرح کپڑے بنانے والے نے بھی اپنی ضرورت سے بہت فاضل کپڑے بنائے اور فاضل اس لئے کہ اس فاضل پیداوار کو کسی کو تبادلے میں دے اور اس سے اس کے بدلے میں اپنے مصرف کی کوئی چیز مثلاً جوتے لے ۔ یہاں پر دو شخص ہیں ۔ ایک جوتے بنانے والا اور دوسرا کپڑا بنانے والا اور ان دونوں میں سے ایک نے جوتے اس لئے فاضل بنائے ہیں کہ کپڑوں سے بدلے اور دوسرے نے کپڑے اسلئے فاضل بنائے ہیں کہ اس کے بدلے میں جوتے لے ۔ جوتے بنانیوالے کے پاس جوتے ضرورت سے فاضل ہیں ۔ کپڑے بنانے والے کے پاس جوتے نہیں ہیں ۔ جوتے بنانے والے کے پاس جو فاضل جوتے ہیں خود اس کے لئے بیکار ہیں یا کم از کم اس کے لئے اتنے مفید نہیں جتنے کپڑے والے کیلئے ہونگے ۔ جس کے پاس جوتے ہیں ہی نہیں ۔ اسی طرح کپڑے بنانے والے کے پاس جو فاضل کپڑے ہیں وہ اس کیلئے اتنے مفید نہیں جتنے جوتے والے کیلئے جسکے پاس کپڑے ہیں ہی نہیں ۔ یہ اگر اپنے فاضل جوتے جو اس کیلئے کم مفید ہیں کپڑے والے کو دیدے تو اس کے فائدہ رسانی میں اضافہ ہو جائے ۔ اسی طرح اگر دوسرا اپنے فاضل کپڑے جوتے والے کو دیدے تو اس کے فائدہ رسانی میں اضافہ ہو جائے ۔ تبادلہ کے ذریعہ یہ عمل بالکل آسانی سے ہو جاسکتا ہے ۔ جوتے والا کپڑے والے کو جوتے دیدے اور اسکے بدلے میں کپڑے لے ۔ گویا تبادلے کا عمل کم مفید چیزوں کو زیادہ مفید بنا دیتا ہے اور اسکے فائدے میں

اضافہ کرتا ہے۔ گویا تبادلہ بھی ٹھیک اسی طرح کا کام ہے جیسے جوتا یا کپڑے بنانا جس سے چمڑا اور روئی کم مفید صورت سے زیادہ مفید صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اگر کوئی شخص "تبادلہ" کی خدمت وسیع پیمانے پر اپنے متعلق لے لے۔ تو وہ بھی ایک مفید اور کارآمد کام کرتا ہے بالکل اسی طرح جیسے جوتا بنانے والا یا کپڑا بنانے والا یا غلّہ اگانے والا۔

اسی طرح وہ شخص بھی جو اوروں کی ضرورتوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ ان کے پوری ہونے کے لئے بنانے والوں کو بنانے کا حکم دیتا ہے۔ چیزوں کو اپنے طور پر بنواتا ہے۔ اور بنی ہوئی چیزوں کو اہل ضرورت تک پہونچاتا ہے۔ ایک مفید اور کارآمد کام کرتا ہے۔ ان چیزوں کی ترتیب میں اس کا بھی ایک حصہ ہے۔

معاشی معاملات کے وسیع اور پیچیدہ ہوجانے کے بعد اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس طرح کے کام کرنے والے کثیر مقدار میں ساز و سامان یا آلات اور اوزار کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اور "آفرینش" کے اس جزو کو ادا کرنے کے لئے کسی اور کی مدد لیتے ہیں۔ جب معاشی ترقی اور کاروبار اس حد تک پہونچ جائے تو ظاہر ہے کہ حکم دے کر بنوانے والوں اور باربرداری کا سامان کرنے والوں کی طرح ایک گروہ اس قسم کے لوگوں کا بھی ہوجائے گا۔

اب اگر پھر کسی چیز کے "بنانے" "پیدا کرنے" یا حاصل کرنے کے طریقے کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا بنکر تیار ہونا یا پیدا کیا جانا۔ یا حاصل ہونا بجائے صرف دو اجزاء کے اشتراک عمل کے نتیجہ ہونے کے چند اور اجزاء کے ملنے کا نتیجہ ہے۔ ان میں دو تو وہی ہیں۔ یعنی وہ مادی چیز جس پر عمل کیا جائے اور وہ آدمی جو عمل کرے مگر معاملات کے بیچ نے دو اور کا اضافہ کردیا یعنی وہ جو کام کروائے۔ یعنی جو تنظیم کی خدمت اپنے متعلق لے لے۔ اور وہ جو ساز و سامان اور آلات و اوزار بہم پہونچائے۔ ساتھ ہی ساتھ "تبادلہ" جو شروع میں ایکدم نا پید اور بعد میں محض ایک آسان عمل تھا اور دو بنانے والوں میں براہ راست ہوجاتا تھا۔ اب بہت پیچیدہ عمل ہوگیا اور اس میں بہت سے مدارج ہوگئے۔

معاشی ترقی کے ساتھ معاشی معاملات اور پیچیدہ ہوتے ہوگئے بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ معاشی ترقی حقیقتاً معاشی معاملات کے پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوجانے کا نام ہے۔ روز بروز یہ پیچیدگی بڑھتی گئی یہاں تک کہ ایک ایک جزو کام کے خود الگ الگ ٹکڑے ہوگئے اور انکے کرنے والوں کی تعداد اور قسمیں اتنی ہوگئیں کہ انتہا نہیں۔ کام کے اتنے بڑھ جانے کے ساتھ ساتھ ہر کے ادا کرنے کا طریقہ بھی بدلتا گیا اور ہر کے ادا کرنے کے لئے ایک خاص قسم کے نظام کی ضرورت ہوئی۔

بہرکیف تفصیلات کو الگ کردینے کے بعد اور اجمالاً اگر موجودہ دور کے اجزاء آفرینش کا تجزیہ کیا جائے تو اس تجزیہ کا خلاصہ یہ ہے کہ "آفرینش" کا کام چار قسم کے لوگوں نے اپنے متعلق لے لیا ہے۔ آفرینش ان چاروں کی اشتراک عمل کا نتیجہ ہے۔ اس کے مکمل کرنے میں ایک اور قسم کا گروہ شامل ہے۔ اور اس کے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ "تبادلہ" ہے۔

۱۔ سرمایہ داری نظم میں سب سے ممتاز اور جلیل القدر وہ گروہ ہے جس نے زمین پر قبضہ کرلیا اور کل زمین معدنیات اور خام جنسوں پر قابض ہو بیٹھا۔

۲۔ دوسرا وہ گروہ ہے جو مختلف طریقوں پر ایک کثیر سرمایہ کا مالک ہو بیٹھا۔

۳۔ تیسرا وہ گروہ ہے۔ جو تنظیم اور ترتیب کا کام ادا کرتا ہے۔

۴۔ چوتھا وہ گروہ ہے جو ان کے ہاتھوں اپنی محنت بیچتا ہے۔ اور کارخانوں۔ ملوں۔ اور فیکٹریوں میں کام کرتا ہے۔

یہ چاروں گروہ کے لوگ مل کر آفرینش کا کام انجام دیتے ہیں۔ اور ہر گروہ اپنا اپنا حصہ تبادلہ کے وسیلے سے ملتا ہے۔ دنیا کی کل دولت تبادلہ کے ذریعہ تقسیم ہوتی ہے۔ اور اسی تقسیم میں ہر ایک کو اپنا اپنا حصہ ملتا ہے۔ جب معاشی ارتقا اس حد کو پہونچ گیا یہ گروہ بندی ہوگئی۔ ان نئے حالات کی مطابقت میں ایک ڈھانچہ کھڑا ہوگیا اور معاشی تنظیم ان بناؤں پر ہونے لگی تو گویا موجودہ دور شروع ہوگیا۔ سرمایہ داری وجود میں آگئی

یہ نظم آفرینش اور تقسیم معاشی حیثیت سے نہایت پیچیدہ ہے۔ تنظیمی حیثیت سے ناقص ہے۔ تاریخی طور پر ناجائز طور پر عمل میں لایا گیا ہے۔ اجتماعی حیثیت سے ضرر رساں ہے۔ اخلاقی حیثیت سے نامناسب اور ناجائز ہے۔ سیاسی نقطہ نگاہ سے محض جبری ہے اور مجموعی حیثیت سے ناقابل برداشت ہے۔ مگر جیسا کہ اوپر کہا جاچکا یہاں پر ان پہلوؤں سے بحث نہیں یہاں صرف موجودہ طرز آفرینش اور اس کے اجزاء کا بیان مقصود تھا۔ محض بیان واقعات۔ محض ایک تجزیہ۔

××× ××× ××× ××× ×××

تاریخ صِقلیہ پر ایک نظر

از جناب پروفیسر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی (برلن)

جزیرۂ صقلیہ (Sicily) جس کے عہد اسلامی کی تاریخ ہمارے فاضل دوست سید ریاست علی صاحب ندوی نے دو جلدوں میں لکھی ہے، بحر متوسط یعنی بحر روم کے قلب میں واقع ہے۔ اور اپنے مرکزی محل وقوع کے سبب سے نہایت قدیم الایام سے مختلف سلطنتوں اور تمدن کا مقام اتصال رہا ہے۔ اہل فنیقیہ، اہل یونان، اہل روما اور اہل اسلام سبھی نے اس جزیرہ کو قرناً بعد قرنٍ اپنا جولانگاہ بنایا، اور اس سرزمین پر باری باری حکومت کا ڈنکا بجایا۔ صقلیہ کے میدانوں میں نہ صرف مختلف اقوام کے نبرد آزماؤں نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں اپنی بہادری کے جوہر دکھلائے بلکہ متعدد مذاہب اور مختلف تمدنوں نے بھی اپنی اپنی مابہ الامتیاز خصوصیات کی بہار دکھلائی اور اس ملک کی ذہنی، اقتصادی اور تمدنی ترقی میں اپنی بساط بھر کم و بیش حصہ لیا۔ غرضکہ صقلیہ کی تاریخ محض ایک جزیرہ کی تاریخ نہیں ہے بلکہ کئی ایک متمدن اور ترقی یافتہ اقوام کا سنگم ہونے کے سبب سے "تاریخ مغرب کا خلاصہ" ہے۔ صقلیہ کے عہد اسلام کی تاریخ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ عربوں کا تمدن جہاں ایک طرف اندلس کے راستہ سے یورپ پر اثر انداز ہوا وہاں دوسری طرف صقلیہ اور جنوبی اطالیہ کے واسطہ سے بھی اس کے گوناگوں اثرات یورپ تک پہنچے۔

باوجود اس امر کے کہ یہ عہد سیاسی اور تمدنی لحاظ سے اس قدر اہم ہے، چند سال پیشتر تک کوئی مستقل اور جامع تاریخ اس عہد کی اردو زبان میں موجود نہ تھی۔ اردو تو کیا حال کی عربی اور انگریزی تالیفات میں بھی جو مواد اس موضوع پر تھا وہ اتنا ناکافی تھا گویا نہ ہونے کے برابر تھا۔ پچھلی صدی میں صرف اطالین زبان میں ایک مغربی مستشرق اماری (Amari) نے اس باب میں ایک مفصل تاریخ تین مجلدات میں لکھی تھی جس کا عنوان "تاریخ مسلمانانِ صقلیہ" ہے۔ مگر وہ بھی ایک مدت سے ناپید تھی اور زبان کی غرابت کے سبب سے ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کی دسترس سے باہر تھی۔ ہمیں سید صاحب موصوف کا غایت درجہ ممنون ہونا چاہئے کہ اُن کے علم وفضل اور شوق تحقیق کی برکت سے یہ کمی بطریق احسن پوری ہو گئی۔

سید صاحب موصوف نے تاریخ صقلیہ لکھ کر جس احسن طریق پر اس کمی کو پورا کیا ہے اس کا کچھ اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تصنیف دو جلدوں اور ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسے موضوع پر جس کے متعلق ہماری زبان کی کل کائنات چند ایک صفحوں سے زیادہ نہ تھی، فاضل محقق نے دو جلدوں میں ایک ضخیم کتاب تیار کر دی۔ مگر اس اعجوبہ زائی کا راز اُن کے علمی شوق ان تھک جستجو اور مآخذ کے استقصاء میں پوشیدہ ہے۔ دس سال کی شبانہ روز محنت شاقہ اور دیدہ ریزی سے انھوں نے عربی زبان کے تمام اہم تاریخی، جغرافی اور ادبی مصادر کو کھنگال کر اپنے حسب مطلب جواہر ریزے جمع کئے ہیں اور پھر انکو خوبی کے ساتھ ترتیب دیکر ایک بدیع المثال مرقع تیار کیا ہے۔ جو اپنے موضوع کی اہمیت اور ندرت کے لحاظ سے تمام مشرقی لٹریچر میں اپنی نظیر آپ ہے۔ عرب مورخین کے بیانات کے ساتھ ساتھ مغربی مورخوں کی تحریروں کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اس طریق عمل سے واقعات تاریخی کے متعلق مصنف کو صحیح رائے قائم کرنے اور ان کی اصلیت تک پہنچنے میں بڑی مدد ملی ہے۔

غرض کہ تاریخ صقلیہ اپنے حسن ترتیب، تفصیل بیان، اصابت رائے اور اصول تاریخ نویسی کی پابندی کے لحاظ سے شبلی اسکول کی بہترین تصانیف میں سے ہے۔ روایت ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنی روحانیت کے زور سے جن تسخیر کر رکھے تھے اور اپنے محلات اور ہیکل کی تعمیر میں اُن سے کام لیتے تھے۔ اعظم گڑھ میں بھی ایک سلیمان ہے۔ اُس نے بھی چند ایک علمی جن قابو میں کر رکھے ہیں جو مل کر اسلام کے پارینہ علوم و معارف کی عمارت از سر نو کھڑی کر رہے ہیں۔ تاریخ صقلیہ بھی اسی عمارت کا ایک زرنگار عمود ہے۔

پہلی جلد میں فاضل مصنف نے فتح اسلامی سے لے کر عربی حکومت کے انقراض تک کی سیاسی تاریخ لکھ دی ہے اور اس تاریخی بیان

کو جزیرہ صقلیہ کے طبعی اور تاریخی جغرافیہ سے شروع کیا ہے - کیونکہ بغیر جغرافی واقفیت کے تاریخی واقعات کا بخوبی سمجھنا دشوار ہے - اس کے بعد اُن تمام خاندانوں اور حکمرانوں کے حالات قلمبند کئے ہیں جنھوں نے یکے بعد دیگرے جزیرہ پر تسلط حاصل کیا - یہاں تک کہ پانچویں صدی ہجری کے وسط میں نارمن قوم نے حملے شروع کر دئے - جبکہ صقلیہ کے مسلمان باشندوں کے باہمی افتراق و اختلاف اور تائید الدولہ جیسے کوتاہ اندیش اور بدبخت حکمرانوں کی خانہ جنگی اور نفاق انگیزی سے اسلامی اقتدار کو گھن لگ چکا تھا - نتیجہ یہ ہوا کہ جزیرہ میں اسلامی حکومت کا چراغ کچھ عرصہ ٹمٹمانے کے بعد آخر کار گل ہو گیا - عربی اقتدار کو جن اسباب سے زوال آیا یعنی باہمی حسد و عناد، نفاق و افتراق اجتماعی شیرازہ بندی کی حفاظت اور اطاعت اولی الامر کی بجائے انفرادی اغراض کے حصول کی ہوس ان اسباب کو فاضل مصنف نے واقعات کے سلسلہ میں ایسی وضاحت سے لکھا ہے جس سے ہمارے لئے درس عبرت کا پڑھنا آسان ہو جاتا ہے -

گو عرب صقلیہ میں صرف تاخت و تاراج کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ وہ اسلامی تہذیب اور مشرقی تمدن کے علم بردار بھی تھے - اگرچہ نارمنوں کی یورشوں سے صقلیہ سے اُن کی حکومت مٹ گئی - مگر اُن کے تمدن کے آثار مدت تک باقی رہے - وہ نارمن جو جزیرہ میں فاتح بنکر آئے تھے - ایک اعلیٰ تمدن کے ہاتھوں مفتوح ہو گئے اور عربی تمدن اور معاشرت کے ایسے گرویدہ ہو گئے کہ نہ صرف دربار شاہی بلکہ تمام جزیرہ پر ایک عرصہ دراز تک اسلامی عربی رنگ قائم رہا - مصنف نے اپنی تاریخ کی پہلی جلد کو ان نارمن حکمرانوں کے حالات پر ختم کر دیا ہے جن کی عرب دوستی اور اسلامی تہذیب کی قبولیت اُن کا طغرائے امتیاز تھا -

مشرقی مورخوں کی تالیفات کے متعلق ایک عام شکایت ہے کہ اُن کی نگاہ بالعموم صرف بادشاہوں اُن کے امیروں وزیروں انکی جنگوں اور تباہ کاریوں تک محدود رہتی ہے - ان باتوں کے سوا اُن میں اور کسی قسم کی تفصیلات کا تلاش کرنا بے سود ہے - جن سے انکے عہد کی معاشرت اور تہذیب و تمدن کا حال وضاحت سے معلوم ہو سکے - مقام مسرت ہے کہ سید صاحب موصوف کی تصنیف اس الزام سے یکسر بری ہے کیونکہ انھوں نے اپنی کتاب کی دوسری جلد کو صقلیہ کے تمدنی مرقع کیلئے وقف کر دیا ہے - اور اس میں عربوں کی تمدن آفریں قوم کے اقتصادی، معاشرتی، تمدنی اور علمی خط و خال کو خوب وضاحت سے دکھلایا ہے - یہ جلد کئی ایک باب پر حاوی ہے - ایک باب میں اہل صقلیہ کی زبان - انکے ادیان و مذاہب اور عادات و رسوم کا بیان ہے - پھر معیشت کے باب میں اُن کے طرز معاش اور اقتصادی زندگی کی تفصیل ہے اس ضمن میں زراعت و فلاحت صنعت و حرفت اور تجارت کا مفصل بیان ہے - پھر علوم و فنون والا باب مسلمانان صقلیہ کے ذہنی علمی اور ادبی ترقیوں کا آئینہ دار ہے - اس باب میں آپ کو رجال صقلیہ یعنی عہد اسلام کے علماء، ادباء، شعراء اور حکماء کے حالات زندگی اور انکی تصانیف کی ترتیب وار تفصیل ملے گی - آخری باب میں صقلیہ کے اسلامی تہذیب و تمدن پر ایک اجمالی نظر ڈالی گئی ہے اور یورپ پر اس کے جو مختلف نوعیت کے اثرات مترتب ہوئے انکو مستند ذرائع سے بیان کیا گیا ہے - غرضکہ لائق مصنف نے اپنے اختیار کردہ موضوع کا حق ادا کر دیا ہے -

صقلیہ کی اسلامی حکومت کے انقراض پر پورے نو سو برس گزر چکے ہیں مگر آج تک کسی مشرقی زبان میں اس درخشاں عہد کی ایسی جامع تاریخ مرتب نہیں ہوئی تھی - گویا مسلمانان صقلیہ کا تمام عالم اسلامی پر ایک قرض تھا جو آج تک ادا نہیں ہوا تھا - ہمارے لئے یہ امر موجب صد ناز و افتخار ہے کہ اس فریضہ ملی کی ادائگی ایک ہندی صاحب علم کے ہاتھوں ہوئی - اور اہل بہار اور بھی زیادہ مستحق مبارکباد ہیں کہ انکی خوش قسمتی سے یہ اعزاز و امتیاز اُن ہی کے صوبہ کے ایک نوجوان فاضل کے حصہ میں آیا - وھذا فضل من اللہ یوتیہ من یشاء من عبادہ -

اگر کسی بات کا افسوس ہے تو یہ کہ اس قسم کے ٹھوس علمی کاموں کی ہمارے ملک میں کافی قدردانی نہیں - بہرحال حضرت مصنف کو اس خیال سے تسکین ہونی چاہئے کہ انھوں نے وہ علمی کام کیا ہے جس کا سرانجام دینا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی - ضرورت اس امر کی ہے کہ اس بے نظیر تصنیف کو نہ صرف اس ملک کے اطراف و جوانب اور قوم کے تمام طبقوں میں بلکہ بذریعہ تراجم دوسرے ممالک میں اشاعت عام حاصل ہو جس کی وہ ہر طرح مستحق ہے -

پورنیہ میں علم و ادب کا چرچا

از جناب مولوی محمد سلیمان صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل وکیل پورنیہ

مسلمانان بہار میں پورنیہ کے مسلمانوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے لیکن اہمیت کا سبب محض کم ارزہے یعنی بہار کے چالیس لاکھ مسلمانوں میں نو لاکھ کے قریب مسلمان اسی پورنیہ میں بستے ہیں۔ اور یہ صرف نقامت بہتر کا مصداق ہے۔

فرانسیس بوچانن پورنیہ کے متعلق کہتے ہیں کہ "یہاں کی ایک کثیر تعداد فارسی پڑھتی ہے۔ ہندوستانی نرے گنواروں کے سوا سبھی سمجھتے ہیں" یہ سنہ ۱۸۱۰ء کی بات ہے۔

پورنیہ کی سب سے قدیم تصنیف جو آج مل سکتی ہے وہ بدیادھر ہے۔ یہ تصنیف نواب سیف خاں کے وقت کی ہے۔ اسکے مصنف ایک صاحب شیخ کفایت نام کے ہیں۔ تاریخ تصنیف سنہ ۱۷۲۸ء ہے۔ ان کی یہ تصنیف بڑی مقبول اور ہر دلعزیز رہی ہے۔ اور آج تک لوگ اس کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ اسکے اکثر قلمی نسخے پائے جاتے تھے اور اپنی مقبولیت کے سبب پہلے پہل گذشتہ سال چھپ کر شائع بھی ہوگئی ہے۔ اسکی جو زبان ہے وہ آج متروک ہے۔ نفس کتاب کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہندو مسلم اتحاد کا ایک بہتر نمونہ ہے۔ کتاب کے مصنف مسلمان ہیں اس لئے اس میں حمد بھی ہے نعت بھی۔ چار یار کا بھی ذکر ہے۔ آل اطہار کا بھی ازواج مقدسہ کا بھی بیان ہے اور شریعت طریقت۔ حقیقت معرفت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہتے ہیں۔

بنا محمد جو پنتھ سدھارے — پہونچ نہیں بھوار ہی مارے

یعنی

خلاف پیمبر کسے رہ گزید — کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

لیکن اصل کہانی کا تعلق ایک ہندو راجہ کی لڑکی سے ہے ہیرو بھی ہندو ہے۔ بادی النظر میں قصہ کچھ بھی نہیں ہے لیکن مصنف نے بات میں بات نکالی ہے۔ اور اچھی سخن طرازی کی ہے اس میں مسائل بھی ہیں۔ دوائیں بھی فالنامہ بھی ہے تعبیر خواب بھی اور کوک شاستر بھی۔ ان کی شاعری کا اندازہ لگانے کے لئے میں انکا محض ایک شعر درج کرکے بدیادھر کا ذکر ختم کرتا ہوں۔ ہیروئین نکاح کے بعد ہیرو سے ملنے جاتی ہے ملنے سے پہلے کے جذبات کا بیان ہے

کچھ ہلسے کچھ ڈرے من ماہی — پرکھ ہیو ہم جانئے ناہی

"خوش بھی اور دل میں ڈرتی ہوئی بھی۔ مرد کے ساتھ کیونکر برتاؤ کیا جائے معلوم نہیں"، کسی نے کہا ہے

آہ وہ جوش مسرت وہ تقاضائے حیا — خندہ زیر لب نگاہ ناز شرمائی ہوئی

اسی سلسلے میں ایک مصرعہ ہے "ترد نا سای ہم ابلا تھر تھر کانپے رنگ" یعنی ہمارے شوہر جوان ہیں ہم الہڑ کا سارا جسم تھر تھر کانپ رہا ہے۔

فارسی کی تعلیم اگلے وقتوں سے ہوتی آئی۔ اور یہ معلمین بیشتر پچھم کی طرف سے آتے رہے۔ شیخ کفایت بھی اپنے تین شیخ محمد اعظم ناظر پوری کا شاگرد بتاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "ناظر پور پچھم سو آئے"۔

فارسی کی عام تعلیم کا اثر تھا کہ تھوڑے دنوں قبل یہاں کی کچہریاں دوسری جگہوں کے وکلا۔ اور مختاران سے بھری ہوئی نہیں بلکہ اکثر قصبوں میں وکیل اور مختار پائے جاتے تھے عدالت کے عملے بھی باہر سے نہ آتے تھے۔

انہیں وکیلوں میں سے منشی فرید بخش صاحب سنہ ۱۸۵۶ء میں منصف بحال کئے گئے اور ۸ اپریل سنہ ۱۸۷۰ء میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ منصفی کے دوران میں آپ ستمبر سنہ ۱۸۶۵ء سے تا نومبر سنہ ۱۸۶۶ء ضلع گیا کے مختلف مقامات جہان آباد اور نوادہ میں بھی رہے ہیں۔

الحاج منشی فرید بخش صاحب موصوف کے سبب سے علم و ادب کی تحریک میں بہت بڑی قوت پہونچی آپ بستی بلاس منی

میں جو مکتب قایم تھا وہ آجکل کے اچھے اچھے مدرسوں اور اسکولوں سے بدرجہا زیادہ فیض رساں تھا۔ دور دور سے طلبا آنے لگے اور فارغ التحصیل ہوکر نکلنے لگے اور اس ایک دئے سے سینکڑوں دئے جلتے چلے گئے۔ طلب علم کا کچھ ایسا شوق ہوا کہ آپ کا چھوٹا لڑکا عبدالرشید گھر چھوڑ کر بہت دنوں تک ہندوستان کے اچھے اچھے مدرسوں میں درس لیتے رہے اسکے بعد ہندوستان سے ممالک عربیہ کو چلے گئے انہیں کے ساتھ ایک صاحب حافظ عبدالواحد صاحب بھی گئے جنکا ایک کارڈ مدتوں مفقود الخبر رہنے کے بعد سنہ ۱۹۱۸ء میں مکہ معظمہ سے موصول ہوا تھا۔

پلاس منی میں کتابوں کا بھی ایک نادر ذخیرہ جمع ہوگیا تھا جو خانہ سوزی میں نذر آتش ہوگیا قران پاک کا ایک قلمی نسخہ اب بھی موجود ہے جسکی تقطیع ۶×۸ ہے ہر صفحہ میں سات سطریں بخط جلی ہیں سنہری جدول ہے کاغذ سفید اور دبیز ہے دو جلدوں میں ہے چرمی سنہری جلد سے مجلد۔ حرف ابھی تک صاف اور نہایت خوب ہیں۔ کاتب کی طرف سے اخر میں یہ مضمون درج ہے هدیته منا الی روضته سید المرسلین محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔ کتبہ العبد الجلیل محمد اسمٰعیل عفرلہ فی سنتہ الھجرۃ الف مایتہ و احدی اربعین۔

پورنیہ کی مطبوعہ کتابوں میں شاید کلیات عزیزی سب سے پہلی کتاب ہے جو سنہ ۱۳۱۲ ہجری میں چھپی تھی۔ یہ الحاج منشی فرید بخش صاحب کے لڑکے عبدالعزیز صاحب مختار مرحوم کی تصانیف کا مجموعہ ہے۔ اس میں آپنے اپنی طبعیت کی جولانی کا پورا ثبوت دیا ہے خوب خوب طبع آزمائیاں کی ہیں پوری کتاب فارسی میں ہے۔ لیکن آخر میں چند ورق غزلیات اردو کے بھی ہیں۔ منشی مہتر علی صبا بھی اچھے اہل قلم گذرے ہیں آپنے ایک قلمی نسخہ چھوڑا ہے جو سنہ ۱۳۰۸ ہجری کی تصنیف ہے۔ آپ سکندر نامہ کو مسدس کرنیکی فکر میں تھے چنانچہ ایک حد تک اس مہم کو انجام بھی دیا تھا۔

پورنیہ کے صاحبان تصنیف وتالیف میں منشی مراد اللہ صاحب یتیم کا بھی بڑا درجہ ہے آپ کی متعدد تصنیفات وتالیفات ہیں اور وہ طبع ہوکر شایع بھی ہوچکی ہیں۔ خطبہ جدید کہیں کہیں مقبول ہے۔

پورنیہ کے ذیعلم ہستیوں میں حضرت مولانا حفیظ الدین صاحب متوطن کنہریا معروف بہ رحمان پور کو ایک ممتاز درجہ حاصل تھا۔ آپ کی ذات گوناگوں صفات سے متصف تھی۔ آپ ایک جید عالم تھے۔ عرصہ تک بمقام سہسرام مدرس کے فرایض انجام دیتے رہے۔ آپ کی متعدد قابل قدر تصانیف ہیں عجالہ نافعہ اور دیوان لطیفی بھی آپ کی تصنیفات سے ہیں اور چھپ چکی ہیں لطیفی آپ کا تخلص ہے

دور جدید میں شاید پہلا قدم محمدیہ کا تھا جس نے ایک جلسے میں سارے ضلع کے لوگوں کو دعوت دی باہر سے علما بلائے گئے اور ایک تحریک کا آغاز ہوا۔ محمدیہ میں ایک مدرسے کی بھی بنیاد پڑی جسمیں کبھی پروفیسر عبدالماجد صاحب پورینوی بھاگلپوری بھی بحیثیت مدرس کے آئے تھے۔ لیکن مولوی لیاقت حسین صاحب مرحوم ومغفور نے جو کچھ کیا وہ انہیں پورنیہ کے سر سید احمد ہونے کا درجہ عطا کرتا ہے انہوں نے سنہ ۱۹۰۷ء میں انجمن اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور ایک سال بعد مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد پڑی۔

انجمن اسلامیہ کے سالانہ جلسوں نے وہ کامیابی حاصل کی کہ پورنیہ کا گوشہ گوشہ اسکے اثر سے متاثر ہوگیا اور ایک انقلابی کیفیت پیدا ہوگئی۔ انگریزی تعلیم کو حرام سمجھنے والوں کو شکست ہوئی لوگ تعلیم جدید کی طرف مایل ہوگئے پورنیہ پر باہر کے حضرات کا بھی بہت بڑا اثر پڑا ہے الحاج حضرت مولانا قادر بخش سہسرامی کے احسانات سے پورنیہ کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا ہے۔ آپنے اسلام کا پیغام پورنیہ کے کونے کونے تک پہونچایا اور پورنیہ نے اُسے گوش دل سے سنا۔ انجمن اسلامیہ کے جلسوں میں علامہ حضرت شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کی تشریف آوری کا بھی بہت اثر پڑا۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب دہلوی کے فیض سے بھی پورنیہ بے بہرہ نہ رہا۔

اخبارات جنکا اثر پورنیہ پر پڑا اُن میں پیسہ اخبار لاہور۔ وکیل امرتسر زمیندار لاہور کے نام لئے جاسکتے ہیں رسایل میں مخزن لاہور اور زمانہ کانپور کی اولیں جلدیں مجھے کہیں کہیں دستیاب ہوئی ہیں۔

حالات حاضرہ پر نگاہ ڈالی جائے تو دیکھا جاتا ہے کہ تعلیم کا چرچا ترقی پر ہے۔ اسکولوں کی بھی تعداد بڑھ رہی ہے اور مدرسوں کی بھی۔ پورنیہ کے طلبا علیگڈھ بھی جاتے ہیں ندوۃ العلماء کو بھی۔ بہار کے بھی اکثر شہروں میں یہاں کے طلبا پائے جاتے ہیں اخبار ورسایل کی اشاعت سے بھی پورنیہ بے بہرہ نہیں رہا۔

اپریل سنہ ۱۹۳۴ء میں مولوی ابراہیم صاحب صدیقی نے بارا عیدگاہ سے طلبہ نامی ایک ماہانہ پرچہ نکالا اور ۲۲ جون سنہ ۱۹۳۴ء کو پورنیہ سے مولوی محمد طاہر صاحب وکیل علیگ

وکیل ایم - ایل - اے نے ہفتہ وار اخبار آفتاب نکالا ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو کشن گنج سے ہفتہ وار اخبار آئینہ نکلا - طلبہ اور آفتاب کی اشاعت اب نہیں ہوتی - لیکن آئینہ خدا کے فضل و کرم سے نہایت پابندی وقت کے ساتھ جاری ہے اور آج پورنیہ کو دعویٰ ہے کہ بہار کے مسلمانوں کا بہترین ترجمان اگر کوئی ہے تو وہ آئینہ ہے جو کشن گنج سے نکلتا ہے - اور یہ ایک حقیقت ہے کہ آئینہ اپنے مالک مولوی فضل الرحمٰن صاحب ایم - ایل - اے کے بے نظیر ایثار کا آئینہ دار ہے -

اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو کشن گنج کا تذکرہ نہ کرنا بے انصافی ہوگی، کیونکہ اس کی تاریخ ان اخبارات و رسائل سے بھی پہلے کی ہے - ۹ اگست ۱۹۲۷ء کو انجمن ترقی اردو کشن گنج کی بنیاد پڑی اور اس کا پہلا سالانہ اجلاس ۳۰ اگست ۱۹۲۸ء کو بصدارت جناب مسٹر کے - پی سنہا آئی - سی - ایس ایس ڈی او کے ہوا - اس انجمن کے ممبران ان اخبارات و رسائل کی اشاعت میں شریک غالب رہے ہیں - اور آج کشن گنج میں بزم ادب کے تحت ایک گرانقدر لائبریری عزیز لائبریری کے نام سے قائم ہے جس سے کثیر التعداد اصحاب مستفید ہو رہے ہیں -

میں نے کوشش کی ہے کہ پورنیہ کی تعلیمی حالت کے متعلق قارئین کے سامنے ایک سطحی خاکہ پیش کروں - یہ صحیح ہے کہ پورنیہ آگے بڑھنے کے لئے بے چین ہے - لیکن ایک لحظہ کی غفلت نے اسے بہت زیادہ پسماندہ بنا رکھا ہے - صد شکر کہ پورنیہ کے جوانوں کا ترانہ آج بھی ہے کہ

ع ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو

کاش ہمارے وہ برادران جو ہم سے زیادہ توانا ہیں ہمیں دھکے دیکر پیچھے نہ ہٹائیں بلکہ ہماری دستگیری کریں - اور ہمیں آگے بڑھنے میں مدد دیں - کیونکہ

ع ان کی عزت ہم سے ہے اور ہم کو ان پر ناز ہے

فنِ مصوری میں "پٹنہ قلم"

از جناب ادھا موہن صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ال پرنسپل پٹنہ اسکول آف آرٹس پٹنہ

دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ قریب قریب تمام ملکوں میں فنونِ لطیفہ کی ترقی اور تنزّلی اوس ملک کے چین اور امن پر منحصر رہی ہے۔ اگر کسی ملک کی اندرونی حالت نازک رہی ہے تو ضرور بالضرور اوس کے فن و صنعت کی حالت پر بھی اوس کا اثر رہا ہے۔ پس ہندوستان بھی اس حالت سے مبرّا رہے یہ ایک ناممکن بات ہے۔ یہ کسے معلوم نہیں کہ تاریخ کے آغاز سے اور اسوقت موجودہ زمانہ تک ہندوستان کے اندر اوس کے علم۔ ہنر۔ و ہر قسم کے فن و صنعت میں ملک کی اندرونی حالت کے مطابق ترقی و تنزّلی ہوتی رہی۔ اگرچہ اس وقت ہمارا موضوع صرف فنِ مصوری اور خاص کر "پٹنہ قلم" کے آغاز کو دکھانا ہے۔ تاہم سلسلے کے لئے اگر اس فن کی کچھ اگلے وقت کی تھوڑی تاریخ جس سے صوبہ بہار کا خاص طور پر تعلق رہا ہے۔ بیان کردی جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

فنِ مصوری اور سنگ تراشی ہندوستان کے اندر موریوں کے وقت میں کہ جن کا دارالسلطنت پاٹلی پتر (پٹنہ) تھا۔ اپنے حدّ کمال کو پہنچ گئی تھی اور بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بودھ مذہب کے پھیلانے کے خیال سے ان موریوں نے اسی صوبہ بہار میں بیٹھ کر اپنے ملک کے فنِ سنگ تراشی و فنِ مصوری کے نمونے تمام ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچائے اور ہندوستان ہی تک محدود نہ رکھ کر ہندوستان کے باہر بھی مثلاً تبت۔ چین۔ جاپان۔ جاوا۔ ملایا وغیرہ وغیرہ میں پھیلائے اور صوبہ بہار کو فخر بخشا۔

اس دور سے کچھ اور آگے چل کر اب ہندوستان کی حالت بدلتی ہے اور بہار کی بھی تاریخ ہم لوگ کی نظر سے غائب ہو جاتی ہے۔ بودھ مذہب کا زبردست پایہ اپنی جگہ سے کھسکتا ہے۔ برہمنوں کے دور کا آغاز ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ مسلمانوں کی آمد ہندوستان میں شروع ہوجاتی ہے۔ اون کے زوردار حملوں اور اونکی متواتر لوٹ مار سے ملک میں ایک زبردست بدامنی پھیلتی ہے۔ تمام چیزیں ردوبدل ہوجاتی ہیں مکانات مسمار ہوتے ہیں بھاگ بھگیڑ مچتی ہے غرضکہ تمام ملک ایک پریشانی کی حالت میں پڑجاتا ہے اور یہ حالت کچھ روز تک کچھ ردوبدل کے ساتھ قائم رہ جاتی ہے۔ اتنے دنوں کے اندر ہندوستان کو کوئی موقع اپنے کسی چیدہ فن کو ترقی دینے کا نہ ملا اور اس وجہ سے کوئی نمونہ ہندوستان کے فنِ مصوری یا سنگ تراشی کا ہم لوگوں کے سامنے نظر نہیں آتا۔ اتنے وقت کی کوئی تاریخ ہندوستان کی بنسبت فنِ مصوری کی ہم لوگوں کے پاس نہیں ہے۔

یہاں تک کہ مغلوں کی سلطنت قائم ہوتے ہی ہندوستان کے اندر فن کا ایک نیا دروازہ کھلتا ہے اور یہ فن اپنے انتہائے کمال کو پہنچتا ہے اور اب اس وقت سے ایک اور نئی اور زبردست شاخ جو مسلمان مصوری کہی جاتی ہے شروع ہوتی ہے۔ مسلمان مصوری اسلئے کہ اب اس فن کی ترقی مغل بادشاہوں کے زیر نگرانی ہونے لگی جس وقت مغلیہ سلطنت کی بنیاد ہندوستان کے اندر ڈالی جارہی تھی۔ اوسوقت یہ فن مصوری ملک ایران میں شاہی سرپرستی کے ماتحت ایک نہایت ہی اونچے پیمانہ پر ترقی کررہا تھا چنانچہ بہزاد اوس زمانہ میں ایران کے اندر ایک نہایت ہی کامل مصور گذرا ہے۔

ف۔ ندیم لائق مضمون نگار کو یہاں پر یہ اشارہ کرنا چاہئے تھا کہ برہمنوں کے دور کے آغاز کے ساتھ خصوصًا فنِ سنگ تراشی کو سخت صدمہ پہنچا۔ بودھ کی لاکھوں لاکھ مورتیاں توڑ پھوڑ کر ڈال دی گئیں۔ اس دور کی ٹوٹی پھوٹی مورتیاں آج صوبہ بہار کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جا بجا درختوں کے نیچے پڑی ہیں۔ بعض مندروں کی پھر زینت بن گئی ہیں۔ برہمن دور کی اس بت شکنی سے فنِ سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونے ضائع ہوگئے۔ آج ہندوؤں میں سے نیم پڑھے لکھوں کا طبقہ ان بتوں کی بربادی کا ذمہ دار مسلمانوں کو سمجھتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اہلِ علم اس قسم کے شکوک کو بھی آہستہ آہستہ دور کریں۔

چنانچہ مغل شروع ہی سے اور تمام ایرانی فنون لطیفہ کے ساتھ ایرانی موئے قلم بھی اپنے دربار میں لائے اور قدر و منزلت کی جگہ دی۔ ہمایوں اکبر۔ جہانگیر وغیرہ نے مصوروں کو ایران سے بلا کر اپنے دربار میں متقرر کیا۔ ابوالفضل کی فہرست میں فرخ قلماک۔ ابوصمد شیرازی۔ میر سید علی تبریزی کے نام درج ہیں۔ اس کے علاوہ ان بادشاہوں نے ہندوستانیوں کو بھی ان ایرانی مصوروں کے زیر تعلیم رکھا اور ہندوستانی خیالات کی بنا پر ان سے تصویریں بنوائیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اسی وقت سے ایرانی اور ایرانی ہندوستانی قلم شروع ہوا کہ جس سے آگے چل کر لکھنؤ۔ پٹنہ۔ اور دکنی قلم ایجاد ہوئے۔ یہ لوگ دربار میں رہ کر ہر قسم کی تصویریں مثلاً شبیہ۔ جنگل کے شکار۔ تاریخی واقعات۔ درباری مجلس۔ پھول پتیاں اور جانوروں وغیرہ وغیرہ کی تصویریں بناتے ہیں۔ کام ان کا نہایت صاف اور اعلیٰ درجہ کا ہوتا تھا۔ کام میں نرمی انکی ایک خاص خوبی تھی اور ایرانی انداز انکی تصاویر سے صاف نمایاں تھے۔ رنگ زیادہ تر بیش قیمت پتھروں۔ لکڑی۔ دھات اور دوسری چیزوں سے تیار کرتے تھے۔ جہانگیر کے زمانہ تک یہ فن اپنے انتہائے کمال کو پہنچا رہا اور کافی عزت پاتا رہا۔ لیکن شاہ جہاں کے زمانہ سے فن مصوری کا وہ عروج نہ رہا بلکہ کچھ تنزلی کے آثار نظر آنے لگے۔ شاہ جہاں کو چونکہ عمارت بنانے میں زیادہ دلچسپی تھی۔ اس لئے اس فن سے اسکو کسی قدر بے توجہی رہی اور اسی وقت سے اس فن مصوری کے اندر تنزلی کی ابتدا ہوئی۔ بہرحال اسوقت تک دہلی میں تمام مصور اپنی جگہ پر قایم رہے اور "دہلی قلم" کہئے "ایرانی قلم" بھی کہنا چاہئے قائم رکھے رہے لیکن اورنگ زیب کے تخت نشین ہوتے ہی جس طرح تمام فنون پر آفتیں آئیں اس ضمن میں فن مصوری بھی شامل ہوگیا۔ کچھ قبل سے اسکی حالت نازک ہو ہی چکی تھی اب اس کے آخری دم ٹوٹنے کی باری آگئی۔ شاہی امداد جو ایسے فنون کی ترقی کے لئے ضروری ہوتی ہے اور جو اس فن کو اب تک ملتی آئی وہ اس سے محروم کر دیا گیا۔ بلکہ اورنگ زیب کے صوفیانہ مزاج نے اور ایسے فنون سے اوسکی خاص نفرت نے اس فن کی تباہی میں پوری پوری مدد پہنچائی[1]۔ تمام مصور جو ہمیشہ بادشاہ کے خاص درباریوں میں سمجھے جاتے تھے اور جن پر بادشاہ کی خاص نظر مہر باقی رہا کرتی تھی اب وہ اپنے کو بالکل بے پناہ محسوس کرنے لگے اور اپنی اوقات گذاری کے لئے اب کوئی دوسری جگہ تلاش کرنے لگے۔ ہاں ایک بات اورنگ زیب کے زمانے میں یہ ضرور ہوئی کہ اوسکی دکن کی فتحیابی سے اس فن میں ایک نئی شاخ جسے دکنی قلم کہتے ہیں شروع ہوا۔ یہ قلم دلی قلم سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ دکن والے اپنے کام میں سونا زیادہ استعمال کرتے تھے۔ اور رنگ بھی بہ نسبت دلی والوں کے کچھ شوخ لگاتے تھے۔

بہر کیف اس فن کی حالت روز بروز ابتر ہی ہوتی گئی اور اس کا چرچا اب صرف درباریوں اور امرا کے درمیان باقی رہ گیا۔ اس کے بعد مغل خاندان کے بادشاہوں سے جدا ہو کر کچھ دن اودھ کے نوابوں نے اسے سایہ دیا اور قدر بھی اسکی کی۔ کئی گھرانے مصور فن کے آکر اودھ کے صوبوں میں بس گئے اور اپنے پرانے طریقے پر مصوری کرنے لگے۔ چنانچہ یہیں سے "لکھنؤ قلم" شروع ہوا جو کہ دلی قلم کا ایک خاص جزو ہونے کی وجہ سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ کام میں صفائی ضرور تھی لیکن دلی والوں کی طرح اونچے پیمانہ کا نہ تھا۔ اپنی تصویروں میں یہ لوگ سفید زمین زیادہ تر رکھا کرتے تھے اور یہ انکی ایک خاص خوبی تھی۔

دلی سے جب مصورین اپنی روٹی کی تلاش میں باہر نکلے اور ادھر ادھر بسنے لگے تو کچھ صوبہ اودھ میں بسے اور کچھ صوبہ بہار و بنگال میں آکر بسے۔ صوبہ بہار میں علاوہ اور جگہوں کے ان لوگوں کی خاص جگہ پٹنہ۔ بانکی پور۔ داناپور وغیرہ تھی۔ ان تین جگہوں میں سے پٹنہ میں زیادہ تعداد میں بسے اور زیادہ تر محلہ لودی کٹرہ اور محلہ مغلپورہ میں آباد ہوئے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ صرف پٹنہ سٹی میں قریب ایک سو گھرانے مصوروں کے تھے۔ جن میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔

---

[1] نوٹ: ہم اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں کیا کیا چیزیں ممنوعات میں داخل تھیں اس سلسلہ میں اس کے خلاف فرد قرارداد جرم جو تیار کی گئی ہے اس میں جیسا کہ مضمون نگار نے لکھا ہے فن مصوری کے خاتمہ کرنے کا الزام بھی ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر پر اس نوعیت کے الزامات کی کیا حقیقت ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے اڈیٹر ندیم کے ایک مقالہ کا مطالعہ دلچسپ ثابت ہوگا۔ جو "کیا عالمگیر کے عہد میں تاریخ نویسی قانوناً جرم تھی؟" کے عنوان سے معارف بابت ماہ [illegible] میں شائع ہوا ہے "عالمگیر کے عہد میں فن مصوری" پر اگر جناب عبداللہ صاحب چغتائی (لاہور) یا پروفیسر نجیب اشرف ندوی (بمبئی) یا کوئی اور صاحب نظر نظر ڈالیں تو ایک مفید خدمت ہوگی۔ ندیم کے مضمون نگار کے اس بیان میں اس موقع پر جو تضاد ہے۔ وہ آشکارا ہے۔ ایک طرف وہ فرماتے ہیں کہ اورنگ زیب کے تخت نشین ہوتے ہی دوسرے تمام فنون کی طرح فن مصوری پر بھی آفت آگئی۔ اور دوسری طرف دو سطروں کے بعد اقبال کرتے ہیں کہ عالمگیر کے فتح دکن کے بعد فن مصوری میں ایک نئے قلم یعنی "دکھنی قلم" کی داغ بیل پڑی۔ اور یہ قلم دلی قلم سے ملتا جلتا تھا۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ دلی قلم جو ایرانی قلم سے ماخوذ تھا۔ دکھنی قلم میں ملا اور اس سے تمام قلم میں حسن کی آمیزش سے ایک نیا قلم تیار ہوا۔ اس لحاظ سے فن مصوری کو عالمگیر کے عہد میں ترقی ہوئی یا تنزلی اس کا فیصلہ اہل نظر کریں۔

سچ پوچھا جائے تو فن مصوری میں "پٹنہ قلم" کے بہ موجد اوسی دلی گروہ کے ایک جزو تھے اور کام میں بھی لکھنؤ والوں کی طرح دلی قلم کا رنگ رکھتے تھے۔ ڈرائنگ میں ضرور اچھے تھے لیکن رنگ کے معاملہ میں انکا انداز کچھ بھاری پن لئے ہوئے تھا۔ رنگ لگانے کا اندازہ دلی والوں سے ملتا جلتا تو ضرور تھا لیکن اونکی تصویروں میں وہ ملائمیت اور نرمی جو دلی قلم میں نمایاں ہوتی ہے نظر نہیں آتی۔ پرواز (؟) دلی والوں کی طرح ابلا کچی دانہ او کھیے پڑتے سے تھے رنگ زیادہ تر شوخ استعمال کرتے تھے۔ تصویروں کے اندر سونے کا استعمال بھی کرتے تھے اور آگے چل کر ادرق کی صورت دونوں حالت میں لگاتے تھے۔ ہاتھی دانت کے اوپر چھوٹی چھوٹی اور بہت باریک کاموں کی تصویر بنانا بھی اپنے ساتھ ضرور لائے تھے لیکن ہاتھی دانت کے اوپر کام باریک ہونے پر دلی والوں سے کچھ بھدا ہوتا تھا اور صفائی بھی اوس درجہ کی حاصل نہ کر پاتے تھے۔ ابرق پر مصوری انکی ایک خاص جدت تھی اس کے کچھ نمونے ابھی تک خدا بخش لائبریری اور کچھ پٹنہ اسکول آف آرٹ میں نظر آتے ہیں۔ تصویروں میں غبیہ تو بناتے ہی تھے لیکن یہ لوگ زیادہ تر ہر روز کی نظر سے گذرتی ہوئی چیزوں اور جانوروں اور چڑیوں کی تصویریں زیادہ تر بناتے تھے۔ کیونکہ دلی والوں کی طرح ان کا ساتھ دربار سے تو تھا نہیں کہ انکی مصوری کے نمونوں میں سلطنت اور دربار کے مناظر کی بہتات ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ روزانہ کی پیش پا افتادہ چیزیں انکی مشق کا تختہ رہیں۔ اس قسم کے متعدد نوادر پٹنہ اسکول آف آرٹس کی گیلری میں محفوظ ہیں۔

ان کے کام کے تمام انداز دلی والوں سے ملتے جلتے تھے فقط دلی والوں کی طرح کام میں ملائمیت اور نرمی حاصل نہ کر سکتے تھے۔ پھر انگریزی حکومت کے اثرات ان کے موئے قلم سے بھی آشکارا ہوئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی تصویروں میں بہت جلد رومی یعنی انگریزی قلم کے انداز بھی اوتار لئے گئے۔

پٹنہ قلم کے اہل فن رنگ خود سے تیار کرتے تھے اور باریک سے باریک قلم بھی گلہری کے بال سے خود تیار کرتے تھے۔[1] رنگ کچھ تو پھول اور کچھ دھات اور قیمتی پتھروں سے نکالا کرتے تھے مثلاً سفید رنگ سیپ یا موتی جلا کر بناتے تھے۔ لال رنگ کرم دانے سے۔ زرد رنگ ہڑتال پتھر ریوند چینی لکڑی۔ زنگار دھات سے بنا تھا۔ اوسیطرح سیاہ کاجل سے تیار ہوتا تھا۔ نیلا نیل اور لاجورد پتھر سے تیار ہوتا تھا۔ غرضکہ اسی طرح تمام رنگ اپنے مصرف کا اپنی دیسی ہی چیزوں سے بنا لیا کرتے تھے۔ چنانچہ بصد عاجزی کے ساتھ بطور نمونہ کے میں دو تصویریں خاص پٹنہ قلم کی اپنے اسکول آف آرٹ کے مجموعہ سے اس پرچہ میں شائع بھی کراتا ہوں اور آئندہ بھی شائع کرانے کی امید رکھتا ہوں۔ ناظرین ان تصویروں سے "پٹنہ قلم" کے طرز کا ایک اندازہ لگا سکتے ہیں۔

بہرکیف سب ہوتے ہوئے بھی زمانہ ہمیشہ ان لوگوں کے ناموافق ہی رہا اور یہ لوگ روز بروز مٹتے اور برباد ہی ہوتے گئے۔ جے رام داس جی۔ جمنا پرشاد۔ شیو لال جی۔ شیو دیال جی۔ پھیرو جی۔ مرزا لفضا مہدی وغیرہ وغیرہ اپنے وقت میں اچھے اور بہت ہی اعلیٰ درجہ کے مصور گنے جاتے تھے۔ اب اس وقت موجودہ زمانہ میں صرف دو گھرانے قابل ذکر موجود ہیں ان میں سے ایک تو بابو مہادیو لعل صاحب کا گھرانہ اور دوسرا بابو اشوری پرشاد کا۔ اب یہی دو گھرانے بلکہ یہی دو شخص پٹنہ قلم کے خاص آدرچے ہوئے یادگار زمانہ نمونہ باقی رہ گئے ہیں جن کے کاموں میں ابھی وہی دلی کا رنگ نظر آتا ہے۔ بابو اشوری پرشاد تو اب کلکتہ میں قیام کرتے ہیں اور بابو مہادیو لعل صاحب بہت ضعیف ہو کر کام سے مجبور ہو گئے ہیں۔ ان کے کام کے نمونے مہاراجہ رام نرائن کے خاندان والوں کے پاس بہت کافی تعداد میں موجود ہیں اور دوسرے ان کے کام پٹنہ اسکول آف آرٹ میں بھی کافی دکھائی دیتے ہیں۔ آپ نے اپنے ہنر کو بہت کچھ پھیلایا اور کئی شاگرد بھی تیار کئے۔ چنانچہ اسوقت بھی جو کوشش اس فن کو پھیلانے کی پٹنہ اسکول آف آرٹس کے ذریعہ صوبہ بہار میں ہو رہی ہے وہ بھی آپ ہی کے شاگردوں کی ہے اور دراصل آپ ہی کی توجہ کی بدولت ہے۔ افسوس یہی ہے کہ آپ اور بابو اشوری پرشاد کے بعد پٹنہ قلم اپنی خاص خوبی کو لیکر اس صوبہ بہار سے معدوم ہی ہو جائے گا۔ اور فقط اس کا افسانہ ہی باقی رہ جائے گا۔

---

[1] ندیم - افسوس کہ یہاں پر فاضل مضمون نگار کے قلم کے بعض فقرے صحیح طور پر پڑھنے میں نہ آ سکے۔

ندیم کی تاریخ اشاعت متعین ہو گئی

اب ندیم التزام کے ساتھ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو دفتر سے روانہ ہو جایا کرے گا۔

"منیجر"

حضرتِ صوفی منیری کی تاریخ گوئی کا ایک شاہکار

از جناب رخشاں ابدالی، اسلام پوری

حضرتِ صوفی منیری (سنہ ۱۲۵۲ھ ۔ سنہ ۱۳۱۸ھ) اپنے وقت کے ایک باکمال شاعر تھے، آپ کو حضرت غالب سے تلمذ تھا۔ آپ کے سمندِ فکر کی جولان گاہ اُردو ہی کی وادی ... نہیں، بلکہ زمین پارس بھی تھی، اور نثر و نظم دونوں ہی ہیں۔ آپ نے اتنی وقیع یادگاریں چھوڑی ہیں جن میں بعض منظرِ عام پر آکر قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہیں اور بعض ہنوز پردۂ گمنامی میں مستور ہیں۔ ان سطور سے مقصود آپ کے حالات پیش کرنا نہیں ہے کہ یہ راقم کے قلم سے رسالہ "معارف" (اعظم گڑھ) ماہ جون سنہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہو چکے ہیں، بلکہ اس احساس کے پیشِ نظر کہ حضرت صوفی کی مختلف خصوصیات و حیثیات پر روشنی ڈالی جائے۔ آپ کی نثر نگاری سے روشناس کرایا جائے۔ مثنوی نگاری کے کمالات نمایاں کئے جائیں اور تاریخ گوئی کی جھلک دکھائی جائے، آپ کی شاعری کے ان تمام پہلوؤں کو ایک ایک کر کے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ آج کی صحبت میں حضرت صوفی منیری کی تاریخ گوئی کا ایک نمونہ پیش کر رہا ہوں۔

حضرت شاہ اعظم علی عرف شاہ بیکن فردوسی منیری رح کا شمار منیر شریف کے ممتاز بزرگوں میں ہے، حضرت جناب صوفی کے ماموں تھے، آپ کا وصال سنہ ۱۲۸۰ھ میں ہوا ہے۔ حضرت صوفی نے آپ کی تاریخ وفات نظم کی ہے، نظم کی کل کائنات پانچ شعر ہے، لیکن کمال یہ ہے کہ سات سو تیس طرح سے تاریخ نکلتی ہے۔ مثلاً ہر مصرعہ علیحدہ علیحدہ تاریخ بتاتا ہے۔ تمام منقوطہ حروف یکجا کئے جائیں تو تاریخ نکل آتی ہے، اسی طرح حروف مہملہ کی یکجائی سے ایک تاریخ نکل آتی ہے۔ خود حضرت صوفی کے الفاظ میں اس کی تفصیل یہ ہے :۔

تاریخ وصال جناب غفراں مآب حضرت شیخ محمد اعظم علی عرف شاہ بیکن فردوسی منیری قدس اللہ سرہ العزیز

کہ ہر مصرعش تاریخ است وسوای آن حروف منقوطہ یک مصرع با حروف منقوطہ دیگر مصاریع از ہر مصرعہ کہ خواہند بشمر ند تاریخ است و ہمچنیں حروف مہملہ یک مصرع با حروف مہملہ دیگر مصاریع حساب کنند تاریخ یابند و ہمچنیں حروف منقوطہ ایں و مہملہ آں و مہملہ ایں و منقوطہ آں و شنجرفی با شنجرفی و سیاہی با سیاہی، و شنجرفی با سیاہی ۔ و سیاہی با شنجرفی، و شنجرفی با مہملہ، یا با منقوطہ، و سیاہی با مہملہ یا با منقوطہ ہر گونہ کہ شمار کنند تاریخ باشد، جملگی ہفتصد و سی نوع تاریخ بر می آید بدیں تفصیل سنہ ۱۲۸۰ھ

ہر مصرع مادہ تاریخ است

۱۰

منقوطہ با منقوطہ	مہملہ با مہملہ	منقوطہ ایں و مہملہ آں	مہملہ ایں و منقوطہ آں	شنجرفی با شنجرفی
۴۵	۴۵	۴۵	۴۵	۴۵
سیاہی با سیاہی	شنجرفی ایں و سیاہی آں	سیاہی ایں و شنجرفی آں	شنجرفی ایں و منقوطہ آں	
۴۵	۴۵	۴۵	۴۵	
منقوطہ ایں و شنجرفی آں	شنجرفی ایں و مہملہ آں	مہملہ ایں و شنجرفی آں	سیاہی ایں و منقوطہ آں	
۴۵	۴۵	۴۵	۴۵	
منقوطہ ایں و سیاہی آں	سیاہی ایں و مہملہ آں	مہملہ ایں و سیاہی آں	جمع کل	
۴۵	۴۵	۴۵	۷۳۰	

تاریخ

قطب اوج وقت عالی وجہ عید روزگار
جلوۂ صبحِ ہُدا صافی نفس قدسی شعار

کردہ جاں تسلیم حق ہادی بدیں ماہ ورا
شاہ بیکن او وجہ علم یقیں طارم وقار

رکن حج لطف شایاں کعبۂ فردوسیاں
معدنِ جود و صفا و اہل صدق واعتبار

کعبۂ حاجات صوفی کو حرم معنی مطاف
عیسئ اوجِ حقیقت وا دل پردہ دار

سال شد کل جملہ اے دل دیگر از جمعش بہم
واں بشنجرف و سواد وحملہ و نقطہ دار

جملہ ہائے شنجرفی

قطب وعیدِ روزگار ، صبح صافی نفس قدس ، جان تسلیم ما ، شاہ بیکن ارم وشان فرد ، معدن صفا وصدر ، کعبہ جا کو حرم معنیِ مطاف ، اوج حقیقت ، واشد گل دیگر بہم بشنجرف ۔

گوتم بدھ کے قبل جنوبی بہار[1]

از جناب سید اظہر الحق صاحب قادری سونبرساوی

درحقیقت گوتم بدھ کی پیدائش کے قبل بہار کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے۔ لیکن ہندو مذہب کی مذہبی کتابوں سے کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان سے قدیم بہار کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ گوتم بدھ کی پیدائش کے قبل (سنہ ۵۶۳ ق م) بہار کسی ایک حکمراں کے ماتحت نہ تھا بلکہ کئی ریاستوں میں منقسم تھا۔ مگدھ (Magadh) اور انگا (Anga) جنوبی بہار اور ویسالی (Vaisali) اور ویڈیہا (Vidaha) شمالی بہار میں مشہور ریاست تھے۔

مگدھ قدیم مگدھ دراصل آجکل ضلع پٹنہ اور گیا کا نصف شمالی حصہ ہے مگر کچھ دنوں تک مگدھ سے صرف پٹنہ اور گیا کے یہ حصے مراد نہ لئے جاتے تھے بلکہ بہت وسیع صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ اسکی حد جنوب گنگا سے کو دندیا (Kindiya) کے شمالی حصہ تک جس کے مشرق میں مدگری (Madgagri) (مونگیر) اور مغرب میں چرندادری (Charanadri) (چونار) واقع ہے پھیلا ہوا تھا۔ اس سرزمین کے باشندے مگدھا (Maghadas) کہلاتے تھے۔ اور یہاں کی زمین "مگدھ دیش" کے نام سے پکاری جاتی تھی اسوقت آریہ (Arya) (یعنی ہندوں کی موجودہ اعلیٰ ذاتیں) اس صوبہ میں آباد نہ تھے۔ وجاسینی یا سمہیتا (Vajaseni-ya-Samhita) سے معلوم ہوتا ہے کہ مگدھوں کا کوئی مذہب نہ تھا نہ تو یہ برہمن تھے نہ شودر (نیچی ذات) مگدھ والے گانے کے وقت بہت ہنگامہ مچاتے اور یہی انکا پیشہ بھی تھا۔ چونکہ پوران سے ظاہر ہے کہ لفظ مگدھ کے معنی "بادشاہ کی شان میں زور و شور سے گانیوالا" ہے اسلیئے اگر انکا امتیازی وصف کوئی تھا تو یہی تھا

ویترا Vratyas کچھ عرصہ کے بعد آریوں کی ایک جماعت مگدھ پہونچی اور یہیں آباد ہوگئی۔ یہ لوگ آریہ رسم و رواج کے پابند نہ تھے۔ اسلئے شمالی بہار کے آریوں نے انلوگونکو ورتیا (Vratya) کے نام سے یاد کیا۔ اس جماعت کے رسم و رواج، طور و طریقہ، رہن سہن پنجاب کے آریوں سے بالکل جداگانہ تھے۔ انلوگوں کے کپڑوں پر سیاہ گوٹ لگی رہتی تھی۔ یہ لوگ نقری زیورات کا زیادہ استعمال کرتے تھے۔ اور دوسرے آریہ طلائی زیور پہنتے اس سے صاف عیاں ہے کہ ورتیا (Vratyas) بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور خاصے مہذب تھے۔ ورتیا قدیم آباد شدہ قوم مگدھوں سے بالکل ہل مل گئے اور کافی رعب و داب بھی انکا مانا جاتا تھا۔

کیکاٹا (Kikatas) نو وارد آریوں اور پرانی قوم مگدھوں کو کیکاٹا بھی کہے جاتے تھے۔ یہ لوگ صلح کن اور ترقی پسند تھے شہروں کے نام درختوں کے نام پر رکھے جاتے تھے یہ سنکر تعجب ہوگا کہ جنوبی بہار کا مشہور شہر پاٹلی پتر (Patliputra) پاٹلی درخت کے نام پر رکھا گیا تھا۔ دوسری جگہ کے آریوں جو مشرق کی طرف بڑھے آرہے تھے خواہش ظاہر کی کہ انلوگونکو بھی اپنی ذات میں شامل کریں۔ چنانچہ چند شرائط منظور کراکے انلوگون کو اپنی سوسائٹی میں داخل کرلیا۔

برہمنوں کا عروج پوران و مہابھارت سے پتہ چلتا ہے کہ برہمنوں نے کسطرح اپنا دارودورہ بہار میں شروع کیا۔ قصہ یوں ہے کہ ایک انگیرس (Angirasa) نامی ریشی (فقیر) بادشاہ کرندھم (Karandhama) کے یہاں پوجاری تھا اور یہ بادشاہ ویسالا (Vaisala) خاندان کا بادشاہ تھا۔ پوجاری کے خاندان میں دیرگھاتما (Dirghatma) نامی ایک لڑکا تولد ہوا جو کہ بدفعلی اور بدچلنی کی وجہ سے گھر سے نکال باہر کیا گیا۔ وہ وہاں سے سلطنت انادا (Aanava) (مونگیر و بھاگلپور) پہونچا۔ اور وہاں کے راجہ بالی (Bali) نامی نے اسکا خیر مقدم کیا۔ دیرگھاتما نے ایک شودر عورت سے شادی کی جس سے چند لڑکے بھی ہوئے۔ دیرگھاتما اور اسکے لڑکے وہاں

---

[1] یہ مضمون پروفیسر ڈاکٹر بی۔ بی مزمدار کے ایک انگریزی مقالہ سے ماخوذ ہے۔

سے گریورآج (Girivraja) (راجگیر) پہونچے اور اپنا سکہ جمایا۔ دیرگھاتما نے زندگی کے آخری دور میں راجہ بھرت کو مرید کیا۔ اسی کے بعد برہمن مذہب ہر چہار سو پھیل گیا۔

شہر گیا کی بنیاد۔ مہابھارت میں سولہ بادشاہوں کے نام درج ہیں، جو .... "راجہ چکرورتی" (Rajah chakravarti) کہلاتے تھے۔ ان سولہ بادشاہوں میں سے دو برہیدرتھ (Brihadratha) اور گیا امرترس (Gaya Amartayasa) بہار کے نامی بادشاہ گذرے ہیں گیا امرترس کا لڑکا اور کنیا کبجا (Kanya Kubja) کے بادشاہ کوسنا (Kusa) کا پوتا تھا۔ اسکے والد نے ایک سلطنت قائم کی جسکو بعد میں مگدھ کہنے لگے۔ اور گیا امرترس گیا پر حکمراں رہا۔ اور اسی کے نام سے یہ شہر مشہور ہوا۔

مگدھ کا زوال برہیدرتھ پسر باسو (Vasu) راجہ بھرت کے خاندان سے تھا۔ باسو ہی نے سلطنت گریوراج اور باسومتی (Vasumati) کی بنا ڈالی تھی۔ مہابھارت سے معلوم ہوتا ہے، مگدھ کا پایہ تخت گریوراج تھا۔ یہ ایک بہت ہی مستحکم شہر تھا جسکے چاروں طرف سلسلہ کوہ تھا جراسندھ (Jarasandha) کے وقت مگدھ عروج پر تھا۔ اسنے اپنے اطراف میں یعنی متھرا (Mathura) تک قوت بڑھائی۔ اور یہاں کے بادشاہ کنس (Kansa) نے جراسندھ کی لڑکیوں سے شادی کی، اپنے سسر پر بھروسہ کرکے اپنی رعیت کو اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ نہ باقی رکھا کرسنا (Krishna) نے کنس کو موت کے گھاٹ اتارا یہ اطلاع پاتے ہی جراسندھ برہم ہوا اور متھرا پر راجہ بھوج اور کرشن کے خلاف چڑھائی کی یہ لوگ کچھ دنوں اسکا مقابلہ کرکے گجرات آکر دوارکا (Dwarka) میں آباد ہو گئے اسکے بعد جراسندھ ارجن اور بھیم کے ہاتھ قتل کیا گیا۔ اسکے مرنیکے بعد ہی مگدھ کی شہرت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

سلطنت انگا (ANGA) سلطنت انگا مگدھ کے مشرق میں واقع تھی اسکا دارالسلطنت (Capital) چمپا تھا ایک طرف چمپا اور دوسری جانب دریا گنگا رواں تھا موجودہ چمپانگر اور چمپاپور (بھاگلپور) قدیم دارالسلطنت کے مناظر پیش کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگ بحری سفر کرنا خوب جانتے تھے۔ اور دوسرے ممالک سے تجارت بھی کرتے تھے کچھ عرصہ کے بعد چمپا سے کچھ لوگ کوچن چین (Cochin China) جاکر آباد ہو گئے، سلطنت انگا کی بنا ایک راجہ انگا ہی نے ڈالی تھی

ویدک تمدن جنوبی بہار پہلے ایک غیر متبرک سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اسکے بعد اسکو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی ویدک تمدن کی اشاعت میں جنوبی بہار کا نمایاں حصہ تھا اسلئے اسکی شہرت دور پھیلی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مضافات گیا میں ساوتری استھان (ساوتری کو پہچاننے کی جگہ) تھا۔

رامائن سے معلوم ہوتا ہے کہ فقیر وشوامتر (Vishwamitra) نے رام اور لکشمن کو جبکہ یہ دونوں فقیری لئے ہوئے تھے۔ دریا سون (Sone River) کے کنارے پر لایا۔ وشوامتر نے بھوج قوم (Bhoj Tribe) کے ساتھ کچھ جشن بھی منایا اور انلوگوں کو۔ بھوج (Sone Bhoj) کہا، موجودہ بھوج پرگنہ جو کہ بکسر (Buxar) سب ڈویزن میں ہے اسی بھوج قوم کے نام سے مشہور ہے اس بھوج پرگنہ کو اجین (Ujjain) کے راجہ بھوج سے کچھ تعلق نہ تھا۔

انہیں تاریخی حوادث کے بعد جنوبی بہار کے متعدد مقامات کو مذہبی عظمت حاصل ہوئی جو آج تک قائم ہے۔

صوبۂ بہار کا ایک دلکش اجمالی مرقع

از جناب سید شاہ قاسم غنی صاحب رئیس گیا

نوٹ: بالا ئے ایک بسیط مضمون از خاندان مخدومی مسٹر نصیر الدین حسین نعیم مدظلہ بیرسٹر ایٹ لا سابق اودھ کمشنر انکے علمی ذخیرہ میں محفوظ تھا۔ یہ مضمون چند سال پیشتر کا لکھا ہوا تھا۔ راقم سطور نے اسکی اشاعت "بہار نمبر" کیلئے مناسب سمجھی لیکن عدم کی تنگی داماں کے سبب اس بسیط مقالہ کی تلخیص مزید ضروری تھی۔ ذیل میں اس کا تلخیص ممدوح موصوف مدظلہ کے شکریہ کے ساتھ پیش کی۔ نیز ادھر چند سال میں صوبہ کیلئے جو بعض نئی ترقیاں ہوئی ہیں۔ انکے اشارات بڑھا دیے گئے ہیں۔ تواصل مضمون مذکورہ تاریخی ہوگا۔ وہاں موضوع پر غیر معمولی معلومات کا حامل ہے۔ امید ہے کہ ناظرین موصوف کے اس مقالہ کی تلخیص دلچسپی سے پڑھیں گے ——— قاسم غنی

بہار بہت قدیم آبادی ہے۔ مگدھ دیش کا یہی دار السلطنت تھا موریوں کی سلطنت یہان بہت قدیم زمانہ میں تھی اور بدھ مذہب کے ماننے والے بھی بہت سے سلاطین یہان گذرے ہیں جین مذہب کی بنا بھی اسی علاقہ میں پڑی۔ اسکی انہیں خصوصیتوں سے پورے صوبہ کا نام بھی بہار ہی رکھا گیا۔

بارھویں صدی عیسوی میں محمد بختیار خلجی نے بہار کو فتح کیا پھر سنہ ۱۱۹۳ء میں مسلمان صوبہ دار بنگالہ کے ماتحتی میں آیا اسکے بعد سنہ ۱۳۳۰ء میں صوبہ بہار کے دکھن کا حصہ دلی میں شامل کر لیا گیا اور اتر کا حصہ تھوڑے زمانہ تک صوبہ بنگال کی ماتحتی میں رہا پھر سنہ ۱۳۹۷ء میں پورا بہار جونپور کی سلطنت کی ماتحتی میں چلا گیا سلاطین مغلیہ نے بھی ابتدأً شہر بہار ہی کو اس صوبہ کا دار السلطنت قرار دیا سنہ ۱۷۶۵ء میں صوبہ بہار صوبہ بنگال میں شامل کر لیا گیا۔ پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں رہا سنہ ۱۹۱۱ء میں پھر بہار اڑیسہ مل کر ایک صوبہ بنایا گیا۔ اور ایک خاص گورنر کی ماتحتی میں اس کی ساری چیزیں صوبہ بنگال سے الگ کر دی گئیں اور اس صوبہ کا دار السلطنت پٹنہ ہی قرار دیا گیا۔ اس صوبہ کی علحدگی اور مستقل گورنری ہونے میں سر علی امام مرحوم نے بہت بڑا حصہ لیا۔ اور یہ انہیں کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ آج صوبہ بہار کی ایک الگ ہستی ہے اور ہائیکورٹ یونیورسٹی وغیرہ سب اسکے اپنے محکمے ہیں۔ اور یہ دوسرے صوبہ کا اب کسی امر میں محتاج نہیں ہے سنہ ۱۹۳۵ء سے صوبہ اڑیسہ بھی خارج ہو گیا۔ اور بہار مستقل صوبہ قرار پا گیا۔

قصبہ بہار آج کل بختیارپور جنکشن سے راجگیر تک ریل کی ایک چھوٹی لاین گئی ہے جس نے بہار کو پٹنہ اور راجگیر سے ملا دیا ہے اور بہار ہی میں سب ڈویزن کا افسر بھی رہتا ہے اولیاء اللہ کے مزاروں کی کثرت کی وجہ سے اب تک بہار شریف کا قدیم اعزاز مسلمانوں میں باقی ہے گو چھپانہ ندی کے سوکھ جانے کیوجہ سے اکثر محلوں میں ریت پڑ گئی ہے۔ بہار آجکل چند گلیوں اور انکی شاخوں میں آباد ہے یہاں کے اکثر مقبرے یا تو اینٹوں سے بنے ہوئے ہیں یا پتھر سے تراشے ہوئے ہیں نووارد کی نگاہ میں اسکی پوری آبادی پرانے کھنڈروں پر آباد نظر آتی ہے۔ جا بجا پختہ قبریں ملتی...... ہیں۔ آبادی اجڑتی اور بستی گئی ہے۔ کہیں کہیں مکانوں کے اندر بھی قبریں آگئی ہیں یہاں کے آثار قدیمہ میں ایک قلعہ ہے جو کہ اونچی زمین پر واقع ہے اس قلعہ کی چہار دیواریاں پتھر کی بنی ہوئی تھیں لیکن اب یہ قلعہ ویران ہے اس کے بیچ میں ایک درگاہ حضرت قادر قمیش رح کی ہے اور اس سے تھوڑی دور پر ایک درگاہ حضرت مخدوم شاہ احمد چرم پوش کی ہے۔ اسکا پھاٹک گیارہ فیٹ اونچا اور سات فیٹ چوڑا ہے اس پر نازک نقاشی تھی۔ آبادی کے اتر اور پچھم ایک پہاڑی کی چوٹی پر ملک ابراہیم بیا کا مقبرہ ہے جس کے ارد گرد دس اور مجاہدین کے مزار ہیں۔ ملک بیا کے مزار کے اوپر ایک گنبد بنا ہوا ہے اور روضہ پر جو کچھ لکھا ہوا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ انکا انتقال سنہ ۱۳۵۳ء میں ہوا۔ یہ ایک بہت ہی مشہور مجاہد تھے۔ انہوں نے روہتاس گڈھ کے ہندوؤں کو سخت شکست دی تھی حضرت مخدوم شیخ شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ (جنہیں مخدوم الملک کہتے ہیں) کے مزار سے اس قصبہ کو شرف فضیلت حاصل ہے یہ درگاہ سنہ ۱۵۶۹ء میں تعمیر ہوئی اس کی زیارت کو لوگ دور دور سے آتے ہیں اور حضرت مخدوم الملک کا سالانہ عرس ۵ شوال کو ہوتا ہے۔

چھوٹی درگاہ کے نام سے حضرت بدر عالم کا مزار مشہور ہے یہ بزرگ بھی برگزیدہ اولیاء میں سے تھے۔ چاٹگاؤں سے آکر بہار میں بس گئے تھے۔ انکا انتقال سنہ ۱۴۴۰ء میں ہوا ہے یہاں کی جامع مسجد اکبر کے وقت میں سعید خان صوبہ دار بہار نے سنہ ۱۶۰۱ء میں بنائی تھی جو آجتک قایم ہے

جو اب تک قایم ہے۔ حبیب خان نے جو خاندان سور سے تھا ایک تالاب اور ایک مسجد سنہ ۱۶۳۲ء میں بنائی تھی

صوبہ بہار

بہار کا صوبہ جو زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے وہ گنگا کی وادی میں آباد ہے۔ نیپال کی ترائی سے چھوٹا ناگپور کی پہاڑی تک پھیلا ہوا ہے یہ چند کمشنریوں میں تقسیم ہے۔ پٹنہ کمشنری کا رقبہ ۱۱۱۵۴ مربع میل ہے جسکی آبادی ۶۲۲۹۴۲۵ اسمیں ترہٹ کا رقبہ ۱۱۵۹۸ مربع میل ہے جن میں ۱۰۷۳۹۲۴ آدمی بستے ہیں۔ بھاگلپور کمشنری کا رقبہ ۱۸۵۸۳ مربع میل ہے اس میں ۸۷۵۹۰۱ آدمی بستے ہیں۔ اس صوبہ کی آبادی ہندوستان میں ہر جگہ سے زیادہ گنجان ہے اسمیں چند در چند ریلوے لائن بن گئی ہیں اور اسمیں کئی کمپنیوں کی گاڑیاں چلتی ہیں۔ یہ صوبہ بندوبست دوامی کا مرکز ہے جہاں زمینداروں کی کثرت ہے زبان یہاں کی اردو ہے اور کہیں کہیں بھاشا آمیز یہاں کے لوگ پچھم کے لوگوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ زمین اسکی مسطح ہے سوائے مونگیر اور پورب دکھن کے علاقوں کے۔

دریائے گنگا بکسر میں صوبہ بہار میں داخل ہو کر پورب طرف بہتا ہے اور راج محل میں صوبہ سے باہر نکل جاتا ہے۔ گنگا کے اوتر طرف سارن، چمپارن، ترہٹ، پورنیہ اور مونگیر کے اضلاع کے کچھ حصے پڑتے ہیں دکھن جانب گنگا کے شاہ آباد اور پٹنہ گیا سنتال پرگنہ اور باقی حصہ مونگیر اور بھاگلپور کا پڑتا ہے یہ تقسیم فطرتی ہے اور رقبہ زمین کا اتر اور دکھن گنگا کے قریب قریب برابر ہے۔

آب وہوا

آب وہوا میں اس صوبہ کے اعتدال ہے جاڑا، گرمی، برسات تینوں فصلیں یہاں کی خوشگوار ہوتی ہیں۔ گرمی ویسی سخت نہیں پڑتی جیسے دلی وغیرہ میں۔ نہ ویسی سخت سردی یہاں پڑتی ہے جیسے پنجاب یوپی میں۔ بارش بھی اتنی کثرت سے نہیں ہوتی جیسے بنگالہ میں۔ گرمی اس صوبہ میں وسط مارچ سے لیکر جون کے آخر تک رہتی ہے۔ جولائی سے آخر ستمبر تک برسات رہتی ہے اکتوبر سے لیکر وسط مارچ تک جاڑے کی فصل رہتی ہے

صنعت وحرفت ومعدنیات

سارن چمپارن اور پورے ترہٹ میں شورہ صاف ہو کر کلکتہ روانہ ہوتا ہے سوت کے کپڑے اور تسر کے کپڑے بہار میں نہایت اچھے بنے جاتے ہیں ململ اور ڈھاکہ آج بھی بہار کے خاص کپڑے ہیں۔ تسر کے کپڑوں کی تجارت اب بہار میں نہایت اچھی طرح سے اور ایک بڑی تجارت ہے اور طرح طرح کے کپڑے اب بہار میں بنے جاتے ہیں۔ گرچہ بھاگلپور نے تسر کے کپڑوں کے بننے میں قصبہ بہار سے زیادہ ترقی کی ہے اور قریب قریب بنارس کے تسری کپڑوں کے اب بھاگلپور میں بھی تسری کپڑے بنے جاتے ہیں۔ سونے چاندی کی چیزیں اور زیور پٹنہ میں نہایت عمدہ بنتے ہیں۔ گیا کے اطراف میں کمبل کثرت سے بنے جاتے ہیں۔ کاغذ بھی بعض بعض ضلعوں میں صوبہ بہار کے بنائے جاتے ہیں اب ڈالمیا نگر کی کاغذ اور سمنٹ کی فیکٹری سے بہترین کاغذ اور سمنٹ تیار ہوتا ہے چھوٹا ناگپور کا علاقہ اپنے کوئلہ اور ابرک وغیرہ کی کانوں کیلئے مشہور ہے۔ رانچی میں لاکھ کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔

تعلیم

بہار اسلامی عہد سے پہلے اپنی تعلیمی ترقیوں میں شہرت عام رکھتا تھا جس کے حالات دہرانے کی ضرورت نہیں پھر مسلمانوں نے بھی یہاں سیکڑوں مدرسے بنائے اور ہر امیر وقت کی یہ شان تھی کے وہ تعلیم گاہوں کی مدد کو اپنا فرض سمجھتا تھا علما مسجدوں کے حلقوں میں مدارس بنائے ہوئے تھے وہ لوگوں کو مفت تعلیم دیتے تھے اور ان مدارس کے اخراجات کا سامان یوں ہوتا تھا کہ کسی امیر نے کسی مدرسہ کی سرپرستی اختیار کرلی اور کسی دوسرے امیر نے کسی دوسرے مدرسہ کی۔ پرانے شہروں میں ان کے نشانات آج بھی کثرت سے پائی جاتی ہیں

تعلیمی علمی ادارے

انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ضلع پٹنہ کی تعلیمی حالت یہ تھی کہ کسی تعلیم گاہ عامہ کا یہاں وجود بھی نہ تھا یا تو گرو یا کچھ مولوی امرا رؤسا کی طرف سے معین تھے۔ جو پنڈے یا مکتبوں میں لڑکوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔

یہاں کی عدالتوں کی زبان فارسی تھی اور ہندؤوں کو بھی ابتدائی تعلیم فارسی کی دی جاتی تھی حساب وکتاب بھی فارسی میں لکھا جاتا تھا۔ اور یہ کام اکثر کایستھوں کے سپرد تھا۔

جو لوگ فارسی میں خط کتابت کر سکتے تھے انکا لقب منشی تھا اور وہ اکثر خوشخط ہوتے تھے علماء کا کام فارسی سے لیکر عربی تک پڑھانا تھا جو اکثر نوجوانوں کو تعلیم دیا کرتے تھے اس زمانہ میں تقریباً بیس ہزار آدمی اس ضلع میں پڑھے لکھے تھے مستورات کی تعلیم اکثر چار دیواریوں

کے اندر رہوا کرتی تھی اور پردے کی وجہ سے غیر قوموں سے ان کی تعلیم کا موازنہ کرنا تو بیجا ہے یہ محال تھا۔ لیکن انکی لکھی ہوئی قلمی کتابیں بہت سے پرانے گھروں میں آج بھی پائی جاتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ پڑھی لکھی بیبیاں کم ہوتی تھیں لیکن ان .... میں جو قابل ہوتی تھیں ان کی خوشنویسی اور فارسی کی لیاقت ایسی ہوتی تھی کہ آجکل کے بہت سے پڑھے لکھے مردوں کو بھی ویسی خوشنویسی نصیب نہیں

سنہ ۱۸۶۰ء میں پہلے پہل پٹنہ کولیجیٹ اسکول گورمنٹ کی طرف سے کھولا گیا اور سنہ ۱۸۶۷ء سے سنہ ۱۸۷۱ء تک اس صوبہ میں گورمنٹ کی امداد سے چند اسکول کھولے گئے جن میں ایک ہزار پانچ سو طلبا تھے پٹنہ کالجیٹ اسکول کھلنے کے چند دنوں بعد پٹنہ کالج گورمنٹ کی طرف سے قایم ہوا اور اسمیں ایک قانون کی تعلیم گاہ بھی کھولی گئی۔

سنہ ۱۸۷۴ء میں ڈاکٹری کا ٹمپل میڈیکل اسکول گورمنٹ کی طرف سے کھولا گیا پھر پٹنہ نورمل اسکول بھی گورمنٹ نے کھولا۔

عورتوں کی عام تعلیم کے لئے سنہ ۱۸۸۰ء سے تعلیم گاہیں کھلنی شروع ہوئیں۔

جنوری سنہ ۱۹۰۹ء میں بادشاہ نواب رضوی کی مدد سے ایک تعلیمی کالج عورتوں کیلئے کھولا گیا جس میں انکی وقف کردہ سالانہ آمدنی ۲۷۶ روپے کی جاری ہے یہ کالج پہلے بتیاہوس میں قایم ہوا۔ لیکن حال میں گورمنٹ نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا اور اسمیں دستکاری سکھانے کیلئے بھی ایک تعلیم گاہ ہے اس کالج کی ایک ہندوستانی خاتون پرنسپل ہیں۔ اس کالج میں پردہ کا بھی انتظام ہے اور اکثر مسلمانوں کی لڑکیاں یہاں تعلیم پاتی ہیں۔ پھر پٹنہ یونیورسٹی یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۷ء سے کھلی اور کلکتہ یونیورسٹی کی جگہ تعلیم کی نگرانی کا انتظام صوبہ بہار میں یونیورسٹی نے کرنا شروع کیا۔ پٹنہ یونیورسٹی کیلئے ایک نہایت خوبصورت عمارت بانکی پور میں پٹنہ کالج کے قریب بن گئی ہے جس میں امتحان کا کمرہ بہت ہی شاندار ہے اور اسی عمارت میں یونیورسٹی آفس ہے۔ اسکے متعلق ایک پبلک لائبریری ہے جو خاص پروفیسروں کے لئے ہے۔

ضلع پٹنہ میں اول درجہ کے دو کالج ہیں ایک پٹنہ کالج دوسرے بہار نیشنل کالج حال میں سائنس کالج کی عمارت پٹنہ کالج کے قریب ہی بہت ہی شاندار بنائی گئی ہے اور اسمیں تمام آلات متعلق کمسٹری اور فزیکس اعلیٰ درجہ کے مہیا کئے ہیں اور اسمیں لائبریری بہت عمدہ بنائی گئی ہے مختصر یہ کہ ہر قسم کی سائنس کا انتظام یہاں اول درجہ کا ہوگیا ہے اور ایم۔ اس سی تک کی تعلیم یہاں ہوتی ہے

معلموں کیلئے ٹریننگ کالج بھی ہے اور قانون کی درسگاہ الگ بن گئی ہے

بانکی پور میں لڑکوں کے قیام کیلئے ہوسٹل بہار نیشنل اور پٹنہ کالج کے بن گئے ہیں جن میں مسلمانوں کا انتظام جدا ہے ہندؤں کا الگ

ٹمپل میڈیکل اسکول کا کمپونڈ اور اس کے آس پاس کی زمین لیکر پٹنہ پرنس آف ویلس میڈیکل کالج اور اسپتال بنائے گئے جس میں ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم دیجاتی ہے

بہار اسکول آف انجینیرنگ جو پہلے تھا اب وہ وسعت دیکر بہار انجینیرنگ کالج بن گیا ہے اور اسمیں عمدہ ترین تعلیم انجینیرنگ کی ہوتی ہے

عربی تعلیم کیلئے اعلیٰ درسگاہ سنہ ۱۹۱۹ء میں مدرسہ شمس الہدیٰ کے نام سے مسٹر سید نور الہدیٰ سی۔ آئی۔ ای نے قایم کیا اور اور ایک دو منزلہ عمارت اور ایک مسجد اس احاطہ میں بنائی جہاں مسلمانوں کو مذہبی تعلیم دیجاتی ہے اور اسکا انتظام گورمنٹ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے صغریٰ وقف اسٹیٹ کا مدرسہ عزیزیہ بہار شریف مدرسہ اسلامیہ بہار مدرسہ خانقاہ سہسرام اور مدرسہ سلفیہ دربھنگہ مدرسہ حنفیہ آرہ مدرسہ انوار العلوم گیا وغیرہ صوبہ کی ممتاز عربی درسگاہیں ہیں مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل اور جناب حاجی شرف الدین صاحب عزیزیہ بہار کے پرنسپل ہیں بانکی پور میں طبیہ اسکول بھی قایم کیا گیا ہے۔ جہاں یونانی طب پڑھائی جاتی ہے اور یونانی علاج ہوتا ہے جناب حکیم محمد ادریس صاحب مدرسہ طبیہ کے پرنسپل ہیں اور ویدک اسکول بھی گورمنٹ کی طرف سے قائم کیا گیا ہے

پٹنہ میں سب سے بڑی لائبریری خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ہے جسے سنہ ۱۸۹۰ء میں خان بہادر خدا بخش خاں سی۔ آئی۔ ای نے اسکو دو منزلہ عمارت میں کھولا اس کتب خانہ میں فارسی عربی کی نادر قلمی خوش خط کتابیں جمع ہیں بیشتر کتابیں ایسی ہیں جن کا واحد قلمی نسخہ اس لائبریری کی زینت ہے۔ اسکے ماسوا اور زبانوں کی بھی مفید کتابیں جمع ہیں۔ اسکا انتظام اب گورمنٹ کے ہاتھ میں ہے اور

جمعہ کے دن کے سوا ہر روز چھ بجے دن سے دس بجے دن تک پھر شام کو دو گھنٹے تک یہ لائبریری کھلی رہتی ہے اس کے پاس گورمنٹ نے کتب بینی کیلئے ایک ہال بنایا ہے جس میں عامہ خلقت جاکر کتابوں کا مطالعہ کرتی ہے یہ تعمیر گورمنٹ کے خرچ سے ہوئی ہے ......

...... اس لائبریری کے سکریٹری ان دنوں مولوی وہاب الدین خدا بخش بی اے بی ایل ہیں اور نادر قلمی کتابوں کی تحقیق کی خدمت مولانا مسعود عالم ندوی کے سپرد ہے مسٹر سچدانند سنہا نے اپنی بیوی کی یادگار میں ایک لائبریری کھولی ہے جس کا نام شریمتی رادھیکا انسٹی ٹیوٹ ہے اس کتب خانہ کیلئے ایک نیا مکان انہوں نے پٹنہ گیا روڈ پر بنایا ہے اور یہ بھی پبلک لائبریری ہے نئے علوم کا نادر ذخیرہ یہاں فراہم ہو رہا ہے ۔ گذشتہ سال آنریبل ڈاکٹر سید محمود سابق وزیر تعلیم صوبہ بہار نے گورمنٹ اردو لائبریری حکومت کی طرف سے قایم کی ہے یہ اردو کی خدمت کے سلسلہ میں انکا اہم کارنامہ ہے ۔ اس لائبریری کیلئے اورینٹل لائبریری کے بغل میں لا کالج کی پرانی عمارت اسکو دیدی گئی ہے اور یہ اب اپنی مستقل عمارت میں قایم ہے اس لائبریری کیلئے گذشتہ سال پہلی مرتبہ کتابوں کا ستھرا انتخاب ہوا تھا لیکن افسوس ہے کہ امسال اسکا التزام قائم نہیں رہا ۔ محض رطب و یابس کتابیں حکومت کے سالانہ عطیہ کو کسی طور پر صرف کردینے کی خاطر اکٹھا کیجا رہی ہیں ۔ ضرورت ہے کہ حکومت اپنی خاص توجہ اس جانب مبذول کرے اور کتابوں کے انتخاب کیلئے اہل علم سے مشورے حاصل کرے مولوی سید حسن آرزو صاحب پھلواروی اس لائبریری کے انچارج ہیں

طالب علموں کے ملنے جلنے کے لئے اور آپس میں اتحاد بڑھانے کیلئے چوہٹے میں بہار ینگ مین انسٹی ٹیوٹ کی عمارت بنائی گئی ہے جسمیں ہر طرح کی دلچسپی کا سامان مثلاً بلیرڈ کارڈ اخبارات وغیرہ مہیا کیئے گئے ہیں یہاں شام کو نوجوان باہم ملتے جلتے ہیں

پٹنہ کے دو اور کلب قابل ذکر ہیں ۔ ایک تو "بانکی پور کلب" ہے جو گنگا کے کنارے پر فضا مقام پر واقع ہے اس میں رقص و سرود کے جلسے ہوتے رہتے ہیں ۔ لیکن اس کلب کے ممبر بیشتر یوروپی ہیں ۔

دوسرا "نیو پٹنہ کلب" ہے ۔ اس کے قائم کرنے میں جسٹس اف ۔ آر ۔ رو، سر علی امام اور سر سلطان اور پی آر داس وغیرہ نے بڑا حصہ لیا تھا ۔ اس کے ممبران کی تعداد ۸۰ ہے ۔ جن میں ہندوستانی اور یوروپین دونوں ہیں ۔

پٹنہ "میوزیم" بھی نظر انداز کرنے کے لایق نہیں یہ ابھی حال ہی قائم ہوا ہے اسمیں کتابوں کا قیمتی ذخیرہ بھی ہے ۔

بانکی پور پٹنہ کی انجمن اسلامیہ بھی قابل ذکر ہے ۔ اس کا مقصد آپس میں ارتباط بڑھاتا ہے اور مسلمانوں میں ہر طرح کے آداب و اخلاق کی تعلیم کا پھیلانا ہے محلہ مرادپور میں اسکی شاندار عمارت ہے اور اس میں ہر طرح کے عام جلسے صوبہ کے مسلمانوں کی بہبودی کیلئے ہوتے رہتے ہیں اسمیں ایک بہت بڑا ہال ۱۹۰۵ء میں تعمیر کیا گیا ہے جسکے اوپر کی منزل میں گیلری اور اردو کا کتب خانہ ہے جس میں ہر شخص جاکر کتابیں دیکھنے کا مجاز ہے اور اس کتب خانہ میں اخبارات اور رسائل بھی آتے ہیں ۔

بھاگلپور میں ٹی ۔ این جوبلی کالج ہے ۔ بزاری باغ میں سینٹ کولمبس کالج اور اسمیں لڑکوں کیلئے دار الاقامہ بھی ہے یہ پادریوں کا بنایا ہوا کالج ہے

خاص قصبہ بہار میں نالندہ کالج دوسرے درجہ کا کالج ہے جسمیں ایف ۔ اے تک کی پڑھائی ہوتی ہے ۔ گرونسنگ اسکول اور بہار اسکول بھی قابل اعتماد تعلیمگاہیں ہیں پٹنہ کے دو انسٹیٹیوشن کا ذکر باقی رہ گیا ۔ ایک مسلم ہائی اسکول ہے جسکو گذشتہ سال مسلمانوں نے نئے جوش و ولولہ سے جاری کیا ہے امسال یہاں کے طلبہ نے میٹرک کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اسکے روح رواں مسٹر حیدر امام بیرسٹر اور ڈاکٹر سید عبد الحفیظ ہیں ۔ دوسرا پٹنہ اسکول اف آرٹس ہے جس میں صنعت و حرفت اور مصوری کی اعلیٰ تعلیم دیجاتی ہے حکومت نے اردو لائبریری کے پہلو میں اسکو عمارت دیدی ہے جناب رادھا موہن صاحب اسکے

گیا میں اسوقت تک افسوس کہ کوئی ڈگری کالج موجود نہیں چند ہائی اسکول ہیں ہادی ہاشمی ہائی انگلش اسکول سے اسلامیہ اسکول کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں ۔ مدرسہ انوار العلوم اس شہر کی دیرینہ عربی تعلیمگاہ ہے اس ضلع کے ممتاز قصبہ داؤدنگر میں سفٹن ہائی اسکول ہے جسکو اسکے ہر دلعزیز سکریٹری خانبہادر حکیم سید محمد صاحب خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں اسی طرح نوادہ، جہان آباد اور اورنگ آباد میں ہائی اسکول

سلہ یعنی جسٹس سید شرف الدین صاحب مرحوم کا وسیع سکونتی مکان مسمی چھجو باغ ہاؤس

جاری ہین اسی طرح ایک دوسرے قصبہ بیلا گنج میں ایک ڈگری کالج بھی قائم ہوگیا ہے خبر ہے کہ جناب لال جی بابو بیرسٹر کی کوششوں سے عنقریب شہر گیا میں بھی کالج کا افتتاح ہونے والا ہے ۔ . . . .

نئی سرکاری عمارتیں ۔ پٹنہ میں اس کے دار السلطنت ہونے کی حیثیت سے جو چند عمارتیں بنائی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں ایوان گورنری ۔ اس کی عمارت سہ منزلہ ہے اتر دکھن لمبی ہے ۔ زمین کی منزل پر آفس اور دربار کا کمرہ ہے جس کمرہ کی بلندی دو منزل تک چلی گئی ہے یہ کمرہ ۶۵ ½ فیٹ لمبا ہے اور ۴۳ فیٹ چوڑا ہے . . . . . .

. . . پچھم جانب دربار اور رقص کا کمرہ ہے اس کمرہ میں ٹیک کے تختے بچھے ہوئے ہیں جن کے نیچے کمانیاں دیکر لچک پیدا کیگئی ہے یہ سرکاری عمارتوں میں سب سے اخیر ہے پہلی منزل میں ملاقات کے کمرے اور کھانے کے کمرے ہیں جنکی لمبائی ۴۳ فیٹ اور چوڑائی ۳۳ فیٹ ہے اسکے احاطہ میں ایک سو ایکڑ زمین ہے جسمیں ٹینس کھیلنے کی جگہیں بنی ہوئی ہیں اور خوبصورت چمن پھولوں سے آراستہ ہیں ایوان گورنری کے پورب ایک بہت بڑی عمارت ۷۱۶ فیٹ لمبی اور ۳۴۶ فیٹ چوڑی ہے جس میں ایک سو پانچ کمرے ہیں پہلی منزل میں ۹۲ کمرے ہیں دوسری منزل میں . . . . . تیس آفس ہیں اور ۵۰۰ کلرک کام کرتے ہیں گھڑی کا ایک منارہ ۱۸۷ فیٹ اونچا بنا ہوا ہے یہ عمارت سکریٹریٹ کہلاتی ہے ۔

کونسل چیمبر ۱۹۲۰ء میں بنکر مرتب ہوا وہ سکریٹیٹ کے پورب ہے اور یہ عمارت بھی بہت ہی خوبصورت ہے ۔ کونسل چیمبر کا ہال کمرہ ۶۰ فیٹ لمبا اور ۵۰ فیٹ چوڑا بنا ہوا ہے ۔ ایک گیلری اُپر کی منزل میں بنی ہوئی ہے قانون ساز جماعتوں کے مباحثہ سے دلچسپی رکھنے والوں اور . . . . اخبارات کے نامہ نگاروں کو اس میں جگہ دیگئی ہے

دار السلطنت بہار کیلئے ۱۹۱۶ء میں ہائیکورٹ کی عمارت الہ آباد ہائیکورٹ کی وضع پر بنائی گئی سوائے اسکے اس میں جدت یہ کی گئی کہ سامنے پچھم رخ سنگ مرمر کی سیڑھیاں اور ایک بڑا گنبد بنایا گیا ۔

پٹنہ کا عجائب خانہ پہلے پہل ۱۹۱۵ء میں پٹنہ ہائیکورٹ کے اتر رخ کے بازو میں تھا مگر اب اسکی عمارت پٹنہ گیا روڈ پر نہایت خوبصورت بن گئی ہے اس عمارت کے چاروں کونے پر چار گنبد ہیں ۔

رجال

صوبہ بہار کی سرزمین میں بڑے بڑے علمائے کرام پیدا ہوئے علم اور کمال زمانہ قدیم سے اس کا مایہ امتیاز رہا ہے سلم العلوم حاشیہ میر زاہد ملا جلال وغیرہ یہاں کے علماء کی مشہور زمانہ کتابیں ہیں شیخ محب اللہ بہاری ۔ امین اللہ مرحوم نگرنہسوی مولانا علیم الدین حسین مرحوم مولانا شمس الحق مرحوم قاضی صادق علی مرحوم مولانا ولایت علی مرحوم مولانا احمد اللہ مرحوم مولانا یحیٰ علی مرحوم ۔ مولانا عبد القیوم مولانا عبد الرحیم مرحوم ۔ مولانا حکیم عبد الحمید مرحوم اور مولانا نظیر حسین صاحب مرحوم وغیرہ یہاں کے متقدمین اہل علم میں عالمگیر شہرت کے مالک ہیں

اولیائے کرام صوبہ کے مشہور اولیائے کرام میں حضرت تاج فقیہ اور ان کے اخلاف کو بلند مرتبے حاصل ہیں وہ خود اپنے علمی تبحر سے امام محمد تاج الفقہاء کہلائے ۔ ان کے پوتے حضرت مخدوم یحیٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو منیر ہی میں پیدا ہوئے آپ کا سنہ وصال ۱۲۹۱ء ہے آپ حضرت مخدوم شیخ شرف الدین بہاری قدس سرہٗ کے والد ماجد اور حضرت شیخ شہاب الدین پیر جگجوت قدس سرہٗ کے داماد تھے جنکا مزار شریف جیٹھلی میں ہے حضرت پیر جگجوت کی دوسری صاحبزادی بی بی کمال رحمۃ اللہ علیہا ہیں جو کاکو میں مدفون ہیں ۔ مخدوم شاہ یحیٰ منیری کا مزار بھی منیر ہی میں ہے ۔ اس مزار کے حلقے میں ایک مسجد بھی ہے جو ایک بڑے تالاب کے پورب واقع ہے ۔ اس تالاب میں سون سے ایک نہر گرائی گئی ہے جو ۴۰۰ فیٹ لمبی ہے مسجد اور حجرہ ابراہیم خان صوبہ دار بہار کا تعمیر کردہ ہے اسی کے قریب تھوڑی دور پر ۱۶۱۶ء میں ابراہیم خان صوبہ دار بہار نے حضرت مخدوم شاہ دولت کا ایک روضہ بنوایا ہے جسکی دیواروں پر پاکیزہ نقاشیاں ہیں اور ہر گوشے پر ایک نہایت ہی خوبصورت مینار بنا ہوا ہے اسکا گنبد بہت رفیع الشان ہے ۔ اس روضہ میں قرآن شریف کی آئتیں منقش ہیں اور اس احاطہ میں ایک خوبصورت مسجد بنی ہوئی ہے جسکے پھاٹک پر جو عبارت کھدی ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۶۱۹ء میں یہ عمارت بنی تھی مخدوم شاہ دولت کا روضہ چھوٹی درگاہ کے نام سے مشہور ہے اور مخدوم شاہ یحیٰ منیری کا مقبرہ بڑی درگاہ کہلاتا ہے ۱۲۳۰ء میں بابر بادشاہ حضرت مخدوم یحیٰ منیری کے روضے

پر زیارت کیلئے آیا تھا - اور اس نے مسجد میں جو متصل مزار مخدوم یحیٰ منیری ہے نماز ظہر ادا کی تھی - بارہویں شعبان کو یہاں میلہ ہوتا ہے جس میں تبرکات حضرت تاج فقیہہ کی زیارت کی جاتی ہے جیساکہ شروع میں بیان ہوچکا ہے حضرت مخدوم شیخ شرف الدین علیہ الرحمۃ کو مخدوم الملک کہا جاتا ہے اسی سے یہ ظاہر ہے کہ انکا پایہ فقر کس قدر بلند تھا انہیں علوم قرآن و حدیث میں بلند مرتبہ حاصل تھا آپکے مکتوبات کا مجموعہ خاص شہرت کا حامل ہے پھلواری شریف میں حضرت شاہ مجیب قدس سرہ اور حضرت منعم پاک قدس سرہ متین گھاٹ پٹنہ کے مناقب و فضائل بھی مشہور عام ہیں آج تک اس خاندان میں صوفیائے کرام ہوتے آئے ہیں -

یہ سب تو اگلے بزرگان دین تھے شاہ ولایت علی صاحب اسلام پور حضرت عطا حسین صاحب خانقاہ منعمیہ گیا حضرت شاہ قیام اصدق صاحب پٹنہ اور مولانا محمد سعید صاحب مرحوم اور شاہ امین احمد صاحب سجادہ نشین بہار حضرت شاہ عبدالقادر صاحب اسلام پور مولانا قاری شاہ سلیمان صاحب پھلواروی مولانا شاہ بدرالدین صاحب پھلواروی اور جناب شاہ چاند صاحب بیتھو شریف صوبہ بہار میں دور اخیر کے ارباب کمال میں گذرے ہیں -

ارباب کمال صوبہ بہار کے جواہر و یاقوت رقم حضرات کے تذکرات بھی لایق ذکر ہیں - جناب منشی الٰہی بخش صاحب (گیا) خوشنویسی کے بہت بڑے استاد گذرے ہیں جناب میر صاحب و مرزا صاحب پٹنہ میں نستعلیق کے اول درجہ کے ماہرین میں سے تھے جناب منشی واعظ علی صاحب مرحوم مغلپورہ ہفت قلم سمجھے جاتے تھے - نواب یوسف علی خان نستعلیق و شفیعہ اور مولانا تصدق حسین صاحب خلاق نگرنہسوی نستعلیق و شفیعہ کے ممتاز استاد تھے مجھے ان حضرات کی لکھی ہوئی وصلیوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے نوادر روزگار میں سے ہیں دور حاضر میں جناب شاہ اکرام الدین احمد صاحب عرفاں رئیس اسلام پور خطاطی کا پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں - اور اس دور زوال میں اس فن و کمال کو زندہ کئے ہیں موصوف کے یہاں مذکور الصدر اساتذہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وصلیوں کا نادر ذخیرہ جمع ہے

شعرا صوبہ بہار میں ۱۱۵۰ھ ہجری سے شعرائے دلی کی آمد شروع ہوگئی - دلی میں جو انقلابات ہوئے اور ہل چل مچی اس نے کسی کو چین سے رہنے نہ دیا - اور بارہویں صدی ہجری کے وسط ہی سے اکثر ارباب کمال دلی سے پٹنہ میں آئے اور انکو قدردانی نے اس صوبہ کا ایسا گرویدہ کیا کہ وہ یہیں کے ہو رہے

۱۱۵۰ھ سے لیکر ۱۳۰۰ھ تک قریب قریب تین سو شعرا اس صوبہ میں ایسے گذرے ہیں جو ممتاز اساتذہ کی صف میں داخل ہو سکتے ہیں اور جنکا کلام آج بھی تلاش کرنیوالے کو دستیاب ہو سکتا ہے - ۱۱۳۰ھ سے لیکر ۱۱۵۰ھ تک کے چار سو کے قریب ایسے شعرا ہیں جنکی یادگار میں صفحہ دہر پر زمانہ دراز تک رہیں گی مولانا امین اللہ صاحب متوفی ۱۲۳۲ھ .... نگرنہسہ ضلع عظیم آباد کے رہنے والے تھے تفسیر و حدیث میں مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ممتاز شاگردوں میں تھے ان کے فضل و کمال کا شہرہ پورے ہندوستان میں تھا مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ایک مدت تک مدرس اول رہے تھے اور انکی حدیث اور تفسیر کا علم مسلم الثبوت ہے - فارسی میں قصیدہ کے نام سے ایک عجیب و غریب قصیدہ لکھا جسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک کو ولادت سے وفات تک بیحد غزارت اس فصاحت و بلاغت سے بیان کیا ہے کہ آج تک ارباب علم میں یہ قصیدہ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے -

اس دور کے ممتاز شعرا میں مشہور مرزا بیدل نواب علی ابراہیم خان خلیل عظیم آبادی مصنف تذکرہ گلزار ابراہیم منشی سب سکھ خاکستر - منشی ہلاس رائے رنگین مہاراجہ رام نراین وغیرہ ہیں ۱۲۰۱ھ کے بعد سے ۱۲۵۰ھ تک کے دور میں مولانا تصدق حسین نگرنہسوی المتخلص بہ خلاق ...... شیخ غلام علی راسخ راجہ پیارے لعل الفتی سید محمد عسکری اور مولوی انور علی یاس اور شاہ محمد ابوالحسن فرد سجادہ نشین پھلواری وغیرہ ہیں

۱۲۵۱ھ سے لیکر ۱۳۰۰ھ کے دور کے حکیم مولانا عبدالحمید پریشان شمس العلما مولانا حاجی محمد سعید صاحب حسرت قدس سرہ مولوی احمد کبیر صاحب حیرت منشی سید فرزند احمد صاحب صفیر آروی کنور سنگھ رح بہادر رحمتی حضرت سید شاہ امین احمد صاحب سجادہ نشین خانقاہ بہار شریف المتخلص بہ ثبات شفیق - شاہ الفت حسین صاحب فریاد حکیم ہادی حسن خان رئیس میسوپور وغیرہ ممتاز اکابر شعرا ہیں ۱۳۰۱ھ سے دور اخیر تک کے باقی اساتذہ میں حضرت شاد عظیم آبادی بشارت حسین اصغر بہاری نواب سید امداد امام اثر حضرت فضل حق آزاد عظیم آبادی عشرت گیاوی جناب ضمیر الدین عرش گیاوی حضرت نصیر پٹنوی و حضرت مبارک عظیم آبادی وغیرہ ہیں -

بس یہی ہے صوبہ بہار کا اجمالی مرقع جو بہار نمبر کی مناسبت سے آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے

بہار میں اُردو زبان اور شاعری

بہار اور اُردو

بہار کی بھی ہے شرکت بہارِ گلشن میں
لہو سے ہم نے بھی سینچا ہے باغِ اُردو کو

از حضرت حمید عظیم آبادی

تاریخ شاہد ہے صوبہ بہار اپنی قدامت اور تاریخی عظمت، وقعت اور شہرت، تہذیب و تمدن، تادیبِ نفس اور ارتقائے معاشرت میں ہندوستان کے کسی صوبہ سے کم نہیں۔ اس کی تاریخی قدامت بتاتی ہے کہ جس وقت سے ہندوستان کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے، اسی وقت سے اس صوبہ کا تاریخی دور بھی شروع ہوتا ہے۔ لیکن آج کے مضمون میں نہ مجھے صوبہ بہار کے تمدن اور نہ یہاں کے طرزِ معاشرت پر روشنی ڈالنی ہے اور نہ تاریخی حیثیت سے اس کی قدامت سے بحث کرنی ہے بلکہ مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے وہ اس کی ادبی عظمت اور علمی خدمت سے تعلق رکھتا ہے۔

غیر آریہ قومیں جب ہندوستان میں آکر بسیں تو جس طرح اُن کی ٹولیاں الگ الگ تھیں، اُن کی بھاکھائیں بھی جداگانہ تھیں، اور جس طرح وہ تمدن و معاشرت میں ایک دوسرے سے علیحدہ تھیں، اُسی طرح اُن کی زبانیں بھی ایک دوسرے سے بیگانہ۔ دلی او متھرا کے علاقہ میں برج بھاشا، دکن میں مہاراشٹری اور اودھ و صوبہ بہار میں پالی زبان بولی جاتی تھی۔ غرض ہر صوبہ کی بھاکھا الگ اور ہندوستان کے ہر ٹکڑے کی پراکرتا جداگانہ تھی۔ لیکن جب قوم آریا نے ان غیر آریا قوموں پر فتح پائی اور حکمت ہو کر بیٹھے تو اپنے فلسفہ، قانون اور مذہب کی تدوین و ترتیب کے ساتھ ساتھ وہ اپنی زبان کی تکمیل و تہذیب کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ ان نئے حکمرانوں کے اقتدار کی طرح ان کی زبان (سنسکرت) بھی بڑھی، لیکن یہ حکمران قوم اپنی مفتوحہ قوموں کو اس درجہ ذلیل سمجھتی تھی کہ وہ اُن کی زبانوں سے اپنی مقدس زبان کے الفاظ بھی سُننا گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ حاکم و محکوم کے مذہب اور اُن کی معاشرت کے اختلاف کے ساتھ ساتھ زبان کے فرق کا بھی یہ اثر ہوا کہ اُن کے تخیلات کسی طرح ایک نہ ہو سکے، اور آخر دونوں میں افتراق و نفاق کا بیج پڑ گیا۔ اس افتراق کا نتیجہ جو ہونا چاہیے تھا وہ ہوا یعنی اُن غیر آریا قوموں کی زبانیں جو عرصہ سے یہاں جاری و ساری ہو رہی تھیں جاری رہیں، اور اُن کی جسمانی غلامی کے باوجود بھی اُن کی مختلف پراکرتیں سنسکرت کی لونڈیاں نہ بن سکیں اور بدستور آزاد رہیں۔

اس کے بعد رامائن اور مہابھارت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اس زمانہ کے بعد ہندوستان کی ریاستوں نے اپنے تمام کاموں میں زیادہ تہذیب اور ترتیب سے کام کرنا شروع کیا۔ صوبہ بہار کے ملکی نظام نے بھی اور دیسی ریاستوں کی طرح اسی زمانے میں رونق پکڑ لی۔ مہابھارت کے زمانے میں جراسندھ نامی راجہ صوبہ بہار میں حکومت کرتا تھا۔ اس راجہ کے بعد اس کی نسل سے اٹھائیس راجاؤں نے بہار میں حکومت کی۔ ان اٹھائیس حکمرانوں کے بعد سیس ناگ (ششناگ) نے سنہ ۶۰۰ ق م کے لگ بھگ اپنا حکمرانی سلسلہ صوبہ بہار میں قایم کیا اور درحقیقت اسی سلسلہ سے بہار کی ملکی تاریخ کی بنیاد قایم ہوتی ہے۔

سیس ناگ کا دار الحکومت مقام راجگیر تھا۔ اس کی چوتھی پشت میں بمب سار (بمبیسار) نامی حکمران نے ۴۹ برس بہار میں حکومت کی اور سلطنت کو بہت فروغ دیا۔ اسی کی حکومت کے زمانہ میں گوتم بدھ[1] یہاں کی خاک سے اُٹھے۔ انہوں نے اپنے دیس کی زبان اختیار کی اور یہاں کے عوام ہی کی بھاکھا میں اپنا وعظ شروع کیا۔ یہ وہی پالی زبان تھی جو اودھ اور صوبہ بہار میں بولی جاتی تھی۔ چنانچہ گوتم جی نے اپنے چیلوں کو ان لفظوں میں مخاطب کیا اور کہا "دھرم کرو، دھرم کرو، دھرم کا سنکھ پھونکو، دھرم کی ڈُنڈ مچاؤ[2]" آج کون اُردو داں ہے جو ان فقروں کے الفاظ اور مطالب نہیں سمجھتا! اب آپ اسے پالی کہیں یا قدیم بھاشا کے نام سے پکاریں یا ڈھائی ہزار برس اُدھر کی اُردو سمجھیں!! المختصر یہ پالی زبان بودھ مذہب کے ساتھ ساتھ آگے

---

[1] جس طرح گوتم جی کی پیدائش اور انتقال کے زمانوں میں مورخین کا اختلاف ہے اسی طرح اُن کی جنم بھوم میں کوئی نیپال کی ترائی بتاتا ہے اور کوئی خاص مگدھ دیس (قدیم بہار) کہتا ہے مگر اس مسئلہ پر سب متفق ہیں کہ اُن کی تعلیم و تربیت بہار کے دار العلوم میں ہوئی اور اُن کا مذہبی عروج اسی سرزمین کا منت پذیر ہے۔

[2] ڈُنڈ مچانا، خاص اُردو کا محاورہ ہے۔ ملاحظہ ہو جامع اللغات ص ۶۸۱ الف = سعیدی ڈکشنری ص ۵۲۱ ب = شور و غل کرنا

(ندیم بہار نمبر ۱۹۴۰ء)

بڑھی اور اس عروج پانے والے روشن آفتاب کی شعاعوں نے سنسکرت کے ٹمٹماتے چراغ کو گویا گل کردیا۔ مورخین اس باب میں ہمنوا ہیں کہ گوتم جی کی کامیابی کا خاص سبب یہ تھا کہ وہ عوام کی بول چال میں وعظ فرمایا کرتے تھے، عوام کے دل اُن کی طرف کھنچے، عوام کی تعداد ہمیشہ خواص سے زیادہ ہوتی ہے، پھر یہ اکثریت اقلیت پر بھی حاوی ہوگئی۔

بمبسار کے بعد اس کا بیٹا اجات شتر ۵۵۴ ق م میں سریر آرائے حکومت ہوا۔ اجات نے مشرقی بہار کو فتح کرکے اپنے حدود سلطنت میں ملا لیا۔ فتوحات میں برابر ترقی اور وسعت ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ تھوڑے عرصہ میں ریاست کوسلا کو بھی اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔ اسی راجہ کے ایام حکومت میں تورانیوں ایک خانہ بدوش قوم ہمالیہ کی راہ سے بہار میں آئی اور یہاں کے باشندوں کی آزار رسانی کا باعث ہوگئی۔ راجہ نے بہار کو ان کی غارت گری (لوٹ مار) سے محفوظ رکھنے کے لئے شہر پاٹلی پتر (پٹنہ) آباد کیا اور ایک مستحکم قلعہ اور دروازے بناکر اس مقام کو اپنی فوج کا مرکز قرار دیا۔

اسی خاندان کے عہد حکومت میں فارس کا بادشاہ "دارا گشتاسپ" افغانستان اور پنجاب پر حملہ آور ہوا اور دونوں خطوں کو فتح کرکے اپنی سلطنت میں ملا لیا، لیکن جب چوتھی صدی قبل مسیح کے شروع میں فارس کی سلطنت روبانحطاط ہوئی تو یہ صوبے پھر خود مختار ہوگئے۔ ہندوستان پر اس فتح کا یہ اثر پڑا کہ یہاں ایک نیا رسم خط جاری ہوگیا جسے "کھروشٹی" رسم خط کہتے ہیں اور اسی وقت سے عمارتوں کے بنانے میں بھی فارسی طرز تعمیر کی نقل ہونے لگی۔

سسیس ناگ (ششو ناگ) خاندان کے خاتمہ کے بعد نند خاندان کے راجہ قابض ہوے۔ سکندر اعظم کے حملے کے وقت مگدھ (بہار) میں اسی خاندان کا راجہ مہاپدم نند سریر آرائے حکومت تھا۔ چنانچہ یونانیوں کے حملہ کو ہمارے ادیب الملک خیال مرحوم اپنے خاص انداز میں یوں تحریر فرماتے ہیں۔ "بودھ مذہب کو پھیلنے اور عروج پکڑے ہوئے اور پالی کے نام نکلے ہوئے ابھی پورے ڈھائی سو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ یونانیوں نے دنیا میں سر اٹھایا اور سکندر کی تلوار نے عالم میں خون کا مینہہ برسایا۔ آریوں کا قدیم ملک ایران اسی کے ہاتھوں سر ہوا، وہاں کی معاشرت اور تمدن میں فرق ڈالتا اور تزند کو روندتا، پامال کرتا ہوا وہ یونانی سیلاب باغ ہند کی طرف بڑھا۔ اور سرحدی بند توڑتا ہوا پنجاب سے بھی آگے نکل آیا اور گنگا جمنا کے کنارے آلگا۔ سکندر نے یہاں لسبندو (لشکر) کی چھاونی ڈال، اپنے الفاظ کے لشکر کو بھی خیمہ زن کردیا۔ اس کے رخصت ہونے پر سلیوکس (Selucas) اُس کا سپہ سالار ادھر ہوا کھانے نکلا۔ چندر گپت سے مڈبھیڑ ہوئی اور آخر اپنی ایک بیٹی دان کرکے لوٹ گیا۔ پالی گھر سے نکل برہما اور چین میں جا پہنچی۔ یہاں کی زبانیں اور یونان کے میل و آمیزش بلکہ اس کے گھر کرنے کی یہ دلچسپ تاریخ ہے۔

اسکندر کی وفات کے بعد مگدھ کا راج نند خاندان کے ہاتھوں سے نکل گیا اور چندر گپت نامی ایک نوجوان ۳۲۵ یا ۳۲۰ ق م میں تخت نشین ہوا۔ اسی چندر گپت سے موریہ خاندان کی ابتدا ہوئی اور ہندوستان کے تاریخی دور کا یہ پہلا بادشاہ ہوا جس کو شہنشاہ کہہ سکتے ہیں لیکن اس کی سلطنت بھی شمالی ہند تک محدود رہی۔ چندر گپت کے بعد اس کا پوتا اشوک اس خاندان کا بہت ہی مشہور بادشاہ ہوا۔ اس کے دور حکومت میں بودھ مذہب نے بہت ترقی کی۔ اشوک نے اس مذہب کی اشاعت کے لئے جابجا پتھر کی چٹانوں اور کھمبوں پر ہدایتی تحریریں کھدوائیں۔ یہ کل تحریریں پالی ہی زبان میں تھیں۔

اشوکا کے بعد گرچہ اُس کے چھ ورثا یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوے اور چالیس سالوں تک سریر آرائے حکومت رہے، لیکن یہ نظام مملکت داری میں کچھ ایسے کورے نکلے کہ مگدھ (بہار) کی وہ عظیم الشان اور مستحکم سلطنت مضمحل اور بالکل کمزور ہوگئی۔ اس سلسلے کے اخیر حکمراں کو اس کے وزیر پشیامتر نے مار کر تخت سلطنت کو اپنے لئے خالی کرلیا اور ایک نئے سلسلۂ حکومت کی بنا ڈالی۔ ایک سو بارہ سالوں تک یہ سلسلہ حکومت کرتا رہا۔ لیکن نہ ملکی نظام درست ہوسکا اور نہ پہلی کمزوری کی تلافی ہوسکی۔ ملک میں بدامنی پھیل گئی اور "کہ کرد کہ نیافت" اس سلسلہ کے آخری بادشاہ کے بھی تمام اختیارات اُس کے وزیر باسدیو نامی نے ضبط کرلئے اور خود حاکم بن بیٹھا اور اپنے سلسلہ کو کنواں کے نام سے مشہور کیا۔ ابھی سلسلہ نظام درست بھی نہ ہونے پایا تھا کہ سلسلۂ اندھرا کے ایک راجہ نے علاقہ ناگپور کی راہ سے آکر بہار پر حملہ کیا۔ بہار اُس کے قبضۂ تصرف میں آگیا۔ اس سلسلہ نے پانسو برس بہار میں حکومت کی۔ بعدہٗ بہار کی تاریخ میں کانشکا نام نظر آتا ہے۔ سنہ ۷۸ء میں اس نے مگدھ (بہار) پر فوج کشی کی اور بہار کو بھی اپنے اثر سے خالی نہیں چھوڑا۔ کانشکا کے بعد اُس کے ورثا کے زمانہ میں گپتا خاندان نے عروج پکڑا۔ پہلے یہ خاندان سانکا کا مطیع اور ماتحت تھا۔ مگر آگے چل کر وہ خودسر اور مختار ہوگیا۔

گپت اوّل کے علاوہ دو اور راجہ سمدر گپت اور چندر گپت دوم بڑے نامی و گرامی نکلے - اسی راجہ کے وقت میں چین کا مشہور سیاح فاہیان سنہ ۴۰۰ء میں یہاں آیا -

سنہ ۴۷۶ء میں بہار کی علم خیز زمین نے ایک بہت بڑے ذی استعداد، قابل حکیم اور کامل اُستاد کو پیدا کیا - اس حکیم کا نام آریہ بھٹ تھا - اسی نے سب سے پہلے ثقل ارضی کی کشش کی (Gravitation of the earth) تحقیق کی اور اس کے ثبوت فراہم کر کے تمام دنیا تک پہنچائے - چار کا پنڈت جو علم طب کا موجد مانا جاتا ہے، بہار ہی کی زمین کا جوہر اعلیٰ تھا - دھنتر پنڈت بھی اسی معدن بہار کا گوہر یکتا تھا - یہ وہی حکیم ہے جس کی ریاضی میں اعلیٰ قابلیت دنیا تسلیم کر چکی ہے - اسی کو شطرنج کا موجد بھی کہا جاتا ہے -

سلسلۂ کلام کی کڑیاں ملانے کے لئے مختصراً تاریخ سے روشنی ڈالتا جاتا ہوں - اس کے بعد ہندوستان کی بساط پر ہونوں کے پیادے دوڑتے نظر آتے ہیں - سنہ ۵۱۰ء میں ہونوں کے سردار تورمان نے ہندوستان میں اپنی سلطنت قایم کی - اس کے بعد اُس کا بیٹا "مہرگل" جانشیں ہوا یہ پہلے بودھ مذہب کا معتقد تھا لیکن بعد میں کسی وجہ سے بودھوں کا ایسا دشمن ہوا کہ اُن کے مٹانے پر آمادہ ہوگیا -

مہرگل کے مرنے کے بعد یہ حکومت تہ و بالا ہوگئی - بعدۂ ہرش وردھن کا نام ہندوستان کے حکمرانوں میں نظر آتا ہے - یہ ہندو اور بودھ دونوں مذہبوں کا یکساں احترام کرتا تھا - اسی راجہ کے وقت میں مشہور چینی سیاح ہیونٹ سانگ سنہ ۶۳۰ء میں ہندوستان آیا - مغربی اور شمالی ریاستوں سے ہوتا ہوا بہار اور پٹنہ بھی پہنچا - بہار اُس وقت علوم و فنون کا مرکز تھا، ماہرین علم اللسان کا خیال ہے کہ لفظ "بہار" دراصل "وِہار" تھا جس کے لغوی معنی علم کے ہیں کثرت استعمال سے بہار ہوگیا، اور چونکہ یہ دارالعلوم یعنی علم کا مرکز تھا، اس لئے ہمارے صوبہ کو بہار کا لقب ملا -

مختصر یہ کہ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں جو غیر ملکی ہندوستان میں آکر بسے نہ انہوں نے بودھ مذہب کی طرف کوئی توجہ کی اور نہ اس سرزمین کی شجاع ترین قوم راجپوت نے اس کی طرف رخ کیا - یہی نہیں بلکہ آٹھویں اور نویں صدی میں کمارل بھٹ اور شنکر اچاریہ[1] نے بودھ مذہب کے خلاف آواز بلند کی اور ویدک دھرم کا پرچار شروع کیا - اس سے بودھ مت کی عمارت متزلزل ہو ہی چلی تھی کہ مسلمان آدھمکے، ان کے جنوبی بہار میں قدم جماتے ہی اس مذہب کی بنیاد کھوکھلی ہوگئی - نہ اب بودھ مذہب رہا اور نہ اُن کی پالی زبان، بلکہ اس پالی کی جگہ برج بھاشا نے لے لی اور یہ زبان نہ صرف صوبہ بہار بلکہ تمام شمالی ہند کی جاگیردار بن بیٹھی، اس تفصیل کا اختصار ہمارے استاد حضرت شاد اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے قلم فصاحت رقم کی زبانی سنئے! "جب تک بودھ مذہب کا اقبال تھا، بڑے زور شور سے پالی زبان بھی حکومت کرتی رہی - سوریہ بنس راجاؤں کا خاندان جو ہزار برس قبل سنہ عیسوی سے تھا، یہ خاندان اور سنگا بنسی خاندان بودھ مت رکھتا تھا، اس لئے پالی زبان کا بھی خوب ستارہ چمکتا رہا، مگر ان بنسی راجاؤں کے بعد جب اندر بنسی کا اندر اپنے اکھاڑے میں آ بیٹھا تو بھاشا کی پریاں دربار میں اپنے اپنے سج دکھانے کو آئیں، گو پالی زبان بھی اُن کے غول اور جمگھٹ میں ایسا ملی جلی رہی کہ .. .. مگر رفتہ رفتہ پالی متروک اور بھاشا مرغوب ہوگئی "

الحاصل سروآسی بھاشا (برج بھاشا) پر ہماری اُردو کی بنیاد اور سروآسی زبان کے خمیر میں پالی زبان کا کافی عنصر موجود، اور یہی پالی زبان مگدھ دیس (صوبۂ بہار) کی خاص پراکرت، لہٰذا ہمارا صوبہ اردو زبان کا دیرینہ مرکز !!

اس بیان کو ذرا اُس کے زندۂ جاوید قلم کی زبانی بھی سنئے جس نے آبِ حیات چھڑک کر اُردو کو حیات دائمی بخشی - "دفعۃً ۵۴۳ برس قبل عیسوی میں بدھ مذہب کے بانی شاکہ منی پیدا ہوئے - وہ مگدھ دیس سے اٹھے تھے، اس لئے وہیں کی پراکرت[2] میں وعظ شروع کیا - کیونکہ زیادہ تر کام عوام سے تھا، عورت مرد سے لیکر بچے اور بوڑھے تک یہی اُس دیس کی زبان تھی - اُن کی آتش زبانی سے مذہب مذکور ایسا پھیلنے لگا جیسے بن میں آگ لگے، دیکھتے دیکھتے دھرم، حکومت، رسم و رواج - دین و آئین سب کو جلا کر خاک کر دیا - اور مگدھ دیس کی پراکرت کل دربار اور کل دفتروں کی زبان ہوگئی - اقبال کی

---

[1] شنکر چاریہ نامبودری برہمن تھے، اور دکھن میں بمقام ملابار پیدا ہوئے - یہ اپنے مذہب کے ایک جید عالم تھے، بودھ مذہب کے علما، مذہبی مناظروں میں ان سے نیچا دیکھنے لگے اور علمی قابلیت میں ان کا مقابلہ نہ کر سکے، لہٰذا ہندو مذہب ہر طرف بڑھنے اور پھیلنے لگا -

[2] پراکرت کے معنی جو طبیعت سے نکلے، پس پراکرتیں وہ زبانیں ہیں جو طبیعت (نیچر) نے اپنی اپنی زمین میں پیدا کر دیں -

یاوری نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہو کر اُسی زبان میں علوم کے کتب خانے سج گئے۔ اور فنون کے کارخانے جاری ہو گئے۔ کہیں کہیں کونے، گوشے میں جہاں کے راجہ وید کو مانتے رہے، وہاں ویدوں کا اثر رہا، باقی راج کے دربار اور علمی سرکار سب ماگدھی ہی ماگدھی ہو گئے۔ ان کے حوصلے وسیع ہو کر دعوے بڑھے۔ اور بہ آوازِ بلند کہہ دیا کہ تمام زبانوں کی اصل ماگدھی ہے۔ برہمن اور کل انسان بات کرنے کے لایق بھی نہ تھے . . . .

"زمانے نے اپنی عادت کے بموجب (تخمیناً ۵۰۰ سو برس بعد) بودھ مذہب کو بھی رخصت کیا اور اُن کے ساتھ اُن کی زبان بھی رخصت ہوئی۔ شنکر اچارج کی برکت سے برہمنوں کا ستارا ڈوبا ہوا پھر اُبھر کر چمکا اور سنسکرت کی آب و تاب بھی شروع ہوئی۔ راجہ بکرماجیت کے عہد میں جو روشنی اس کی فصاحت نے پائی آج تک لوگوں کی آنکھوں کا اُجالا ہے۔ اُس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دربارِ سلطنت اور اعلیٰ درجہ کے لوگوں کو سنسکرت بولنا اعتبار و افتخار کی سند تھا اور پراکرت عوام کی زبان تھی . . . .

گیارہویں صدی عیسوی سے پہلے راجہ بھرت کے عہد میں برج کے قطعہ کی زبان تھی جسے ہم آج کی برج بھاشا کی اصل کہہ سکتے ہیں۔

. . . . کہ دفعتہً زمانہ کی شعبدہ بازی نے ایک اور رنگ بدلا یعنی اسلام کا قدم ہندوستان میں آیا۔ اُس نے ملک و مذہب کو نیا انقلاب دیا اور اُسی وقت سے زبان کا اثر زبان پر دوڑنے لگا۔"

میرے تمام تفصیلی بیانات اور مختلف تحریروں کے اقتباسات پیش کرنے کی غرض یہ ہے کہ صوبۂ بہار کے تغیر پذیر حالات پر قدرے تفصیلی روشنی ڈال کر یہ ثابت کروں کہ یہ صوبہ زبان کے مسئلہ میں بھی ہمیشہ اپنا ہی آپ مقلد رہا۔ کس طرح پالی زبان میں سنسکرت کے الفاظ بلا ارادہ شامل ہو گئے۔ اربابِ علم سے مخفی نہیں اور پھر کس طرح پالی کی جگہ برج بھاشا زبانوں پر حکومت کرنے لگی، یہ بھی پوشیدہ نہیں۔ المختصر برج بھاشا نے بائیں طرف سے دائیں طرف کروٹ لی تو ہندوستانی کہلاتے کہلاتے یک بیک اُردو کے نام سے پکاری جانے لگی۔

لفظ اُردو، روز مرہ سندھی زبان میں چیزوں کے انبار یا لوگوں کے اجتماع کے لئے مستعمل ہے۔ یہ لفظ اس معنی میں سندھ میں عربوں کے آنے کے تین ہزار برس قبل سے اسی معنی میں بولا جاتا ہے۔

یہ لفظ اُردو، نہ سندھ اور نہ ہندوستان میں معرضِ وجود میں آیا بلکہ اس کی ابتدا تاریخی دور سے بھی قدیم تر ہے۔ اگر ہم لوگ اوستا[51] یا قدیم ایرانی زبان کو دیکھیں تو یہ لفظ وہاں بھی موجود ہے۔ شہر اردبیل[52] اور شاہ اردشیر[53] اس دعوی کی منہ بولی شہادتیں اور روشن دلیلیں ہیں۔ آج بھی یہ لفظ سندھ میں جس معنی میں بولا جاتا ہے، اُسی معنی میں جدید ایران میں بھی مستعمل ہے، یعنی فوج، چھاؤنی، بازار۔ لیکن یہ بات بہ آسانی دیکھی جا سکتی ہے کہ ان سب معنوں میں جزو مشترک کیا ہے؟ وہی ڈھیر، اجتماع اور بھیڑ!

ابتدا ہی سے یہ لفظ اُردو اپنے اندر ڈرانے والے اور دہشت انگیز کے معنی بھی پوشیدہ رکھتا ہے جس سے اُس دیوتا ارد کی طرف اشارہ ہے جو قسمت کی طرح خوفناک اور ہولناک ہے۔[54]

---

۵۱ اردشیر کے مشہور اور نمایاں کارناموں میں دینِ زردشت کا زندہ کرنا اور اُس کو رواج دینا ہے کیونکہ گذشتہ زمانے میں (اردشیر سے پہلے) اس مذہب کا اعتبار اور وقار باقی نہیں رہا تھا بلکہ یہ مذہب گویا مفقود ہو چکا تھا، اردشیر کے حکم سے کتاب زندکی شرح لکھی گئی جسے اوستا کہتے ہیں (ترجمہ از تاریخ مختصر ایران)

۵۲ اردبیل بفتح اول ایک شہر کا نام ہے۔ چنانچہ حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں۔

یکے آہنی پنجہ در اردبیل ٭ ہمی بگذرانید بیلک ز پیل

۵۳ اردشیر مرکب از لفظ ارد بالفتح کہ بمعنی خشم و قہر یا لفظ اُرد بضم کہ بمعنی مانند و نظیر است۔ بہر تقدیر لقب بہمن بن اسفندیار است۔ چون جدش گشتاسپ (ایک قسم کا تیر) او را بسیار دلیر دید بدیں لقب ملقب کرد و نیز لقب ساسان بن ساسان کہ نبیرۂ بہمن و دختر زادہ بابک بود۔ و او را اردشیر بابکان نیز گویند۔ بہ الف و نونِ نسبت (غیاث اللغات)

ارد بفتح اول۔ قہر و غضب و غصہ۔ اُرد بضم اول مانند و نظیر۔ ارد بکسر اول ہر شمسی مہینے پچیسویں روز کا نام (جامع اللغات) اُردشیر بابکان ایران کے وسیع بادشاہوں میں تھا۔ اشکانی سلطنت کا خاتمہ کرنے کے بعد پھر نئے سر سے ایران کو قبضے میں لایا اور اس طرح حق حقدار کو پہنچ گیا۔ چونکہ اُردشیر بابک کا بیٹا اور ساسان کا پوتا تھا اسلئے اُسے اُردشیر بابکانی اور اس کی اولاد کو ساسانیان کہتے ہیں۔ ۲۴۲ میلادی میں اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ (ترجمہ از تاریخ مختصر ایران)

۵۴ ارد بفتح اول و سکون ثانی و دالِ ابجد بمعنی خشم و قہر و غضب باشد و مخفف آردہم ہست۔ بضم اول مانند و نظیر و شبیہ را گویند و بہ کسر اول نام فرشتہ ایست کہ موکل بر دین و مذہب است و تدبیر و مصالح۔ اوزار دکہ بست و پنجم ہر ماہ

یہ لفظ اردو آریا زبانوں میں ایک قدیم ترین لفظ ہے اور جو اب تک اسی طرح عالم بقا میں موجود ہے۔ اس میں قدیم آریا تمدن اور بنی نوع انسان کی جماعتی زندگی کی زندہ تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ وہی لفظ ہے جو آج اردو، اُردو، کہا جا رہا ہے۔ اور جس سے ایک ایسی جماعت کی زبان مراد ہے جس میں ہر قوم و ملت کے لوگ شامل ہیں اور یہی زبان ہے جو واقعی صحیح طور پر تمام ملک کی ملکی زبان کہی جانے کی مستحق ہے۔ اُردو کی بنیاد برج بھاشا ہے صرف اس کی ظاہری نمایش اور آرایش ایرانی ہے، ہاں اس میں شک نہیں کہ اس کا وقار اکبر اعظم کے وقت میں بڑھا جبکہ مذہبی اور قومی خلاقات مٹ رہے تھے۔ اور مغل سلاطین بہ فخر و ناز ہندوستان کو اپنا وطن تسلیم کر چکے تھے، اور یہیں کی زبان بولنے کے لئے بیتاب اور خواہشمند تھے۔

بہرکیف! مجھے نہ اس جگہ یہ عرض کرنا ہے کہ کس طرح یونانیوں کے بعد تاتاری، پھر تورانی اور آخر میں ترکی ہندوستان پر یکے بعد دیگرے حملہ آور ہوئے اور ہندوستان کی مختلف پراکرتوں پر ان کی آمد کا کس طرح اور کیا کیا اثر پڑا اور نہ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عربی اور تازی زبانیں کس طرح یہاں کی بھاکھاؤں میں مل کر ایک نئے روپ میں رونما ہوئیں، اور نہ مجھے یہاں محمد بن قاسمؒ کی فتح کی داستان سُنانی ہے اور نہ محمود غزنویؒ کے متواتر حملوں کا تذکرہ کرنا ہے، بلکہ صرف اُس واقعہ کی طرف اشارہ کرکے اپنے سلسلہ کلام کی کڑی کو ملانا ہے، جب بختیار خلجی کے بیٹے اختیار الدین محمد نے بنگال پر فوج کشی کی اور ۱۱۹۷ء میں اُس نے صرف دو سَو سواروں سے علاقہ بہار کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ مسلمانوں کے صوبۂ بہار میں آنے کا زمانہ یہی گیارہویں صدی عیسوی ہے۔ اُس وقت کی خالص زبان سُنئے جو بالکل ٹھیٹ اور خالص ہے۔

ایک شاعر کہتا ہے۔ ۔ ؎ پرسوں آون کہہ گئے کہ پرسوں نہ آیو پیو ٭ جو پرسوں آویں نہیں تو پرشوں آپن جیو
(آنے کو) (لیکن) (آئے) (آئے) (اپنا)

میرا پی (شوہر) مجھ سے کہہ گیا تھا کہ پرسوں آؤنگا لیکن وہ نہیں آیا۔ اگر واقعی پرسوں نہیں آئے گا تو میں اُس پر اپنی جان نچھاور کر دوں گی۔ پرشوں بمعنی نچھاور کروں۔ شاعر نے صنعت ایہام سے شعر میں کیا لطف پیدا کیا ہے اور اسی لطف کے خیال سے پرسوں کی قید لگائی گئی ہے۔

گیارہویں صدی کے آخر سے اس صوبہ میں برابر مسلمانوں کی حکومت رہی اور اُسی وقت سے بنگال اور بہار سلطنت دہلی کے صوبے سمجھے جانے لگے جب دہلی کے حکمران کمزور ہوتے تو یہ صوبے خود مختار ہو جاتے۔ محمد تغلق کے عہد میں یہ صوبے بھی آزاد ہو گئے تھے، اتنا ہی نہیں بلکہ ۱۳۵۵ء میں فیروز شاہ تغلق نے بھی شمس الدین الیاس شاہ کو سارے بنگال کا آزاد حکمران تسلیم کر لیا۔ سید اور لودی خاندانوں کے حکمران بنگال کو مغلوب کر سکے ۱۵۱۸ء میں نصرت شاہ کے عہد میں بابر نے بنگال پر فوج کشی کی تھی لیکن اُس نے صلح کر کے بابر کو ٹال دیا۔

بابر کی وفات کے بعد لودی افغانوں نے بہار اور بنگال میں پھر اپنی جمعیت کو بڑھا لیا۔ ہمایوں کے عہد میں شیر شاہ سوری بنگال پر اچھی طرح قابض ہو بیٹھا مگر شیر شاہ کی وفات کے بعد پھر افغانوں کا دور دورہ ہو گیا۔ ۱۵۷۶ء میں شہنشاہ اکبر نے بیٹھان خاندان کے آخری حکمران داؤد کو شکست دی اور بنگال کو اپنے قلمرو میں شامل کر لیا۔ بنگال کے ساتھ ساتھ بہار کا صوبہ بھی مسخر کر لیا گیا۔

الحاصل گیارہویں صدی عیسوی سے برابر صوبۂ بہار مسلمانوں کے زیر نگیں رہا اور اُردو زبان کا بیج جو ہندوستان میں مسلمانوں کے لگاتار حملوں نے بویا تھا وہ شاہجہاں عہد میں پھوٹا اور بڑھا۔ اور عالمگیری دور میں بارآور و شاداب نظر آیا اور محمد شاہی دور میں پھول پھل بھی لے آیا۔ یوں تو شاہجہاں و عالمگیر ہی کے زمانہ میں دہلی کے امراء پورب اور خصوصاً صوبۂ بہار، پٹنہ میں آئے۔ قلعۂ معلی کی آواز یہاں بھی گونجی اور شاہزادہ عظیم الشانؒ کے مبارک قدموں کی بدولت یہاں کا پرانا قلعہ نیا آباد ہونے اور پٹنہ عظیم آباد بننے لگا۔ پھر فرخ سیر یہاں آیا اور اس کے داہنے بازو

؎ ۱۶۹۷ء میں شاہزادہ عظیم الشان پٹنہ میں تشریف لائے۔ اُن کے تشریف لانے سے پٹنہ کی شان کچھ ایسی دوبالا ہو گئی کہ آج تک عظیم آباد ان ہی کے نام سے مشہور ہے۔ شاہزادہ نے اپنے قیام کے زمانہ میں پٹنے کے قلعہ کو از سر نو مرمت کرایا اور اس کی اندرونی عمارتوں کی بھی قرار واقعی درستی کر کے اپنی مستورات کو وہیں رکھا۔ شہر کو از سر نو آباد کرتے وقت ہر فرقہ اور ہر گروہ کے محلے جدا گانہ بنائے۔ متعلقین دفتر شاہی کے لئے دیوان محلہ اور امراء فوج کے لئے لودی کٹرہ بسایا۔ مغلوں کے رہنے کے لئے مغلپورہ اور شاہزادوں اور امراء کے لئے مہ لیوانی سنگوہ جو اب بگڑ کر کو لکھوہ ہو گیا ہے۔ عظیم الشان کا قصد تھا کہ عظیم آباد ہو بہو دلی بنا چھوڑے لیکن وقت نے فرصت نہ دی۔

امیر الامرا نواب سید حسین علی خاں صوبہ دار پٹنہ کے دست قوی کے بدولت شاہزادہ یہیں شاہ ہند بنا اور اسی جگہ سر پر تاج رکھ کر دلی کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے بعد تو عظیم آباد، پٹنہ، دلی والوں کا گھر آنگن تھا۔ وہاں کے اکثر امرا کو اس صوبے اور اس شہر میں آل تمغا اور جاگیریں ملیں، اور وہ دلی چھوڑ کر پٹنہ ہی میں آ بسے۔ یہ امرا اپنے شاگرد پیشہ (عملۂ نوکر چاکر) تک وہاں سے اپنے ہمراہ لاتے اور ان کی پرورش کرتے تھے۔ اس لئے ان کی اور ان کے گھر کی زبان پر مدت تک دہلی کی زبان کا اثر رہا۔ ان امرا میں نواب لطف اللہ خاں صادق (عالمگیری) کی اولاد خاص ذکر کی مستحق ہے کیونکہ اُن کی جہت سے پٹنہ کی اور بھی رونق بڑھی۔ اس خانوادے کے ارکان زیادہ تر محلہ نون گولہ، پورب دروازہ - دول پورہ (دھولپورہ) اور حاجی گنج میں آباد ہوئے اور ان کی وجہ سے ایک عرصہ تک ان محلوں کی زبان و معاشرت اس شہر کے لئے باعث تقلید رہی۔ اس طرح اُردو کا گھر گھر چرچا پھیلا اور اردو خاص و عام کی زبانوں پر حکومت کرنے لگی۔

عالمگیری عہد میں پٹنہ میں مرزا عبد القادر بیدل سا باکمال پیدا ہوتا ہے اور فارسی کے ساتھ اُردو کا بھی دلدادہ بن جاتا ہے۔ بیدل جب پٹنے کو خیر باد کہتا ہے تو یہاں کے در و دیوار پر بہ حسرت نظر کر کے یہ شعر پڑھتا ہے۔ ؎

سر اوپر مایا رام نہیں دشمن آپن کیس　　پٹنہ نگری چھوڑ دہن بیدل چلے بدیس

دو شعر اور ملاحظہ فرمائے جائیں :-

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں،　　اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں،
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا　　پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

بیدل[1] جو نو ہوتے ہوئے دلی پہونچے اور وہاں شاہزادہ عالمگیر (اعظم و معظم) کے استاد و اتالیق مقرر ہوئے۔ ۱۱۳۳ھ میں شاہجہاں آباد ہی میں رحلت فرمائی۔ اس صوبے اور اس شہر میں (جیسا میں قبل عرض کر چکا ہوں) اردو نے اُس وقت ترقی کی جب کہ دلی کے باہر اس کی نشو و نما محدود تھی اور ہماری اُردو اُس کی زبان سے گویا ہوئی جو عالمگیری شاہزادوں اور امیروں کا اتالیق و استاد اور دکن و دلی کے سخندانوں کا سرتاج تھا۔

مرزا بیدل عہد اورنگ زیب میں یہاں سے دہلی گئے اور فرخ سیر کے زمانے[2] تک اپنی شاعری اور زبان کو پھیلاتے، اُردو کو فروغ دیتے اور بہار اور پٹنہ عظیم آباد کے نام کو روشن کرتے رہے۔ بیدل دلی سدھارے تو سمجھا گیا تھا کہ پٹنہ سُونا ہو جائے گا، مگر اس شہر کا نصیبا ابھی جاگ رہا تھا، مرزا معز موسوی خاں فطرت دلی سے ادھر آئے اور ان کے قیام سے پٹنہ دلی کا ایک ٹکڑا نظر آنے لگا۔ فطرت ۱۰۸۲ھ میں ایران سے ہندوستان آئے۔ اورنگ زیب کا زمانہ تھا صوبۂ عظیم آباد کی دیوانی پر معمور ہوئے۔ شعرائے عظیم آباد میں میر محمد ہاشم مضمون وغیرہ ان کے فیض تلمذ سے بہرہ مند ہوئے۔ (مضمون پہلے مشربی تخلص کرتے تھے، چنانچہ اپنے ایک مقطع میں موسوی خاں کی شاگردی پر یوں فخر کرتے ہیں۔ ؎

مشربی منتِ تعلیم فلاطوں نہ کشم،　　موسوی خاں چو بود صاحب و اُستاد مرا)

اسی زمانہ میں یہاں کی خاک سے ملا محمد علیم تحقیق سا محقق اٹھا، انہوں نے بھی مرزا موسوی کے آگے زانوے شاگردی تہ کیا، فارسی کے علاوہ اردو کو نوازا۔ فرماتے ہیں :-

جھگڑا باندھ کر دل موں سما جا،　　سلونو سانورے ادھر کو آجا،
سرجن تیرے مکھڑے میں سورج کی کرن پایا ہے　　دیکھوں ہوں جو تجھ مکھ کوں نینا میرے چندھرا

---

[1] مرزا پٹنہ ہی محلہ کے رہنے والے تھے۔

[2] ادیب الملک خیال مرحوم تحریر فرماتے ہیں :- "فرخ سیر کے زمانے میں ایک امیر باتدبیر تھا جسے تاریخی زبان عمدۃ الملک امیر الامرا محمد امیر خاں کہتی، اور انجمن شعر انجام کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ یہ نواب بھی بیدل ہی کا دلدادہ اور مقلد تھا۔ اور جس وقت استاد اردو کی طرف مخاطب ہوا، مؤدب شاگرد بھی ہمہ تن ادھر متوجہ ہو گیا۔ اس کی اس توجہ و خیال سے اس زبان کا وہ آوازہ بلند ہوا کہ ساری دلی گونج اٹھی اور پھر تو گھر گھر سے اس کی صدا آنے لگی۔"

تحقیق[1] صرف شاعر اور ملا ہی نہ تھے بلکہ علم موسیقی اور تیر اندازی اور پہ گری میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ملا صاحب کو جانوروں کے لڑانے کا بہت شوق تھا، دہلی بھی گئے، اہل کمال سے ملے، شعر و شاعری کا بھی مشغلہ رہا، وہاں کے شعرا کو داد سخن دیتے اور ان سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے۔

تنگیٔ داماں کا خیال کرتے ہوئے بہت سے شگفتہ پھولوں کو بھی نظر انداز کرنا پڑا ہے۔ جن کی عطر بیز خوشبو سے مشام بہار معطر رہ چکا ہے۔ لیکن پھر بھی چند نام لیے بغیر نہیں رہ سکتا اور جن کی یادگاریں آج تک ٹھنڈی مرحوموں کی روحوں کی فاتحہ خوانی کر رہی اور چشم حقیقت نگر کو درس عبرت دے رہی ہیں۔ جب شائستہ خاں ناظم بہار، آگرہ بلائے گئے تو ان کی جگہ جعفر خاں بہار کے صوبہ دار مقرر کئے گئے۔ یہ وہی جعفر خاں ہیں جن کے نام کی یادگار آج تک باغ جعفر خاں پٹنہ میں موجود ہے اور اپنی گذشتہ بہار کا آج وہی باغ مرثیہ خواں ہے۔ جعفر خاں کے بعد سیف خاں کو بہار کی صوبہ داری ملی۔ ان کی یادگار ایک بہت بڑا مدرسہ تھا جس کا نام اب باقی نہیں، مگر ہاں اس مدرسہ کے نام پر آج محلہ مدرسہ قائم ہے جو اس مدرسہ کی یاد تازہ کرتا اور اہل علم و تحقیق کو سیف خاں کی علم دوستی کا سبق پڑھاتا ہے۔ اسی سیف خاں کی بنائی ہوئی مسجد گنگا کنارے مدرسہ گھاٹ کے متصل کھڑی، زبان کی شست و شو کر رہی، اور زبان حال سے پکار کر کہہ رہی ہے ۔ بیا مسجد سیف خاں نظر کن ❊ مصفا تر از سینۂ پارسا ۔

بہر کیف! اگر اودھ کو شجاع الدولہ و آصف الدولہ کی بزرگی اور ان کی زبان دانی کی جہت سے کوئی امتیاز ہے تو صوبۂ بہار کو بھی نواب مہابت جنگ (نواب شہید) کے علاوہ مہاراجہ رام نرائن موزوں اور مہاراجہ شتاب رائے اور ان کے خلف الرشید راجہ بہادر کی ذات اور زبان پر بجا ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

راجہ رام نرائن[2] تخلص موزوں فضلائے روزگار اور ادبائے مشرق دیار میں تھے۔ شیخ علی حزیں اصفہانی کے شاگرد تھے۔ فارسی کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ اردو ریختہ گوئی میں بھی پختہ کار تھے۔ نواب میر جعفر خاں ناظم بنگالہ کے نائب اور صوبۂ عظیم آباد کے فرمان روا تھے۔ نواب میر قاسم علی خاں کے عہد میں معزول ہوئے۔ اور گنگا میں ڈبو دئے گئے۔ یہ واقعہ ۱۱۷۳ھ میں وقوع پذیر ہوا۔

مسند بنگالہ کی بساط جب میر جعفر اور میر قاسم کے سے فراشوں نے اٹھانا چاہی اور بے رحم اور نمک حرام میرن (پسر میر جعفر) نے سراج الدولہ کا کام تمام کر دیا تو اس جانکاہ واقعہ کی خبر آگ کی طرح عظیم آباد پہونچی۔ راجہ اس وقت دربار کر رہے تھے اطلاع ملتے ہی مسند سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بہت روئے اور درباریوں کو مخاطب کرکے فی البدیہہ یہ شعر نظم فرمایا

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی، دوانہ مر گیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

شعر جذبات کا مرقع اور واقعہ کی مکمل تصویر ہے۔ کوئی واقف کار اہل دل اس شعر کو پڑھ کر چشم پرنم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ راجہ کے دو اور اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں :-

ابر تو خود ہی خجالت سے ہے پانی پانی، کب مقابل ہو مرے دیدۂ خونبار کے ساتھ

بھولی نہیں ہے مجھکو بتوں کی ادا ہنوز دل کے نگیں پہ نقش ہے نام خدا ہنوز

مہاراجہ شتاب رائے عظیم آباد کے نائب صوبہ دار اور مرشد آباد کے نائب دیوان تھے۔ ۱۱۸۷ھ میں جب نن کمار کی سازش سے محمد رضا خاں دیوان نائب ناظم گرفتار کرکے کلکتہ بھیجے گئے۔ تو ان کے ساتھ شتاب رائے بھی بہ حیثیت نائب دیوان عظیم آباد میں گرفتار کئے گئے اور ان کے ساتھ دو برس تک بغیر ثبوت جرم مقید رہے دو برسوں کے بعد رہا ہوئے، لیکن دنیا سے جی چھوٹ گیا، مرض استسقاء میں مبتلا ہوئے

[1] تحقیق کے والد سید بدیع الدین عرف میر متین (غالباً متین گھاٹ کا محلہ آپ ہی کی طرف منسوب ہے) سمرقند کے سید تھے مگر ملا تحقیق کا مولد محلہ پھلواری عظیم آباد تھا ۱۰۷۸ھ میں پیدا ہوئے اور بانوے سال کی عمر پاکر ۱۱۶۲ھ میں مہابت جنگ کے زمانے میں رحلت فرمائی اور عظیم آباد میں مدفون ہوئے۔ صاحب سیر المتاخرین، ان بزرگوار کی نسبت تحریر فرماتے ہیں۔ "میر محمد علیم کہ از مشاہیر و مشائخ عظیم آباد و از جملہ شاگردان میرزا معز موسوی خاں فطرت تخلص بود و شہرت علمش بسیار و شاعر یش ہم اشتہار داشت۔"

[2] خلف دیوان رنگ لال۔ قوم کائستھ سری باستو

تو پھر جانبر نہ ہو سکے، اور ۱۷۷۵ء میں اس دار فانی کو خیر باد کہا۔

اس مہاراجہ کی علم دوستی اور اُردو پرستی نے باکمالوں اور دلّی کے زبان آوروں کو ادھر کھینچا۔ نواب اشرف علی خاں[1] کا سا ہنگامہ آرا اور زبان پرور ان ہی مہاراجہ کی خاطر اپنا وطن دلّی چھوڑ کر عظیم آباد چلا آیا اور بڑے دبدبہ سے یہاں رہا۔ گویا دلّی گئے لال قلعہ کی زبان یہاں بھی عام کرتا رہا۔ اس وقت عظیم آباد دلی والوں کا گھر آنگن بنا ہوا، دار السلطنت کا مزا دے رہا تھا۔ یہاں نواب کی بڑی تعظیم و تکریم اور آؤ بھگت ہوئی۔ امرا و اعیان شہر بہ عزت و ادب پیش آئے۔ عظیم آباد میں نواب کا دربار مشہور تھا۔ فضلا و شعرا کا مجمع رہتا۔ زبان و محاورات کی چھان بین ہوتی۔ نو آبان پانی پت (جو اپنی جاگیر کے انتظام کی خاطر یہاں محلہ نون گولہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے) سے اور نواب سے خاص ربط تھا، نواب نے شاہانہ طرز سے یہاں زندگی بسر کی۔ ۱۱۸۶ھ میں وفات پائی۔ بڑے دھوم سے جنازہ اٹھا اور آغا حسینا کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔ نواب کی یہ مشہور غزل یہیں کہی گئی تھی۔ جو اس درجہ مشہور ہوئی کہ مرزا سودا نے اُس کے ایک شعر کی تضمین کی اور وہ شعر مرزا کا حصہ سمجھا گیا۔

سودا لکھا فغاں کو یہ خط اُس کے یار نے | جس وقت اُس کے حال کی اُس کو خبر گئی،

قطعہ اس شعر سے شروع ہو کر فغاں کے مندرجہ ذیل شعر پر ختم ہوتا ہے۔:-

شکوہ کرے ہے تو جو مرے اشکِ سرخ کا | تیری کب آستین میرے لوہو سے بھر گئی

غزلِ فغاں

کہتے ہیں فصلِ گُل تو چمن سے گذر گئی، | اے عندلیب تو نہ قفس بیچ مر گئی

مجھ سے جو پوچھتے ہو بہر حال شکر ہے، | یوں بھی گذر گئی مری وہ یوں بھی گذر گئی

شکوہ کرے ہے تو جو مرے اشکِ سرخ کا | تیری کب آستین مرے لوہو سے بھر گئی

ق

تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں | انصاف کو نہ چھوڑ، مروت اگر گئی

آخر فغاں وہی ہے اُسے کیوں بھُلا دیا | وہ کیا ہوئی نگاہ وہ اُلفت کدھر گئی

آپ کے سنگ مزار پر حکیم ابو الحسن مفتوں کا تصنیف کردہ قطعۂ تاریخ انتقال کندہ ہے۔ و ہو ہذا :-

قطعہ

کو کہ خاں آں بہار باغ سخن، | سُوئے خلد بریں ز دُنیا رفت،

کرد مفتوں چو فکرِ تاریخش، | گفت ہاتف "سرور دلہا رفت"

۱۱۸۶ھ

راجہ بہادر المتخلص بہ راجہ خلف مہاراجہ شتاب رائے ان ہی اشرف علی خاں فغاں کے شاگرد تھے۔ اُن کا بھی ایک شعر ہدیہ ناظرین ہے۔ :-

یہ زخم دل ہمارے مرہم تلک نہ پہنچے | ہم اُن تلک نہ پہنچے، وہ ہم تلک نہ پہنچے

اگر اکبر آباد کی بدولت دلّی کو میر تقی میر پر فخر ہے تو عظیم آباد کو بھی بلا شرکت غیرے اُن شیخ غلام علی راسخ[2] پر ناز ہے اور بجا ناز ہے، جو میر تقی میر کے ہمعصر اور ہمزبان اور اُن کے نعم البدل کہلائے۔ جس سال تحقیق کے سے تحقق سے پٹنہ خالی ہوا، اُسی سال اس باکمال کے وجود نے پٹنہ کی سرزمین کو نوازا۔

اس شہر کا یہی ادبی وقار اور شہرہ تھا کہ میر شیر علی افسوس اور میر امن کے سے زبان داں اور نثار تک یہاں آئے اور رہے۔ اسی طرح دیگر باکمال یہاں کی خاک کی طرف کھنچے اور ڈھیر ہو گئے۔ ندیم کے دامن کی وسعت کا خیال کرتے ہوئے اس مختصر کو مطول بنانے کی گنجائش نہیں۔

---

[1] نواب اشرف علی خان فغاں، احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ (دودھ شریک بھائی) قلعۂ شاہی میں پلے، لہٰذا ان کی زبان بھی وہی زبان تھی جسے اُردوئے معلّٰے کہتے ہیں۔

[2] راسخ مرحوم کی مکمل سوانح عمری مع انتخاب کلام مرتب کر چکا ہوں، ناظرین تا اشاعت انتظار فرمائیں۔

غالبؔ کی نسبت مشہور ہے کہ اس ملک میں وہ پہلے بزرگوار ہیں جنہوں نے اُردو میں خط و کتابت شروع کی۔ لیکن یہ خیال اُنہیں غدر ۱۸۵۷ء میں آیا جبکہ اُن کے قواء ضعیف ہو چکے تھے، اور مشکل کو نباہ نہ کر سکتے تھے، مگر نواب جلال الدین خاں تاثیرؔ خلف نواب مہدی علی خاں مہدیؔ (جناب شادؔ کے جدِّ مادری) نے ۱۸۴۶ء میں جبکہ وہ جوان تھے اُردو پر اپنی طاقت آزمائی کی ہے۔ اور وہ بھی کسی مجبوری سے نہیں بلکہ اس اردو کا خیال کر کے جو اُن کے خاندان کا آلِ تمغا تھی، ہمارے اگلے امرا اور بزرگواروں میں دو ایک اور بھی ایسے نام ہیں جو نظر انداز نہیں کیے جا سکتے، نواب سیّد ہدایت علی خاں اسد جنگ بہادر المتخلص بہ ضمیرؔ بڑے پائے کے بزرگوار اور امرا و اعیانِ ملی میں سے تھے۔ ناظم بنگالہ نواب شجاع الملک محمد علی وردی خاں، مہابت جنگ کے خویش تھے۔ شجاعت و سخاوت میں مشہور روزگار، کچھ دنوں نیک نامی کے ساتھ عظیم آباد کے صوبہ دار بھی رہے۔ یہ محمد شاہ بادشاہ کے مقربین اور نواب عمدۃ الملک محمد امیر خاں انجامؔ (وزیر محمد شاہ) کے خاص دوستوں میں سے تھے نواب نے یہاں بھی ایک حویلی بنائی جسے بڑی حویلی کہتے تھے، حاجی گنج میں یہ حویلی اُن کے پوتے نواب سیّد کاظم علی خاں کے وقت تک آباد رہی، مگر اب ویرانہ اور کھنڈر ہے۔ نواب نے عظیم آباد میں انتقال کیا اور حسین آباد میں مدفون ہوئے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرماتے تھے ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

ہر گز ہم سے عشق کا سِر فاش نہ ہوتا ٭ کرتا نہ اگر آ کے مرا چہرہ وہ دری رنگ

پھر ان ضمیرؔ کے خلف الرشید مشہور و معروف نواب سیّد غلام حسین خاں عظیم آبادی، صاحب سیر المتاخرین ہیں، جن کی تاریخ دانی اور زبان دانی جریدۂ عالم پر ثبت ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ شاعری میں شیخ علی حزیںؔ اصفہانی کے شاگرد تھے۔ ان ہی غلام حسین کے ساتھ ساتھ میں غلام حسین شورشؔ کے نام کو بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ کہ جن کی بدولت عظیم آباد کو یہ بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے کہ سب سے پہلے عظیم آباد کے اس رُکن رکین نے تقریباً ۱۱۹۵ھ میں شعرائے ریختہ کا تذکرہ ریختہ ہی میں قلمبند کیا۔ اسی طرح نواب علی ابراہیم خاں بہادر نصیر جنگ المتخلص بہ خلیلؔ (عظیم آبادی) مؤلف تذکرہ گلزار ابراہیم بھی صوبہ بہار اور ہندوستان کی ادبی دنیا میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں اور مورخین کی جماعت کے بھی ایک ممتاز رکن ہیں۔ تبرکاً دو شعر ہدیۂ ناظرین ہیں۔ ؎

اُڑ گئے کچھ حواس سے میرے ٭ اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

؎ بھور ونے سے میرے تر ہوا جیب و کنار آخر ٭ خلیلؔ آنکھوں کے ہاتھوں ہو گیا گلزار پہلو میں

نواب آصف الدولہ کے عہد میں ان کے ایک بڑے کارکن راجہ جھاؤ لال لکھنؤ سے نکلے اور مع خدم و حشم عظیم آباد آ کر مقیم ہوئے۔ مدرسہ سیف خاں کی پشت پر پچھم طرف نواب ہیبت جنگ کی تعمیر کردہ جو حویلی اور چہل ستون تھا وہ انہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے قیام کو عنایت ہوا اور راجہ بہ کرّ و فر یہاں رہنے لگے۔ ہمارے یہ راجہ صاحب عربی، فارسی کے استاد اور شاعری میں بھی ممتاز تھے۔ ان کی زبان ٹکسالی اور اُس وقت کے لکھنؤ کی بہترین سوسائٹی کا بہترین نمونہ تھی۔ لکھنؤ میں جس طرح ان کے نام سے ایک پل "جھاؤ لال کا پل" کھڑا ہے، اُسی طرح یہاں کا محلہ "جھاؤ گنج" بھی انہیں یاد دلاتا ہے ہمارا پرانا قصہ دہراتا ہے۔ یہ تھا عظیم آباد کا اگلا اور دیرینہ قصہ لیکن جب نیا دور شروع ہوا تو ایسٹ انڈیا کمپنی اور شاہ عالم کے وقت میں دلّی کا ایک اور چراغ یہاں روشن ہوا۔ راجہ پیارے لال اُلفتیؔ ایک مدت تک دلّی میں اکبر شاہ ثانی کے میر منشی رہے، لیکن بالآخر ترکِ نوکری کر کے عظیم آباد چلے آئے، اور یہیں کے ہو رہے۔ عربی میں ذی استعداد اور فارسی کے استاد تھے۔ اُردو کو بھی آپ نے نظر انداز نہیں فرمایا۔ آپ کا ایک شعر ہدیۂ ناظرین ہے۔ ؎

خاکساری سے مثالِ نقشِ پا[1] ٭ جس جگہ بیٹھے وہیں کے ہو گئے

راجہ کو کتب بینی کا از حد شوق تھا، چنانچہ اُن کے خانگی کتب خانہ میں کئی ہزار کتابیں تھیں۔ میرے اُستاد مرحوم حضرت شادؔ علیہ الرحمۃ فرماتے تھے کہ "میں نے راجہ کے کتب خانہ کی کوئی ایسی کتاب نہیں دیکھی، جس پر راجہ صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا حاشیہ نہ ہو۔ یہ تھا اُس وقت کا عظیم آباد اور اُس دور کے اربابِ کمال کا ذوق و شوقِ علم!!

کنور ہیرا لال ضمیرؔ ان کے اکلوتے فرزند بھی عربی و فارسی کے استاد اور مستند شاعر تھے۔ انہوں نے کنور برج بہادر اور کنور سکھ راج بہادر دو لائق فرزند چھوڑے۔ کنور سکھ راج بہادر کی علم دوستی مشہور خاص و عام ہے۔ ان کے ہاں مشاعرے بھی یادگار ہوئے۔ کنور صاحب کا خاندان ان کے قدیم محل واقع ہر مندر گلی میں سکونت پذیر رہا اور ہنوز قایم ہے۔ اِن اگلی بہاروں کا آخری شگفتہ پھول فریادؔ (شاہ الفت حسین) کچھ

---

[1] مصنفِ تاریخ شعرائے بہار جناب آزؔ مرحوم عظیم آبادی نے "نقشِ پا" کی جگہ "کفشِ پا" تحریر فرمایا ہے۔ یا تو مصنف نے اِس لفظ پر غور نہیں کیا یا کاتب سے سہو ہو گیا۔

اس طرح کھلا کہ عظیم آباد تو عظیم آباد تمام ہندوستان کو مسخر کر گیا - ان ہی حضرت فرہاد کے شاگرد اور فخر استاد شاگرد ہمارے استاد مرحوم نور اللہ مرقدہ حضرت شادؔ تھے، جن کی نسبت نے عظیم آباد کی شاعری اور زبان دانی کے پلہ کو اور بھی گراں تر کر دیا - بقول میر انیسؔ مرحوم -

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر　　　مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا،

اسی کی طرف حضرت سیماب اکبر آبادی مندرجہ ذیل سطور میں اشارہ فرماتے ہیں - "عظیم آبادیوں تو ہمیشہ فضلا و شعرا کا مولد و مسکن رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ علامہ شادؔ عظیم آبادی کی نسبت نے اسے ہندوستان کے ادبی جغرافیہ میں بہت ممتاز جگہ دے دی ہے، اور ہم عظیم آباد کو حضرت شادؔ مرحوم ہی کی وجہ سے زیادہ پہچان سکتے ہیں" اب میں اس سلسلہ کی آخری کڑی ملا کر یعنی اپنے محترم ادیب الملک نواب نصیر حسین خاں خیالؔ کا نام لکھ کر آج کی داستان ختم کرتا ہوں - ہمارے اِسی خیال کے متعلق رشید احمد صاحب صدیقی (پروفیسر مسلم کالج، علی گڈھ صدر شعبۂ اردو) تحریر فرماتے ہیں:- "شادؔ اور خیالؔ بہار کے انیسؔ و آزادؔ ہیں" میں شادؔ اور خیالؔ کی رُوحوں سے شرمندہ ہوں کہ طوالتِ مضمون کے باعث میں ان حضرات کے متعلق کچھ عرض نہ کر سکا، لیکن ان بزرگواروں کے متعلق اتنے مضامین شایع ہو چکے ہیں کہ ان حضرات کا تعارف میری جنبشِ قلم کا محتاج نہیں اور نہ یہ کمی مضمون کو تشنۂ معلومات رکھ سکتی ہے -

غرض اس صوبہ اور اس شہر کی زبان و شاعری آج کی نہیں بلکہ بہت پرانی، شہہانی اور شاہجہانی ہے اور ہند کے اکثر صوبوں اور شہروں پر اسے قدامت اور افضلیت حاصل ہے - یہ شہر اپنے مذاقِ شاعری میں کسی کا محتاج نہیں بلکہ آپ اپنا مقلد و شاگرد رہا - اور یہیں کے فیض سے اپنا کشکول بھر اکیا ہے - بقول حضرت شادؔ :-

"چو تعظیمِ بزرگاں ہست کیشم　　　در اُردو پیروِ آبائے خویشم
زبان دانانِ ایں شہرِ معظم،　　　نہ پنداری کہ بودند از کسے کم
زبانِ مادری من ہمان است　　　نہ ماخوذ از کلامِ دیگراں است۔"

اصل حقیقت یہ ہے کہ دہلی و لکھنو و عظیم آباد وغیرہ وغیرہ شہروں کی زبانیں ایک ہی جننے کی دو والیں اور شاہجہانی اُردو کی بیٹیاں ہیں - ایک ہی گھر میں پیدا ہوئیں، ایک ہی جگہ کھیل کود کر بڑی ہوئیں - ایک ہی طرح کے جہیز پائے - کوئی بیاہ کر پورب گئی، کوئی پچھم، کوئی اُتر اور کوئی دکھن، لہٰذا فرق بھی اتنا ہی ہونا چاہیئے جتنا دو بہنوں میں ہوتا ہے، نہ یہ کہ ایک کی آواز اور لحن پر ہزاروں طوطی قربان اور سیکڑوں ارگن بلجے اور خوش آواز ساز نثار، اور کسی کی بھدی آواز اور کریہہ الفاظ حسنِ سماعت کے لیئے ایک غیر قابل برداشت بوجھ اور ثقالت کا انگھ بار - اِن آخری الفاظ کی میں ذرا وضاحت بھی کر دینا ضروری سمجھتا ہوں - آج کا عظیم آباد، اب وہ اگلا عظیم آباد نہیں، لہٰذا اہل عظیم آباد یہ نہ سمجھ لیں کہ اب بھی یہاں کی عام زبان پہلے کی طرح فصیح اور لائق تقلید ہے - سوا چند نفوس کے (جن کی تعداد بہت ہی کم ہے) تمام اہل عظیم آباد کا شمار فصحا میں نہیں ہو سکتا - مثل مشہور ہے کہ شبنم سے پیاس نہیں بجھ سکتی - یہ چند گنتی کے فصحا تمام صوبے کی زبان کیونکر درست کر سکتے ہیں، جب تک کہ زبان کے ہر نام لیوا اور اس کے تمام ہمدردوں کو اس کی اصلاح اور ترقی کا خیال نہ ہو - ہاں! پچاس ساٹھ سال اُدھر البتہ عظیم آباد فصحا کا مولد و مسکن تھا، لیکن ع "یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا!" اب تو جدھر جایئے اور جس سے سُنیئے وہ زبان بولی جاتی ہے کہ خدا دشمن کو بھی نہ سُنوائے -

ہمارے اگلے بزرگواروں میں تہذیب زبان کے ساتھ تہذیب آداب مجلس و نشست و برخاست اور حفظِ مراتب بھی ایسا تھا کہ ہمارے اس موجودہ شائستہ زمانے میں کوئی اس کا برتنے والا تو درکنار، جاننے والا بھی دکھائی نہیں دیتا - مجھے اِس وقت آدابِ مجلس کے متعلق کچھ عرض کرنا نہیں - ہاں! آداب زبان کی طرف توجہ دلائے بغیر نہیں رہ سکتا - اس میں شک نہیں کہ ہر ملک کے دار السلطنت میں بہ نسبت دیگر شہروں کے تہذیب و شائستگی زیادہ اور وہاں کی زبان و لہجہ بھی فصیح تر - اسی کلیئہ کے ماتحت عظیم آباد، پٹنہ بھی اپنے صوبہ کے دوسرے شہروں سے کیا بہ حیثیت زبان اور کیا بہ حیثیت معاشرت یقینی شرف امتیاز رکھتا ہے - لیکن تاہم محاوروں کے استعمال میں چند ایسی بے احتیاطیاں اور بے پروائیاں بھی برتی جاتی ہیں کہ جن کو سُن کر فصاحت و زباں دانی، بلاغت و شاعری انگشت بدندان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی - مثلاً

(۱)　افعال میں تذکیر و تانیث و جمع کی غلطیاں :-　روٹی کھایا - باتیں کیا - وغیرہ وغیرہ
(۲)　جمع کی جگہ واحد　:-　دو چار بات سُنو -

(۳) تانیث وتذکیر کے استعمال میں عدم احتیاط :- اُس کی مزار - چھوٹی تکیہ - بڑی پلنگ - کھٹی دہی وغیرہ وغیرہ

(۴) افعال میں حرف زاید لگانا :- کہس اور کہن - دہس اور دہن ، بجائے کہا اور دیا -

(۵) ایک دو وغیرہ کے بعد لفظ "ٹھو" کا استعمال :- ایک ٹھو - دو ٹھو -

(۶) اسمار کی غلطیاں :- بدھنا بجائے لوٹا - بارات بجائے برات وغیرہ -

(۷) "نے" کا غلط استعمال :- تم لائے کی جگہ تم نے لایا -

(۸) غلط مصادر کا استعمال :- پہرنا بجائے پہننا - چیپ دینا بجائے دبا دینا - ٹانگنا بجائے لٹکانا - وغیرہ وغیرہ -

(۹) غلط ترکیب :- ہر شہروں - ہر گھروں بجائے ہر شہر ، ہر گھر -

(۱۰) غلط تلفظ :- پکھا بجائے پنکھا - رے ، کو ڑے تلفظ کرنا - وغیرہ وغیرہ

(۱۱) غلط محاورہ :- پانی پٹانا بجائے سینچنا - وغیرہ

میں اس جگہ غلط اور صحیح ، فصیح و غیر فصیح کی فہرست بہ خیالِ طوالت پیش نہیں کر سکتا ، لیکن اشارۃً توجہ دلانے کے لئے چند مثالیں عرض کر دی گئی ہیں - یہ ایسی بیش پا افتادہ اور سامنے کی غلطیاں ہیں کہ ذرا سی توجہ کے بعد بہ آسانی ان کی اصلاح ہو سکتی ہے - صرف اچھے بُرے چند اشعار کہہ لینا اور اپنے کو شعرا و فصحا کی صفوں میں کھڑا کر دینا اور بات ہے - اور سلیس و فصیح اُردو بولنا اور لکھنا اور بات ! ہمارے شعرا یاد رکھیں کہ زبان کے بننے یا بگڑنے کی سب سے زیادہ ذمہ داری ان ہی حضرات کے سر عاید ہوتی ہے - صرف چند غزلوں کے کہہ لینے سے زبان کی اصلاح اور خدمت نہیں ہو سکتی - اسی امر کی طرف جناب شادؔ اشارہ فرماتے ہیں :- "لیکن بڑی حیرت ہے کہ ایسے لوگ بھی جن کو زباں دانی سے ایک طرح کا (منزل ہی سہی) سابقہ پڑتا ہے جب اپنے احباب سے باتیں کریں گے تو اسی ٹھیٹھری اور بھدی زبان میں ، نہ یہ کہ اپنی تحقیق بھر اس میں عمدہ محاورے صرف کریں - اُن کا حال بعینہٖ اُس بھوکے کا ہے کہ تلاش سے نعمتیں جمع کرے اور بے پروائی سے بھوک کے مارے مر جائے "

"زبان کا سدھارنا شاعروں کے متعلق ہے"

"شاعر اور غیر شاعر میں کوئی ایسا مابہ الامتیاز فرق نہیں ہے اور اگر ہے تو یہی ہے کہ اُس نے زبان کے ہر ایک نکتہ پر خوب غور کیا ہے اور کوڑے کے انبار سے گوہر شب چراغ چُن لئے ہیں" میں اپنے طبقہ شعرا کے متعلق تو مختصراً عرض کر چکا لیکن صرف یہ ایک طبقہ کیا کر سکتا ہے جب تک کہ ملک کا ملک اور شہر کا شہر توجہ نہ کرے لیکن زبان کی اصلاح اور بگاڑ کی سب سے زیادہ ذمہ دار حکومت ہوتی ہے - پہلے تو خیر غیر ملکی حکومت تھی لیکن جب سے صوبائی حکومتیں قائم ہوئی ہیں اور عنانِ حکومت کا ایک سرا ہمارے ہموطن بزرگواروں کے ہاتھوں میں آیا ہے - جب سے تو اُردو اور بھی سخت شکنجہ میں آگئی ہے - زبانی وعدے بھی ہوئے ، احکام بھی لکھ کر نافذ کئے گئے لیکن اب تک بھی منت کشِ حنا نہ ہوا - ندیمؔ نے بھی اپنے نظرات میں بار بار صوبہ بہار کی گورنمنٹ کی توجہ اس طرف مبذول کی لیکن اُس کی آواز بھی صدا بہ صحرا سے زیادہ سماعت نواز ثابت نہ ہوئی - اس سے زیادہ اُردو کے ساتھ اور کیا بے انصافی کی جاتی کہ ہندو تو ہندو ، غریب مسلمانوں کے ہاں بھی سرکاری دفاتر سے جتنے سمن (summon) وغیرہ جاری کئے جاتے ہیں سب ہندی میں ، اور طرہ تو یہ ہے کہ فارم چھپا ہوا تو انگریزی میں ہے لیکن ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارتیں ہندی میں - کاش وہ بھی اُسی طرح انگریزی ہی میں ہوتیں ! کیا اُردو داں طبقہ اب اس امر پہ مجبور کیا جائیگا کہ وہ اس طرح کے کاغذات واپس کر کے عدالتی احکام کی خلاف ورزی پر آمادہ ہو جائے ؟ میں عرض کرتا ہوں کہ برادرانِ وطن غیر ملکی قوم کا شکوہ کرتے ہیں لیکن یہ خود اُن سے دو ہاتھ آگے نظر آتے ہیں -

مجھے ندیمؔ کے نظرات میں یہ پڑھ کر کہ فارم پر اُڑیا رسم خط تو ہے لیکن اُردو ندارد اور بھی افسوس ہوا - ذہنیت تو ایسی پھر اور پست اور تمام ملک کی نمایندگی کا دعویٰ ! میں یہ پڑھ کر بہ بانگ دہل اعلان کرنے پر تیار ہوں کہ یہ سب کچھ نہیں صرف اُردو کی دشمنی اور مسلمانوں سے غلط نسبت دیکر اس کی بیخ کنی مقصود ہے - مجھے مدیر ندیمؔ سے اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ وہ لجاجت سے یہ کہتے ہیں کہ "صوبہ بہار میں اُڑیا جیسی غیر ضروری زبان ہی کے نیچے سہی غریب اُردو کو بھی رہنے کی جگہ عنایت کیجا سکے " میں کہتا ہوں کہ اُردو داں طبقے کو یعنی ہندو اور مسلمان دونوں کو مل کر گورنمنٹ کو مجبور کرنا چاہئے کہ وہ ہندی کے پہلو بہ پہلو اُردو کو بھی جگہ دے - یہ میرا حق اور جائز حق ہے ، پھر اس کا مطالبہ فقیروں کی طرح کیوں کیا جائے ! میں ایسے حضرات کو جو بھائی بھائی میں کسی طرح کا افتراق پیدا کریں اور ایک معمولی سا زبان کا سوال اُٹھا کر باہمی میل جول میں فرق ڈال دیں ، حتیٰ کہ زبان تک کو دو بنانا چاہیں ، وہ رقیبوں کے پوشیدہ قوتِ بازو اور اُن کے دامِ سازش کے چھپے ہاتھ ہیں -

ہمارے صوبے میں ایک اور عیب بیرون پرستی کا بھی ہے جس کی وجہ سے یہاں کے باکمال پراگندہ خاطر ہو کر خاموش ہو بیٹھتے ہیں ، یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کسی دلیل کی ضرورت نہیں - لیکن ؎

کوئی اے شادؔ پوچھے یا نہ پوچھے اس سے کیا مطلب　　خود اپنی قدر کرنی چاہئے صاحب کمالوں کو ،

ایک عظیم آبادی شاعر جس پر اکبرآباد نے قبضہ کر لیا

اور

اسکی ایک قلمی مثنوی

"پیام نظیر"

از جناب عبدالحمید صاحب حمید تاج محلی

اس تاریخی اجتماع میں جبکہ اردو زبان کا نقشہ بدلا جا رہا ہے تاریخ ایک جدید شکل اختیار کرتی جا رہی ہے میرے ایک کرم فرما نے رسالہ "ندیم" کو اپنی مختصر تحریر کے ساتھ تحفتہً میرے پاس ارسال فرمایا ہے۔ اور بہار نمبر ۱۹۴۰ء کے اشتہار کی سرخی اور آخری جملہ کی طرف خاص طور پر رجوع کیا ہے۔ حالانکہ میں مضمون نگار نہیں مگر میری دلچسپیاں قریب قریب ہر ایسے رسالہ سے جس کی سرمستیاں زبان اردو کو زندہ کرنے میں پیش پیش ہوں۔ متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ خصوصاً فرمائش پر عزیز دوستوں کا مشکور ہوتا ہوں۔

اس فرمائش کو جب میرے ضمیر نے قبول کر لیا تو دو جملے اول یہ کہ "مضمون نگاروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے مضامین روانہ کریں" دوئم یہ کہ "مضمون صوبہ بہار ہی کے کسی پہلو پر لکھا گیا ہو" پڑھ کر سکتہ میں رہ گیا اور آفتاب آمد دلیل آفتاب کہہ کر رہ گیا۔ پھر دن اس تلاش اور جستجو میں رہا کہ ناظرین "ندیم" کو کس طرح خوش ہونے کا موقع دیا جائے۔

کوئی شہر ایسا نہیں کہ جہاں خوش گو ماہر فن شاعر نہ گذرا ہو یا موجود نہ ہو لیکن ایسا شاعر جو فطرت پرست مصور ان جذبات تمدن و معاشرت۔ محاکات فکار کی تلاش مشکل اور بہت مشکل ہے اور پھر وہ جو اس قید کا موازنہ ہو پہچان کر ادب کی محفلوں میں استقبال کرنا کوئی آسان بات نہیں آسمان ادب کے ستاروں کا ہر مورخ نے ذکر کیا ہے مگر میاں نظیر ایک ایسے شاعر ہیں کہ گمنام ہی رہتے۔ اس خدمت کے لئے صرف بزم نظیر ہے کہ وہ دور اول کے شاعر کے واقعات کو موقع بموقع پیش کرتی رہتی ہے۔ وہ نظیر جو ہندوستانی شاعری کے لحاظ سے زبان اردو میں جواب نہیں رکھتا۔

نہ صرف اکبرآباد کا ذرہ ذرہ نظیر کا محبوب ہے بلکہ بہار کو بھی اس مناظر فطرت کی تصویر پر ناز کرنا زیبا ہے اس لئے کہ مرحوم عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور سن شعور کو وہیں گذارا پھر اکبرآباد پہنچے گویا وہ صوبہ بہار کے مہکتے ہوئے پھول تھے اور سو برس کے بعد اکبرآباد میں آکر مرجھا گئے اس لئے پیام نظیر بہاریوں اور اکبرآبادیوں دونوں کے واسطے یکساں ہے مگر دونوں کی ادبی تاریخیں تاہنوز مرحوم کے ذکر سے خالی نظر آ رہی ہیں ہے تو یہ کہ اصلی نام کو بھی فراموش کر دیا اب صرف نظیر کے نام سے مشہور ہیں۔

میاں نظیر کی ذات ایسی ہے جس کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی شاہراہ سب سے علیحدہ بنائی اور اپنے لئے تقلید کا تنگ دائرہ پسند نہ کرتے ہوئے خود ایک صنف کے موجد ہو گئے۔ نظم اور مسلسل نظم جو اس وقت تک اردو شاعری کے لئے بالکل اجنبی تھی اب اس میں شامل ہو گئی۔ تعجب تو یہ ہے کہ مغربی تعلیم و تربیت کا قدم اس وقت تک ہندوستان میں نہیں پہونچا تھا لیکن نظیر کے یہاں خیال کی ادائی اور خطابت کا جو عنوان اور اسلوب ملتا ہے وہ بالکل مغربی شاعری کے طرز پر ہے

اس تاجدار سخن کے کلام کو یورپ نے بھی قبول کر کے ترجمہ کر لیا ہے انکا قول ہے کہ شعرائے ہند میں نظیر ہی وہ شاعر ہے جس میں شکسپیر کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔ نظیر نے دنیا کو جس حالت میں دیکھا اوسکو اوسی شکل میں قلمبند کر دیا۔ نظیر کے کلام کو اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو بلا مبالغہ ہر صاحب علم کہہ سکتا ہے کہ نظیر مصور فطرت تھے۔ نقاش حیات۔ الفاظ کے بادشاہ۔ خیالات کے مالک۔ جذبات کے فرمانروا

تھے، بے تعصبی کا یہ عالم کہ جہاں بزرگانِ اسلام کی منقبت میں نظمیں لکھیں، وہاں ہندو اوتاروں کے لئے بھی اظہارِ عقیدت کیا ہے۔

جس جوش و خروش سے عید منائی اُسی سرمستی اور ہنگامہ سازی سے ہولی کی رنگ رلیاں قایم رکھیں۔ غزلیات میں میرؔ کے دوش بدوش نہ سہی قدم بہ قدم چل رہے ہیں مختصر یہ کہ نظیرؔ نے اپنے جوش کے عالم میں جو کچھ کہا ہے وہ بے مثل و بے نظیر ہے۔ نظیرؔ کا مرجوعہ خیال اتنا بلند تھا کہ جس پر ظاہر بینوں کی نگاہ نہیں پڑی اور یہ اُس گویا واگو شاعر کہہ کر خاموش ہو گئے۔ نظیرؔ کو سمجھنے کے لئے پہلے دنیا کو سمجھنا چاہئے۔ ہندوستان اگر مغربی شاعر کے مقابلہ میں کسی شاعر کو پیش کر سکتا ہے تو وہ نظیرؔ کی ذات ہے۔ بزمِ نظیرؔ نے بہت کوشش کی کہ کہیں سے تصویر میسر آسکے مگر معذور رہی۔ اکثر رسالوں سے قلندرانہ وضع میں ہلاک پیش کئے ہیں مگر وہ تمام میاں نظیرؔ کے حلیہ سے دُور تر ہیں۔ آپ نے اپنا حلیہ اپنے قلم سے بند کیا ہے۔ قابلِ غور ہے ؎

مست روش پست قد سانولا ہندی نژاد — تن بھی کچھ ایسا ہی تھا قد کے موافق میاں
ماتھے پہ اک خال تھا۔ چھوٹا سا مسّے کے طور — تھا وہ پڑا آنکھ اور ابروؤں کے درمیاں
وضع سبک اُسکی تھی تس پہ نہ رکھتا تھا ریش — مونچھیں تھیں اور کانوں پر پٹے تھے پہند ساں
پیری میں تھی جس طرح اُس کو دل افسردگی — ویسی ہی تھی ان دنوں جن دنوں میں تھا جواں

آنکھیں نم چھوٹی۔ کسرتی بدن۔ سوتواں ناک۔ کتابی چہرہ۔ خوش قیافہ۔ شگفتہ مزاج۔ بلا کی ذہانت تھی۔ لباس کرتہ، سیدھے پردے اور نیچی چولی کا انگرکھا۔ بڑے پائچوں کا پائجامہ۔ پگڑی محمد شاہی چکر دار کھڑکی دار۔ پٹکہ کمر میں۔ گھیتلی جوتی۔ ہاتھ میں آڑو کی چھڑی۔ دو انگوٹھیاں انگلی میں عقیق اور فیروزے کی نگ دار۔ جاڑوں میں فرخ آبادی چھینٹ کا چوغہ۔

میاں نظیرؔ کا خط نہایت اچھا تھا۔ اُس کی نسبت آپ خود فرماتے ہیں ؎

لکھنے کی یہ طرز تھی کچھ جو لکھے تھا کتاب — پختگی اور خامی کی اُس کا تھا خط درمیاں

تصانیف و تالیف۔ قصّہ لیلےٰ مجنوں نظم۔ مثنوی حسن و عشق۔ نثر میں انشائے نظیر۔ قدر متین۔ فہم ترین۔ بزمِ عیش۔ رعنائے زیبا۔ اور حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کریما کے ہر شعر پر بند لگائے ہیں پھر صدہا نظموں کا مجموعہ کلیات ہے۔ جو بلا کسی نگرانی اور دیباچہ کے طبع ہو چکا اور صدہا نظمیں ایسی ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ جب ہم حساب لگاتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ میاں نظیرؔ کے بعد کسی شاعر نے آج تک اس قدر اشعار نہیں کہے۔ الفاظ، لغت، ردیف۔ قافیہ، یہ سب غلام تھے۔ جس طرح چاہا باندھا، جہاں چاہا کھپا دیا۔ گویا ان تمام کو نظیرؔ نے فروغ دیا جو تمام تر مقامی تہذیب، تمدن اور معاشرت کی تصویریں ہیں۔

میاں نظیرؔ کی پیدائش کا سنہ مورخین نے ۱۱۴۸ھ لکھا ہے گویا عالمگیر اورنگزیب کی وفات کے تیس برس بعد ہے۔ آپ کا نام نامی سید ولی محمد تخلص نظیرؔ تھا۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام سید محمد فاروق ہے جو سادات بارہہ میں سے تھے۔ اور عظیم آباد خاص میں کسی نواب کے مصاحب تھے۔ چونکہ آپ کی شادی نواب سلطان خاں قلعہ دار آگرہ کی دختر سے ہوئی تھی، اُس سے آگرہ میں محلہ نوری دروازہ آکر مقیم ہوئے۔ اور شرفائے اکبر آباد میں سے مشہور ہوئے اور جب میاں نظیرؔ سنِ بلوغ کو پہونچے تو ان کی شادی عبدالرحمٰن خاں چغتائی سخلف محمد علی بیگ صوبہ دار جن کا سلسلہ نسب وزیرِ سلطان جہانی حضرت حبیب اللہ سے ملتا ہے ہو گئی۔ اس لئے میاں نظیرؔ تاج گنج گلی ملکہ زیرِ محل نواب بیگم صاحبہ باشندہ اکبر آباد ہو گئے اور کچھ اس درجہ مانوس ہوئے کہ مسکن سے دو میل دور جانا بھی پسند نہ فرمایا۔

میاں نظیرؔ نے باپ ہی کے زیرِ سایہ فارسی، عربی، ہندی میں کامل دستگاہ حاصل کی۔ شعر و سخن میں کسی اوستاد کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ زورِ فکر، جودتِ طبع اور انقلابِ زمانہ نے خود بخود یدطولےٰ عطا کر دیا اور آزادی کا جس طرح آپ نے ماحول پیش کیا ہے۔ اب جو مہذب زمانہ کہلاتا ہے، لکھ نہیں سکتا۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا اُس کا مقصد پیشِ نگاہ رکھتے ہوئے ہر نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا۔

جب ہم میاں نظیرؔ، امیرؔ اور غالبؔ کے کلام کا موازنہ کرتے ہیں تو تاریخ بتاتی ہے کہ یہ شاعر اپنے رنگ کا استاد تھا۔ لیکن امیرؔ کی زبان کو کس شاعر نے قبول کیا اور زبانِ اُردو کا لغت کس نے ترتیب دیا، کس نے پشت پناہی کی؟ مجھ سے اگر کوئی صاحب دریافت کریں تو میں بلا مبالغہ عرض کرونگا کہ نظیرؔ اور صرف نظیرؔ کی وہ ذات ہے جس نے اُردو ادب میں چار چاند لگائے۔ پھر وہ کلام جسے میاں نظیرؔ نے مسدس، منقبت وغیرہ وغیرہ میں گذشتہ

دور کے تمدن و معاشرت کا نقشہ کھینچکر رکھدیا ہے اور وہ وہ الفاظ جذب کئے کہ آج کسی کی زبان پر نہیں، کانوں نے سُنا نہیں۔

غرضکہ میاں نظیر کی شاعری مبالغہ سے خالی، تصنع سے بری نظر آتی ہے۔ معاصرین کے رنگ سے جُدا رنگ ہے۔ سیدھی سیدھی باتیں، حقیقی کیفیتیں۔ سنہری زبان میں جو ایک شاعرِ اعظم کے لئے ضروری ہیں جمع کر گئے۔ ان کی بے تعصبی کہئے یا اظہارِ عقیدت سمجھئے ایک طرف رام لچھمن۔ رادھا کرشن۔ بلدیو جی۔ مہادیو جی۔ گرونانک کے واقعات پر تبصرہ فرمایا تو دوسری طرف لیلےٰ مجنوں اور دیوالی کی سرمستیوں کو بھی پیشِ نظر رکھا۔ جہاں عید کی خوشی ہے وہاں ہولی کی ہنگامہ سازی اور بسنت کی رنگینیوں کو بھی نہیں چھوڑا۔

میاں نظیر حضرت میر سے جن کی پیدایش سنہ ۱۱۳۷ھ ہے عمر میں گیارہ سال چھوٹے تھے۔ اور غالب سے جو سنہ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے تقریباً چونسٹھ سال بزرگ تھے۔ بہت ممکن ہے کہ میر نے دارالسلطنت آگرہ کی وہ جھلک دیکھی ہو کہ جب یہاں نہرِ بہشتی پیاسوں کو سیراب کرتی ہو شعر و سخن کا شور ایک عالم پر چھایا ہوا ہو حسین خوش ترکیب پاکیزہ طینت سرگرم کار ہوں۔ عارف، کامل، فاضل، قاری، محدث، شیخ اور حکیموں کا مجمع ہو۔ لیکن میاں نظیر نے جب ہوش سنبھالا ہے تو مغلیہ سلطنت کا دم نزع میں تھا۔ ایک ایک کرکے دہلی، لکھنؤ، لاہور، حیدرآباد کو رخصت ہو چکے تھے۔ مگر میاں نظیر کے پاؤں میں حب الوطنی کی زنجیر پڑی ہوئی تھی، آپ نے باوجود اس کے کہ نواب واجد علی شاہ کا پیام آتا ہے، مگر آپ گھر سے قدم باہر نہیں نکالتے ہیں۔

نظیر کا انتقال سنہ ۱۲۴۶ھ میں ہوا۔ اور اپنے مکان کے سامنے ایک کشادہ زمین میں نیم کی درخت کے نیچے دفن ہوئے۔ پختہ مزار ہے مگر آہ! آگرہ میں اس غریب الوطن شاعر کی قبر کا یہ حال ہے کہ قبر موجود ہے۔ چہار دیواری فنا ہو گئی۔ ہر تیوہار پر خصوصاً ہولی اور دیوالی پر معتقدین جمع ہوتے ہیں، شعر خوانیاں کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ موجودہ فضا نے اسے بھی مٹا دیا تھا، سنہ ۱۹۳۷ء کے شروع میں بزمِ نظیر نے جنم لیا۔ صد سالہ برسی کا آغاز کیا۔ ۲۵ر جنوری سنہ ۳۹ء کو تیسرا بسنت منایا۔ عوام نے لبیک کہا، خصوصاً اہلِ ہنود نے بڑی دلچسپی ظاہر کی۔ اس وقت اس اکبرآباد کے تاج ثانی کی قبر کی برتری کی اپیل کی تھی

سوتا ہے نظیر اس جا غربت میں بہت دن سے　　مسکن نہیں بنتا ہے تو تبخانہ بنا دو

اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ اصلاح ہو گئی، ایک ہنڈا روشنی کا لگا دیا گیا۔ امید ہے کہ آنے والے بسنت تک جو سنہ ۴۰ء میں ہونیوالا ہے اور کچھ ہو رہے گا۔ [1]

علاوہ کلیات نظیر، آگرہ میں کئی جگہ نظیر کے کلام کے قلمی نسخے موجود ہیں، انہیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ نظیر ایک بحرِ زخار تھا جس کی موجوں میں جو آ گیا بہا چلا گیا۔ اس موقع پر مضمون کو طول ہو جانے کا ڈر ہے، ورنہ دل تو نہیں چاہتا کہ قلم کو روک دوں مناسب یہ ہوگا کہ اُس مثنوی کے چند بند نمونہ کے طور پیش کر دوں۔ جو کلیات نظیر میں طبع نہیں ہوئے ہیں۔ اگر ناظرینِ ندیم کی توجہ ہوئی تو آیندہ اور روانہ کر سکوں گا۔ یہ مثنوی تین سو اشعار پر ختم ہوتی ہے جو ایک سو بیس برس قبل کی یادگار ہے اور عہدِ گذشتہ کی تصویر ہے، جب کہ اُردو زبان نے جنم لیا تھا اور بڑی خوبی یہ ہے کہ بالکل اچھوتا مضمون ہے۔

جب تلک تھی نہ جوانی تو بہت شادی تھی　　کچھ نہ اپنے دلِ آزاد پہ بیدادی تھی،
حسن اور عشق کے اُن جھگڑوں سے آزادی تھی　　اُس طرح راحت و آرام کی نہ بربادی تھی

سینۂ دل میں مئے عشق کا کچھ جوش نہ تھا
وہی ایام بہت خوب تھے جب ہوش نہ تھا

---

[1] اس مزار کی چہار دیواری وغیرہ وغیرہ کا تخمینہ نوسو پچھتر ۹۷۵ روپیہ کل دار ہے۔ معتقدین کوشاں ہیں، امید ہے کہ کوئی شکل ایسی نکل آئیگی کہ زائرین محفوظ ہو سکیں۔ ادب نواز نگاہیں فنِ شعر کے قدر دانوں سے بھی درخواست کی گئی تھی کہ اس تشنہ کامانِ ادب کی قبر کی تیاری میں حصہ لیں مگر کسی نے کروٹ نہیں بدلی۔ اب یہی پیامِ نظیر، ناظرینِ ندیم کو ہے کہ نظیر کی قبر جس بیکسی کی حالت میں ہے اُس پر عنداللہ توجہ فرمائیں ورنہ نظیر کی پیشنگوئی بالکل درست ہے۔

یہ کم نصیب ہوئے ہم کہ بعد مرگ نظیر　　ہوئی نہ قبر تو ان کی کوئی بھی خشت نصیب

ہوش جب ہم نے سنبھالا تو سنبھلتا نہیں دل، ایک دم اب تو بجز عشق سنبھلتا نہیں دل
آتشِ عشق سے کب سینہ میں جلتا نہیں دل شمع کی طرح سے کس روز پگھلتا نہیں دل
پیشتر سوزِ غمِ ہجر سے نالاں کب تھے
ہمہ تن داغوں سے ہم سرو چراغاں کب تھے

تھے وہ دن خوب کہ تھی حسن سے واقف نہ نگاہ دل کو معلوم نہ تھی کوچۂ الفت کی راہ
تھے نہ آگاہ کہ کس بات کو کہتے ہیں چاہ عشق میں حالتِ دل ہوتی ہے کس طرح تباہ
ہائے کیا دن تھے کہ جب بےخبری رہتی تھی
کاہے کو آٹھ پہر نوحہ گری رہتی تھی

ظلم بیداد کسے کہتے ہیں واقف تھا کون آہ فریاد کسے کہتے ہیں واقف تھا کون،
فتنۂ ایجاد کسے کہتے ہیں واقف تھا کون جامہ برباد کسے کہتے ہیں واقف تھا کون
کسی صورت کی نہ غفلت میں خبرداری تھی
وہی دن خوب تھے جب تک کہ نہ ہشیاری تھی

پیشتر راتوں کو اس طرح نہ بےخوابی تھی، کیا ہی آرام سے سوتے تھے نہ بیتابی تھی،
غنچۂ دل میں عجب رنگ کی شادابی تھی، خوش گزرتی تھی غم و درد کی پامالی تھی،
موم تھا پہلے یہ دل سینہ میں کچھ سنگ نہ تھا
پر جو اب ڈھنگ ہے آگے یہ کہیں ڈھنگ نہ تھا

وہ بھی دن خوب تھے جب غم سے سروکار نہ تھا عشق کے پیچ سے زنہار خبردار نہ تھا،
دامِ الفت میں دلِ زار گرفتار نہ تھا عیش سو طرح کے تھے ایک بھی آزار نہ تھا
دل سے اس طرح نہ پہروں مجھے سرگوشی تھی
ایسے ہشیار سے بہتر وہی بیہوشی تھی

پیشتر دل کی اذیت سے نہ آگاہی تھی، ان پریزادوں کی صورت سے نہ آگاہی تھی،
رنج کیا چیز ہے راحت سے نہ آگاہی تھی، ہجر اور وصل کی لذت سے نہ آگاہی تھی
کچھ نہ خوبی سے صباحت کی خبر رکھتے تھے
نہ چاشنی سے نہ ملامت کی خبر رکھتے تھے

دل کو پہلے نہ سمجھتے تھے کہ رسوا ہوگا نوجوانی میں ہمیں زلف کا سودا ہوگا
عشق کا کوچہ و بازار میں چرچا ہوگا دیکھیں انجام اس آغاز کا اب کیا ہوگا
لطف سمجھے تھے جوانی میں دو چنداں ہوگا
یہ بھلا کس کو خبر تھی کہ پریشاں ہوگا

ہائے اے رنج! کہاں اپنا وہ پہلا آرام ہائے بیتابیِ دل تو نے کیا کام تمام
سوزشِ عشق سے ہے آٹھ پہر زیست حرام ہے تڑپ شام سے تا صبح سحر سے تا شام
اس قدر یوں نہ طبیعت یہ بلاکش ہوتی
آب و گل میں نہ اگر عشق کی آتش ہوتی

مدد اے اشکِ رواں ضبط سے گھبراتا ہوں آتشِ عشق کی گرمی سے پھنکا جاتا ہوں،

سوزشِ داغ کی میں تاب نہیں لاتا ہوں ہائے کیا آگ لگی ہے کہ جلا جاتا ہوں

سرد ہوتی نہیں اس اپنے دلِ زار کی آگ،
پھونک دی عشق نے کس شعلۂ رخسار کی آگ

ظلمتِ دل کو کیا عشق کے جب نور نے کم صاف آئینہ کی صورت نظر آیا عالم
حسن دکھلانے لگا اپنے تماشے پیہم پھنسے جاتے ہیں جو ان کے عجب پیچ میں ہم

دل کا پہلے نظر آتا تھا او لجھنا مشکل
کھل گیا اب کہ او بجھا رہے سنبھلنا مشکل

خلق میں سب کے لئے عشق کا دیں زیبا ہے عشق پر کون سی یہاں شان نہیں زیبا ہے
گر کہیں ہم خضرِ راہ یقیں زیبا ہے عشق کا خاتم خاطر پہ نگیں زیبا ہے

دولتِ عشق جو عالم میں فراواں ہو جائے
کیا عجب ہو کہ یہ اک مور سلیماں ہو جائے

حسن اور عشق نہ ہوتے جو عیاں دنیا میں ہوتے ظاہر نہ کبھی رازِ نہاں دنیا میں
جب کہ آرام کا ملتا نہ نشاں دنیا میں دیکھتے لطف نہ کچھ پیر و جواں دنیا میں

ہر بشر مغتنم اس راہ نما کو سمجھے
خلعتِ عشق سے بندے بھی خدا کو سمجھے

عشق اپنی نہ اگر جلوہ گری دکھلاتا کبھی مہتاب نہ داغِ جگری دکھلاتا،
حسن اگر شیشۂ دل میں نہ پری دکھلاتا پردۂ چشم نہ اشکوں سے تری دکھلاتا،

دل نہ یوں شیفتۂ زہرہ شمائل ہوتے
نہ فرشتہ بھی غریقِ چہِ بابل ہوتے

دلِ مجنوں کو اگر عشق کا آتا نہ پیام کبھی بھولے سے بھی لیتا نہ وہ لیلےٰ کا نام
دلِ فرہاد میں کرتا نہ اگر عشق مقام کبھی شیریں کی جدائی میں نہ پھرتا وہ تمام

سب کو عالم میں عجب عشق کی سرکار ملی
گر ملا یار تمنائے دلِ زار ملی

گرمئ عشق دلوں میں نہ اگر کرتی راہ، شمع پر کرتے نہ پروانے بھی جاں دینے کی نگاہ
محوِ گل پھر دلِ بلبل نہیں ہوتا واللہ ماہ کنعاں کی زلیخا کو بھی پھر ہوتی نہ چاہ

عشق اگر چاند کی صورت نہ عیاں ہو جاتا
جلوۂ ماہ سے کیوں چاک کتاں ہو جاتا

چونکہ رسالہ ندیم بہار نمبر نکال رہا ہے، بہتر سے بہتر ذخیرہ جمع ہو چکا ہوگا اس لیے یہ سولہ بند ناظرین ندیم کو محظوظ کرنے کیلئے اور گمنام شاعر کے نام کو زندہ کرنے کی غرض سے ارسال کر رہا ہوں۔ آپ کی نظروں سے اس سے قبل اور بھی واسوخت گذرے ہونگے، آپ نے کبھی غور کیا کہ حسن اور عشق کا آغاز جس پیرایہ میں نظیر نے کیا ہی ایک جدید رومان نظر آ رہا ہے۔ عشق کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے حسن کا غیر فانی ہونیکا ثبوت مسرت پیدا کر رہا ہے۔ دولتِ عشق کا ہونا اور اس کے ذریعہ خدا کو پہچاننا کس قدر خوشنما لازم و ملزوم قرار دیا۔ یہ یگانگی کی شمع گو بجھ چکی ہے۔ مگر بزمِ نظیر اس امر میں کوشاں ہے کہ ہند کا بچہ بچہ نظیر سے اور نظیر کے نام سے اور سوانح سے واقف ہو جائے۔

"شاد کا تغزل"

از جناب سید شاہ ولی الرحمٰن صاحب بی ام۔ اے ڈپٹی مجسٹریٹ، چمپارن

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسن یار　　چیزے فزوں کند کہ تماشا بہ ما رسید

"میخانۂ الہام" کی تنقید کے دوران میں میں نے اعلان کیا تھا کہ شاد مرحوم کے رنگ تغزل اور خصوصیات کلام سے بحث کرونگا۔ مقالہ کی ترتیب میں فرصت کا فقدان برابر سد راہ رہا۔ آج مہینوں کے بعد محترم ایڈیٹر ندیم کی فرمائش سے ندیم کے بہار نمبر کے لئے قلم فرسائی کی نوبت آئی ہے۔ کئی دنوں تک سوچتا رہا کہ کس موضوع پر لکھوں۔ آخر دل نے یہی فیصلہ کیا کہ شاد مرحوم کے رنگ تغزل اور خصوصیات کلام سے سیر حاصل بحث کروں۔ قبل بھی اس موضوع پر ندیم میں مضامین لکھے جاچکے ہیں۔ سب سے پہلے میرے عزیز دوست مولوی سید نصیر حیدر ڈپٹی کلکٹر نے شاد کے کچھ اشعار کی تشریح کی۔ اس کے بعد جناب حمید عظیم آبادی نے شاد کے سوانح حیات اور خصوصیات کلام سے ندیم کے بہار نمبر ۱۹۳۴ء میں بحث کی۔ لیکن یہ دونوں مقالے تشنۂ نظر آتے ہیں۔ پھر ندیم کے بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں محترمی سید وصی احمد بلگرامی ڈپٹی کلکٹر نے "سن شوص" کے مقالہ میں شاد مرحوم کا ذکر کیا لیکن رنگ تغزل اور خصوصیات کلام سے مطلق بحث نہ کی۔ بہر کیف اس تکرار کے باوجود بھی یہ داستان کچھ ایسی لذیذ و دلچسپ واقع ہوئی ہے کہ بار بار اس کے دہرانے میں مزہ آتا ہے

جو سنے اسے بھی خلش رہے جو کہوں تو ختم نہ ہوسکے　　یہ فسانہ زلف دراز کا کہیں زندگی سے درازہے

ہر شخص کا معیار تنقید جداگانہ ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا حضرات نے اس موضوع پر اپنے اپنے نقطۂ خیال سے لکھا۔ میں بھی اپنے نقطۂ خیال سے لکھونگا۔

شاد مرحوم نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی فرمائی لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ قابل التفات انکی غزلوں کا مجموعہ ہے بلکہ بقول نواب سید نصیر حسین خیال مرحوم وہ کسی اور صنف سخن کے مالک ہی نہ تھے۔

علامہ شبلی کا خیال ہے اور نہایت صحیح خیال ہے کہ میر کا تغزل، درد کا تصوف اور غالب کا تفلسف شاعری کی جان ہے۔ میر کی دردمند طبیعت سوز و گداز کا آتشکدہ تھی جس نے اردو غزل کو درد و حسرت سے معمور کرکے عرش کمال تک پہونچا دیا۔ درد زاویہ نشین اور صاحب وجد و حال بزرگ تھے۔ انھوں نے اردو غزل کو تصوف کے رموز و نکات اور حقائق و معارف سے مالا مال کردیا۔ نادرالوجود غالب کی فلسفیانہ طبیعت دائم الجدت اور حسن حقیقت کی پرستار واقع ہوئی تھی حسن و عشق ہو یا اخلاق و تصوف ہو یا توحید و معرفت ہو وہ ہر چیز کو فلسفیانہ انداز اور جدید اسلوب میں پیش کرتے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو کے تمام شعراء میں غالب کی شخصیت منفرد اور عدیم النظیر نظر آتی ہے۔ غالب کے تخیل کی رفعت و جدت، اور بیان کی جزالت و ندرت اپنی آپ مثال ہے۔

ایک شاعر اور بھی ہے جس کا تغزل اردو کے لئے سرمایۂ ناز ہے۔ وہ کون؟ آتش۔ خواجہ حافظ کا انداز بیان اگر اردو کے کسی شاعر میں پایا جاتا ہے تو خواجہ آتش میں۔ رنگینی و دل آویزی، روانی و برجستگی، جوش و سرمستی، وسیع المشربی و آزادگی آتش کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

کیا ان شعراء کے علاوہ کوئی اور بھی ایسا شاعر ہے جس کے سر آتش کے بعد تغزل کا سہرا رہا؟ تحقیق کی عدالت کا فیصلہ ناطق یہ ہے کہ ایسی ہستی شاد عظیم آبادی کی ہے۔ آتش نے ۱۲۶۳ھ میں انتقال کیا۔ اسی سال شاد پیدا ہوئے۔ ایک تناسخ کا قائل کہہ سکتا ہے کہ آتش کی روح نے شاد کے پیکر میں دوبارہ جنم لیا۔ یہی پانچ شعراء یعنی میر، درد، غالب، آتش اور شاد اردو غزلگوئی کے عناصر خمسہ ہیں۔

صوبۂ بہار میں ملا محمد علیم محقق سے لیکر موجودہ دور تک سیکڑوں شعراء پیدا ہوئے۔ ان میں سے راسخ اور جوشش سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ راسخ میر کے عکس ہیں لیکن نامکمل۔ جوشش درد کے پرتو ہیں لیکن ناتمام۔ اگر صوبۂ بہار کے تمام شعراء کے دواوین میرے سامنے رکھے جائیں اور کوئی یہ کہے کہ ان میں سے صرف ایک دیوان لے لو اور بقیہ کو جانے دو تو میں بے تامل کہہ دونگا کہ حضرت آپ یہ سب دواوین لے جائیے مگر دیوان شاد یہیں رہنے دیجئے۔

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بہ کس نگاہے

کلامِ شاد پر تبصرہ کرنے سے پہلے ناظرین کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ شاد مرحوم سے مجھے عقیدت مندی ہے اور رشتۂ تلمذ بھی گلے میں پڑا ہوا ہے تاہم میں نہایت آزادی و بیباکی سے تبصرہ کرونگا ۔ روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں کو نمایاں کرونگا اور انصاف کو عقیدت پر ترجیح دونگا ۔ اب میں اصل بحث کی طرف رجوع کرتا ہوں ۔

کلام شاد

شاد کی غزلیں "پستش بہ غایت پست و بلندش بسیار بلند" کی مصداق ہیں ۔ ان کے ضخیم دیوان غزلیات کا غایت درجہ چوتھائی حصہ قابلِ اعتنا ہے ۔ بقیہ حصہ بالکل ناقابلِ توجہ ہے ۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں جو شعریت سے یکسر معرا ہیں اور ان میں کوئی دلکشی و دلآویزی نہیں پائی جاتی ۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں جو نہایت دلکش اور بلند ہیں اور جن کی تعریف نہیں ہو سکتی ۔ شعر کے اساسی عنصر صرف دو ہیں خیال اور زبان ۔ یعنی کیا کہنا چاہئے اور کیونکر کہنا چاہئے ۔ ایک بات سیدھے سادے طریقہ سے کہی جائے تو اسے ایک معمولی بات کہیں گے اسے شعر نہیں کہہ سکتے ۔ اگر اسکو نئے انداز اور جدید اسلوب سے ادا کیا جائے تو یہ شاعری ہے ۔ بعض اہلِ فن کے خیال میں اسی جدتِ بیان اور لطفِ ادا کا نام شاعری ہے ۔ مثال میں شاد مرحوم کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

محبت خاص نعمت اسکی ہے اور آدمی بس رکھ
یہ عزت تو نے بیشک اپنے رتبہ سے سوا پائی

کوئے نیاز عشق میں آ جو پڑا رہے نصیب
خاک پہ رکھ جبینِ شوق سجدۂ عاجزانہ کر

بات ایک ہی ہے لیکن اندازِ بیان نے دوسرے شعر کو آسمان پر پہونچا دیا ۔ پہلا شعر بات ہی بات ہے جس میں مطلق حلاوت نہیں اور "آدمی بس رکھ" یہ ٹکڑا غیر شاعرانہ ہے اور مصرع کی روانی کے منافی بھی ہے ۔

میں نے جو شاد کو میر و درد ، غالب و آتش کے بعد بہترین غزل گو کہا ہے تو میری یہ رائے ان کے منتخب اشعار کے لحاظ سے ہے ۔ نیاز فتحپوری نے نگار میں صحیح تنقید کی تھی کہ شاد کے دیوان غزلیات کو ضرور شائع ہونا چاہئے لیکن انتخاب سختی کے ساتھ کیا جائے خواہ ایک ہی جزو کا دیوان کیوں نہ رہ جائے ۔

زبان شاد

شاد عظیم آباد کے ایک معزز خاندان کے رکن تھے ۔ اس گھرانے کی زبان مستند تھی ۔ زبان کے معاملہ میں شاد نہ دہلی کے پیرو تھے نہ لکھنؤ کے ۔ انکی زبان ایک خاص قسم کی زبان تھی ۔ وہ یقیناً فصحائے عظیم آباد سے تھے ۔ لیکن ان کا مذاقِ شاعری اتنا بلند واقع ہوا تھا کہ وہ زبان و بیان پر خیال و مضمون کو ترجیح دیتے تھے ۔ کہیں کہیں وہ متروک الفاظ بھی استعمال فرماتے تھے ۔ مثلاً ؎

عشق تو اس کا فضل ہے اس سے کسے ضرر ہوا
دونوں جہاں کی نعمتیں اس کے سبب سے پائیاں

بار حسن کلیوں پر تھیں پرچھائیاں
اے خزاں پہلے دی پرچھائیاں

متقدمین فعل کو بہ صیغۂ جمع استعمال کرتے تھے لیکن متاخرین بلکہ متوسطین ہی نے اسے متروک کر دیا ۔

شاد کی زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بعض بعض الفاظ اور ترکیبیں انہیں بہت مرغوب تھیں ۔ مثلاً "تکسنا" ؎

خالی نہیں اثر سے محبت جہان میں
بلبل تڑپنے کی جو آہ تو کلیاں تکس گئیں

ابھی نوخیز ہیں رنگت زمانے کی نہیں دیکھی
تکستی ہیں جو کلیاں بعض غنچے مسکراتے ہیں

بھچکنا ؎
دل بھچک کر صورتِ آئینہ حیراں رہ گیا
ہاں نقاب اٹھی یہ تو آنکھوں سے پنہاں رہ گیا

خدا کو مان ؎
تنگ نہ کر خدا کو مان اے مری دل گرفتگی
جاؤ نکالیں قفس میں خود ابکے بہار دیکھ کر

دل کی گرہ کھلنا ؎
عدو کے دل کی گرہ اک ادا میں کھول گئے
وہ کیا چھپائے ہیں ہم اک نظر میں تول گئے

جب جب ؎
ہم اپنے ہاتھ میں جب جب لبالب جام لیتے ہیں
تو ہر ہر گھونٹ پر ساقی کا اپنے نام لیتے ہیں

گھبرا کے ؎
دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا

ناشدنی ؎
دل کئے دیتا ہے رہ رہ کے کلیجہ پانی
مجھ سے پھر ناشدنی داد طلب کرتا ہے

کمبخت ؎
بد کہا شیخ نے غصہ میں بتوں کو ناحق !
یہ بھی کمبخت نہ سمجھا کہ کدھر آئے گی

مقرر ؎
کھل ہی جائے گا مقرر کسی دن آپ سے آپ
چپ رہو شاد زمانے کی ہے طینت معلوم

دلا ؎
ہرگز کبھی کسی سے نہ رکھنا دلا غرض!
جب کچھ غرض نہیں تو زمانے سے کیا غرض

گھڑیوں ؎
مری دیوانگی ناصح کا عاقل بن کے سمجھانا!
اس افسانہ کو جو سنتا ہے گھڑیوں مسکراتا ہے

اردو میں ایک طریقۂ بیان یہ ہے کہ معہود ذہنی کو کبھی کبھی محذوف کر دیتے ہیں لیکن معنی میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ مثلاً ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کا ایک دل پسند شعر ہے ؎

خدا جانے کہاں سے کھینچ کے میخانے میں آتی ہے
خبر اتنی تو ہے شیشے سے پیمانے میں آتی ہے

اس شعر میں شراب معہود ذہنی ہے جو اگرچہ محذوف ہے مگر شعر کا لطف ادا اس محذوف لفظ کو صاف ظاہر کر رہا ہے اور معنی سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اردو کے بہت سے شعرا نے اس طریقۂ بیان سے کام لیا ہے۔ شاد مرحوم ایک مخصوص محاورہ کے ساتھ معہود ذہنی کو محذوف کرنے کے عادی تھے "رہ رہ کے آنا" اس مخصوص محاورہ کو وہ ایک انوکھے انداز سے استعمال فرماتے تھے جس کی مثال شاید کسی شاعر کے کلام میں نہ ملے گی۔ اس طریقۂ بیان میں کہیں حیرت کو کہیں غصہ کو کہیں ترس کو معہود ذہنی قرار دیتے ہیں۔ مثلاً ؎

مجھے اس بے مروت آہ پر آتا ہے رہ رہ کر
مزا دیکھو وہیں کی ہو رہی کافر جہاں پہونچی

رہ رہ کے مجھ کو آتی ہے اپنی امید کی
بیکس کی لاش پر بھی کوئی نوحہ گر نہ تھا

مجھے رہ رہ کے اس حسرت زدہ بلبل پہ آتا ہے
کسی دن چین سے رہنے نہ پائی آشیانے میں

ہمیں تو حشر کی آتی ہے دیکھئے کیا ہو
یہ ایک وعدۂ نا استوار باقی ہے!

فارسی مصدر (کردن) کا ترجمہ (کرنا) بعض الفاظ کے ساتھ خلاف محاورہ استعمال کر جاتے تھے۔ مثلاً ؎

کہیں تو جام دھرا ہے کسی طرف ساغر!
کدھر جھکائے سر انسان کدھر نماز کرے[2]

نشیمن کرے شاخ گل پر نہ بلبل
کسی کو بھی یہ شاخ پھولی پھلی ہے

مشقت کے سوا کیا مل گیا مشق سخن کرکے
عدو چاروں طرف پیدا کئے ہم نے یہ فن کرکے

اس کے ماسوا اوپر بمعنی پر، پہ پر بمعنی لیکن، یاں واں بجائے یہاں، وہاں۔ خالی بمعنی صرف، موئے بمعنی مرے، ذری بجائے ذرا بھی استعمال کرتے ہیں ؎

کعبۂ مقصود کا حج ترے اوپر ہے فرض
وسعت دل ہے منا خون تمنا بہا

اے شاد رفتگان عدم پر نثار میں!
آنکھوں سے گو ہیں دور پہ دل سے قریب ہیں

رہا کیا ہے دل ویراں میں اک ارمان خالی ہے
جدھر آنکھیں اٹھاؤ منزلوں میدان خالی ہے

فقط ایک شاد پر کیا موئے کتنے مرنے والے
کہ خدا کرے کسی دن وہ سر مزار آئے

اسی بہانے سے دل کو انہیں دکھا دینا
یہ چیز کیسی پڑی ہے ذری اٹھا دینا

بقیہ الفاظ کا استعمال بہت عام ہے اس لئے مثالیں نظر انداز کرتا ہوں[1]

شاد کے بعض اشعار کی لفظی و معنوی حیثیت سے ارباب نظر گرفت بھی کرتے ہیں۔ جن کا شاید کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ؎

کہاں چھوڑا ہے مجھ وحشی کو قاتل نیم جاں تو نے
وہ کالی رات سناٹے کا عالم ہو بنارن کا

پہلے مصرع میں صیغۂ حاضر رہے استعمال ہوا ہے اس لئے دوسرے میں وہ کی بجائے یہ ہونا چاہئے تھا۔ اسی طرح سے ذیل کے شعر میں ؎

جس کو اس حسن پہ شک ہو اسے ایمان نہیں
جو نہ سمجھے تجھے یکتا وہ مسلمان نہیں

---

[1] ان الفاظ و تراکیب کا استعمال شاد نے اکثر شعروں میں کیا ہے۔ طوالت کے خیال سے نظر انداز کرتا ہوں۔ (دی)

[2] میر کے وقت میں یہ محاورہ مستعمل تھا مگر اس کے بعد بالکل متروک ہو گیا۔

تجھے کی جگہ پر اُسے ہونا چاہئے تھا کیونکہ مصرع اول میں اُس ہے۔

ساقی مہ لقا نے جب خم ہی سبو میں ڈھالدی   محلس مے میں چار سو شور مچا درود کا

شراب کی مجلس میں خم نہیں آتا۔ خم تو مجلس سے باہر ہی رہتا ہے۔ خم سے سبو میں شراب انڈیلنے کی خدمت مغبچے یا غلامان میکدہ انجام دیتے ہیں نہ کہ خود ساقی۔ خم ایک بہت بڑا ظرف ہے جس کا وزن شراب بھر جانے کی حالت میں اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ ایک معمولی طاقت کا انسان اسے اٹھا...... نہیں سکتا۔ شاد مرحوم [illegible] کے خلاف ہے۔ ساقی مہ لقا کے حسن و لطافت اور رعنائی و نزاکت سے بعید ہے کہ وہ بھرے خم کو اٹھائے۔ یہی اعتراض اس شعر پر بھی وارد ہوتا ہے

ساقی خموں سے ڈھال کے دیتا تھا خود جسے   ہم اس شراب ناب کے لذت چشیدہ ہیں

ہاں اگر ساقی دیو پیکر ہو تو البتہ یہ خدمت انجام دے سکتا ہے۔

کوئی قطرہ بھی خم سے ڈھال لے بے اذن کیا ممکن   یہ میخانہ ہے ساقی کا یہاں کیا اختیار اپنا

خم سے صرف ایک قطرہ شراب ڈھالنے کا خیال ذرا مستبعد معلوم ہوتا ہے۔

میں نثار تجھ پہ ہوں ساقیا تجھے مل سکے تو کہیں سے لا   جو پلا دیا تھا الست میں اسی جام سے ہمیں کام ہے

اس شعر میں روز الست کی جگہ پر صرف الست استعمال کیا گیا ہے جو محل نظر ہے۔ اس کے علاوہ شتر گربہ کا عیب بھی موجود ہے۔ دوسرے مصرع میں، ہمیں کی جگہ پر مجھے ہونا چاہئے تھا مگر غزل کی ردیف "سے ہمیں کام ہے" واقع ہوئی ہے اس لئے شاعر کو مجبوری ہوئی پہلے مصرع میں ترمیم ہو سکتی ہے۔

غضب نگاہ نے ساقی کی بند و بست کیا   شراب بعد کو دی پہلے سب کو مست کیا

کتنا پر کیف شعر ہے۔ لیکن اس میں بھی تنقید کی گنجائش ہے۔ پہلے مصرع میں نگاہ ساقی فاعل ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ دوسرے میں فاعل کون ہے۔ ساقی یا اسکی نگاہ؟ اگر یہاں بھی نگاہ ساقی فاعل ہے تو شراب دینے کا مفہوم مہمل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شراب سے یہی مادی شراب یعنی بادۂ انگوری مراد ہے اور ظاہر ہے کہ نگاہ سے شراب انگوری کی تراوش نہیں ہو سکتی۔ ثانیاً جب نگاہ ساقی سب کو مست کر چکی تو یہ ٹکڑا "شراب بعد کو دی" بیکار ہوا جاتا ہے کیونکہ جس چیز نے سب کو پہلے مست کیا وہی چیز شراب کہی جا سکتی ہے۔ اگر دوسرے مصرع میں ساقی کو فاعل قرار دیا جائے تو بھی شعر میں نحوی اشکال رہ جاتے ہیں۔ نگاہ اور ساقی یہ دونوں الفاظ بہ حالت مضاف و مضاف الیہ واقع ہیں۔ نگاہ مضاف ہے اور ساقی مضاف الیہ۔ پہلے مصرع میں مضاف فاعل ہے۔ دوسرے مصرع میں مضاف الیہ کو فاعل قرار دینے میں نحوی قباحت ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود شعر اس قدر پر کیف ہے کہ نقص کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا۔

شعرا کے کلام سے استفادہ

ایک دن قیس مرحوم نے شاد مرحوم سے آتش کے کلام کے متعلق استفسار کیا۔ فرمایا کہ آتش کے کلام کا چوتھائی حصہ قابل اعتنا ہے اور بقیہ حصہ کوڑے میں پھینک دینے کے لائق ہے۔ میر کے کلام کے متعلق بھی یہی رائے ظاہر فرمائی۔ درد کے تصوف کی بہت تعریف کی۔ میں نے غالب کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ غالب کے کلام میں ناہمواری ہے اور انداز بیان پسندیدہ نہیں۔ میں نے پھر پوچھا کہ خیالات کیسے ہیں تو فرمایا کہ ہاں خیالات اچھے ہیں۔ داغ کے خیالات کو عامیانہ و سوقیانہ قرار دیا مگر زبان کی تحسین کی۔ امیر کے متعلق فرمایا کہ جہاں تک ان کے پہلے دیوان (مرآۃ الغیب) کا تعلق ہے۔ انکا کلام بیشتر پسندیدہ ہے مگر دوسرا دیوان (صنم خانۂ عشق) بالکل داغ کے رنگ میں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شاد مرحوم میر، درد اور آتش کے کلام کے بہت مداح تھے۔ اس سے ان کے مذاق کی سلامت روی کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن یہ امر یقیناً قابل افسوس ہے کہ وہ غالب کے محاسن کلام اور رتبۂ شاعری کے گویا منکر تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ شاد مرحوم نے کن کن شعرا کے کلام سے استفادہ فرمایا؟ یہ سوال بہت اہم ہے اور اگر اس کے جواب میں قلم اٹھایا جائے تو ایک طویل مضمون مرتب ہو جائے۔ اختصار کے ساتھ اس سلسلہ میں کچھ عرض کرتا ہوں۔

میں کہہ چکا ہوں کہ شاد کا ذوق سخن بہت بلند واقع ہوا تھا۔ انھوں نے صرف انہیں شعرا کے کلام سے استفادہ کیا۔ جن کا مذاق شاعری ان سے ملتا جلتا تھا۔ علی الخصوص میر، درد اور آتش کے کلام کو انھوں نے پیش نظر رکھا۔ شاد کی طبیعت سوز و گداز کا

آتشکدہ اوران کا دل درد و حسرت کا مخزن تھا۔ پیرانہ سالی، تنگدستی، زمانہ کی قدر ناشناسی، اور گوناگوں مصائب نے اس وصف کو اور نمایاں کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاد کے بہت سے اشعار میں میر کے رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس عنوان کے اشعار آگے چل کر پیش کرونگا۔ یہاں پر نمونہ کے طور پر صرف تین اشعار درج کرتا ہوں۔

میر۔ کرے کیا کہ انسان مجبور ہے　　　زمیں سخت ہے آسماں دور ہے
شاد۔ ستم ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا　　　زمیں کا سخت ہو جانا فلک کا دور ہو جانا
میر۔ اتنی ہی ہستی یہ اللہ مصیبت یہ ہے　　　موت کی نیند لگا دی ہے غنیمت یہ ہے
شاد۔ اپنی ہستی کو غم و درد و مصیبت سمجھو　　　موت کی نیند لگا دی ہے غنیمت سمجھو
میر۔ ناصح کو خبر کیا ہے لذت سے غم دل کی　　　ہے حق بطرف اس کے چکھے تو مزا جانے
شاد۔ مزا ل جائے کا جینے کا تجھکو　　　کسی ظالم پہ ناصح تو بھی مر دیکھ

دوسرا شعر میر کے دیوان میں مجھے نہیں ملا۔ اول اول میں نے اس شعر کو ثاقب عظیم آبادی سے ۱۹۱۸ء میں سنا تو میرا خیال ہوا کہ شاد کے کسی مخالف نے سرقہ کا الزام قائم کرنے کے لئے یہ شعر تراشا ہے۔ مگر مجھے سخت حیرت ہوئی جب ۱۹۳۰ء میں اسی شعر کو نواب سید امداد امام صاحب اثر عظیم آبادی سے میں نے گیا میں سنا۔ میں نے مرحوم سے کہا بھی کہ یہ شعر میر کے متداول دیوانوں میں نہیں ملتا تو فرمانے لگے کہ میرے پاس جو نسخہ ہے اسکی میں یہ شعر موجود ہے۔ مرحوم اس شعر کو پڑھ کر اسکی کیفیات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بے اختیار رونے لگے۔ اس صحبت میں حضرت رسا ہمدانی بھی موجود تھے بلکہ انہیں کے دولتکدہ پر یہ واقعہ ہوا تھا۔

جہاں تک حقائق و معارف کا تعلق ہے شاد کا بیشتر کلام خواجہ میر درد کے رنگ کی جھلکیاں دکھاتا ہے لیکن صوری حیثیت سے نہیں بلکہ معنوی حیثیت سے کیونکہ شاد کا انداز بیان درد کے انداز بیان سے الگ ہے۔

لیکن درحقیقت حضرت شاد مرحوم آتش کے رنگ سخن سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ بہت سے شعروں میں آتش کے رنگ سخن کا اثر پایا جاتا ہے۔ چند مثالوں سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔

آتش۔ بیتاب ہے کمال ہمارا دل حزیں　　　مہماں سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا
شاد۔ مہماں سرائے تن میں بہت دل ہے بیقرار　　　شاید عدم کو اب یہ مسافر روانہ ہو
آتش۔ دل کے آئینہ میں کر جوہر پنہاں پیدا　　　در و دیوار سے ہو صورت جاناں پیدا
شاد۔ غبار آئینۂ دل کا صاف ہو تو پھر　　　انہی کی شکل نمایاں رہے جدھر دیکھو
آتش۔ باغ جہاں میں گل کی قناعت ہے جائے رشک　　　عمر دو روزہ ایک قبا میں تمام کی
شاد۔ تمام عمر رہا تن پہ ایک پیراہن　　　گلوں نے عمر بسر کی ہے کس قناعت سے
مردوں کی قناعتوں پہ ہو رشک　　　پہلے رہے اک کفن ہمیشہ
آتش۔ ساقی زلال و درد جو توفیق ہو سو دے　　　مستوں کو تیرے ہوش کہاں امتیاز کا
شاد۔ شراب جام میں بھر دی کہ زہر ساقی نے　　　کسے دماغ ہے اتنا کہ امتیاز کرے
آتش۔ خراب مٹی نہ ہو کسی کی کوئی نہ مردود دوستاں ہو　　　جدا ہوا شاخ سے جو پتہ غبار خاطر ہوا چمن کا
شاد۔ کسی پتہ کے لب پر بھی اگر نام خزاں آیا　　　نکالا باغباں نے اسکو رسوائے چمن کر کے
آتش۔ نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو　　　کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا
شاد۔ جدھر دیکھو نئی شکلیں نئے نقشے نیا جلوہ　　　یہ دنیا بھی ہے اک گوشہ ترے آئینہ خانے کا
آتش۔ نکل اے جان تن سے تا وصال یار حاصل ہو　　　چمن کی سیر ہے انجام بلبل کی رہائی کا
شاد۔ نکلنا شرط ہے اس دام سے اے مرغ جاں تیرا　　　بیک پرواز تو ہی تو ہے اور گوشہ گلستاں کا

آتش۔ بولی یہ روح پھینک کے پشتارہ جسم کا — بھاری ہی بوجھ کون یہ بیگار لے چلے

شاد۔ کہاں پھینکا ہے لا کر روح نے اس جسم خاکی کو — یہی ہوتا ہے طاقت سے زیادہ بوجھ ڈھونے میں

آتش۔ مجھ رند کو حلال ہے گو کہ حرام ہو — پیر مغاں کا حکم ہے اس میں جواز کا

شاد۔ پیر مغاں کے معجزے دیکھے ہیں کیسے ہو واعظو — تم نہ پیو جو ہے تو خیر حکم تو دو جواز کا

آتش۔ تلاش یار میں کیا ڈھونڈھیے کسی کا ساتھ — ہمارا سایہ ہمیں ناگوار راہ میں ہے

شاد۔ جسم خاکی تجھ سے تعلق نے گرانبار کیا — کاش میں راہ میں تیری تن تنہا ہوتا

آتش۔ خبر اول و آخر نہیں مطلق آتش — نہ تو آغاز ہے معلوم نہ انجام اپنا

شاد۔ سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی — نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

مولانا عبدالسلام ندوی شعر الہند میں فرماتے ہیں کہ شاد نے کہیں کہیں غالب و مومن کی بھی پیروی کی۔ میں اس رائے کا ہمنوا نہیں ہو سکتا اور میں کیا شاید کوئی بھی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ غالب و مومن کے مخصوص خیالات و جذبات اور اسلوب بیان و طرز ادا کی جھلک شاد کے کلام میں مطلق نظر نہیں آتی۔ دو چار شعروں میں اگر اشتراک خیال اور اتحاد رنگ اتفاق سے پا یا بھی جائے تو یہ اس بات کی محکم دلیل نہیں ہو سکتی کہ شاد نے غالب کا تتبع کیا۔ بہرکیف تلاش و تفحص سے مجھے چند اشعار شاد کے دیوان میں ایسے ملے ہیں جو غالب کے اشعار سے ماخوذ ہیں مگر اسلوب ادا جداگانہ ہے:۔

غالب۔ زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

شاد۔ زیست کا حوصلہ نہ ہو مرگ کا آسرا نہ ہو — اس کی نہ پوچھو اے بتو جس کا کوئی خدا نہ ہو

غالب۔ ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

شاد۔ اے بزم خیال تیری کیا بات! — خلوت میں ہے انجمن ہمیشہ

غالب۔ تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جاں دہم — گر بہ موج افتد گمان چین پیشانی مرا

شاد۔ خوش ہیں کہ تشنہ لبی نے یونہی مارا ہم کو — چین ابرو نہیں دریا کی گوارا ہم کو

۔ لب تشنہ مرنا احسان سے بہتر — تکتا رہا منہ دریا ہمارا

غالب کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر — پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

شاد شب آخر ہوئی ذرا غنچوں کو دیکھ اور خوش ہو اے بلبل — ترے نالوں سے کمبختوں کی چھاتی پھٹتی جاتی ہے

غالب۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

شاد۔ اہل ہوس بھی ہو گئے آ کے حریف میکشاں — پیر مغاں الٹ دے خم بند شراب خانہ کر

اسی سلسلہ میں چار اشعار ایسے بھی سن لیجئے جن پر مومن کے رنگ کا شبہہ ہو سکتا ہے ؎

موت تھی غیر کی سیج پہ آ مرنا کیسا چیز — آج گیسو ترے شانوں پہ پریشان نہیں

کہاں رقیب کا گھر آپ کا کہاں دیدار — برا ہو شوق کا کمبخت سب گوارا ہے

عدو کے دل کی گرہ لگ ادا میں کھول گئے — وہ کیا چھپاتے ہیں ہم اک نظر میں تول گئے

پس از معشوق مرنا عشق کو بدنام کرنا ہے — خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

شاد اور حافظ

بعض تلامذۂ شاد کا خیال ہے کہ شاد کا کلام ایک ایسا چشمہ ہے جس کی سوتیں "آب رکنا باد" سے ملی ہوئی ہیں یعنی شاد کا رنگ سخن حافظ شیرازی کے رنگ سخن کے مماثل ہے۔ خود شاد مرحوم کا بھی ایسا ہی خیال تھا چنانچہ فرماتے ہیں ؎

کہتے ہیں شعر کیسے بزم پہ کھل جائے گا — شاد آیا نہ کہو حافظ شیراز آیا

شعروں میں اے شاد یہ باطنیت — تم حافظ وقت ہو تم باللہ!

یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے اسکی تصدیق یا تردید کیلئے فلسفۂ حافظ کی تشریح ضروری ہے اور میرے خیال میں فلسفۂ حافظ کی تشریح اردو زبان کے سب سے بڑے نقاد علامہ شبلی سے بہتر کسی نے نہیں کی ہے اس لئے علامہ موصوف ہی کی تحریر اس سلسلہ میں درج کردیتا ہوں جو بہت اہم اور دلچسپ بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں :۔

"خواجہ صاحب پر رندی اور سرمستی کا جذبہ غالب تھا۔ ان کے تمام کلام میں یہ جذبہ اس جوش اور زور کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ فارسی شاعری کی ہزار سالہ زندگی میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے پہلے ایک رند سرمست کی حالت کا تصور باندھو کہ جب وہ مستی کے جوش و خروش میں ہوتا ہے تو اس کے دل میں کیا کیا خیالات آتے ہیں۔ وہ مزے میں آکر پکارتا ہے کہ مجھکو نام و ننگ کی کچھ پروا نہیں۔ ساقی پیالہ پر پیالہ دئے جا اور کسی سے نہ ڈر۔ زاہد کیا جانتا ہے کہ جام میں کیا کیا گوناگوں عالم نظر آتے ہیں۔ مطرب سے کہدو یہ ترانہ گائے کہ تمام دنیا پر میری حکومت ہے کل خاک میں جانا ہی ہے آج کیوں نہ عالم میں غلغلہ ڈال دوں۔ تم مجھے حقیر سمجھتے ہو، شراب خانہ میں آؤ تو تم کو نظر آئے کہ میری کیا شان ہے۔ میرے ہاتھ میں جو پیالہ ہے جمشید کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔ میں شراب آج سے نہیں پیتا۔ مدت سے آسمان اس غلغلے سے گونج رہا ہے۔ صوفی اور واعظ رازدانی کی شیخیاں بگھارتے ہیں، حالانکہ جو کہتے ہیں مجھی سے سن لیا تھا۔ یہ عالم لطف اٹھانے کے لئے کافی نہیں آؤ آسمان کی چھت توڑ کر ایک اور نیا عالم بنائیں"۔

پھر فرماتے ہیں :۔

"یہ فلسفہ خواجہ صاحب پر اس قدر چھا گیا تھا کہ بوریائے فقر ان کو مسند جمشید نظر آتا تھا۔ وہ خود اس خیال میں مست تھے اور چاہتے تھے کہ اور لوگ بھی اس عالم کا لطف اٹھائیں۔ وہ مناظر قدرت سے بہار سے آب رواں سے سبزہ و مرغزار سے لطف اٹھاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ خوش عیشی کا یہ عالم ہر شخص کو نصیب ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر وہ تمام دنیا کو خوش عیشی کے فلسفہ کی تعلیم دیتے ہیں۔ یونان میں اپیکورس کی بھی یہی تعلیم تھی لیکن وہ فلسفی تھا اسلئے جو کچھ کہتا تھا فلسفہ کے انداز میں کہتا تھا خواجہ صاحب شاعر تھے اور فطری شاعر تھے اس لئے انھوں نے خوش عیشی کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ زمین سے آسمان تک جوش مسرت سے لبریز نظر آتا ہے اور یہی شاعری کا اعلیٰ کمال ہے"۔

شاد مرحوم بھی بادہ و ساغر کے متوالے نظر آتے ہیں چنانچہ انکی کوئی غزل بادہ و ساغر کے مضامین سے خالی نہیں لیکن باایں ہمہ خواجہ شیرازی کا مذکورۂ بالا فلسفہ ان کے کلام میں نظر نہیں آتا اور اگر ہے بھی تو اسی قدر جتنا آٹے میں نمک۔ چنانچہ صرف دو غزلیں ہیں جن کے کچھ اشعار میں فلسفۂ خوش عیشی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

رندو مناؤ عیش یہ میری صلاح ہے
ڈھالو پیو پلاؤ اسی میں فلاح ہے

واعظ بہشت و بزم حسیناں کو ابا جانؔ
تیرا لغت وہ ہے یہ مری اصطلاح ہے

کہدو یہ مفتیوں سے کہ نیت یہ ہے مدار
تم کو جو مے حرام ہے ہم کو مباح ہے

—×—

ڈھال ساقی کہ زمانہ کی ہے عادت معلوم
بعد کو فرصت تحصیل سعادت معلوم

چھیڑ مطرب کوئی ساز ابھی میں شب باقی ہے
آتی فرصت ہے بہت پھر تو یہی فرصت معلوم

بزم ساقی کے نثار اسکی کہانی دہراؤ
قصۂ کوثر و افسانہ جنت معلوم

—×—

توقف نہ کر جام بھرنے میں ساقی
کہ پیمانۂ عمر پیمان گل ہے

ممکن ہے کہ مزید تلاش و جستجو سے کچھ اور ایسے اشعار دستیاب ہوں جن میں فلسفۂ خوش عیشی کی تلقین ہو۔ لیکن حافظ کے کلام میں اس فلسفہ کا جیسا بوقلموں مرقع نظر آتا ہے اس مرقع کی ایک بھی رنگین و دلآویز تصویر کلام شاد میں نظر نہیں آتی۔

تاہم خواجہ حافظ کے کلام کا ایک حصہ تصوف کے حقائق و معارف اور اخلاق کے رموز و نکات کا بھی حامل ہے۔ اور جہاں تک

تغزل کے اس شعبہ کا تعلق ہے میرے خیال میں شاد نے حافظ کی پیروی یقینی کی ہے۔ شاد نے حافظ کی طرح بادہ و ساغر ہی کے پردے میں بہت سے بلند خیالات کی ترجمانی کی ہے اور میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ شاد نے اردو زبان کی شاعری میں خیالات وجذبات کا ایک معتد بہ اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنی اسی رنگ کی شاعری کے متعلق کیا خوب کہا ہے

حقیقت میں جمال یار کا افسانہ کہتے ہیں
نہ آئینہ کا قصہ اور نہ حال شانہ کہتے ہیں

حافظ کی طرح شاد نے بھی غزل کو یہ وسعت دی کہ فلسفہ، تصوف، اخلاق، سیاست، موعظت ہر قسم کے خیالات ادا کئے لیکن غزل کی لطافت میں فرق نہ آنے دیا۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

(۱) وحدت الوجود کے رو سے حسن حقیقت کا پرتو تمام کائنات پر ہے۔ ایک عارف جس کا دل عشق ومحبت سے لبریز اور عرفان و حقیقت سے معمور ہے۔ جہاں یہ جلوہ دیکھتا ہے بیخود ہو جاتا ہے اور اسے اصل و فرع اور حقیقت ومجاز کی تمیز نہیں رہتی۔ دیکھئے اس وسیع مضمون کو غزل کے رنگ میں کس اہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے

وہ عالمگیر جلوہ اور وہ حسن مشترک تیرا
خدا جانے ان آنکھوں کو ہوا کس کس پہ شک تیرا

اسی خیال کو دوسرے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے

ہر شئے میں تجھے دیکھ کے ہو جاتے ہیں بیخود
دیوانوں کا تیرے خفقان اور ہی کچھ ہے

(۲) علمائے ظاہر احکام شریعت کے محض ظاہری خط وخال کے پابند ہیں لیکن عارفین وارباب باطن کا مرتبہ اس سے کہیں بالاتر ہے اور جب تک تائید ایزدی نہ ہو عرفا بھی اس بار گراں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس فلسفہ کو حافظ کے انداز میں کس خوبی سے نظم کیا ہے

بار سبو ہی اٹھائے جس پہ ہو فضل مے فروش
زاہد خشک یہ بھی کیا بوجھ ہے جا نماز کا

اسی بنا پر حقیقۃً علمائے ظاہر دنیا پرست ہیں اور عرفا عروس دہر کے عشوہ وغمزہ کے پھندے میں نہیں آسکتے

آئے اگر عروس دہر بھول کے میکدہ میں آ
کہدو یہ صومعہ نہیں زاہد پاکباز کا

(۳) خدا نے ظلمت کدۂ عالم میں ایک ایسی ہستی (نبی آخر الزماں صلعم) پیدا کی جس کا اسوۂ حسنہ تمام کائنات کے لئے آئینۂ عمل ہے اور ایک ایسی کتاب (قرآن پاک) نازل کی جو ہر شعبۂ زندگی کے لئے دلیل راہ ہے۔ لیکن اس پر بھی مسلمانوں میں عمل صالح کا فقدان ہے۔ اس وسیع مضمون کو تغزل کے رنگ میں کس خوبی سے نظم کیا ہے

لیکے خود پیر مغاں ہاتھ میں مینا آیا
میکشو شرم کہ اس پر بھی نہ پینا آیا

(۴) عرب کی حکومت میں وقتاً فوقتاً تغیر وانقلاب ہونے سے خانۂ کعبہ مختلف حکومتوں کے قبضہ میں رہا کیا اور ہر انقلاب کے بعد حجاج کو گوناگوں مشکلات کا سامنا ہوا۔ اس خیال کو شاد نے تغزل کے پیرایہ میں کس دلکشی کے ساتھ ادا کیا ہے سبحان اللہ

یہ نوبت تیرے میخانے کی اے پیر مغاں پہونچی
حریفوں نے بٹھا رکھے ہیں بدخو پاسباں در پر

(۵) حرام وحلال کا مسئلہ فقہ کا ایک خشک مسئلہ ہے لیکن شاد کے فلسفیانہ ذہن نے اسے نہایت دلکش پیرایہ میں پیش کیا ہے

میں فدائے ساقی مہ لقا یہی میکشی کا ہے مسئلہ
وہی حکم دے تو حلال ہے وہی رد کرے تو حرام ہے

ایسے ایسے اشعار نوادر ادب میں شمار ہونے کے لائق ہیں اور اردو زبان ان اشعار پر ایک عرصہ مدید تک ناز کر سکتی ہے۔

اگر میں اسی طرح مختلف اشعار کے مفہوم کی تشریح اور ان کے محاسن کی تنقیح کرتا جاؤں تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ لیکن اتنی زحمت کہاں تک گوارا کی جائے اور کس کے لئے؟ کتنے لوگ ہیں جو اس تنقید کو دلچسپی سے پڑھیں گے؟ بیشتر حضرات تو اس کے مطالعہ کی زحمت بھی گوارا نہ کریں گے۔ علم وادب کے فقدان کا ماتم!!! اس کے سوا ندیم کے صفحات میں زیادہ گنجائش بھی نہیں اس لئے اب اختصار کے ساتھ مختلف عنوانوں کے کچھ اشعار درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

فلسفہ شاد نے اپنی غزلوں میں فلسفیانہ خیالات کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ میں صرف وہی اشعار درج کرونگا جو دائرۂ تغزل سے باہر نہیں ہیں۔

"حیرت کدۂ عالم کی ماہیت میں لب کشائی معصیت ہے"

جہاں ہے مکتب حیرت سبق ہے چپ رہنا
بڑا گناہ یہاں ہے الف سے بے کہنا

"معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"

ترے کمال کی حد کب کوئی بشر سمجھا
اسی قدر اُسے حیرت ہے جس قدر سمجھا

دنیا میں کوئی شئے بیکار نہیں

خالی سمجھ کے پھینک نہ اے موج رائگاں
ہر کیسۂ حباب کے اندر خزانہ ہے

تنازع للبقا

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

قمار خانہ ہے بزم دنیا بڑے کھلاڑی کا سامنا ہے
گرہ سے پونجی گنوائی اس نے یہاں ذرا بھی جو چال چوکا

مادہ فنا نہیں ہوتا صرف شکل بدل جاتی ہے

لہو شہیدوں کا ہو رائگاں معاذ اللہ!
چمن میں پھول تو پھولوں میں رنگ و بو ہوگا

قطرہ قطرہ دریا می شود

یوں حبابوں کا نہ دل توڑ خدارا اے موج
انہی قطروں کی بدولت تو ہے دریا تیرا

راز کائنات کی گرہ کشائی بیکار ہے

پوچھو نہ حال چشم دلآویز یار کا
کھولو نہ راز گردش لیل و نہار کا

خیر و شر فرضی و اضافی چیزیں ہیں

بظاہر آلودہ سم ہے جس میں بھرا ہے امرت بھی اس نظر میں
جفا کو کیونکر جفا کہیں ہم تمیز مشکل ہے خیر و شر میں

لا تبدیل لخلق اللہ

دہر میں کیا کیا ہوئے ہیں انقلابات عظیم
آسماں بدلا زمیں بدلی نہ بدلی خوئے دوست

انگریز فلسفی جان لاک (John Locke) کا نظریہ ہے کہ ذہن انسانی پیدائش کے وقت ایک صفحۂ سادہ (Tabula Rasa) کے مانند ہوتا ہے۔ انسان فطرت سے کچھ لے کر نہیں پیدا ہوتا بلکہ جو کچھ علم اسے حاصل ہوتا ہے تجربہ و مشاہدہ سے

مدرسۂ وجود میں صفحۂ سادہ بن کے آ
پیر خرد سے لے سبق مسئلۂ شہود کا

اخلاقیات

شاد کی غزلوں میں اخلاقی مسائل بھی بکثرت موجود ہیں اور وہ بھی حدود تغزل کے اندر ہیں اور نہایت دلکش۔ ملاحظہ ہو

"جد و جہد لازمۂ کامیابی ہے"

نہ چھوڑے جستجوئے یار خضر شوق سے کہہ دو
کسی دن خود لگا لیگی پتہ عمر دراز اس کا

دنیا کی بے ثباتی کا احساس

یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا
ہنسو گے خود اس چمن پہ غنچو زمانہ آلے ذرا نمو کا

"فرصت کا ایک ایک لمحہ غنیمت ہے اسے برباد نہ کرنا چاہئے"

پکار کر وحشیوں سے کہہ دو خزاں کا بھی دور ہے غنیمت
قبا کے دامن کو تا تک تو لیں اگر نہ موقع ملے رفو کا

"حوادث عالم انقلاب زمانہ"

پروں کے ڈھیر ہیں ویراں چمن میں آشیانے ہیں
یونہی ہوتی چلی آئی ہے اس کے کارخانے ہیں

اب اشک ہیں ترے آتا نہیں لہو اے چشم
تجھی پہ کیا ہے زمانہ کا خوں سپید ہوا

"زمانہ خود غرض واقع ہوا ہے کوئی کسی کا نہیں"

یہ اٹھتی بزم میں ساغر سنا گیا اب کے
کسی کا کوئی نہیں سب ہیں اپنے مطلب کے

"انسانی جوہر کا تقاضا ہے کہ مصائب برداشت کئے جائیں یہی زندگی ہے"

نگاہ کی برچھیاں جو سہ سکے سینا اسی کا ہے
ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے

تصوف

شاد کے بیشتر کلام میں صوفیانہ شان پائی جاتی ہے۔ اور بہت سے ایسے اشعار ہیں جو تصوف کے رموز و نکات سے لبریز ہیں مگر انداز بیان شاعرانہ ہے۔ مثالاً چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

"وحدت الوجود"

نہ دوست اور نہ کسی کا کوئی عدو نکلے
اگر یہ نقش مٹا دیں تو تو ہی تو نکلے

مہک اٹھا چمن دہر کا پتہ پتہ
راز چھپنے نہیں دیتی تری خوشبو تیرا

"کل یوم هو فی شان"

جوں جوں بڑھا کریگا تمنا کشوں کا شوق
ووں ووں بدلتی جائیگی اس رخ کی شان بھی

سیماهم فی وجوههم من اثر السجود

ستارے کی طرح پیشانیاں ان کی چمکتی ہیں
میسر ہے جنہیں سجدہ تمہارے آستانے کا

"تسلیم و رضا، صبر و توکل"

دیکھتے ہی سبو مجھے صبر کا حوصلہ دیا!
جس کی طلب تھی ساقیا اس سے کہیں سوا دیا

ہزار تلخ ہے پیر مغاں نے جب دی ہے
خدا نہ کردہ جو میں منہ بنا بنا کے پیوں

طلب کرتے نہیں ساقی سے گو افراط سے مے ہے
زباں روکے ہوئے ہیں رنگ محفل دیکھنے والے

ترے مہماں ہیں جہاں بٹھا سر فرش روئے زمیں سہی
ہمیں بیٹھ رہنے سے کام ہے کوئی جا نہیں تو نہیں سہی

ترے ظلم کا نہ کروں گلہ کٹے تیغ سے بھی اگر گلا
کہوں وجد میں یہی برملا کہ انا لشہید بکربلا

عارف زندگی کو مصیبت سمجھتا ہے کیونکہ یہ باعث فرقت الٰہی ہے

زیست ہے نام تیری فرقت کا
کچھ ٹھکانا ہے اس مصیبت کا

"اور موت کو مژدۂ وصال الٰہی جانتا ہے"

صعوبت سہ چکے اے شاد لو اب چین سے کاٹو
مبارک ہو قضا خود لے کے فرمان اماں پہونچی

عارف کے لئے زندگی کے تمام مصائب و آلام بہ منزلہ امتحان ہیں۔ وہ ان تمام تکلیفوں کو خوشی سے برداشت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ نزع کی تکلیف و اذیت کا بھی مردانہ وار سامنا کرتا ہے اور اس کا دل اس امید سے سرشار رہتا ہے کہ یہی آخری امتحان ہے اور اس کے بعد وصل دوام کی لذتیں حاصل ہونگی ؎

آخر ہے عمر ضعیف میں دل بھی ہے جان بھی
مردانہ باش ختم ہے یہ امتحان بھی

حسن و عشق

شاد کے کلام کا ایک حصہ حسن و عشق کی رنگین تصویروں کا مرقع اور عشق و محبت کے رموز و کوائف کا آئینہ ہے۔ ان کے انداز بیان و طرز ادا میں ایسی شیرینی و دل آویزی ہے کہ شوق کے ظاہری خط و خال کے بیان میں بھی جذبات و کیفیات کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ چند دلکش تصویریں ملاحظہ ہوں ؎

ایک ستم اور لاکھ ادائیں اف ری جوانی ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں تنگ قبائیں اف ری جوانی ہائے زمانے

ہجر میں اپنا اور ہی عالم ابر بہاراں دیدۂ پرنم
ضد کہ ہمیں وہ آپ بلائیں اف ری جوانی ہائے زمانے

پچھلے پہر اٹھ اٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدوں پہ سجدے
جو نہیں جائز اس کی دعائیں اف ری جوانی ہائے زمانے

انشاء اللہ آئندہ فرصت میں ان مایۂ ناز شخصیتوں کے کلام کو پیش نظر رکھ کر یہ دکھانے کی کوشش کرونگا کہ شاد کے یہاں مختلف مذاق کا باہمی امتزاج کس قدر حسن کارانہ اور دلفریب ہے۔ آج کی صحبت میں شاد کے اُن زندہ اور سربرآوردہ شاگردوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو دورِ جدید کی صف میں آتے ہیں تاکہ شاد اسکول کے کچھ خصوصیات پر روشنی پڑ سکے۔ سب سے پہلے میں شاد کے معتقد معاصرین کے بارہ میں لکھنا چاہتا ہوں جو بفضلہ تعالیٰ بقید حیات اور مشق سخن فرماتے ہیں۔ اس سے ناظرین کو پتا چل سکے گا کہ آغاز دورِ جدید کے وقت بہار کا مذاقِ سخن کس نوع کا تھا اور کس طرح تدریجاً تبدیلیاں ہوتی گئیں۔

آزاد۔ حاجی حافظ سید فضل حق۔ جناب شاد کے ہم عصروں میں سب سے پہلے آپ ہی کا نام آتا ہے۔ آخری بار مجھے آپ کی زیارت شاد منزل کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی جو جناب شاد کے انتقال کے بعد ۷ جنوری ۱۹۲۸ء کو منعقد ہوا تھا۔ آزاد۔ شفیق۔ بدر (مرحوم) مبارک۔ امداد۔ بیتاب (مرحوم) اور بہت سے سربرآوردہ شعرا کا مجمع تھا۔ غالباً عظیم آباد میں ان حضرات کا آخری اجتماع تھا جن کے دم سے ادبی صحبتوں کی تہذیب اور رونق باقی ہے۔ میں اس وقت تک اسکول کے ایک ابتدائی درجہ میں پڑھتا تھا۔ بزم سخن کا ہر رکن اپنی باوقار شخصیت کے ساتھ رونق افروز تھا لیکن پھر بھی اس بزم کے ایک خاص رکن جناب شاد کی کمی محسوس کیجا رہی تھی۔ جناب آزاد نے اس مطلع میں اسی رکنِ اعظم کی طرف اشارہ بھی کیا تھا ؂

شمع ہے دلگیر میکش جمع ہیں ساغر چلے　　دورِ ساغر آج اے ساقی لبِ کوثر چلے

ساقی سے مراد حضرت شاد مرحوم کی ذات مجمع الصفات تھی۔

اس مطلع کے متعلق اخبار اتحاد (پٹنہ) میں عرصہ تک مراسلہ نگاری ہوتی رہی لیکن یہ بحث چونکہ میرے موضوع سے خارج ہے اس لئے اس پر زیادہ روشنی نہیں ڈال سکتا۔ محض عظیم آباد کی ادبی تاریخ کے ایک واقعہ کی حیثیت سے اس کا ذکر میں نے یہاں پر مناسب سمجھا۔

میں گذشتہ سطروں میں اس امر کی طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ شاد و آزاد کا دور وہ دور ہے جو دورِ قدیم اور دورِ جدید کا سنگم سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس دور میں دورِ جدید اور دورِ قدیم کی آمیزش کچھ اس انداز سے پائی جاتی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ جناب آزاد کا کلام اس خصوصیت سے بری نہیں۔ لیکن مشکل پسندی بہت زیادہ نظر آتی ہے۔ آپ نے نظمیں بھی متعدد لکھی ہیں لیکن چونکہ اس دور میں شعراء نے زیادہ تر غزلوں پر زور دیا ہے، اسلئے اُن کے معیارِ شاعری کا صحیح اندازہ اسی صنف سے ہو سکتا ہے۔ نمونے کے طور پر آپ کی ایک غزل پیش کرتا ہوں ؂

نوبہارِ زندگانی موت کا ساماں بھی ہے	دردِ بے درماں ہمارا درد بھی درماں بھی ہے
منتظر ہیں دردِ دل حد سے گزر جائے کہیں	مشکلوں کا سامنا مشکل بھی ہے آساں بھی ہے
ہر نفس آئینۂ ماضی ہے پیش چشم دل	شکلِ مستقبل سے دِل ششدر بھی ہے حیراں بھی ہے
جو دلِ دانا ہے اُس کے پیس دینے کے لئے	آسیائے آسماں بھی گردشِ دوراں بھی ہے

چپ رہے آزاد ہم اب تک تو تھے اس سوچ میں
اپنی گردن پر مشیت کا کوئی احساں بھی ہے

مبارک۔ (ڈاکٹر) سید مبارک حسین۔ شاد کے معاصرین میں جناب مبارک کا دم بہت غنیمت ہے۔ داغ کے معتقد شاگردوں میں ہیں۔ لیکن آپ کا رنگ تغزل داغ کے عام رنگ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ داغ کو محض زبان کی صفائی اور سلامت بیان نے معیاری شاعر بنا دیا۔ لیکن مضامین کے لحاظ سے دامن بہت تنگ ہے۔ جناب مبارک نے اس دامن کو وسیع کر دیا اور مضامین کے گلہائے رنگا رنگ سے بھر دیا ہے۔ سب سے پہلے ایک نہایت کیف بار اور رنگ جدید میں ڈوبا ہوا مطلع سُنیئے ؂

گھٹا اُٹھی ہے کالی اور کالی ہوتی جاتی ہے　　صراحی جو بھری جاتی ہے خالی ہوتی جاتی ہے

کہنگی اور فرسودگی سے بچا کر اپنے استاد کے رنگ میں کیا اچھا مطلع کہتے ہیں ؂

جنون جو قہر کی ہے تو تیور جلال کے　　مطلب یہ ہے کہ رکھ دو کلیجہ نکال کے،

اس کا مقطع بھی معنویت اور انداز بیان کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔ ؎

یہ دہر غم کدہ ہے مبارک خوشی کہاں، غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے،

بعض وقت متانت کے دائرے سے بھی باہر آجاتے ہیں لیکن پھر بھی ابتذال سے دور رہتے ہیں۔ ؎

عمر کٹی ہے لالہ رخوں میں دیکھی ان کی فصل بہار　　آج بھی گل سے گالوں والے ہم کو مبارک پیارے ہیں

نمونۂ کلام کے طور پر مختلف اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ ؎

ہوائے شوق کے جھونکے سلامت　　رہو گے تم پس پردہ کہاں تک
نیاز و ناز کے چرچے رہیں گے　　ہماری اور تمہاری داستاں تک

سودائیان عشق کا سودا ہی اور ہے　　اس کی ہوا ہے اور یہ صحرا ہی اور ہے
دل ملا ہے خلش خار تمنا کے لئے　　یہ کھٹکتا ہوا پیکان کہاں جاتا ہے،
خانقاہوں پہ ہوا پیر مغاں کا قبضہ　　آج مے خانے کا سامان کہاں جاتا ہے،

شفق عمادپوری

امیر مینائی کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں۔ کلام میں جدت اور اچھوتا پن ہے۔ جام فکر تو وہی پرانا ہے لیکن اس کی شراب بعض وقت شراب نو کا مزا دے جاتی ہے۔ زندگی کے ایک رخ کی کتنی مکمل روداد پیش کرتے ہیں۔ ؎

مانند نبض ضعف دل ناتواں سے ہم،　　اب تک وہیں ہیں چل کے چلے تھے جہاں سے ہم
نالے ہمارے بانگ درا کا جواب ہیں　　ہیں کارواں میں رہ کے جدا کارواں سے ہم

واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ نفسیاتی واردات کی مکمل تصویر ملاحظہ ہو۔ ؎

نہ مرنے ہی کا موقع تھا نہ بس جینے پہ چلتا تھا،　　لئے تھے سر وہ زانو پر کسی کا دم نکلتا تھا

کیف تغزل ملاحظہ ہو۔ ؎

ذرا کہہ دے یہ ہے بسمل ہمارا　　تماشا دیکھ پھر قاتل ہمارا
اک آہ جو کر دے دل دیوانہ ہمارا　　دو حرفوں میں بس ختم ہوا افسانہ ہمارا

نصیر

مسٹر نصیر الدین حسین بیرسٹر۔ متوطن نگرنہسہ ضلع پٹنہ۔ جناب مبارک کی طرح آپ بھی داغ کے جدید شاگرد ہیں۔ کہنہ مشق ہیں اور کلام اپنے دور کی خصوصیات کا حامل۔ افسوس ہے کہ آپ کی غزلیں دستیاب نہ ہو سکیں ورنہ مذاق سخن پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا۔ ایک رباعی ہاتھ آئی وہ درج ذیل ہے ؎

ہاتھوں میں چھلکتا ہوا پیمانہ ہے　　ہر گام پہ اک لغزش مستانہ ہے،
ساقی تری آنکھوں نے عجب کام کیا　　اک رنگ میں ہے جو ترا دیوانہ ہے،

تمنا عمادی

علمی استعداد اچھی ہے۔ کلام کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کاوش سے مضامین پیدا کرتے ہیں، لیکن مشکل پسندی کے سبب سے وہ زور اور وہ کیف مفقود ہے جو اس دور کے اکثر شعراء میں پایا جاتا ہے۔ تازہ ترین افکار میں سے چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔ ؎

جب سے ملی ہے چشم حقیقت نگر مجھے　　آتا نہیں کسی کو جو آتا نظر مجھے،
ہاں ہاں بھلا دے ذہن سے اے فتنہ گر مجھے　　ایسا بھلا کہ یاد رہے عمر بھر مجھے،
کوچہ سہی ترا نہ ملے خشت در مجھے　　اک دست خم زدہ ہی بہت زیر سر مجھے،
کھویا گیا جو عشق میں جاسوس دہر ہے　　رہتی ہے خوب بے خبروں کی خبر مجھے

تلامذۂ شاد

دبستانِ شاد کا اولین دورِ بہار کی ادبی تاریخ میں "دورِ نہضت" ہے جس میں مختلف مذاق کی پرکیف ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اس وجہ سے یہ دبستان اپنی خاص خصوصیات کا حامل ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں تلامذۂ شاد کے کلام پر اس اسکول کی مختلف خصوصیات کے تحت میں تبصرہ کروں گا۔ میرے انتخاب میں کچھ تلامذۂ شاد تو ایسے ہیں جن کے کلام میں جدت اور قدامت کا باہمی امتزاج ہے اور کچھ ایسے جو قطعی طور پر رنگِ جدید کے دلدادہ ہیں۔

امداد - سید عنایت حسین - انگلستان کا مایۂ ناز شاعر شیلی (Shelley) اپنی زندۂ جاوید نظم (Sky Lark) میں یوں رقم طراز ہے۔ Our truest songs are those that tell of sadest thoughts.

(ہمارے سچے نغمات وہی ہیں جو الم ناک خیال ظاہر کرتے ہیں) اس کا ثبوت ملٹن (Milton) کی دونوں نظموں Lallegro اور Il penseroso کے بیک وقت پڑھنے سے ملتا ہے۔ حقیقتہً ہماری زندگی کا نشاطیہ پہلو اتنا اثر انگیز نہیں ہوتا جتنا حزنیہ پہلو جناب امداد کی شاعری میں حزن و ملال کا عنصر بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے اُن کے درد و اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ صفحۂ دل پر جلد منقوش ہو جاتے ہیں۔ جناب حمید حضرت شاد کے رنگِ شاعری کے متعلق لکھتے ہیں "شاد مرحوم اگرچہ میخانۂ درد کے جرعہ نوش اور اسی خانقاہ کے مجاوروں میں سے تھے لیکن بظاہر اُن کی شاعری میر کے بادۂ پرکیف سے زیادہ سرشار نظر آتی ہے اور ان کا سر اسی شاہِ سخن کے آستانہ کی طرف جھکا دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا سلیمان (ندوی) نے لکھا ہے کہ غزل گوئی کے لحاظ سے شاد میں میر کے انداز پائے جاتے ہیں" (ندیم بہار نمبر ۱۹۳۳ء صفحہ ۲۰) جناب امداد کو چونکہ اپنے استاد کی صحبتِ بابرکت سے زیادہ فیض اٹھانے کا موقع ملا ہے اس لئے دبستانِ شاد کی یہ خصوصیت اُن کے کلام میں نمایاں ہے۔ ؎

بڑھی کچھ اور بھی دحشت نکل کے صحرا سے، جنوں نے کر دیا برباد لاکے بستی میں،
اسیرِ ظلم مٹے، لی خبر نہ ایک نے بھی نہ اہلِ دل تھا کوئی کیا جہاں کی بستی میں،
ہمیشہ بادِ مخالف نے کی دراندازی اگرچہ منو مرے گلہائے آرزو نے کیا،

جہاں شاعری کی اور اور قسمیں ہیں وہاں ایک قسم "اخلاقی شاعری" بھی ہے جو تعمیری (Constructive) شاعری کے تحت میں آتی ہے۔ مغربی ادب میں اس قسم کی شاعری کی مثال اٹلی کے مایۂ ناز شاعر ڈانٹے (Dante) کی Devine Comedy میں ملتی ہے ایشیا میں اس قسم کی شاعری کے لئے حضرت سعدی کا نام مشہور ہے۔ دنیائے شعر میں اخلاق کی تعلیم نظموں میں بہ آسانی ہو سکتی ہے۔ جناب امداد کا کمال یہ ہے کہ بہ تقلید حضرتِ شاد اخلاق کی تعلیم غزلوں کے اشعار سے دیتے ہیں میرا مطلب یہاں پر ہرگز یہ نہیں کہ اوروں نے ایسا نہیں کیا ہے۔ مطلب صرف اسی قدر ہے کہ جناب امداد کے کلام میں یہ چیز خصوصیت سے اور بہت سادہ انداز میں پائی جاتی ہے۔ ؎

اسیرِ ظلم مٹے، لی خبر نہ ایک نے بھی نہ اہلِ دل تھا کوئی کیا جہاں کی بستی میں

کون کہہ سکتا ہے کہ مذکور الصدر شعر اخلاقی تعلیم کے ساتھ ساتھ آئے دن کے واقعات پر جامع تبصرہ نہیں؟ اور اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

ادب ضرور ہے ساقی سے جام لینے میں سبو کو شیخ نے توڑا دراز دستی میں
یہ خاک کہتی ہے اُس کی گلی کی اُڑ اُڑ کر نہاں ہے راز بلندی ہماری پستی میں
ضرورت جتنی ہو پی اتنی ہی اس بادہ خانے میں ہلاکت کا سبب ہوتے کا بے انداز ہو جانا

ہماری معیاری شاعری نہیں بہ تقلید شعرائے فارس تصوف۔ فلسفۂ الٰہیات و معرفت کا عنصر بہت غالب ہے۔ جناب جگر مرادآبادی کی پوری غزل جس کا ایک مطلع یہ ہے ؎

باندھ کے ہاتھ خدمتِ خالقِ سوز و ساز میں، پڑھ دلِ مضطرب غزل خاص زبانِ راز میں

میرے دعوی کی تائید کو کافی ہے۔ جناب امداد نے بھی اس رنگ میں خامہ فرسائی کی ہے اور اس انداز کو بڑے مزے میں نباہا ہے۔ چنانچہ مندرجۂ بالا اشعار میں سے بعض علاوہ اخلاقی تعلیم کے ان مسائل کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ عارفانہ شاعری جنابِ امداد کا مذہب بھی وہی ہے جو مولانا روم اور ملا محمود صاحب تلنوی "گلشن راز" کا تھا۔

ہوش حجاب بیچ میں ہم ہوں وہ مست ناز ہو عشق کی بارگاہ میں خم جو سرِ نیاز ہو
حیرتی جمالِ ہو بندہ حسن و ناز ہو عشق میں خود غرض نہ ہو ایسا تو پاکباز ہو
لب پہ ہو مہرِ خامشی آنکھوں سے اشک ہو رواں جذبۂ مدعائے دل رو کشِ کشفِ راز ہو
سجدۂ شوق پاک ہو شرکِ خیالِ غیر سے کعبۂ عشق ہی مراقبۂ جا نماز ہو

واقعۂ کربلا کی عظمت اور اہمیت سے کون صاحبِ دل انکار کر سکتا ہے۔ جس طرح یہ سانحۂ عظیم ہمارے اور شعبۂ زندگی پر اثر انداز ہے۔ اسی طرح ہمارا ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

اے دل بگیر دامنِ سلطانِ اولیا یعنی حسین ابن علی جانِ اولیا

جناب شاد کا بھی یہی مسلک رہا اور آج دنیا شاد کے جس رنگِ شاعری کی معترف ہے وہ علاوہ اور خصوصیات کے زیادہ تر اسی سانحۂ عظیم کے گہرے فلسفیانہ، عارفانہ اور کارآمد نتائج کا رہین منت ہے۔ جہاں فلسفہ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں، وہاں صاف لفظوں میں فرماتے ہیں۔

موردِ آفات رہ ظلم کا تابع نہ بن، بھول نہ بھولے سے بھی واقعۂ کربلا

جنابِ امداد کی شاعری بھی اسی سے متاثر نظر آتی ہے۔

محوِ جمال یوں رہوں قتل بھی کوئی گر کرے حلق پہ کب چھری پھری یہ بھی نہ امتیاز ہو
کٹا کر سر بنایا سرفروشانِ محبت نے وفادار وہنر ہے وقت پر جانباز ہو جانا

جس طرح ہر حقیقی شاعر کا ایک رنگ خاص ہوتا ہے اسی طرح جناب امداد کا بھی ایک رنگ ہے جس میں موجودہ دور میں ان کا ایک بھی حریف نظر نہیں آتا۔

تمام ہوئی نہ کیوں عمر مے پرستی میں تھی خیر دو نوں جہاں کی ہماری مستی میں
ادب ضرور ہے ساقی سے جام لینے میں سبو کو شیخ نے توڑا دراز دستی میں
کوچۂ مے فروش کا میں بھی ہوں کہنہ مے گسار اتنی مگر مجھے ہے قید بادہ خانہ ساز ہو
ہے وہ سبق مرے لئے جو ہو حدیثِ خاص دوست صدق کا اس پہ ہو یقیں جو بھی رقم طراز ہو
مزاجِ شمع کو امداد پروانے سمجھتے ہیں، بہت مشکل تھا ورنہ سوز سے دمساز ہو جانا

نہالؔ۔ (نواب) سید صادق حسین۔ حضرتِ شاد کے حقیقی بھانجے اور ادیب الملک نواب خیال مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ "دبستانِ شاد" جہاں معنی آفرینی میں بہت ارفع ہے وہاں صفائی زبان کے لحاظ سے بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے اس خصوص میں جنابِ نہال کا کلام بہت بلند ہے۔ قیس مرحوم آپ کے متعلق لکھتے ہیں۔ " کلام میں رنگینی، جذباتِ لطیف اور محاورے کا بہت خیال رہتا ہے۔ زبان نہایت شستہ و صاف، ترکیب بندش اور فکر رسا کہنہ مشقی کا پتا دیتی ہے۔ جدتِ تخیل اور طرز ادا آپ کا خاص حصہ ہے۔ اساتذہ میں حضرتِ آتش کے کلام کے دلدادہ ہیں اور اس کا تتبع اپنے لئے لازمی سمجھتے ہیں۔ نیچرل نظمیں اور نثر بھی اعلیٰ درجہ کی لکھتے ہیں " (گلشنِ حیات صفحہ ۱۳۵)

اردو غزل گوئی کا ایک دور یہ بھی رہا ہے کہ صفائی زبان (جو دنیائے شعر کا ایک خارجی پہلو ہے) کے لئے مضامین کا خون ہوا کیا، شعرائے طبع آزمائی کے لئے مشکل سے مشکل زمین پسند کی اور خیالات کو نظر انداز کرکے اسی میں زبان کے جوہر دکھائے۔ جو طبیعتیں "نابغہ"

(Queins) تھیں اُنہوں نے بعض وقت اہنیں سنگلاخ زمینوں میں ایسے اشعار کہہ ڈالے جو اپنی مثال آپ ہیں۔
آتش کا ایک شعر ہے۔

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک　　نہ اک مُو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا

جناب نہالؔ کی شاعری کا امتیازی رنگ جیسا کہ اوپر درج ہوا، صفائی زبان کا لحاظ ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مضامین کے لحاظ سے آپ کا دامن تنگ ہے۔ آتش کی طرح آپ نے بھی خود کو مضامین کی پستی اور خیالات کی بے راہ روی سے قطعی طور بچایا ہے جیسا کہ ذیل کے اشعار سے معلوم ہوگا۔ صفائی زبان کے ساتھ ساتھ تغزل کا کیسا شگفتہ رنگ ہے۔

فلک کو پہلے سلیقے ستم کے یاد نہ تھے　　یہ سب جناب کے انداز ہیں سکھائے ہوئے
نہ توڑ دل کسی بدمست رند کا ساقی　　کہ پھر نہ جائیں گے شیشے کہاں لئے ہوئے

نقادانِ علم و فن کے خیال میں تخیل کی سرمستی اور محاکات کی بلندی شعر کے قیمتی جوہر ہیں۔ یہ چیزیں بھی جناب نہالؔ کے کلام میں جدت اور کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر صرف تین اشعار لکھتا ہوں۔

نجد کا ہر اک بگولا اے نہالؔ!　　قیس کی آنکھوں میں محمل ہو گیا
سوتے میں آپڑی ہیں لٹیں روئے یار پر　　میلی سے ہے چاندنی مہہ کامل گہن میں ہے

نیچرل (Natural) نظموں میں آپ کی ایک نظم "کوئل" دنیائے ادب میں ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ افسوس ہے کہ دستیاب نہ ہو سکی ورنہ اس کے اقتباسات ہدیہ ناظرین کئے جاتے۔

حمید

سید عبد الحمید۔ اردو غزل گوئی پر جہاں مختلف اعتراضات ہیں وہاں ایک عالمگیر اعتراض یہ بھی ہے کہ اس میں صرف تیر و پیکان۔ خنجر و نشتر۔ سنان و شمشیر۔ قتل و خون۔ ساقی و شراب۔ ناز و غمزہ۔ گیسو و شانہ۔ شمع و پروانہ گل و بلبل۔ قیس و فرہاد۔ شیریں و لیلیٰ۔ طور و موسیٰ۔ دار و منصور کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا، وہ بھی فرسودہ اور کہنہ انداز میں سرزمین بہار میں اس بدعت کو قایم رکھنے والی ایک ذات جناب حمیدؔ کی بھی ہے۔ لیکن آپ کے یہاں یہ بدعت اس انداز سے برقرار ہے جو حکم جواز رکھتی ہے۔ میں تقلید۔ پیروی۔ اور تتبع کو برا نہیں سمجھتا، ہاں لکیر کا فقیر ہو جانا البتہ کسی طرح پر جائز نہیں۔ اگر کہنگی اور فرسودگی سے دامن آلودہ نہیں ہوتا تو اس کا برتنے والا شاعرِ حقیقۃً تلامیذ الرحمٰن کہے جانے کا مستحق ہے۔

ناقدین کا ایک طبقہ ادب میں روایات کی تبدیلی کا حامی ہے۔ کیونکہ بغیر اس تبدیلی کے مضامین میں تنوع اور خیالات میں بلندی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اگر کوئی شاعر بغیر ان تبدیلیوں کے مضامین نو کا انبار لگا دے تو اس کے متعلق کیا ارشاد ہوگا؟ جناب حمیدؔ کے کلام سے پتا چلتا ہے کہ وہ روایات کی تبدیلی کے قائل نہیں بلکہ حقیقت طراز غالبؔ کے اس خیال سے لفظ بہ لفظ متفق ہیں۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام　　چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

میں تبدیلی کا مخالف نہیں بلکہ اس کو ادبی ارتقا اور وسعتِ تخیل کا پیش خیمہ سمجھتا ہوں۔ اُن حضرات کا شکوہ سنج ضرور ہوں جو اپنی سطحی معلومات اور کوتاہ نظری سے اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ

نہ آئینے کا قصہ اور نہ حالِ شانہ کہتے ہیں　　حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں ــــــ (شادؔ)

اب میں جنابِ حمیدؔ کے کلام سے چند ایسی مثالیں پیش کرتا ہوں جو روایاتِ کہنہ اور فرسودہ مفروضوں کے دامن میں جواہر ریزے لئے ہوئے ہیں۔

اپنے تیروں کی تو اتنی دیکھ بھال　　دوسرے کا دل تو کوئی دل نہیں
آنے لگی نہ ہو کہیں ہمدردیوں کی بو　　دل کو ہمارے چھوڑ دے پیکان کو دیکھئے
ہے تیغِ اجل وہ ترچھی نظر اور تیرِ قضا مژگاں اُن کی　　آفت یہ ہے آفت دل کیلئے ناوک بھی ہے تلوار بھی ہے

اب ایسی مثالیں پیش ہیں جن میں زندگی کی تصویر ہے - فلسفۂ حیات ہے - جوش ہے - سرمستی ہے اور سبق ہے - ع

ظاہر میں حمید اپنا ہی یہ دل باطن میں مگر ہے دشمنِ جاں، تصویر ہے دنیا والوں کی بدخواہ بھی ہے غمخوار بھی ہے

تڑپ میں زندگی ہے اور سکوں کا نام مرنا ہے جہاں والو! سبق سیکھو ہمارے مضطرب دل سے

اس کو بنا دیا کبھی اس کو مٹا دیا، دنیا کو اس نے ایک گھروندا بنا دیا

بننے کے شوق نے مری مٹی خراب کی مٹنے کی آرزو نے مجھے پھر بنا دیا!

محاکات - تصویر کشی اور جذبات نگاری کی مثالیں - ع

ہائے اس چشمِ سیہ مست کا اندازِ حجاب جب تلک ہم رہے گردش میں کئی جام رہے

ہر طرف اب تیرگی ہی تیرگی ہے جلوہ گر، بختِ بد بھی کیا کسی پابندِ غم کی شام ہے

بل کھاتے وہ دیکھو آ رہے ہیں، نظروں میں بھرے شراب خانے

یاس - مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی معروف بہ یگانہ لکھنوی - جناب یاس موجودہ دور میں زبانِ اردو کے چوٹی کے غزل گو شعرا کی صف میں شمار کئے جاتے ہیں - آپ کے متعلق قیس مرحوم مصنفِ "گلشنِ حیات" اپنی کتاب میں لکھتے ہیں

"ان کی طبیعت مضمون آور، فکر تخیل دوست، مذاق معنی پسند، زبان متانت شعار، اور کلام اپنے استادوں کا چند اعتبار سے آئینہ دار ہے جس میں بیتاب کی تہذیب غزل سرائی اور مولانا شاد کی معنی آفرینی و سحر طرازی کے تتبع کا فیض بہت کچھ نظر آتا ہے" ——

"گلشنِ حیات" صفحہ ۱۴۱ -

دار المصنفین کے روحِ رواں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی فرماتے ہیں - "یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ میرزا یاس یگانہ اپنے وقت کے ایک کامل شاعر ہیں - ان کے خیالات بلند، زبان صاف ستھری - ترکیبیں چست اور کلام حشو و زوائد سے پاک ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ لکھنؤ کے طرزِ شاعری میں اُن کے ہنگاموں کے باعث مفید انقلاب پیدا ہوا ہے" ——

"معارف" اپریل سنہ ۱۹۳۴ء صفحہ ۳۱۴ -

علاوہ اس کے مسٹر مالک رام ایم - اے - ایل - ایل - بی کا ایک تبصرہ یاس کے رنگِ سخن پر رسالہ زمانہ کانپور کی فروری سنہ ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں شایع ہو چکا ہے اس لئے مزید تفصیل سے گریز کرتا ہوا صرف نمونۂ کلام پر اکتفا کرتا ہوں - اگر موقع ملا تو ایک الگ مقالہ سپردِ قلم کروں گا - ع

خزاں سے پہلے ہی کاش اپنی آنکھیں بند ہو جاتیں بہارِ اولیں ہوتی نگاہِ واپسیں ہوتی،

جو رو سکتے تو آنسو پونچھنے والے بھی مل جاتے شریکِ رنج و غم دامن سے پہلے آستیں ہوتی،

حسنِ فطرت بولتا ہے پردۂ اسرار میں معنیِ بے لفظ پنہاں ہیں زبانِ خار میں

چپ لگی مجھ کو - گناہِ عشق ثابت ہو گیا رنگ چہرے کا اڑا - رازِ دلِ مضطر کھلا

مُسلم - محمد مسلم - پروفیسر سنٹ کلمبس کالج ہزاری باغ - تلامذۂ شاد میں خاص طور پر دورِ جدید کی صف میں جس کا سب سے پہلے نام آتا ہے وہ جنابِ مسلم ہیں - کچھ تو اس وجہ سے کہ آپ کی شاعری کا یہی دور ہے اور کچھ اس وجہ سے کہ آپ کی تعلیم ہی ایسے ماحول میں ہوئی جس پر انگریزی ادب کا اثر غالب ہے - آپ کے کلام میں رفعتِ خیال کے ساتھ ساتھ فارسی ترکیبیں نہایت ہی حسن کارانہ انداز میں پائی جاتی ہیں - نمونے کے طور پر ایک غزل کے چند اشعار پیش کرتا ہوں - ع

دلِ پُر داغ پہ بھی ایک نظر او گلچیں! کاش یہ گل بھی ترا زینتِ داماں ہو جائے

کیا ستم ہو کہ کرے تازہ ستم روز ایجاد جب پریشاں مجھے دیکھے تو پریشاں ہو جائے

یہ نہیں ہے کہ نہیں تابِ فغاں اب ہم میں، خوف یہ ہے کہ کہیں تو نہ پشیماں ہو جائے

جنابِ مسلم نے اسی طرح کی متعدد غزلیں کہی ہیں - لیکن آپ کے مذاقِ سخن کا اصلی رنگ آپ کی نظموں کے دیکھنے سے کھلتا ہے - شبلی

(Shelley) کی طرح آپ بھی حیاتِ انسانی کو قعرِ مذلت کی طرف گرتا ہوا دیکھتے ہیں، لیکن اس کی موجودہ پستی مایوس نہیں کرتی بلکہ ہر جگہ روحِ امید سرگرم کار ہے۔ اس نظریے کا انکشاف آپ کی نظم "رازِ حیات" کے مطالعہ سے ہوتا ہے جو ایک حد تک اقبال کے فلسفہ سے بھی متاثر ہے۔ اس نظم کے پہلے حصّہ میں تو بے ثباتیِ روزگار کا شکوہ ہے جس کا اختتام یوں ہوتا ہے ؎

کیا اسی بے رنگ و بُو گلشن کا دم بھرتا ہے تُو　　کیا یہی وہ زیست ہے جس کیلئے مرتا ہے تُو

دوسرے حصّہ میں امید کی جھلک صاف نمایاں ہے۔ ؎

ہے زوالِ شام سے رازِ عروجِ صبحِ صاف　　دل نہ ہارے مہر تو رہ یوں ہی سرگرمِ طواف

اپنی ایک نظم "فطرتِ سیمابی" میں ترغیبِ عمل کا نغمہ اس طرح سناتے ہیں۔ ؎

ہے چمن، دشت، صبا خواب میں گر ہو مصروف　　بند پانی ہو تو ہوتی ہے تعفّن اُس میں
ضربِ پیہم ہی پہ ہے نغمۂ بربط موقوف　　دل بھی مُردہ ہے اگر ہو نہ کوئی دُھن اُس میں

انگریزی ادب میں ہارڈی (Hardy) کی زنانہ کردار نویسی کمال کا درجہ رکھتی ہے۔ اُردو ادب میں اگر فطرتِ نسوانی پر جامع تبصرہ دیکھنا ہو تو جناب مسلم کی نظم "مجھ کو نہ چھیڑو" کا آخری بند پڑھیے اور دیکھیے کہ ہمارا ادب بھی کس طرح مغربی ادب کے دوش بدوش ہو چلا ہے ؎

ہمدم کی غمخوار و دمساز ہوں میں　　دلداریوں میں ممتاز ہوں میں،
خود ناز بردار خود نازنہ ہوں میں　　نغمے سے معمور اک ساز ہوں میں،
تاروں میں مستور آواز ہوں میں،　　عاجز ہوں پھر بھی اعجاز ہوں میں،
"اک راز ہوں میں، مجھ کو نہ چھیڑو"

ولی

سید شاہ ولی الرحمٰن ڈپٹی مجسٹریٹ موتیہاری۔ تلامذۂ شاد میں جناب مسلم کے بعد جس نے جدید رنگ میں کامیاب خامہ فرسائی کی وہ جناب ولی ہیں۔ آپ کے کلام پر جدید تاثرات کے علاوہ غالب کا رنگ بہت نمایاں ہے اور اس رنگ کو برتنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں جیسا کہ خود ہی کہتے ہیں۔ ع　خوشہ چینی خرمنِ غالب کی کرتا ہوں ولی

آپ کا مطالعۂ شعری بہت وسیع ہے اور خدمتِ علم و فن اپنا بہترین مشغلہ سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کے بلند پایہ تنقیدی مضامین سے پتا چلتا ہے۔ طبیعت میں زور، عالی خیالی اور ندرت بے انتہا پائی جاتی ہے۔ آپکے صحیح رنگِ سخن کا اندازہ ذیل کی غزل سے ہوگا۔ ؎

ترے آستانے پہ سرنگوں ہمہ تن ہوں ذوقِ نیاز میں　　درِ کعبہ پر کوئی حق پرست ہو جیسے محوِ نماز میں
جھلک اُن کی شوخیٔ حُسن کی ہے ہر اک ذرّے میں جلوہ گر　　مگر اُس پہ بھی یہ حجاب ہے کہ چھپے ہیں خلوتِ راز میں
ابھی جام بھی نہ لگا تھا مُنہ سے کہ مجھ پہ چھا گئی بے خودی　　ہے عجب کرشمہ ساقیا تری چشمِ سحر طراز میں
مری حق شناس نظر بھلا کبھی چُوک جائے مجال کیا　　مجھے اس کا غم نہیں اے ولی وہ چھپیں لباسِ مجاز میں

اس غزل کے چند شعروں سے ناظرین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ "دبستانِ شاد" کی پاکیزہ غزل سرائی کا کتنا گہرا اثر ولی کے کلام پر ہے۔ جدید شعر و شاعری کے میدان میں جناب ولی کس طرح سرگرم تگاپو ہیں ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

ہشیار ہو اے بادہ گسارِ ہستی　　اُترے نہ کہیں ترا خمارِ ہستی
غافل! ہے خزاں بدوش اس کا ہر پھول　　بجلی کا تبسّم ہے بہارِ ہستی

"حُسن"

سازِ گیتی کے لئے ہستی تری مضراب ہے　　خرمنِ دل کو ہے بجلی جلوہ فرمائی تری،
تیرا منظر باعثِ صد نالۂ بیتاب ہے،　　ہے ازل سے دہر میں ہنگامہ آرائی تری،

میری فطرت کے لیے بجلی ترا نظارہ ہے، جس سے پڑ جاتی ہے ہل چل محشر جذبات میں
جلوۂ زیبا کا تیرے دل مرا گہوارہ ہے، نور افشاں جس طرح خورشید ہے ذرات میں

دبستانِ شاد کے نوخیزوں کی بھی ایک کثیر تعداد ہے جس میں خصوصیت کے ساتھ ذیل کے نام ادبی دنیا میں ایک حد تک متعارف ہو چکے ہیں ـــــ اختر کاکوی - صبا عظیم آبادی - ارشاد فاطمی وغیرہ - سبھوں کے کلام میں حضرتِ شاد کی پاکیزہ شاعری کے اثرات پائے جاتے ہیں اور آیندہ ترقی کی امیدیں بہت وابستہ ہیں -

"دورِ جدید"

مولانا عبدالسلام ندوی مصنفِ کتاب شعر الہند کے خیال میں عظیم آباد اسکول کی شاعری شوق نیموی جیسے شاعروں کی کوششوں سے لکھنوی رنگ اختیار کرتی جا رہی تھی - یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے - سب سے پہلے جس نے یہاں کی شاعری کو بیرونی آلودگیوں سے پاک کیا وہ جناب شاد کی ذات تھی - اس "نابغہ" (Genius) کی پیدایش نے اسے ایک خاص معیار پر پہنچا دیا اور لحاظ سے دہلی اور لکھنؤ کے بعد عظیم آباد کو بھی مرکزیت حاصل ہو گئی، چنانچہ جناب سیماب اکبر آبادی جو خود بھی اس دور کے ممتاز شعرا میں سے ہیں مقدمۂ مثنوی مادرِ ہند مصنفۂ شاد میں تحریر فرماتے ہیں کہ عظیم آباد کو ہم زیادہ تر شاد کی وجہ سے جان اور پہچان سکے ہیں -

گذشتہ صفحوں میں پچھلے دور پر جو نظر ڈالی گئی اس سے یہ بات ضرور روشن ہو گئی ہوگی کہ علاوہ جدید تحریکات کے صوبۂ بہار کی شاعری کا دورِ جدید کن اثرات کا رہینِ منت ہے اور ہو سکتا ہے - اب ذیل میں یہ دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دورِ جدید میں بھی صوبۂ بہار کا خاصہ حصہ ہے، اور یہاں کی شاعری معیاری حیثیت رکھتی ہے -

عظیم - (ڈاکٹر) سید عظیم الدین احمد ایم - اے - پی - ایچ - ڈی موجودہ دور کی شاعری اقبال کے وجدانی نغموں اور جوش کے سرمست ترانوں کی رہینِ منت سمجھی جاتی ہے - صوبۂ بہار میں عظیم کا بھی وہی مرتبہ ہے جو دوسرے صوبوں میں اقبال اور جوش کا، لیکن اس صوبے کا یہ پایہ شاعر رسمی شاعری سے قطعی بے نیاز ہے جس کی وجہ سے اس کی ہستی "صدائے خاموش" کے پردے میں چھپ کر رہ گئی - خبر ملی ہے کہ آپ کا ایک مجموعۂ کلام "گلِ نغمہ" کے نام سے چھپ رہا ہے جس کے مرتب آپ کے لائق فرزند پروفیسر کلیم الدین احمد ہیں خدا کرے یہ چیز جلد منظرِ عام پر آ جائے [۵]

جنابِ عظیم کے کلام میں ایک پیام ہے - جوش ہے، فلسفہ ہے اور وہ بلا شبہ بہار کے دورِ جدید کے قائد ہیں - آپ کی شاعری پر ایک بسیط تبصرہ نوشتہ پروفیسر اختر احمد اورینوی ندیم بابت ماہ مارچ ۱۹۳۸ء میں شایع ہو چکا ہے - میں اس پر زیادہ روشنی ڈالنا تحصیلِ لاحاصل سمجھتا ہوں - رسمی طور پر آپ کی نظموں اور غزلوں سے چند اقتباسات پیش کر دیتا ہوں -

درد سے اور تڑپ اے دلِ ناکام ابھی سوچتا کیا ہے اس آغاز کا انجام ابھی
اس کی کیا فکر کہ پروانے جلیں گے کہ نہیں، شمع ساں آپ ہی جلنا ہے ترا کام ابھی

"نویدِ امید"

کیا کوئی موت ہے "غفلت" کہ نہ چونکا جائے زندگی ہے، تو سنبھلنے کا تقاضا ہوگا
بادِ صرصر نے جو چھوڑے ہیں خزاں میں تنکے ڈوبتوں کو انہیں تنکوں کا سہارا ہوگا

"پیامِ ہستی"

تبسم کی ہوس ہی، زخم دامن دار پیدا کر جو گریہ آرزو ہے چشم دریا بار پیدا کر
مرض ہی کیا مداوا جس کا آساں ہو طبیبوں پر نہ پہچانے مسیحا جس کو وہ آزار پیدا کر

[۵] ندیم - گلِ نغمہ شایع ہو گئی ہے جس کا تذکرہ ندیم کے پچھلے پرچہ میں گذر چکا ہے - اور اس کے مفصل معلومات اس نمبر میں کسی دوسری جگہ

پروفیسر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ
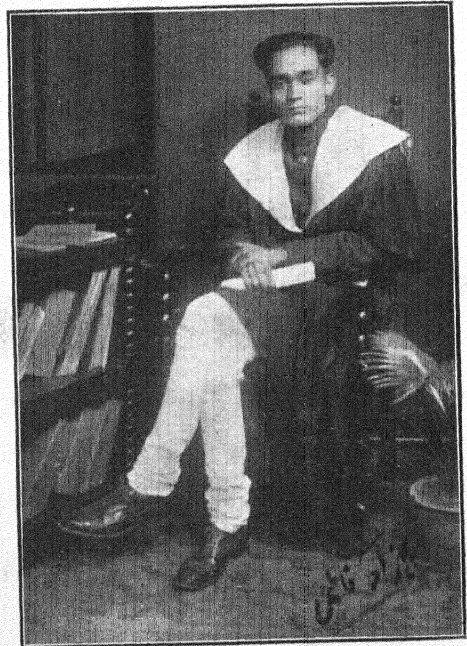
جناب سید محمد ایوب قدر
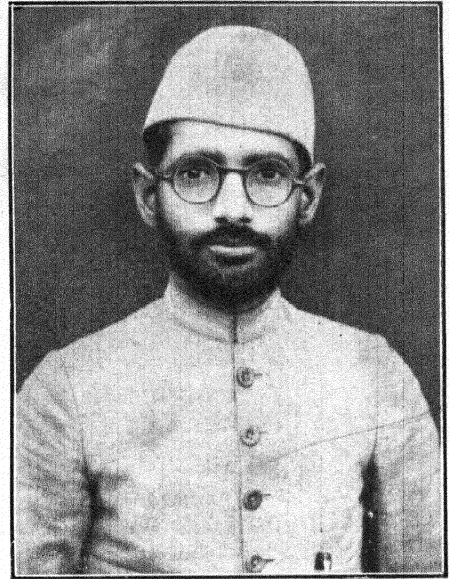
مولانا مسعود عالم ندوی

جناب نسیم گورگانوی
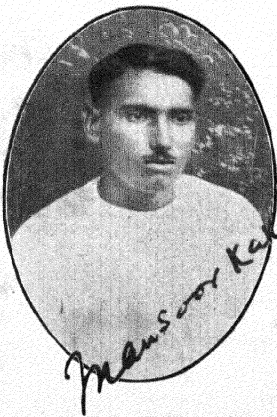
جناب جوہر فریادی

جناب منصور کاکوی

جمیل مظہری

جنابِ عظیم کی طرح جنابِ جمیل بھی ایک فطری شاعر ہیں۔ آپ کا کلام بھی زندگی کی مکمل تصویر کا آئینہ دار اور علوِ خیال کا علم بردار ہے۔ فلسفہ۔ ندرت اور سلاستِ بیان سب کچھ آپ کی شاعری میں موجود ہے۔ اگر اسی طرح مشقِ سخن جاری رہی تو نہ معلوم آپ کی شاعری کس منزل پر پہونچے گی۔

زندگی اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب اُسی وقت کامیاب کہے جانے کا مستحق ہے۔ جبکہ اُس کی ہر موج زندگی کی لہروں سے وابستہ ہو سطحی نقادوں کے جہاں اور سب اعتراضات ہیں وہاں یہ بھی ایک اعتراض ہے کہ اُردو شعرا کے کلام زندگی کی لہروں سے وابستہ نہیں ہوتے۔ اُن شعرا کو تو چھوڑیے جو محض رسمی طور پر یا تفنن بیکاری سمجھ کر شاعری کرتے ہیں مصیبت یہ ہے کہ جنہیں خود فطرت کی طرف سے شاعرانہ دل و دماغ ملے ہیں وہ بھی موردِ الزام ٹھیرائے جاتے۔ سرِ دست مجھے اُن الزامات کا جواب دینا مقصود نہیں۔ صرف یہاں پر جمیل کی شاعری کے چند نمونے پیش کرتا ہوں جس سے پتا چلے گا کہ ادب کی یہ لطیف ترین صنف کس طرح ہمارے لطیف احساسات کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ میرے مخاطب وہ حضرات نہیں جن میں صحیح ذوقِ ادب کا فقدان ہے بلکہ وہ ہیں جن کی بالغ نظری ہر انقلاب کو ایک آنے والے خوش گوار دور کا پیش خیمہ سمجھتی ہے۔

ہ

"پیام"

ہستی کا نظام ہے "تسلسل"
"تکمیل" میں زندگی نہیں ہے
منزل کا وجود ہے خیالی،
منزل کہیں شوق کی نہیں ہے
فطرت کبھی روکتی نہیں ہے

وہ نخل جو کل تھا تخمِ ناچیز
وہ غنچہ جو پھول ہو گیا ہے!!
وہ قطرہ جو تاجِ قیصری میں
موتی بن کر چمک رہا ہے،
صورت گرِ رازِ ارتقا ہے

اس بزمِ عمل میں صرف انساں
بے خود ہے خرابِ رنگ و بو ہے
ہونے کو ہے دل میں آرزو بھی
لیکن رسوائے آرزو ہے
بیگانۂ رازِ جستجو ہے

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

ہر اُوج تاریکیوں میں حیراں بجھا ہوا ہے چراغِ منزل
کہیں سرِ راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

یہ کوئی بات نہیں ہے کہ ہوا کے رُخ پر
چھوڑ دوں دل کا سفینہ کہ جہاں تک پہونچے

مسئلہ جبر کا سمجھا گیا گلچینِ بہار،
رہ گیے لئے توڑ کے گل ہاتھ جہاں تک پہونچے

بیدل

پروفیسر عبد المنان، صدر شعبۂ فارسی پٹنہ کالج۔ آپ کی اُردو غزل گوئی کے متعلق ایک مضمون نوشتہ پروفیسر اختر احمد اورینوی نگار اگست سنہ ۳۹ء میں شایع ہو چکا ہے۔ میں صرف نمونۂ کلام پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہ

طبیب درد کے بڑھنے سے کیوں ہراساں ہے
کہ یہ بڑھا تو پھر الفت کی مشکل آساں ہے

اُسے کہ تلخیِ غم ہی مدارِ ہستی ہو
وہ زہر ہے جسے کہتے ہو تم کہ درماں ہے

نشاطِ غم کا دلِ شیفتہ ہوا خوگر،
کسی کے جورِ سلاسل کا مجھ پہ احساں ہے

اسرارِ محبت کی اتنی ہی حقیقت ہے
کچھ شوقِ مصیبت ہے کچھ ذوقِ اذیت ہے

تعمیرِ تمنا ہے پھر ماتمِ حسرت ہے
اس بزمِ نمائش کی بس اتنی ہی غایت ہے

یہ جلوہ فروشی ہے بے خود ہیں تماشائی؛
محفل کی یہ محفل ہی خلوت کی یہ خلوت ہے

شمس منیری پروفیسر حافظ شمس الدین احمد ۔ صدر شعبۂ اُردو پٹنہ کالج و پٹنہ یونیورسٹی ۔ اُردو غزل گوئی پر جو اعتراضات عائد کئے جاتے ہیں اُن کا ذکر میں جا بجا گذشتہ سطروں میں کر چکا ہوں ۔ جناب شمس منیری بھی دورِ جدید کے غزل گو شاعر ہیں اور اس لحاظ سے معترضین کی زد سے نہیں بچ سکتے ۔ لیکن جہاں تک معیاری شاعری کا تعلق ہے شمس منیری کی شاعری کا بھی ایک خاص معیار ہے جس کے خصوصیات کسی طرح نظر انداز نہیں کئے جا سکتے ۔ کلام کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری دورِ جدید کے تاثرات قبول کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہے ۔ میں اس کے متعلق ایک علیحدہ مضمون لکھ رہا ہوں جو کسی موقع پر ہدیۂ ناظرین کیا جائیگا ۔ جناب شمس کی شاعری میں حقیقت نگاری ۔ جوشِ بیان ۔ حسن ادا ۔ نفسیات ۔ فلسفۂ معرفت و حقیقت ۔ رفعتِ خیال و علوِ نظر ۔ تصویر کشی منظر نگاری اور موسمی کیفیات ، خیامیات و سرمستی کا ایک بے پایاں ذخیرہ ملے گا ۔

حقیقت نگاری:

اُن کے چہرے کے رنگ دو ہی ہیں ۔۔۔ یا چمیلی کا یا گلاب کا رنگ
یہ بھی آنا ہے کوئی آئے خفا ہونے کو ۔۔۔ پیار سے آؤ تو بیشک ہے مزا آنے کا

جوشِ بیان:

جی میں ہے کاٹ کے رکھ دیجئے خود سر اپنا ۔۔۔ سر ہو اک ہاتھ میں اک ہاتھ میں خنجر اپنا
چمن کی خاک سے خوبانِ لالہ رو نکلے ۔۔۔ اب آئی فصل کہ پھر شیشہ و سبو نکلے
لبِ دریا چلو کیفیتِ آبِ رواں دیکھو ۔۔۔ وہ مستانہ روش موجوں کی وہ اٹکھیلیاں دیکھو

نجم گیلانی ۔ مولوی نجم الہدیٰ پروفیسر شعبۂ اُردو پٹنہ کالج ۔ جہاں اور بزرگوں نے سرزمین بہار کی شاعری کو دورِ جدید کے خصوصیات سے روشناس کرایا وہاں جناب نجم کا نام نامی بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ، گو کہ آپ نے اپنی صحت اور کثرتِ مشاغل کے سبب سے مشغلۂ شعر و سخن کو ایک حد تک ملتوی کر دیا ہے ۔ ذیل میں آپ کی ایک نظم "پیغامِ عمل" کا اقتباس درج کیا جاتا ہے ۔ اس اقتباس سے پتا چلتا ہے کہ آپ کے جذبۂ شعری پر بڑی حد تک اقبال کی قومی نظموں کا رنگ اثر انداز ہے ۔

ساز عجمی کیسا ۔ بزمِ عربی کیسی ؛ ۔۔۔ اے دل ! صفِ ماتم میں راحت طلبی کیسی
ہے شمعِ حرم مُردہ ۔ اے سوزِ نہاں والے ۔۔۔ آ دیکھ ! مرے دل میں ہے آگ دبی کیسی
خالی کیا ساقی نے پیمانہ تو گیا پروا ۔۔۔ ہے دجلۂ خوں جاری یاں تشنہ لبی کیسی

اُٹھ سینۂ پُر غم سے نالے کو رہا کر دے
اس طائرِ بے پر کو ہمدوشِ سما کر دے

ہستی میں سکوں کیسا عزت ہے تموّج میں ۔۔۔ گنگا کا تعاقب کر دریا ئے رواں ہو جا
رہبر کی ضرورت کیا رہوار کی حاجت کیا ۔۔۔ کا ندھے پہ اُٹھا بستر صحرا میں رواں ہو جا
ہنگامۂ آفت تابی اور تیری یہ خاموشی ، ۔۔۔ یا شورِ جرس بن جا یا بانگِ اذاں ہو جا

جا دیکھ لے مقتل میں حالت مرے بسمل کی ؛
ہے عمرِ خضر پنہاں شمشیر میں قاتل کی ؛

اختر ۔ اختر احمد اورینوی ۔ پروفیسر شعبۂ اُردو پٹنہ کالج ۔ اُردو شاعری کے دورِ قدیم میں زندگی کے مسائل اتنے پیچیدہ نہ تھے جتنے اب ہیں ۔ ہماری سیاست کا دائرہ ہماری ضروریاتِ زندگی کے مطابق محدود تھا ۔ اسی طرح ہماری شاعری بھی ایک حد کے اندر رہی ۔ عصرِ حاضر میں جس طرح اور باتیں خصوصیاتِ شاعری میں داخل ہو گئیں ، اُسی طرح سیاست بھی ایک جزوِ اعظم قرار پائی ۔ سب سے پہلے حالی نے اس طرف توجہ کی ۔ اس کے بعد اقبال کی "پین اسلامزم" (pan Islamisim) کی تحریک اثر انداز ہوئی ۔ چکبست اور جوش نے حب الوطنی کی طرف راغب کیا اور اس کے بعد رفتہ رفتہ سیاسیات کے کل مسائل اُردو شاعری میں داخل ہو گئے ۔ حالاتِ حاضرہ پر آزادانہ اظہار ہونے لگا اور اس قسم کی نظموں کا ایک معتد بہ ذخیرہ ہمارے ادب میں شامل ہو گیا ۔ جو ہماری موجودہ کشمکش کا آئینہ دار ہے ۔ جنابِ اختر نے بھی اس قسم کی نظمیں لکھی ہیں ۔ آپ کی ایک نظم "ایک مجاہدِ فلسطین کے افکار"

کے ایک بند سے چند اشعار درج کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو۔

ص

اے فلسطیں! جوشِ ایماں اب بھی ناداروں میں ہے، — اب بھی جرأت کی چمک مسلم کی تلواروں میں ہے
اک گراں مایہ امانت ہے شہیدوں کا لہو — جان دے کر بھی بچاؤ نگا میں اپنی آبرو،
تیری خاکِ پاک سے وابستہ ہے الفت مری — بک نہیں سکتی کسی قیمت پہ بھی عزت مری
سو تو سکتا ہے مسلماں پر یہ مر سکتا نہیں — لشکرِ باطل کے ہنگاموں سے ڈر سکتا نہیں

روح پرور اہلِ ایماں کے لئے تکبیر ہے
مردِ مومن کا ارادہ خالقِ تقدیر ہے

تاریخ ادب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ جب زندگی کا دَور کشمکش اور انقلاب سے گزرتا ہوتا ہے تو اُس وقت ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو جاتا ہے جو خیالی دنیا میں جاکر پناہ لیتا ہے۔ اس کا دل کشمکش سے گھبرا اٹھتا ہے اور وہ اس سے گریز پر مائل ہو جاتا ہے۔ مغربی ادب میں اس کی مثال کثرت سے ملے گی۔ یورپ کی رومانی شاعری میں ایک حد تک یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اُردو ادب بھی اس رومانی شاعری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس کے دَورِ جدید میں رومانیت کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ ایسے شعرا تو بہت کم ہیں جو خالص رومانی ہوں، اُن شعرا کی کمی نہیں جنہوں نے اور اصنافِ شاعری کے ساتھ اس صنف پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ جنابِ اختر کی بھی بہت سی ایسی نظمیں ہیں جن میں خالص رومانیت پائی جاتی ہے۔ ذیل میں آپ کی ایک نظم "ارمغانِ شباب" کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

ص

سبزۂ شاداب پر شہلا جمالوں کا ہجوم ؛ — سون کی وادی میں رقصاں ہے غزالوں کا ہجوم
غنچۂ نورس ثمرور نونہالوں کا ہجوم — شاعرِ سرشار کے رنگیں خیالوں کا ہجوم
ساریوں کے رنگ میں یا لالہ زاروں کا ہجوم — آبجاں کی لہر ہے یا آبشاروں کا ہجوم
خندۂ بے باک میں لرزاں ہیں فواروں کے گیت — قہقہوں کے راگ یا بجتے ستاروں کا ہجوم

موجودہ دَور کی ایک خاص خصوصیت مکمل تصویر کشی بھی ہے۔ یہ چیز جوشؔ کے یہاں کثرت سے اور مکمل انداز میں پائی جاتی ہیں۔ اخترؔ کا کلام بھی اس خصوصیت سے متاثر ہے۔ نمونہ کے طور پر آپ کی ایک نظم "نغمے" کا ایک بند درج کرتا ہوں۔

ص

موجِ نازک سے صبائے شوخ کی مستانہ وار، — مخملیں سبزے پہ جیسے برگِ گل کی ہو پھوار
جس طرح پانی کی چادر پہ نشیلی رات کو، — بارشِ شبنم بنائے ریشمیں شکنوں کا ہار
جیسے بیمارِ محبت کی تھکی پلکیں جھکیں، — دھیرے دھیرے دل پہ میرے چھایا نغمے کا خمار

کیف تھا اک روح افزا گیت کی ہر تان میں
لہر دریائے مسرت کی رواں تھی جان میں

رضوی۔ سید اجتبیٰ حسین۔ پروفیسر راجندر کالج چھپرہ۔ جنابِ رضوی بھی موجودہ دَور کے ایک خوش گو شاعر ہیں۔ کلام میں انتہا سے زیادہ درد ہے جس کی وجہ سے آپ کے اشعار تاثیر اور کیفِ غم میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے آپ کو میرؔ کا مقلد کہنا بیجا نہ ہوگا۔ ذیل میں آپ کے تین اشعار لکھے جاتے ہیں جن میں میرؔ کے نشتر اور شادؔ کی پاکیزہ غزل سرائی کی کیفیت بہت کچھ پائی جاتی ہے۔

ص

احباب چھٹے اغیار چھٹے سر اپنا پرایا چھوٹ گیا، — جب روح بدن سے چھوٹ گئی سب رشتہ ناتا ٹوٹ گیا،
ہاں حسن! اگر تجھے تھی ہم سے غرض، تھا عشق کو ذوقِ طلب — رکھی رہی شانِ استغنا۔ آخر کو یہ بھانڈا پھوٹ گیا
کہتا ہے کہ رضوی مانگ دعا، خود تو ہی بتا ہم مانگیں کیا — چاہا تھا کہ مانگیں تجھ سے تجھے یہ ہو نہ سکا جی چھوٹ گیا

پرویز شاہدی۔ سید اکرام حسین عظیم آبادی ایڈیٹر رسالہ اردوئے جدید کلکتہ - جہاں تک انسان کے لطیف احساسات اور اثر کا تعلق ہے جناب پرویز کی شاعری دورِ جدید میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے - آپ کے کلام پر متشائم (Pessimistic) خیالات کا گہرا اثر پایا جاتا ہے جس نے آپ کی غزل گوئی کو ایک معیاری درجہ دے دیا ہے -

قسمت میں لکھی تھی محرومی ناکام تمنا ہونا تھا　　کیا کیجئے ہم کو فطرت کے ہاتھوں کا کھلونا ہونا تھا

کیا اس میں خطا تھی گر میں نے دو چار گلوں کو چوم لیا　　پابندی یہاں جب ایسی تھی ہر پھول کو کانٹا ہونا تھا

ہنستے ہو مرے تم رونے پر اللہ ہنسائے خوب ہنسو!　　ہوتا جو تمہیں بھی درد کہیں پھر دیکھتے طوفاں کیا ہوتا

غزل کے ساتھ ساتھ جناب پرویز نے اپنے رنگ میں رباعیاں بھی خوب لکھی ہیں - فرماتے ہیں -

رفعت سے بہت دور ہے پستی میری　　ہم دوشِ فنا رہتی ہے ہستی میری

پیتا ہوں جو مے بھی تو سمجھ کر اک زہر　　اترا ہوا اک نشہ ہے مستی میری

بینا رشیدی حافظ سید مظہر الدین احمد رئیس راجگیر - حقیقی شاعر کے تلامیذ الرحمٰن ہونے میں اگر کسی کو شک ہو تو وہ جناب بینا کو دیکھے بعض کم سنی میں بینائی سے محروم ہو گئے - لیکن فطرت نے جو مواد آپ کے ذہنِ رسا کو بخشا وہ کب رکنے والا تھا - خیالات کی فراوانی اشعار کے پیکر میں ظاہر ہوئی اور مشقِ سخن نے اس کو ہر طرح مرصع کر دیا - پاکیزہ تغزل کی چند مثالیں آپ کے کلام سے درج کرتا ہوں -

تڑپ تڑپ نہ دلِ بے قرار پہلو میں　　ٹھہر ٹھہر کہ ہے تصویرِ یار پہلو میں،

یاس کا، حسرت کا، ارماں کا ہے دل میں اک ہجوم　　ارتعاشِ غم ہے لیکن سازِ دل خاموش ہے

یہ وفورِ ذوقِ غم اے آہ کیوں، اور کس لئے؟　　اضطرابِ دل ٹھہر، تو ہے کہاں، کچھ ہوش ہے

نغمہائے تارِ دل سے چونکتا ہوں خواب میں　　"ایک صوتِ سرمدی ہے جس کا اتنا جوش ہے"

اپنے دور کی خصوصیات سے متاثر ہو کر آپ نے بہت سی بلند پایہ نظمیں بھی لکھی ہیں جو وقتاً فوقتاً صحیفہ "فطرت" راجگیر میں شایع ہوئیں -

صبا رشیدی۔ سابق مدیر "فطرت" - جناب بینا کے چھوٹے بھائی اور دورِ جدید کے اچھے شاعر ہیں - کلام میں وہی سوز و گداز پایا جاتا ہے جو جناب بینا کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے - نمونہ کلام کے طور پر ایک غزل کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں -

موجۂ بادۂ الست عشق کے ہر خمار میں　　جلوۂ طور کی تڑپ حسن کے ہر نکھار میں

ذرہ سوز و ساز ہے درسِ حیات کشمکش　　دیکھ نشانِ کارواں اڑتے ہوئے غبار میں

حسنِ حقیقت آشنا محرمِ دیدہ ہے مگر،　　شوقِ حجاب پھر وہی جلوۂ بار بار میں

دورِ جدید میں شعراء نے غزلوں سے زیادہ "نظم" کے میدان میں طبع آزمائی کی ہے، چنانچہ آپ کی ایک بلند پایہ نظم "کوئل" کا ایک بند لکھتا ہوں جس میں شیلی (Shelley) کی زندۂ جاوید نظم SKY LARK کا تتبع پایا جاتا ہے -

ہے زمزموں میں تیرے　　آہنگِ سازِ ہستی　　جذباتِ بے خودی میں　　سوز و گدازِ ہستی

تخئیل کی فضا میں　　مستورِ رازِ ہستی　　ہاں یوں ہی چھیڑتی جا　　اے نے نوازِ ہستی

نغموں سے تارِ الفت　　اک شاہکارِ الفت　　دنیائے بے خودی میں　　اک نغمہ زارِ الفت

کس طرح کی خلش ہے　　کیوں بے قرار ہے تو

رضی عظیم آبادی۔ جناب رضی کا بلند پایہ کلام عرصۂ دراز تک "ندیم" اور "فطرت" کے اوراق پر نظر آتا گیا - لیکن نہ جانے کیوں اب آپ نے خاموشی اختیار کی۔[1] بہر حال جو کچھ بھی اشعار آپ کے ملتے ہیں وہ بجائے خود اپنے معیاری

[1] ندیم: یہ نظر بہار نمبر میں ایک تازہ نظم شریک اشاعت ہے۔ اب حضرت رضی ادب کی زمین سے کنارہ کش ہو کر سیاسیات کی پرخار وادی میں قدم رکھ چکے ہیں۔ حضرت رضی ہیں: اور آل انڈیا سوشلسٹ پارٹی کا صدر دفتر پٹنہ۔ اور عجیب کیا ہے کہ ان سطروں کے شایع ہونے تک وہ قید خانہ میں شاہی مہمان ہوں۔

ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ نمونۂ کلام دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے بڑی حد تک حضرتِ جگر مراد آبادی کے رنگ کو اخذ کیا ہے۔

مٹا مٹا! نظرِ انتخاب کے ہاتھوں، لٹا لٹا دلِ خانہ خراب کے ہاتھوں
سنبھل سنبھل کے وہ پھر مستیوں میں کھو جانا، نگاہ ساقی و کیفِ شراب کے ہاتھوں
ٹھہر ٹھہر کے مرا بے خودی سے چونک اُٹھنا جنوں سا ہے دلِ پُر اضطراب کے ہاتھوں
بہت بچا تھا مگر بے خودی میں پی ہی گیا کسی کے شیوۂ عذرِ حجاب کے ہاتھوں
وہ مستی نشۂ بے شراب کیا کہنا! تبسمِ نگہِ نیم خواب کے ہاتھوں
خمارِ حسن کی انگڑائیاں ارے توبہ! کہاں بچے کوئی کیفِ شباب کے ہاتھوں
تخیلات کی دنیا میں انقلاب آیا، بدل گئیں وہ فضائیں شباب کے ہاتھوں

رسا ہمدانی

یو۔پی میں جنابِ فراقؔ گورکھپوری اور بہار میں جناب رساؔ ہمدانی بسیار نویسی کے لئے بہت زیادہ مشہور ہیں۔ ان دونوں بزرگوار نے جتنی پھر بھی علم و ادب کی خدمت کی ہے وہ کسی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ جنابِ رساؔ نے غزلوں سے زیادہ نظمیں لکھی ہیں جو اپنے خاص رنگ کی آئینہ دار ہیں۔ آپکی نیچرل نظموں میں زیادہ تر تصویر کشی کا انداز پایا جاتا ہے۔ مثلاً

اُٹھا مشرق سے بادل اور سوئے کوہسار آیا صدا بادِ بہاری نے یہ دی ابرِ بہار آیا،
بڑھایا سبزے نے دامن گلوں نے جام دکھلائے لٹاتا گوہرِ شہوار یوں ابرِ بہار آیا،
صراحی غنچہ ہے گُل جام مے ہے بوئے گُل مے ہے چلو رندو۔ ہوا ٹھنڈی چلی ابرِ بہار آیا،
بن سنور کر خوب اک لالہ عذار دستِ نازک میں لئے پھولوں کا ہار
بام پر ہے آج محوِ انتظار

ارمان آروی

جناب تمناؔ کے مایۂ ناز شاگرد اور دورِ جدید کے ایک خوش فکر نوجوان شاعر ہیں۔ آپ کا کلام چند اعتبار سے اپنے اُستاد کے رنگ خاص کا آئینہ دار ہے۔ وسعتِ تخیل اور حسنِ ادا کی اچھی مثالیں آپکے اشعار سے ملتی ہیں۔ آپ کی نظم "حیات،، سے ایک بند درج کرتا ہوں۔

نزع کا وقت ہے اِک موجۂ بیتابِ حیات عالمِ قبر ہے اک حلقۂ گردابِ حیات
موت کہتے ہیں جسے وہ بھی ہے اک خوابِ حیات یعنی ہر حادثۂ عمر ہے اک بابِ حیات
جامۂ تن کو اُتارا کہیں چلنے کے لئے،
یعنی مرتے ہیں تو پوشاک بدلنے کے لئے

کشتہ گیاوی

اودھ کشور پرشاد وکیل۔ آپ جناب نوحؔ ناروی کے شاگرد اور اپنے استاد کے قدم بہ قدم چلنا اپنی عین سعادت سمجھتے ہیں۔ عرصے سے علم و ادب کی خدمت میں مشغول ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے ایک سبق ہے۔ غزل اور نظم دونوں سے دلچسپی رکھتے ہیں اور بڑی حد تک اپنے اُستاد کے رنگ کو نباہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپکی ایک غزل کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

اقرارِ محبت کبھی انکارِ محبت کیا لطف مجھے دیتی ہے تکرارِ محبت
کوشش سے بھی مجھ پر نہ کھلا رازِ برہمن یہ تارِ گریباں ہے کہ زنارِ محبت
کھل جاتے ہیں کھل جاتے ہیں سب پر چھپنے نہیں چھپتے نہیں آثارِ محبت

"ساون"

پاک دامن بھی نظر آنے لگے تر دامن کر گئی بارشِ مے آج گھٹا ساون کی
گر پڑے آکے نہ بلبل کے نشیمن پہ کہیں یہ چمکتی ہوئی بجلی ہے بلا ساون کی

جناب ساحر کاکوی۔ جناب الیاس بہاری۔ جناب جمیل دانا پوری۔ جناب رخشاں ابدالی۔ جناب ثمر آروی۔ جناب عرفان اسلام پوری۔ جناب بسمل دانا پوری اور

شعرائے بہار عہدِ حاضر میں

از جناب ڈاکٹر سید نسیم گورگانوی پٹنہ،

ندیم گیا بہار نمبر ۱۹۳۵ء شایع ہوا اور ہندوستان کے قریب قریب تمام رسائل و جرائد نے اپنے اپنے خیالات و آراء کا اظہار ریویو کی صورت میں کیا۔ حق تو یہ ہے کہ بہار نمبر جن خصوصیات کا حامل تھا، وہ اہلِ نظر و اربابِ ذوقِ سلیم سے پوشیدہ نہیں۔ بہار نمبر کی خصوصیات میں سے سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اِس کے تمام تر مضامین صوبہ بہار سے متعلق اور بہاری ادبا و شعراء کے ہوئے قلم کے رہینِ منت ہوتے ہیں۔

رسالہ شاعر آگرہ کے فاضل ایڈیٹر حضرت سیماب اکبرآبادی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور یہ حسرت ظاہر فرمائی کہ اگر بہار نمبر میں بہار کے ذی حیات شعراء پر بھی ایک دو مضمون ہوتا تو بہار نمبر کی خصوصیات میں چار چاند لگ جاتے۔ ہم حضرت سیماب اکبرآبادی کی اس اہم رائے سے کامل اتفاق رکھتے ہیں، اس لئے ہمیں فوراً خیال آیا کہ اگر ہماری عدیم الفرصتی نے جس وقت ذرا سی بھی اپنی گرفت ڈھیلی کی تو ہم حضرت سیماب مدظلہ کے ظاہر فرمائے ہوئے ضروری عنوان پر ایک مضمون ضرور سپردِ قلم کریں گے۔ آج اِن ہی خیالات کا نتیجہ آپ کے پیشِ نظر ہے۔

ذیل کے مضمون میں ہم نے اپنی معلومات کی بنا پر یہ کوشش کی ہے کہ بہار کے ایک ایک مشہور اور مستند شاعر کا بھی نام اس مضمون میں شریک ہونے سے نہ رہ جائے۔ اب اگر اس احتیاط کے باوجود ہم سے کوئی مستند شاعر کا نام سہواً درج ہونے سے رہ گیا ہو تو اسے آپ ہماری دماغی کمزوری پر محمول کیجئے۔ گلہ اور شکایت کی کوئی وجہ نہیں۔ زندگی نے وفا کی تو پھر کبھی۔

یہ مضمون کئی ہفتوں کی کاوش اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہے۔ ایک ایک لفظ پر ہمیں شعرائے کرام سے ملنا اور خط و کتابت کرنی پڑی ہے ——— چونکہ اس مضمون کے مختلف حصے مختلف اوقات میں قلم بند کئے گئے ہیں، اس لئے اسلوبِ تحریر میں نمایاں فرق ہے۔

قارئین نے اگر ہماری اس سعی کو بہ نظرِ استحسان دیکھا تو ہم ان شاء اللہ تعالیٰ انہیں صفحات پر بشرطِ حیات چند ماہ کے بعد دو اور مکمل مضامین "بہار کی موجودہ شاعرات" اور "بہار کے موجودہ ہندو شعراء" جو خاص طور پر بہار سے تعلق رکھتے ہیں، پیش کرنے کی جرأت کریں گے۔

امیرؔ جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

۱۔ علامہ آزاد عظیم آبادی

آزاد تخلص کرتے ہیں، پورا نام سید شاہ فضل حق ہے۔ شاہو بگہا (ضلع گیا مضافاتِ عظیم آباد) کے رہنے والے ہیں۔ شعر و سخن کا ذوق آج کا نہیں، بہت قدیم ہے۔ آپ صحیح معنوں میں کہنہ مشق شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔ موصوف کی قادر الکلامی اور تبحرِ علمی کا سارا ہندوستان لوہا مان چکا ہے۔ ان دنوں آپ زندگی کے آخری لمحات شاہو بگہا میں رہ کر گزار رہے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

شوق ناحق شعلہ زارِ گرمیٔ انفاس تھا
عمر بھر ڈھونڈا کئے جس کو وہ اپنے پاس تھا
چند قطرے تھے جفاکش کی جبینِ شوق پر
سیپ میں موتی نہ کانوں میں کہیں الماس تھا

۲۔ ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی

جناب ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی خاص عظیم آباد (پٹنہ سٹی) کے متوطن ہیں۔ اسمِ گرامی مبارک حسین ہے اور تخلص مبارک کیا کرتے ہیں۔ آپ داغ دہلوی مرحوم کے ممتاز ترین تلامذہ میں سے ہیں اور اس وقت صوبہ بہار میں ان کی یادگار ہیں۔ آپ کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

یوں نہیں آپ سمجھئے اس میں کوئی بات بھی ہے
سچ تو کہئے مرے دشمن سے ملاقات بھی ہے

راقم الحروف کو حضرت مبارک سے خاص طور پر ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ آپ فی البدیہہ بھی ایسی ایسی غزلیں تصنیف کر جاتے ہیں کہ

سننے والا محو حیرت بنا ہوا آپ کا منہ تکتا رہ جاتا ہے۔ ابھی حال کا ذکر ہے کہ بزم ادب پٹنہ کالج کا ایک غیر معمولی مشاعرہ مولانا انجم گیاوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ حسن اتفاق سے علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ بھی اُسی وقت اعظم گڈھ سے تشریف لے آئے، مولانا انجم نے کرسیٔ صدارت علامۂ موصوف کے حوالہ کردی اور مشاعرہ شروع ہوا۔ جب حضرت مبارک کو یہ خبر ملی تو وہ فوراً مشاعرہ کی شرکت کے لئے آمادہ ہوگئے۔ ہال ہی میں آپ نے علامہ سلیمان ندوی کی شان میں فی البدیہہ دو رباعیاں تصنیف فرمائیں اور اُٹھ کر پڑھنے لگے۔ اجتماع کافی تھا، ہر گوشہ سے واہ واہ کی صدا بلند ہونے لگی، حاضرین کے مکرر اصرار سے حضرت مبارک نے ایک دو غزلیں بھی پڑھیں اور مشاعرہ نہایت کامیابی کے ساتھ برخاست ہوا، آپ کی ایک غزل جو داغ مرحوم کے مخصوص رنگ میں کہی گئی ہے درج کیجاتی ہے، پڑھیے اور مرحوم داغ کا رنگ ملاحظہ فرمائیے۔

ع

دشمنوں سے گلا نہیں غم کا، دوستوں میں ہے جشن ماتم کا
جب سے بدلی ہے یار کی چتون رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا
میرے رونے پہ لوگ ہنستے ہیں مجھ کو رونا ہے چشم پُرنم کا

مولانا تمنا پھلواروی

قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعر ہونے کے علاوہ دَور حاضرہ کے بہت بڑے عروض داں تصور کئے جاتے ہیں، تمنا تخلص ہے، پورا نام سید شاہ محی الدین ہے۔ قصبہ پھلواری شریف ضلع پٹنہ کے رہنے والے ہیں شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ آپ کے شاگردوں میں سے حضرت احمد آرمان آروی۔ ایم۔اے ونیلئے شاعری میں نمایاں شہرت حاصل کرچکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ حضرت تمنا کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

ع

جب وہ تلوار کھینچکر نکلا ہر گریباں سے ایک سر نکلا،
پھر کہاں چاندنی کہاں مہتاب جب وہ خورشید بام پر نکلا

ڈاکٹر عظیم الدین احمد

علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد پی۔ایچ۔ڈی عظیم آباد کے مشہور انقلابی محلہ صادق پور کے باشندے ہیں عظیم الدین احمد نام اور عظیم تخلص ہے۔ جرمنی سے واپس آنے کے بعد مستقل پانچ برسوں تک لاہور میں مقیم رہے پھر عظیم آباد آئے اور عرصہ دراز تک پٹنہ کالج میں عربی و فارسی کے پروفیسر رہے۔ اندنوں پٹنہ سٹی میں ریٹائرڈ لائف بسر کر رہے ہیں موصوف ایک کامیاب فلسفی شاعر ہیں، اُن کی نظموں کا ایک ایک شعر مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ متعدد نظمیں نصاب تعلیم میں داخل کرلی گئی ہیں، آپ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ زبان عربی میں بھی مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ آپ کی زبان دانی اور عدیم المثال شخصیت کے متعلق مولنا عبدالباقی کی یہ سطریں ناقابل فراموش ہیں۔

"ڈاکٹر عظیم الدین احمد علم و فضل کے اعتبار سے آج مستشرقین میں ایک بلند پایہ رکھتے ہیں، آپ کی تحقیق و اجتہاد سے اگرچہ مغربیت کا رنگ جھلکتا ہے لیکن ان میں مارگولیتھ کی سطحیت کہیں نہیں پائی جاتی۔ اُردو ادب پر ان کے احسانات ایک زمانے تک فراموش نہیں کئے جاسکتے، شاعری میں بھی آپ جدید الفکر شعرا کی صف اول میں جگہ رکھتے ہیں اور قلمروئے شاعری کی اگر کوئی وزارت مرتب کیجائے تو ڈاکٹر عظیم اس کے اہم ترین رکن ہوں گے"

موصوف کی ایک نظم ذیل میں درج کی جاتی ہے، پڑھیئے اور دیکھیئے کہ صوبہ بہار کی سرزمین بھی کیسی کیسی مایۂ ناز و صد افتخار ہستی پیدا کرتی ہے۔

ع

سُننے والوں سے یہ کہہ دو نہ ہراساں ہونا طرز نو سے ہے مجھے آج غزل خواں ہونا
میرے نالوں سے یقیں ہے دل احباب ہلیں میری آہوں سے ہے محفل کو چراغاں ہونا
زیست کا راز مجھے اُن سے بیاں کرنا ہے جن کی قسمت میں ہے عالم کا نگہباں ہونا

علامہ جمیل مظہری

نام سید کاظم علی کاظمی اور تخلص جمیل ہے۔ حسن پورہ، چھپرہ کے رہنے والے ہیں، لیکن ایک عرصہ سے مظفر پور کی بود و باش اختیار کرلی ہے۔ ان دنوں پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے شعبۂ اُردو کے افسر اعلیٰ ہیں۔ حضرت

جمیل کو اُردو ادب کی تمام اصناف پر کامل قدرت حاصل ہے، موصوف کے شعروں میں شعریت ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں آپ ہندوستان کی عظیم ترین لٹریری سوسائٹی یعنی اُردو لٹریری کانفرنس کلکتہ کی مجلس استقبالیہ کے صدر منتخب ہو چکے ہیں، یہ قوم کی سعادت مندی تھی جس نے ایک مسلم الثبوت ادیب و شاعر کو اس اہم فریضہ کی انجام دہی کی جانب آمادہ فرمایا۔ ہندوستان کا ہر صاحب ذوق اکثر آپ کو ایک فطری شاعر کی حیثیت سے جانتا اور ان کے کلام کی قدر کرتا ہے۔ ایک مشہور نظم کے چند مصرعے بطور نمونہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں پڑھئے اور جھومئے، زبان کی خوبیوں کے علاوہ ادبی لطافتوں کی بھی داد دیجئے۔ مرحوم شاما کو متوجہ کر کے کہتے ہیں۔ ۵

اٹھو عمر شب مختصر ہو رہی ہے، دعا کامیاب اثر ہو رہی ہے
نکھرتے ہیں جلوے بکھرتی ہے ظلمت سحر ہو رہی ہے، سحر ہو رہی ہے

سرکتی ہیں چہرے سے زلفیں کسی کی، ہوئی جاتی ہے چاندنی پھیکی پھیکی
کہیں دل نے چھیڑا ہے ساز محبت سنو آ رہی ہے صدا بانسری کی

یہ پچھلا پہر اور یہ تنہائی میری، تخیل کی دنیائے رنگیں اندھیری،
کدھر ہے ارے او جواں مرگ شاما! جگہ بزم فطرت میں خالی ہے تیری،

ہے پھولوں کی خوشبو پریشان اب تک چمن کی فضائیں ہیں حیران اب تک
ترے سوگ میں ہیں تری سیرگاہیں ندی کا کنارہ ہے سنسان اب تک

جو بو تیری زلفوں کی پاتی نہیں ہے، چمن میں کلی مسکراتی نہیں ہے
تری جستجو میں ہیں گنگا کی موجیں، کہ تو اب نہانے کو آتی نہیں ہے

ہوا راکھ جل کر ترا جسم خاکی ہے مرگھٹ کا ہر ذرہ تربت وفا کی
صبا اپنے دامن میں مثل امانت لئے پھرتی ہے راکھ تیری چتا کی

بہار آ کے گلشن میں جاتی ہے اب بھی گھٹا بال بکھرائے آتی ہے اب بھی
وہ شاخ آم کی جس پہ جھولا تھا تیرا صبا آ کے اس کو جھلاتی ہے اب بھی

قسم تجھ کو افسردگی قمر کی قسم تجھ کو تقدیر شمع سحر کی
ادھر آ تجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہے نسیم جنوں خیز پچھلے پہر کی

مولانا شفق رضوی

مولانا شفق رضوی ایک کہنہ مشق اور کامیاب شاعر ہیں۔ پورا نام سید حسن مرتضیٰ ہے، شفق تخلص کرتے ہیں۔ عماد پور ضلع گیا کے رہنے والے ہیں۔ پہلے حضرت کوثر خیرآبادی کو کلام دکھاتے تھے۔ پھر حضرت امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ان دنوں حضرت شفق کا قیام الہ آباد میں ہے۔ وہاں کسی سلسلہ کی وراثت میں سجادگی مل گئی ہے۔ عرصہ ہوا کہ آپ ایک ادبی ماہنامہ "نسیم سحر" کے نام سے نکالتے تھے۔ نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔ سنتے ہیں کہ حضرت شفق نہایت اچھے خوشنویس

بھی ہیں - خدا جانے اس میں صداقت کو کہاں تک دخل ہے[1] - ان کے کلام میں سلاست، روانی اور پختگی تینوں خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں - نمونۂ کلام ملاحظہ ہو -

نہ مرنے ہی کا موقع تھا نہ بس جینے پہ چلتا تھا | لئے تھے سر وہ زانو پر کسی کا دم نکلتا تھا
گواہ دردِ فرقت ہر شکن تھی بسترِ غم کی | بڑی بیتابیوں سے کروٹیں کوئی بدلتا تھا
ادھر گرمی سے شمعیں ڈوبی جاتی تھیں پسینے میں | اُدھر اپنے پروں سے پنکھیا پروانہ جھلتا تھا

حضرت نجم گیلانی

گیلانی بہار شریف کے قریب ایک گاؤں ہے، پروفیسر نجم گیلانی وہیں کے رہنے والے ہیں۔ نام نجم الہدیٰ ہے اور تخلص نجم کرتے ہیں - کچھ عرصہ سے پٹنہ میں مستقل قیام ہے، اس سے قبل عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر تھے، ان دنوں پٹنہ کالج میں ایک پروفیسر کے فرائض انجام دے رہے ہیں - کچھ روز تک وکالت بھی کرتے تھے - صوبۂ بہار کی پچھلی حکومت نے جو ہندوستانی کمیٹی زبانوں کی ترقی کے لئے قایم کی ہے موصوف اس کے سکرٹیری ہیں - نیز مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کی نظامت کے فرائض بھی موصوف ہی کے سپرد ہیں - آپ کے اشعار بہت پاکیزہ اور لطیف ہوا کرتے ہیں - پروفیسر نجم عدیم الفرصت ہونے کی وجہ سے کہتے بہت کم ہیں - موصوف کو اپنے وطن سے بھی بڑی محبت ہے، چنانچہ انتہائی جوش اور ہمدردی میں آپ ایک بار بے قرار ہو کر " نغمۂ بہار " کے عنوان سے پکار اٹھے اور خدا کو متوجہ کر کے یوں کہنے لگے -

لالہ کو بہار دے، سبزہ کو مرغزار دے | میرے وطن بہار کو گلشنِ نو بہار دے
باغِ بہشت کی نظیر، یعنی وہ کوہِ راجگیر | پھر اُسے لالہ زار کر، سرو دے اور چنار دے
رقص کرے جو موج گنگ دل میں اٹھے نئی اُمنگ | رُوح کو کر تپش عطا، قلب میں اک شرار دے

حضرتِ رسا گیاوی

محلہ غسال گڈھ بہار شریف کے رہنے والے ہیں - رسا تخلص کرتے ہیں - اسم گرامی سید محمد اسمٰعیل ہمدانی ہے، پیشۂ وکالت کے سلسلے میں قیام شہر گیا میں رہتا تھا، پھر شیخپورہ کالج میں گئے - اب پٹنہ کالج میں ریسرچ اسکالر ہیں - آپ حضرت کوثر مرحوم خیرآبادی کے تلامذہ میں ہیں - نثر نگاری سے موصوف کو بہت کم دلچسپی ہے - شعر خوب کہتے ہیں - اور بہت کہتے ہیں - ایک بلند پایہ نظم جس کا عنوان " ایک نوجوان سپاہی کی موت میدان جنگ میں " ہے اُس کا ایک بند نمونہ کے طور پر درج ہے -

سونے والے جاگ آئی ہوں جگانے کے لئے، | پیاری پیاری شکل آئی ہوں دکھانے کے لئے
خود ترے پاس آئی ہوں بلانے کے لئے | رُوٹھنے والے، میں آئی ہوں منانے کے لئے

حضرت حمید عظیم آبادی

حضرت حمید عظیم آبادی علامہ شاد اعلی اللہ مقامہ کے شاگرد رشید ہیں اور اپنے کو خاکپائے شاد لکھا کرتے ہیں - حضرت شاد مرحوم کی صحبت سے حضرت حمید بہت زیادہ مستفیض ہوئے ہیں - حمید تخلص ہے اور نام سید عبد الحمید ہے - لودیکٹرہ پٹنہ سٹی کے رہنے والے ہیں - نمونۂ کلام یہ ہے -

وفا کیسی، بس اب طوقِ جفا زیبِ گلو کر لے | جفا کاروں کی دنیا ہے، جفا سہنے کی خو کر لے
بنا دامن کو گلشن اور سیرِ رنگ و بو کر لے | ابھی آنکھیں ہیں قابو میں ابھی دل کو لہو کر لے
نہیں یہ دھجیاں، صحرائے الفت کی ہیں گل بوٹے | یہ کیا کہتے ہو عاشق سے کہ دامن کو رفو کر لے

حضرت بیدل عظیم آبادی

" نظم جدید " کے مؤلف اور پٹنہ کالج کے پروفیسر حضرت عبد المنان بیدل عظیم آبادی کے نام نامی سے اخبار بین طبقہ کافی حد تک روشناس ہو چکا ہے - آپ ڈیانواں ضلع پٹنہ کے رہنے والے ہیں - عبد المنان نام ہے اور بیدل تخلص کرتے ہیں - شاعری اور خصوصاً غزل گوئی میں پروفیسر بیدل کا پایہ بہت بلند ہے - موصوف کی ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے اور ہماری باتوں کی تصدیق کیجیے -

آنکھ ساقی کی کبھی ہوش رُبا ہوتی ہے | اور کبھی ہوش میں لانے کی دوا ہوتی ہے
بے گناہی بھی محبت میں خطا ہے شاید | جرم ثابت نہیں ہوتا ہے سزا ہوتی ہے

[1] ندیم :- موصوف کی خوشنویسی کا نمونہ زیر نظر نمبر کے باب " فن پارسی " میں ملاحظہ فرمائیں -

ہم کو دنیا سے مٹا کر یہ خوشی ہے کیسی؟ دیکھیں اب کس پہ تری زورِ جفا ہوتی ہے

حضرت سریر کابری

حضرت سریر کابری کی نظموں میں وہ کیفیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو ایک بلبل کے نغموں میں ہونی چاہئیں۔ حضرت سریر کا خاص وطن کابر ضلع گیا ہے۔ لیکن بسلسلۂ ملازمت قیام برابر حسین آباد ضلع پلاموں میں رہا کرتا تھا، اب بہ سلسلۂ ملازمت گیا میں مقیم ہیں۔ آپ ایک کامیاب ناظم ہیں اور نظمیں بڑی سلجھی ہوئی لکھا کرتے ہیں۔ ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

غم ہی مجھے دے دے جو میسر نہ خوشی ہو، اے چرخ ستم ہے اگر اس کی بھی کمی ہو،
اندوہ و الم خوابِ مسرت کی ہے تعبیر، آنکھوں میں بھی ہو اشک جو ہونٹوں پہ ہنسی ہو
اک ہم ہیں کہ اشکوں میں بھی تاثیر نہیں ہے اِک وہ ہیں کہ جو منہ سے نکل جائے وہی ہو

حضرت مقبول آبگلوی

آبگلہ ضلع گیا کے رہنے والے ہیں۔ سید مقبول امام اسم گرامی ہے۔ مقبول تخلص کرتے ہیں جناب قاضی سید شاہ مظاہر امام صاحب کے خلف اکبر ہیں۔ قاضی صاحب موصوف کہنہ مشق شاعر ہیں۔ پچاس سال پیشتر فارسی میں کہتے تھے۔ پھر اردو میں بھی کبھی مشق فرمایا۔ سید تخلص فرماتے تھے۔ اُس زمانہ کے صحائف میں آپ کے کلام چھپتے تھے۔ اب مشق سخن چھوڑ دی ہے۔ صرف سالانہ تقریب عرس کے وقع پر منظوم نوید شایع کرتے ہیں۔ اس نوید کی خصوصیت ہر سال یہ رہتی ہے کہ ہر شعر کے پہلے مصرعہ کے پہلے حرفوں کے مجموعہ سے ہجری تاریخ اور دوسرے مصرعوں کے پہلے حرفوں کے مجموعہ سے عیسوی تاریخ نکلتی ہے۔

حضرت مقبول نے اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ سن شعور کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔ یہ ندوۃ العلماء کا دور اول تھا۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کے رفیق درس تھے۔ شعر و شاعری کا مذاق ابتدا ہی سے تھا۔ انہوں نے ذوق شعری اپنے والد بزرگوار سے پایا۔ حضرت کوثر خیر آبادی کے ممتاز تلامذہ میں ہیں اور کہنہ مشق ہیں۔ دس بیس برس پہلے گیا کے مشاعروں میں ان کے دم سے رونق رہتی تھی، ادھر بیس پچیس سال پیشتر اردو اخبار و رسائل میں آپ کے کلام چھپتے تھے گیا کے رسالہ "بزم سخن" میں آپ اور آپ کے تلامذہ کی غزلیں خاص طور پر رہتی تھیں۔ لیکن اب مشق سخن جاری نہیں رکھی، ادھر ایک زمانہ کے بعد ایک دو غزلیں ندیم کے صفحات میں نظر آئیں جن میں کلام کی استادانہ جھلک پورے طور پر موجود ہے۔ اگر مشقِ سخن جاری رکھتے تو اس وقت چوٹی کے شعرائے بہار میں ہوتے۔ کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

لب آشنائے نالۂ دردِ جگر نہ ہو، اے ضبط گھر کی بات ہے باہر خبر نہ ہو
چند قطرے آنسوؤں کے چند نالے دل گداز ہم غریبوں کے لئے ہیں نقدِ حالِ زندگی
آج ماتم میں مرے مقبول ہیں وہ بھی شریک زندگی میں جو نہ تھے پرسانِ حالِ زندگی

حضرت کشتہ گیاوی

صوبہ بہار میں ہندو شعرا کی تعداد گرچہ بہت کم ہے، لیکن پھر بھی ہندو شعرا کی جو فہرست اس وقت ہمارے پیش نظر ہے وہ بہت امید افزا ہے۔ حضرت کشتہ گیاوی اس فہرست کی صفِ اول میں جگہ رکھتے ہیں مشاعرے میں برابر کی شرکت کی وجہ سے پبلک آپ سے بہت زیادہ متعارف ہو چکی ہے۔ موصوف حضرت نوح ناروی کے شاگرد ہیں۔ ان کا پورا نام اودھ کشور پرشاد ہے اور کشتہ تخلص کرتے ہیں۔ مستقل قیام شہر گیا میں رہتا ہے۔ اور ذریعۂ معاش پیشۂ وکالت ہے۔ وکالت کی مشغولیت کے باوجود آپ اپنا قیمتی وقت بہت زیادہ علمی مشاغل میں صرف کرتے ہیں۔ ان کے اشعار بہت سادہ اور مطالعہ کے لائق ہوتے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

نہ قابو آپ کے دل پر نہ بس اپنی طبیعت پر برستی ہے وفورِ غم سے حسرت کیا ہی حسرت پر
اُدھر رنجش پہ رنجش ہے عداوت ہے عداوت پر اِدھر الفت پہ الفت ہے محبت ہے محبت پر
یہ اظہارِ تنفر ہے کہ اظہارِ محبت ہے؟ جو ہنس کر پھیرتے ہو منہ مری صاحب سلامت پر

حضرت اجتبیٰ رضوی

رضوی تخلص کرتے ہیں، نام سید اجتبیٰ حسین ہے۔ چھپرہ کے رہنے والے ہیں۔ عرصہ سے شعر و سخن کا ذوق ہے۔ راجندر کالج چھپرہ میں ... پروفیسر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں جریدہ "استقلال" پٹنہ کے ادارۂ تحریر سے وابستہ تھے۔ غزلیں اور نظمیں دونوں خوب کہتے ہیں، اہل ذوق کی نظر میں ایک اچھے شاعر ہونے کی حیثیت سے بڑی قدر ہے۔ ایک مرصع غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے اور شاعر کی قادر الکلامی کی داد دیجئے۔

سه

حدودِ جسم خاکی میں نہ پاؤ گے نشاں میرا　　غبارِ کارواں ہوں دُور پہنچا کارواں میرا
بلندی پر بہت نازاں ہے شمسہ تیرے ایواں کا　　زمینِ عجز سے اُٹھے غبارِ ناتواں میرا
خجل ہے میری محرومی سے رحمت کی جہانگیری　　یہ تیری وسعتِ دامن یہ دستِ ناتواں میرا

حضرت شمیم رائے پوری

سید مظفر حسین نام اور شمیم تخلص ہے۔ سنبل پور کساوہ ضلع پٹنہ کے رہنے والے ہیں۔ مگر بچپن سے اپنی نانہال رائے پور میں رہ گئے ہیں۔ آج سے دو ڈھائی سال قبل آپ کا قیام کلکتہ میں تھا، یہاں کے مختلف علمی اداروں سے وابستہ رہے۔ کچھ دنوں سے دار الاشاعت کی ملازمت کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھے۔ اب مرکزی انجمن ترقی اُردو (دہلی) میں تشریف فرما ہیں۔ بہت سے حضرات غلطی سے آپ کو کلکتوی یا لاہوری سمجھتے ہیں، گنتی کے چند افراد ہیں جو انہیں بہاری جانتے ہیں۔ آپ کے چھوٹے بھائی اختر حسین رائے پوری ہندی ادب کے اہل طرز اور بلند پایہ ادیب ہیں۔ کچھ دنوں سے اُردو ادب کی طرف بھی توجہ مبذول کی ہے۔ نثر اچھی لکھتے ہیں۔ حضرت شمیم ایک مستند شاعر ہیں، لیکن ملازمت کی وجہ سے غزلیں کہنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ آپ ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خیال مرحوم کی نثر نگاری کے بے حد دلدادہ اور عاشق ہیں۔ چنانچہ اسی جذبہ کے ماتحت حضرت خیال کے انتقال کے بعد حضرت خیال پر آپ کے کئی قابل قدر مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ موصوف کی ایک غزل میں یہاں نمونہ کے طور پر درج کرتا ہوں، امید ہے کہ قارئین بھی لطف اندوز ہوں گے اور سمجھ سکیں گے کہ شمیم کس پایہ کے شاعر ہیں۔

سه

روئدادِ محبت کیا کہیے، بے دادِ محبت کیا کہیے　　جب سُننے والا کوئی نہ ہو تو غم کی حکایت کیا کہیے
دل کے کھوٹے سکّے کا لینے والا کوئی نہیں ہے　　ایک نگاہِ لطف سے بڑھکر اس کی قیمت کیا کہیے
سینے میں اک چھالا سا تھا کیا جانیں کب پھوٹ گیا　　پوچھ رہے ہو دل کی حالت، دل کی حالت کیا کہیے

حضرت ارمان آروی

احمد ارمان نام۔ ارمان تخلص ہے۔ علامہ تمنا مدظلہ کے شاگرد رشید ہیں۔ وطن مالوف شہر آرہ ہے۔ تعلیم کے زمانہ سے برابر قیام عظیم آباد اور مضافات عظیم آباد میں رہتا ہے۔ اہل ذوق آپکو "سحر البیان" کہتے ہیں۔ دنیائے صحافت میں شہرت بھی کافی حاصل کر لی ہے۔ کئی سال کا ذکر ہے کہ آپ نے اپنی سحر البیانی سے جناب حسینی پر جنہوں نے حضرت بیدل عظیم آبادی کی کتاب "نظم جدید" پر اعتراضات کئے تھے، کچھ ایسا زبردست اور زود اثر سحر چلایا تھا کہ بیچارے حسینی صاحب کے منہ سے کوشش کے باوجود بھی ایک آدھ لفظ نہ نکل سکا۔ حضرت ارمان آروی کے کلام میں بڑی بے ساختگی اور پختگی موجود ہے۔ ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے اور موصوف کے افکار عالیہ کی داد دیجئے۔

سه

اے جنوں آج پھر ایسا کوئی ساماں کرنا　　کہ میسّر ہو مجھے سیرِ بیاباں کرنا
میں نے مانا کہ مرا کام ہے دشوار مگر　　تجھ کو مشکل نہیں مشکل مری آساں کرنا

حضرت نجم ندوی

سید محمد ابراہیم نام۔ اور نجم تخلص ہے۔ کسمر ضلع چھپرہ کے رہنے والے ہیں۔ قیام اوسن پور، چھپرہ میں ہے۔ اور وہیں کے مڈل اسکول میں ایک ٹیچر کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ حضرت نجم کے کلام میں پختگی بہت زیادہ نمایاں ہے۔ بعض بعض شعر بہت پاکیزہ اور لطیف ہوا کرتے ہیں۔ نثر بھی بہت سُلجھی ہوئی اور سلیس لکھا کرتے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

سه

ہے رفیقِ راہِ الفت جذبۂ کامل مجھے،　　ننگ ہے اس میں تلاشِ رہبرِ منزل مجھے
اک دلِ درد آشنا پہلو سے کیا جاتا رہا،　　چار دن کی زندگی بھی ہو گئی مشکل مجھے

خواتین بہار

بہار کی ایک مایۂ ناز فاضلہ

از مولانا سید محمد طٰہٰ صاحب اشرف، امتھوی

زبان و ادب کی خدمت میں ہمارے صوبہ کی خواتین کا بھی کچھ کم حصہ نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ اُن کی ادبی خدمتیں منظر عام پر نہ آسکیں، آج میں ایک ایسی مایہ فخر و ناز ہستی کا تعارف کراتا ہوں، جو اپنی مجموعی خوبیوں اور اپنے علم و کمال کی وجہ سے موجودہ عہد میں صفِ نسواں میں ممتاز اور بلند نظر آتی ہے، جس نے تمامی مصروفیتوں کے باوجود خدمتِ زبان و ادب کا مشغلہ برابر جاری رکھا، شاعری کی، لیکن شاعری کا غلط مصرف نہ لیا۔ افسوس یہ گرانمایہ ہستی چند سال ہوئے کہ پیوندِ خاک ہوچکی۔

نام اور سلسلۂ نسب

اس فاضلہ جلیلہ کا نام "صالحہ" سنہ ولادت غالباً ۱۲۹۸ھ، والد ماجد کا نام سید شاہ فضل عظیم جو عرصہ تک پٹنہ سٹی اسکول میں عربی کے ماسٹر تھے۔ جد امجد کا نام شاہ بہادر حسین ابن مولانا محمد امیا ؒ ساکن وتاؤ، اور والدہ ماجدہ کا نام بی بی فاطمہ ہے جو سید شاہ محمد تقی بلخی کی دختر کی نواسی، اور شاہ بہادر حسین صاحب کے برادر حقیقی عارف باللہ حضرت شاہ امیر الحسن صاحب کی نواسی تھیں، اور آپ کی شادی موضع بھری ضلع آرہ میں جناب مولوی سید شاہ شرف الدین صاحب سے ہوئی جو علمی حیثیت سے خود ایک ممتاز شخصیت کے مالک صاحب تصنیف و تالیف ہیں۔

حضرت صالحہ کے نانا جناب مولوی سید شاہ نور الحسن صاحب، اور شوہر مولوی سید شاہ شرف الدین صاحب کے والد ماجد جناب مولانا سید شاہ احمد حسین صاحب امتھوی حقیقی بھائی، اور حضرت مولوی معنوی جناب مولانا محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ العزیز یکے از جامعین فتاویٰ عالمگیری[1] کے اولاد و احفاد میں ہیں، اس حیثیت سے بھی آپ صوبہ کے ایک قدیم ترین علمی خانوادے کی چشم و چراغ تھیں،

سلسلۂ تلمذ

آپ نے اپنے مادری سلسلہ کے بزرگ مولانا شاہ وحید صاحب سے جو آپ کی والدہ ماجدہ کے خالو، مصنف "حالات مولائے علی کائنات" تھے۔ اور مولانا شرف الدین برادرِ نسبتی مولوی نور الہدیٰ بلخی وکیل گیا، پدر بزرگ مولوی قمر الدین صاحب مختار سے فقہ، تفسیر، حدیث میں شرفِ تلمذ حاصل کیا، پھر اپنے شوہر مولوی سید شاہ شرف الدین صاحب سے تکمیل کی۔ فارسی اور نحو و صرف کی ابتدائی تعلیم غالباً اپنے والد ماجد سے حاصل کی تھی،

حفظ قرآن کا شوق

علوم متداولہ سے فراغت کے ایک عرصہ بعد آپ کو حفظ قرآن کا شوق ہوا، اور یہ آتش شوق اتنی تیز تھی کہ مکروہاتِ دنیاوی، اور مصائب لامتناہی کے طوفان بھی اس آگ کو نہ بجھا سکے، اور مرحومہ نے ہر حال میں اس مبارک شغل کو جاری رکھا، ہمیشہ فرماتی رہیں کہ حفظ قرآن میری دوا اور روحی غذا ہے، چنانچہ آپ نے بیس پارے حفظ کر لئے تھے، اور دمِ واپسیں تک یہ شوق اتنا غالب تھا کہ دم نکلنے کے وقت بھی سورہ "رعد" وردِ زبان تھی۔ مرحومہ نے اپنے حفظ قرآن کا تذکرہ اپنی ایک نظم (مطبوعہ "الفقیہہ") میں اس طرح کیا ہے:-

> شکر تیرا میں کروں کیونکر ادا، حفظ قرآں کی جو نعمت کی عطا،
> فضل سے تیرے ہی اے مولا مرے بیس پارے حفظ مجھکو ہوگئے

آپ نے جو کچھ حفظ کیا اُس کو نہایت بہتر طریقہ پر محفوظ بھی رکھا، ضروریاتِ زندگی اور امور خانہ داری کی مصروفیتوں میں بھی زبان کو وِرد و تلاوت سے فرصت نہ تھی، آپ کا معمول تھا کہ بچوں کو لوریاں بھی دیتیں تو قرآن ہی سے، اور مصائب و آلام میں تسکین

---

[1] حضرت مولوی معنوی رحمتہ اللہ علیہ اور اس علمی خانوادہ کے اکثر افراد کا ذکر رسالہ معارف اعظم گڑھ اپریل و مئی ۱۹۳۶ء میں خاکسار کے قلم سے نکل چکا ہے۔ اور حضرت مولانا سید شاہ احمد حسین صاحب کی بعض اردو تصنیفات کا حال رسالہ ندیم میں بھی "اُردو نثر کی ارتقا میں ادبائے بہار کا حصہ" کے عنوان سے شایع ہوچکا ہے

قالب حاصل کرتیں تو قرآن ہی سے،

خطاطی اور خوشنویسی

معلوم نہیں آپنے اس فن میں کسی سے باضابطہ تعلیم حاصل فرمائی یا محض اپنے فطری ذوق سے اتنی مشق بہم پہنچائی، آپ کے حروف نہایت پاکیزہ تھے، اور مرحومہ کے صاحبزادہ مولوی سید شاہ احسن الدین صاحب کی روایت کے مطابق خطِ نسخ، خطِ نستعلیق، خطِ طغریٰ، خطِ توام، خطِ گلزار، خطِ غبار میں مرحومہ کو اچھی مشق اور مہارت تھی،

مشاغل علمی اور دیگر حالات

کتابوں سے آپ کو عشق تھا - اور کتب بینی میں ہمیشہ محو رہتیں، ہمیشہ آپ کے گرد کتابوں کا انبار ہوتا، بچوں کو صرف و نحو، فقہ اور حدیث کا درس خود دیتیں، اگرچہ گھر کا سارا انتظام تنہا مرحومہ کی ذات سے وابستہ تھا؛ لیکن فرصت کے اوقات میں درس و تدریس مطالعۂ تفسیر و حدیث، ورد و وظائف، عبادت و ریاضت کے سوا کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ کار خیر میں نہایت بلند حوصلگی سے حصہ لیتیں۔ فقرا و مساکین مسجد و مدرسہ کی مد میں ان کا خرچ کافی تھا، اخبار الفقیہ امرتسر کو خالص مذہبی و دینی جریدہ ہونے کی حیثیت سے نہایت عزیز رکھتی تھیں۔

استعداد علمی

مرحومہ نے چونکہ مشاغل علمی کو ہمیشہ جاری رکھا، درس و تدریس اور کتب بینی میں برابر مصروف رہیں اسلئے عربی و فارسی کی استعداد نہایت جید اور مذہبی معلومات نہایت وسیع تھیں۔ آپ کی عربی استعداد کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ کے اشعار میں عربی تلمیحات بکثرت ملتی ہیں، گاہے گاہے آپنے عربی مصرعے اور اشعار تک موضوع فرمائے ہیں مثلاً اپنی چھوٹی صاحبزادی محمودہ بیگم کو ایک خط میں دعائے صحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں :-

صالحہ کی یہ دعا مقبول ہو ربّ الرشاد، انت شافی انت کافی فی مہمات العباد

اور ایک دعائیہ نظم مطبوعہ رسالہ پردہ نشین آگرہ میں لکھتی ہیں :-

علم مجھکو کچھ نہیں یا ربّنا! ہاں مگر اتنا ہی ما علّمتنا

بس اسی پر ختم کرتی ہوں دعا ربّنا اتمم لنا ھٰذا الرّجا

گو یہ سیدھے سیدھے اشعار ہیں، اور ان میں کوئی معنی آفرینی اور جدت نہیں، لیکن کم از کم یہ صاف ظاہر ہے کہ بغیر کافی استعداد و صلاحیت عربی میں صفائی کے ساتھ شعر اور مصرعے موزوں کر لینا ممکن نہیں ہے۔

آپ کی فارسی کی مہارت کے ثبوت میں ایک قطعہ تاریخ درج ذیل ہے، جو مرحومہ نے اپنے والد ماجد کے انتقال کے موقع پر لکھا تھا۔

صالحہ دل پہ رکھ کے سنگ صبر فکر تاریخ کی جو میں نے ذرا

ہاتف غیب نے بعد حسرت دی ندا، "صبر نہ بحکم قضا"

۱۳۱۸ھ

از حد رنج دل بحسرت گفت

کرد رحلت پدر بزرگوار

۱۳۱۸ھ

مادۂ تاریخ کی خوبی و بے ساختگی، تاریخ گوئی اور اصول تاریخ گوئی میں مرحومہ کی واقفیت تامہ کے ساتھ آپکی فارسی دانی کیلئے ثبوت کافی ہے۔

اولاد و اخلاف

مرحومہ کے اس وقت ایک صاحبزادہ مولوی سید شاہ احسن الدین صاحب موجود ہیں جو اپنی تمامی مصروفیتوں کے باوجود تصنیف و تالیف اور علمی خدمات میں مشغول رہتے ہیں، اُن کی تصنیفات سے دو چیزیں شائع ہو چکی ہیں - ایک تو "گرامر منظوم"، جس پر متعدد اخباروں میں ریویو ہو چکے ہیں اور گورنمنٹ بہار و اڑیسہ نے اُس کی دو سو جلدیں خرید کی تھیں۔ دوسری "احسن المولود منظوم"، شعر و سخن کا مذاق چونکہ فطری ہے اسلئے نثر سے زیادہ آپ نظم ہی میں کہتے ہیں -

تین لڑکیاں ہیں، بڑی لڑکی پٹنہ سٹی میں ڈاکٹر سید محمد وارث بلخی کے صاحبزادے مولوی بشیر بلخی مرحوم سے منسوب تھیں، اور دوسری لڑکی مولوی سید الطاف کریم ایم اے پروفیسر رانچی کالج سے بیاہی گئیں - تیسری کی شادی جوانا مرگ ادیب مولوی سید سراج الحسن ایم اے سے ہوئی تھی - بڑی صاحبزادی مرحومہ کی زندگی ہی میں بیوہ ہو چکی تھیں، اسلئے اُن کے نام سے مرحومہ نے جو منظوم خطوط لکھے ہیں وہ خصوصیت کے

ساتھ درد و اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

مرحومہ کی ایک خط سے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ کی منجھلی صاحبزادی خدیجہ بیگم زوجہ مولوی سید الطاف کریم ایم اے بھی شعر و سخن کا ذوق رکھتی ہیں، اللھم زد فزد ولا تنقص،

نمونہ کلام اور ایک اجمالی تبصرہ

افسوس یہ کہ مرحومہ کا مجموعہ کلام میرے پاس موجود نہیں جو کوئی تفصیلی تبصرہ اور بہتر انتخاب پیش کرسکوں، مرحومہ کے دو ایک خطوط اور دو ایک متفرق نظمیں میرے پیش نظر ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلام میں سلاست و روانی کافی ہے۔ عالمانہ اور عارفانہ نصیحتیں موثر پیرایہ میں ادا کی گئی ہیں۔ درد و اثر سوز و گداز.... کلام میں بھرا ہوا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری ہر شاعر کے جذبات کی صحیح ترجمان ہوتی ہے۔ مرحومہ کے کلام سے ان کے فطری رجحان، انداز مزاج، افتاد طبیعت، عادت و سیرت کا صحیح حال معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کامل جو جوہر انسانیت ہے، آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھا، خشیت الٰہی سے آپ کا دل لبریز تھا، صبر و شکر کا آپ کے خانۂ دل میں ذخیرہ تھا، آپ نے اپنے ہر خط میں اپنی بچیوں کو صبر و شکر کی زبردست تعلیم دی، اور اس پر کاربند ہونے کی سخت تاکید فرمائی ہے، دنیاوی جاہ و جلال، شان و شوکت، قوت و ثروت، مال و دولت کی آپ کے دل میں مطلق قدر نہ تھی، آپ نے اللہ تعالیٰ سے جب مانگا تو اس کی رضا مانگی، علم فقہ اور علم دین مانگا، حفظ قرآن کی دولت کو نین مانگی، اور توفیق عمل کی داعی ہوئیں۔ آپ کی ایک مناجات مطبوعہ رسالہ پردہ نشین آگرہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

تو ہے دانا اور بینا اے خدا! ہے رضا تیری ہمارا مدعا
اے خدا اپنی عطا کے واسطے سرور ہر دو سرا کے واسطے
چار یار رہنما کے واسطے پیروان مصطفیٰ کے واسطے
مجھکو علم فقہ و دیں تو کر عطا اور توفیق عمل دے اے خدا

یا وہ چیز مانگی جو ہمیشہ اور دونوں جہان میں کام آوے۔ جیسا کہ اپنی ایک دعائیہ نظم مطبوعہ "الفقیہ" کے مقطع میں فرماتی ہیں۔

صالحہ پر رحم کر خیر البشر کے واسطے بخش وہ نعمت جو کام آئے سدا کے واسطے

اسلئے آپ کی شاعری میں غزل سرائی، قافیہ پیمائی، گل و بلبل کی حکایت، عشق و محبت کے افسانے، غم ہجر اور رنج فراق کی فرضی داستان کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔

افسوس یہ ہے کہ مرحومہ نے اس فن میں باضابطہ کسی بلند پایہ اور مستند شخص سے تلمذ حاصل نہ کیا، اور ایک کورِ دہ کی مستقل اقامت اور کثرت مشاغل کی وجہ سے زبان کی تدریجی ترقیوں سے مستفید ہونے کا ان کو موقع نہ ملا، تاہم بحیثیت مجموعی آپ کا کلام قدر کے لائق ہے۔ ذیل میں آپ کے ایک منظوم خط کا اقتباس درج ہے، جو مرحومہ نے اپنی بہو اور ممدوحہ صاحبزادی عائشہ بیگم کو تحریر فرمایا تھا، یہ خط طول و طویل ہے۔ تقریباً پچاس ساٹھ اشعار ہیں، اور ان تمام خصوصیات کا حامل جن کی طرف میں نے سرسری اشارہ کردیا ہے۔ خط کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:۔

مری عائشہ! ماں تری صالحہ ہے جو ہر درد میں صابرہ شاکرہ ہے،

پھر اپنے اس صبر و شکر کے دعوی کی دلیل مشاہدات کی روشنی میں پیش کرتی ہیں:۔

تن زار کی میرے تو دیکھ حالت نہ باقی ہے صحت، نہ باقی ہے طاقت
نہ تھا آسماں بوجھ اٹھانے کے قابل سب آفات سہنے کو آیا تھا یہ دل

اس کے بعد عالمانہ اور عارفانہ نصیحتیں شروع ہوتی ہیں:۔

بشر کو ہے لازم کہ ہمت نہ ہارے نہ خائف بلا سے ہو، سب بوجھ اٹھائے
نہ ہو بیقرار اور نہ ہرگز ہو مضطر کہ ہے صبر اور شکر ہر شے سے، بہتر
مصیبت حسینؓ اور نبیؐ نے اٹھائی کیا کربلا میں ادا شکر باری
نہ ایوبؑ و یعقوبؑ سے ہم ہیں بڑھکر کہ ہم چین لیں اور بلا آئے ان پر

بتا تُو نے کیا بیقراری سے پایا　　وہی ہو رہا ہے جو منظورِ رب تھا

اُس کے بعد یہ چند شعر ملاحظہ ہوں جو درد و اثر سے لبریز ہیں، اور جد و جہدِ زندگی میں جوشِ عمل پیدا کرنے کیلئے ایک تازیانہ۔

دیا حق کے لیے ہی صبر و شکر اور ہمت　　جو ہے کام، تو ہیچ ہیں ساری کلفت
رہی جب نہ راحت تو غم کب رہیگا　　ہر اک شے ہے فانی وہی رب رہیگا

پھر روزانہ کے معمولی واقعات سے خداوند عالم کی رحمتِ بیکراں پر استدلال کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ تم ایک دفعہ اس درجہ بیمار ہوگئی تھیں کہ تمہاری زندگی کی کسی کو امید نہ تھی، تمہارے عزیزوا قراں میں کوئی بھی تمہاری مصیبت اور تکلیف میں کام نہ آسکتا تھا خود میں بھی مجبور اور بے بس تھی اور دعا کے سوا کچھ اختیار نہ تھا۔ مگر :-

سُنی جب خدا نے مری آہ و زاری　　یکایک ہوا تم پہ پھر فضلِ باری
کبھی دل میں میمونہ کے درد بھر کر　　ہوا خود تمہارا معین اور یاور
کبھی مہرباں کرکے خالہ کو بھیجا　　کسی حال میں بھی نہ وہ تمکو بھولا

اس تمہید کے بعد اصل مطلب بیان کرتی ہیں :-

بھلا جس نے مُردے سے زندہ بنایا　　وہ کیا پھر خبر اب نہیں لینے والا
نہ ناشکری کا ایک فقرہ نکالو　　نہ ہو کر کے مایوس اپنے کو، کوسو
یہ قدرت کا ہر دم تماشا رہا ہے　　خدا بیکسی میں دکھائی دیا ہے
سنی جس نے آہ و بکا سب ہماری　　ہے دریا کرم کا ابھی اُس کے جاری

شعر کیا ہے ایک زخمی دل کے لیئے مرہم، ایک مضطرب اور بے قرار کے لیئے وجہ سکون، اور ایک پریشان حال اور از خود رفتہ کے لیئے سہارا ہے ــــ خاتمہ کے اشعار نہایت پر لطف اور نازک جذبات کے حامل ہیں :-

مجبر ہے یہاں جلد ہی تم ہو آتی　　خوشی سے ہوں میں اپنے پھولے سماتی
بر آئے ہماری یہ امید یا رب!　　کوئی ایسی پیدا ہو تمہید یا رب
مری عائشہ جلد سسرے میں آئے　　مجھے اپنی صورت وہ آکر دکھائے
ہے دیوار و در کو یہی انتظاری　　کہ آجائے جلد عائشہ وہ ہماری

ہر اک کو سلام اور دعا میری کہدو
بس اب ضعف روکتی ہو قلم کو

مرحومہ کا ایک دوسرا خط جو انتقال سے ایک ماہ قبل مرحومہ نے اپنی دوسری لڑکی خدیجہ بیگم زوجہ مولوی سید الطاف کریم - ایم - اے کو لکھا تھا، کچھ اشعار اُس کے بھی ملاحظہ ہوں :-

مری پیاری بیٹی کو میری دُعا　　رکھے خوش ہمیشہ اُسے کبریا
کروں اُس کے جذبات کا کیا بیاں　　کہ منظوم خط اُس نے بھیجا یہاں
تمہارا یہ خط ہے محبت بھرا　　کہ ہے میرے امراض کی اِک دوا
مری پیاری بیٹی خدیجہ مری　　ہیں پیشِ نظر سب سعادت تیری
عجب حوصلے والا دل ہے ترا　　تو رکھتی ہے ہر اک کی خاطر سدا
اِدھر اپنی بہنوں پہ ہے تو فدا　　اُدھر میری دلجوئی مقصد ترا

یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ یہ مرحومہ کے ذاتی اور نجی خطوط ہیں جو انہوں نے محض بے تکلفانہ اور قلم برداشتہ اپنی بچیوں کو لکھے، ان کے متعلق مرحومہ کو شاید وہم و گمان بھی نہ ہوگا کہ یہ چیزیں ایک دن شایع ہو کر منظر عام پر آئیں گی، اسلئے ان

آثارِ عتیقہ

قلعۂ رُہتاس

از مولانا حافظ سید محمد عبد الرؤف صاحب ندوی، اورنگ آبادی

چند ماہ گذرے کہ میں دفتر ندیم میں بیٹھا تھا، اثنائے گفتگو میں اعز الاحباب عالیجناب مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی، دام مجدہٗ مدیر ندیم گیا نے قلعہ رہتاس پر ایک مکمل مضمون لکھنے کی فرمائش کی، میں نے اس خدمت کا بیڑا اٹھایا، یہ حسنِ اتفاق تھا کہ نومبر ۳۵ء میں ایک جماعت قلعہ مذکور کی سیر کو اورنگ آباد سے گئی ہوئی تھی جس میں قابل ذکر اصحاب مولوی فصیح الدین صاحب منجی ریونیو آفیسر سرائے کیلا اسٹیٹ اور مولوی محمد یوسف صاحب بلخی ایم اے انگلش ٹیچر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ تھے اور راقم الحروف بھی رفیقِ سفر تھا، اُسی موقع پر اس موضوع کے قیمتی معلومات اور مواد حاصل ہو چکے تھے اور محترم دوست کی فرمائش کو پورا کرنا راقم سطور کے لئے اب آسان تھا، چنانچہ اب اضافۂ مزید کے بعد ذیل کا مضمون ہدیۂ ناظرین ہے۔ امید ہے کہ آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اس تاریخی و ادبی مضمون سے لطف اٹھائیں گے ——— "عبد الرف"

خاک پاک بہار کے عہدِ عتیق کی زندہ یادگار، اور آثار سلف کی بے نظیر مثال قلعہ رہتاس ہے۔ اس پیر کہن سال نے اپنی طویل مدتِ عمر میں کتنے انقلاب دیکھے، کوئی تاریخ صحیح طور پر نہیں بتا سکتی ہے۔ اگر ایک طرف اُس نے ہند قدیم کے راجگان اولو العزم کے نقش و نگار دیکھے تو دوسری طرف شاہان افاغنہ و مغل کے جاہ و جلال و شان و شکوہ دیکھے۔ قلعہ مذکور آثار قدیمہ کا ایک گہوارہ ہے جس کے ہر ہر ذرہ میں راجگان ہند اور شاہان ایران و ہندوستان کی داستانیں گم ہیں۔ آثار قلعہ سے کتنے سر بفلک قایم اور کتنے سر بزمین مسجود کتنے موجود کتنے مفقود ہیں۔ غرضکہ آثار نہیں عبرت کے مرقع ہیں جو بزبان حال فاعتبروا یا اولی الابصار پڑھ رہے ہیں۔

تاجداران ہند قدیم اور شاہان عجم سے جو وابستگی رہی ہے اُس کو قلعہ رہتاس کی تاریخ مرتب کرنے والا کسی طور پر قلم انداز نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں اسلیئے اس حصہ کو حذف کر کے ابتداً یہ کہہ سکتے ہیں کہ:-

قلعۂ رہتاس کا بانی

شاہ ہند شنکل کے فرزند رشید راجہ رہت[1] نے قلعہ رہتاس کی بنا ڈالی ہے۔ اس کی حکومت مالدہ تک پھیلی ہوئی تھی، چنانچہ فرشتہ تحریر کرتا ہے کہ

راجہ بود عابد و نیک اندیش و خوش خلق حاصل ممالک خود را | ترجمہ:- رہت عبادت گذار نیک خلق راجہ تھا۔ اُس کی حکومت گڈھ[2]

---

[1] رہتاس گڈھ پر مستقل ایک کتاب چند ورق کی بزبان انگریزی Description of Extract Rohtas garh یعنی بیان رہتاس گڈھ مارٹن صاحب کی پائی جاتی ہے جس میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ شہزادہ رہتاسو کے نام سے نسبت رکھتا ہے۔ اور رہتاسو مشہور ہند خاندان سورج بنسی کے راجہ ہریشچندر ...... کا فرزند تھا۔ اور اسی تحقیق کو مولوی ابو محمد مصلح صاحب سہسرامی نے تاریخ سہسرام کے حصہ قلعہ رہتاس میں بر زور طریق پر غالباً اضافہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مارٹن صاحب نے کسی تاریخ کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ جو کچھ لکھا ہے مشہور عام کی بنا پر لکھا ہے۔ کیونکہ قلعہ مذکور کی بنا اور اُسکے بانی کی بابت ہندؤں کی مشہور کتاب مہا بھارت اور راماین خاموش ہیں بے شبہ ہندؤں کی ان کتابوں میں سورج بنسی خاندان کے راجہ ہریشچندر اور اُس کے فرزند رہتاسو کی وہ مشہور داستان کہ وشوامتر رشی نے راجہ کے کسی ایک نامعلوم جرم کی سزا یوں دی کہ بیوی اور بیٹے رہت کے برہمن کے ہاتھ فروخت کرے۔ اور نیز ہریشچندر نے خود کو بنارس کے ڈوم کے ہاتھ فروخت کیا۔ اور مزید داستان اسی سلسلہ کی شاخ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رہت کے اسمی مشارکت سے لوگوں کو دھوکہ ہوا ہے۔

[2] گڈھ سے مراد یہی رہتاس گڈھ ہو جس پر قلعہ مذکور تعمیر ہوا۔ اور نیز اس عبارت سے ظاہر ہے کہ رہت کی راجدھانی رہتاس گڈھ قرار پائی تھی۔

از گدھے تا سرحد مالوہ بود - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - -

- - - - - - - - - -

- - - - - - - - - -

. . . . و راجہ رہت نیز کہ قلعہ رہتاس بنا کرد و بتخانہ عظیم ساختہ در آنجا مشغول طاعت می شود از و برگشت و رہت بعد از انکہ ہشتاد و یک سال حکومت کرد درگذشت "

مالوہ تک پھیلی ہوئی تھی، اُس نے اپنے ملک و سلطنت کی آمدنی کو تین حصوں پر تقسیم کیا تھا - تیسرا خیر خیرات کے لئے - دوسرا اپنے اپسر شنکل کے خرچ اخراجات اور نیز افراسیاب کی نذر و باجگذاری کے لئے، اور ایک حصہ لشکر اور اُس کے جانوروں کے مصارف کیلئے مقرر کئے تھے۔ اسی باعث اُس کے لشکر کم ہو گئے اور راجہ مالوہ نے جو اُس کا حکمبردار تھا الگ ہو کر باغی ہو کر گوالیار کے قلعہ کو اُنکے گماشتوں کے دستِ تصرف سے نکال لیا۔ راجہ رہت جس نے قلعہ رہتاس کی بنا ڈالی تھی اور ایک بتخانہ عظیم تیار کرایا تھا - جس میں ہمیشہ مشغول عبادت رہا کرتا تھا - وہ بھی افراسیاب کی اطاعت سے پھر گیا اور اکاسی سال حکومت کرکے دنیا سے رخصت ہو گیا۔

قلعۂ رہتاس کا سنہ تعمیر اور مدتِ تعمیر

حقیقت تو یہ ہے کہ قلعۂ مذکور کی تاسیسِ تعمیر کی صحیح تاریخ بتانے سے ہند و عجم کی تاریخیں خاموش ہیں کیونکہ رائج الوقت سنین و تاریخ کی تخلیق و ترویج سے قلعۂ مذکور کا وجود قدیم ہے - تفحص و تجسس مزید کے بعد دور اور قرن بتائے جا سکتے ہیں - چنانچہ حکمائے ہنود کے تعین کردہ دور سے رہت کا زمانہ ست یگ[1] کہا جا سکتا ہے - علاوہ ازیں شنکل کو شاہانِ عجم افراسیاب اور بہرام گور کا معاصر بتایا جا سکتا ہے - اگر شنکل کو بربنائے تحقیقِ فرشتہ افراسیاب کا ہمعصر تسلیم کیا جائے تو افراسیاب سلسلہ شدادیان اور بناکر فریدوں سے ہے - جس کا زمانہ میلادِ مسیحی سے تقریباً ۱۲ سو سال پیشتر کہا جاتا ہے[2] اور اگر شنکل کو بربنائے تحقیقِ فردوسی بہرام گور کا معاصر مان لیا جائے تو بہرام گور سلسلۂ[3] ساسانیان یا سلسلۂ کیان[4] سے بتایا جاتا ہے - جس کے تخت نشینی کا زمانہ سنہ ۲۰۰ (ق م) یعنی قبل میلادِ مسیحی ہے[5] - بنا بریں قلعہ مذکور کو عالم وجود میں آئے ہوئے تقریباً تین ہزار ڈھائی سو سال ہوئے ہیں - ——— جب سنہ تعمیر نامعلوم اور نامحدود ہے تو مدتِ تعمیر کی بابت تو کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے - مگر عبارت مذکور سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ رہت کی مدت حکومت اکاسی سال ہے - لہذا اگر قلعہ اور قلعہ کے آثار باقیہ کی عظمت و شان اور استحکام و پائداری پر نظر ڈالتے ہوئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تعمیر کی مدت حکومت کی مدت کے قریب قریب برابر ہو گی۔

قلعۂ رہتاس عہدِ اسلام میں

راجگانِ ہند کے عہد میں قلعہ کو جو مرکزیت حاصل تھی اُس کو شاہانِ اسلام نے باقی ہی نہ رکھا بلکہ اُس کے نظم و نسق میں سلیقہ و ضابطہ کے ساتھ اصلاحیں کئے، اور خاص قلعہ پر وہ شہری آرائش و نمائش پیدا کی جس سے وہ مشہورِ عالم اور منتخبِ روزگار بن گیا - ———

چنانچہ حاکم قلعہ بنام قلعہ دار اور دار وغہ قلعہ مقرر کیا اور اس کی ماتحتی میں دیوان دیا اور دیوان قلعہ کے ماتحت گماشتے رکھے جس کی نگرانی میں پرگنات تمکرائن[6] اور سہسرام کتنبہ سے بنارس تک اور پرگنات جونرود، منگرور و ملوتھو و اکبر پور و سوجا و بجے گڈھ پھیلا ہوتے مقامات مذکورہ کا صدر مقام اور دار الحکومت یہی قلعہ رہتاس ہوتا اور قلعہ دار پرگنات مذکور کا حاکم ہوتا جہاں سے فوجداری و دیوانی دونوں قسم[7] کی احکام

---

[1] تخلیق عالم کا عہد اولی از مہابھارت ورامائن بحوالہ تحقیق فرشتہ [2] تاریخ ایران اقبال فارسی - [3] از تاریخ ایران - [4] از روئے تحقیق شاہنامہ فردوسی - [5] تاریخ ایران اقبال - [6] قصبہ اکبر پور کے باہر قلعہ رہتاس کے دامن میں شاہجہانی عہد کے قلعہ دار اور فوجدار ملک وصل فرزند نواب اخلاص خاں کے مقبرہ کے کتبہ سے اس حقیقت پر پوری روشنی پڑتی ہے - [7] اُس عہد مسعود کے فیصلے اور احکام ہنوز بعض پرانی ریاستوں یا قدیم گھرانوں میں پائے جاتے ہیں - چنانچہ سنہ گذشتہ میں جمال الدین افغانی حاکم قلعہ کا ایک فیصلہ دیو اسٹیٹ اور نگ آباد کی بڑی رانی کیطرف سے اسٹیٹ مذکور کے ناقابل تقسیم ہونے کے دعویٰ میں مولوی فصیح الدین صاحب ملجی عظیم آبادی نے عدالت عالیہ بہار میں پیش کیا ہے - [8] ندیم :- محترم مقالہ نگار نے قلعہ رہتاس پر معلومات سے لبریز مقالہ لکھا ہے - ہمارا خیال ہے کہ قلعہ رہتاس کے متعلق مشکل سے کوئی چیز ایسی ہو گی جس کے اشارات اس مقالہ میں نہ آ گئے ہوں لیکن دلی افسوس ہے کہ ہم اس کو قصد کے باوجود تمام و کمال اس نمبر میں شایع کرنے سے قاصر رہے - اور درمیانی حصوں کو حذف کرکے آخری حصہ جو خاص تاریخ عتیقہ سے تعلق رکھتا ہے اس کو اس نمبر میں جگہ دیگئی ہے - مضمون کے بقیہ حصے ندیم کے آئندہ نمبر میں ناظرین کی نظر سے گذریں گے - مباحث کا اندازہ لگانے کیلئے مقالہ کے دیگر عنوانات جس کے مباحث اثنا میں رہ گئے ہیں ذیل میں درج ہیں :- قلعہ رہتاس اور مورخین ہند - فرشتہ، آثار شرف، تاریخ ہند، آئین اکبری، نسخہ قلعہ رہتاس،

و فیصلے صادر ہوتے۔ جن پر نام سرکار رہتاس مہریں ثبت ہوتیں۔

مارٹن صاحب[۵۱] لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں اس قلعہ کے اندر ہمیشہ ایک قلعہ دار رہا جس کی ماتحتی میں ایک دیوان ہوتا۔ اور اُس کے انتظام میں چین پور، کیرا، موگرور، سرس[۵۲]، کمٹیا، ڈگل، چرکنگا، جیلا، بلوجا، جاپا گڑھ، اکبرپور، تلوٹھو، شہسرام وغیرہ تھے۔ علاوہ ازیں قلعہ دار عموماً ۴۰۰ سے ۵۰۰ تک اشخاص اپنی ذات کے لئے رکھتا تھا۔ جن کے عزل و نصب کا اُس کو پورا اختیار ہوتا تھا اور فوجی انتظامات دہ ہزاری عہدے رکھنے والوں کے ہاتھ میں ہوتے۔ اس منصب کی آخری یادگار کرامت خاں اور آخری دیوان کے گماشتہ کے نوشتہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دہ ہزاری جودہ ہزاری کے ماتحت ہوتے جو قلعہ ہی میں سکونت رکھتے تھے۔ اور اُن کے اہل و عیال اور دیگر وابستگان کے قیام کے لئے قلعہ کے اوپر مکانات ہوتے تھے۔ بہرکیف اُن کے متعلق توپخانہ و میگزین کا کام سپرد ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ قلعہ کی فوج کا کام بھی انجام دیتے۔ علاوہ ازیں دو رسالے اسلحے اور بندوق سے مسلح ہوتے۔ اور ہر رسالہ دو ہزار سپاہیوں پر مشتمل ہوتا۔ اُن کی تعیناتی قلعہ ہی پر ہوتی۔ اور وقت ضرورت کبھی اُن میں اضافے بھی ہوجاتے۔ اور باضابطہ طور مسلح فوج سے پہرہ بدلتا رہتا۔

مزید براں قلعہ دار کی[۵۳] قیام گاہ سے راج گھاٹ تک پُررونق بازار تھا۔ جس کی چھت پٹی ہوئی اور راستے پختہ و سنگین تھے۔ قرینہ سے دُوکانیں لگی ہوتیں اور کاریگران چابکدست اور صناع نازک خیال رہتے تھے۔ ضرورت کی چیزیں مہیا اور ہر جنس کی چیزیں ہر وقت وافر دستیاب ہوتی تھیں۔ متعدد مسجدیں اور ایک جامع مسجد اور مدرسہ بھی تھا۔ سپاہیاں متعلقہ قلعہ اور عملگان دفتر اور وابستگان منصبداران قلعہ اور بیشہ وروں سے قلعہ پر اچھا خاصہ شہر آباد تھا۔

قلعۂ رہتاس کی جغرافی حالت

بہار کی کمشنری پٹنہ میں شہر آرہ سے جنوب مغرب ۷۵ میل فاصلہ پر اور شیر شاہی سڑک (جو سون ایسٹ بنک اور ڈہری اون سون سے گذرتی ہے) سے جنوبی سمت کو ۲۰ میل کے فاصلہ پر بندھیاچل کے کوہستانی سلسلہ کی شاخ کیمور نامی پہاڑی کی بلندی پر قلعہ مذکور واقع ہے۔ بائیں طرف دریائے سون لہریں لے رہا ہے تو دائیں جانب پہاڑیاں اور بکثرت جھاڑیاں ہیں۔ محیط قلعہ[۵۴] ۲۲ میل اور فصیل قلعہ ۴ ۲ میل ہے جس میں دوہری سنگین مورچہ بندیاں ہیں۔ اُس کے چہار طرف چودہ گھاٹیاں ہیں۔ پائین قلعہ میں تین طرف شمال و جنوب و مغرب گھاٹیاں ہیں۔ آثار قلعہ مشرق سے مغرب تک تقریباً پانچ چھ میل اور شمال سے جنوب تک پانچ میل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بنابریں ۳۵ میل مربع میں پہاڑی کا ایک حصہ ختم ہوتا ہے۔ دوسرا عمیق و عریض حصہ جسے کریاری کھوہ کہتے ہیں، وہ سطح مرتفع کو جدا کرتا ہے۔ اور پھر اسی کریاری کھوہ کی ایک شاخ گلیاری کھوہ بھی اُس مرتفع سطح کو جانب غرب جدا کرتی ہے۔ اور وہ اپنی منتہی جنوبی اور اُس چٹان کے درمیان جو سون پر واقع ہے۔ ایک جزیرہ نما شکل کی پہاڑی کو چھوڑ کر تقریباً چار سو گز عریض چلی گئی ہے اور چٹان تک پہونچنے کے رستے گذرگاہیں استوار و محکم ہیں۔ چار بڑے بڑے پھاٹک ہیں، اور انہیں پھاٹکوں سے سطح بالائی تک رسائی باآسانی ہوسکتی ہے۔ استحکامات کے آثار فی الحال راج گھاٹ اور کٹھوتیا میں موجود ہیں۔ یہی جزیرہ نما اُس سطح مرتفع کو اکبرپور سے ملاتا ہے —— اس مرتفع سطح پر قلعہ کا جو حصہ واقع ہے وہ شکستہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حملہ آوروں کی مدافعت کے لئے ایک وسیع خندق تھی۔ ان آثار کو راجہ مان سنگھ[۵۵] نے سنہ ۱۵۹۷ء میں کچھ اور مستحکم کیا تھا جو بہترین استحکامات کے آثار ہیں۔ ان کی ساخت دو پھاٹکوں سے تمام ہوئی ہے۔ پہلا پھاٹک اُس جزیرہ نما شکل کے پہاڑ کی شمال کی طرف ۶۰ قدم کے فاصلہ پر راستوں اور شہر پناہوں سے علیحدہ ہے۔ یہ پھاٹک اور خندق دوہرے سنگین حصار اور قلعہ کی برجیوں سے مستحکم ہیں۔ یہ برجیاں پشت پہاڑی سے گذر کر تقریباً ۶۰ یا ۷۰ فیٹ ۴۰۰ گز لمبائی تک خندق سے اونچی ہیں۔ استحکامات کا دوسرا حصہ جزیرہ نما پہاڑی سے گزرتا ہوا شمال کی طرف چلا گیا ہے، اُن آثار سے آج صرف ایک

---

۵۱ کتاب مذکور بیان رہتاس گڈھ۔ ۵۲ اسی پرگنہ سرس کا مشہور قصبہ اورنگ آباد ہے۔
۵۳ مدرسہ و بازار کی بابت صراحۃً مارٹن صاحب نے تحریر کیا ہے اور دیگر حقیقتیں عنوانات بیان اور قرائن سے صاف ظاہر ہیں۔ ۵۴ ماخوذ از منتخب اللباب و آثار شرف۔
۵۵ بیان رہتاس گڈھ مارٹن صاحب۔

خوبصورت دروازہ دکھلا ہے جسے لال پتھروں کی مناسبت سے لال دروازہ کہا جاتا ہے[1]

قلعۂ رہتاس کی راہیں اور اُس کے آثار

قلعہ مذکور تک پہونچنے کی دو ہی راہیں معلوم ہیں۔ ایک اکبر پور[2] سے جس کو صدر راستہ کہا جا سکتا ہے دوسری کوٹا گھاٹی سہسرام سے۔ مگر یہ دوسری راہ دشوار اور خطرناک بتائی جاتی ہے۔ قلعہ کی سیر کے دلدادہ سیاحان عالم براہ ریلوے[3] اکبر پور پہونچتے ہیں اور اکبر پور سے قلعہ کے اوپر جاتے ہیں۔ قصبہ مذکور کے مغربی سمت کو قلعہ کے راستہ پر سنگیں حصار نظر آتے ہیں۔ جن کے پاس ہی ایک سنگین بڑی طویل باؤلی ہے اور نیز بڑے قطر کا چاہ پختہ اور سنگین چہار دیواری سے گھرا ہوا ایک مقبرہ ہے۔ جن کے اندر قناتی مسجدیں اور قبریں ہیں۔ بعض تعویذ مزار پر سنگیں حروف میں کچھ لکھے نظر آتے ہیں، اگر پڑھے نہیں جاتے ہیں۔ مقبرہ کی پیشانی پر مندرجہ ذیل طویل کتبہ مکتوب ہے۔ عبارتِ کتبہ:۔

"در عہد شاہجہاں بادشاہ غازی کہ حکومت قلعہ داری بمنصب سہ ہزاری و فوجداری از مکرا ٓن و پرگنہ سرس دکھٹبہ تا بنارس و جاگیر پرگنہ جوند و پرگنہ منگرو او تلوتھو و اکبر پور و بلونجا و[4] بجے گدھ و جپلا بہ نواب عالیمقدار، اخلاص خاں مقرر و متسلم بود اقل عباد اللہ ملک واصل کہ بہ منزلہ فرزند سرفراز بود داروغگی قلعہ رہتاس فوجداری دیہات و نواحی قلعہ مسلم بود، دریں ابنا رخویش نزدیکی برحمت حق پیوست، بنا بر آں توفیق حق بخاطر رسید کہ خانۂ آخرت در حین حیات صحن و عمارت چبوترہ مسجد چہار دیواری باؤلی و باغ طرف شمال و جنوب بنا کردہ شروع عمارت بتاریخ ۵ ربیع الآخر ۱۰۴۶ھ و بتاریخ .... رمضان المبارک ۱۰۴۷ھ مرتب شد"

یعنی شاہجہانی عہد میں ملک واصل خاں فرزند نواب اخلاص خاں سابق قلعہ دار و فوجدار علاقجات جو بعد وفات نواب مذکور خود داروغگی و فوجداری کے عہدہ پر سرفراز تھا۔ اُس نے زمانہ عہدہ داری میں اولاد کی وفات پر مقبرہ مذکور اور اُس کے متعلق عمارتیں تیار کرائی تھیں۔ اور یہ عمارتیں ایک سال پانچ مہینہ میں اختتام پذیر ہوئی تھیں۔ عمارات مندرجہ کے علاوہ ایک باغ کی طرف بھی اشارہ ہے مگر افسوس وہ دائمی خزاں کی نذر ہو گیا جس کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں کتبہ مندرجہ سے قلعۂ رہتاس کے انتظامی امور پر روشنی پڑتی ہے کہ ایک قلعہ دار یا داروغہ قلعہ عہدہ فوجداری علاقجات نامیدہ رکھتا تھا۔ علاقجات و پرگنات کی تصریح سے اُس کے حدود و وسعت کا پتہ چلتا ہے۔ کہ موجودہ ضلعوار حدود سے اُس کی وسعت تقریباً دوگونہ تھی۔ اس سے آگے بڑھ کر اُس راستہ پر آتے ہیں جو رہتاس پہاڑ کو گیا ہے۔ راستہ میں چونے کی قدرتی پہاڑیاں جابجا ملتی ہیں اور وہ جھاڑیوں سے ڈھکی و چھپی ہوئی ہیں۔ اسی کے بعد ہی وہ ڈھالو اٹیک کھیئے یا راستہ ملتا ہے جس میں شکستہ سیڑھیوں کے آثار بکثرت اور قدم قدم پر ملتے ہیں۔ اور نیز اس تنگ راستہ کے دونوں بازوؤں میں گھنے جنگل اور جھاڑیاں ہیں۔ اسی دشوار گذار راہ سے قلعہ کی بالائی سطح پر اس طرح پہونچتے ہیں کہ ہاتھ میں ڈنڈے لئے ٹیکتے ہوئے جابجا دم لیتے ہوئے۔ زاید از دو میل

---

[1] از تاریخ سہسرام مصنفہ ابو محمد مصلح سہسرامی Description of Extract Rohtas-gharh From Martins Eastern india Velum I

[2] اکبر پور سہسرام سب ڈویزن کا ایک بڑا گاؤں ہے جو دریائے سون پر واقع ہے۔ اور قلعۂ رہتاس کی ناہموار چٹانوں سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہے ـــــ راجہ مان سنگھ نے شہنشاہ اکبر کے نام پر بسایا ہے۔ یہاں کے مسلم باشندے اُسی عہد اکبری کے کسی منصب دار اور عہدہ دار سے تعلق رکھتے ہیں۔

[3] گرین کارڈ لائن پر ڈہری اون سون مشہور جنکشن ہے۔ وہاں سے لایٹ ریلوے رہتاس فورٹ کو گئی ہے۔ رہتاس فورٹ اسٹیشن زمین اکبر پور میں واقع ہے۔ شائقین قصبہ مذکور سے اشیاء خوردنی ہمراہ لے کر قلعہ کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ ـــــ اور اوپر ڈاک بنگلہ میں قیام کرتے ہیں جہاں آرام کے سامان مہیا ہوتے ہیں۔

[4] سلاطین تغلقیہ کے زمانہ میں اور اُس کے بعد بھی فرمانروا اکثر ملک سے خطاب کئے جاتے تھے، بنا بریں یہ ایک عہدہ ہے نہ قومیت۔

سنگ لاخ مسافت[۵۱] طے کر کے قلعہ کے حصار سنگین اور اس دروازہ تک پہونچتے ہیں جہاں سے تقریباً دو میل پرے سمت مشرق اکبری قلعہ اور محل شاہی کی پُر شکوہ عمارتیں نظر آتی ہیں - اس دروازہ سے جو راستہ قلعہ مذکور کو گیا ہے، اس میں جا بجا جھاڑیاں اور عالیشان کہنہ درخت، تالاب، نہریں، رواں چشمے، بستیاں آبادیاں ملتی ہیں اور اسی راہ کے دائیں بائیں قلعہ کے آثار باقیہ پھیلے ہوئے ہیں -

قلعے کے آثار صنادید

آثار باقیہ پر نظر ڈالنے سے ہمیں ہر عہد کی ایک دو یادگاریں نظر آتی ہیں - چنانچہ تفحص مزید کے بعد بعنوانات مختلفہ چند یادگاریں ذیل میں درج کی جاتی ہیں :-

(عہد ہنود)

مذکورہ بالا جزیرہ نما کے شمال و مشرق گوشہ میں ایک پہاڑی پر خوشنما عمارت ہے جو چوراسی سیڑھی کی عمارت کے نام سے مشہور ہے - ۸۴ زینوں کو طے کرنے کے بعد اس عمارت تک رسائی ہوتی ہے - حقیقت میں یہ دو مندر ہیں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں - عمارت کی ساخت ستون دار کمروں پر مشتمل ہے - جس پر پانچ قبے ہیں - ان میں سے ایک مندر میں راجہ روہتت کے اور دوسرے میں اس کے باپ راجہ شنکل کے مجسمے بصورت مورتیاں نصب تھے - جس کے متعلق مہربان جناب مارٹن صاحب کتاب مذکور میں تحریر کرتے ہیں کہ روہتاسوا کے مندر کی پرستش عہد عالمگیری تک تھی، جن کی مورتیوں اور بتوں کو عالمگیر کے دست استبداد نے فنا کر دیا ——— باایں ہمہ چند شکلیں اور تصویریں اس میں نظر آتی ہیں - بیچ چھت میں کنَیش کی اور اس کے اوپر چند نامعلوم پرندوں کی شکلیں ہیں جو ہنس وغیرہ سے مشابہت کچھ رکھتی ہیں، اور پھر انہیں شکلوں کے پایئں میں دونوں بازوؤں پر دو شمشیر بکف انسان کی شبیہ ہے ——— اور نیز مہربان مذکور لکھتے ہیں کہ مندروں کے عقب پر ایک عالمگیری مسجد تھی جس کے آثار شکستہ کچھ باقی ہیں ———

چوراسی سیڑھیوں کی پیمائشی حساب یہ ہے کہ ہر ایک زینہ آٹھ انچ اونچا اور دس انچ چوڑا - اور دس فیٹ لمبا ہے - اور نیز زینوں کی ہیئت و نوعیت سے ظاہر ہے کہ یہ زینے راجہ مان سنگھ کے پہلے کے نہ ہونگے -

اسی چوراسی سیڑھی والی عمارت کے مقابل پہاڑی مذکور کے نیچے ایک کھلا ہوا ہشت پہل ستون دار کمرہ ہے جس پر نصف کرہ کا قبہ ہے - راجہ مان سنگھ کا بنایا ہوا مندر ہے - اس میں بھی مورتی موجود نہیں ہے - اور صاحب مہربان نے اس کی بابت بھی حضرت عالمگیر[۵۲] رحمتہ اللہ علیہ کو اسی طرح بدنام کیا ہے -

اسی جزیرہ نما پر مندر مذکور کے قریب ہی ناہموار پتھروں کی لاٹھ جو چوبیس[۲۴] فیٹ بلند نظر آتی ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ روہتاسوا کے عہد کی کوئی یادگار مندر مذکور کے علاوہ ہو سکتی ہے تو یہی پتھروں کے سربلند تودے ہو سکتے ہیں - علاوہ ازیں قلعہ کی عمارت سے دو میل فاصلہ پر شمالی جہت کو لال دروازہ ہے جس پر سنہ ۱۲۲۳ء کا کتبہ ہے، جس پر پرتاب[۵۳] دھولا سردار قوم

---

[۵۱] قلعے کے اس سمت کا حصہ بہت بلند ہے - اس کی اونچائی کی بابت فرشتہ نے زاید ایک کروہ لکھا ہے اور دوسروں نے دو کروہ اور نیز نا اندازہ دو کروہ تحریر کیا ہے - اگر کم از کم دو میل مسافت مان لیجائے تو از روئے حساب دس ہزار پانسو ساٹھ فیٹ اس کی بلندی ہوتی ہے - [۵۲] مغربی حکمرانوں نے ابتدا حکمرانی سے جس حکمت عملیوں کو عمل میں لایا ہے اس کا اقتضا یہی ہے کہ شاہان اسلام کو عموماً اور اعلیٰحضرت اورنگ زیب عالمگیر نور اللہ مرقدہ کو خصوصاً بدنام کیا جائے - ان جیسے الزامات کے خلاف ایک نہیں بیسیوں محققانہ مضامین نکل چکے ہیں اس لئے اس پر مزید قلم فرسائی کی ضرورت نہیں ہے - حق تو یہ ہے کہ ہندو دنیا اور ان کے شعار کے ساتھ شاہ ممدوح نے جو شاہانہ الطاف و نوازش مبذول رکھی اگر وہ فیاضیاں شعار اسلام کے ساتھ مبذول ہوتیں تو آج اسلامیان ہند ان کے نام پر فاتحہ خوانی اور عرس کرتے - ہمارے ضلع گیا میں بودھ مندر میں شاہ ممدوح نے تقریباً پانچ لاکھ آمدنی کی جائداد التمغادی تھی جو آج تک باقی ہے (ندیم: اس فرمان کا عکس اسی نمبر میں ملاحظہ فرمائیں) ——— اسی طرح پر دیگر مقامات میں بھی اس کے اثرات بکثرت ملتے ہیں - ——— بنا بریں مارٹن صاحب کے یہ الزامات بے بنیاد اور سراسر غلط ہیں - حقیقت یہ ہے کہ قلعہ روہتاس کے مندر اور ان کے نصب کردہ بت جنرل گارڈ صاحب کے ہاتھوں برباد ہوئے، کیونکہ جنرل مذکور کا دور تخریبی دور تھا بیسوں آثار نیست و نابود کر دیئے گئے ہیں - اس کا اقرار خود جناب مارٹن صاحب کو بھی ہے - اندریں صورت ملزم کون ہے، انصاف فرمائیں -

[۵۳] کہروار ایک جنگلی مگر قدیم العہد قوم ہے جو سورج بنسی ہونے کی مدعی ہے اور وہ اپنے کو راجہ روہت اور اس کے پدر سے منسوب کرتی ہے - اسی قوم کا ایک سردار پرتاب سنگھ دھولا ہوا ہے جس کا آبائی اور قدیمی مسکن روہتاس بتایا جاتا ہے - علاقہ جات قلعہ کا حاکم مطلق تھا -

کہروار کے جانشین وارث کا نام مذکور ہے۔

اور مختلف مقام پر تین تالاب نظر آتے ہیں جو راجگان قلعہ راجہ بین[1]، راجہ گور، راجہ چندر بھان کی طرف منسوب اور انہیں کے نام سے موسوم ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہر سہ راجہ ایک ہی برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شیر شاہ نے قلعۂ رہتاس کو راجہ چندر بھان سے حاصل کیا، مگر اس کی تغلیط اس کتبہ سے ہو جاتی جو ہند وگھاٹ پر ہے۔

عہد افاغنہ

جزیرہ نما پر لال دروازہ سے دو میل فاصلہ پر ایک طرف شاندار اور استوار مسجد ہے جو جامع شیر شاہی کے نام سے مشہور عام ہے، جس پر قبے و گنبد چند ہیں، اُس کی ساخت عظیم آباد[2] کے جامع مسجد شیر شاہی سے مماثلت رکھتی ہے۔

اس کے متعلق مارٹن صاحب لکھتے ہیں جامع مسجد شیر شاہی جو عالمگیری مسجد کے نام سے مشہور انام ہوئی ہے، اسکو ہیبت خاں کا[3] کتبہ جو فارسی میں کندہ ہے اُس کی تغلیط کرتا ہے۔ کتبہ ۹۵۲ھ کا ہے۔ مسجد کے اندر امام کا حجرہ بھی ہے۔ فصیل قلعہ کا وہ حصہ جو مغربی سمت کو ہے اُس کو شیر شاہ نے غلام حسنی داروغہ قلعہ اور ناظر تعمیرات کی نگرانی میں تعمیر کرایا تھا یہی داروغہ جب قلعہ کا حاکم بنایا گیا ہے تو اسی نے مدرسہ و مسجد تعمیر کرایا جن کا اب نام و نشان نہیں ہے۔

عہد مغل

(مسجد حبش خاں)

حبش خاں امرائے عساکر[4] سے تھا، محب علی خاں قلعہ دار رہتاس کے ہمراہ باغیوں کے مقابلہ میں شریک جنگ تھا۔ چنانچہ جنگ بکسر میں شہنشاہ اکبر کے عہد میں ۹۸۰ھ میں شہید ہوا۔ لاشہ جنگ گاہ سے قلعہ کے اوپر لایا گیا۔ اور اسکی بنائی ہوئی مسجد میں دفن کیا گیا۔ یہ عمارت درحقیقت مسجد ہے جس میں بانی مسجد کا مزار بھی ہے۔ اسی مناسبت اُس کو مقبرہ اور روضہ حبش خاں مشہور کیا گیا اور مورخین[5] نے بھی روضہ کے عنوان سے اس کو بیان کیا ہے۔ مسجد مذکور کو حبش خاں نے حیات ہی میں محب علی خاں کی قلعہ داری کے زمانہ میں ۹۷۶ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کی ساخت حبش خاں سور پدر شیر خاں کے روضہ سہسرام سے پوری مشابہت و مماثلت رکھتی ہے۔ مندرجہ ذیل تاریخ مسجد مذکور پر کندہ ہے۔

اکبر غازی آن کہ از رفعت — می کند رخش او بگردوں سیر
در زمانہ چنیں شہنشا ہے، — کہ بفرمان اوست وحش و طیر
بود در خاطر ایں حبش خاں را — کہ کند مسجد از برائے خیر
سال تاریخ مسجد عالی، — شد ز روئے حساب بقبہ خیر

در تاریخ شہر المرجب ۹۸۶ھ۔

عہد اکبری میں قلعہ پر سب سے پہلے جو عمارت تعمیر ہوئی ہے وہ یہی مسجد حبش خاں اور مقبرہ ساقی خاں ہے۔ کیونکہ ۹۸۳ھ میں قبضہ ہوا اور ۹۸۶ھ میں مسجد مذکور تعمیر ہوئی ہے۔

---

[1] راجگان مذکور کی بابت مارٹن صاحب نے تحریر کیا ہے کہ ان کا عہد ۱۰۰۰ء و ۱۱۰۰ء میں تھا اور یہ مالکان قلعۂ رہتاس سے گذرے ہیں۔

[2] پٹنہ سیٹی محلہ دھولپورہ میں مسجد شیر شاہی ہے جس کی محیر العقول صنعت یہ ہے کہ صحن مسجد اور اندرونی حصہ سے پانچ قبے معلوم ہوتے ہیں اور اوپر سے صرف تین معلوم ہوتے ہیں۔ (ندیم :- اس مسجد کا فوٹو اسی نمبر میں ملاحظہ ہو۔ افسوس کہ زلزلہ میں اس مسجد کو غیر معمولی نقصان پہنچا۔ مولوی محمد قاسم صاحب رئیس دھولپورہ اس کی مرمت و تعمیر جدید میں ہمہ تن مشغول ہیں۔ مسلمان اپنے عطایا سے اس کار خیر میں حصہ لیں اور اس تاریخی یادگار کو مٹنے سے بچالیں۔)

[3] مقابر و مساجد تقریباً کل جالیوں کے پردہ سے بنظر حفاظت اس طرح پر بند کر دی گئیں کہ اندر کی حالت دریافت کرنا مشکل ہے۔ اور ناظر محکمۂ آثار قدیمہ کی جانب سے مسدود دروازوں کے کھولنے کی سخت ممانعت ہے۔ بنابریں اندرونی کیفیت دریافت نہ کیجا سکی اور نہ کتبہ مندرجہ نقل کیا جا سکا۔ کتبہ مذکور اندرونی سمت کوشہ (؟) پر مکتوبہ ہے۔

[4] ماثر الامرا جلد اول

[5] مارٹن صاحب نے اور انہیں صاحب کی پیروی میں مولوی ابو محمد مصلح صاحب نے تاریخ سہسرام میں روضہ حبش خان لکھا ہے اور حبش خاں کی بابت مارٹن صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اوس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیر شاہ کے عہد میں ایک حبشی غلام تھا جو داروغہ قلعہ تھا جس کی نظارت و نگرانی میں قلعہ کی فصیل کا بعض حصہ تعمیر ہوا ہے۔ اور اس کے بعد وہ قلعہ کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اور مدرسہ و مسجد بنوایا۔ جس میں اُس کا مزار ہے اور اُس کے مقبرہ و روضہ کی ساخت حسن خاں سور کے روضہ سے پوری مشابہت رکھتی ہے۔ حالانکہ یہ حبش خاں وہ غلام حبشی نہیں ہے۔

مقبرہ ساقی خاں

اسی سنہ میں ساقی خاں جو امرا اعساکر سے تھا اُس کا روضہ بھی تعمیر ہوا ہے جس کا کتبہ بمشکل نقل اور مرتب کیا گیا ہے۔ کتبہ مذکور حسب ذیل ہے :-[۵]

فغاں از گردشِ چرخِ ستمگر　　کہ نبود با کسِ او را مہربانی
خلافِ ساقی سلطاں داشت در دل　　کہ گردد مفتخر با اسم خانی
قضارا آنچناں رنجور گردید　　کہ از صحت نبود او را نشانی
بادیکِ اجل آمد بگفتا　　سفر کن زود ازیں دنیائے فانی
بچشم از خرد تاریخِ فوتش　　بگفتا در بہشتِ جاودانی

۹۸۶ھ تاریخ برآمد ہوتی ہے

مقبرہ کی ساخت چار ستون پر ایک گنبد دار عمارت ہے۔ مقابل گنج شہیدان ہے۔ پیشانی مقبرہ پر معمولی پتھر نصب ہے۔ جس پر تاریخ مندرجہ تراشیدہ حروف میں منقوش ہے۔

مسجد خواجہ سرا

یہ ایک مختصر سی مسجد ہے جو گورستان کے بیچ میں واقع ہے۔ سنہ ۱۵۸۰ء میں تعمیر ہوئی تھی

نو تعمیر قلعہ اور اُس کی عمارتیں

قلعہ کے دروازہ سے دو میل سمت مغرب مسافت طے کرنے پر بلند پختہ چہار دیواریں ملتی ہیں۔ چہار دیواری کے وسیع صحن سے گذر کر ایک بڑے دروازہ سے محل کے بیرون صحن میں قدم رکھتے ہیں۔ یہ صحن غیر معمولی وسیع ہے۔ اس کے سہ طرف سر بفلک سنگین پھاٹک کھڑے ہیں اور شمال و مغرب گوشہ سے قوس کی شکل میں فوج کی بارکیں اور اصطبل کا سلسلہ شروع ہو کر جنوب و مغرب گوشہ پر ختم ہوتا ہے۔ افواج متعینہ کی قیام گاہ شاید یہی بارکیں ہیں۔ صحن کے جنوب و مغرب گوشہ پر محل کا وسیع اور سر بلند پھاٹک ہے جس کی محرابیں دوہری اور بہت بلند و کشادہ ہیں۔ اس کے دونوں بازو پر بیرونی سمت کو پیل سیاہ سنگین دیواروں میں بیٹھائے ہوئے ہیں۔ شاید اسی مناسبت سے اس کو ہتھیا پول کہتے ہیں سمت جنوبی کی محراب جو اندرون صحن کی طرف نمایاں ہے۔ اُس پر سنگ سرخ کی لوح چسپاں ہے جس پر بخطِ ریحانی جلی حروف میں یہ عبارت اور قطع فارسی کندہ ہے۔

ایں تاریخ در زمان سلطان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ

دروازۂ ہفتم بنائے جو شد تمام　　دروازہ سپہر زرشکش سقیم شد
سال عمارتش چوں نمودم بطبع گفت　　از راجہ مان سنگھ بنائے بقیم بکشد

تحریر فی التاریخ بست و ہفتم شہر رجب المرجب سنہ ہزار و پنج الف[۶]

پروہت سریر مہر داروغہ بل بقدر مار وار صنعت گر استاد مبارک فقط[۱] دوسری طرف شاید یہی مفہوم سنسکرت لغت میں مکتوب ہے۔

---

[۶] پنج الف ۶" یہ ایک معمہ ہی سا ہے، اس کے حل میں باخبر اصحاب مختلف الرائے ہیں۔ حضرت مولانا مولوی ابوالحسن خوشدل شہسرامی رحمۃ اللہ نے اس کا منشا اپنی بیاض کبیر میں تحریر فرمایا ہے کہ عمارت کی صرف مزدوری میں ساڑھے تین لاکھ روپے صرف ہوئے اور یہی حل صاحب تاریخ شہسرام حاشیہ ذیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ پنج الف ۶" یعنی ساڑھے تین لاکھ اس کی تعمیر میں خرچ ہوئے۔ ظاہر تو پنج الف کا یہی مطلب ہے

مجموعہ = ۷۰ × ۵۰۰ = ۳۵۰۰۰

واضح رہے کہ اخراجات کی یہ تفصیل صرف مزدوروں کی ہے

بعضوں کا خیال ہے کہ پروہت سرید پھر مذکور کا یہ اعزازی نشان ہے۔ ممکن ہے کہ یہی ہو۔

[۵] پورے مصرع سے تاریخ سنہ ۱۰۰۰ھ برآمد ہوتی ہے۔

عبارت مندرجہ سے ظاہر ہے کہ راجہ مان سنگھ[1] فرمانروائے بہار نے عہد اکبری میں اور اپنے دورِ حکومت سنہ ۱۰۰۰ھ میں استادانِ کامل کے ہاتھوں زرِ کثیر صرف کرکے اس محل کو تعمیر کرایا اور نیز اپنے مذہبی پیشوا سری بھر کے ہاتھوں شاید اس محل کی بنیاد رکھوائی ہو اور مل بھدر ماواز کی نگرانی میں اس عمارت کا کام تمام ہوا ہو۔ مارٹن صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اس کتبہ اور کٹھوتیہ گیٹ کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محل کی عمارتوں کے کام کامل دس سال میں ختم ہوئے۔

اس محراب و در سے ایک بڑے زمین دوز کمرے سے گذر کر بارہ دری تک راستہ گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہی مقام ناظم اعلیٰ کا دربار تھا۔ اسی مناسبت سے اس کو دیوان عام بھی کہتے ہیں۔ متفرق سر رشتے۔ امتیازی نشستیں، توشہ خانے، وہ کل چیزیں جو دربارِ عام کے لئے ہونی چاہئیں تقریباً سب موجود ہیں۔ اور ایک برآمدہ پوری لمبائی میں ہے —— اس پر اس ہولناک زلزلہ کا اثر ہے جو سنہ ۳۴ء میں واقع ہوا تھا کہ جابجا سنگین شہتیریں چٹخ گئی ہیں۔

اس نو تعمیر قلعہ کے محل دو بڑے حصوں میں ہیں، ایک بیرونی، دوسرے اندرونی۔ اور نیز اندرونی حصے چند حصوں میں تقسیم معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ مختلف صحن پائے جاتے ہیں۔ محل کے حصۂ بیرونی میں بارہ دری او تخت شاہی قابل دید اور لائق ذکر عمارت ہے۔ فرمانروائے سلطنت کی قیامگاہ بیرونی تخت شاہی کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ چہار منزلہ عمارت ہے۔ بالائی سطح پر جانے کے لئے دونوں بازوؤں پر چھت دار ٹھنڈی تنگ سیڑھیاں ہیں جو اوپر تک چلی گئی ہیں۔ اوپر پہونچکر راستہ متفرق دالان اور سائبان کی طرف نکل گیا ہے —— دالان و سائبان کے محراب و در اور ستون سب نقش و نگار سے مزین ہیں۔ اور اس کے بالائی حصہ پر خوشنما قبے اور گنبد ہیں، اور محل کے اندرونی حصوں میں لائق ذکر اور قابل دید عمارت شیش محل ہے، جو اندرونی حصوں کے وسط میں اور ایک پر فضا اور دلکشا باغ کے بیچ میں واقع ہے باغ کا طرز خاص تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایرانیوں کی وضع پر اس کو ترتیب دیا گیا تھا۔ اس لئے اس کو فارسی باغ سے نامزد کرتے ہیں۔ یہی وہ عمارت ہے جس میں رانی اپنی سہیلیوں کے ہمراہ قیام رکھتی تھی۔ اور نیز شاہان ہند اور فرمانروائے صوبہ کے قیام کے موقع پر بیگمات خاص کے ہمراہ قیام فرما ہوئی تھیں۔

اس کے بالاخانے سب پردہ دار ہیں، پردہ کا پورا لحاظ کیا گیا ہے۔ اس کے بالاخانے کی سیڑھیاں بھی چھت دار اور ٹھنڈی ہیں —— اس عمارت اور تخت شاہی کے بالائی حصوں کی سیر زیادہ پر لطف ہے۔

دوسری سمت تیسرے درجہ پر ایک قبہ دار کمرہ اور کھڑکی ہے جس سے حرم مذکور کی چھتیں نظر آتی ہیں اور محل کے سارے مناظر پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ اور بائیں میں دریائے سون کی لہریں، گھنے جنگلوں کی فضا اور صحرا و پہاڑ کا دلفریب نظارہ عجیب لطف پیدا کر رہا ہے۔ ایک سمت بالائی سطح پر ایک نازک اور حسین کمرہ برآمدہ جس کے ستون نقش و نگار سے مزین و مرصع ہیں —— محل کے حصۂ زیریں میں حمام خانے اور حوض پائے جاتے ہیں۔

اس نو تعمیر قلعہ کے بالائی حصوں میں سمت شمالی و مشرق جابجا بڑے بڑے سوراخ نظر آتے ہیں، جس کی بابت کہا جاتا ہے گولہ باری برق اندازی اور نیز تیر اندازی کے لئے یہ سوراخ بنائے گئے تھے اور ایسا ہی کچھ معلوم ہوتا ہے۔ مگر مارٹن صاحب لکھتے ہیں کہ ابو الفضل کا یہ کہنا کہ یہ سوراخ گولہ باری کے لئے ترتیب دئے گئے تھے غلط ہے، کیونکہ عہد اکبری تک توپ و گولہ کا استعمال ہرگز نہ تھا۔ ابو الفضل[2] نے خوشامدانہ یہ دل خوش کن باتیں لکھ دی ہیں۔

---

[1] مان سنگھ شرفائے قوم کچھوایہ راجپوت سے تھا اور بھگونت داس ولد بہارا مل کچھوایہ فرمانروائے جے پور کا لڑکا یا بھتیجا تھا۔ چونکہ بہارا مل اکبر بادشاہ کا اور بھگونت داس جہانگیر بادشاہ کا خسر تھا بنا بریں اس ازدواجی تعلق کے سبب مان سنگھ اکبری و جہانگیری عہد میں صوبہداری و سپہ سالاری کے عہدہ پر سرفراز رہا چنانچہ پہلے کابل کی مسند نظامت پر تھا۔ اس کے بعد سنہ ۱۵۸۸ء میں بہار آیا۔ قیام بہار میں اسے راجہ کا خطاب حاصل ہوا۔ اور دس سال اس قلعہ رہتاس پر قیام کرکے قابل توجہ یادگار عمارتیں چھوڑیں۔ یہاں سے بنگال روانہ ہوا اور عہد جہانگیری میں سنہ ۱۶۱۴ء میں وفات پائی۔

[2] صاحب مذکور نے ابو الفضل علامی کی تحریر کا حوالہ دیا ہے مگر کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا تعجب ہے۔ ممکن ہے کہ آئین اکبری کے دوسرے [illegible] ہو کیونکہ دفتر اول اور اکبر نامہ پیش نظر ہیں، ان میں کہیں نو تعمیر قلعہ یعنی محلات شاہی کا ذکر نہیں ہے۔

مجموعی حیثیت سے یہ نو تعمیر قلعہ اور اُس کے محل کی عمارتیں فنِ تعمیر کی نادر مثال ہیں اور بہار و بنگال میں شاہانِ مغلیہ کی یگانہ یادگار ہیں۔ چنانچہ [۵۰] مسٹر جوزف صاحب فرماتے ہیں کہ کوئی کلام نہیں کہ قلعہ رہتاس سے اچھی اچھی عمارتیں ہندوستان میں پائی جاتی ہیں۔ مگر بنگال و بہار میں مسلمانوں کی صنعت و عمارت کا نمونہ اس سے بہتر بتلایا نہیں جا سکتا ہے۔

قلعۂ مذکور کے بعض حصّوں پر قیامت خیز زلزلہ سنہ ۱۹۳۴ء کا اثر نمایاں ہے۔

ایک بزرگ کا حجرہ

قلعۂ مذکور سے [۵۱] دو میل فصل پر جزیرہ نما کی مغربی سمت کو ایک عمیق غار ہے جس کی گہرائی ہزاروں فیٹ ہوگی۔ اُس کے دہانہ پر خطرناک مگر پُر فضا مقام پر ایک حجرہ ہے جس میں بزرگ مرحوم کا مزار بھی ہے۔ نام نامی بہاءالحق رہتاسی زبان زدِ خلائق ہے۔ آپ کی بابت صرف اسی قدر مذکور [۵۲] ہے کہ جس وقت آپ قلعہ رہتاس پر تشریف لائے ہیں اور قیام کرنا چاہا ہے تو راجہ قلعہ نے تین بار دست و بازو باندھ کر غار میں پھینکا، لیکن ہر بار زندہ اوپر برآمد ہوئے، یہ زندہ کرامت دیکھ کر راجہ مذکور آپ کا بہت معتقد ہو گیا۔ اور تعرض سے باز آیا۔ مزید احوال شاہ عبد الرحیم [۵۳] فردوسی بودھن شاہی رحمۃ اللہ سابق سجادہ نشین درگاہ بودھن شاہی شہسرامی کے پشت نامہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ شیخ المشائخ [۵۴] حضرت مولانا شاہ فرید الدین المعروف شاہ بودھن دیوان قدس سرہٗ کے خسر تھے اور نیز آپ کے نبیرہ شاہ زاہد فردوسی رحمۃ اللہ کو بھی اُن کے اقربائے خاص سے نسبت مصاہرت حاصل تھی۔ چنانچہ عبارت پشت نامہ اس طور پر مسطور ہے کہ "زوجہ حضرت فرید الدین المعروف شاہ بودھن دیوان سلطانیہ بی بی بودند کہ دختر شیخ المشائخ حضرت بہوہ رہتاسی بودند۔ و شیخ بہوہ از بس نجیب و شریف بودند و فقیر و ہم رئیس قلعہ بودند۔

"شاہ محمد زاہد رحمۃ اللہ چہار زوجہ بودند، زوجہ ثالثہ دختر شیخ شاہ نور محمد کہ از شیخ بہوہ رہتاسی تعلق برادری خاص داشتند۔ بودند"

اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ شیخ رہتاسی اور دیوان صاحب ہمعصر ہیں اور دیوان صاحب نے سنہ ۱۰۰۰ھ میں تقریباً سو سال سے زائد کی

---

[۵۰] تاریخ صوبہ اڑیسہ و بہار صفحہ ۴۰۰ مصنفہ جناب سید اولاد حیدر صاحب فوق بلگرامی کواتھ۔ [۵۱] تاریخ صوبہ اڑیسہ و بہار مذکور و تاریخ سہسرام۔

[۵۲] آپ شہسرام کے درویش صفت رئیس تھے۔ علوم فارسیہ و صوفیہ اور تصوف کے ساتھ فنون لطیفہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور نیز بڑے جواد و سخی تھے۔ ساری جائداد فقرا و غربا کی نذر کر دی۔ بہرکیف بعد وفات آنجناب اور پسر اوسط شاہ غلام یحییٰ فردوسی جو مرید مجاز خاص تھے بار سجادگی نہ اٹھانے کی صورت میں آپ کے پسر اکبر شاہ غلام مخدوم صاحب قبلہ مدرس اوّل فارسی مدرسہ خانقاہ کبیریہ شہسرام صاحب سجادہ ہوئے اور تا حال ہیں۔ خدا انہیں فرائض سجادگی کے انجام دہی کی توفیق عطا کرے آمین

[۵۳] آپ کا وطن آبائی قصبہ روح نواح بہار ہے اور حسب ارشاد پیر آپ نے سہسرام میں اقامت اختیار کی۔ سلسلہ نسب بسند صحیح حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے۔ ارادتاً فردوسی تھے۔ حضرت مخدوم الملک بہاری کے بارگاہ قدس سے عقیدت تھی۔ حضرت ابو الخیر فردوسی دولت پوری رحمۃ اللہ سے بیعت حاصل کی مگر آپ کے مرشدان کامل اٹھارہ کی تعداد میں مختلف مقامات عجم و عرب کے ہیں۔ قادریہ، چشتیہ، فردوسیہ، مداریہ، ہر چہار سلسلہ میں مجاز تھے۔ اور خود سلسلہ بودھن شاہی کے بانی ہیں۔ علوم شرعیہ سے فراغت کر کے معرفت و عرفان کے طلب و حصول میں عجم و عرب کے مشاہیر اور سرآمد روزگار درویشوں کی خدمت میں پہونچے ہیں۔ اور پیادہ پا حج کئے اور سارے عالم اسلام کی سیر کی ہے۔ رفیقان سفر میں حضرت شاہ ارزاں و میر ہاشم چلیار ضرب و شاہ کرامت اولیا و شاہ نعمت مکدسی اور شاہ مومن حب و میر سید گوشا یئم و شاہ شمس الحق دیولان کے نام نامی آئے ہیں۔ آپ کی کرامت و مناقب میں ایک دفتر سیاہ ہے۔ غرضکہ آپ جامع شریعت و طریقت ایک مجاہد بزرگ تھے۔ آپ کے مبارک عہد میں نام آور شاہان افاغنہ و مغل تھے۔ ہر ایک بذات خود اور اُن کے امرا و عملگان آپ کے ساتھ حسن ظن رکھتے تھے مگر آپ کی قانع طبیعت نے اُنکی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ بالآخر اسلام شاہ المعروف سلیم شاہ اور اُس کے فرزندان عالیجاہ جو مریدانہ عقیدت رکھتے تھے خاص جاگیریں اور جائدادیں نذر کیں جن کے آثار باقیہ تا حال ہیں۔ آپ کے ابنا میں سے شاہ محمد خلیل دیوان سجادہ نشین اور شاہ کبیر الدین سجادہ نشین بلند اقبال اور خوش طالع بزرگ گذرے ہیں کہ ایک طرف شاہ محمد خلیل سجادہ نشین درگاہ بودھن شاہی کے شاہ عالم ثانی اور اُس کی دختر و عملگان مرید ہوئے اور کثیر آمدنی کی جاگیریں بہ نیاز درگاہ اور اخراجات اہل و عیال کے لئے دیں اور حرمسرا اور حویلی پختہ بنوا دئے جو تا حال بحالت شکستہ موجود ہیں۔ اور دوسری طرف شاہ کبیر الدین کو کبیر درویش کی خانقاہ کی تولیت و سجادگی ملی جس کی آمدنی آج بھی تقریباً پچاس ہزار ہے۔ بنا بریں خانقاہ بودھن شاہی اور خانقاہ کبیر درویش کی تولیت و سجادگی آپ ہی کی اولاد کے ہاتھ میں ہے۔ خدا ہر دو صاحبان سجادہ کو توفیق نیک عطا کرے۔ سالانہ عرس اور تبرکات کی زیارت کا سلسلہ ۲۵ محرم سے ختم صفر تک رہتا ہے۔ تبرکات کی فہرست حسب ذیل ہے:۔ موئے مبارک و شاخ موئے مبارک جناب سالتمآب و نعلین مبارک و پنجہ مبارک جناب علی کرم اللہ وجہہ و موئے مبارک امام حسین و موئے مبارک غوث الاعظم و دندان مبارک حضرت نظام الدین اولیا و قدم رسول و گدی مبارک شاہ دیوان تبرکات پشت نامہ دیوان صاحب ... حج و زیارت و سیاحت کے دوران عرب و عجم سے ہمراہ لائے جن کی سند موجود ہے اور شاید بعض تبرکات اُن کے خلفا نے حاصل کئے جن کی سند صحیح مرقوم ہے۔

عمر میں وفات پائی ہے۔ بنابریں شیخ رہتاسی کا زمانہ دسویں صدی ہجری متعین کیا جاسکتا ہے۔ زمانہ معلوم اور کرامت مشہور پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا قدم درویشانہ قلعۂ رہتاس پر اُس وقت پہونچا ہوگا جب کہ قلعہ پر راجہ ہرکشن وغیرہ مالکان قلعہ کی حکومت ہوگی لہذا آپ کا قدوم شیر خاں کے لئے تسخیر قلعہ کی بابت نیک فالی تھا۔ مگر یقینی طور پر کہا نہیں جاسکتا ہے کہ شیر خاں کے فاتحانہ درآمد کے وقت وہ بقید حیات تھے یا قید حیات سے آزاد ہو چکے تھے۔ بہر حال شیخ رہتاسی رحمۃ اللہ دسویں صدی ہجری کے گمنام مگر ایک بلند پایہ متاہل درویش تھے۔

حجرہ مذکور میں داخل ہونے کے لئے مغرب رخ کا ایک سنگین دروازہ ملتا ہے، جس کے داہنے بازو پر غار کی طرف کچھ اونچی دیواریں ہیں۔ دروازہ سے نیچے نشیب میں حجرہ کے تنگ دروازہ تک گئے ہیں۔ چنانچہ بیسوں زینے طے کرنے پر حجرہ کے اُس تنگ دروازہ تک رسائی ہوتی ہے جہاں سے بیٹھ کر بمشکل اندرون حجرہ داخل ہوتے ہیں۔ مگر اندرون حجرہ پوری وسعت ہے۔ حجرہ میں مشرق سمت کو ایک طرف مصلّی ہے اور مغرب سمت کو دوسری طرف ایسی نشیب زمین ہے کہ فاتحہ خوان بافراغت مغرب سمت رخ بمشرق کھڑا ہوتا ہے مصلّے کے نزدیک مشرق و شمالی سمت کو دو روشن دان ہیں جن سے روشنی کے ہمراہ روح پرور ہوائیں آتی ہیں۔ اور مشرق سمت کو دریائے سون کا اور شمالی سمت کو آبشار کا منظر پیش نظر ہو جاتا ہے۔

اُس عہد سے آجتک مزار مقدس بوسہ گاہ خلائق ہے۔ منت اُتارنے والے اور چادریں چڑھانے والے عقیدتمند اصحاب بکثرت آتے ہیں۔ عقیدت کی باز گذاری میں ہندو مسلم دونوں شریک ہیں۔ برد اللہ مضجعہ و نور اللہ مرقدہٗ۔

روضہ سلطان فریدالدین شیر شاہ

شہسرام ضلع شاہ آباد (آرہ)

(از جناب سیّد محمد صابر صاحب قادری۔ قمر کاروی)

سنگی روضہ جس کی تعمیر ۹۴۵ھ میں ہوئی تھی شہر شہسرام کے مغرب میں دو ہزار فٹ طویل اور دو ہزار فٹ عریض احاطہ میں واقع ہے، جس میں گیارہ سو فٹ طول اور ہزار فٹ عرض کا ایک وسیع تالاب ہے۔ اس کا پانی بہت صاف رہتا ہے۔ اہل شہر اسی تالاب کا پانی پیتے ہیں، مگر چند سالوں سے اس کا پانی یک بیک سبز ہو گیا ہے۔ دیکھنے میں سبز معلوم ہوتا ہے، مگر مزہ میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اس میں غسل کرنے کی اور کپڑا صاف کرنے کی گورنمنٹ کی طرف سے سخت ممانعت ہے۔ اس کے پورب طرف نہایت عمدہ سنگی گھاٹ بنا ہوا ہے اور اس کے کنارے ایک (روٗل) کا سائبان ہے جس کے شمال و جنوب میں ایک ایک کمرہ ہے، گذشتہ دو سالوں سے اس میں ایک اعلیٰ پیمانہ پر لائبریری قایم ہے۔ تالاب کے کنارے ہر چہار طرف بہت گہری نالیاں ہیں جن کے ذریعے سے باہر کی مٹی اور بارش کا (گندا) پانی دوسرے راستے سے الگ نکل جاتا ہے۔ اور تالاب میں کسی قسم کی گندگی پیدا ہونے نہیں پاتی۔ اس کے چاروں طرف پختہ سڑکیں ہیں، جن کا محیط ایک میل ہے۔ اس سڑک سے تالاب تک چاروں طرف تقریباً ۲۵ فٹ عریض زمین ہے جو پہلے غیر آباد تھی مگر ۱۹۳۷ء میں اس کے چاروں طرف خوشنما پارک بنا دیا گیا ہے، جس کا نام "اظفر پارک" ہے۔

روضہ میں داخل ہونے کے لئے شمالی سڑک سے راستہ ہے، اور ایک گنبد نما پھاٹک سے گذرنا پڑتا ہے جس میں شیر شاہ کے ایک سچے وفادار دربان کی قبر ہے۔ ۱۹۳۵ء میں اس پھاٹک پر بجلی گری تھی۔ جس سے خفیف سا ضرب آگیا تھا، گورنمنٹ نے مرمت کر دی ہے۔ اور اس

۱؎ حجرہ کے دروازہ سنگین سے زینہ اول پر قدم رکھتے عمیق غار کی طرف جو نگاہ گئی تو بندہ کے قدم میں لغزش اور سر میں چکر آ گیا، آنکھ بند کرکے بیٹھ گیا اور مایوسانہ باہر نکل آیا۔ مگر رفیقانِ سفر کی شفقت کہ اُنہوں نے بازو پکڑ لیا اور بندہ نے آنکھ میچ لی اور کھسکتا کھسکتا زینوں کو طے کرکے حجرہ کے تنگ دروازہ تک جا پہونچا آنکھ کھول کر اندر داخل ہوا۔ فاتحہ پڑھی، فاتحہ کے بعد سارا ہراس جاتا رہا اطمانیت و سکون حاصل ہو گیا۔ اور فیوض و برکات کی دولت لیکر باہر نکلا۔

مقبرہ کے جنوبی جانب کے دروازہ سے اُس پختہ راستہ پر جانا ہوتا ہے جو روضہ تک گیا ہے۔ اس کا طول ۲۵۰ فٹ ہے۔ اس کی مسافت طے کرکے زینوں کی راہ سے اوپر پہنچ کر پہلا دروازہ ملتا ہے۔ اس سے گزر کر ایک وسیع صحن میں پہونچتے ہیں جس کی بلندی ۲۰ فٹ اور وسعت ۳۰۰ سو مربع فٹ ہے۔ روضہ کے چاروں طرف سنگی زینے ہیں جو تالاب کے اندر تک چلے گئے ہیں۔ اس کا عرض تقریباً ۲۸۰ فٹ ہے۔ اس کے ہر چہار گوشوں پر آٹھ دروں والے ہشت پہل اور خوبصورت گنبد ہیں جن کی بلندی ۳۰ فٹ ہے۔ اس کے علاوہ چہار دیواروں میں چھوٹے خوبصورت گنبد چار سنگین ستونوں پر قایم ہیں جن سے تالاب کا منظر دیکھا جاتا ہے۔ اور اس صحن کے ہر چہار گوشوں پر سرو کے چھوٹے چھوٹے درخت ہیں جو غالباً سنہ ۱۹۳۷ء میں لگائے گئے ہیں، اس صحن کے عین وسط میں مقبرہ کی ہشت پہل عمارت ہے۔ بیرونی ہر پہل اس کا ۶۰ فٹ لمبا ہے۔ اور اندرونی پہل ۴۲ فٹ لمبا ہے۔ اس سایبان کے ہر پہل میں تین تین خوشنما محرابی دروازے ہیں۔ روضہ کے اندر ہر پہل میں ایک ایک دروازہ ہے، اس کے اوپر آٹھ گنبد ششش پہل ہیں جن کی بلندی ۲۴ فٹ ہے۔ شمالی دروازہ عمدہ ہے اس سے ہوکر اندر داخل ہوتے ہیں جس پر سر بہ فلک عالیشان قبہ تعمیر ہے، اس کے پہلے درجے میں ۱۶ کھڑکیاں ہیں، ان کے علاوہ متفرق جالیوں کے تراشے ہوئے پتھر اوپر کے حصے میں نصب ہیں۔ ان سے ہوا اور روشنی اندر آتی ہے۔ اس حصے میں ۲۵ قبریں ہیں جو شیر شاہ کے خاص افسروں اور مخصوص اہل خاندان کی ہیں، اور وسط میں شیر شاہ کی قبر ہے، جس پر سرخ چادر چڑھی رہتی ہے۔ اور اس کی قبر کے سرہانے چراغدان بھی ہے۔ اس حصہ کا طول ۲۱۵ فٹ بعرض ۲۱۵ فٹ ہے۔ روضہ کے پہلے درجے پر جانے کے لئے جنوبی مشرقی درے چھیالیس زینوں کو طے کرکے ۱۵ فٹ عریض صحن میں پہونچتے ہیں جس کے کنارے پر منڈیر بنی ہوئی ہے۔ اور آٹھ سنگی ستونوں پر گمزیاں ہیں، اور قبہ والی ہشت پہل دیوار میں متفرق تراش کی جالیوں والے سولہ در ہیں۔ روضہ کے اندر مزار شیر شاہ کے مقابل ٹھیک وسط میں کوئی چیز گھنٹہ کی صورت میں آہنی زنجیر میں قبہ کے بیچ سے لگی ہوئی لٹکتی ہوئی ہے۔ جو ان سولہ دروں سے مختلف شکل میں دکھائی دیتی ہے، کسی سے چڑیا، کسی سے طوطا اور کسی سے مچھلی وغیرہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں سے دوسرے درجے پر جانے کے لئے دو راستے ہیں، اس درجے میں بھی پہلے درجے کی طرح ہشت پہل پورے شہر اور پہاڑوں کا منظر نظر آتا ہے۔ اس درجے کے کچھ اوپر جاکر ہشت پہل دیوار ختم ہوجاتی ہے اور ۲۲ فٹ کا بلند گنبد نصف دائرہ میں شروع ہوتا ہے اور بتدریج مخروطی ہوتا گیا ہے اور اس کے سرے پر نہایت عمدہ کلس ہے۔ اس روضہ کی بلندی تالاب سے ۱۹۰ فٹ ہے، روضہ کے اندر جس میں شیر شاہ کا مزار ہے اس کے ہر پہل میں دروازے ہیں۔ پچھم طرف کی پہل میں محرابی مسجد ہے جس میں مندرجہ ذیل آیات قرآنی، درود شریف و تاریخ و اشعار خط طغری میں منقوش ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللّٰھم صل علی محمد و علی آل محمد و بارک وسلم و صل علی جمیع الانبیاء والمرسلین و علی ملائکۃ المقربین و علی عباد اللہ الصالحین ۵ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ اللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم ۵

گوشۂ محراب میں :۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ لا الٰہ الا اللہ موسیٰ کلیم اللہ

ایک گوشہ میں :۔ یا بدوح یا فتاح حسبی اللہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ

ہر چہار جانب محراب کے :۔ سورۂ یٰسین۔ مزمل۔ آیۃ الکرسی۔ قل یا ایھا الکافرون

اور محراب کے اندر :۔ سورۂ والشمس وضحٰھا وغیرہ منقوش ہیں۔

اور ایک طرف یہ شعر کندہ ہے ؎

شاہا بقائے عمر تو بادا ہزار سال،
سالے ہزار ماہ و ماہی ہزار سال

۱۸۵۷ء صوبہ بہار میں:۔

غدر میں گیا کے سیاسی حالات

از جناب خواجہ جلال الدین صاحب بی۔ اے۔ بی ایل وکیل، گیا

تاریخ ہند کے واقعات کا وہ اہم سلسلہ جو بعض اوقات صرف ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی سپاہیوں کا غدر کہلاتا ہے۔ کیا واقعی صرف ہندوستانی فوج تک محدود تھا۔ یا بہار اور ...... حالات کے مطابق ہندوستانیوں کے اور طبقوں نے بھی اس میں شرکت کی؟ کیا یہ محض چربی دار کارتوسوں کا قضیہ تھا۔ یا کچھ اور شکایتیں بھی تھیں جن سے عام ہندوستانی دماغ برافروختہ ہو رہے تھے؟ واقعات شاہد ہیں کہ غدر میں عملی حصہ لینے والی صرف ہندوستانی فوجی جماعت ہی نہیں تھی بلکہ علی قدر مراتب اور ہندوستانی طبقوں نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

کچھ شک نہیں کہ انگریزی فوج کی برتری کا وہ طلسم جو پلاسی اور ارکاٹ کے مرغزاروں میں قائم ہوا تھا۔ ایک صدی کے وسیع عرصہ میں پنجاب کے میدانوں، افغانستان کی پہاڑیوں اور کریمیا کے ساحلوں پر ٹوٹ چکا تھا۔ ہندوستانی فوج نے انگریزی فوج کو دیکھا پھر اپنے آپ کو دیکھا۔ ایک اور پانچ کا فرق پایا۔ اس نے اپنے سامنے ایک نیا فوجی قانون دیکھا۔ جس کی دفعات کے مطابق اسکی خدمات کا دائرہ ہندوستان کی حدود سے باہر نکل چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ ابتدا میں یہ شرط نہیں لگائی گئی تھی۔ یہ تو صاف بدعہدی ہے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ وہ منحوس رائفل اس کے ہاتھ میں دیدی گئی۔ جس کے کارتوس کے ایک سرے پر چربی لگی ہوئی تھی اور اس سرے کو دانت سے کاٹنا پڑتا تھا۔ بس۔ وہ بگڑ گئی۔ اور اس درجہ بگڑ گئی کہ تاریخ ہند میں ایک ایسے باب کا اضافہ ہوا جو اہمیت کے لحاظ سے کسی اور باب سے نہیں ٹھہر سکتا۔

ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایسے عناصر بھی سرگرم عمل تھے۔ جو اگر لارڈ ڈلہوزی کی ہوس ملک گیری نہ ہوتی تو شاید کبھی نمایاں نہ ہوتے۔

واجد علی شاہ سے اودھ کا وسیع اور زرخیز خطہ چھین کر انکو مٹیا برج کی چند بیگہ زمین زندگی کے بقیہ دن کاٹنے کے لئے دیدی گئی تھی۔ اور یہ خبر تو دہلی میں عام تھی کہ بہادر شاہ ثانی مریں تو انکی اولاد کو محلات شاہی سے نکال دیا جائے گا۔ باجی راؤ ثانی پیشوا معزول کئے گئے تھے اور آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ انکی پنشن مقرر کی گئی تھی۔ لیکن ان کے مرنے کے بعد ان کے متبنّیٰ ڈھونڈھو پنتھ عرف نانا صاحب کو اس پنشن سے محروم کردیا گیا تھا۔ جھانسی کی نوجوان رانی [1] لکچھمی بائی جن کی شجاعت اور بلند حوصلگی کی داستانیں اب بھی وسط ہند میں خون کو گرما دیتی ہیں، انہیں لڑکا گود لینے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اور جھانسی کی ریاست ملحق کرلی گئی تھی۔ ارکاٹ کے نواب اور تنجور کے راجہ دونوں کا انتقال ہوا تو انکی اولاد پر وظیفہ اور خطاب کا سلسلہ بند کردیا گیا۔ نظام حیدرآباد کے ذمہ امدادی فوج کے مصارف کا کچھ روپیہ باقی تھا۔ اسکے سلسلہ میں صوبہ برار ملحق کرلیا گیا۔ اس قسم کے اور بہت سے الحاق اور بدعہدی کے واقعات تھے جنھوں نے والیان ملک اور ان کے ہمدردوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کی نیت اور عہد و مواثیق کے سلسلہ میں شکوک و شبہات پیدا کر رکھے تھے۔

ہندوستانی طبقہ عوام کو بھی بعض خاص شکایتیں تھیں۔ انگریزی فوجی چھاؤنیوں کے قرب و جوار کی بستیوں میں ہر جگہ انگریزی سپاہی اعلیٰ عادات و خصائل کا حامل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسکی شخصیت ملکی قوانین کی گرفت سے ذرا بلند رہتی تھی۔ عام طور پر انگریزوں کا فاتحانہ انداز اُن کے ہر شعبۂ حیات پر حاوی تھا۔ مسیحی تبلیغی انجمنیں، حکومت کے سیاسی غلبہ اور تعلق کو برقرار رکھنے اور ایک ایسی جماعت پیدا کرنے کی نیت سے

---

[1] مردانہ لباس میں سپاہیوں کی طرح لڑتی ہوئی، ۱۸ جون ۱۸۵۸ء کو میدان جنگ میں ماری گئیں۔ (ج)

جو کسی خاص ضرورت کے عالم میں ہم مذہب ہونے کی بنیاد پر اسکی معاون ہوسکے۔ روحانیت کا حسین اور سنہری جام پے بہ پے ہر طرف پر ملا بڑھا رہی تھیں۔ اور حکومت اصلاحات کے پردے میں آہستہ آہستہ رسم و رواج میں دخل انداز ہو رہی تھی۔

گو مختلف صوبے، ذرائع رسل و رسائل کے آفلیں اور سامان نقل و حرکت کے محدود ہونے کے باعث آپس میں اتنے نزدیک نہ تھے جتنے کہ آج ہیں۔ لیکن چونکہ فرقہ وارانہ تحریکیں اور ہنگامے ابھی عالم وجود میں نہیں آئے تھے اس لئے ہندوستانی علی العموم آپس میں یگانے تھے اور ایک دوسرے سے اتنے دور نہ تھے۔ جتنے کہ آج ہیں۔ عوام فوج کی بددلی کو دیکھ رہے تھے۔ والیان ملک کی پریشانی کی داستانیں سن رہے تھے۔ اور خود اپنے دل میں خوف اور دہشت کے آثار محسوس کر رہے تھے۔ مشترک خوف و دہشت اور اغراض و مقاصد نے ایک ایسا خاموش اور مستحکم اتحاد پیدا کر رکھا تھا جو اکثر متحدہ قومیت کی بنیاد ہوا کرتا ہے۔

بعض ریاستیں چھن چکی تھیں اور بعض چھینی جا رہی تھیں۔ ہندوستانی عسکریت کی نگاہیں اپنی بلند قامتی اور بلند حوصلگی پر پڑ رہی تھیں۔ متحدہ قومیت کا احساس انگڑائی لے رہا تھا۔ خاموش مخالف طاقتیں مصروف کار تھیں کہ لارڈ ڈلہوزی ۱۸۵۶ء میں انگلینڈ واپس تشریف لے گئے۔ اور انکی جگہ پر لارڈ کیننگ گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ روانگی سے قبل ایک اعزازی دعوت کے موقعہ پر لنڈن میں انھوں نے کہا کہ "ہند کی فضا میں سکون تو نظر آتا ہے لیکن ایک چھوٹے سے بادل کا ٹکڑا بھی سارے آسمان پر پھیل کر ہمیں برباد کر سکتا ہے۔" کیا ایک اتنا بلند پایہ ماہر سیاست نباض میں غلطی کر سکتا ہے؟ لارڈ کیننگ ہندوستان آئے۔ اور ایک بادل کا ٹکڑا آسمان پر چھا گیا۔ اور جو سارے ملک کی فضا کو تاریک کر گیا۔

غدر کی پہلی چنگاری ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں بلند ہوئی۔ بہانہ، چند سپاہیوں کا چربی والے کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دینا تھا۔ وہ قید کر لئے گئے۔ اُن کے ساتھی بگڑ گئے۔ افسروں کو قتل اور قیدیوں کو رہا کیا گیا۔ بجارے بہادر شاہ ثانی جو ضعیفی اور بیکسی کے عالم میں پیری و مریدی اور شعر و شاعری کے مشاغل میں اپنے دن کاٹ رہے تھے انکو اُن کے انکار کے باوجود تخت حکومت پر بٹھایا گیا۔ انکی بادشاہت کا اعلان کیا گیا۔ بغاوت کی آگ بھڑکی اور پھیلی۔ لکھنؤ۔ کانپور ہوتی ہوئی بنارس اور دانا پور پہنچی۔ اور بنارس اور دانا پور میں آگ لگی ہو۔ تو کیا اسکی گرمی گیا میں محسوس نہیں ہو گی؟

اٹھارہویں صدی کے وسط میں جو خلفشار سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ ایک حد تک گیا اُس کے اثر سے محفوظ نہیں رہا تھا۔ ٹکاری۔ گیا اور مان پور کی راہ کئی بار مرہٹہ سواروں کی یلغار اور تاخت و تاراج کے مناظر دیکھ چکی تھی۔ راجہ سندر سنگھ[۱] نے ٹکاری میں اور نامدار خاں معین ایک مشہور زمیندار نے گھنے جنگلوں اور پہاڑیوں میں مغلوں کی مرکزی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ صوبہ بہار کے نائب ناظم علی وردی خاں کی فوجیں ۱۷۴۰ء میں انکی سرکوبی کے لئے اس ضلع میں آچکی تھیں۔ اُن فوجوں کی واپسی کے بعد ایک ابتری سی پھیل گئی۔ ہر طرف زمینداروں نے اپنی چھوٹی چھوٹی سی فوجیں تیار کر لیں۔ آخر ۱۷۴۰ء میں چند زمینداروں نے متحد ہو کر رام گڑھ کے راجہ پر فوج کشی کی۔ اتحادی فوجیں جن کی باگ راجہ ٹکاری۔ کامگار خاں اور نامدار خاں زمینداران نرہٹ اور سماے اور بشن سنگھ زمیندار سیرس اور کٹمبا کے ہاتھوں میں تھی۔ رام گڑھ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئیں۔ اور رام گڑھ کے جنگلوں اور پہاڑیوں میں یادِ پیشقدمی نہیں کرنے پائی تھیں کہ ۱۷۴۳ء میں پیشوا بالاجی راؤ کے پچاس ہزار سوار بنگالہ پر حملہ آور ہونے کے لئے اس ضلع سے گذرے اور جہاں پہنچے زمینداروں نے سر اطاعت خم کیا۔ ایک صرف احمد خاں جو داؤد خاں بانی داؤد نگر کے پوتے تھے اور انچھ اور گوہ میں انکی زمینداری تھی۔ انھوں نے غوث گڑھ میں برائے نام کچھ مقابلہ کیا۔ لیکن انھوں نے بھی پچاس ہزار روپیہ جرمانہ دیکر اپنی گلو خلاصی کرائی۔ دو تین سال کے بعد مرہٹہ فوجیں بنگالہ کی مہم سے واپسی کے وقت گیا ہوتی ہوئی ٹکاری پہنچیں۔ اور ٹکاری کو تاخت و تاراج کرتی ہوئی دریائے سون کو پار کر کے اس ضلع سے باہر نکل گئیں۔ ۱۷۶۱ء میں جبکہ مرہٹہ اور افغان ایک فیصلہ کن جنگ کے لئے پانی پت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شاہزادہ

---

[۱] دھیر سنگھ ایک معمولی زمیندار موضع اتری کے تھے جو ٹکاری سے ۱۴ میل جنوب کی طرف واقع ہے۔ انھوں نے ٹکاری میں سکونت اختیار کی۔ ان کے بیٹے سندر سنگھ نے زمانہ کے خلفشار اور طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر اپنی زمینداری کی حدود میں بہت توسیع کی۔ اور خدمات شاہی کے سلسلہ میں بارگاہ مغلیہ سے راجہ کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۷۵۸ء میں اپنے ایک کپتان کے ہاتھ سے مارے گئے۔ (ح)

عالی گوہر (جو چند دنوں کے بعد شاہ عالم کے نام سے مشہور ہوئے) نے بہار اور بنگالہ میں مغلوں کا کھویا ہوا وقار اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے اس ضلع کو اپنی کوششوں کا مرکز بنایا تھا۔ کامگار خاں جن کا نام مقامی افسانہ گوئی میں اب بھی زبان پر آجایا کرتا ہے ان کے فوجی مشیر تھے۔

۱۵ جنوری ۱۷۶۱ء کو عالی گوہر شاہزادہ ہی نہیں تھے بلکہ تخت دہلی کے مالک شاہ عالم ہو چکے تھے۔ لیکن وہ تاریخ اور یہ ضلع دونوں ان کے لئے سعید ثابت نہیں ہوئے۔ اس روز مان پور کی دیواروں کے پاس انگریزوں کے ہاتھوں سے انہیں ایک جنگی شکست نصیب ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد تقریباً ایک سو سال تک گیا گویا سوتا رہا۔ اور جب ۱۸۵۷ء میں بنارس اور دانا پور میں بد امنی اور بغاوت رونما ہوئی تو گیا میں بھی بے چینی اور بے اطمینانی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ لیکن علانیہ مخالفت کا کوئی واقعہ اواخر جولائی تک پیش نہیں آیا۔

اس زمانے میں مسٹر فریڈرک ہیلیڈے[1] بنگال کے لفٹنٹ گورنر۔ مسٹر ولیم ٹیلر کمشنر پٹنہ ڈویژن اور مسٹر الونزو مونی گیا میں کلکٹر[2] اور مجسٹریٹ تھے۔ مسٹر ہیلیڈے امور حکومت کے سلسلہ میں کوئی آزادانہ رائے نہیں رکھتے تھے۔ احباب اور اعزہ کی رائے ہمیشہ ان کی رہنمائی کیا کرتی تھی۔ مسٹر ٹیلر اصابت رائے۔ ہمت اور اولو العزمی جیسی صفتوں کے حامل تھے لیکن ساتھ ہی دہشت انگیزی اور تشدد کی پالیسی کے عامل تھے اور ہر باغی کی سزا انکے خیال میں موت ہی ہوا کرتی تھی۔ اور مسٹر مونی کی طبیعت میں نمائش، تلون اور جلد بازی تھی۔ ان کا دماغ فوری رائے قائم کرنے سے معذور تھا۔ اور قوت فیصلہ ہمیشہ ڈگمگاتی رہتی تھی۔ اسی زمانے میں جگدیش پور (ضلع آرہ) کا ایک راجپوت زمیندار کنور سنگھ جو ۸۰ جاڑوں کی برف کی چادر میں لپٹا ہوا دل میں انگریزی نشتر کی چبھن محسوس کر رہا تھا باغی سپاہیوں کی حمایت میں میدان جنگ میں اتر چکا تھا۔ آرہ میں ۱۵ انگریز، ۵ سکھ اور ایک مسلمان ڈپٹی کلکٹر سید عظیم الدین خاں محصور تھے اور ان کی مدد کے لئے ۳۴۳ یوروپین اور ۷۰ سکھ سپاہیوں کا ایک دستہ کپتان ڈنبار کی قیادت میں پٹنہ سے روانہ کیا گیا تھا۔ ۳۰ جولائی کو یہ دستہ تباہ کر دیا گیا۔ کپتان ڈنبار اور ان کے ساتھ کئی آفیسر مارے گئے۔ ۳۱ جولائی کو مسٹر ٹیلر کا ایک حکم مسٹر مونی کے نام موصول ہوا کہ "آرہ کے نزدیک انگریزی دستہ شکست کھا گیا ہے۔ اب مرکزی مقام کی حفاظت کے لئے ہر شئے قربان کر دینی چاہئے۔ کلکٹر اور دیگر حکام فوراً پٹنہ چلے آئیں۔ اور اگر نقصان جان کا احتمال نہ ہو تو خزانہ کا روپیہ بھی ساتھ لیتے آئیں" اسوقت ۴۵ انگریز سپاہی اور ۱۰۰ سکھ سپاہی گیا میں موجود تھے کل انگریز ایک جلسہ میں مدعو کئے گئے۔ مسٹر مونی نے کمشنر کا حکم ان کو سنایا۔ بعض انگریزوں نے انکو مشورہ دیا کہ خزانہ کا روپیہ ساتھ لے جانے کے لئے بیل گاڑیاں فراہم کی جائیں اور روپیہ ساتھ لیکر روانہ ہوں لیکن مسٹر مونی نے اُن کے مشورہ پر عمل نہیں کیا۔ اور حالانکہ تین دن قبل یعنی ۲۸ جولائی کو خود انھوں نے ایک رپورٹ پٹنہ بھیجی تھی کہ شہر والوں سے مجھے کوئی خوف نہیں ہے اور اگر باغی بھی گیا کی طرف رخ کریں گے تو میں اُن کے مقابلہ کے لئے تیار ہوں۔ لیکن پھر بھی داروغہ اور نجیب[3] محافظوں کے صوبہ دار کے ذمہ سرکاری خزانہ کا ۷ لاکھ روپیہ مجرموں سے بھرا ہوا قیدخانہ[4] اور سارے شہر کی عزت و آبرو اور جان اور مال چھوڑ کر فوجی سپاہیوں کے ساتھ شام کو ۲ بجے شہر سے روانہ ہو گئے۔

اس جماعت میں ایک انگریز مسٹر ہولنگس بھی تھے۔ جن کا تعلق محکمہ افیون سے تھا۔ انکو اپنی جماعت کی اس حرکت مذبوحی پر شرم سی آنے لگی۔ اور ذلت کا احساس ہونے لگا۔ اور جب یہ جماعت شہر سے تین میل یعنی موضع ہتھوسے کچھ آگے شمال کی طرف گئی ہوگی کہ وہ بیتاب ہو کر مسٹر مونی کے پاس آئے۔ انکو سمجھایا۔ اس حرکت کی ذلت کا احساس کرایا۔ مسٹر مونی کی غلط اندیشی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے رائے بدلی اور مسٹر ہولنگس کے ساتھ واپس لوٹے۔ تین گھنٹہ کی غیر حاضری کے بعد شہر کی حالت میں کوئی تغیر نہیں پایا۔ شہریوں نے خیر مقدم کیا۔ زمینداروں اور گیاوال طبقوں نے شہر کی حفاظت کے لئے تین چار ہزار آدمی فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن اس پر بھی شہر کی حالت مخدوش تھی۔ نجیب محافظوں کے دلوں میں باغیوں کی ہمدردی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ سرکاری خزانہ میں ایک کثیر رقم موجود تھی جس پر نجیبوں

---

۱ ہیلیڈے روڈ۔ ٹیلر روڈ۔ اور مونی روڈ' یہ تین سڑکیں اب تک شہر گیا میں ان تینوں ہستیوں کی یاد دلا رہی ہیں۔ (ع)

۲ ۱۸۵۷ء میں یہ دونوں عہدے الگ الگ تھے۔ لیکن ۱۸۵۹ء میں باہم ملا دئیے گئے۔ (ع)

۳ نجیب ایک سرکاری نیم فوجی جماعت کا نام تھا۔ مسٹر مونی اپنے نجیب محافظوں کا کبھی اعتبار نہیں کرتے تھے۔ (ع)

۴ اس زمانہ میں قید خانہ شہر کے شمالی حصہ میں تھا۔ محلہ پرانا جیل خانہ اسی کی یاد دلا رہا ہے۔ (ع)

کی للچائی ہوئی نگاہیں بیچ بیچ کر پڑ رہی تھیں - شہر کھلا ہوا تھا - اور غیر محفوظ - باغی دستوں کے لئے راہ صاف تھی - آرام طلب گیا وال طبقہ سے امداد کی زیادہ امید نہیں ہو سکتی تھی - اور اسپر انہیں یقین تھا کہ گیا ایک مقدس شہر ہے - باغی جماعتیں اس شہر پر حرص و آز کی نگاہیں نہیں ڈال سکتی ہیں - زمیندار بعض بزدل تھے اور بعض بے اعتنائی برت رہے تھے - اور بعض ایسے بھی تھے جو حالات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے - اور ادھر کے بعض زمینداروں کی طرح موقعہ کی تاک میں لگے ہوئے تھے

عید الاضحیٰ کا زمانہ تھا - اور مسلمان آزادی کے ساتھ سر اٹھا سکتے تھے - انہیں معلوم تھا کہ ڈیڑھ مہینہ قبل ۱۹ جون کو مسٹر ٹیلر نے پٹنہ میں شہر کی حالت پر غور کرنے کے لئے عمائد کی ایک کانفرنس طلب کی تھی - جس میں . . . . تین سر برآوردہ اور با اثر علما، مولوی شاہ محمد حسین - مولوی احمد اللہ اور مولوی واعظ الحق بھی مدعو کئے گئے - لیکن شرکت جلسہ کے بعد یہ تینوں حضرات دھوکے سے حراست میں لے لئے گئے اور نظر بند کر دیے گئے - انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ۳ جولائی کو ۲۰۰ مسلمانوں نے گذری کے ایک غریب کتب فروش پیر علی کی سیادت میں پٹنہ میں علم جہاد بلند کیا تھا - اور اس سلسلہ میں پیر علی سولی کے تختہ پر اپنی جان دے چکے تھے اور نواب لطف علی خاں پر بغاوت کے متعلق ایک مقدمہ پٹنہ چل رہا تھا - ان حالات کو مدنظر رکھ کر مسٹر مونی نے انگریزی رجمنٹ کے ایک دستہ کو شیر گھاٹی سے گیا آنے کا حکم بھیجا - ۲ اگست کو ۸۰ گورے سپاہیوں کا ایک دستہ بیل گاڑیوں میں شیر گھاٹی سے گیا پہنچا - لیکن یہ دستہ بھی گیا کی حفاظت کے لئے کافی نہ تھا - یکم اگست کو یہ خبر حکام کو مل چکی تھی کہ باغی دستوں نے شہر آرہ لوٹ لیا ہے - جو بنگالی ان کی زد پر آ گیا وہ تہ تیغ کر دیا گیا ہے - اور انگریز باشندے محاصرہ کی حالت میں ہیں - ۲ اگست کو گیا کے زمینداروں نے خدمت خلق اور حفاظت شہر کے لئے ایک سو آدمیوں کی ایک ٹولی پیش کی - لیکن یہ بھی دیہاتوں کے بوڑھے - بیمار - اور نکمے انسانوں پر مشتمل تھی - ۳ اگست کو ایک فوری پیغام مسٹر مونی کے پاس داناپور سے پہنچا - کہ "۸ ویں دیسی پیادہ رجمنٹ داناپور سے گیا کی طرف جا رہی ہے - خبر ملی ہے کہ ایک توپ بھی اوس کے ساتھ ہے - خدا کے لئے ہوشیار ہو جاؤ" - ان حالات میں ۸۰ گورے سپاہی گیا کی حفاظت کے لئے کافی نہیں معلوم ہوتے تھے - طوفان نزدیک پہنچ رہا تھا - اس لئے مسٹر مونی نے انگریز مقیمان گیا کی ایک مجلس فوراً جنگ طلب کی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ ۸۰ گورے سپاہی گیا کی حفاظت نہیں کر سکتے ہیں اس لئے مناسب ہے کہ خزانہ کا روپیہ ساتھ لیکر گرینڈ ٹرنک روڈ کی طرف نکل جانا چاہئے -

۳ اگست سنہ ۱۸۵۷ء کی شام کو ۶ بجے یہ جماعت گیا کو خدا حافظ کہہ کر روانہ ہوئی اور روپیہ بیل اور بیل گاڑیوں پر لاد کر ساتھ لے چلی - یہ جماعت مغرب کی طرف چلی اور مسٹر مونی کچھ قیمتی چیزیں لینے کے لئے اپنی کوٹھی پر واپس آئے - ابھی پہنچے ہی تھے کہ شور و غوغا سنائی دینے لگا - ملازم چلاتا ہوا دوڑا آیا کہ جیل خانہ کے دروازے کھول دئے گئے ہیں اور قیدی نزدیک آ پہنچے ہیں - مسٹر مونی اپنے اصطبل کی طرف لپکے - ان کی خوش نصیبی سے گھوڑا کسا ہوا تیار تھا - سوار ہوئے - ایڑ لگائی اور مغرب کی طرف نکل بھاگے - اور کچھ دور جا کر انگریزی فوج کے دستہ سے جا ملے -

یکم اگست ہی سے مسٹر مونی کی کوشش اس قسم کی ہو گئی تھی کہ جس سے مخالف عناصر کو یہ سمجھنے کا موقعہ مل رہا تھا کہ شہر کی حفاظت اور امن و امان قائم رکھنے کی نیت سے مسٹر مونی واپس نہیں آئے ہیں بلکہ ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ خزانہ کا روپیہ اپنے ساتھ لے جائیں - ۱ اگست کی صبح کو انھوں نے خزانہ میں جتنے اسٹامپ موجود تھے سبھوں کو عوام کی نگاہوں کے سامنے جلا ڈالا تھا - اور ۳ اگست کی شام کو جب خزانہ کا روپیہ روانہ کر دیا گیا تو باغی عناصر زیادہ دیر تک خاموش نہیں رہ سکتے تھے - نجیبوں نے جیل خانہ کے دروازے کھول ڈالے اور قیدیوں کو رہا کر دیا - لیکن یہ غیر مسلح چار پانچ سو قیدی ایک منظم اور مسلح فوجی دستہ کے ۸۰ سپاہیوں کا کیا بگاڑ سکتے تھے - لیکن نجیبوں نے بھی ان کی شرکت کی اور دونوں ڈوبھی روڈ میں موجودہ جیل خانے کے نزدیک اس جگہ حملہ آور ہوئے جہاں چھوٹے چھوٹے پہاڑی ٹیلوں کے درمیان سڑک پیچ و خم کھاتی ہوئی ڈوبھی کی طرف نکل جاتی ہے - حملہ آور کچھ نقصان اٹھا کر پسپا ہوئے - اور یہ دستہ گرینڈ ٹرنک روڈ ہوتا ہوا رانی گنج اسٹیشن پہنچا - وہاں سے مسٹر مونی ریل گاڑی پر کلکتہ پہنچے - یہاں انہوں نے وہ روپیہ جمع کر دیا جو اس قدر پریشانی کے بعد وہ بچا کر لائے تھے اور جس کو اگر وہ چاہتے اور عجلت سے کام نہ لیتے تو نہایت آسانی کے ساتھ کئی دن قبل پٹنہ پہنچا سکتے تھے -

کلکتہ میں ۷ لاکھ روپیہ بچا کر لے آنا کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا - ہر قدم پر پس و پیش کرنے والا انسان اب مسٹر مونی "ہیرو آف بہار" کے معزز لقب سے یاد کیا جا رہا تھا - اگر انکی جگہ کوئی دوسرا شخص کلکٹر ہوتا اور جذبات سے زیادہ دماغ سے کام لیتا تو جس وقت مسٹر مونی گیا سے

کلکتہ کی طرف روانہ ہو رہے تھے اُس وقت سے کئی گھنٹہ قبل سرکاری خزانہ کا کل روپیہ پٹنہ پہنچ گیا ہوتا - لیکن مسٹر مونی کی قسمت میں "کمانڈر آف دی باتھ" کا خطاب تھا - اسکو کوئی کیسے روک سکتا تھا - اور بچارے مسٹر ٹیلر جنھوں نے کمشنر پٹنہ ڈویژن کی حیثیت سے ایک گونہ بہار کو بچایا تھا - اُن پر مسٹر ہیلیڈے لفٹنٹ گورنر کی عتاب آمیز نگاہیں پڑ رہی تھیں - مسٹر ہیلیڈے نے مسٹر ٹیلر کے مخالفوں کی سازش سے متاثر اور معاملات حکومت میں مسٹر ٹیلر کی بار بار اپنی آزادانہ رایوں کی مداخلت سے زچ ہو کر ان پر ایک فردِ جرم قائم کی - ۳۱ جولائی کو جو حکم انھوں نے گیا کے کلکٹر کو بھیجا تھا وہی حکم انھوں نے مظفرپور کے کلکٹر کو بھی بھیجا تھا - مسٹر ہیلیڈے کی رائے میں یہ حکم انگریزی آبادی کے دل میں بیجا دہشت اور خوف پیدا کرنے کا باعث ہوا - دوسرا الزام باغیوں پر بیجا تشدد اور سختی انتظام کے سلسلہ میں تھا - اسی لئے وسط اگست ۱۸۵۷ء میں مسٹر ولیم ٹیلر کمشنر پٹنہ ڈویژن کے عہدے سے سبکدوش اور سرکاری ملازمت سے برطرف کئے گئے - اور انکی جگہ مسٹر سیموئیل کمشنر مقرر ہوئے -

۱۴ اگست سے ۱۵ اگست تک گیا میں طوائف الملوکی کا عالم رہا - رہا شدہ قیدیوں اور نجیبوں نے خزانہ میں جو کچھ روپیہ باقی بچ گیا تھا وہ لوٹا - اور لوٹ کر قیدیوں نے اپنے اپنے گھر کی طرف رخ کیا - اور نجیب آرہ کی طرف روانہ ہو گئے - گیا میں اب ایسے افراد کا دور دورہ تھا جو فساد اور ہنگاموں میں اپنا ذریعۂ معاش تلاش کر لیتے ہیں - اب انہیں کی حکومت تھی اور انہیں کا راج پاٹ تھا - امن و امان کی قیمت مقرر کی گئی - مہاجنوں کو جی بھر کر لوٹا گیا - شہر کو کافی نقصان پہنچایا گیا - انگریزوں کی کوٹھیاں منہدم کر دی گئیں - جج اور کلکٹر کی کچہریاں خاکستر کر دی گئیں - محافظ خانہ نذرِ آتش کیا گیا اور جتنی چیزیں غارت گروں کے کام کی نہ نکلیں وہ برباد کر دی گئیں -

۱۶ اگست کو ۲۰ سکھوں اور ۳۵ گوروں کی ایک جماعت نے بغیر کسی مزاحمت کے شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور گیارہ دن کے بعد انگریزی حکومت از سر نو قائم ہوئی - ۲۵ اگست کو مسٹر مونی کلکتہ سے واپس آئے - شیرگھاٹی اور نوادہ پر بھی دوبارہ قبضہ کیا گیا - تہتا میں باغیوں نے افیون کوٹھی کا محاصرہ کر رکھا تھا وہاں وہ منتشر کئے گئے - ایک سوار رجمنٹ نے بھاگل پور میں بغاوت کی ... اور اس ضلع پر حملہ آور ہوئی - نوادہ میں سرکاری عمارتوں کو آگ لگاتی ہوئی وزیر گنج پہنچی - اس کی تعداد ۶۰۰ تھی اور اُن کے ساتھ ایک کثیر تعداد پیدل اور سوار مددگاروں کی بھی تھی - اس وقت گیا میں تقریباً ۲۰۰ سکھ اور گورے سپاہی کپتان راٹرے کی تحت میں تھے - مسٹر مونی کے سخت اصرار پر باغیوں کا راستہ روکنے کی سعی لاحاصل کے لئے وہ گیا سے وزیر گنج کی طرف بڑھے - جہاں ۸ ستمبر کو سخت مڈبھیڑ ہوئی کپتان راٹرے کے دستہ کو کافی نقصان پہنچا - اور باغی راہ کاٹ کر اُن سے قبل گیا پہنچ گئے - جیل خانے کے دروازے کھول دئے - قیدیوں کو رہا کر دیا - شہر کو لوٹنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوسکے - جج کی کوٹھی کے چاروں طرف خندق کھود کر انگریزوں کے لئے ایک جائے امن سی بنا لی گئی تھی - اسپر باغی حملہ آور ہوئے - لیکن ناکامیاب رہے - منصف بہار[1] انکی زد پر آ گئے وہ قتل کر دئے گئے - گیا سے آگے بڑھے اور ٹکاری کی راہ سے دریائے سون کے پار نکل گئے -

اواخر اکتوبر ۱۸۵۷ء میں ڈو دیسی پیادہ کمپنیاں بھاگل پور میں باغی ہو کر اس ضلع میں یلغار کرتی ہوئی پہنچیں لیکن شہر گیا کی طرف انھوں نے رخ کیا - جہان آباد کی راہ سے وہ بھی دریائے سون کی طرف چلی گئیں - ۲۲ اکتوبر کو میجر انگلش انگریزی رجمنٹ کا ایک دستہ لے کر گیا کی حفاظت کے لئے آ گئے اور حکام کو کچھ دنوں کے لئے اطمینان نصیب ہوا -

۱۸۵۷ء کے تلاطم نے چند نایاب گوہر ایام روزگار کے سامنے پیش کئے - کون ہے جو مولوی احمد اللہ[2] تعلقہ دار فیض آباد کی عالی مرتبت بزرگانہ ہستی - سیاسی جدوجہد - اعلیٰ جنگی قابلیت اور حب الوطنی کے عمیق جذبات کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا ؟ - اودھ میں انکی مسلسل اور جانفشاں سرگرمیوں نے ایک صورِ قیامت پھونکا تھا - اور اُن کے جنگی نقشوں کی عمدگی اور ہمہ گیری - فوجوں کی تنظیم و ترتیب - وقت اور مقام جنگ کے انتخاب - اور حربی کارروائیوں میں صحیح رہنمائی نے بہترین انگریزی ماہرین جنگ کو اُن کے سامنے مقابلہ پر آنے کے لئے مجبور

---

[1] ۱۸۶۵ء میں موجودہ بہار سب ڈویژن کا علاقہ اسی ضلع میں تھا اور یہ ضلع بہار کہلاتا تھا - ۱۸۶۵ء میں بہار سب ڈویژن کا علاقہ ضلع پٹنہ میں ملا دیا گیا - اور ضلع گیا معرضِ وجود میں آیا - ۱۸۷۱ء میں پرگنہ جات جپلا و بلونجا ضلع گیا سے نکال کر ضلع لوہار ڈانگا (لوہاردگا) میں جس کا کچھ حصہ اب ضلع پلامو کہلاتا ہے ملا دئے گئے - اور ۱۸۷۵ء میں ۶ مربع میل کا رقبہ ضلع ہزاری باغ میں منتقل کر دیا گیا - موجودہ گیا کا رقبہ وہی ہے جو آخری طور پر ۱۸۷۵ء میں مقرر ہوا تھا - ج

[2] ۵ جون ۱۸۵۸ء کو شہید ہوئے اُن کا سر پیش کرنے والے کو ... ۵ پاؤنڈ گورنمنٹ نے عطا کئے (ح ع)

گیا - کون ہے جو جگدیش پور کے اُس بوڑھے راجپوت کنور سنگھ کی اولوالعزمانہ کارروائیوں - فوجی مہموں کی رستخیز - اور طریقۂ جنگ سے مکمل شناسائی کے باعث اُن کا نام ادب سے نہیں لیتا؟ اُن کے فوجی دستے اعظم گڈھ تک فاتحانہ یلغار کرتے ہوئے پہنچے - اور ایک وقت وہ بھی آ گیا تھا جب آرہ سے کلکتہ تک کوئی ان کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتا تھا - مولوی احمد اللہ ادھر کی فضا پر چھائے ہوئے تھے - اور کنور سنگھ کا اثر بہار میں اور ایک حد تک گیا میں نمایاں تھا - بعض زمیندار علانیہ طور پر ان کے ہمدرد تھے اور بعض واقعات کی رفتار کو بغور دیکھ رہے تھے - اُسوقت جبکہ شہر گیا کی سرزمین دیسی اور انگریزی رجمنٹوں کی قدمبوسی میں لگی ہوئی تھی - شمال اور مغرب میں اروَل کی طرف ایک زمیندار جودھ سنگھ نامی تاریخ گیا کے صفحات پر اپنا نام دھندلی روشنائی سے لکھنے میں مصروف تھا - موضع کھامنی کا رہنے والا - ایک معمولی حیثیت کا زمیندار ضلع آرہ کے بھوجپوری جوانوں کی ایک جماعت اُس نے فراہم کر لی - علم بغاوت بلند کیا - اور چاروں طرف اعلان کرا دیا کہ انگریزی راج کا اب خاتمہ ہو گیا ہے - دوسروں کی زمینیں چھین چھین کر اپنے ساتھیوں کو تقسیم کرنے لگا - اروَل کے اطراف میں شاید ہی کوئی جگہ ایسی ہو جو اُسکی تاخت و تاراج سے محفوظ رہی ہو - جو کوئی اُسکی مخالفت پر اترا وہ موت کے گھاٹ اتارا گیا - آخر نجیبوں کا ایک دستہ اسکی سرکوبی کے لئے گیا سے بھیجا گیا - جودھ سنگھ نے موضع کھامنی میں اپنے مکان کی کافی مورچہ بندی کر رکھی تھی اور اُسکو ایک چھوٹا سا مستحکم قلعہ بنا رکھا تھا - ۷۰۰ - ۸۰۰ جوانوں کا ایک دستہ اور ایک توپ اور توڑے دار بندوقیں لے کر وہیں پناہ گزیں ہوا - اور نجیبوں سے مصروف پیکار ہو گیا - نجیبوں نے کافی زور آزمائی کی - اور اُس کے مکان میں گھس جانے کے لئے بے انتہا زور لگایا - لیکن نقصان اٹھا کر پسپا ہوئے - پھر اُس مکان میں آگ لگا دینے کی تدبیریں کیں - لیکن وہ بھی بیکار ثابت ہوئیں - مجبوراً نجیبوں کو اروَل ناکام لوٹ جانا پڑا -

حکام گیا کو صرف جودھ سنگھ کے مقابلہ میں عارضی ناکامی ہوئی - ورنہ اور ہر طرف امن قائم کرنے میں وہ زیادہ کامیاب ہوئے باغیوں کی ایک کافی تعداد گرفتار ہوتی گئی - ان پر مقدمات چلائے گئے - اور اکثر پھانسی کے تختہ پر لٹکا دئے گئے - یوروپین سوار پولیس کا ایک دستہ تیار کیا گیا - ۲۵۰ کانسٹیبل بطور مزید کمک بڑھا دہ بھیجے گئے - جنوری ۱۸۵۸ء میں مندی بڑہ کے ایک سو انگریز بحری سپاہی اور آفیسر گیا آ گئے - ۱۸۵۸ء کے آغاز سے بغاوت کی آگ ہر طرف دھیمی ہونے لگی - ۲۶ اپریل کو جگدیش پور میں کنور سنگھ کا انتقال ہو گیا اور اُن کے بھائی امر سنگھ نے انصرام امور اپنے ہاتھوں میں لیا - ماہ جون میں آرہ کے باغیوں نے اس ضلع پر یورش کی - عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ باغی ٹکاری کے قلعہ پر حملہ کرنے کی نیت سے آ رہے ہیں کیونکہ اُس زمانہ میں وہاں تقریباً پندرہ بیس لاکھ روپیہ جمع کیا گیا تھا - لیکن انھوں نے اروَل کے قرب و جوار کے مواضعات کو لوٹنے اور مسٹر سکونو کے خاندان کی دو نیلگیریاں تباہ کر دینے پر ہی قناعت کی - چونکہ گیا پر حملہ ہونے کا پورا یقین تھا اس لئے کلکٹر نے ڈیڑھ سو خطرناک قیدیوں کو حراست میں شیر گھاٹی روانہ کر دیا - لیکن راہ میں شیر گھاٹی سے ۶ میل اسطرف قیدیوں کے محافظ ہی باغی ہو گئے - اپنے آفیسر پر حملہ آور ہوئے - اُسکو گولیوں کا نشانہ بنا دیا - اور قیدیوں کو رہا کر دیا - ۲۲ جون کو شب کی تاریکی میں امر سنگھ کے ساتھی ۲۰۰ باغی دبے پاؤں جیل خانے کے دروازے تک آ پہنچے کسی کو خبر تک نہ ہوئی اور قیدیوں کو رہا کر دیا - ۲۴ جون کو جہان آباد کے تھانہ پر باغیوں کی ایک جماعت نے دفعتہً حملہ کر دیا - سرکاری عمارتیں جلا ڈالی گئیں داروغہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا - اور اُس کا دھڑ الٹے پاؤں تھانہ کے سامنے ایک درخت میں لٹکا دیا گیا - جودھ سنگھ کی ہمت بڑھ رہی تھی - اور اب علانیہ لاف زنی کرنے لگا کہ "دریائے سون اور مونگیر کے درمیان جتنی سرکاری عمارتیں ہیں میں اُنکو تباہ کر کے دم لوں گا" حالت نازک ہو رہی تھی - جودھ سنگھ امن و امان کی راہ میں ایک بہت بڑا اور آخری کانٹا تھا اس لئے ۳۰۰ پیادہ سپاہی اور ۵۰ سوار کا ایک دستہ اُس کے استیصال کے لئے گیا سے روانہ کیا گیا - اروَل کے نزدیک جودھ سنگھ کے ساتھیوں کی ایک جماعت سے اس دستہ کی مڈبھیڑ ہوئی - لیکن شکست کھا کر منتشر ہو گئی - جودھ سنگھ کی اصلی جنگی قوت موضع کسما کے پاس مجتمع تھی - وہاں ایک سخت جنگ ہوئی - جودھ سنگھ کو شکست فاش ہوئی - اسکے ۱۰۰ آدمی مارے گئے - اس کی جماعت منتشر ہو گئی اور اسکی طاقت کا خاتمہ ہو گیا - انگریزی حکومت کی اس جنگی فتح نے اس ضلع میں بغاوت کی آخری چنگاریوں کو بجھا دیا - بد امنی کے کانٹے الگ کئے گئے - امن کی راہیں صاف ہوئیں اور گیا آرام کی

---

[1] ایک یوروپین تھے - افیون کی کاشت کرتے تھے - ان کے خاندان کی جائداد اب تک اس ضلع میں ہے - (ح)

نیند سو گیا۔

مسٹر مونی نے ۱۸۵۷ء کے واقعات کو اپنی رپورٹ میں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا تھا۔ انکی رپورٹ ایک خاص سیاسی نقطۂ خیال کی آئینہ داری۔ غدر کی متحارب طاقتوں کی ایک صف میں وہ بھی موجود تھے اور اپنے حریف کو شکست دینے کی کوشش میں انھوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ اس لئے دلچسپی کے لحاظ سے انکی رپورٹ کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

" گیا - ۱۱ مارچ ۱۸۵۸ء

بخدمت کمشنر - پٹنہ

میں اجازت چاہتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء میں جو واقعات اس ضلع میں رونما ہوئے اُنکی مختصر روئداد آپ کے سامنے پیش کروں۔

میں یہاں ۲۸ اپریل ۱۸۵۷ء کو آفیشیٹنگ کلکٹر کی حیثیت سے آیا۔ زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ شمال و مغرب کی فضا میں طوفان نے ایک تلاطم پیدا کردیا۔ گو جنوب میں بہار ایسے دور مقام میں اس طوفان کے کبھی پہنچنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن وہ نزدیک سے نزدیک پہنچتا ہی گیا۔ اور اس کے پہنچنے کے قبل دو قدم آگے ہی اُس بے کلی اور بے چینی کے عام جذبات نمایاں ہونے لگے جو مادی ہوں یا اخلاقی، عظیم ہنگاموں کے پیشرو ہوا کرتے ہیں۔ بنارس میں فوج بگڑی تو اُسکی خبر اس ضلع میں بجلی کی لہر کی طرح دوڑ گئی۔ مجھے پورا یقین ہے اور میری رائے کی تصدیق یہاں کے سمجھدار لوگوں نے کی ہے کہ بنارس پر بہار کی قسمت کا فیصلہ موقوف تھا۔ اُن دنوں اندیشہ کی معقول وجہیں موجود تھیں۔ خطرہ قریب آتے دیکھ کر شرفا خوف کا اظہار کرنے لگے۔ گیا کے گنڈے شہدوں کی زبان کھلنے لگی۔ اور لاف زنی کے الفاظ سنائی دینے لگے۔ انکی جسارت کا یہ عالم ہو گیا کہ برملا کہنے لگے کہ آنے والی گھڑی آ لے تو انگریز مردوں کا خون اور انکی عورتوں کی عصمت دری ہمارے لئے بھی مسرت کے اسباب پیدا کرے گی۔ ہنگامہ کے امکان کی علامتیں ظاہر ہو رہی تھیں۔ اور عام افواہ تھی کہ ہنگامہ کے لئے ۱۵ جون کا دن مقرر کیا گیا ہے۔ مجھے ایسے قیاس کی کوئی خاص وجہ نہیں ملی۔ لیکن عام طور پر ایسا ہی یقین کیا جاتا تھا۔ تار سے کلکتہ خبر بھیجی گئی۔ اور وہاں سے ہر مجسٹی کی ۸۴ ویں رجمنٹ کی ایک کمپنی کو جو اُسوقت شیر گھاٹی کی راہ سے کوچ کر رہی تھی گیا آنے کا حکم صادر ہوا۔

اُسی زمانے میں مجھے اپنے فرائض کے علاوہ مجسٹریٹ کا آفس بھی اپنے ذمہ لے لینے کی ہدایت ملی۔ میرا اولین مقصد یہ تھا کہ گنڈے بدمعاشوں کے دلوں میں دہشت پیدا کردوں اور انکو منتشر کردوں اس لئے ہر مشتبہ شخص کے ذریعۂ معاش کے سلسلہ میں میں نے سخت تفتیش شروع کردی۔ جب مجھے گورنمنٹ اور کمشنر سے پچاس آدمی پولیس میں بھرتی کرنے کا حکم ملا تو میں نے انکو چار بڑی سڑکوں پر جو شمال و جنوب و مغرب سے شہر میں آتی ہیں۔ پہرہ کے لئے سنتری کے طور پر متعین کردیا۔ مشرق میں دریا حفاظت کے لئے کافی تھا۔ ان سنتریوں کے ذمہ یہ کام تھا کہ مشکوک اشخاص کو جن کی ایک فہرست تیار کی گئی تھی۔ معقول تعداد میں گرفتار کریں۔ اور ایسے سپاہیوں اور مشتبہ افراد کو جو ٹولی بنا کر یا اسلحہ لے کر شہر میں داخل ہونا چاہیں، روک لیں اور میرے سامنے پیش کریں۔ اس طریقہ سے شہر کے آوارہ بدمعاشوں پر زبردست دباؤ ڈالا گیا۔ اور ایک ہفتہ کے اندر یا تو وہ حراست میں لے لئے گئے یا شہر سے باہر کہیں نکل گئے۔ ۱۲ سکھوں کی کمک نے ہماری پوزیشن مستحکم بنادی۔ لیکن سکھوں کو آئے ہوئے بہت دن نہیں گذرے تھے کہ مجھے خبر ملی کہ شہر والے انکو عیسائی کہہ کر پکارتے اور ان کے ساتھ بیٹھنے اور تمباکو[1] پینے سے انکار کرتے ہیں۔ ایک بڑھئی کے خلاف اس کا ثبوت بہم پہنچا کہ اس نے چند سکھوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ تمہارے کھانے میں سور کی چربی اور بیل کی پسی ہوئی ہڈیاں ملی ہوتی ہیں۔ دوسرے ہی دن وہ کمینہ سولی پر ٹکا دیا گیا۔ اور میں نے یہ مشتہر کرادیا کہ اگر کوئی شخص کسی سکھ کے ساتھ اس وجہ سے تمباکو نہیں پیئے گا کہ وہ عیسائی ہو گیا ہے یعنی اُس سکھ کو کھانے میں ناپاک غذا ملی ہے تو اُس شخص کو کوڑے سے پٹوایا جائے گا۔ اس کے بعد کوئی شکایت اور سننے میں نہیں آئی۔

۱۰ جولائی تھی یا اُسکے قریب کوئی اور تاریخ کہ ۸۴ ویں رجمنٹ کے ایک دستہ کو گرینڈ ٹرنک روڈ پر کوچ کرنے کا حکم ہوا۔ اُس کی روانگی کے ایک دن قبل کمشنر کا ایک اہم مکتوب مجھے ملا۔ جس میں اُس دستہ کو اسوقت تک روک رکھنے کی تاکید

۱؎ سکھ اور تمباکو نوشی مشکل سے سمجھ میں آتا ہے۔ (جلال)

کی گئی تھی۔ جس وقت تک کہ ایک مخبر جو ٹکاری بھیجا گیا تھا، واپس نہ آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ٹیلر کو اطلاع ملی تھی کہ مود نرائن سنگھ[1] کی ۲۰۰ توپیں ٹکاری قلعہ پر چڑھا دی گئی ہیں۔ مجھ کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ اگر مخبر ٹکاری سے لوٹ کر اس اطلاع کی تصدیق کرے تو سکھ اور انگریزی فوج لے کر راتوں رات مارچ کردوں اور ٹکاری قلعہ پر اچانک حملہ کردوں۔ لیکن مخبر نے آکر اس اطلاع کو غلط بتایا اور وہ دستہ شیر گھاٹی روانہ ہوگیا۔ اس انگریزی دستہ کے چلے جانے سے ہماری پوزیشن بہت کمزور پڑ گئی۔ داناپور کی پلٹنوں پر کسی کو بھروسہ نہیں تھا۔ پانچویں بے قاعدہ رجمنٹ ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ مزید براں، وہ انگریزی فوج جو ٹرنک روڈ پر آرہی تھی، ٹھیک انہیں دنوں اُسکو قیام کرنے کا حکم ملا۔ چند دنوں میں ٹرنک روڈ کی حالت بھی مخدوش ہونے والی تھی۔ میرے خیال میں انگریز بچوں اور عورتوں کے لئے اب گیا مناسب جگہ باقی نہیں رہا تھا۔ جج میرے ہمخیال تھے۔ اس لئے ہم دونوں نے گشتی چٹھی کے ذریعہ سے سبھوں کو مشورہ دیا کہ بال بچوں کے ہٹانے کا انتظام کریں لیکن انگریزی قوم میں، ہندوستانی انگریز، گھر کی چاردیواری سے مانوس ہستی کا ایک نمونہ ہوتا ہے۔ اُن میں سے کسی مرد یا عورت نے ہمارا شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ اور جب تک کہ میری اور جج کی بیویوں نے رہنمائی نہیں کی، کسی نے ہلنے کا نام بھی نہیں لیا۔ اور جب یہ دونوں چلیں تو سب کے سب چل کھڑے ہوئے۔

میں یہ تذکرہ کرنا بھول گیا کہ ہمارے پاس ۶۴ ویں رجمنٹ کے ۸۰ سپاہیوں کے علاوہ ۸۴ ویں رجمنٹ کے ۵۴ سپاہی تھے۔ ۸۰ چلے گئے تو یہ ۵۴ ہمارے پاس رہ گئے۔ اس لحاظ سے ہمارا فوجی دستہ اب ۱۲۰ سکھوں اور ۵۴ انگریزوں پر مشتمل تھا۔

اواخر جولائی تک حالات میں ایک عارضی سکون قائم رہا۔ دیسی اور انگریز دونوں اپنی اپنی جگہ پر کشمکش کو بغور دیکھ رہے تھے۔ اسکے قبل آرہ میں کنور سنگھ کی سازشوں سے میری توجہ ادھر بھی مبذول ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے کاشتکاروں کو وقت پر تیار رہنے کے لئے جو تاکید کی تھی اور ضلع گیا کے دو سب سے بڑے زمینداروں کو جو خطوط اس نے لکھے تھے اُنکی رپورٹ میں کمشنر کے پاس بھیج چکا تھا۔ ۲۵ جولائی کو داناپور کی تین رجمنٹیں باغی ہوگئیں، اور کوئی نقصان اٹھائے بغیر چل کھڑی ہوئیں۔ اس واقعہ کا انتظار بہت دنوں سے تھا لیکن اس کے ظہور پذیر ہونے کی اطلاع کمشنر نے مجھے پانچ چھ سطروں کے ایک اہم مراسلہ میں دی جس کے آخری الفاظ یہی تھے کہ "ہشیار! سنا جاتا ہے کہ کثیر تعداد تمہاری طرف جا رہی ہے" کثیر تعداد کے مقابلہ کی سکت تو ہم میں تھی نہیں۔ اس لئے مسٹر ٹیلر کو میں نے لکھا کہ "اگر فاضل آدمی ہوں تو مدد کے لئے بھیج دیجئے"۔ اگر چھ ہفتہ قبل یہ بغاوت داناپور میں ہو جاتی۔ تو یقینی گیا میں بھی ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ لیکن یہاں کے کنڈے اور شہدے اور رذیل قوم کے افراد دبائے جا چکے تھے۔ اُن کا کوئی سرغنہ بھی نہ تھا۔ مشہور بدمعاش جبل خاں جیل خانے کی چاردیواری میں بند کسی کو ضرر پہنچانے کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔ اور جو اُن کا سردار مانا جاتا تھا۔ وہ پٹنہ بھیج دیا گیا تھا۔ اس لئے تین رجمنٹوں کی بغاوت کی صدا مقامی بازگشت سے یہاں محروم رہی۔ اس پر بھی یہ زمانہ پریشانیوں کا تھا۔ دو نجیب کمپنیاں ۱۶۰ آدمیوں کی یہاں موجود تھیں اور اُن میں بہت سے اعتبار کے قابل نہیں تھے۔ مجھے خبر مل چکی تھی کہ اُن میں بہت سے افراد خفیہ جلسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ گو میں جانتا تھا کہ جتنی فوجی قوت ہمارے پاس اُس وقت تھی اس کی موجودگی میں انہیں کھلم کھلا بغاوت پر اتر آنے کی ہمت نہیں پڑیگی۔ لیکن یہ ناممکن بھی نہیں تھا کہ کسی روز رات کے وقت وہ مغرب کی طرف روانہ ہو جائیں۔ اور روانہ ہونے کے قبل خزانہ کے کچھ حصہ پر بھی ہاتھ ڈالدیں جس کی حفاظت نجیب اور سکھ باری باری ۲۴ گھنٹے کے وقفہ پر کیا کرتے تھے۔

۳۱ جولائی کو میں نجیبوں کے صوبہ دار سے اپنے کمرہ میں باتیں کر رہا تھا کہ کمشنر کا ایک خط جس پر الفاظ "فوری اور ضروری" لکھے ہوئے تھے مجھے دیا گیا۔ میں نے خط کھولا۔ مختصر سی عبارت تھی کہ "ڈنبار کا دستہ آرہ میں شکست کھا گیا ہے۔ مرکزی مقام کو بچانے اور ملک پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے اب ہر چیز قربان کر دینی چاہئے"۔ مجھ کو اور ملکی حکام کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ "جس قدر فوجی قوت ہو لے کر فوراً خفیہ طور سے پٹنہ چلے آؤ"۔ آخر میں یہ حکم تھا کہ "اگر جان کا خطرہ نہ ہو تو خزانہ ہٹا دو"۔ صوبہ دار نے مجھ سے پوچھا کہ "کمشنر صاحب کیا فرماتے ہیں؟"

---

[1] مہاراجہ متر جیت سنگھ والی ٹکاری کا انتقال سنہ ۱۸۴۰ء میں ہوا۔ اور ٹکاری راج دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ ان کے بڑے بیٹے مہاراجہ ہیت نرائن سنگھ ۹ آنہ راج کے مالک ہوئے۔ اور چھوٹے بیٹے مود نرائن سنگھ، ۷ آنہ راج کے مالک ہوئے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں یہ دونوں راج ملا دئے گئے۔ (ج)

میں نے کچھ کہہ کر ٹال دیا - اور دو ایک منٹ میں اُس کو رخصت کر دیا۔ اُس کے جانے کے بعد ایک گشتی چٹھی بھیجی اور ایک گھنٹہ میں سب لوگ جمع ہو گئے یہ فیصلہ ہوا کہ شام کے پانچ بجے ہم لوگ سب روانہ ہو جائیں۔

مسٹر ٹیلر آپ فرماتے ہیں کہ میرا منشا تھا کہ "خزانہ بھی ہٹا لیا جائے" اور خزانہ ہٹانے میں جس قدر وقت لگتا اُسکو میں نے پہلے ہی قیاس کر لیا تھا" لیکن ان کے حکم سے ایسا نہیں ٹپکتا تھا۔ اُس خط سے یہی مقصد نمایاں طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ مرکزی مقام کی حیثیت سے پٹنہ کی حفاظت کی جائے۔ اور اُس کا ذریعہ یہی تھا کہ جس قدر عملی قوت جتنی جلد مہیا ہو سکے ایک مقام پر خفیہ طریقہ سے نہایت جلد مجتمع کر دی جائے۔ اور اگر اس میں ذرا بھی دیر لگتی تو ان کے حکم کے الفاظ اور معنی دونوں کی خلاف ورزی ہوتی۔ اگر مرکزی مقام پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے ہر چیز کی قربانی" ضروری تھی تو یہ ظاہر ہے کہ خزانہ کا روپیہ ہٹا لینے کے لئے گاڑیاں جمع کرنے اور اون پر روپیہ چڑھانے میں ضرور کچھ وقت لگتا۔ اور یہ یقیناً کمشنر کی خواہش اور اُن کے نقشہ کے خلاف ہوتا۔ بہرکیف کم از کم میرا یہ خیال ضرور تھا۔ اُسوقت بھی میں نے یہی سمجھا اور اسوقت بھی یہی سمجھتا ہوں کہ افسر بالا کے حکم سے جو مقصد ظاہر ہو رہا تھا اُسی پر عمل کر رہا تھا۔ ۶ بجے ہم لوگ روانہ ہوئے - داروغہ - صوبہ دار اور دو ایک دلیسیوں سے میں نے باتیں کیں اور اُنکو امن و امان قائم رکھنے کی ہدایت کی۔

ہم لوگ شہر سے باہر ایک میل جا چکے ہونگے کہ مجھے دفعتہً[1] خیال آیا کہ میں کمشنر کے پاس جتنے سپاہی مل سکیں بھیجنے کے لئے مجبور ہوں لیکن اس امر کے لئے مجبور نہیں کیا گیا ہوں کہ مرکزی مقام کی حفاظت کے سلسلہ میں بذاتِ خود بھی مدد کروں - مسٹر ہولنگس اور میں دونوں لوٹے - اور یہی سوچتے ہوئے لوٹے کہ آنیوالے خطرہ کے مقابلہ کے لئے ہمیں ابھی سے ہمت کا قدم اٹھانا چاہئے - میں پہلے جیل خانہ گیا۔ وہاں ۸۰ سپاہی گارڈ تھے۔ اُنکو باہر بلایا۔ اُن سے کچھ باتیں پوچھیں - جیسے سپاہیوں کا عام قاعدہ ہے اُنھوں نے الفاظ اور چہرہ بشرہ سے وفاداری اور اطاعت کا اظہار کیا۔ وہاں سے میں خزانہ پہنچا۔ محافظ میرے سامنے آ گئے - جیل خانہ کے سپاہیوں کی طرح خالی ہاتھ نہیں - بلکہ بندوقیں لئے ہوئے - میں نے یوں محسوس کیا جیسے اُن میں سے بعض دل میں کشیدہ ہیں۔ اُن کے سامنے ہندوستانی میں میں نے ایک تقریر کی - جواب میں سبھوں نے وفاداری کی قسمیں کھائیں - یہ سب کچھ ہو چکا تو ہم دونوں اپنی اپنی کوٹھیوں[2] میں چلے گئے۔ میں نے ایک سوار کے ذریعہ مختصر سا پیغام شیر گھاٹی[3] بھیجا - اور رائے پوچھی کہ میں کیا کروں۔ شیر گھاٹی سے ۶۴ ویں رجمنٹ بلوائی جا چکی تھی۔ اور اُسکو ایک دوسرے سوار نے وہاں جا کر پکڑا۔ اور کپتان طامسن اپنی رجمنٹ لے کر گیا آ گئے۔ اُن کے آنے کے قبل دو دن اور دو راتیں بڑی پریشانی میں کٹیں - مجھے خوف لگا رہتا تھا کہ کہیں نجیب خزانہ ساتھ لے کر اپنے باغی بھائیوں کے پاس آرہ نہ چلے جائیں لیکن اس عرصہ میں بھی ہم لوگ غافل نہیں تھے - بڑے بڑے گیاوال جو یہاں کے پنڈے ہیں - اُنکو ایک جلسہ میں میں نے مدعو کیا - انھوں نے آدمی اور اسلحہ سے پوری طرح مدد اور حمایت کا وعدہ کیا - دلیسیوں کے دماغ میں سکون پیدا کرنے کی غرض سے مسٹر ہولنگس اور میں دونوں اپنے آفس میں گئے - لیکن گیاوال تو ٹوٹی ہوئی بانسری کی طرح نکلے - ان میں سے ایک دو ناتھ سجارنے تو چند آدمی کام کے بھیجے - بقیہ اوروں نے آدمی تو ضرور بھیجے لیکن بوڑھے - اندھے - پاؤں میں لنگ - ہاتھ میں کچھ نہیں - صرف تلوار اور وہ بھی زنگ کھائی ہوئی - یہ حقیقت عیاں تھی کہ عوام اپنی مدد آپ نہیں کرنا چاہتے ہیں - اور جب یہ حقیقت عیاں ہو گئی اور قبل اس کے کہ ۶۴ ویں رجمنٹ کا دستہ یہاں پہنچے - میں اس پر غور کرنے لگا کہ آخر کرنا کیا چاہئے - کلکتہ سے رسل و رسائل کا کوئی ذریعہ سوائے ڈاک کے نہیں اور اُس میں بھی دیر لگتی - اس لئے حالات کو مدنظر رکھ کر جو صحیح تدبیر میری سمجھ میں آئے اُسی پر مجھے عمل کرنا تھا - یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ اگر پٹنہ کا خطرہ واقعی ایسا ہی تھا کہ اُسکی حفاظت کے لئے معمولی سی تعداد سکھوں اور انگریزوں کی جو گیا میں تھی اسکو بھی جانا پڑا تو یہ ۸۰ آدمیوں کا دستہ جو یہاں آیا تھا اُسکو بھی یقیناً بلا لیا جائے گا - اور میرا یہ فرض بھی تھا کہ جس طرح پہلے اپنی فوجی قوت

ف۱ انہیں خیال نہیں آیا تھا - بلکہ مسٹر ہولنگس نے خیال دلایا تھا۔ (ح)
ف۲ موجودہ ڈاک بنگلہ سے مغرب اور میگفرسن روڈ کے جنوب اور مغرب کے کونے پر کلکٹر کی کوٹھی تھی - اور کلکٹر کی موجودہ کوٹھی میں مسٹر ہولنگس رہا کرتے تھے (ح)
ف۳ شیر گھاٹی میں ایک اسپشل مجسٹریٹ رہتا تھا اور ایک چھوٹی سی فوج بھی مقیم تھی - (ح)

مسٹر ٹیلر کے پاس بھیج چکا تھا - اسی طرح ان ۸۰ آدمیوں کو بھی اُنکی مدد کے لئے بھیجدوں - اور ایسی حالت میں جبکہ میں دیکھ چکا تھا کہ عوام پر کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہے - تو اس فوجی قوت کے ساتھ ساتھ خزانہ بچانے کی رہی سہی امیدوں کو بھی مجھے وداع خیر کہنا پڑتا - اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ ۸۰ سپاہی پٹنہ روانہ ہو جائیں اور اپنے ساتھ خزانہ کا روپیہ بھی لیتے جائیں - روانگی کے وقت سے ۶ گھنٹہ قبل کپتان طامسن کو داناپور کے ایجنٹ سائمن آفیسر کا ایک پرزہ ملا جس میں پنسل سے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے کہ "خدا کے لئے ہشیار ہو جاؤ - دیسی پیادہ رجمنٹ فل مارچ کرتی ہوئی گیا جا رہی ہے جنرلی ہے کہ ایک توپ بھی ساتھ ہے" - اب شمال کی طرف جانا اس رجمنٹ سے ٹکرانا اور خزانے کا چھن جانا یقینی تھا - اس لئے جنوب کی طرف سے کلکتہ جانے کا فیصلہ کیا گیا - پنسل سے لکھی ہوئی چند سطروں نے غالبًا بہت سے انسانوں کی جان بچائی - اگر ہم لوگ شمال کی طرف روانہ ہوتے ابھی شہری میں ہوتے اور جیل خانہ کا دروازہ کھول دیا جاتا اور لمبی لمبی سڑکوں اور گلیوں کے طویل سلسلے سے ہم لوگوں پر حملہ کیا جاتا تو جان بچا کر بھاگنا ہی قسمت کا بڑا کارنامہ ہوتا - اور جنوب جاتے ہوئے خزانہ کے دروازہ سے صرف میدان ہی کا راستہ تھا ۶ بجے یہ جماعت روانہ ہوئی - میں قبل بالتفصیل لکھ چکا ہوں کہ میں پیچھے رہ گیا - نجیبوں نے جیل خانے کے دروازے توڑ ڈالے - اور قیدی اور محافظ دونوں مل کر میرے بنگلہ پر حملہ آور ہوئے - خوش نصیبی سے مجھے ایک گھوڑا کسا ہوا تیار ملا اور میں سوار ہوا اور بچکر نکل گیا - اس بدمعاش ہجوم نے ہم لوگوں کا تعاقب شہر سے تقریبًا تین میل باہر اس جگہ تک کیا جہاں سڑک چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کو چیرتی ہوئی ایک تنگ راستہ کی صورت میں باہر نکلتی ہے - اور دو بار ہم لوگوں پر حملہ آور ہوا اور آخر ۵ - ۶ ساتھیوں کو مُردہ چھوڑ کر بھاگ نکلا - برسات کا زمانہ ، سفر تکلیف دہ اور طویل لیکن انگریزی فوجیوں کی ہشیاری - جفاکشی اور ہمہ تن کوشش مستعدی کی بدولت کلکتہ کے خزانہ میں ۷ لاکھ روپیہ جمع کرنے میں ہم لوگ کامیاب ہو گئے -

ہزیمت خوردہ دشمن - قیدی اور محافظ دونوں شہر کی طرف واپس لوٹے - اور خزانہ میں تھوڑا سا روپیہ جو جیل خانہ کی رسد کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا - لوٹ لیا - اور منتشر ہو کر محافظوں نے آرہ کا رخ کیا - اور قیدی اپنے اپنے گھر کی طرف چلے گئے - شب کے وقت شہر پر ایک سکوت اور لرزہ کا عالم طاری تھا - صبح ہوئی - اور مشرق کے وحشی کی روح نے پوری طاقت کے ساتھ انگڑائی لی - ہر لچا شہدا جو رات بھر لوٹ مار کا خواب دیکھ چکا تھا اب اُس خواب کی تعبیر کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا - دس دس بارہ بارہ برس کے لڑکے - ہاتھ میں تلوار لئے اکڑتے ہوئے نکلے - امن پسند اور اہل ثروت طبقے جو تعداد میں بدمعاشوں سے دس گنا زیادہ تھے اگر کسی دوسرے ملک میں ہوتے تو مشترکہ دشمن کے سامنے ایک ہو جاتے لیکن اپنا انتظام آپ کرنے کے عناصر اس ملک میں مفقود ہیں اس لئے شہر کے ذلیل ترین افراد اور گنڈے شہدوں نے من مانی کارروائیاں کیں - وہ ایک گروہ کے سردار ذرا سمجھدار تھے انھوں نے جبریہ چندہ لینا ہی کافی سمجھا - گھر گھر جاتے اور امن و امان کی قیمت وصول کرتے - اور بعض گروہ تو بلا امتیاز غارتگری اور لوٹ میں مست تھے - پانچ چھ گیا وال اپنے ساتھیوں کو لے کر آمادہ ہوئے اور ایک محلہ پورے کا پورا لوٹ لیا - خاص طور پر نقصان اُٹھانے والے بدنصیب ہندو مہاجن تھے شہر کے نیچے حصہ کے رہنے والے مسلمانوں کے ادنیٰ طبقہ کے افراد نے اور بالائی حصہ کے ان پنڈوں نے اُن کو بہ یک وقت اپنا شکار بنا لیا -

۱۶ اگست کو شہر پر دوبارہ قبضہ کیا گیا - حکام پٹنہ سے واپس بھیجے گئے - اُن کے ساتھ ۸۰ ویں پلٹن کے ۳۵ انگریز اور کپتان راترے کے ۲۲۰ سکھ تھے - شہر کی آبادی پہلے تو ڈری - کہ سرکاری عمارتیں جلادی گئی ہیں - یوروپینوں کی جائداد تباہ کردی گئی ہے - اس کا بدلہ شہر پر گولہ باری کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ؟ اس لئے جس کو جو راہ ملی اُدھر بھاگ نکلا - لوٹ مار کرنے والوں نے لوٹی ہوئی چیزیں سڑکوں پر اور کھیتوں اور تالابوں میں پھینک دیں - لیکن جب انہیں یقین ہو گیا کہ مراجعت حکام کا مقصد عام طور پر انتقام لینا نہیں ہے بلکہ امن و امان قائم کرنا ہے تو اعتبار کی فضا قائم ہو گئی - دس دن کی طوائف الملوکی نے امن پسند طبقہ کے دل میں اُس چیز کے خلاف جو ہندوستانی راج کہلاتی ہے ایک نفرت سی پیدا کر دی - انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خود اپنی عزت و عافیت کے لئے بدیسی حکومت کا وہ مضبوط ہاتھ کتنا ضروری ہے جس کا انہیں وہم ہوتا تھا کہ ذرا زور سے دبا رہا ہے - یہ بھی انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ صرف شہر ہی میں نہیں بلکہ دیہاتوں میں بھی بدامنی اور تعدد ...... نے غلبہ پا لیا تھا - کس طرح دیہات کے کاشتکار اور شہر کے بدمعاش دونوں گویا اپنی فطرت

کی پکار پر غارت گری اور تشدد کی طرف جھپٹے تھے۔ اور انھوں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ جنگلی شکاری جانور کی وہ روح کس عالمگیر انداز میں کارفرما رہی جو نفس کی ہوسناکیوں کے سوا کوئی مشترکہ حدود تسلیم نہیں کرتی ہے اور نہ کسی آئین کے سامنے سر جھکاتی ہے۔ کئی معزز لوگوں نے مجھ سے کہا ہے کہ "ایسی غلامی میں دوبارہ زندگی بسر کرنے سے تو کہیں بہتر ہے کہ گورنمنٹ کے دامنِ امن میں پناہ ملنے کے لئے عیسائی بننے کی شرط ہو تو میں تیار رہوں"

"دو واقعات جن کی کڑی اس ضلع کے فساد کے ساتھ ملتی ہے عجیب ہیں۔ ایک۔ کنور سنگھ کا اثر۔ اگرچہ وہ خاص بہار کا زمیندار نہیں ہے اور دوسرے۔ ہندوستانی گورنمنٹ کے مفہوم کے ساتھ لوٹ مار اور غارت گری کی عام مطابقت۔ اگر کوئی زمیندار کسی کمزور پر حملہ آور ہوا یا کوئی دیہات آس پاس میں کسی ٹولہ پر شکاری کی طرح ٹوٹ پڑے۔ یا دس بارہ مسلح بدمعاش کسی تنہا راہ گیر کو مار کر گرا دیں اور سب کچھ لوٹ لیں۔ تو صدا یہی سننے میں آتی تھی کہ "ہندوستانی راج ہوا۔ کنور سنگھ کا راج۔ لوٹ۔ لوٹنے" اس ضلع میں کوئی ایسا با اثر زمیندار نہ تھا۔ جو ان بٹے ہوئے مختلف اور منتشر ٹکڑوں کو گوندھ کر ایک متعفن انبار کھڑا کر دیتا۔ ان ہنگاموں کو صرف تین جگہ وہ ابتری نصیب ہوئی جو غلطی سے بغاوت کہلاتی ہے۔ اس ضلع کے شمال و مشرق کے حصہ میں حیدر علی خاں نے چند رفیقوں کی مدد سے پرگنہ راجگیر پر جو زمانہ سابق میں اس کے مورثوں کا تھا قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ ستمبر میں وہ گرفتار ہوا اور سولی پر چڑھا دیا گیا۔ دو مخالفین راج نے ایک ننھا سا جھنڈا بلند کیا۔ ایک تو روپوش ہے اور دوسرا جیل خانہ میں بیٹھا اپنے مقدمہ کی پیشی کے دن گن رہا ہے۔ وزیر گنج میں ۱۲ یا ۱۴ مواضعات نے ایک شخص خوشحال سنگھ (جو کئی مواضعات کا ٹھیکہ دار ہے) کی سیادت میں متحد ہو کر پہلے تو بلا امتیاز غارت گری کی بھدی رسمیں ادا کیں۔ اور پھر خوشحال کا جھنڈا کھڑا کیا۔ ان میں سے بعض بدبخت احمق کالا پانی بھیجدئے گئے ہیں۔ لیکن خوشحال سنگھ اب تک نہیں پکڑا گیا ہے۔ اس ضلع میں ایک مسٹر سلونی ہی زمیندار یا افیون کی کاشت کرنے والے یوروپین ہیں۔ مغربی تھانوں میں ان کی تین چار فیکٹریاں تباہ کر ڈالی گئیں۔ دو شخصوں کے شریفانہ طرز عمل کا تذکرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انکی ہمت اور قوت فیصلہ نے شیرگھاٹی کو خطرہ سے محفوظ رکھا۔ ایک شیرگھاٹی کے داروغہ رجب علی اور دوسرے بابو آنند کمار رائے جن کا تعلق محکمہ انگریزی کیوڈ انجینیر کے ساتھ ہے یہ دونوں اپنے فرائض کی انجام دہی میں اس زمانے میں بھی منہمک رہے جبکہ سارے ضلع میں پولیس روپوش ہو گئی تھی۔ خود نمونہ بنے۔ خیرخواہوں کی جماعت کھڑی کی۔ بدمعاشوں کو مرعوب کیا۔ لوٹ مار نہیں ہونے دی۔ اور انگریزی اور سرکاری جائداد کو کوئی ہاتھ تک نہیں لگا سکا۔

میں ۲۵ اگست کو گیا واپس آیا۔ اسوقت اس ضلع کا مشرقی حصہ پانچویں بے قاعدہ رجمنٹ کے باغی سواروں کے قبضہ میں تھا۔ یوں نظر آتا تھا جیسے یہ بھلے آدمی یہ سمجھ رہے ہیں کہ گورنمنٹ کے پاس کوئی فوجی قوت ان کے خلاف استعمال کئے جانے کے لئے نہیں ہے۔ کوچ آہستہ آہستہ، قیام، ایک ایک جگہ پر۔ تین تین۔ چار چار دن۔ اور اس کا ذرا احساس تک نہیں کہ کہیں تعاقب تو نہیں ہو رہا ہے۔ شروع میں انکو یہ یقین اس سمت کھینچ لایا تھا کہ گیا جنگی قوت سے اب تک محروم ہے۔ اور جب انکو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ تب بھی انکی نقل و حرکت میں قسمہ بھر بھی عجلت نمایاں نہیں ہوئی۔ وزیر گنج گیا سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں ان کا قیام ۳ دن رہا۔ اور اس عرصہ میں چاروں طرف سے رسد اور روپیہ تحصیل وصول کرتے رہے۔ انگریزی حکومت نگاہ حقارت سے دیکھی جا رہی تھی۔ اور مجھے اندیشہ تھا کہ انکی موجودگی کے باعث اس ضلع میں بغاوت کا شعلہ کہیں پہلے سے زیادہ تیز نہ بھڑک اٹھے۔ لیکن ہم لوگ ۲۵۰ انگریز اور سکھوں کو خاموش لئے بیٹھے رہیں اور ان لٹیروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیہاتی علاقہ پر قبضہ جمانے اور مستانہ وار جھومتے پھرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں۔ یہ ہمیں گوارا نہ تھا۔ تعداد میں ہم ان سے آدھے تھے۔ گورنمنٹ سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ ۶ ستمبر کو باغیوں کا سوار دستہ وزیر گنج سے جنوب کی طرف بڑھا۔ بظاہر اس کے معنی یہی تھے کہ وہ ٹرنک روڈ کی طرف جا رہے ہیں اور گیا حملہ کے خطرہ سے محفوظ ہو گیا ہے۔ کیپٹن راترے نے حملہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ میں ہمیشہ جارحانہ اقدام کا حامی تھا۔ اس لئے یہ کہتے ہوئے کہ حملہ کرنا اب کا فرض ہے۔ انکی تائید کی۔ اور گیا سے ہم لوگ باہر نکلے۔ ۸ ستمبر کو دشمن کے قریب جا پہنچے۔ جنگی کارروائیوں اور ان کے نتائج سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم نے دشمن کو شکست نہیں دی۔ اور نہ دشمن نے ہمیں شکست دی۔ گو اخبارات کے بیان ان دونوں اصرار کے ساتھ کچھ اور ہونے لگتے۔ ہمارا کوئی آدمی نہیں مارا گیا۔ ۲۲ زخمی ہوئے۔ جن میں دو جانبر نہ ہو سکے۔ باغی جو میدان جنگ میں مقتول

ہوئے یا بعد کو زخموں سے جانبر نہ ہو سکے اُنکی مجموعی تعداد ایک درجن کے قریب ہے۔ اُن کے زخمیوں کی تعداد کا حساب نہیں مل سکا۔ باغی سوار، ہم لوگوں سے رفتار میں تیز، گیا پہلے پہنچ گئے۔ جیل خانہ کے دروازے کھول دئے۔ اور مغرب کی طرف نکل گئے۔ اندازاً دو ہفتہ اور وہ اس ضلع میں رہے۔ اور اس عرصہ میں کون سا قابل نفرت فعل ہے جو اُن سے سرزد نہ ہوا ہو۔ رسوائے عالم گنڈا اندر سنگھ اور اُس کے رفیق گیا کے کل بد معاش اور لچے شہدے قیدی۔ سب اُن کے ہمراہ ہوگئے۔ عورتیں زبردستی چھین کر بھگائی گئیں اور پھر کسی تازہ مہم کے شکار کے واسطے جگہ بنانے کے لئے سڑکوں پر چھوڑ دی گئیں۔ بامحنتی اور جفاکش مرد، سب کچھ ان کا لوٹا ہوا عصمت ریزی۔ لوٹ مار۔ قتل وخون۔ اس قسم کے نقش قدم چھوڑتے ہوئے یہ کمینے بڑھتے چلے گئے۔

آخرکار اس پانچویں بے قاعدہ باغی رجمنٹ نے دریائے سون کو عبور کیا۔ ابھی وہ اور زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ رام گڑھ بٹالین کی ملیناری کی خبروں نے تشویش پیدا کردی۔ اس رسالہ میں بہت سے سپاہی شیر گھاٹی اور گیا کے مضافات اور اس ضلع کے دیگر اطراف سے بھرتی کئے گئے تھے۔ مجھے جتنی خبریں ملیں اُن سے یہ یقین ہوتا تھا کہ ان کا ارادہ شیر گھاٹی ہو کر گیا پہنچنے کا تھا۔ اور ہماری فوجی قوت کا یہ عالم تھا کہ سکھ ۵۰ تھے۔ علاوہ بھی بیمار اور زخمی۔ اور اُن میں بھی ایک درجن کے قریب چلنے پھرنے کے ناقابل۔ ۸۴ ویں پلٹن کے ۵۳ انگریز تھے۔ ان میں بھی ۸ بیمار اور زخمی۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات تھی کہ اگر رام گڑھی اس طرف رخ کرتے تو ہم انکا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ اس لئے میں خزانہ کا روپیہ بھیجنے کے سامان میں مصروف ہوگیا۔ ہاتھی منگوائے۔ ہزار ہزار روپیہ رکھنے کے لئے بڑی بڑی تھیلیاں بنوائیں۔ بیماروں کے لئے ڈولیاں فراہم کیں۔ فوری ضرورت کے عالم میں کہاروں کی معقول تعداد جمع کرنے میں دقت ہوئی اس لئے میں نے تقریباً ایک سَو کہار ملازم رکھ لئے۔ اور سکھوں کو ہدایت کی کہ صبح و شام دونوں وقت اپنی صحت کی خاطر ہواخوری کیا کریں۔ انکو یہ ہدایت پسند آئی۔ زخمیوں اور بیماروں کی ڈولیوں کی ایک لمبی قطار روزانہ دوبار بلیرڈ بنگلہ[۱] سے (جو اُن دنوں سکھوں کے ہسپتال کا کام دے رہا تھا) نکلتی ہوئی نظر آیا کرتی اور جب چترا[۲] میں ۵۳ ویں رجمنٹ کے ہاتھوں رام گڑھیوں کو شکست نصیب ہوئی تو اس وقت تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور اگر رام گڑھیوں کو گیا آنا نصیب بھی ہوتا۔ تو قبل اس کے کہ شہر کے در و دیوار ان پر ان کی نظر پڑتی یہ سکھ گیا سے پٹنہ جانے والی راہ پر آدھی مسافت طے کرلیتے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ یہ ضلع مشرق کے باغیوں کی رہ گذر بننے والا تھا۔ میں نے جولائی میں اس حقیقت کی طرف گورنمنٹ کی توجہ منعطف کرائی تھی۔ اور پیشین گوئی سی کردی تھی کہ جب پانچویں بے قاعدہ اور ۳۲ ویں رجمنٹیں بگڑیں گی تو اپنی اس محبوب دیسی سڑک پر گامزن ہونگی جو دیوگڑھ۔ کڑک ڈیہا اور نوادہ چھوتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ پانچویں بے قاعدہ نے یہی سڑک چنی۔ اواخر اکتوبر میں ۳۲ ویں رجمنٹ کی تین کمپنیوں نے دیوگڑھ میں بغاوت کی تو وہ بھی اُنہیں کے نقش قدم پر روانہ ہوئیں۔ یوں تو سارا غدر باغیوں کی حماقت کا ایک کارنامہ تھا۔ لیکن یہ ایک حیرت انگیز خدائی بات تھی کہ یہ صوبہ کس طرح محفوظ رہ گیا۔ اگر داناپور کی رجمنٹ۔ رام گڑھ کی پلٹن۔ پانچویں بے قاعدہ اور ۳۲ ویں رجمنٹیں یہ سب کہیں مل کر ساتھ نکلتیں تو کچھ مدت کے لئے تو ضرور اُن کا کوئی مقابلہ کرنے والا نہیں تھا۔ میں نے دیوگڑھ کی بغاوت کی خبر سنی تو فوراً ڈپٹی مجسٹریٹ نوادہ کو ہدایت بھیجی کہ نوادہ جیل خانے کے تین سو حاجتی قیدیوں کو (یعنی جن قیدیوں کے مقدمات ابھی زیر سماعت تھے) گیا بھیجدیا جائے آپ واقف ہیں کہ پانچویں بے قاعدہ رجمنٹ کے دریائے سون پار کرتے ہی کپتان راترے اور اُن کے ساتھ جتنے سکھ بہم پہنچ سکے اس ضلع سے باہر سون کے کنارے ڈہری بھیجدیئے گئے تھے۔ پولیس کی تعداد میں اضافہ کرکے میں نے اتنی قوت پیدا کرنے کی کوشش کی کہ منتشر بستیوں میں وقتاً فوقتاً جو لوٹ مار اور بدامنی کی وارداتیں ہوجایا کرتی تھیں انکو موثر طریقہ سے دبا سکوں۔ لیکن اندرونی علاقہ کے جنگجو راجپوتوں اور برہمنوں[۳] کے مقابلہ کے لئے ہمارے برقندازوں کی معمولی تعداد کافی نہ تھی۔ اس لئے آپکی بھیجی ہوئی کمک کو دیکھ کر جو میرے پاس چالیس

---

[۱] کچہری روڈ میں میونسپل مارکیٹ کے نزدیک انا کوٹھی کے نام سے ابھی تک مشہور ہے اور ان دنوں جناب حاجی خان بہادر چودھری محمد بخش صاحب آف کھنیار سابق ایم۔ ایل۔ سی۔ کی تولیت میں ہے۔ (ع)

[۲] میجر انگلش نے ۲ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو چترا ضلع ہزاری باغ میں رام گڑھ بٹالین کو شکست دی تھی (ع)

[۳] بابھنوں سے مراد ہے۔ (ع)

نجیبوں کے دستہ کی صورت میں پٹنہ سے آئی - میرے دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی - میں نے انہیں نوادہ بھیجدیا - میرا اعتبار اُن پر شاذ اُسی وقت تک تھا جب تک کہ وہ باغیوں سے دور رہیں - لیکن جب ۳۲ ویں رجمنٹ کی ۳ کمپنیاں کر گئیں تو میں نے انکو اور اُن کے ساتھ حاجتی قیدیوں کو بھی گیا منگوا لیا - اب گیا جیل خانہ میں حاجتی قیدیوں کی تعداد ۶۰۰ سے تجاوز کر گئی - اور انکی حفاظت کے لیے یہ ۴۰ نجیب اور چند برقنداز تھے - یہ زمانہ میرے لئے بڑی پریشانی کا تھا - اور کیوں نہ ہوتا ؟ ایک کثیر تعداد قیدیوں کی - اور وہ بھی ایسے جرائم میں ماخوذ جن کی سزا سخت سے سخت ہو سکتی ہے - محافظوں کی تعداد اس قدر کم - اور محافظ بھی ایسے کہ اُن کے بھائیوں نے قبل ایک بار جیل کا دروازہ توڑ ڈالا تھا - اور میری جان پر حملہ آور ہوئے تھے - باغیوں کی تین کمپنیاں گیا سے کچھ دور نہیں - اور وہ بھی اس شاہراہ پر قدم زن جو گیا کی طرف آتی ہے - خود گیا میں ایک فوج بیمار اور زخمی سپاہیوں کا - اور تیس سے بھی کم ایسے جو وقت پر کام آ سکیں - اِن دقتوں نے میرے فرائض کی گرانباری اور ذمہ داریوں کی سختی کو بڑھا دیا تھا - میں نے سوچا کہ کل قیدیوں کو بیڑیاں پہنا کر گرینڈ ٹرنک روڈ کے نزدیک کسی مقام پر بھیجدوں - اس لیے بیڑیاں تیار اور سکھوں کے لیے پھر صبح و شام دونوں وقت تھوا فوری کا انتظام کیا - انتظام کیا ہی تھا کہ تار سے خبر ملی کہ میجر انگلش اور آنکی ۵۳ ویں رجمنٹ کو گیا آنے کا حکم ملا ہے لیکن ابھی تک یہ امر مشکوک تھا کہ گیا پہلے کون پہنچتا ہے ؟ یہ رجمنٹ یا تین باغی کمپنیاں ؟ باغی وزیر گنج پہنچ چکے تھے اور ۱۴ میل کی مسافت حائل تھی - میجر انگلش ۲۰ میل دور شیر گھاٹی میں تھے - اُن کے پاس میں نے ایک تاکیدی پیغام بھیجا - اور دوسرے روز انگریزی سنگینوں کی چمک نے ہمیں ہمت دلادی کہ اب کوئی خطرہ باقی نہیں رہا - اب باغیوں نے مغرب کی راہ چھوڑی اور شمال کی سمت رخ کیا - کرنیل انگلش کی یہ کوشش تھی کہ جہان آباد میں باغیوں کو روکیں اور وہیں اُن کا کام تمام کریں - لیکن وہ نظر بچا کر نکل بھاگے اُن کے پیچھے پیچھے ایک ہفتہ کے اندر ہی اُسی رجمنٹ کی اور دو کمپنیاں پہنچیں جنھوں نے راج محل کی پہاڑیوں میں علم بغاوت بلند کیا تھا - ان کی سرکوبی کے لیے ہم لوگ یکم نومبر کو روانہ ہوئے - ۳۰ میل مارچ کرنے کے بعد ہم لوگ ہسوا پہنچے جہاں سے نوادہ ۹ میل کے فاصلہ پر ہے - اور باغیوں کا تعاقب شروع ہوا - نوادہ سب ڈویژن کے ضلع پٹنہ کا جنوبی حصہ طے کرتے ہوئے جہان آباد سب ڈویژن کی راہ تک دریائے سون تک اُن کا تعاقب جاری رہا - اور مسلسل چار دن اور پانچ راتیں ۱۳۰ میل تعاقب کرنے کے بعد باغی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے - سنہ ۱۸۵۷ء میں اس ضلع میں باغیوں کی یہ آخری تاخت و تاراج تھی -

میری دانست میں اس قسم کی تاخت و تاراج کے سلسلہ میں دو ایک نتیجے نکلتے ہیں اول یہ کہ عام خیال ہے اور اس خیال میں صحت کا کوئی وجود نہیں ہے کہ باغیوں کے ذرائع خبر رسانی عمدہ ہوتے ہیں - بلکہ اس کے برعکس مجھے یقین ہے کہ اُن کے ذرائع نہایت محدود اور ناقابل اعتبار ہوتے ہیں - پانچویں بے قاعدہ رجمنٹ کو گیا کے نزدیک پہنچنے کے قبل معلوم نہیں تھا کہ شہر پر سرکاری حکام دوبارہ قابض ہو چکے ہیں - جتنی باغی جماعتیں اس ضلع میں آئیں کوچ کے دوران میں جھوٹی خبروں سے برابر اثر پذیر ہوتی رہیں - ۳۲ ویں رجمنٹ کا پہلا دستہ یہ خبر پا کر جہان آباد چھوڑتا ہوا آیا کہ وہاں کچھ فوج انکی گھات میں بیٹھی ہوئی ہے - انکے کوچ کی راہیں ٹیڑھی اور پیچدار ہوتی تھیں - دیہاتی اپنی بستیوں کو اُن کے شرف قدم سے دور رکھنے کے لیے جھوٹی اور غلط اطلاعیں پہنچا کر انکو سیدھی راہ سے ہٹا دیا کرتے تھے -

صحیح اطلاعات کا تعلق جہاں تک خود میری ذات سے ہے مجھے اُن کے حاصل کرنے میں کبھی کوئی دقت پیش نہیں آئی - اس ضلع سے باغیوں کی کوئی جماعت ایسی نہیں گذری جس کے متعلق مجھے یہ نہ معلوم ہوا کہ انکی تعداد کتنی ہے - ہاتھی اور اونٹ اُن کے ساتھ کتنے ہیں - اور کس راہ سے کوچ کرنا چاہتے ہیں - غدر کی خبر سنتے ہی میں نے ہرکاروں کے دو سلسلے اس سڑک پر مقرر کر دئے جس سے دشمن اس ضلع میں داخل ہونے والے تھے - یہ سلسلے اس ضلع سے باہر ۲۰ - ۳۰ میل تک پھیلے ہوئے تھے - ان کے علاوہ ہرکاروں کے کئی سلسلے قرب و جوار کے تھانوں اور اُن مختلف مقامات تک پھیلے ہوئے تھے جدھر میرا خیال تھا کہ باغی رخ کریں گے - داروغوں نے بھی اپنے اپنے تھانوں میں ہرکاروں کا اسی قسم کا سلسلہ قائم کر رکھا تھا - زر کثیر اس میں صرف ہو گیا - کیونکہ میں نے اجرت معقول ادا کی - لیکن نتائج قابل اطمینان نکلے -

کلکتہ اور انگلستان میں ایک خاص طبقہ کے انگریزوں کا یہ دستور ہو گیا ہے کہ اسباب غدر کا تذکرہ کرتے وقت وہ لوگ گورنمنٹ کی بدنظمی ہمارے ملکی آئین - اور اُن کے طرز نفاذ کی مفروضہ سختی کا بھی ضرور تذکرہ کرتے رہتے ہیں - میں نے اس امر کی تحقیق کرنے میں جانفشانی

اور دروغ ریزی سے کام لیا ہے کہ یہ دعویٰ کسی بنیاد پر - کمزور ہی سہی - قائم کیا ہے۔ میرا تجربہ شاہد ہے کہ یہ دعویٰ سراسر بے بنیاد ہے۔ اس ضلع میں کبھی کسی باغی سپاہی نے اس قسم کا کوئی عذر اپنی سرکشی کے سلسلہ میں پیش نہیں کیا ہے۔ کاشتکاروں اور زمینداروں نے سپاہیوں سے بغاوت کرنے کا سبب دریافت کیا اور اُن کے جواب مختلف اور اس طرح کے ہوا کرتے تھے کہ "ہمارا مذہب خطرہ میں آگیا ہے" اور "ہم کو توپ سے اڑا دیا جاتا" یا "ہمارے بہت سے ساتھی پھانسی پر لٹکا دیئے گئے ہیں اور ہمارا بھی یہی حشر ہوتا" یا "ہماری تنخواہیں باقی رہ گئی ہیں"۔ یہ سب یا اسی وضع کے اور جواب ملتے تھے۔ لیکن اتنی دروغ بافیوں پر بھی باغی سپاہی اتنا احمق نہیں تھا کہ ظالمانہ قوانین اور عوام پر تشدد کا بھی عذر پیش کرتا۔ اگر پیش کرتا تو کاشتکار اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر خود اُس کا فیصلہ کر دیتا۔ جو لوگ گذشتہ سال کے واقعات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اب اُن کے حصہ میں یہ بات رہ گئی ہے کہ غدر کے ایسے اسباب بتلائیں جو رہنمایان غدر کے دماغ میں بھی کبھی نہیں آئے۔ باغیوں کا اس قسم کی کوئی دلیل پیش نہ کرنا سب سے زبردست ثبوت اس امر کا ہے کہ عوام ہمارے قوانین میں کوئی سختی محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اگر قوم کے قلب عظیم سے جواب کی ذرا بھی امید ہوتی تو ایسی پکار ملک کے سامنے بہترین فریاد کا کام دیتی۔ اور نانا[1] جیسے انسان اس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ لیکن نانا کو معلوم تھا کہ ایسی پکار صرف صدا بصحرا ہے۔ کوئی گونج پیدا نہیں ہوگی۔ اس سے لندن کے کسی جلسۂ عام میں جاہلوں کو ابھارا جا سکتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں والیان ریاست اور کاشتکار کبھی اس پر کان نہیں دھرتے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ باغی سپاہی کو اپنی محرکات اور اپنے دلائل جاننے کا موقعہ کیوں نہیں دیا جاتا۔ اس نے یہ بانگ دہل اُن کا اعلان کیا ہے۔ اور مختلف طریقوں سے اتنا کافی طور پر اعلان کیا ہے کہ دوڑنے والا بھی اسکو پڑھ سکتا ہے۔ جس وقت اُس نے اطاعت کا جوا اتار پھینکا۔ جیل خانے کے دروازے توڑنے لگا۔ خزانے لوٹنے لگا۔ عزت و آبرو مال و دولت پر دست درازی کرنے لگا۔ اُس وقت وہ آسودہ شکم عسکریت کی تمام بدکاریوں کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اور دکھلا رہا تھا کہ اس کا مدعا غیر منضبط آزادی حاصل کرنا تھا۔ جس وقت اس نے چاٹگام میں بغاوت پر کمر باندھی یا پنجاب میں اور اپنے قدم یکساں طور پر دہلی کی طرف اٹھائے اُس وقت وہ اپنے اُس گہرے اور زبردست دیرینہ اور روایاتی جذبہ کی ایک جھلک دکھلا رہا تھا جس کی چنگاری اب تک اس کے دل کی تہ میں سلگ رہی تھی۔ اودھ میں اُس کی آویزشیں وطن پروری کے اُن جذبات کا آئینہ تھیں جن کا اظہار غلط راہ پر کرایا جا رہا تھا۔ افسروں کا خون جس سے اُس نے اپنے ہاتھ رنگے تھے وہ خاموشی کے عالم میں طبعی قومی منافرت کی شہادت دے رہا تھا۔ میں نے خود ایک کمسن لڑکے کو دیکھا ہے کہ آنکھوں میں آنسو اور زبان سے یہ اقرار کہ "مجھے یقین ہو گیا کہ میرا مذہب خطرہ میں پڑ گیا ہے"۔ تو یہ امر واضح ہے کہ ۱۸۵۷ء کے تاریخی واقعات کس بڑی حد تک مذہبی جنون کے مرہون منت ہیں۔ لیکن تنظیم کی غیر موجودگی سے اور نیز اس وجہ سے کہ عمل کی راہ میں بیک وقت قدم نہیں اٹھائے گئے۔ اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ عام طور پر کوئی مشترک وجہ شکایت کی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

میں ہوں آپ کا خادم

اے۔ مونی ٹ

اب گیا تقریباً اسی سال سے سویا ہوا ہے۔ اور اگر فرقہ وارانہ اور جماعتی تحریکیں اس کے خواب میں گاہے گاہے مخل نہ ہوں تو شاید سمجھا جا سکتا ہے کہ گیا قیامت کی نیند سو گیا ہے۔ گرچہ دور دور صوبہ میں بعض بعض سیاسی تحریکوں کے ہلکے ہلکے بادل گیا کے افق پر کبھی کبھی منڈلاتے نظر آ جاتے ہیں۔ آئندہ ہندوستان کی قومی تحریکات کون سی کروٹ لیتی ہیں۔ اور ان کا کون سا اثر گیا پر مترتب ہوتا ہے اس کا فیصلہ ابھی مستقبل کے مورخ کے قلم میں پوشیدہ ہے۔

---

[1] پیشوا باجی راؤ ثانی کے متبنیٰ دھونڈھو پنتھ عرف نانا صاحب غدر کے زمانے کی ایک مشہور ہستی۔ دسمبر ۱۸۵۸ء میں نیپال میں روپوش ہو گئے۔ (ح)

صوبہ بہار کا ایک بہادر باغی[۱]

از جناب خواجہ عبدالقیوم۔ بی۔ اے۔ آنرس

حکومت اور اُس کے کارپردازوں کے خلاف باغیانہ خیالات کی ترغیب دینا قانونی جرم ہے۔ مگر ایک مستحکم حکومت کے باغی کی ہمت اور شجاعت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان ان بہادر باغیوں سے خالی نہیں۔ انہیں قوم، مذہب، ملک، عمر غرضکہ تمام پہلوؤں سے ہی کیوں نہ کیا جائے، تاہم انکی ہمت اور خودداری خراج تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ انہیں باغیوں میں سے صوبہ بہار کا ایک بہادر اسی برس کا بوڑھا کنور سنگھ بھی تھا جس کے نام سے آجکل بہت کم لوگ واقف ہیں مگر جس کی بہادری اس قابل ہے کہ اُسے ایک مشعلِ ہدایت سمجھ کر ہندوستان کے نوجوانوں میں ایک نیا جوش اور ایک نیا ولولہ سرائت کیا جا سکے۔

کنور سنگھ ۱۸۵۷ء میں ضلع شاہ آباد میں آرہ کا ایک بوڑھا زمیندار تھا۔ وہ دراصل جگدیش پور کا رہنے والا تھا جو آرہ سے ساٹھ میل مغرب کی طرف واقع ہے۔ جائداد کم ہونے کے باوجود ایک قلعہ اور ایک عالیشان مندر اُس کے قبضہ میں تھا۔ اپنے علاقہ کے اطراف میں اُس کا اثر اس کا اثر اس قدر حاوی تھا کہ اُس کے مقابلہ میں ڈمراؤں کے مہاراجہ کا بھی اتنا جاہ و جلال نہ تھا۔

لڑکپن میں کنور سنگھ کو تعلیم سے بالکل رغبت نہ تھی۔ وہ لکھنے پڑھنے کو حقارت بھری نظروں سے دیکھتا تھا۔ مردانہ کھیل اُسے بہت عزیز تھے۔ اکثر اوقات وہ رہتاس گڑھ کے گھنے جنگلوں میں شکار کے لئے نکل جایا کرتا۔ اپنے اطوار اور احساس خودی کے موجب وہ ایک راجپوت تھا۔ خودداری کے جذبہ کی وجہ سے وہ اپنے آغاز شباب کے پہلے ہی بہار کے راجپوتوں کا سرغنہ تسلیم کیا جانے لگا۔ شاہ آباد کے مسلمان اور جینی زیادہ تعداد اور کثیر دولت کے باوجود اس کے قبضہ میں تھے اسکی عزت اور وقار کا یہ حال تھا کہ جسطرف سے وہ گذرتا عوام بلاتفریق مذہب و ملت اسکی تعظیم کیلئے کھڑے ہو جاتے۔ ضلع کے تمام لوگ اسے اپنا خیرخواہ اور نیک حاکم سمجھ کر اسکی عزت کرتے۔ ضلع کے کلکٹر کی نظروں میں اسکی بڑی وقعت تھی ایک دفعہ جیل کے قیدیوں نے مٹی کے برتنوں میں کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ کنور سنگھ سے کلکٹر نے مدد مانگی۔ اور جو کام کلکٹر کی دھمکیوں اور اسکی تمام کوششوں سے نہ ہو سکتا تھا وہ کنور سنگھ کے بھیجے ہوئے ایک پیغام سے انجام پا گیا

کنور سنگھ کے اخراجات اسکی آمدنی سے ہمیشہ تجاوز کر جاتے اسلئے اسے بہت زیادہ سود پر قرض لینا پڑتا۔ اسطرح وہ بیس لاکھ کا مقروض ہو گیا۔ قرض خواہوں نے اسکے خلاف بیس لاکھ کی ڈگری حاصل کر لی۔ مالگذاری کے محکمہ (BOARD OF REVENUE) نے پہلے تو جائداد کے انتظام کرنے کا اور قرض کو رفتہ رفتہ ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد اس محکمہ نے کسی ذمہ داری کو اپنے سر لینے سے انکار کر دیا۔ کنور سنگھ کی تمام جائداد اب نیلام پر چڑھنے والی تھی۔ اس تباہی کے زمانہ میں اسکے بیٹے کی وفات اور اس کے پوتے کے پاگل ہو جانے کی خبر نے اسے اور زیادہ پریشان کر دیا۔ اسکی ناامیدی دن بدن زیادہ ہوتی گئی اور مصائب و آلام نے اسے کچھ روز کیلئے نیم پاگل سا بنا دیا۔ کنور سنگھ ابھی ان دنیاوی مشکلات میں گھرا ہوا تھا کہ پٹنہ کے کمشنر نے ایک ڈپٹی کلکٹر کو اسکے پاس بھیجا کہ وہ دوستی کے بھیس میں اسکے گرفتار کرے۔ یہ اسکے جذبہ خودداری کیلئے ایک زبردست ٹھیس تھی اور وہ اس تہمت کو برداشت نہ کر سکا۔

یہ واقعات ۱۸۵۷ء کے ہیں۔ اس وقت کنور سنگھ کی عمر ۸۰ برس کی تھی۔ اتنی عمر ہونے کے باوجود وہ ایک مضبوط اور توانا پست قامت آدمی تھا۔ بہادری اور شجاعت اسکے چہرہ سے جھلکتی ہوئی نظر آتی تھی۔ عالم پیری میں بھی جوانی کی جوشیلی آنکھوں میں کسی قسم کی پژمردگی نہ آئی تھی۔ اسکی بڑی بڑی آنکھوں میں سے شباب کا جوش و خروش ابھی تک ٹپکا پڑتا تھا۔ اسکی گھنی داڑھی نے اسکے چہرہ کو اور زیادہ مدبر اور مرعوب کن بنا دیا تھا۔ اسکے بازوؤں کی طاقت دیکھنے ہی سے ظاہر ہو جاتی تھی۔ اسکا لباس چست اور سادہ تھا۔ نیولین کی

---

[۱] یہ مضمون ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے ایک مضمون کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ جو گذشتہ ماہ دسمبر میں انگریزی اخبار میں شائع ہوا تھا

طرح اسکی آنکھوں اور چہرہ سے حکمرانی ٹپکتی تھی۔

کنور سنگھ کے دو مصاحب رندالن سنگھ اور ہرکشن سنگھ انگریزوں کے سخت مخالف تھے اور وہ ہر وقت انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے کے متلاشی رہتے تھے مگر کنور سنگھ کے بھائی دیال سنگھ اور رام سنگھ اپنی دوربینی کی وجہ سے ہمیشہ نرمی اور ضبط کی تلقین کرتے تھے کیونکہ انہیں اس بات کا کافی احساس تھا کہ چھوٹے پیمانہ پر بغاوت کرنے کا نتیجہ اپنے آپ کو برباد کر دینے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اسی زمانہ میں کنور سنگھ کو اطلاع ملی کہ پٹنہ سے مسٹر ٹیلر اسے گرفتار کرنے کیلئے آرہا ہے۔ یہ وہی زمانہ تھا جس وقت غدر .... شروع ہونے والا تھا۔ ہندوستان کے تمام حصوں سے تشویش کن خبریں آرہی تھیں۔ کنور سنگھ کے سامنے دو راستے تھے اسے کسی ایک کو اختیار کرنا ضروری تھا چونکہ انگریز اسے پہلے ہی باغی قرار دے چکے تھے۔ اور اس کی گرفتاری کا سامان بھی کیا جا رہا تھا اسلئے اس نے کھلی بغاوت کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس نے ہرکشن سنگھ کو دانا پور کی فوجوں میں ایک باغیانہ لہر پیدا کرنے کیلئے روانہ کیا۔ اسے اپنے مقصد میں کافی کامیابی نصیب ہوئی۔ اور وہ آرہ کی حفاظت کیلئے بہت سے سپاہیوں کو اپنے ہمراہ لیتا آیا۔

۱۸۵۷ء میں غدر کے شروع ہونے کے وقت آرہ میں تقریباً پچاس سپاہی اور انگریز شہری موجود تھے۔ ایک سول انجینئر نے جسے فوجی فن کا کچھ علم حاصل تھا سامان رسد اور کچھ اسلحے جمع کر لئے۔ اور ریت کے بھرے ہوئے بوروں کو چھت پر رکھ کر سب کو اس قلعہ میں بند کر دیا کنور سنگھ باغیوں کا سرغنہ تھا۔ وہ رات کو اس قلعہ پر حملہ آور ہوا۔ اور اس نے قلعہ کے مکینوں کو دھواں سے دم گھٹ کر مارنے کیلئے چاروں طرف آگ لگانے کا حکم دے دیا۔ انگریزی فوج نے بوئیل (BOYLE) اور آئر (EYRE) کے زیر تحت جگدیش پور میں کنور سنگھ کے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ بوڑھا راجپوت پہلے ہی سے ان تمام حملوں کیلئے تیار بیٹھا تھا اور اس نے ہر مذہب اور ہر قسم کے جنگجو جوان اپنی حمایت کیلئے جمع کر لئے تھے۔ بیبیگنج (Babeeganj) کے قریب کنور سنگھ کی فوج اور آئر کی فوج میں تصادم ہوا۔ مگر ایک گھنٹہ کی مسلسل لڑائی کے بعد باغی فوج کو مجبوراً بھاگنا پڑا۔ اور انگریزی فوج نے شہر میں داخل ہو کر انتقامی جذبہ کے ماتحت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

کنور سنگھ نے سہسرام میں فوجوں کو جمع کرنا اور اپنی تنظیم کرنا شروع کر دیا اور پھر فوج کو ساتھ لیکر اعظم گڑھ پر حملہ کر بیٹھا اعظم گڑھ کے نزدیک اس نے دو لڑائیاں لڑیں جن میں اس نے انگریزی فوج کو جو ملین (Millman) کے ماتحت تھی شکست فاش دی۔ کپتان ڈگلس ان کی مدد کو پہنچ گیا اور گنگا کے کنارے سکندرپور میں پھر کنور سنگھ کی انگریزی فوج کے ساتھ مدبھیڑ ہوئی۔ کنور سنگھ کو شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔ اس نے دریائے گنگا کو پار کرنا چاہا۔ مگر انگریزوں نے تمام کشتیاں غرق کر دی تھیں۔ آخرکار دیہاتیوں نے جن کے دل میں کنور سنگھ کی بہت وقعت تھی کشتیاں بہم پہنچائیں اور اسطرح کنور سنگھ کامیابی کے ساتھ بھاگ گیا۔

بھاگتے وقت کنور سنگھ ایک ہاتھی پر سوار تھا۔ اسکا مصاحب رندالن سنگھ بھی اس کے ہمراہ تھا اور وہ چتر شاہی کو پکڑے ہوئے تھا۔ اس سے ایک فاش غلطی سرزد ہوئی اس موقعہ پر اس نے چھتہ کو کنور سنگھ کے سر پر بلند کر رکھا۔ کنور سنگھ اسطرح پہچان لیا گیا اور انگریزی فوج نے باغیوں کے سرغنہ کی طرف گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ ہاتھی کا ہودہ سواروں کے ساتھ نیچے گرا دیا گیا۔ رندالن سنگھ وہیں مر گیا کنور سنگھ کے بازو پر گولی لگی اور وہ بیہوش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جب اسے کچھ ہوش آیا اور اس نے اپنے بازو کو زخمی پایا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ اسکا زخمی بازو اسکی تلوار سے کاٹ کر گنگا میں پھینک دیا جائے۔ چنانچہ طوعاً و کرہاً اسکے حکم کی تعمیل کی گئی اور اسے جگدیش پور پہنچا دیا گیا۔ ایک بازو کھونے کے باوجود بھی شکست خوردہ کنور سنگھ نے ہمت نہ ہاری اور ڈگلس کی بڑھتی ہوئی فوج کا ایک سخت مقابلہ کرنے کیلئے فوج منظم کرنے لگا۔ لیکن وہ زخموں سے جانبر نہ ہو سکا اور اسے جلد ہی اس دنیا سے گذر جانا پڑا۔

ایک معمولی زمیندار ہو کر کنور سنگھ اپنی طاقت اور خودداری کے زیر اثر ایک باغی فوج کا منتظم بن بیٹھا۔ انگریزوں کے خلاف لڑنے میں اس نے ایک زبردست شجاعت کا ثبوت دیا۔ اسکی فطرت میں باغیانہ جذبہ موجود نہ تھا مگر خارجی معاملات نے اسے باغی بننے پر مجبور کیا پہلے تو وہ انگریزوں کا خیرخواہ تھا اور انگریزوں کی طرفداری کرنا دھرم خیال کرتا تھا۔ مگر پٹنہ کے کمشنر مسٹر ٹیلر کی پالیسی نے اسے باغی بننے پر مجبور کیا۔ وہ انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکا کیونکہ ان کی فوج اسکی فوج سے بہت زیادہ تھی۔ اور وہ فوجی فن سے کہیں زیادہ واقف تھے اسکی جگہ اکبر بھی ہوتا تو اسے بھی انگریزوں کے سامنے اپنا سر نیچا کرنا پڑتا تاہم اسکے بہادرانہ کام ہندوستان کے لوگوں سے خراج تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ صوبہ بہار کو اس بات کا فخر ہونا چاہیئے کہ اس زبردست فوجی انسان نے اسی کی سرزمین پر نشو و نما حاصل کی اور اسی کی زمین پر پروان چڑھا۔

منظومات:

ترانۂ اردو

زبانِ خلق پر ہے نعرۂ مستانہ اردو

از فخر بہار یادگار داغ تاجدار سخن حضرت مبارک عظیم آبادی

ہمیں افسوس ہے کہ منظوم کلام کی ترتیب میں اپنے دامن کی تنگی کے باعث کتابت کے بعد رد و بدل کی ضرورت ہوئی۔ بعض شعرائے کرام کے کلام سے ہم ناظرین کو لطف اندوز ہونے کا موقع نہ دے سکے۔ اور بعض کی نظم اور غزل میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے پر مجبور رہے۔ لہذا شعرائے کرام سے ہم بصدق دل معذرت خواہ ہیں۔ والعذر عند کرام الناس مقبول۔ ان شاء اللہ باقی ماندہ پرکیف کلام جون اور جولائی کی اشاعتوں میں نظر سے گذریں گے۔

سید حسن امام حسن وارثی۔ رکن ادارۂ شعبۂ منظومات رسالہ ندیم

کہاں سے ہے کہاں تک دور میں پیمانۂ اردو
جسے دیکھو وہ ہے منّت کشِ میخانۂ اردو

کم و بیش اس کی جولاں گاہ ہے ہر قطعۂ ارضی
کہ دنیا کا کوئی گوشہ نہیں بیگانۂ اردو

یہ وہ مقبول ہے مقبولیّت کا جس کے سہرا
جگہ ہر دل میں ہے ہر دل ہے خلوت خانۂ اردو

مسلمانوں کو زمزم ہندوؤں کو حق میں گنگا جل
بٹی ہے اس طرح سب میں مئے خمخانۂ اردو

یہی تو وہ زباں ہے شمعِ بزمِ محفل جسے کہئے
جدھر دیکھا اُدھر پایا گیا پروانۂ اردو

یہ وہ لیلیٰ ہے مجنوں جس کا ہے ہر نطقِ انسانی
یہ وہ پیاری زباں ہے ہر زباں دیوانۂ اردو

زبانیں آ سکے قبضے میں جہاں بان زباں ہے یہ
سلامت یا الٰہی دولتِ شاہانۂ اردو

زبانوں میں اسی کو کجکلاہی زیب دیتی ہے
زمانہ ہے قتیلِ غمزۂ ترکانۂ اردو

یہ وہ رنگین زباں ہے کہتی ہیں رنگینیاں اس کی
کہ رنگینی سے رنگا رنگ ہے افسانۂ اردو

فقط اک ہند کیا سارا جہاں ہے کلمہ گو اس کا
پرستش گاہِ عالم بن گیا بت خانۂ اردو

مبارک اک ہمیں کیا نعرہ زن اس بزم میں نکلے
زبانِ خلق پر ہے نعرۂ مستانۂ اردو

قلعۂ رہتاس

از بلبلِ بہار حضرت سریر کابری مینائی گیاوی

آہ اے رہتاس اگلی عظمتوں کی یادگار　اے نشانِ بے نشاں اے عبرت آبادِ بہار
فخر آثار قدیمہ ہیں ترے نقش و نگار　قابلِ نظارہ ہے تیری خزاں دیدہ بہار
ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے آج تیری خاک کا
تو نمونہ ہے جفائے گردشِ افلاک کا

تجھکو دیکھا ہی کروں ہردم اسی قابل ہے تو　کتنے شاہانِ سلف کی آرزوئے دل ہے تو
نقشۂ بربادیٔ ہنگامۂ محفل ہے تو مگر　کاروانِ رفتہ کی اجڑی ہوئی منزل ہے تو
دہر میں تو انقلابِ دہر کا آئینہ ہے
تیری تاریخ کہن اک دفترِ پارینہ ہے

کوہ کی چوٹی پہ تیری راجدھانی الاماں　آسماں پر اک زمیں ہے یا زمیں پر آسماں
وہم کو بھی ہو نہیں سکتا رسائی کا گماں　پاؤں تیرے چھو سکا کب سون کا سیلِ رواں
مٹتے مٹتے بھی رہا ست جگ سے لیکر آج تک
کون جانے تو نے دیکھے کتنے منظر آج تک

تو نے دیکھی راجگانِ ہند کی سرکار بھی　قشقۂ صندل جبیں پر دوش پر زنار بھی
میہماں تیرے رہے اسلام کے جرار بھی　تجھ میں چمکی شیر شاہی عدل کی تلوار بھی
تو ہمیشہ اک انوکھی شان دکھلاتا رہا
پرچمِ اقبالِ اکبر تجھ پہ لہراتا رہا

تو وہی ہے آج لیکن وہ تری شوکت کہاں　کر دیا ہے تجھ کو ویرانی نے اک عبرت نشاں
اور اگر یوں ہی رہا وقفِ جفائے آسماں　مٹ کے رہ جائیگا اکدن تیری ہستی کا نشاں
ہر نفس دیتا ہے دنیا کو پیامِ انقلاب
ہر گھڑی پیشِ نظر ہے صبح و شامِ انقلاب

از حضرت جمیل مظہری ایم اے

یہ نظم عقیدۂ جبر و قدر میں مشہور جرمن فلسفی شوپنہار کے مشہور رعام نظریہ کے جواب میں لکھی گئی۔ (ندیم)

دل کی آنکھوں میں اترتی نہیں صورت اُسکی
گم ہوئی اس کے کرشموں ہیں حقیقت اُسکی

بے پناہوں کے لئے چاہیئے تخئیل پناہ
وہ نہ ہو بھی تو مسلّم ہے ضرورت اسکی

وہ جو سجدوں کا ہے طالب تو تعجب کیوں ہے؟
اپنی فطرت سے سمجھ لیجئے فطرت اُسکی

یہ مسلّم کہ خودی کا ہے نتیجہ تخلیق
مگر اے دوست ذرا دیکھ تو حرمت اُسکی

دل بہ "تحریک محبت" ہے غزلخواں اُس کا
گل بہ عنوان تبسم ہیں حکایت اُسکی

جب ہے افعال و نتائج کا تعلق ظاہر
تو مسلم نہ ہو کس طرح عدالت اُسکی

روح گھبراتی ہے تخئیل رہائی سے کیوں
گر یہ "قید قفسِ جسم" ہے لعنت اُسکی

ہوا ثابت کہ نہ ہونے سے ہے ہونا بہتر
ہو گئے ہم تو یہ ہونا بھی ہے رحمت اُسکی

یہ جو بازارِ تمدّن میں ہے ہنگامۂ حشر
تیری آزادی ہے ملزم نہ کہ قدرت اُسکی

مصلحت تھی کہ رہیں تیرے ارادے آزاد
مصلحت تھی کہ نہ دے دخل مشیّت اُسکی

مصلحت یہ کہ بنے ہستیٔ آزاد ایسی
کہ جسے دیکھ کے آسودہ ہو حکمت اُسکی

یہ مصائب کا ہجوم اور یہ حوادث کا نزول
غور کیجئے تو نظر آئے گی حکمت اُسکی

ہمیں کرتا ہے وہ مجبور کہ مختار ہوں میں
زحمتیں یہ بھی رہتی ہے مشیت اُسکی

چاہتا ہے کہ بتدریج یہ انسان ضعیف
ہو خدا یعنی مکمل ہو یہ صنعت اُسکی

سلطان المجاہدین سید شاہ سبحان احمد سہسرامی

از ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی

ہمارے صوبہ کے بلند ہمت نوجوان جناب سید شاہ سبحان احمد صاحب سہسرامی حج و زیارت کے لئے پاپیادہ سفر پر جس طور سے روانہ ہوئے ہیں وہ اخبار بین طبقہ سے پوشیدہ نہیں۔ موصوف ہمارے صوبہ کے مشہور اخبار نویس جناب سید سلطان احمد (اڈیٹر اتحاد پٹنہ) کے حقیقی برادر عزیز ہیں۔ موصوف سہسرام سے یکم رمضان سنہ ۱۳۵۸ھ (۲۰ دسمبر سنہ ۱۹۳۹ء) کو شبلی تنہائی میں روانہ ہوئے اور یہ التزام رکھا کہ ہر پانچ قدم پر دو رکعتیں نفل ادا کرتے جائیں گے۔ مذہبی حیثیت سے اس اقدام پر کس نوعیت سے نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ ہمیں یہاں اس سے غرض نہیں۔ پروفیسر سید احمد (الہ آباد یونیورسٹی) نے ایک مضمون میں اس سفر کی دینی نوعیت دکھانی چاہی ہے۔ اب اہل نظر جانیں کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہیں یا ناکام۔ بہرصورت دیا جیسے اس نوجوان پیادہ پا مسافر کے جوش ایمانی کو عمومی حیثیت سے سراہے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ ان دنوں وہ لاہور کے مضافات میں ہیں۔ دعا ہے کہ بخیر و خوبی اپنی منزل مقصود کو پہنچیں۔ موصوف جہاں جہاں سے گذرے اثنائے راہ کی اسلامی آبادیوں نے انکے خیر مقدم کیلئے دیدۂ و دل فرش راہ کیا۔ ملک کے ممتاز شعراء نے انکی شان میں نظمیں لکھیں۔ حضرت نوح ناروی نے موصوف پر اپنی ایک نئی نظم ارسال فرمائی جو درج ذیل ہے۔ ندیم

اے رب دیکھئے کہ حقائق آگاہ ہر پانچ قدم پر یہ نوافل سرِ راہ
مدحِ سفرِ پاک میں سبحان احمد اللہ بھی کہتا ہے کہ سبحان اللہ

دیگر

شیدائے محمدؐ محوِ احمد سبحان اللہ سبحان اللہ / سبحان احمد سبحان احمد سبحان اللہ سبحان اللہ
ہر پانچ قدم پر رستے میں دو رکعت نفلوں کا پڑھنا / تسلیم و رضا کی ہو گئی حد سبحان اللہ سبحان اللہ
اول تو مدینے کا عالم پھر پاک مزارِ شاہ امم / نادر حالی عمدہ گنبد سبحان اللہ سبحان اللہ
کیا لطف حضوری رہتا ہے دن رات وہاں پر رہتے ہیں / پہنچیں نہ جہاں ادراک و خرد سبحان اللہ سبحان اللہ
دنیا سے نہیں مٹنے والا اس حسنِ مسافت کا چرچا / از روزِ ازل تا روزِ ابد سبحان اللہ سبحان اللہ
ہر وقت مصلے پر سجدہ ہر آن بھروسہ مولا پر! / ہے تکیہ یہ ہے مسند سبحان اللہ سبحان اللہ
محبوب جہاں مرغوب جہاں مقصودِ جہاں مقبول جہاں / اعظم اکرم امجد ارشد سبحان اللہ سبحان اللہ
لوگوں سے دعائیں لیتے ہیں بزرگوں کو دعائیں دیتے ہیں / یہ راہِ خدا میں داد و ستد سبحان اللہ سبحان اللہ
آندھی آئے پانی برسے منزل کی طرف بڑھتے جانا / یہ سرگرمی یہ شد و مد سبحان اللہ سبحان اللہ
بطحا سے کبھی مل جائیگی یثرب میں کبھی ہو جائے گی / روضے کی زیارت حج کی سند سبحان اللہ سبحان اللہ
دم بھر میں یہاں دم بھر میں وہاں دن رات سفر یہ جوشِ سفر / ہر رات افضل ہر دن اسعد سبحان اللہ سبحان اللہ
مقصود وہی مطلوب وہی ظاہر بھی وہی باطن بھی وہی / دل میں ہی احد لب پر ہی صمد سبحان اللہ سبحان اللہ
احساس خود اپنا رہ نہ گیا سرشاری ذوق کامل میں / مستغنی فکر نیک و بد سبحان اللہ سبحان اللہ
رحمت نے ادھر چھینٹا کا دیا ملکوں سے ملک نے جھاڑو دی / جس سمت ہوئی آمد آمد سبحان اللہ سبحان اللہ
قسمت کی رسائی دل کی دعا امید کی حسن کوشش کی ترنگ / حضرت کی کشش قدرت کی مدد سبحان اللہ سبحان اللہ

گویا نوح کہے کیا نوح لکھے طوفانِ سخن کب تک لائے
اوصاف و فضائل ہیں بے حد سبحان اللہ سبحان اللہ

میری شاعری اور سامعین

از حضرت رضی عظیم آبادی

سننے والے شعر کے میرے جو کراہتے ہیں آہ / چوٹ سی اک دل پہ لگتی ہے نکل آتی ہے آہ
"واہ وا" کر اٹھتے ہیں سن کے میرے اشعار جو / وہ کچل دیتے ہیں میری شاعری کی روح کو
شعر میں پڑھتا نہیں ہوں "واہ واہی" کے لئے / یہ تو اک توہین ہے قومی سپاہی کیلئے
شاعری کرتا ہوں کہ گرماؤں انسانوں کے خوں / پیشہ ور شاعر نہیں ہوں میں کہ داد شعر لوں

سن کے یہ اشعار جن کے خون گرماتے نہیں
اف! وہ میری شاعری کو ہی سمجھ پائے نہیں

جو کہ آتے ہیں میرے اشعار سننے کے لئے / واہ کرنے کے لئے اور سر کو دھننے کے لئے
خیر سے کہلاتے ہیں جو کہ پڑھے لکھے جواں / نوکری کے واسطے کرتے ہیں جو پاس امتحاں
مستند جن کا غلامانہ ہے تعلیمی نصاب / بے خبر سے ہیں کہ آزادی ہے کیا کیا انقلاب
پست ہیں جن کے خیالات اور نظریں جنکی تنگ / جن کے دل کے گوشوں میں باقی نہیں کوئی امنگ
بوڑھی ہے جنکی جوانی زرد رو جن کا شباب / دوپہر کو جن کا پیلا پڑ چکا ہے آفتاب
جن کے جذبوں کو غلامی نے کچل کر رکھ دیا / چٹکیوں میں کھلتی کلیوں کو مسل کر رکھ دیا
خون کے بدلے ہے پانی جن کی نسوں میں رواں / شرم آتی ہے مجھے تو جن کو کہتے نوجواں
جو کہ ہیں ڈرپوک، بزدل، بے حمیت بے خبر / ہے جھکا جن کے سبب دنیا میں ہندوستاں کا سر
جن کے آگے جنگ آزادی کی قیمت کچھ نہیں / سامنے جن کے امارت اور غربت کچھ نہیں

چاہتا ہوں نظم کے شعلوں میں انکو ڈالنا
شعر کی گرمی میں پگھلا کر سپاہی ڈھالنا

وہ سپاہی جن کے سینے میں ہے دل بازو میں دم / دوش پر ہے جنکے لہراتا بغاوت کا علم
وہ سپاہی کھیل سمجھیں جو مصائب جھیلنا / جو کہ آگ اور خون سے ہنس ہنس کے جانیں کھیلنا
وہ سپاہی دم میں جو لوہے کی کڑیاں توڑ کر / جو کہ دیو مرگ کا بھی رکھ دیں پنجہ موڑ کر
وہ سپاہی جنگ آزادی میں جو کہ لڑ پڑیں / جو غریبی کے لئے سرمایہ داری سے لڑیں
وہ سپاہی لوٹ لیں جو فرقہ واری کی دکاں / جن کا نصب العین ہو آزادی ہندوستاں
وہ سپاہی دہلے جن کے نعروں سے ظالم سماج / جن کے للکاروں سے کانپ اٹھے یہ خونی سامراج
وہ سپاہی جو بدل دیں موت کا اندھا نظام / جس میں سرمایہ ہے حاکم اور محنت ہے غلام
وہ سپاہی جو کہ جنگی دیوتاؤں سے لڑیں / امن دائم کے زمانے میں جو پیغمبر بنیں!

سننے والوں کی رگوں میں گرم خوں دوڑینگے جب
شاعری سمجھی گئی ہے میری، میں سمجھوں گا تب

نغمۂ بہار

از جناب صبا رشیدی ام-اے بی-ال سابق اڈیٹر فطرت

جب سارے جگت کے والی نے
گلزارِ عدم کے مالی نے
اک باغ لگایا ہستی کا

ہاں حسن کے نوریں مندر میں
جب پہلے پریم مراری نے
اک راگ الاپا ہستی کا

جب مست بنانے والے نے
جب سندر موہن ساقی نے
میخانہ بسایا ہستی کا

میثاق کے رنگیں رندوں کو
جب صدر بزم جمالی نے
اک جام پلایا ہستی کا

فطرت نے خمارِ رنگیں میں
اک مستی کی انگڑائی لی
اور ساری فضائیں جاگ اٹھیں

اور حسن کی دیوی کے لب پر
اک ہلکی ہنسی سی لہرائی
اور عشق کا دیوتا چونک پڑا

اک بار ضیائیں پھوٹ پڑیں
ترلوک کی رنگیں محفل پر
ترلوک کے بانی اترائے

کچھ نور کی پریاں اٹھلا کر
آکاش کی اونچی منزل پر
کچھ اپنی زلفیں بکھرائے

نغمائیں فضائے شبگوں میں
اور ساز شوق کامل پر
کچھ گیت انھوں نے دہرائے

بھارت کے بہاریں رت پر
گنگا کے طلسمی ساحل پر
بس نوریں نغمے لہرائے

اک بار مگدھ کے ذروں سے
زردوسی نغمے پھوٹ پڑے
اور ڈالی ڈالی جھوم گئی

کچھ کونپل پھوٹی شاخوں میں
پھر غنچے چٹکے بہائے
اور رنگ برنگ کے پھول کھلے

کچھ کلیاں جنک کے باغوں میں
چن چن کے کبھی لائی تھی صبا
اور سارا دیس مہک اٹھا

فردوس شمائم کلیوں سے
اک سورج جوت کا پھول بنا
اور سیتا اس کا نام پڑا

اس حسن کی دیوی سیتا نے
بھارت میں پرچم لہرایا
اک سیتا رام کا شور ہوا

ہر بت کے جمال کافر میں
حسن اس کا پھوٹا اور نکھرا
"رومان محبت" تازہ ہوا

بھارت کے جبین تاباں پر
گنگا کے روئے درخشاں پر

مشرق کی فضائے خنداں پر　　خورشید جہاں آرائے سحر
چمکا تھا ہمارے ماضی کا
شہرہ تھا ہمارے ماضی کا

گونجی تھی مگدھ کے کاشانوں میں　　کرشن کنھیا کی مرلی
فردوس محبت گونج اٹھا
گوتم کو اسی کے ذروں نے　　روحانی بات بتائی تھی
کچھ دھیان ہوا کچھ گیان ملا
اور جین دھرم کے بانی نے بھی　　پائی یہیں اک دن مکتی
اور ہستی کا کچھ بھید کھلا
سلطان جہاں شرف الدین　　مخدوم بہاری فردوسی
خورشید ولایت شمع ہدیٰ
اسلام کے سچے خادم نے　　اللہ کے سچے شیدا نے
نغمات حقیقت چھیڑ دئے
ناقوس کے شور پیہم میں　　اللہ کا نغمہ گونج اٹھا
ہندو و مسلماں ایک ہوئے

اک ذرا اسی کے ذروں سے　　پھوٹی تھی ضیائے مہر مبیں
تھا اوج پہ ماہِ علم و ہنر
اک ذرا اسی کے ٹیلوں پر　　نالندہ کا تھا اک حصن حصین
ہر ذرہ یہاں تھا رشک گہر
اک ذرا اسی کی وادی میں　　چلتی تھی نسیم شعر آگیں
ہر سبزہ تو تھا زمزمہ گر
ہیں بیدل[1] و راسخ[2] جوشش کے　　نغمات حسیں خوابیدہ یہیں
استاد جہاں تھے شاد و اثر
فریاد و صفیر و راز و حقیر　　اک ایک نے کی تھی رکھوالی
گلزار سخن کے پھولوں کی
اور شوق و خیال سحر بیاں　　کس کس کا سناؤں قصہ یہاں
اے آہ اب اتنی تاب کہاں
گل پھول بہت سے اب بھی ہیں　　اس اجڑے ہوئے گلشن میں صبا
اللہ کرے پروان چڑھیں
آزاد و تمنا ماہر فن　　علامہ عظیم بے ہمتا
گلزار سخن میں پھیلیں پھولیں

ہیں شمس[3] و مبارک بیدل بھی　　گلزار سخن میں نوا پیرا
دنیائے سخن آباد کریں
اک سوز مجسم ہیں بیتاب　　اک شاعر فطرت ہیں بینا
شہباز تخیل شاد رہیں

علامہ سلیماں فخر زماں　　مولانا مناظر گیلانی
ہیں علم و ادب کے مہر و قمر
مولانا نجیب و ریاست بھی　　اور قاضی و داؤد و طاہر بھی
ہیں باغ ادب کے چیدہ ثمر

پرویز و جمیل و شرار ماں　　اور نجم ہدیٰ گیلانی بھی
ہیں چرخ سخن کے حسیں تارے
اور شرف جلیلی نسیم اختر　　محفوظ و شفیق نجم ندوی
قدرت کے ہیں رنگیں شہپارے
وہ یاس و شفیع زمزمہ خواں　　وہ حشر و جگر کا شور فغاں
اک ایک ہیں ان میں نجم سحر
رنجور و حمید و جوہر ہیں　　باطن ابھی ہیں کے گل تر ہیں
ہیں پھول کوئی اور کوئی ثمر
سرمایۂ شعر و جان سخن　　وہ پیکر عفت فخر زمن
وجدان تخیل کا تارا
وہ رشک ملک بلقیس جہاں　　یعنی وہ حجاب سحر بیاں
قدرت کا وہ قدسی شہپارا
فخر خواتیں فخر جہاں　　وہ شعر و ادب کی روح رواں
مخفی و سکینہ راز و وفا
سب اپنے وطن کی کلیاں ہیں　　عصمت کی بہار خنداں ہیں
اس دیس میں کیا کیا پھول کھلا
ہیں اور بہت سے لالہ و گل　　شمشاد و صنوبر اور سنبل
کس کس کی کہانی سنئے گا
رات آئی فضا تاریک ہوئی　　ہر سمت سے چھائی خاموشی
اب نغمۂ شاعر ختم ہوا

[1] مرزا عبدالقادر بیدل [2] شیخ غلام علی راسخ [3] پروفیسر حافظ شمس الدین [4] پروفیسر عبدالمنان [5] مظہر حسین بیتاب [6] وجیہ الدین شہسرامی [7] اختر شہسرامی [8] رام ... [9] حضرت ... عظیم آبادی [10] محترمہ سکینہ گیا [11] محترمہ راز عظیم آبادی [12] محترمہ عائشہ شہسرامی وفا

یہ دنیا!

از جناب اختر قادری بلیاروی ایم-اے

یہ دنیا! کشمکش کی جور کی پیکار کی دنیا
یہ دنیا! کلفتوں کی رنج کی آزار کی دنیا

یہ دنیا! جس میں ہر سو ظلم کی ہے گرم بازاری
یہ دنیا! جس میں ہر گوشے میں پلتی ہے سیہ کاری

یہ دنیا! جس میں لفظ رحم ہے معنے سے بیگانہ
یہ دنیا! جس میں ہمدردی ہے خود غرضی کا پیمانہ

یہ دنیا! جس میں ہے فقدان الفت کا مروت کا
یہ دنیا! جس میں ہے طوفان نفرت کا عداوت کا

یہ دنیا! جس میں سفلے مورد الطاف و عزت ہیں
یہ دنیا! جس میں اہل علم و عرفاں غرق ذلت ہیں

یہ دنیا! جس میں استبدادیت لیتی ہے انگڑائی
یہ دنیا! جس میں حریت ہے مجبور جبیں سائی

یہ دنیا! جس میں خون مزدور کا پانی سے ارزاں ہے
یہ دنیا! جس میں جو زردار ہے فرعون ساماں ہے

یہ دنیا! جس میں نیکوں کو نہیں ملتی اماں کوئی
یہ دنیا! جس میں بیکس کی نہیں سنتا فغاں کوئی

یہ دنیا! جس میں کم ظرفوں کو حاصل جاہ و سطوت ہے،
یہ دنیا! جس میں نخوت ہے قساوت ہے شقاوت ہے

الٰہی! ایں جہاں با فطرت ما در نمی سازد
جہانِ تازہ فرما کہ طرح دیگر اندازد

خیالات کی رَویں

از مولوی سید ناظر امام صاحب بیخود ندوی

اے زینت و زیبائی اے خوبی و رعنائی
اے محو خود آرائی اے جان تمنائی

محروم جواب اپنے مکتوب نیاز آگیں
شاخیں مرے ارماں کی پھل پھول کہاں لائیں

میں پیکر حیرانی - تصویر پریشانی
سکھیوں کی نہیں صحبت عشرت کی فراوانی

تفریح و تفرج ہے قصہ ہے کہانی ہے
گویا کہ نہ خط لکھنے کی آپ نے ٹھانی ہے

فرمائیے تو صاحب، رنجش کا سبب کیا ہے
یہ طور ستم کے کیوں - یہ ظلم کا ڈھب کیا ہے

کب میری وفاؤں کے انداز میں فرق آیا
کیا میں نے اُسے نہ دے ڈالا دل کا تھی سرمایا

ابنائے زمانہ میں سرشار مئے فرحت
امواج مسرت میں ڈوبی ہوئی ہے خلقت

دن آج ہے ہولی کا پچکاریاں چلتی ہیں
بے تاب تمنائیں سینوں میں مچلتی ہیں

افسوس! یہ ساماں ہوں اور آپ نہیں آتیں
کیا ایسی بہاریں بھی بے لطف گذر جاتیں

آباد ہے جو گھر ہے برباد فقط ہم ہیں!
دل شاد ہے اک دنیا - ناشاد فقط ہم ہیں

اس حال میں اے بیخود اک دست نے فرمایا
پائل کی بجیں جھنکاریں دیکھو بھی تو کون آیا!

منگل تالاب کی ایک رات

از جناب جوہر زیادی

آہ وہ تالاب ہاں جس کے کناروں پر کبھی — چاندنی راتوں میں باندھا تو نے عہد دوستی
آہ وہ تالاب کی پھر سبز سبز آغوش میں — بیٹھ کر وہ تیری باتیں وادیٔ خاموش میں
مضطرب کرتی ہیں روحانی ملاقاتیں سبھی! — خون رُلواتی ہیں اب وہ چاندنی راتیں مجھے
ثبت صحن باغ میں جو ہیں محبت کے نشاں — کہہ رہی ہیں عشق کی گذری ہوئی وہ داستاں
یاد ہے وہ تیرا گانا ہاں درختوں کے تلے — وہ شرابی مسکراہٹ وہ محبت کے مزے
ہاں گھنی شاخوں پہ اکثر سبز ٹھنڈی چھاؤں میں — میں نے پہنائے ہیں جوڑے تیرے نازک پاؤں میں
ہاں لب تالاب کی میز دں پہ اکثر بیٹھ کر — گفتگو کرتے تھے باہم عشق کے عنوان پر
حسن کی مئے پی کے ہر شئے مست تھی مخمور تھی — عشق کے نغمات سے ساری فضا معمور تھی
اے مرے محبوب سچ کہنا تجھے بھی یاد ہے — آہ وہ تالاب برسوں سے جو غیر آباد ہے

چمن اردو

از جناب سید بدرالدین احمد صبر رضوی سربری مخدوم آبادی - گیاوی

اللہ رے بہار چمنستان معانی!! — ہر پھول کی خوشبو ہے جدا رنگ جدا ہے
اردو کا چمن جس نے کیا ہے تر و تازہ — اے خاک دکن وہ ترے کوچے کی ہوا ہے
اے خاک اودھ تو بھی ہے رشک گلستاں — جو پھول ترے باغ میں ہے روح فزا ہے
ہے سارا زمانہ تری خوشبو سے معطر — اے دھلی مرحوم تری بات ہی کیا ہے
اے خاک بہار اپنی لطافت کی بدولت — جو نخل ہے تجھ میں تر و تازہ ہے ہرا ہے
زندہ ہے جہاں میں سخن راسخ[1] و بیدل[2] — ہر مصرعۂ تر میں اثر آب بقا ہے
سونی ہے بڑی انجمن عشرت[3] و شاد[4] آج — محفل سے ابھی شوق[5] سخن سنج اٹھا ہے
آزاد[6] و سرِیر[7] و شفق[8] و یاس[9] و مبارک[10] — ان سب پہ اگر ناز ترا ہے تو بجا ہے
رنگینیٔ فکر سخن تازہ سے جس کی — دامن ترا ہر رنگ کے پھولوں سے بھرا ہے
ہر گل کو ہے لیکن خلش خار کا شکوہ — بدلی ہوئی کیا صبر زمانے کی ہوا ہے

ایسے بھی ہیں کچھ پھول ترے باغ سخن میں
بازار میں بھی جن کو کوئی لا نہ سکا ہے

---

[1] شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی [2] مرزا عبدالقادر بیدل [3] سید احمد علی عشرت گیاوی [4] سید الشعرا علی محمد شاد عظیم آبادی [5] ظہیر حسن شوق نیموی [6] علامہ حافظ سید محمد فضل حق آزاد گیاوی [7] جمیل بہار سید محمد عباس سریر کا بری گیاوی [8] افصح الفصحا علامہ حکیم سید حسن مرتضی شفق عمادپوری گیاوی [9] حکیم سید شاہ محمد الیاس فردوسی بہاری [10] فخر بہار. یادگار داغ ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی۔ (صبر)

اقبالؔ

از جناب فخر الدین خاں صاحب بھاگلپوری ڈسٹرکٹ سب رجسٹرار مونگیر

معدنِ علم و عمل مخزنِ صد فضل و ہنر   موجدِ طرزِ سخن لطفِ زباں را مصدر
اے کلام تو پسندیدۂ اربابِ نظر   ایکہ پروردۂ بیانِ تو اثر سرتاسر
نیّرِ برجِ سخن روحِ معانی بودی
حافظِ نکتہ بیاں سعدیِ ثانی بودی

بندشیں چست تو فقرے ہیں غضب کے نایاب   جتنے الفاظ ہیں وہ پھول ہیں گویا شاداب
تجھ سے وابستہ ہیں شیریں سخنی کے ابواب   فکر روشن ہے تری رشکِ ضیائے مہتاب
دلربا طرزِ سخن شوخی بھی انداز بھی ہے
سننے والوں کے لئے سوز بھی ہے ساز بھی ہے

طائرِ فکر کی ہے عرش کے اوپر پرواز !   نغمہ سنجی کی جو پوچھو تو عجب سوز اور ساز
زمزمہ سنجِ حقیقت تھی تری طبعِ گداز   ہیں بھرے دامنِ افکار میں گلہائے مجاز
تیرے اعجاز کی اک خلق تماشائی ہے
جلوۂ شانِ کلیمی ہے مسیحائی ہے

بقعۂ نور مگر "بانگِ درا" کی ہے زمیں   تابشِ روئے سخن آئینۂ مہر مبیں
ہیں منیا گیر تری نظم سے در ہائے ثمیں   یہ صباحت چمنِ دہر کے پھولوں میں نہیں
اے ہمہ شکل تو مطبوع ہمہ جائے تو خوش
دلم از عشوۂ شیریں شکر ہائے تو خوش

اے خوشا تو جو ہوا سلسلہ جنبانِ کلام   فکر ہے شانہ زنِ زلفِ پریشانِ کلام
جلوۂ شانِ کلیمی ہے تری شانِ کلام   گلِ اعجاز سے لبریز ہیں دامانِ کلام
بے بہا وزن میں ہیں دام میں گو سستے ہیں
دستِ پروردِ یدِ بیضا کے یہ گلدستے ہیں

مست ہیں بزم میں افراط سے مئے نوش   آج یاروں میں امنگیں ہیں نہ وہ جوش و خروش
ہے گلوگیر جو غم قلقلِ مینائے خموش   سر بکف جام ہے محفل میں سبو خانہ بدوش
گریہ شیشہ کو ہے کوزوں کو گراں جانی ہے
شدتِ غم سے نشاطِ مئے کا لہو پانی ہے

مسلمِ تفتہ جگر گھلتا ہے جوں شمع گداز   اب نئی لے سے نہیں کوئی بھی یاں زمزمہ ساز
کوشش زن کون کرے نغمۂ تہذیبِ حجاز   ساز گر ہے بھی تو بے نغمۂ مضراب ہے ساز
"نالے بیتاب ہیں نغموں سے نکلنے کے لئے
طور آمادہ ہے اس آگ میں جلنے کے لئے"

مولینا سید منظر علی ندوی مرحوم

از حضرت اختر شہسرامی ایم اے

صحبت علم و ادب میں کل جو تھا مصروف کار
آج سویا ہے کفن پہنے ہوئے زیر مزار

ایک مدت تک ادب کی جس نے خدمت دل سے کی
محسن اردو میں پھر اُس کا نہ ہو کیوں کر شمار

اُسکی خلوت میں بھی جلوت کا ملتا تھا مزا
تشنگان علم اُس کے گرد تھے پروانہ وار

علم کا پرچار ہو پیارا وطن پھولے پھلے
بس یہی دُھن میں لگن اُسکے رہی لیل و نہار

ذوق تھا نشر و اشاعت کا ہمیشہ سے اُسے
الہمشیر بھی ہے اُسکے نام کی اک یادگار

مدتوں اخبار مسلم کا تھا وہ روح رواں
اُس کے دم سے سارے صوبہ میں تھی [illegible]

شاق ہے سب کے دلوں پہ مولوی منظر کی موت
دوستوں کو کس طرح بتلائیے آئے قرار

"صبح کا ستارہ"

از جناب محمد عبد الغنی صاحب شمس گرائے پرسرائے

سوئی تھی ابھی سیارے سحر تاریکی کے گہوارے میں
اور باہم پیہم سرگوشی تھی جاری اک اک تارے میں

موجوں کی ہر گہرائی میں پنہاں تھا سکون دریا بھی
ملفوف ردائے خاموشی میں جنگل بھی تھا صحرا بھی

ہر سمت کو نصب اک خیمہ تھا ظلمت کا کالا بادل تھا
دوشیزۂ صبح کے چہرے پر ڈالے ہوئے کوئی آنچل تھا

افلاک پہ پھیلے اور بکھرے کچھ تارے صرف چمکتے تھے
عشاق کی صورت آنکھیں پھاڑے راہ کسی کی تکتے تھے

حوران بہشتی دنیا میں سوئی تھیں اونچے کوٹھوں پر
زلفیں تھیں بکھری عارض پر مستی کی دھری تھی ہونٹھوں پر

تھے مست مئے خواب غفلت میخانۂ ہستی کے میکش
بے ہوش پڑے تھے سب کے سب پیمانۂ ہستی کے میکش

اک لہر تبسم زاد دڑی دوشیزۂ عالم کے لب پر
ہونے لگی طاری کیفیت رعشے کی سی ہر کوکب پر

ناگاہ ستارہ صبح کا اک دامان افق پر آیا نظر
یا شعلۂ جوالہ تھا وہ یا رعنائی کا اک پیکر

یا عکس ید بیضی تھا وہ یا پرتو نور تجلی تھا
یا داغ تھا عاشق کے دل کا جو بنکے شرارہ چمکا تھا

یا برق بھی کوئی چشمک زن یا محو تبسم اختر تھا
یا کوئی قبائے سیمیں میں لپٹا ہوا از سر تا سر تھا

یا کوئی شمع فروزاں تھی خلوت گہ ناز حجاباں میں
یا کوئی چراغ روشن تھا افلاک کے گور غریباں میں

فطرت نے اک انگڑائی لی انوار کی بارش ہونے لگی
عالم نے ذرے ذرے میں بیداری کی لہر دوڑ گئی

اب ساری دنیا سیمیں تھی دریائے ضیا میں نہا دھو کر
اور اٹھ بیٹھا عالم کا عالم میٹھی نیندیں سو سو کر

مندر سے صدائیں آنے لگیں ناقوس و جرس کے بجنے کی
اشنان کی خاطر جانے لگی مہ پاروں کی ٹولی ٹولی

مسجد میں اذانوں کے نعرے افلاک سے سر ٹکرانے لگے
جس کی ہیبت اور عظمت سے باطل کے دل تھرانے لگے

سنسار کے پالنہار کو اے شمس چلو اب یاد کریں! کیوں ناحق نظم سرائی میں ہم وقت اپنا برباد کریں

آنسو

از جناب سید مرتضیٰ حیدر صاحب نقاد عظیم آبادی

جو لگی دل کی بجھا دیتا ہے وہ دریا ہے تو
موجۂ اندوہ ہے تو اور حباب بحرِ غم
وہ جرس ہے تو کہ ہے جس کی خموشی میں صدا
صدمہ و غم سے فقط رہتی نہیں سازش تری
قطرے قطرے میں ترے فطرت کی ہے وہ داستاں
تیرے قطرے وہ کہ شرمندہ ہے جس سے ابرِ تر
دُرِ مکنوں سے کہیں توقیر میں برتر ہے تو
تو جو فطرت کے دبستاں کا نہ ہو آکر مشیر
چشم سے انساں کی تو بہتا ہے جب وقتِ دعا
تجھ سے بہتر زخمِ عصیاں کا کوئی مرہم نہیں
تیرا ہر قطرہ گناہوں سے ہے بخشش کی سبیل
زشتِ اعمالی کے دفتر تجھ سے ہوتے ہیں سفید
اس جہاں میں تجھ سے کب خالی ہے کوئی اہلِ دل
وائے اُن آنکھوں پہ جن آنکھوں میں گریاں تو نہیں

ہیں سمندر تیری موجیں گرچہ اک قطرہ ہے تو
تیرے قطروں میں نہاں ہے صورتِ دُرِّ دوام
کارواں جیسا بھی ہو چل جاتا ہے تجھ سے پتا
ہوتی ہے ذوقِ طرب سے بھی کبھی بارش تری
جس کو کرتی ہے ادا تیری زبانِ بے زباں
جب لڑی تجھ سے تو پھیکی ہو گئی آبِ گہر
ابرِ نیساں سے کہیں تاثیر میں بڑھ کر ہے تو
کتنے ہی بچوں کا خوں ہوتا رہے لے آبِ شیر
تجھ سے اخلاصِ دلی کا صاف چل جاتا ہے پتا
آبِ رحمت سے ترا قطرہ اثر میں کم نہیں
رونی آنکھوں سے نہ کیونکر شاد ہو ربِّ جلیل
تیری ہی بارش سے ہے سرسبزیِ کشتِ امید
ہے جگہ آنکھوں میں تیری تو ہے دل سے متصل
منزلِ ویراں ہے وہ جس میں کہ مہماں تو نہیں

کسی کی یاد

از جناب قیصر عثمانی

(سانیٹ)

یہ آب جو یہ مستانہ ہوائیں
کسی کی یاد پیہم آ رہی ہے
دلِ مہجور کو تڑپا رہی ہے
نہ کیوں اشکوں کے ہم دریا بہائیں

طیورِ خوش نوا میرے لئے کیا
یہ سبزہ اور یہ رنگیں ابر پارے
متاعِ نظرِ حسن تھے یہ پیارے پیارے
کروں کیا اس جہانِ رنگ و بو کا

عروس نو بنی ہے آج فطرت
ہر اک شئے جلوہ گاہ آرزو ہے
جدھر میں دیکھتا ہوں تو ہی تو ہے
کہ امڈا ہے مرا دریائے الفت

چلی آ اے مری رعنا چلی آ
کہ ہے ویران آغوش تمنا

شرابی سنسار

از جناب شفیق قادری سونبرسادی (گیا)

(جناب سہیل عظیم آبادی کے افسانہ "شرابی" مطبوعہ ندیم ماہ اگست سنہ ۱۹۳۹ء سے متاثر ہو کر ——— "شفیق")

کتنا مورکھ ہے سنسار — آگ کو یہ کرتا ہے پیار
زہر کا پیالہ پی پی کر — مرنے کو ہے تیار
بوتل میں کیا چیز بھری ہے — یہ کیوں سوچے؟ کیا درکار؟
ڈوب رہی ہے اس کی ناؤ — اور یہ گاتا ہے ملہار
ناداں! سوچ تو ہو گا کیا — جینا ہو گا تجھ پر بار

کھو دیگی وہ تجھ کو اک دن
جس سے گیا تو جیون ہار

مقصد حیات

از جناب نجم کاکوی

(ایک انگریزی نظم کا آزاد ترجمہ)

پیپل کے درخت کو تو دیکھو — صدیوں سے یونہی کھڑا ہوا ہے
دو دو تن کی حیات سے گل تر — نکہت افزائے بوستاں ہے

انساں کا بھی حال ہے اسی طرح — گر زندہ رہے جو ایک ساعت
کر جائے وہ کار نیک ایسا — نام اس کا جہاں میں جاوداں ہے

لیکن برسوں ہی زندہ رہیئے کیا فائدہ ایسی زندگی سے
جب حاصل زندگی نہیں کچھ اس زیست پہ موت کا گماں ہے

انتظارِ شوق

از جناب محمد کمال احمد صاحب رازؔ بھاگلپوری

جانِ تمنا جلد آجاؤ
دل کو نہ اب میرے تڑپاؤ
نغمۂ شیریں اپنا سناؤ
آؤ آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوش ربا دکھلاؤ!

چاند سی صورت پر میں قرباں
موہنی مورت پر میں قرباں
گوری رنگت پہ میں قرباں
آؤ آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوش ربا دکھلاؤ!

آتی ہیں یاد تمہاری باتیں
کیسے کٹیں گی برساتیں
اس پر کافر کالی راتیں
آؤ آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوش ربا دکھلاؤ!

گل جیسے رخسار دکھادو
لمبے بال اک بار دکھادو
مرتا ہوں دیدار دکھادو
آؤ آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوش ربا دکھلاؤ!

دل میں اک ہیجان بپا ہے
اشکوں کا طوفان بپا ہے
محشر میری جان بپا ہے
آؤ آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوش ربا دکھلاؤ!

آؤ غم کے گیت سناؤں
اپنا حالِ زار دکھاؤں
روؤں اور تم کو بھی رلاؤں
آؤ آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوش ربا دکھلاؤ!

عشق کے نغمے گاتی آؤ!
زلفوں کو لہراتی آؤ!
ناز و ادا دکھلاتی آؤ!
آؤ آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوش ربا دکھلاؤ!

اگلی صحبت یاد نہیں ہے؟
پہلی الفت یاد نہیں ہے؟
میری محبت یاد نہیں ہے؟
آؤ آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوش ربا دکھلاؤ!

جناب محمد کمال راز

جناب قمر کاردی

جناب سید عبد الغنی فخر مرحوم
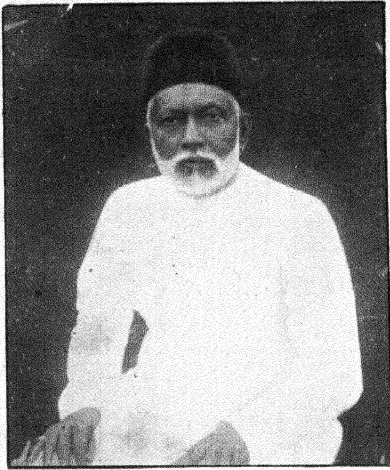
عالیجناب خان بہادر احمد علی صاحب بالقابہ
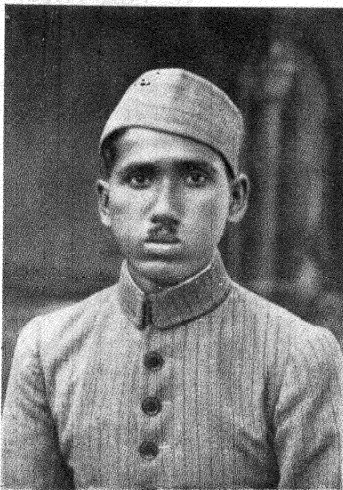
جناب مکیش عظیم آبادی

جناب ایم ذکی اختر
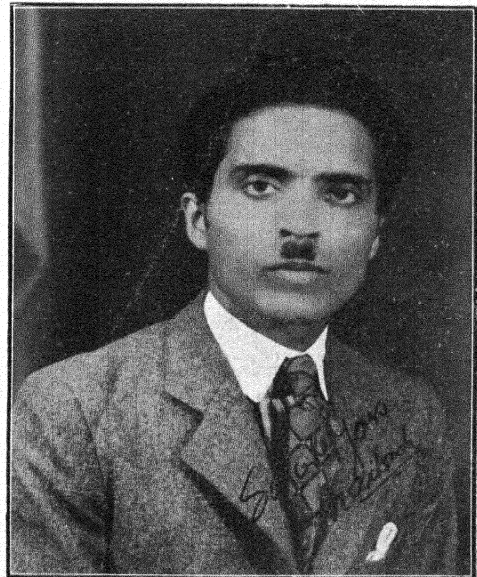
بادۂ کہن

سید محمد عبدالغنی فخر

اسم شریف محمد عبدالغنی تخلص فخر - والد کا نام وحیدالدین احمد - آپ کا سلسلہ نسب سادات سے تھا - آپ کے جدامجد موضع ہاشمی چکواہ بقانہ وارث علی گنج - ضلع گیا سے منتقل ہو کر ضلع پٹنہ شہر بہار شریف محلہ ابیری میں آکر بسے تھے - آپ کی ولادت بمقام بہار شریف ۱۲۶۹ھ فصلی ہوئی - اور سال رحلت ۱۹۰۵ء تعلیم کا سلسلہ بہار ہی میں رہا - عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم کے علاوہ انگریزی کی تعلیم انٹرنس کلاس تک کی ہوئی تھی عمر کا زیادہ حصہ ضلع گیا میں بعہدہ اورسیری ڈسٹرکٹ بورڈ صرف ہوا - حضرت جناب حضور شاہ امین الدین احمد قدس سترہٗ سجادہ نشین خانقاہ حضرت مخدوم الملک حضرت شیخ شرف الدین رحمتہ اللہ علیہ بہاری سے سلسلہ قادریہ میں شرف بیعت حاصل تھا - طبیعت بہا اختراع اور جدت پسندی مائل تھی - چنانچہ اپنے نام کے بجائے اکثر حروف ع غ ف ق (عبدالغنی فخر قادری) تحریر فرماتے - شعر و شاعری میں کسی سے تلمذ حاصل نہ تھا - علاوہ شغل سخن کے یا تو اپنے فرائض منصبی سے شغف تھا یا صناعی و دستکاری میں وقت صرف ہوتا تھا -

عہد وکٹوریا کے چھوٹے پیمانہ کے پوسٹ کارڈ پر حضرت سعدی کی "کریما" نہایت صاف حرفوں میں تحریر فرمانا آپ کا محض بائیں ہاتھ کا کھیل تھا - اس کا ایک نسخہ اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں محفوظ تھا - اپنے احباب کو بھی اس کا ہدیہ کیا تھا - ممکن ہے کہیں اور بھی موجود ہو - اسی طرح بوند کی صرف دال پر مکمل سورۂ قل ہو اللہ مسطور کیا کرتے تھے - نجاری اور آہنگری سے لیکر نازک تر کام خوش نویسی تک کا بغیر تکلف انجام فرمایا کرتے تھے - نجاری میں بھی صناعی اعلیٰ قسم کی ہوتی تھی - پلنگ کی بناوٹ میں اشعار بنتے تھے، اور پھول پتی کاڑھنا تو معمولی بات تھی -

فن شاعری میں صنائع و بدائع سے خاص موانست تھی اور کسی صنف شاعری میں فکر طویل کے کبھی محتاج نہ ہوئے - خداداد عطیہ و ذہانت اعلیٰ سے مکلف تھے - فی البدیہہ اور قلم برداشتہ لکھا کرتے تھے - حضرت امیر خسرو کے رنگ و زبان میں چیستان خوب فرماتے تھے، دراصل میں اپنا انداز خاص بھی ضرور رہا کرتا - افسوس کہ بیاض معمہ کسی کو پسند آگیا - دو ایک جو زبان زد ہے ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے :-

۱ - تین جان اگیارہ پاؤں - چلے پھرے وہ گاؤں گاؤں - سیدھی سادی ہلکی پھلکی - بوجھو اسکو فخر بہاری -   ریل کی پہیلی

۲ - ایک تریا کی سندر مورت - ٹھہر ہی گھڑی میں دیکھوں صورت - پاؤں نہیں دن رات چلے وہ -
اپنی جگہ سے پر نہ ٹلے وہ - سوئی رکھتے سیئے نہ جانے - اس کو بوجھیں اچھے سیانے .... گھڑی

۳ - کیست آں مرد مسلماں کہ بدارد وہ پاے - سر ہزار و کمرش پنجہ و عبد آل بسرش ساختہ جاے .... عبدالغنی

ن غ ی

مادہ تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے - اور برجستہ فرماتے تھے - اور انواع و اقسام سے منظوم فرما دیتے - مثال کے طور ذیل کیا جاتا ہے :-

قطعہ تاریخ رحلت جناب شیخ امید علی صاحب ساکن قصبہ مروح ضلع گیا

جناب شیخ امید علی حمیدہ خصال — کہ روح در جسد روح بود درامثال
خجستہ یوم جبینے کہ ہمدراں روزے — فراغ یافت ز تعمیر عید گاہ شمال
بہ ورد کلمۂ طیب بشکر مقالی کرد — سپرد جاں بہ جہاں بخش ایزد متعال
برداشت خشیۂ حق از رہ خردمندی — نہ داشت خرخشۂ مطلق ز جاہ و مال منال
حکیم شیخ محمد مواصل عالی — مہین پور گرامی آن ستودہ خصال
برائے سال بہ فخر بہار ایما کرد — ز فیض ملہم غیبی دو مصرعہ شد فی الحال
کہ بست و پنج ز ماہ مبارک رمضان — ہزار و سہ صد و بدھیدہ ز ہجری سال

دیگر:-

چوں بہ دختِ مولوی اطہر حسین آنکہ در جھٹولی عنت دولتخانہ اش
گشت تزویج محمد یوسف آنکہ ہست دولتپور راز ہٹ خانہ اش

چشمِ بے سرمہ مدام او را سیاہ جائے دِل در گیسوے بے شانہ اش
بست و یک شوال و یوم السبت بود زیب تن شد جامۂ شاہانہ اش

از خطاب خاتمہ ظاہر گشت فخر (۱۳۱۲ھ) سال عقد دخل شاہانہ اش،
بست و ہفتم از جمادی الآخرین بود سہ شنبہ کہ از جانانہ اش

در ڈیاواں فخر بعد از نیم شب گشت پیدا پور در کاشانہ اش
از تفضل سال ہجری شد عیاں (۱۳۱۶ھ) عین حق گفتا یکے فرزانہ اش (۱۳۱۶ھ)

عمر خضر و طالعِ اسکندری حق دہد با شوکتِ شاہانہ اش
دولت آباداں - بہی خواہاں شاد کور بادا دشمنِ دیوانہ اش،

بُد پریشاں گو ہر تاریخہا
نظم کردم فخر ایں دُردانہ اش

دیگر:-

اندھیری شب آج کیا بلا ہے کہ دل ہے خستہ تپاں جگر ہے یہ پنج ماہ ربیع ثانی شگون بد سی بھری مگر ہے،
وہ دیکھو محزون ستم رسیدہ بلکتے آتے ہیں میر گھسو طبیعت اپنی سنبھالئے تو اور کہئے صاحب کہ کیا خبر ہے،
کہوں میں کیا۔ غم کی داستاں ہے عجب طرح کا یہ حادثہ ہے خدا کے سب ہیں یہ کارخانے اُسی کا بندہ ہے جو بشر ہے
اُنہی کے گھر کا یہ واقعہ ہے کہ منجھلا لڑکا ابو مظفر سدھارا جنت کو وائے حسرت کہ خستہ ماں ہے حزیں پدر ہے
یہ سُنکے دل دم سے ہو گیا فخر نہ دل ٹھکانے نہ ہوش برجا پہونچ کے دیکھا تو سب فسردہ ہیں اور ماتم زدہ وہ گھر ہے
بفکر تجہیز و غسل ہیں سب یگانے بیگانے دوست ساتھی خموش بیٹھے جو ہم نے سوچا تو سال نکلا غم پسر ہے

۱۳۱۷ھ

دیگر:- قطعۂ تاریخ تعمیر مسجد واقع محلہ بنولیہ بہار شریف :-

بہ حسن سعی و بہیں انتظام مولا بخش شد ایں عمارتِ مسجد مجدد ا ستیار
بہ سجدہ آمدہ فخر بہار و رد نمود سُبحان ربی الاعلیٰ اسال سہ بار

۱۳۰۵ فصلی

افسوس کہ زمانہ کے دستبرد نے آپ کے اکثر سفائن کو ضایع کر دیا۔ کاش وہ کلام اور ضایع مطبوعہ ہوتے اور سخندان اس سے لطف اندوز ہوتے۔ یوں تو فی زمانہ کلکتہ اور اجمیر کا سفر ایک دورات کی بات ہے اور کون ہے جو ان مقامات کی سیر و زیارت سے مشرف نہیں ہوا۔ اس میں چنداں کوئی اہمیت نہیں، مگر ایک زمانہ تھا کہ یہ سب سفر یادگار ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے سفر کے احوال کو قلمبند کر دیا اور طبیعت موزوں ہو گئی تو اوّل سفرنامہ کلکتہ میں ۱۴۳ - اشعار کہے، دوسرے میں ۳۰۴ - اسی طرح سفرنامہ دہلی مشتمل بر ۱۵ اشعار ہیں۔ اور سفرنامہ بنارس میں ۲۲۶ اشعار - پہیلی و معمہ وغیرہ کی تعداد ۲۰۷ تھی جو تلف ہو گیا۔ سفرنامہ کے چند اشعار قارئین کرام کے لئے ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

سفرنامۂ کلکتہ :-

آیا جب سال چھیاسی (۱۲۸۶ء) کا مہ سپٹمبر ہوا دل کا ارادہ کہ ہو کچھ سیر و سفر
اپنے صوبہ سے نکلنا نہ ہوا تھا گاہے گرچہ تھا خدمتِ سرکار میں ہر روز سفر

. . . .

موقع اس کا ہے کہ کچھ وصف ہو اسٹیشن کی ہے کم و کاست لکھوں لطف صحت ہو جس پر
ہے کسی در پہ لکھا ٹیلیگراف آفس صاف ہے بکنگ آفس و وے اوٹ کسی تختہ پر
کمرہ ایک خاص ہے آراستہ بہر لیڈیز دوسرا اوسطے مردوں کے سجا ہے بہتر
ایک کمرہ ہے الگ جس میں ہے کلنر کی دوکاں چاہے جو لیجیے مے برف و طعام خوشتر
پوسٹ آفس ہے لکھا در پہ کسی کمرہ کے ہر طرف بھیڑ ہے اشخاص کی اندر باہر
تازہ پھل پان مٹھائی و کباب و روٹی بیچتے پھرتے ہیں خوانوں میں صدائے دیگر
منتظر سب تھے کھڑے چیزوں کو اپنے سر پائے اتنے میں آ گئی موقع پر ادھر یا سنخر
کوئی مسافر کی صدا ہے کہ کواڑا کھولو کوئی بہشتی کو پکارے ہے کھڑا چلا کر
کوئی اندر ہے سے چلاتا ہے پانی پانڈے کوئی تماشہ میں ہے کھڑکی سے نکالے ہوئے سر

مدعا یہ ہے کہ جو آئی ادھر ڈون ٹرین ۔۔۔ ہم تھے موجود لیے بیگ بچھاون گٹھر
ایک ہی کمرہ میں ہم لوگ نے لی جا کے جگہ ۔۔۔ اک پہ والد تھے ادھر ایک پہ ہم دو برادر
بعد کچھ دیر کے معمول پر تب ریل کھلی ۔۔۔ ٹھیک جس وقت ہوا پندرہ منٹ بارہ پر
کیفیت راہ کی کچھ لکھ چلوں حتے المقدور ۔۔۔ گرچہ شب تھی پر میں بیدار رہا تا بہ سحر
لیٹ جاتا تھا میں جب کھل چکی گاڑی اور پھر ۔۔۔ اٹھ کے بیٹھا جو پہنچ جاتے تھے اسٹیشن پر
جا بجا جب کہ پہاڑوں میں گذر ہوتا تھا ۔۔۔ منکشف ہوتا تھا قدرت کا نمونہ مجھ پر

الغرض قطعِ منازل ہوئے ہوڑا پہنچے ۔۔۔ دن کا جب تین بجا راہ چلے پانچ پہر

جمعہ کو کھلتا ہے معمول ہے ہوڑے کا پل ۔۔۔ کھل چکا تھا وہ نہیں جا سکے اس کے اوپر
لیک جب کھل چکے پل واں کا تو دستور یہ ہے ۔۔۔ کہ مسافر کے لیے کھلتے ہیں کئی اسٹیمر
اور محصول بھی کم ایک ہی پیسہ فی کس ۔۔۔ الغرض ہم بھی چڑھے لے کے ٹکٹ پھرتی کر

مسجد ناخدا دیکھا۔ گئے ایڈن گارڈن ۔۔۔ جنرل آفس بڑی بازار کبھی تھیٹر
مارکٹ مدرسہ تالاب اور سروے آفس ۔۔۔ ہائیکورٹ اور کبھی زو گئے دل چاہا جدھر
کوک کیلوی و ہملٹن کی دوکانیں اے واہ ۔۔۔ اسمتھ اسٹینسٹریٹ اور دوکان آسلر

سڑکیں کتنی ہیں اور ہوتا ہے تقاطع کتنا ۔۔۔ کہکشاں ایک ہے ہو اس سے تشبیہ کیونکر
دل یہ کہتا ہے کہ از روئے صفائی کہہ دو ۔۔۔ ہے خطِ نور سے تیار بساطِ چوسر

باغ زولوجی علی پور کا سبحان اللہ ۔۔۔ ایک عجب لطف کی ہے چیز پئے جشن بشر
طوطی و فاختہ و شارک و طاؤس و بط ۔۔۔ اشتر و شیر و زرافہ و غزال و بز و خر
جمع ہیں اس میں طیور اور بہایم صدہا ۔۔۔ سیکڑوں وضع کے ذی روح ہیں اندر باہر
مارکٹ واہ رے بازار عجب منظر ہے ۔۔۔ کس قدر چیز یہاں بکتی ہیں ہر دوکاں پر
چیزیں ہر جنس کی موجود بافراطِ تمام ۔۔۔ ادویہ، اغذیہ، اجناس و گل و میوہ تر
قابل دید ہے بازار عجب دلکش ہے ۔۔۔ لوگ ہر جنس کے ہیں بیع و شرا میں مضطر
ہندو و پارسی و ترکی و برمی عربی، ۔۔۔ مصری و جرمن و روسی و فرنچ و بربر،
وصف ہم لکھ چلیں کچھ یاں سے اڈن گارڈن کی ۔۔۔ روحِ کلکتہ جسے کہیے تو کچھ ہو نہ ضرر
دلکشا روح فزا، بہر تفرج جا یست ۔۔۔ گوئی گلگشتِ مصلا کہ بود زیں کمتر

دیگر:-

خامہ مدت سے تو ہے گوشۂ عزلت میں چھپا ۔۔۔ چار دیوار قلمدان سے نکل باہر آ
لکھ سفرنامۂ اضلاع شمال و مغرب ۔۔۔ جس کے شایق ہیں مرے بعض عنایت فرما

الغرض اس مختصر مقالہ میں اتنی گنجائش کہاں کہ پورا سفرنامہ پیش کیا جا سکے مشتے نمونہ از خروارے اور بس۔

ایک ترجیع بند موسوم بہ "بوٹ" از نتیجہ خیال فخر بہاری مرحوم درج ذیل ہے :۔

دوستو دیکھو میرے ہاتھ میں ایک بوٹ ہے یہ
جثہ میں کم تو ہے خوبی میں مگر اونٹ ہے یہ

یہ وہ شے ہے کہ ہے مقبول غریب اور رئیس، شوق لذت سے چرا لیتا ہے دانہ کو سئیس
اس کے کھانے کے طریقے بھی بہت ہیں دس بیس گھگھنیاں اس کی بنیں اس کی قبولی ہو نفیس

دوستو دیکھو .... الخ

جس قدر اس کو بڑا ہم کہیں وہ ہے تھوڑا فربہی لائے قوی تن ہو اسی سے گھوڑا
اس کی توصیف سے جس شخص نے مونہہ کو موڑا سُن کے یہ نظم خیال اپنا دہیں پر چھوڑا

دوستو دیکھو .... الخ

منفعت پاتے ہیں اس جنس سے ہر خاص و عام رات کو دن کو اسے کھائیے کیا صبح کہ شام
کب کسی کو ہوا اس جنس کی خوبی میں کلام، عرف میں لوگ اسے کہتے ہیں ہندی بادام

دوستو دیکھو .... الخ

دل ہو خوش ذکر سے اس کے جو گذر جائے خیال حلوے خوب اس کے بنیں جس سے طبعیت ہو نہال
مونگ کیا ماش بھی کیا چیز ہے، ارہر کیا مال ہوتی ہے کیسی مزہ دار بھئی بوٹ کی دال

دوستو دیکھو .... الخ

کیا قلم میں مرے قوت کہ لکھے اس کی ثنا ہا انا یعنی نخود اس نے کہا نام اپنا
کھائیگا اس کو جو عادت سے رہیگا وہ بنا اک عجب چیز ہے بھائی مرے یہ جنس چنا

دوستو دیکھو .... الخ

ساگ کھائیں تو وہ ترشی کا مزہ اس کا واہ جھنگریاں دیکھیے کیا چیز ہیں سبحان اللہ
اپنے ہر حال میں پیارا ہے ہر خالق سے گواہ خام سے خشک تلک اس کی ہے ہر شخص کو چاہ

دوستو دیکھو .... الخ

انکریاں طوطوں کو مرغوب ہیں در طشت قفس ستو کچھ باندھ کے لے ساتھ مسافر بے کس
بھوسی اس جنس کی بکری کی غذا ہے از بس الغرض کرتے ہیں اس چیز کی ہر کوئی ہوس

دوستو دیکھو .... الخ

اس کی فصل آتے ہی اجل بھی گرہ کو کھولے، سیر دو سیر نہ تلوائے تو کچھ بھی تولے
جا نکلیے اس سے کنارہ نہ تو سادے بھولے واقعی لطف عجب دیتے ہیں سب کو ہولے

دوستو دیکھو .... الخ

اس کے کھانے میں امیروں کو کوئی عار نہیں، اس کا ملنا کسی قریہ میں بھی دشوار نہیں
نہ یہ جس میں ملے۔ کہیئے اسے بازار نہیں، کون ہے جس کو کبھی اس سے سروکار نہیں

دوستو دیکھو .... الخ

بھون کھایا، کبھی کچا کبھی تلوا دیکھا کبھی ستو کبھی پختہ کبھی حلوہ دیکھا
ہے مزہ دار یہ جس حال میں جلوہ دیکھا الغرض اس کو بجائے من و سلوے دیکھا

دوستو دیکھو .... الخ

ہے جو زامی تو اسے کھائے فقط ہوگا صحیح　قبض کی جس کو شکایت ہو وہ پائے تفتیح
اس کے کھانے سے حسیں ہو جو ہو بدشکل قبیح　سچ تو یوں ہے کہ ہے دجّال علالت کا مسیح

دوستو دیکھو .... الخ

رکھ دو بھگوا کے تو جھاڑ آئیں نکل لو پھر کھاؤ　اور بھی چاہو تو روغن میں نمک میں تلواؤ
دانت مضبوط اگر ہیں تو لو کچا ہی چباؤ　کچھ مضرت نہیں ہر حال میں ہے اس سے بناؤ

دوستو دیکھو .... الخ

سچ تو یہ ہے کہ اگر اس کے ہوئے تم عادی　پھر تو خلعے ہو سدا کیسے ریاحی بادی
پہلواں تم ہو جواں بخت سدا اسے ہے شادی　فخر دینے کو ہیں موجود مبارک بادی

دوستو دیکھو مرے ہاتھ میں ایک کونٹ ہے یہ
جُثّہ میں کم تو ہے خوبی میں مگر اونٹ ہے یہ

آپ کی تصانیف میں صرف ایک کتاب موسومہ "ٹرینینٹ اللاسکول" چھپ سکی جو اسکولوں کے مبتدیوں کے لئے بہت مفید ہے۔ انگریزی الفاظ معہ اردو معنی منظوم ہے۔ وہو ہذا

گاڈ خدا　انجل فرشتہ　پروفٹ نبی　ریلیشن رشتہ
اسٹار تارا　اکلپس گہن　پورچ اوسارا　یارڈ صحن

....

ملازمت سے بوجہ علالت رخصت لیکر وطن مالوف آئے اور چندے علیل رہکر بہ ۱۹۰۸ء انتقال فرمایا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون
زبان کی خدمت جتنی کر سکتے تھے نہ کر سکے۔　اپنی اولاد میں چار صاحبزادے مسمیان ابوالحسن محمد طیب ڈپٹی مجسٹریٹ مرحوم۔ ابوالخیر محمد طاہر ڈپٹی مجسٹریٹ۔ خان بہادر ابونصر محمد عمر فی الحال نائب کمشنر پٹنہ ڈویزن اور ابوالفتح محمد عثمان وکیل بہار شریف کو اپنی یادگار چھوڑا۔

میر حسیر عظیم آبادی

از مولوی مسعود الرحمٰن صاحب ندوی

ہمارے اُن باکمالوں میں جو وقت سے پہلے دار آخرت کو چل بسے اور دنیا ان کے کمالات سے روشناس نہ ہوسکی سید محمد قاسم رضوی حسیر عظیم آبادی بھی ہیں۔ یہ اردو کے اچھے انشاپرداز اور شاعر تھے۔ مختلف علمی رسالوں (ادیب الہ آباد وغیرہ) کے ایڈیٹر رہے۔ نقاد اور دوسرے بلندپایہ رسالوں میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے، امپیریل لائبریری کلکتہ میں فہرست سازی کی خدمت بھی انجام دی۔ وفات ۱۹۲۲ء میں ہوئی، عمر چالیس سے زائد نہ تھی۔ سر دست ایک غزل نذر ناظرین ہے، انشاء اللہ ندیم کے کسی آیندہ نمبر میں مرحوم کی علمی، ادبی، زندگی کو اجاگر کرنے کی کوشش کرونگا۔

غزل

فلک پر جو شمس و قمر دیکھتے ہیں
تو ہم اپنا داغِ جگر دیکھتے ہیں

سُنا ہی یہ جب سے وہ ہیں آنیوالے
تو پھر پھر کے دیوار و در دیکھتے ہیں

وہ آئینہ کے رُوبرو محوِ صورت
اِدھر دیکھتے ہیں اُدھر دیکھتے ہیں

شفق اُنکی آنکھوں میں کیا جلوہ گر ہے
کہ شام و سحر دوپہر دیکھتے ہیں

نزاکت کی حد ہی کہ ہر ہر قدم پر
وہ چلنے سی پہلے کمر دیکھتے ہیں

نہ مرتے ہیں بُت پر نہ حُوروں پہ زاہد
تماشا صنم کا مگر دیکھتے ہیں

کلیسا ہو، کعبہ ہو یا طُورِ سینا
سب اُسکے ہی جلوہ کا گھر دیکھتے ہیں

وہی ہے حسیر آپ کہتے ہیں سب سے
جسے کُو بکُو در بدر دیکھتے ہیں

افسانۂ حاضرہ:۔

فرض کی قربانگاہ پر

چند افکار اور چند محسوسات کا ایک افسانوی خاکہ

از حضرت جمیل مظہری ایم۔ اے۔ پبلسٹی آفیسر گورنمنٹ آف بہار

(سلسلے کیلئے ملاحظہ ہو بہار نمبر ۱۹۳۵ء)

مطبوعہ حصے کا خلاصہ:۔ سلیمہ اور محمود کے گھروندے کی محبت جوان ہو کر ایک تلخ حقیقت بنتی ہے لیکن سماج کا قانون سلیمہ کو محمود سے بیاہنے کی جگہ محمود کے بڑے بھائی حامد سے بیاہ دیتا ہے۔ شاعر مزاج محمود سلیمہ کو محبت کے نام پر سماج کی دیواریں پھاند جانے کا مشورہ دیتا ہے لیکن سلیمہ روایت پرست دماغ سوسائٹی کے اس فیصلے سے بغاوت کرنے سے انکار کرتی ہے۔ وہ محمود کو ایک خط لکھ کر فلسفۂ معاشرت کی روشنی میں قدیم طریقۂ ازدواج کی خوبیاں جتلاتی ہے حسن و عشق کے رنگین نظریوں کا مضحکہ اڑاتی اور محمود کو موجودہ حالت پر قانع رہنے کی تلقین کرتی ہے۔ تلقین کرتی اور خود احساس فرض کے ماتحت اپنے جذبات کو ہمیشہ کیلئے کچل دینے کا عزم کرتی ہے —— وقت کی گرم رفتاری جذبات شوق اور احساس فرض کی اس کشمکش کو ایک افسانہ بناتی جا رہی ہے۔ ایک ایسا افسانہ جس کے صفحوں پر عورت کے خاموش آنسوؤں نے کہیں کہیں زندگی کے بولتے ہوئے نقوش بھی بنا دئے ہیں۔

(۸)

ایک ہفتے سے کچھ زیادہ گذر گیا لیکن ملاقات جسے کہہ سکتے ہیں وہ مجھ سے اور محمود سے ایک لمحے کے لئے بھی میسر نہ آئی۔ وہ گھر میں آتے آکر بیٹھتے اور پھر فوراً ہی اٹھ کر چلے جاتے۔ گفتگو کا موقعہ نہ ملتا۔ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ کنواری زندگی میں اکثر ایسا اتفاق ہوا کیا ہے کہ وہ مجھ سے اور میں ان سے ہفتوں کیا مہینوں تک نہیں بولی۔ آنکھوں ہی لڑائیاں بھی ہوئیں اور صلح نامے بھی مرتب ہوتے رہے لیکن اب کے دل کا کچھ اور ہی حال تھا کچھ اور ہی خواہش اور کچھ اور ہی تقاضا۔ اس ایک ہفتے میں اس نے کئی بار میرے قابو سے باہر ہو جانے کی کوشش کی مچلا اور بری طرح مچلا۔ میں اسے زنجیر پہنانا چاہتی اور زنجیروں کا فلسفہ اسکی سمجھ میں نہ آتا۔ میں کہتی کہ فطرت کے حدود کو پہچان وہ کہتا کہ فرض کے حدود کو فطرت کیوں کہتی ہو۔ غرض مجھ میں اور میرے دل میں وہ مباحثہ شروع ہو گیا جس کا سلسلہ عمر کی درازی کے ساتھ جوانی کی شام تک قائم رہے۔

ان چند دنوں میں محمود کی زندگی میں کچھ ایسی کایا پلٹ ہو گئی تھی کہ گھر کے کونے کونے میں۔ انکے متعلق سرگوشیاں ہونے لگی تھیں جتنے منہ اتنی زبانیں کوئی کہتا کہ لڑکا باؤلا ہو گیا ہے۔ کوئی کہتا کہ نہیں کچھ پینے لگا ہے شرابی کی آنکھ نہیں چھپتی۔ ایک دن آتو جی نے خود مجھ سے آکر میرے کان میں کہا کہ کل محمود میاں آدھی رات کو نشے میں چور آئے اور صبح تک دالان کی پلنگڑی پر پڑے سو یا کئے۔ چچی جان حسب عادت انکا اترا ہوا چہرہ اور چڑھی ہوئی چتونیں دیکھ کر کہتیں۔ بیچارے کے گھروندے کی سہیلی محمود نے چھین لی۔ کیسے جی نہ کڑھائے۔ کبھی ہنسی ہنسی ان سے مخاطب ہو کر کہتیں جی نہ کڑھاؤ محمود میں تمہارے لئے چاند سی بنو ڈھونڈ کر لاؤنگی سلیمہ کس گت کی ہے تو یہ ناک پھلکی منہ طباق۔ وہ سنتے اور کھسیانی ہنسی ہنستے۔ میں سنتی اور گھونگھٹ میں مسکرا کے رہ جاتی۔ لیکن یہ خیال رہ رہ کر میرے دماغ کی رگوں کا خون چوس رہا تھا کہ محمود کو میری محبت برباد کر رہی ہے اور میں اسے بچا نہیں سکتی —— بہر حال مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اسے برباد ہونے کے لئے چھوڑ دیا۔ اور خود اپنی حفاظت کی فکر میں مبتلا ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ انکی نگاہ اور میرے دل میں جو ٹکریں ہوتی رہتی ہیں وہ ایک نہ ایک دن میرے "احساس فرض" کو ضرور پاش پاش کر کے رہے گی۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہو اسکی نظروں سے بھاگنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب وہ

اپنے بھائی کے پاس آتے تو میں فوراً وہاں سے اٹھ جاتی - ان کے قدموں کی چاپ سنتی اور بلا تمہید اٹھ کھڑی ہوتی ان کے بھائی خانگی معاملات میں ہر چھوٹی سی چھوٹی بات کو پرکھنے اور کریدنے کے عادی ہیں میری اس اضطراری حرکت کو بھی انھوں نے دیکھا اور دیکھتے رہے - یہاں تک کہ ایک دن تنہائی میں مجھ سے پوچھ ہی بیٹھے - کیوں صاحب! یہ محمود جب آتا ہے تو آپ بھاگ کیا جاتی ہیں میرے تریا چریتر نے صاف گوئی میں مصلحت سمجھتے ہوئے کہا - تو کیا آپ نہیں جانتے کہ وہ بچپن سے مجھ سے پیار کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ آپ پیار کرنے کی چیز ہی ہیں - میں نے کہا - پیار کی نظروں سے گناہ بھی جھانکتا ہے - بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ حسین عورت کو دیکھ کر جوان آدمی کی نظر سے گناہ بھی جھانکتا ہے خدا نہیں جھانکا کرتا ——— میں نے جھنجھلا کر کہا وہ جو کچھ بھی ہو یہ میرا طبعی میلان ہے - میرا بس ہو تو میں ان سے پردہ کروں ——— کہنے لگے کہ میرا بس ہو کیا معنی - آپ کی ہر چیز آپ کے بس میں ہے - لیکن گذارش یہ ہے کہ اس فیصلے پر نظر ثانی کی جائے - یہ تو کسی طرح ممکن نہیں کہ آپ محمود سے پردہ کریں - میرے خیال میں اسکی کسی حال میں ضرورت نہیں - ——— اور اگر آپ جھنجھلا میں نہیں تو یہ عرض کرنے کی جرأت کروں کہ مجھ بیوی کی عصمت سے زیادہ بھائی کی خاطر عزیز ہے -

انکی گفتگو چونکہ مذاق کا پیرایہ اختیار کر رہی تھی اس لئے میں نے بھی وہی انداز اٹھا لیا - "بہت اچھا جیسی آپ کی رائے ہو لیکن میں بھی آخر جوان عورت ہوں - اور ان کے ساتھ کی کھیلی ہوئی ——— اگر کوئی نوع دگر ہو تو مجھ پر الزام نہ رکھئے گا - میں نے ہنستے ہوئے کہا اور انھوں نے ایک قہقہے کے ساتھ جواب دیا - بسم اللہ اگر آپ کے پاس خوش قسمتی سے ایک دیور ہے تو مجھے بھی اللہ میاں نے سالیاں دے رکھی ہیں - میں ہر صورت اپنا انتقام لے لونگا - غرض میری اسکیم ایک مضحکہ ہو کر رہ گئی - لیکن عورت کے دماغ میں اسکیموں کی کیا کمی ہو سکتی ہے - میں نے اپنے مقاصد کے لئے دوسری اسکیم بنانی شروع کی - میرے شوہر حال ہی میں بیرسٹری کی ڈگری لے کر یورپ سے آئے تھے - اور کسی ہائی کورٹ میں اپنا پیشہ شروع کرنا چاہتے تھے - میرے صوبے میں گو ہائی کورٹ کھل چکا تھا لیکن میں نے انکی قوت فیصلہ کو اپنی بہت سی مضبوط اور کمزور دلیلوں سے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ وطن کو خیرباد کہہ کر کلکتہ ہائی کورٹ میں اپنے پیشے کی مشق شروع کریں - بیچارے میری محبت کے ہاتھوں موم کی ناک تھے راضی ہو گئے ——— لیکن اعزا نے ایک خاصہ طوفان اٹھایا - بڑے بوڑھوں نے نشیب و فراز دکھلائے بڑی بوڑھیوں نے قسمیں دے دیکر سمجھایا - لیکن بیرسٹر صاحب اپنے فیصلے اڑے رہے - وہ کیا اڑے رہے میں اڑی رہی ——— غرض میں نے کلکتہ کے لئے رخت سفر باندھا اور وطن کو خیرباد کہنے میں بہت ہی عجلت سے کام لیا اور یہ آپ جانتے ہیں کہ کیوں؟ ——— میں محمود کی نگاہوں سے بھاگ رہی تھی - اور بھاگ آئی - کلکتہ پہونچکر میری زندگی نے شادی کے بعد اطمینان کا پہلا سانس لیا - یہ سوچکر کہ محمود کے حلقہ نظر سے نکل کر دل کو سیدھی راہ پر لے چلنا شاید ممکن ہو گا آپ کا شاعرانہ ذوق مجھے بیوفا سمجھے گا اور سمجھنا بھی چاہئے - اس لئے کہ میں نے محبت کے مقدس ترین جذبے سے بیوفائی کی اور اس کی حقیقت کو کچھ نہ سمجھی مگر یہ کہ ایک عارضی ہیجان - ایک وقتی تموج - ایک نفسیاتی کمزوری ——— بہر کیف میں نے شوہر کے لئے عاشق کو چھوڑ دیا ——— گو اس کے ساتھ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اگر میں چاہتی تو دونوں سے بیک وقت کھیل سکتی تھی - عمر بھر کھیل سکتی تھی - مگر میرے غرور کے لئے اس دو عملی زندگی میں کوئی لذت نہ تھی - میرے غرور نے اسے گوارا نہ کیا کہ خود فریب کھاؤں اور دو مردوں کو فریب دیتی رہوں ——— زندگی کی بولائی ناؤ نے گھاٹ کو پہچاننے میں غلطی کی یا نہیں اس کا فیصلہ وقت کر سکتا تھا اور اس نے کیا -

(۹)

کون کہتا ہے کہ عقل جنون پر فتح نہیں پا سکتی اور عشق کے جذبات فرض کے احساس کے ماتحت مغلوب نہیں کئے جا سکتے - میں نے خود انہیں ایک حد تک مغلوب کیا اور حالات اگر میرے ناموافق نہ ہوتے تو شاید پوری طرح مغلوب کر لیتی -

میں کلکتہ پہونچکر محمود کو بھولنے لگی ——— آپ سمجھیں گے کہ کلکتہ کی دلچسپیوں نے مجھے اپنے اندر گم کر لیا نہیں ایسا نہیں ہے مجھے تو اس شہر میں ہر جگہ نجد ہی کی ہوائیں چلتی ہوئی نظر آئیں - ہر جگہ جنون کی دعوت - سینماؤں میں جنون کی دعوت و ناچ گھروں میں جنون کی دعوت - سوسائٹی کے ہر رنگین مشغلے میں جنون کی دعوت ——— میں دل کی موت چاہتی تھی اور دنیا میرے دل کے واسطے ہر طرف زندگی کا تحفہ لئے کھڑی تھی - یہاں تک میں نے اس کے تقاضوں سے گھبرا کر اس کے دروازے اپنے اوپر بند کر لئے اور گھر سے نکلنا چھوڑ دیا - کتب بینی کا مجھے شوق تھا - میں نے کوشش کی اپنے کو کتابوں میں دفن کر دوں لیکن وہاں

بھی میرے لئے ادب لطیف کی معصیت تھی۔ کوئی ماہوار یا ہفتہ وار رسالہ کوئی ناول یا کوئی افسانہ کوئی دیوان یہاں تک کہ کوئی نظم اور کوئی غزل مجھے ایسی نہ ملی جس میں میرے دل کے لئے میرے دل کی وحشت کے لئے جنون کا پیغام اور جنوں کی دعوت نہو' شاعری محبت محمود کی سفارش کرتی' موسیقی میرے ضبط نفس کا مضحکہ اڑاتی' افسانے میرے احساس فرض پر طنز کرتے ——— اور مصوری حسن و عشق کی زندگی کے مرقعے پیش کر کے مجھے فرض کی دنیا سے خواب کی دنیا میں بلانا چاہتی' میں نے عاجز ہو کر ادب لطیف کے ساتھ تمام فنون لطیفہ سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ لیکن ان آوازوں کا میرے پاس کیا علاج تھا جو میرے ارد گرد گونجتی رہتیں۔ میرے مکان کے سامنے کالج کے چند لڑکے رہتے' راتوں کے سناٹے میں مادر علم سرورتی کے یہ ہونہار بچے جب موسیقی کی دیوی راگنی سے عشق بازی کا سبق پڑھتے تو میرا سویا سلایا ہوا دل انکی آواز سے چونک اٹھتا۔ اور انکی ہر تان مجھے محمود کا وہ گیت یاد دلاتی جو وہ اکثر تنہائی میں گایا کرتا تھا ؎

انا ڑی سیّاں کیا جانے پریت کی ریت

اور مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ محمود کی نشیلی آواز میرے دل میں اتر رہی ہے

ایک دن کوئی لڑکا کسی شاعر کی یہ غزل گا رہا تھا ؎

محبت بھی ہے اک عجب آشنائی
بہ معنی تعلق بصورت جدائی

میرا دل اچھلنے لگا اور میں نے محسوس کیا کہ اس "بہ معنی تعلق بصورت جدائی" میں میرا اور محمود کا افسانہ حیات بند ہے۔ اسکے بعد چند اشعار اور تھے' ہر شعر پر میرا دل ایک کروٹ بدلتا۔ یہاں تک کہ مقطع میں شاعر نے مطلع کے مضمون کو الٹ کر میری اور محمود کی داستان محبت کی جگہ میری ازدواجی زندگی پر طنز کیا۔

جمیل اس تعلق سے ہے فائدہ کیا
بصورت تعلق بہ معنی جدائی

اور میں چند لمحوں کیلئے سمجھنے لگی کہ واقعی ایسا تعلق سوسائٹی کی زبردستی اور سماج کا ظلم ہے ———

خدا سمجھے ان شاعروں سے جو اپنے دل کی شورشوں کو دوسرے دلوں تک پہونچانے کی کوشش کرتے اور اپنے ہیجان نفس میں ساری دنیا کو شریک کرنا چاہتے۔ صرف سلیمہ ہی کو نہیں بلکہ اس محبت کے ستائے ہوئے انسان کو جو اپنے دل کو سمجھا بجھا کر زندگی کی سیدھی راہ پر چلانا چاہتا' شکایت ہے ان شاعروں سے' ان افسانہ نویسوں

ان مطربوں اور رقاصوں سے۔ جو دلوں کو مچلنے کی ترغیب اور نفس کو بغاوت کا مشورہ دیتے ہیں اور نہیں سمجھتے' انسان ان کے نغموں کی مٹھاس میں گم ہو کر اگر ان تلخ حقیقت کو فراموش کر دے۔ جن سے اسکی زندگی اور اسکی سوسائٹی کی ترکیب ہے تو کیا ہو؟

جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا ان کے خوابوں کے پیچھے آوارہ رہے انہیں چاہئے کہ پہلے تمدن کا شیرازہ بکھیر دیں۔ سوسائٹی کے نظام اکھاڑ پھینکیں۔ فرض کی بندشوں کو ایک ایک کر کے کاٹ دیں۔ اور ان تمام ضرورتوں کا منہ بند کر دیں طبیعت کا قانون جن کی زبان سے بولتا ہے۔ اور جب یہ سب کچھ کر چکیں تو پھر اس کے بعد یہ فرمایش کریں کہ دنیا زندگی اور معاشرت کی ناقابل تردید حقیقتوں کو پوجنے کی جگہ صرف نوک پلک کو خط و خال کو رنگ و روغن کو پوجتی رہے۔ پریم ساگر میں غوطے کھاتی رہے پریم بانسری کی ہر دھن پر اپنی زندگی لٹاتی رہے۔ جب تہذیب کی رنگینیاں اور لطافتیں اور مجلس تمدن کی ساری رونق اور چہل پہل موقوف ہے صرف ان محرکات پر جو سوائے ترغیب جنسی کے ہمارے اندر کسی اور جذبے کو حرکت میں نہیں لا سکتے تو پھر بہتر یہ تھا کہ سوسائٹی کا ایک ایسا نظام ہوتا جس میں گھر نہ ہوتے گھر والے اور گھر والیاں نہ ہوتیں۔ ازدواج کا قانون نہ ہوتا' اولاد کی ذمہ داری نہ ہوتی ماں باپ نہ ہوتے' ماں باپ کے حقوق نہ ہوتے۔ یہی نہیں بلکہ سینوں میں ممتا کے شعلے نہ اٹھتے۔ پیٹ میں بھوک کی جلن نہ ہوتی۔ سردیوں میں ہمارے اعصاب کی ٹھٹھرن نرم گرم کپڑوں کا مطالبہ نہ کرتی۔ برسات میں بادل کی پھواریں ہم سے ایک چھت بنوانے اور ایک سایہ دار جگہ میں رہنے کی فرمایش نہ کرتیں ——— لیکن جب ایک ایسی سوسائٹی کی تشکیل ممکن نہیں ہے اور جب یہ تمام معاشرتی ذمہ داریاں ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ سکتیں ——— جب بھوک لگنا ناگزیر ہے جب ازدواج کا قانون سوسائٹی کو گھیرے ہے جب برادری اور سماج کے حقوق ہمارے چاروں طرف دائرہ کھینچے ہیں۔ تو پھر غور کیجئے کہ ان نظموں ان افسانوں ان گیتوں کے کیا معنی ہیں جو ہمارے دلوں کو گدگدا کر ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے ذوق نظر کے مطلوب کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دیں ساری زنجیروں کو توڑ دیں۔ تمام چار دیواریں توڑ کر ایک نعرہ ہو کے ساتھ پھاند جائیں۔ اور اناللہ۔ آزادی کی یہ ساری تبلیغ اور قانون شکنی کے تمام مشورے کس لئے ہیں۔ اپنی ایک خواہش کی غلامی کے لئے ———

میں نے اپنی ایک ذلیل خواہش کے لئے اپنے سماج کی بہترین خواہشوں کو نظر انداز کرنا نہیں پسند کیا اسلئے جہاں تک ممکن تھا محمود اور محمود

کی محبت کو بھلانے - اور بھلانے کی کوشش کرتی رہی سنہری رنجیروں کو پوجتی رہی تمناؤں کو بہلاتی رہی - محمود نے مجھے بیوفا سمجھا - میری شاعر قسم کی سہیلیوں نے مجھے بے مروت کہا - میں نے آنچل پھیلا کر ان کے طعنوں کو شکریے کے ساتھ سمیٹ لیا اور جس راہ کو اپنے لئے بہتر سمجھا اس راہ پر چل پڑی —— بلاشبہ مجھے اس راہ پر اپنے دل کی قربانی کرنی پڑی لیکن میں نے کسی طرح قانون شکنی کو گوارا نہیں کیا -

بہرحال میں نے جب یہ محسوس کیا کہ سوسائٹی کے رنگین مشغلے مجھے گرہست آشرم میں نچلا نہیں بیٹھنے دیتے تو میں نے لٹریچر میں پناہ لینی چاہی لٹریچر میں بھی جب مجھے پناہ نہ ملی - تو میں نے دماغ سے پوچھا کہ اسے بدبخت! روشنی بھینٹ اور راستہ دکھلا کہ خدا کی یہ بندی کدھر جائے - کدھر جائے بھاگ کر ان گیتوں سے جو مجھے لوریاں دیرہے ہیں کدھر جائے بھاگ کر خوابوں کی اس فضا سے جہاں محبت کے نغمے نیند جھڑک رہی ہیں —— دماغ اگرچہ اونگھ رہا تھا لیکن ابھی اسے پوری طرح نیند نہ آئی تھی اس نے جماہی لیکر کہا - کہیں نہ جا اپنے گھر ہی میں رہ اپنی دنیا آپ بنا —— میں نے اپنے گھر ہی کو اپنی دنیا سمجھ کر اسے بنانا شروع کیا اور کوشش کی انکے دھندوں میں اپنے کو گم کردوں کھو جاؤں ——

—— اور اپنے "دل کی آگ" کو چولھے میں جھونک دوں - اور اپنے دماغ کی الجھنوں کو سوئی اور دھاگے کی رشتہ دارانہ کشمکش میں الجھا دوں - یہ فیصلہ کر کے - میں نے جہاد شروع کیا - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خانداری کی مصروفیتوں نے مجھے بہت جلد اپنا لیا —— یہاں تک کہ میں محمود سے زیادہ انکی ہو گئی - محمود سے زیادہ ان کے متعلق سوچنے لگی -

میرے شوہر اپنے باورچی سے نالاں تھے وہ انکی پسند کے مطابق کھانا پکا نہیں سکتا اور یہ اپنی حد سے بڑھی ہوئی مروت کی بنا پر اسکو جواب نہیں دے سکتے تھے - غرض ایک کشمکش کو اس طرح حل کیا کہ ان سے کہا آپ اپنے باورچی کو تو اپنا اردلی بنا لیں اور اپنا باورچی خانہ باہر سے اندر منتقل کردیں - میں خود آپ کی مرضی کا کھانا تیار کرنے کی کوشش کرونگی کہنے لگے کہ جو کھانا آپ کی تکلیف کے بعد پلیٹوں میں آئیگا وہ میرے حلق سے اتر یگا کیونکر - میں نے کہا - شاعری چھوڑیئے آپ آج صاحب بنے ہیں اور میری اور آپ کی ماں بہنیں صدیوں سے یہی کرتی آرہی ہیں اور یہی کرتی رہیں گی - میں بچپن سے اسکی عادی ہوں اس کے علاوہ میرے ساتھ جو دائیاں آئی ہیں وہ میرا ہاتھ بٹائینگی آپ بسم اللہ کر کے جو کہتی ہوں وہ کیجئے - میں گھر کی مالکہ ہوں اور یہ مسئلہ میری مملکت کے حدود میں آتا - آپ کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں - وہ مسکرا کر خاموش ہوگئے اور میں نے باورچی خانہ گھر میں منگوا لیا - باورچی صاحب اب دن بھر ٹانگ پھیلا کر سویا کرتے اور بیڑی پیا کرتے - ان کے متعلق اب گھر کی نگرانی کے سوا کوئی خاص خدمت نہ تھی - میں ان کے عوض باورچی خانہ میں جلتی - اور اس کے باوجود انکی شکر گذار تھی کیونکہ اس جلنے میں میرے لئے سکون تھا - باورچی خانہ عورت کے لئے خود فراموشیوں کی ایک ایسی جنت ہے جہاں پہونچکر نہ سنگار کی ہوس رہتی ہے نہ خود آرائی کا جنون نہ بچوں کی پروا نہ پردیسی پیا کی یاد —— کم از کم میرا تجربہ تو یہی ہے کہ جب باورچی خانے میں ہوتی تو چولھے کی حقیقی آنچ کے سامنے محبت کی مجازی آنچ بہت کم تکلیف پہونچاتی - یہ خوف کہ سالن کہیں جل نہ جائے دال میں نمک کہیں تیز نہ ہو جائے - روٹی کہیں زیادہ تاؤ نہ کھا جائے مجھے اپنے دل سے باتیں کرنے کا بہت ہی کم موقعہ دیتا - اور جب دل سے باتیں موقوف ہوگئیں —— تو اس کے ساتھ محبت کا پیچ و تاب بھی خود بخود کم ہوتا گیا -

خانہ داری کی ان مصروفیتوں سے مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی اس لئے کہ میری پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں نئی تہذیب کی روشنی "زنان خانے" تک نہیں پہونچی ہے - میرے اباجان نے مجھے انگریزی کی کافی تعلیم دلوانے کے ساتھ جہاں تک پردے کی پابندیوں نے اجازت دی تھی مجھے نئی تہذیب سے روشناس بھی کرا دیا تھا لیکن ماحول کا اثر مجھ پر تعلیم کے اثر سے زیادہ تھا -

(۱۰)

آپ نے تصویر کا ایک رخ دیکھ لیا —— دیکھ لیا کہ ایک کمزور عورت نے کس طرح اپنے جذبات پر فتح پانے کی کوشش کی اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو —— ملاحظہ ہو کہ طاقتور مرد جس کے اعصاب میں فطرت نے غیر معمولی طاقتیں ودیعت کی تھیں کس طرح اپنے دل کی غلامی کرتا رہا —— وہ دل کی غلامی جو اکثر اوقات مرد سے عورت کی غلامی کراتی ہے —— یاد ہوگا محمود کا یہ عقیدہ تھا کہ عشق کا درد لذتوں سے معمور ہے اور اپنے اس عقیدے میں انکو اتنا غلو تھا انکی غزلیں ہمیشہ اسی خیال کی تبلیغ

کرتی رہیں۔ لیکن تجربے نے انہیں بتایا کہ یہ عقیدہ کچھ نہ تھا مگر ایک خالص شاعری۔ اگر درد میں واقعی لذت ہوتی تو ہرگز دوا کی تلاش میں انہیں بازاروں کی خاک نہ چھاننی پڑتی۔ اپنی محبوبہ کو کھو کر اسکی جدائی کے درد میں نہ جانے ان کے لئے لذت کیوں نہ رہی کہ انہیں اس سے چھٹکارا پانے کے لئے یک گونہ بے خودی کی تلاش میں بوتل کی لال پری کو منھ لگانا پڑا ——— اور جب بربادی کی یہ پہلی منزل بآسانی طے ہو گئی۔ تو یہاں سے دوسری منزل کا فاصلہ ہی کتنا تھا

نکلے میخانہ سے اور کوئے بتاں تک پہونچے

کوئے بتاں کی آبادی میں شاید ہی کوئی تبکدہ ایسا ہو جس کی چوکھٹ پر محمود کی پیشانی نے اپنے سجدہ ہائے عبودیت کے اثرات نہ چھوڑے ہوں۔ "دل کی دوا" بیچنے والوں کے کوٹھے میں شاید ہی کوئی شفاخانہ ایسا ہو جہاں محمود کے "درد" نے درمان کی جستجو میں نقد خودداری کوڑیوں کے مول نہ لٹایا ہو ——— حسن کی رعنائیاں محبت کے جذبات۔ اور عورت کا دل بکری کی چیز ہو یا نہ ہو لیکن ہمارے مردوں کے تجربے کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ یہ چیزیں بازار میں بکتی ہیں۔ سونے چاندی اور جواہرات کے بھاؤ بکتی ہیں۔ لیکن بکتی ہیں۔ اور لوگ خریدتے ہیں ——— اور خرید کے خوش ہوتے ہیں۔ محمود بھی اسی خریداری کا سودا لے کر اس بازار میں گئے اور ثریا کی دوکان پر پہونچکر خود بک گئے۔ ثریا میرے شہر کی وہ مشہور مجلس آرا عورت تھی جس کے فتوحات کا دائرہ شہر کے سرمایہ دار حلقے سے نکل کر خانقاہوں تک پہونچ گیا تھا اور ایک پیر صاحب اسکی کافر جوانی میں خدا کے جلوے دیکھنے لگے تھے۔ ہاں تو ایک ایسی خطرناک عورت جو پہلی ہی نظر میں اپنے شکار کا سارا خون چوس لینے میں مشہور ہو چکی تو محمود کی طرف متوجہ ہوئی اور محمود اسکی نظر کے حلقے میں اس بری طرح گھرے کہ عید کی نماز کے لئے اس کے کوٹھے سے نہ اترے اور گھر میں عید کے چاند کی طرح بھی نمودار نہ ہو سکے۔ بھائی جان کے خط سے ہمیں محمود اور ثریا کا حال معلوم ہوا۔ ان کے بھائی نے کچھ دیر کے لئے تیوریاں چڑھائیں لیکن میرا دل کئی دن تک سینے میں اچھلتا رہا۔ جھوٹ کیوں بولوں اس خبر سے میرے غرور کو ٹھیس لگی اور یہ سمجھ کر کہ ثریا مجھ سے زیادہ حسین تھی جبھی تو اس نے محمود کو مجھ سے چھین لیا اور محمود مجھے بھول کر اس کا ہو رہا۔ خود غرضی کے پاس انصاف کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ میں محمود کو بھولتی جا رہی تھی۔ بھول جانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن جب محمود نے مجھے بھول جانے کی اپنے نقطۂ نظر سے ایک صورت

پیدا کی تو وہ صورت حال میرے لئے ناگوار ثابت ہوئی اور میں تھوڑی دیر کے لئے یہ سمجھنے لگی کہ مرد کی ذات خلقی طور پر بے وفا ہوتی ہے۔ بہرحال میں اپنے خیالات کے ساتھ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح بل کھاتی رہی اور جب تک محمود کو ایک زہر میں بجھا ہوا خط نہ لکھ چکی وہ زہر نہ اترا جو میرے دل سے لے کر دماغ تک چڑھا ہوا تھا۔

٭٭٭

محمود میاں کو ——— انکی پیاری سلیمہ کا سلام پہونچے۔ پھلنے پھولنے اور خوش رہنے کی دعاؤں کے ساتھ ——— گھروندے کی محبت اور پچھلی زندگی کے تصورات کے ساتھ ——— جو اب ڈھلتی رات کے چراغ کی طرح گل ہوتے جا رہے ہیں۔ موجودہ "مشاغل لطیف" میں ان کے "احساس کامیابی" پر مبارکباد کے مخلصانہ جذبات کے ساتھ ——— محمود میاں کو انکی پیاری سلیمہ کا سلام پہونچے۔ محمود میاں! خدا مبارک کرے آپ اپنے حال سے خوش اور ماضی کی طرف مڑ کر نہیں دیکھتے۔ میرے لئے اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ آپ کا کنبہ آپ کی موجودہ زندگی سے مطمئن نہیں لیکن میں بہرحال مطمئن ہوں۔ "بھوک" کسی قسم کی کیوں نہ ہو "غذا" کی تلاش اس کے لئے ناگزیر ہے۔ آپ بھوکے تھے آپ کی بھوک نے پہلے گھر میں اپنے لئے غذا تلاش کی۔ میں سامنے تھی لیکن میری خودداری نے آپ کا لقمہ بننا گوارا نہ کیا۔ اور ظاہر ہے جب گھر میں کھانا نہیں مل سکتا تو بازار کا کھانا کھانے میں کون سا حرج ہے۔ دل کی بھوک بھی آخر بھوک ہے اور نفس کی پیاس بھی آخر پیاس ہے۔ اسکو بجھانا یا بجھانے کی کوشش کرنا کوئی اخلاقی جرم کیوں ہو۔ ایک پیاسے کیلئے جو بہت زیادہ پیاسا ہو یہ سوال کبھی نہیں پیدا ہوتا کہ چشمہ گدلا ہے یا کنوئیں کے پانی میں ملیریا کے کیڑے ہیں۔ آپ کی تشنگی نے بھی اگر آپ کو ایک ایسے گھاٹ پر پہونچا دیا جس کا پانی خالص نہیں تھا تو دنیا آپ پر کیوں طعنہ زن ہو۔ پیاس بجھ جانے پر آپ کی آنکھیں خود کھل جائیں گی اور آپ کا ذائقہ کڑوے اور میٹھے پانی میں خود تمیز کرنے لگے گا۔ جوانی کی نیند جھنجھوڑنے اور غل مچانے سے نہیں ٹوٹتی ——— آپ کے بھائی نے مجھے ہدایت کی ہے کہ آپ کو ایک واعظانہ خط لکھ کر آپ سے زندگی کے نشیب و فراز پر غور کرنے کی فرمائش کروں۔ لیکن میرے خیال میں آپ جو زندگی آج کل بسر کر رہے ہیں اس پر غور کرنا ایک غیر شاعرانہ حرکت ہے۔ آپ شاعر ہیں اور زندگی کے متعلق شاعر کا نقطۂ نگاہ ہمیشہ یہی رہا ہے ——— کہ

دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند
آنرا کہ عقل بیش غم روزگار بیش

پھر آپ حالات کی ان شیرینیوں میں جب کہ زندگی کا ہر گھونٹ شہد سے زیادہ میٹھا ہے ——— عقل کا مشورہ کیوں لیں ——— اور عقل کا مشورہ لے کر زندگی کے کسی ایک لمحے کو بھی تلخ کام کیوں بنائیں۔ یہ دیکھ کر کہ ثریا کے حسن کی جگمگاتی ہوئی روشنی نے میرے حسن کے نقوش کو آپ کے دماغ سے محو کر دیا۔ میرے غرور کو تھوڑی سی چوٹ لگتی ہے لیکن جب یہ غور کرتی ہوں تو چوٹ کا احساس جاتا رہتا ہے کہ آپ شاعر ہیں اور شاعر ذات کا نہیں صفت کا پرستار ہوتا ہے۔ آپ کو میری آنکھوں کا نشیلا پن اور پلکوں کے نیچے کی طرف غیر معمولی جھکاؤ بہت پسند تھا۔ لیکن یہ جھکاؤ یہ نشیلا پن دنیا کی اور بہت سی آنکھوں میں ممکن ہے پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ کا ذوقِ نظر میری ہی آنکھوں کے تصور کو پوجتا رہتا۔ حسن و عشق کی دنیا میں شاعر بلبل کا مقلد اور بلبل کا حال یہ ہے کہ وہ کسی ایک پھول کی پابند نہیں وہ ہر پھول پر ٹھونگیں مارتی ہے ہر شاخ پر ڈورے ڈالتی ہے۔ ہر کلی سے رس چوستی ہے۔ جب وہ مجرم نہیں تو شاعر کیوں مجرم ہو اور آپ کیوں مجرم ہوں۔

اب رہا یہ سوال کہ آپ ہمیشہ سے عشق کو ایک لازوال حقیقت سمجھتے آئے تھے تو یہ آپ کے فکر خامی اور تجربے کی بے مائگی تھی اور آپ کی ناتجربہ کاری کو کیوں قصوروار کیا جائے جب رومی عرفی اور غالب جیسے مفکر شاعر اس مسئلے پر غور کرتے ہوئے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے تھے۔ میں نے اپنے پہلے خط میں آپ سے گزارش کی تھی کہ آپ جلد سے جلد اپنی زندگی کا شریک ڈھونڈھ لیں لیکن اب سمجھتی ہوں کہ وہ تجویز سراسر غلط تھی اس لئے کہ آپ کے جیسے بے چین طبیعت والوں کے لئے "عمر خیامانہ" زندگی بہت موزوں ہے ——— جو خود پابند نہیں رہ سکتا اسے کیا حق حاصل ہے کہ دوسرے کو اپنا پابند کرے ——— ع

کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے
دو روزہ عمر کو انسان رائیگاں نہ کرے

لیکن آتش کا یہ پیام صرف ان کے لئے ہے جو کسی کے ہو کر رہ سکتے ہیں ورنہ بیکار کسی کو "کر رکھنے" کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اپنی ثریا کے ساتھ خوش رہیے ثریا نہ سہی زہرہ سہی مشتری سہی مریخ سہی آنکھوں کو مطلب تو بس روشنی سے ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ آپ برباد ہو رہے ہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ کام آ رہے ہیں۔ کسی کے نہیں تو ثریا کے کام آ رہے ہیں۔ ثریا اور اس کی بہنیں بھی آخر ملک کی بیٹیاں ہیں۔ آپ جیسے خوش ذوق اور منچلے نوجوان اگر ملک میں نہ ہوں گے تو ملک کی وہ بیٹیاں جو شکار کے خون پر جیتی ہیں ان کے لئے شکار کہاں سے آئیں گے۔ جب تمدن اور سوسائٹی کا فیصلہ یہ ہے کہ ملک کی کچھ عورتیں حسن فروشی کی دوکانیں کھول بیٹھیں اور اسی کی روٹی کھائیں۔ تو جو لوگ برباد ہو کر انکی روٹی مہیا کر رہے ہیں انہیں برباد کہنا نہیں چاہئے۔ یہ ملک کی ایک اقتصادی خدمت ہے اور خدا مبارک کرے کہ آپ اس خدمت میں بہت پیش پیش ہیں۔

زیادہ دعائے خیر۔ اپنی ثریا کو میرا سلام کہئے اور خوش رہئے لیکن کبھی کبھی یہ بھی یاد کر لیا کیجئے کہ۔ ع

فتراک میں ترے کوئی نخچیر بھی تھا

کسی زمانے میں

آپ کی

سلیمہ

خط کے جواب کا انتظار رہا ——— دوسرے ہفتے میں جواب آیا لیکن کس طرح میرا خط واپس کر دیا گیا تھا صرف اسکی پشت پر سیماب کا یہ شعر تھا اور بس ؎

فریفتہ مجھے عالم کے رنگ و بو نے کیا
بڑا ستم ترے ملنے کی آرزو نے کیا

(۱۱)

میری داستان میرے شوہر کے بغیر نامکمل ہے ——— اسلئے آیئے آج انکا تعارف آپ لوگوں سے کرا دیا جائے

تندرست ہاتھ پاؤں مگر غیر متناسب خط و خال کا ایک معمولی آدمی، فطرت نے جس کے چہرے کی سجاوٹ میں ذرا بھی فیاضی سے کام نہ لیا ہو ——— سر بڑا مگر پیشانی چھوٹی۔ آنکھیں سیاہ اور بڑی لیکن کیفیت سے خالی ——— مونچھیں خوبصورت مگر ہونٹ بدنما ——— یہ تھا میرے شوہر ڈاکٹر حامد حسن بیرسٹر کا حلیہ ظاہری ——— اب رہے خصائل باطنی سو ایسی طبیعت کا آدمی میری برادری میں تو کوئی نہ تھا، خدا کی اس لمبی چوڑی دنیا میں ہو تو مجھے انکار نہیں ——— ایک ایسی طبیعت کا آدمی جس نے زندگی میں ایک بار بھی کسی حاجت مند کے سوال کا نفی میں جواب نہ دیا ہو۔ جو دوسروں کے حقوق کا لحاظ رکھنے میں اس درجہ فیاض ہو کہ آپ اپنی شخصیت کو بھول جاتا ہو۔ جس کے نوکروں کو

یہ حسرت رہ گئی ہو کہ انکا مالک ایک بار بھی ان سے جھڑک کر گفتگو کرتا جس کی بیوی کو یہ ارمان رہ گیا ہو کہ ازدواجی زندگی کے دس سالوں میں ایک بار بھی اسکی تیوریاں چڑھی ہوئی دیکھتی ——— جس نے جاڑے کی سردراتیں میں اپنا لحاف ایک سردی سے کانپتے ہوئے فقیر کو دیدیا ہو اور خود ساری رات اور کوٹ اوڑھکر بسر کی ہو۔ جس نے عید کے دن اپنے بچوں کو ایک غریب دوست کے یہاں بھیجتے ہوئے ان کے قیمتی کپڑے اس لیے اتار لیے ہوں کہ انکا لباس دیکھ کر اس گھر کے بچوں کا غمزدہ دل اور کڑھے گا ——— جو اپنی بذلہ سنجی کے لئے اس درجہ مشہور ہو کہ بغیر اس کے شہر کی محفلیں ہمیشہ سنسان سمجھی گئی ہوں جسکی علمی قابلیتوں کا یہ حال ہو کہ مورخوں میں مورخ۔ شاعروں میں شاعر اور فلسفیوں میں فلسفی بن جاتا ہو جس نے ملک کے سیاسی ہنگاموں میں حصہ لیا ہو اور اپنی پالیسی پر سختی سے قائم رہنے کے باوجود اپنی خوش طبعی سے تمام مختلف الخیال جماعتوں کا محبوب بنا رہا ہو۔

اس مزاج، اس طبیعت اور اس صلاحیت کا آدمی یقیناً پوجنے کی چیز تھا ——— لیکن جیسا کہ خود انکا بیان تھا کہ ہندوستان سے لیکر یورپ تک کسی عورت نے انکی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا صرف اس لئے کہ وہ حسین نہ تھا اس کے چہرے میں کوئی جاذبیت نہ تھی ——— نہ جانے تمدن نے زمانے کی نظر کو اتنا سطحی پرست کیوں بنا دیا کہ اُسے جلد اور ہڈیوں سے نیچے کی حقیقتیں سوجھائی نہیں دیتیں۔ لیکن مجھے دوسروں پر اعتراض کرنے کا کیا حق حاصل ہے جبکہ میں خود ان کے ساتھ پرستش کا حق ادا نہ کر سکی اور عمر بھر ان کے قدموں پر رہکر ان کے بھائی کی یاد کو پوجتی رہی

میری رخصتی کا تیسرا دن تھا ——— وہ آئینے کے سامنے کھڑے شیروانی کے بٹن لگا رہے تھے، میں پیچھے سے آئی آئینے پر میرا عکس پڑا، کہنے لگے کہ "قسمت کے مذاق بھی عجیب ہوتے ہیں میرے جیسے عجیب الخلقت حیوان کو دیکھو اور پھر اس کلامنی کو دیکھو جو صرف سونگھنے کی چیز ہو" ——— "تو پھر چھوتے کیوں ہیں؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ کہنے لگے کہ "چھوئے بغیر رہا بھی نہیں جاتا" یہ کہہ کر آئینے میں اپنی صورت کو دیکھا پھر مجھے دیکھا اور ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جس میں تاسف کا حصہ بہ نسبت خوش دلی کے زیادہ ہو۔ کہنے لگے "لوگوں نے تمہارا اور ہمارا رشتہ جوڑ کر تمہارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ کم از کم تمہارے حسن کے ساتھ تو یہ بڑی ہی ناانصافی کی گئی۔ میرا اور تمہارا جوڑ سوسائٹی کی ایک ایسی غیر شاعرانہ حرکت ہے جس پر توضیح کی صنعت اور تناسب کا لفظ ہمیشہ ماتم کریگا" ——— یہ چند جملے غالباً انھوں نے اس توقع سے کہے تھے کہ میں اخلاقاً ہی سہی ان کے اس فیاضانہ اعتراف کی تردید کر کے ان کے دل کا بوجھ ہلکا کر دونگی ——— لیکن اسوقت میرے دماغ پر میاں محمود بری طرح مسلط تھے ——— میں صرف ہنسی اور ہنسکر چپ ہو گئی اور انھوں نے ایک مرجھائے ہوئے تبسم کے ساتھ مجھے دیکھا اور باہر چلے گئے ——— بات ختم ہو گئی لیکن تجربے کی روشنی میں جب مجھے انکی اصلی شکل نظر آئی تو میں نے خود ایک دن چھیڑ کر یہی ذکر نکالا اور پیار سے جو بلاشبہ مصنوعی تھا۔ ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا "جی نہیں یہ آپ کا انکسار ہے۔ میرے لئے آپ سے زیادہ موزوں شوہر ممکن ہی نہ تھا ——— دنیا کی ہر عورت یہاں تک کہ دنیا کی سب سے بڑی عورت مسز سروجنی نائیڈو بھی اگر حسن اتفاق سے آپ کی بیوی بن گئی ہوتیں تو آپ کی روح کی خوبصورتی دیکھ کر آپ کی لونڈی بن جاتیں ——— ہمیشہ کے لئے ——— رہا یہ کہ آپ اپنے کو خوبصورت نہیں سمجھتے تو یہ بھی آپ کی آنکھوں کا قصور ہے میرا معیار حسن آپ کے اس خیال کی تائید نہیں کرتا" بہت ہنسے بہت ہنسے اور بہت ہنسنے کی کوشش کی لیکن اس دن کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ کوئی بوجھ تھا جو میری اس گفتگو نے ان کے دل سے سرکا دیا ——— وہ پہلے سے زیادہ خوش نظر آنے لگے اور ان کے پیار میں جو ایک خاص قسم کی سردی تھی جسے میرے رخساروں نے اکثر محسوس کیا تھا وہ اس دن کے بعد گرمجوشی سے بدل گئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ کوئی شخص بھی کسی مرتبہ کا کیوں نہ ہو اگر حساس ہے تو کسی حسین عورت سے اس وقت تک محبت کا مطالبہ نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ خود اپنے میں عورت کے لئے کوئی کشش محسوس نہ کرتا ہو ——— گو دنیا میں بہ خود غلط لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے لیکن ایسے لوگوں میں یا تو خود شناسی کا مادہ ہی سرے سے مفقود ہوتا ہے یا پھر یہ کہ انکا آئینہ ان سے جھوٹ بولا کرتا ہو۔ یا یہ کہ وہ دولتمند ہوں اور دولتمندی کو اپنے زعم میں سب سے بڑی خوبصورتی سمجھتے ہوں ——— یا پھر یہ کہ شاعر یا انشا پرداز فلسفی یا حکیم ہو کر اس دھوکے میں مبتلا ہوں کہ انکا علمی اور ادبی وقار عورت کو مرعوب کرے گا۔ حالانکہ عورت کا دل ان چیزوں سے نہ مرعوب ہو سکتا ہے نہ متاثر۔ تمدن نے ابتدا ہی سے اُسے سنگھی چوٹی میں مبتلا کر کے "ظاہر پرستی" اور "سطح پروری" کو اسکی فطرت ثانیہ بنا دیا ہے ——— ظاہر ہے کہ وہ عورت جو ہاتھوں کو بقول غالب "مرہون حنا" اور گالوں

کو "رہین غازہ" کر چکی ہو اسکی نظر کی پہونچ اگر ہو گی تو کتنی؟ —— بہر کیف یہ سطح پرستی کچھ ہم عورتوں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہمارے مرد اس معاملے میں ہم سے کہیں زیادہ کمزور ہیں ——
ہمارے قدیم و جدید لٹریچر جنہیں ہمارے جذبات لطیفہ کی تاریخ کہنا چاہئے، ہم یہی کہتے ہیں کہ عشق کے بازار میں "دل کا سودا" ہمیشہ اسی قیمت پر پٹتا رہا۔ سلیمہ اگر اپنے شوہر حامد سے باوجود اس کی بہت سی نفسیاتی خوبیوں کے محبت نہ کر سکی تو سوسائٹی اسے کیوں گنہگار سمجھے جبکہ آپ کے آغوش میں ہمیشہ سے رنگ و روغن کی پوجا ہو رہی ہے۔ اور اس کے معلمین بھی ہمیشہ سے اسی رنگ و روغن کو اپنی بصیرت کا سرمایہ سمجھتے آئے ہیں اور اسی خط و خال میں حقیقت کے خط و خال دیکھتے آئے ہیں

(۱۲)

ہاں تو میں انکا ذکر کر رہی تھی —— پچھلی سطروں میں آپ ان کے حلیہ ظاہری اور باطنی سے واقف ہو چکے اب رہے انکے خیالات تو فلسفے کی باقاعدہ تعلیم اور یورپ کے سہ سالہ قیام نے انکے اخلاقی اور معاشرتی نظریوں کو بہت کچھ تبدیل کر دیا تھا۔ گو عورتوں نے کبھی انکو اس کا موقعہ نہ دیا تھا کہ وہ ان سے دلچسپی لے سکیں، تاہم وہ حقوق نسواں کی حمایت اس گرمجوشی سے کیا کرتے کہ سمجھنے والا یہ سمجھتا کہ عورت کے دل کی نبض ہمیشہ اس شخص کی انگلیوں کے نیچے رہی ہے —— ایک دن میں رسالہ عصمت کے لئے ایک مضمون بھیج رہی تھی۔ مضمون کے نیچے میرے دستخط تھے (سلیمہ حامد حسن)۔ کہنے لگے "یہ سلیمہ حامد حسن کیا بلا ہے۔ کیا تم میری ملکیت ہو کہ تمہاری شخصیت پر میرے نام کا لیبل ضروری ہو۔ یہ رواج یورپ کے اس عہد جہالت کا ہے جب وہاں عورت ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ شادی سے پہلے باپ کی اور شادی کے بعد شوہر کی۔ عورت باپ کی ملک ہو تو ہو شوہر کی تو کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ شادی معاشرتی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ ایک ٹھیکا ہے۔ ایک مفاہمت ہے، ایک معاہدہ ہے جیسا کہ عام طور پر دو فریقوں میں ہوا کرتا ہے۔" میں مسکرا کر چپ ہو گئی۔ اور انھوں نے قلم اٹھا کر اپنا نام کاٹ دیا
ایک دن ہندوستانی عورت کے مستقبل پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کہنے لگے کہ کامنی (وہ مجھے پیار سے اکثر کامنی کہا کرتے تھے) اگر میں کسی دوسری عورت کا ہو جاؤں تو تم کیا کرو گی؟ یہی نا کہ گھر میں بیٹھی میرے نام کی تسبیح پڑھتی رہو۔ میں نے کہا کہ بھارت کی بیٹیوں کا تو دھرم ہی یہی ہے "دھرم ہی یہی ہے" (میرا منھ چڑھا کر بولے) یہی وہ بڑھاوے ہیں جنھوں نے عورت کے غرور کو جھوٹی آسودگی دے کر اس کے جذباتی حقوق غصب کر لئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ جذباتی حقوق کیا بلا ہیں؟ جھنجھلا کر بولے پہلو میں دل اگر بالکل مردہ نہ ہو گیا ہو اور تمہاری بد بخت معاشرت نے اسے بالکل ناتوڑ ڈالا ہو۔ تو اس سے پوچھو۔ میں نے کہا کہ وہ تو آپکے جوتوں کے نیچے کچلا پڑا ہے۔ گھبرائیے نہیں آپ نے نہیں کچلا، میں نے خود اسے آپ کے جوتوں کے نیچے رکھ دیا ہے۔ ہندوستان کی بیٹیوں کا مذہب ہی یہی ہے۔ اسکے جواب میں وہ مسکرائے اور پھر اک ذرا تیور کو سنجیدہ بنا کر بولے تو گویا اسی اخلاقی کمزوری کا نام آپکے لغت میں وفا ہے۔ پھٹکار ہے آپکی اس وفا پر —— وہ عورت کاہے کو ہے مٹی کا ڈھیر ہے۔ جو جوتے کھاتی رہے اور پنکھے کی ڈنڈی سے بھی جوتوں کا جواب نہ دے۔ شوہر ایک چھوڑ دس عورتوں سے بیک وقت کھیلتا رہے اور آپ شوہر پرستی کا دائرہ کھینچ کر دنیا کا منتر پڑھتی رہیں نعوذ باللہ یہ شوہر پرستی نہیں ہے۔ جذبات کا افلاس ہے۔ دماغ کی موت ہے۔ ارادوں کا اضمحلال ہے۔ میں تو تم میں یہ جذبہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اگر میں پیمان وفا کو توڑ کر کسی دوسری عورت کے پہلو میں جا سوؤں تو تم بھی میرے جذبۂ رشک کو سزا دینے کے خیال ہی سے سہی — دوسرے کے آغوش میں جا بیٹھو —— میں نے کہا بس بس اپنا فلسفہ رہنے دیجئے۔ برائی کی تقلید کسی حالت میں اچھائی نہیں نکل سکتی اور پھر یہ کہ برائی سے برائی کا علاج بھی ممکن نہیں۔ کہنے لگے بالکل ٹھیک کامنی لیکن ذرا غور تو کرو کہ یہ کیسی کڑوی حقیقت ہے۔ فرض کرو کہ میں آوارہ ہو جاؤں اور تم میری آوارگی کے باوجود مجھ سے محبت کرتی رہو تو کیا دنیا تمہیں دیوی نہیں کہے گی اور تمہارے اس اسوۂ حسنہ کو دوسری عورتوں کے سامنے بطور نمونہ تقلید پیش نہ کیا جائے گا۔ لیکن پھر اسی کے ساتھ ایسا کیوں ہے کہ اگر تم بدچلن ہو جاؤ اور میں تمہاری بدچلنی کے باوجود تمہیں چاہتا رہوں تو مجھے دیوث کے لقب سے پکارا جائے اور سوسائٹی کی زبانیں اجتماعی حیثیت سے مجھ پر ملامت کی بوچھار کریں۔ آخر کیوں؟ وفا اگر بجائے خود کوئی قابل احترام جذبہ ہے تو کیوں نہ مرد کی وفا کی بھی اسی طرح قدر کی جائے۔ یہ کیسی کھلی ہوئی ناانصافی ہے سوسائٹی کی تم عورتوں کے ساتھ۔ کیا اس کھلی ہوئی ناانصافی کے لئے تمہاری روح میں بغاوت کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ تم پوچھتی ہو کہ عورت کے جذباتی حقوق کیا ہیں۔ وہی جو مرد کو ہر حال میں حاصل ہیں۔ جذبۂ شوق ہو یا جذبۂ رشک۔ تعدد پسندی ہو یا ندرت پرستی، عورت اور مرد دونوں ان فطری جذبات و خواہشات میں مساوی حصہ دار ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے

کہ مرد کے ان جذبات کا تو احترام کیا جائے اور عورت کی ان خواہشوں کے ساتھ مطلق رواداری جائز نہ رکھی جائے۔ آج دنیا کی تعلیم یافتہ عورتیں ہر ملک میں اپنے حقوق کی نوحہ خوانی کر رہی ہیں۔ حالانکہ انہیں خود خبر نہیں کہ انکے حقوق واقعی کیا ہیں۔ سیاسی حقوق حاصل کرکے وہ کیا کرلیں گی ——— جب تک کہ انہیں ہماری طرح جذبات کی پیاس بجھانے کی آزادی نہ مل جائے۔ میں تو یہی سمجھونگا کہ وہ سابق بدستور مردوں کی لونڈیاں ہیں ——— تقریر کو یہاں تک پہنچا کے وہ خاموش ہوگئے۔ اور میری طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں نے کہا صاحب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کو مردوں کی طرح آزاد کردینے کی ایسی کیا ضرورت ہے۔ کیوں نہ مردوں کو بھی عورتوں ہی کی طرح پابند کردیا جائے۔ حیا یا خود اختیاری۔ وفا یا دوسرے لفظوں میں قیود پرستی۔ متمدن دنیا کیلئے اگر کسی حیثیت سے ضروری ہے تو کیوں نہ عورتوں کی طرح مرد بھی اسے اختیار کریں

ذرا غور تو کیجئے کہ نظام معاشرت کی بقا اور تمدن نفس میں ہے یا اس آزادیٔ نفس میں۔ نئی تہذیب جس کا خواب دیکھ رہی ہے ——— میرا یہ کہنا تھا کہ وہ کچھ سوچنے لگے۔ کھو گئے ——— اور بڑی دیر تک کھوئے رہے یہاں تک کہ گھڑی نے بارہ کا گجر بجایا اور میں نے دوپہر کے کھانے کیلئے انہیں چونکایا ——— چونکے اور مسکرا کر کہنے لگے۔ کامنی! تم جیتیں اور میں ہارا بیشک عورتوں کو مردوں کی طرح خود مختار یا مطلق العنان کردینے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ضرورت اسکی ہے کہ عورتوں کی طرح مرد بھی اپنے نفس کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لیں

عورتوں کی طرح مردوں کے جذبات اور جنسی میلانات پر بھی قانون کا پہرہ بٹھلا دیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ بہتر ہے کہ مرد خود ان مراعات سے دستبردار ہو جائیں جو تمدن قدیم نے انہیں ناانصافی سے دے رکھے ہیں۔ سماج کی خیریت بلاشبہ اسی میں ہے

ہماری تہذیب جو بھی کروٹ لے لیکن تمدن کے لئے بہرحال ایک "فلسفہ اخلاق" کی ضرورت ناگزیر ہے ——— ورنہ حکومت کا قانون آخر کس بنیاد پر کھڑا ہوگا ——— اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب تک ہمارے معاشرتی میلانات میں تبدیلی نہیں ہوتی اسوقت تک ایک "اخلاق جنسی" کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ——— میرا دماغ تمہاری دی ہوئی لذتی کا مشکور ہے ——— میں ہنسی اور میری ہنسی ایک فاتحانہ ہنسی تھی لیکن حیرت ہے کہ وہ اس بحث میں اپنی شکست پر مجھ سے کم خوش نہ تھے، کھانا کھاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے کہ تم نے میرے دماغ میں ایک نئی کھڑکی کھولدی

(۱۳)

میرے خط کی پشت پر محمود نے مہتاب کا جو شعر لکھدیا تھا اس نے میرے دماغی ہیجان کو ایک بڑی حد تک سکون سے بدل کر میری خودی کے لئے تھوڑی سی غذا مہیا کردی اور میں یہ سمجھنے لگی کہ "محمود ثریا کے گھر میں بھی میرا ہے" ——— لیکن اس خیال کیساتھ دل کا وہ زخم جو موسم کی ناموافقت سے کچھ مرجھا گیا تھا پھر رسنے لگا۔ چپکے چپکے رسنے لگا۔ میں نے بھی اسے رسنے کے لئے چھوڑ دیا ——— اور حسب معمول اسکی ناز برداری کے ساتھ خانگی زندگی کی ناز برداریاں بھی کرتی رہی ——— یہاں تک کہ میری شادی کا دوسرا سال شروع ہوا اور مجھے ایک بچے کی ماں بننے کی سعادت حاصل ہوئی ——— یہ زندگی کی وہ منزل ہوتی ہے جہاں پہونچکر ایک "معتدل عورت" کے کانوں کو زیوروں کی جھنکار سے زیادہ کھلونوں کی جھنجھناہٹ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اولاد کی محبت ماں کے جذبات کی فاتح ہے اس کے تمام مشاغل اور اس کے تمام رجحانات کی فاتح ہے ——— اس کے پورے وجود کی فاتح ہے

میرے فاتح نے بھی میری مملکت کے حدود میں قدم رکھتے ہی پہلی فتح میری اس ذہنی کشمکش پر حاصل کی جس کا تعلق محمود کی یاد سے تھا۔ اور اس کے بعد فتوحات کا سلسلہ شروع ہوگیا ——— یہانتک کہ میں خانہ داری کے دھندوں کے لئے باقی نہ رہی۔ اپنے شوہر کی ناز برداریوں کے لئے باقی نہ رہی اپنی کتابوں اور اپنی سہیلیوں کے لئے باقی نہ رہی ——— انتہا ہوگئی کہ بعض اوقات نمازیں بھی چھوٹ گئیں اور مجھے اکثر و بیشتر اپنے خدا سے بھی فرصت لینی پڑی ——— ایسے عالم میں جبکہ میری زندگی میں خدا کی گنجایش بھی مشکل سے ہو محمود کی یاد کس منہ سے آتی ——— اور اگر آتی تو "ننھے" کی ایک چیخ سنکر پرے ہٹ جاتی۔ مختصر یہ کہ اس دوران میں محمود اپنی ثریا سے مشغول رہے۔ اور میں اپنے اس کھلونے سے کھیلتی رہی جذبات کا طوفان جو بڑے زور شور سے اٹھا تھا خود بخود سو گیا

دریا نے بہاؤ کا رخ بدل دیا ——— اور زندگی اپنی طبعی حالت پر چل پڑی

ایک سال اور گذر گیا اور میں نے میکے جانے کا نام لیا

بچے کی ولادت سے کچھ دن پہلے میری ساس کلکتہ آئیں اور سال بھر تک میرے ساتھ رہیں۔ جب جانے لگیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلنے پر مصر ہوئیں۔ وہ پوتے سے الگ ہونا نہیں چاہتی تھیں اور ان کے صاحبزادے بیوی سے جدائی گوارا نہیں کرسکتے تھے۔ ہفتوں کشاکش رہی نتیجہ وہی ہوا جو ایسی حالتوں میں ہوا کرتا ہے۔ ماں کی ضد نے بیٹے کی حیلہ سازیوں پر فتح پائی اور میں پورے دو سال کے بعد بادل ناخواستہ وطن چلی ——

بادل ناخواستہ اس لئے کہ محمود کی شخصیت میرے خیال میں میرے خیر مقدم کے لئے وہاں چشم براہ تھی۔ اور مجھے اندیشہ تھا کہ اس سے آنکھیں چار ہوتے ہی میرا احساس فرض کہیں مضمحل ہو جائے

راستے بھر اسی ادھیڑ بن رہی لیکن گھر پہونچتے ہی یہ خوشخبری سنی کہ محمود شہر میں موجود نہیں ہیں۔ بمبئی کی ایک ایکٹرس کچھ دنوں کے لئے ثریا کے یہاں آکر ٹھہری تھی۔ جاتے ہوئے اس نے ثریا کی مہمان نوازیوں کا یہ صلہ دیا کہ اس کے محمود کو اس سے چھین کر اپنے ساتھ لیتی گئی —— یہ خبر سنکر مجھے مطمئن ہو جانا چاہئے تھا' لیکن میں مطمئن ہونے کی جگہ مضمحل ہو گئی۔ یہ معلوم کر کے مضمحل ہو گئی کہ دو سال کے بعد محمود سے ملنے کے جو امکانات تھے وہ ختم ہو گئے

آپ کو حیرت ہو گی اور ہونی بھی چاہئے کہ گھر پہونچنے سے چند گھنٹے پہلے میرے حواس اس تصور سے پراگندہ تھے کہ "محمود سے ملاقات ہو گی تو کیا ہو گا" لیکن جب وہ نہ ملا اور اس سے ملنے کا جو اندیشہ تھا وہ باقی نہ رہا تو دل اس حالت پر بھی قناعت نہ کرسکا۔ اور خواہ مخواہ کڑھنے لگا۔ یہ سوال نہ کیجئے کہ کیوں کڑھنے لگا' کڑھنا تو اسکی طبیعت ہی بن گئی تھی' داد دیجئے اس عورت کی جو سینے میں ایسا شریر دل رکھ کر بھی فرض کے راستے پر تھوڑی دور چل سکی نفسیات محبت کی گتھیاں سلجھانے میں میں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کیا' زندگی کے شیریں ترین لمحے اس کوشش میں ضائع گئے اور اب تک نہ سمجھ سکی کہ یہ بدبخت دل جس چیز سے بھاگتا ہے پھر اسی چیز کو ڈھونڈتا کیوں ہے —— جسے پسند کرتا ہے اسے پیار کیوں نہیں کرسکتا اور جسے پسند نہیں کرتا اسکی جدائی میں سوگوار کیوں رہتا ہے ——

جو چاہتا ہے اس کے کرنے پر قادر کیوں نہیں اور جو نہیں چاہتا اسے بے ساختہ کیوں کر بیٹھتا ہے۔ آج بھی جب اپنی گذری ہوئی زندگی کے اوراق الٹتی ہوں تو ایسی کتنی ہی غیر ارادی حرکتیں کتنے ہی غیر شعوری افعال میرے سامنے آتے ہیں اور مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا —— ؟ میں ان میں سے ایک کا بھی جواب نہیں دے سکتی۔ سوچتی ہوں اور پچھتاتی ہوں۔ میں شاید اس واقعے کو عمر بھر نہیں بھول سکتی' جب میں نے پہلی بار اپنے شوہر کے ساتھ کلکتے کا سفر کیا تھا اور محمود ہم لوگوں کو رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن تک آئے تھے۔ رخصتی کی صبر آزما گھڑیوں اور انکی بے پناہیوں کو میں جانتی تھی۔ اس لئے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ محمود کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھوں گی مجھے خوف تھا میں ڈرتی تھی کہ اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر میرا احساس فرض شکست نہ کھا جائے

میں گھر سے چلی اسٹیشن پر پہونچی اسٹیشن سے پلیٹ فارم اور پلیٹ فارم سے ٹرین تک کا فاصلہ طے کیا۔ لیکن اس عرصے میں ایک لمحے کے لئے بھی میرے ارادے میں ضعف نہ آیا' محمود برابر میرے ساتھ رہے اور میری آنکھیں برابر جھکی رہیں جھکی رہیں۔ یہاں تک کہ گاڑی نے روانگی کی سیٹی دی۔ ڈبے کی سامنے والی کھڑکیاں بند تھیں اور میں انکی آڑ میں سر جھکائے بیٹھی تھی —— انجن کی سیٹی میں نہ جانے کون سی قوت تھی جس نے میرے ہاتھوں سے میرے سامنے کی کھڑکی گروا دی

ٹرین پلیٹ فارم کو چھوڑ رہی تھی —— اور میری خوددار نگاہیں محمود کی بے چین نگاہوں سے گلے مل رہی تھیں

دل سے پوچھتی ہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟ لیکن اس کے سوا کوئی جواب نہیں ملتا کہ یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے —— حافظے سے پوچھتی ہوں تو وہ کہتا ہے

کہ جب ٹرین نے سیٹی دی تو دفعتاً اندر سے ایک فریاد نکلی کہ اے بدبخت! محمود سے بچھڑ رہی ہے اور شاید ہمیشہ کے لئے بچھڑ رہی ہے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو۔ رخصت کی آخری گھڑیوں میں تو ایک بار اسکی صورت دیکھ لے' یہ پکار سنتے ہی دل نے پوری طاقت سے دماغ پر حملہ کیا —— زنجیریں ٹوٹ گئیں اور اعصاب قابو سے باہر ہو گئے —— اور ہاتھ نے بے ساختہ کھڑکی کی طرف بڑھ کر وہ جرات کی جو ایک پردہ نشین عورت سے عام حالات میں ممکن نہیں

بہرحال یہ میرا تجربہ ہے ایک ایسی عورت کا تجربہ جو زندگی کی چڑھتی دوپہر سے عمر کی ڈھلتی چھاؤں تک اپنی خواہشوں کے خلاف جہاد کرتی رہی ہو —— یقین کیجئے —— کہ اعصاب پر جذبات سے مغلوب اعصاب پر عزم کا پہرہ بہت دیر تک نہیں

بھلایا جا سکتا۔ خواہشیں دل میں ایک مرتبہ پیدا ہو کر پھر کبھی نہیں مرتیں۔ ہاں ضبط نفس کے حملوں سے مرعوب ہو کر بھیس بدل لیتی ہیں۔ نقاب اوڑھ لیتی ہیں اور ان نفسیاتی لمحوں کا انتظار کرتی ہیں جب قوتِ فیصلہ حالات سے متاثر ہو اور عقل کا چراغ آندھیوں میں جھلملانے لگے ـــــ جب وہ نفسیاتی لمحے آجاتے ہیں تو فطرت کی یہ بے پناہ قوت نقاب الٹ دیتی ہے۔ کیچلی اتار پھینکتی ہے اور اپنی پوری طاقت سے ہم پر حملہ کرتی ہے۔ ڈرنا چاہئے ان لمحوں سے جب محبت پرہیزگاری کا بھیس بدلے اور گناہ کا لبادہ اوڑھے میرا جی کلکتہ میں کتنی مرتبہ گھر والوں سے ملنے کے لئے کڑھا لیکن گھر آ کر معلوم ہوا کہ وہ گھر والوں کی یاد نہ تھی، محمود سے ملنے کی خواہش تھی جو بھیس بدلے ہوئی تھی۔

بہرحال ملال کی وہ کیفیت جو محمود کے بمبئی چلے جانے کی خبر سے مجھ پر طاری ہوئی تھی، بہت دیر تک باقی نہ رہی۔ میں نے اس پر قابو پا لیا۔ اور میں نے کیا قابو پایا بچے نے بیمار پڑ کر خود بخود اس کے لئے گنجائش پیدا کر دی۔ سال بھر کا کمزور بچہ جاڑے کا موسم اور ساری رات کا سفر۔ سردی لگی تھی اور گھر پہنچتے پہنچتے پنڈا بھبکا ہوا اور شام ہوتے ہوتے بخار چڑھ آیا۔ اور وہ بھی اس شدت کا کہ ایک ہفتے تک آنکھیں نہ کھولیں تیمارداری اور شب بیداری کے ساتھ مامتا نے مجھے اسکی مہلت نہ دی کہ بچے کے سوا کسی اور کے متعلق کچھ سوچ سکوں ـــــ فضا اگرچہ مکدر اور افق گرد آلود ہو چکا تھا۔ لیکن ہوا کا رخ بدل جانے سے آتی ہوئی آندھی واپس لوٹ گئی ـــــ بچہ جب چنگا بھلا ہو گیا تو عزیزوں سے ملنے کا سلسلہ شروع ہوا ان کے بعد بچپن کی سہیلیوں نے مجھے گھیرا اور میں ان سے مل کر تھوڑی دیر کے لئے پھر زندگی کے اس سبزہ زار میں پہونچ گئی جسے وقت کی تقلید میں بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ بچپن کی یاد ابھی کہیں دور نہیں گئی تھی بلاتے ہی آئی اور اس کے اعزاز میں جھولے ڈالے گئے۔ کڑاہیاں چڑھیں پکوان پکے۔ آنکھ مچولی کھیلی گئی۔ غرض بچپن کا زمانہ اپنی تمام دلچسپیوں کے ساتھ کچھ دنوں تک ہمارا مہمان رہا۔ ایک مہینے تک ساس کے ساتھ سسرال رہی اسکے بعد امی جان نے مجھے میکے بلوا لیا اور میں نے پورے ڈھائی سال کے بعد اس ڈیوڑھی میں قدم رکھا جہاں سے میری کنواری زندگی کا جنازہ سہاگ کے تابوت میں کہاروں کے کاندھے پر نکلا تھا

پیاس کی شدت میں آپ بھوک کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ بھوک جب ناقابل برداشت ہوتی ہے تو ایک قحط زدہ ماں کی مامتا کہاں گم ہو جاتی ہے؟ کیا یہ غلط ہے کہ تنازع للبقا کے معرکے ہمارے وجود کے اندر بھی چھڑے رہتے ہیں ـــــ اور بقائے اصلح کا قانون یہاں بھی طاقت کی حکمرانی کا ضامن ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری طرح ہماری خواہشیں بھی آپس میں ٹکراتی ہیں اور ہمارے ہر جذبے ہر میلان اور ہر احساس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہمارے وجود پر تنہا وہی حکمراں ہو اور ہمارے اعصاب اسی کے اشارے پر کام کرتے رہیں۔ جذبات کی اس کشاکش اور خواہشات کے اس تصادم میں جو جذبہ قوی ہوتا ہے وہی ہم پر حکمرانی کرتا ہے اور جو کمزور ہوتا ہے وہ بھاگ کر نفس کی کمین گاہوں میں روپوش ہو جاتا ہے اور روپوش رہتا ہے اسوقت تک جب تک کہ اس کا حریف نامساعد حالات کی بنا پر کمزور یا غافل نہ ہو جائے۔ محمود کی محبت یعنی میرا جنسی میلان بچے کی پیدائش تک مجھ پر حکمراں رہا۔ لیکن بچے کی پیدائش کے بعد اس کا زور کم ہوتا گیا۔ یہاں تک میں سمجھنے لگی کہ میں نے اس جذبے پر قابو پا لیا ـــــ مگر سسرال سے میکے آنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سمجھنا میری خود فریبی تھی وہ کافر جذبہ میرے اندر اسی طرح موجود تھا صرف میری مامتا سے مرعوب ہو کر مقابلے کے میدان سے ہٹ گیا تھا۔ اس کمزور مگر چالاک حریف کی طرح جو غنیم کے بے پناہ حملے سے بھاگ کر کھائیوں میں چھپ جائے اور شبخون مارنے کے لئے رات کا انتظار کرے۔ یہ آپ سے کہہ چکی ہوں کہ ایک مہینے کے بعد میری امی جان نے مجھے سسرال سے میکے بلوا لیا۔ میں سسرال سے میکے آئی اور محمود کی محبت نے حالات کو اپنے موافق پا کر ایک مرتبہ پھر مجھے چھیننے کی کوشش کی۔ اب سنئے کہ وہ موافق حالات کیا تھے۔ پہلی بات یہ ہوئی کہ گھر آتے ہی بچہ میری گود سے نکل کر اپنی نانی کی گود میں چلا گیا اور میں عملاً اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام نشیلے خیالات جو مجھے مصروف دیکھ کر منتشر ہو گئے تھے پھر میرے دماغ میں ہجوم کرنے لگے اور میں انکی کیفیت میں گم ہونے لگی دوسری مصیبت ماحول کی مناسبت تھی۔ میں ان دنوں جس گھر میں تھی اسکی فضائیں گذرے ہوئے زمانے کو اپنی گود میں لئے تھیں۔ یہ وہی گھر تھا جس کی چہار دیواری میں دو معصوم روحوں نے اپنے معصوم

تخیلات کی ایک جنت تعمیر کی تھی - یہ وہی گھر تھا جس کی ہر دیوار پر باقی کے ابھرے ہوئے نقوش مجھ سے میری پچھلی زندگی کی کہانیاں دہرا رہے تھے - انگنائی میں وہ امرود کا درخت اب بھی موجود تھا جس کی ہوا میں ہماری محبت نے شعور کی پہلی انگڑائی لی تھی - سائبان میں کچی اینٹوں کا وہ گھروندا اب تک موجود تھا جسے محمود نے میرے لئے بنایا تھا اور جس کی گری ہوئی چھت اور ٹوٹی ہوئی دیواریں مجھ سے آج بھی یہ سوال کر رہی تھیں کہ ---- اسکی مزدوری؟ ---- مہتابی پر آج بھی چاندنی راتیں اسیطرح آتیں مگر مایوس لوٹ جاتیں - ان کے آجانے میں آنکھ مچولی کھیلنے والے اب ان سے کتنے بیگانہ ہوچکے تھے -

مارچ کا مہینہ تھا اور بسنت کا موسم جو ہندوستان میں جنون کا موسم سمجھا جاتا ہے تخیت کی پاگل ہواؤں نے پنکھے جھل جھل کر راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریوں کو ابھارا ---- اور میری ہڈیاں پھر سلگنے لگیں ---- وہ ندی جو ریت کے نیچے بہ رہی تھی دفعتًا ابل پڑی ---- اور میں اس کے تیز دھاروں میں تنکے کی طرح بہنے لگی - پچھلی زندگی کے تمام مناظر سینما کی تصویروں کی طرح ایک ایک کرکے میرے سامنے آنے لگے اور مجھ سے اپنا حق مانگنے لگے - میں نے محسوس کیا کہ میں تیزی کے ساتھ بدل رہی ہوں جذبات میں تبدیلی افکار میں تبدیلی زندگی کے روزانہ پروگرام میں تبدیلی یہاں تک کہ ایک دن میرے آئینے نے بھی مجھ سے کہا "سلیمہ تو کتنا بدل گئی ہے"؟

دماغ جب جذبات سے متاثر ہو تو خواب کا "رنگ محل" تصور کی آنکھوں کے سنے اپنے تمام دریچے کھول دیتا ہے مجھے بھی نیند میں ---- اور اکثر بیداری میں طرح طرح کے خواب آنے لگے - ڈراؤنے اور ہولناک خواب - دلچسپ اور رنگین خواب ---- بے حیا اور شرمناک خواب - نیند کی مجھے کبھی شکایت نہ تھی بچپن سے لے کر جوانی تک یہ میری وفادار سہیلی رہی ---- لیکن اس عالم میں وہ بھی کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے مجھ سے روٹھ جاتی - اختر شناری کا تجربہ اگرچہ میری پوری حیات عشق میں باقاعدہ کبھی نہیں ہوا لیکن زندگی میں ایک جذباتی رات کا پچھلا پہر میں نے اس مشغلے میں بھی صرف کیا - واقعہ یوں ہے کہ گھر میں میری بھتیجی کے "کن چھیدن" کی تقریب تھی - برادری کی تمام عورتیں دو دن تک گھر میں مہمان رہیں اور گھر کی ہر عورت انکی خاطرداری میں سراپا انہماک میں پہلے پان کے محکمے کی وزیر قرار دی گئی اور قلمدان کی جگہ پاندان مجھے سپرد کیا گیا - میں نے دیکھا کہ یہ وزارت میرے لئے ٹھیک نہ ہوگی - مدت کے بعد میکے کی ایک تقریب میں شریک ہونے کا موقعہ ملا تھا - چاہتی تھی کہ جی کھول کے لوگوں سے ملوں اور جی کھول کے تقریب کا حق ادا کروں اور پان کا محکمہ ایسا ہوتا ہے جس کا دائرۂ عمل زیادہ سے زیادہ ایک کوٹھری تک محدود ہوتا ہے - غرض یہ سوچ کے میں نے اماں جان کی خدمت میں اپنا استعفا پیش کیا جو کسی طرح منظور ہوا اور اسکی جگہ مجھے استقبالیہ کمیٹی کی صدارت پیش کی گئی - اب میرے ذمے یہ خدمت تھی کہ جو بی بی تشریف لائیں ڈیوڑھی میں جاکر انہیں ان کی ڈولی سے اتار لاؤں اور جب وہ واپس ہونے لگیں تو پھر ڈیوڑھی تک انہیں چھوڑ آؤں - کام بظاہر دلچسپ اور آسان تھا لیکن دو گھنٹوں میں میرے پاؤں کے اعصاب نے بھی استعفا کی دھمکی دینی شروع کی نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کوئی معقول عذر تراش کے یہ بلا اپنی بھاوج کے سر ٹالی اور خود مہمانوں کے پاس آکر ان کی دلجوئی کی خدمت اپنے ذمے لے لی ---- آخر ان سے باتیں کرنے والا بھی تو کوئی چاہئے تھا ---- غرض شام تک گھر میں خاصی چہل پہل رہی - شام ہوتے ہی مہمانوں کی بھیڑ چھٹنے لگی - رات کے نو بجتے بجتے گھر میں سناٹا تھا - کنبے کا ہر شخص تھک کے چور ہوچکا تھا جسے جہاں جگہ ملی پڑ رہا - میں بھی اسی فرش پر جہاں بیٹھی تھی لیٹ گئی اور لیٹتے ہی نیند آگئی ---- یہی رات میری زندگی کی وہ تاریخی رات تھی جس میں میں نے وہ خواب دیکھا جوانی کی شبہائے تاریک کا وہ سب سے زیادہ ڈراؤنا خواب جس نے میری محبت کا مزاج اور میرے جذبات کی دنیا بدل دی - رات شاید دوپہر آئی ہوگی کہ دیکھتی کیا ہوں کہ ایک جنگل میں جو پہاڑوں سے گھرا ہے ایک چھوٹی سی ندی بہ رہی اور میں اس کے کنارے کھڑی ایک کنول کا پھول توڑنے کی کوشش کر رہی ہوں - ندی کے اس پار برگد کے سایہ میں ایک جوگی دھونی رمائے ہے جس کی لمبی لمبی جٹائیں کمر تک آگئی ہیں پھر کچھ تاریکی درمیان میں آجاتی ہے اور خواب کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے - لیکن پھر دیکھتی ہوں کہ جوگی کوئی اور نہیں محمود ہے اور خواب ہی میں یہ سوچتی ہوں کہ یہ جوگی کیسے ہوگیا - اتنے میں محمود آواز دیتا ہے کہ اس پار آؤ میں جواب دیتی ہوں "کیوں کر آؤں بیچ میں دریا جو حائل ہے" ---- وہ سامنے ایک ناؤ کی طرف اشارہ کرتا ہے - میں کہتی ہوں "ناؤ پر چڑھتے میرا جی ڈرتا ہے" یہ سنکر محمود قہقہہ لگاتا ہے

اور پوچھتا ہے کہ میں آؤں؟ یہاں سے خواب پھر کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا ہے لیکن پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی منظر سامنے آتا ہے، اور دیکھتی کیا ہوں کہ محمود کشتی کھیتا میرے قریب چلا آرہا ہے۔ کشتی عین بیچ دریا میں پہونچتی ہے تو ایک گھڑیال پانی سے منھ نکالکر محمود کی طرف بڑھتا اور اُسے کشتی سے اٹھاکر نگل جاتا ہے ——— میں چیختی ہوں اور منھ ڈھانپ کے رونے لگتی ہوں ——— خواب یہاں تک پہونچا تھا کہ امی جان نے مجھے چونکاکر کہا سلیمہ! سلیمہ تو نیند میں رو رہی تھی کیا کوئی خواب دیکھا؟ میں نے چونک کر اور اپنے تکئے اور آنچل کو دیکھا تو وہ واقعی آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا ——— امی جان تو کروٹ بدل کر سو گئیں لیکن میں صبح تک جاگتی رہی۔ یہی وہ رات تھی جس کا پچھلا پہر میں نے واقعی اختر شماری میں گذارا۔ صبح تک خواب اور اس کی مختلف تعبیریں۔ میرے دماغ کے سامنے آتی رہیں ——— کہیں دریا زندگی کا دریا نہ ہو ——— کشتی محبت کی کشتی نہ ہو، گھڑیال موت کا گھڑیال نہ ہو، کیا نصیب دشمناں محمود پر کوئی آفت آنے والی ہے ——— تو کیا میں اسیطرح کھڑی رہ کر اس منظر کا تماشا دیکھونگی ——— کیا میری آنکھیں اس تماشے سے پہلے پھوٹ نہ جائیں گی ——— غرض ان اوہام نے جو فی الواقعی اوہام تھے میری خود اختیاری کو مجھ سے بری طرح چھین لیا اور اس خواب کی کیفیتیں میرے اعصاب کو زندگی بھر متاثر کئے رہیں۔ وہ محبت جو کل تک شوق کی ایک تشنگی تھی۔ نفس کا ایک مطالبہ تھی جذبات کی ایک خودغرضانہ طلب تھی، ایک ایسی خودغرضانہ طلب جو جنون کی شوریدگی سے خالی ہو ——— جو قربانی کے تصور سے گھبراتی اور نتائج کی المناکیوں سے ڈرتی ہو ——— آج اس میں ——— اس خواب کے بعد عزم کی تھوڑی سی گرمی اور ایثار کی ذری سی چاشنی پیدا ہو گئی ——— یہ نہیں کہتی اس خواہش میں سوز نہ تھا۔ سوز تھا لیکن سوز میں لذت نہ تھی، اس خواب نے وہ لذت بھی پیدا کردی ——— یہ نہیں کہتی اس آرزو میں درد کی تڑپ نہ تھی درد تھا اور درد کا احساس بھی لیکن محمود کے ساتھ ہمدردی نہ تھی ——— سو وہ ہمدردی یہ خواب دیکھتے ہی پیدا ہوئی اور عمر بھر مجھ پر حکومت کرتی رہی ——— صبح ہوتے ہی اس کا پہلا حکم یہ ہوا کہ محمود کو دریافت خیریت کا تار بھیجا جائے۔ میں نے کہا لوگ کیا کہیں گے۔ جواب ملا "کیوں ری سلیمہ پھر وہی کچی اِمی تک تیرا بل نہیں نکلا" مجھے یاد نہیں آتا کہ باوجود اس پیاس کے جو محمود کے لئے مجھ میں موجود تھی۔ میں نے کبھی یہ سوچا ہو کہ محمود کس حال میں ہے۔ اس پر کیا گذر رہی ہے۔ لیکن آج پچھلے پہر سے نہ معلوم دل کی کون سی رگ کھل گئی تھی کہ مجھے کسی کروٹ چین نہ آیا اور ایک لمحے کے لئے بھی یہ وہم دماغ سے جدا نہ ہوا کہ ہو نہ ہو محمود بیمار ہے ——— یا اسپر کوئی آفت آنیوالی ہے۔

محمود کا پتہ مجھے ان کے دوست بھائی اختر کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔ میں اپنے دل کی اس فرمایش کو بہت دیر تک ٹال نہ سکی اور قلم اٹھاکر یہ تار لکھا:۔

"اپنی خیریت کا ایک بالتفصیل خط لکھئے"۔

خط لکھئے! اس لئے کہ تار کا جواب تار سے آنے میں یہ اندیشہ تھا کہ میرے تار کا حال گھر والوں پر کھل جاتا اور اس سلسلے میں ان کے سوالوں کا جواب میرے بس میں نہ ہوتا۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود جب میں نے تار ترجمن بوا کے ہاتھ دربان کے پاس بھجوایا تو امی جان یہ پوچھ ہی بیٹھیں کہ تار؟ یہ تار کس کو دیا جارہا ہے؟ میں نے کہہ دیا کہ کلکتہ میں میری ایک ملنے والی ہیں۔ خط سے معلوم ہوا ہے کہ انکا بچہ بیمار ہے۔ سو وہاں اس کی خیریت دریافت کرنے کی غرض سے ایک تار بھیجے دے رہی ہوں۔ یہ تھا میری زندگی کا وہ پہلا جھوٹ جو میں محمود کی محبت کے لئے بولی اس کے بعد سے پھر جھوٹ کا سلسلہ شروع ہوگیا

(۱۵)

فراق کی بے چینیوں کا حال جب میں کبھی محمود کی زبان سے سنتی تو اس کو ایک غزل سے زیادہ اہمیت نہ دیتی لیکن ان چند دنوں میں حالات نے مجھے خود بخود اس نتیجے پر پہونچا یا کہ اس قسم کی رنگین بیانیوں میں تھوڑی سی سچائی ضرور ہوتی ہے۔ کئی دن تک میرے تار کا کوئی جواب نہ آیا۔ خط کے انتظار میں میں نے اپنے بچھونے پر جتنی کروٹیں بدلی ہونگی اس سے کہیں زیادہ میرا دل میرے سینے میں کروٹیں بدلتا اور مجھے ایک نئی زندگی سے روشناس کرتا رہا۔ یہاں تک کہ چھٹیں یا ساتویں دن کی ڈاک میں ایک لفافہ ملا جس کے مٹے ہوئے حرفوں پر محمود کے آنسوؤں کی مہر تھی کھولا تو خط نہ تھا اس کے جذبات پریشان کا ایک مجموعہ تھا۔

کیوں جی سلیمہ؟ تمہیں یہ حق کہاں سے حاصل ہو گیا کہ خود جیو اور دوسرے کو جینے نہ دو - یہ تار مجھے کس لئے دیا گیا ہے؟ اسی لئے نا؟ کہ بمبئی کی باغ و بہار فضا میں اگر سکون کے چند لمحے میں نے کہیں سے مستعار لئے ہوں تو اُسے بھی ماضی کے تصورات سے تلخ کر دیا جائے - اگر یہی خیال تھا تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے سکون جس چیز کا نام ہے وہ مجھ سے بہت پہلے چھین لی گئی ——— کس نے چھینا یہ کہنے کی غالباً ضرورت نہ ہو گی اور اس کا جواب میں تم سے بھی نہیں مانگتا - چیز تھی چھن گئی اور ہمیشہ کے لئے چھن گئی - میں نے گھر سے نکل کر اسے احباب کے قہقہوں اور شراب کی بوتلوں میں ڈھونڈھنا چاہا اور نہ ملی - بازار حسن کی رنگینیوں میں تلاش کیا لیکن وہاں بھی اس کا سراغ نہ تھا - ——— کالج کے حلقے سے نکل کر روحانیت کے دائرہ میں آیا وہاں بھی مجھے پناہ نہ ملی ——— ایک مغضوب روح ہے جو عافیت کی تلاش میں سر ٹکرا رہی ہے - راستہ تاریک ہے اور رات اندھیری - جہاں تک نظر کام کرتی ہے گرد و پیش کوئی سرا نہیں اور اگر ہے تو اس کا چراغ روشنی نہیں پھینکتا ——— زندگی کے چٹیل میدان میں جہاں کوسوں تک سبزہ نہیں، یادش بخیر ایک درخت تھا چھوٹا سا سایہ دار درخت جس کی چھاؤں میں یہ مسافر لیٹ رہا کرتا تھا - سو اب اس کے نیچے کسی اور نے اپنا چھوٹا ڈال لیا - بستر پھیلا دیا، اس طرح پھیلا دیا کہ اس تھوڑی سی جگہ میں اب کسی دوسرے کے بیٹھنے کی گنجائش نہ رہی - اب مسافر کہاں جاتے - یہ سوال تم سے نہیں ان لوگوں سے ہے جو . . . . لیکن ان سے بھی کیوں ہو؟ خدا سے ہو ہاں خدا ہی سے اس لئے کہ

جتنے شکوے ہیں اُسی سے ہیں کہ اس گلشن میں
مجھ کو بلبل کیا صیاد کو صیاد کیا

تم پوچھتی ہو کیسے ہو اپنی مفصل حالت لکھو - میں پوچھتا ہوں کہ تمہیں یہ سوال کرنے کا حق کیا ہے؟ یہ سوال اسکو کرنا چاہئے جس نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی میرے متعلق یہ سوچنے میں گذارا ہو کہ میں کیسا ہوں کس حال میں ہوں کدھر جانا تھا کدھر جا رہا ہوں - وہ کہ جس نے اپنے دل کے تمام دروازے اور اپنے دماغ کی تمام کھڑکیاں میرے لئے میری یاد کے لئے میرے تصور کے لئے بند کر رکھی ہوں انصاف کرو اسے میرے متعلق کچھ پوچھنے کا کیا حق حاصل ہے - میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دنیا کیونکر بدل گئی - آفتاب بھی اسیطرح نکل رہا اور ستارے بھی اسی طرح اپنے اپنے سورج کے گرد گھوم رہے ہیں - موجیں اسیطرح ساحل سے سر ٹکرا رہی ہیں اور ساحل اسی غرور کے ساتھ انکی وارفتگی کو ٹھکرا رہا ہے

لیکن سلیمہ بدل گئی ہے ——— اس کا دل بدل گیا ہے ———
کیسی عجیب بات ——— کیسا عجیب انقلاب ———

——— پوچھتی ہو کہ کیسا ہوں؟ اچھا ہوں ——— زندگی کی وہ گنی ہوئی سانسیں جو گننے کے لئے ودیعت کی جاتی ہیں انکی گنتی کو جلدی جلدی ختم کرنا چاہتا ہوں ——— راستہ کتنا ہی لمبا اور منزل کتنی ہی دور کیوں نہ ہو، دوڑ کے چلنے سے جلد پہنچ جانے کا بہرحال امکان ہے - اور دوڑ کے کیوں نہ چلوں، ٹھوکر سے ڈرتا نہیں، گڑھوں سے خوف نہیں کھاتا - تلوے کانٹوں کے عادی ہو چکے ہیں - سر راہ کوئی چشمہ نہیں کوئی سبزہ زار نہیں جہاں کچھ دیر بیٹھ کر ستانے اور پیاس بجھانے کا سوال پیدا ہو - بس سر اٹھائے بھاگا جا رہا ہوں ——— اسیطرح بھاگتے بھاگتے کسی نہ کسی دن منزل پر پہونچ ہی جاؤنگا اور تم بھی سن لو گی کہ مسافر منزل پر پہونچ گیا -

مشکر گذار ہوں ان مشغلوں کا جنھوں نے تندرستی کی بنیادیں ہلا دی ہیں - میرے دوستوں میں ایک صاحب ڈاکٹر ہیں انکی تشخیص ہے کہ میرے جسم میں شکر کے عناصر کم ہو رہے ہیں - ان احمق آدمی کو کیا معلوم کہ جس کی زندگی کی ساری شیرینیاں چھین لی گئیں ہوں اس کے جسم میں شکر کے عناصر کہاں سے آئیں گے - بہرحال غنیمت ہے کہ عناصر کی ایک دیوار تو گر رہی ہے جو باقی ہیں وہ بھی اسیطرح ایک ایک کر کے گر جائیں گی اور روح کا طائر پر جھاڑ کر "انا و لا غیری" کہتا ہوا اپنے نشیمن کی طرف پرواز کر جائے گا - بھائی جان کو خدا سلامت رکھے خیریت بھی پوچھتے ہیں اور ضرورت کے وقت روپے بھی بھیجدیتے ہیں - لیکن نفس کو خود اعتمادی کا سبق سکھلانے کے لئے ایک دفتر میں ملازمت کر لی ہے - صبح سے شام تک دماغ کو قلم کے اشاروں پر لگائے رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، شام ہوتی ہے تو سمندر کی طرف نکل جاتا ہوں، مجھے اسکی گہرائیوں میں عافیت نظر آتی ہے - لیکن وہاں تک پہونچ نہیں سکتا - قدم بڑھاتا ہوں تو جی ڈرتا ہے - کوشش کرتا ہوں کہ نہ ڈروں لیکن ڈرتا ہوں شاید ڈر کسی دن نکل جائے اور زندگی کا یہ کٹھن سفر بحری راستے سے بہ آسانی طے ہو جائے رات ہوتے ہی یہ یاد آتا کہ پردیں منتظر ہو گی چونکہ نہیں چاہتا کہ کسی کو اپنے انتظار کی تکلیف دوں اس لئے وہاں سے اٹھکر اس کے

گھر کی راہ لیتا ہوں۔ وہاں پروین ہوتی ہے اسکی رعنائیاں ہوتی ہیں ساز ہائے موسیقی کی خواب آور لوریاں ہوتی ہیں اور شراب کے رنگین گلاس ہوتے ہیں اور میں تھوڑی دیر کے لئے اپنے دماغ کے تمام ہنگاموں کو اپنے وجود کو اپنی خودی کو یہاں تک کہ تم کو تمہارے تصور کو شراب کے انہیں گلاسوں میں غرق کر دیتا ہوں ——— غرق ہو جاتا ہوں ——— اور صبح تک ایک دوسری دنیا میں رہتا ہوں۔ صبح ہوتے ہی زندگی کی تمام کلفتیں جاگ اٹھتی ہیں اور میرے دماغ سے اپنا خراج مانگنے لگتی ہیں یہ ہے میری روزانہ زندگی اور اس کا نظام اوقات ——— پروین کو تم شاید نہیں جانتیں ——— یہ وہی عورت ہے جس نے مجھے ثریا کی لعنت سے نجات دلائی اور اب ایک چور کی طرح چور دروازے سے میری زندگی میں داخل ہونا چاہتی ہے۔ میں تم سے مایوس ہو کر محبت کی تلاش میں ثریا تک پہونچا تھا۔ اور اس پیاسے کی طرح جو پانی کی جستجو میں چمکیلی ریت کی طرف بڑھے وہاں پہونچکر اپنی تشنگی پر سر دھن رہا تھا کہ پروین ایک راہ چلتے مسافر کی طرح ادھر سے گذری اور میری تشنگی پر رحم کھا کر اپنی چھاگل سے تھوڑا سا پانی دیا اور میں پانی کے لالچ میں اسی کے پیچھے چل پڑا ——— یہ ہے میرے اور پروین کے تعلقات کا خلاصہ وہ تمہاری طرح حسین نہیں ہے لیکن میری طرح وفادار ہے۔ ثریا میری طرح وفادار نہ تھی مگر تمہاری طرح حسین تھی۔ اس کے حسن کے نقوش تمہارے حسن سے بہت ملتے جلتے تھے اور اسی مشابہت نے مجھے اسکی طرف کھینچا تھا لیکن میں نے بہت جلد یہ معلوم کر لیا کہ کسی سے محبت کرنا اس کے پیشے کے اخلاق کے منافی ہے ——— اور میں نے بھول کے دھوکے میں چنگاری پر ہاتھ ڈال دیا ہے ——— پروین نے میرے قریب آ کر محبت کا ہاتھ بڑھایا اور جب سے میری محبت کا ہاتھ جھٹکا گیا مجھ میں محبت کے کسی بڑھتے ہوئے ہاتھ کو جھٹکنے کی طاقت نہیں رہی میں نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن قبول کرتے ہوئے یہ بھی کہدیا تم کسی طرح میری زندگی میں آ نہیں سکتیں اس کے دروازے ہیں اور دروازوں پر کسی نے قفل چڑھا رکھے ہیں لیکن یہ غدار عورت قفل توڑ دینا چاہتی ہے۔ چور دروازے تلاش کرتی ہے نقب لگانے اور دیوار پھاندنے کی دھمکی دیتی ہے ——— میں اس سے بھاگنا چاہتا ہوں ——— اس لئے وہ مجھ سے وہ چیز مانگتی ہے جو میں نہیں دے سکتا جو میرے پاس

نہیں۔ میں اس کے احسانات کے معاوضے میں دل کہاں سے لاؤں۔ جس نے لیا ہے وہ آج بھی واپس کر دے تو میں پروین کی یہ چیز پروین کی طرف بڑھا دوں اس لئے کہ وہ اس کی مستحق ہے اور قدر داں بھی

بہر حال بھاگ جاؤنگا مقصد کی تلاش میں بھاگنا اور دوڑنا ہی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ میں بھی جب سے زندگی کا ہوش آیا ہے بھاگ رہا ہوں اور بھاگتا رہوں گا۔ یہ وجود روح مطلق سے جدا ہو کر جب سے انفرادیت کے عذاب میں مبتلا ہے اسوقت سے ڈھونڈ رہا ہوں اپنے ساتھی کو اپنے "جیون ساتھی" کو اپنی روح کے شریک کو اپنے وجود کے دوسرے ٹکڑے کو ڈھونڈ رہا ہوں۔

آتش کہتا ہے۔ ع

عدم سے جانب ہستی تلاش یار میں آئے

اور بلا شبہ تلاش یار ہی روح کا سب سے بڑا مقصد ہے اور سب سے قوی رجحان ——— انسانی زندگی میں شوق کے تمام ہنگامے نفس کی تمام گمراہیاں اور جنسی جذبات کی تمام بے اختیاریاں اسی "تلاش یار" کا نتیجہ ہیں۔ ایک روح جب کسی دوسری روح کو دیکھتی ہے جو کسی عالم میں اس سے ہم آغوش تھی یا کسی زندگی میں زندگی کی شریک تھی تو بے اختیار بڑھتی لیکن جب ایک جزو نور دوسرے جزو نور کو ایک مانوس روح دوسری مانوس روح کو کھینچتی ہے تو سماج دونوں کے بیچ میں دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

سلیمہ غور تو کرو کہ یہ فطرت کا کتنا بڑا گناہ ہے

میں نے فطرت کے اشارے پر اپنے دل کی تنہائی میں اس گناہ کے خلاف جہاد کرنا چاہا تھا یہ ایک مقدس جہاد ہوتا لیکن تم نے سماج کے خود ساختہ اصولوں کی غلامی کو اپنے لئے بہتر سمجھا ——— یہ جواب ہے تمہارے ان خطوط کا جو میری محبت کے فطری تقاضوں کے جواب میں طمانچوں کی طرح آتے رہے

بہر حال جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے میری شاعری نہ سمجھو سماج کے لئے یہ بہت ہی آسان ہے کہ ان حقیقتوں کو جو اسکی سمجھ میں نہ آئیں یا جو اس کے مذاق کے موافق نہ ہوں انہیں شاعری کہہ کے جھٹلا دے اور تم بھی اسی سماج کی ایک سعادت مند بیٹی ہو نا۔

غالباً بھولی نہ ہو گی میرے اور ثریا کے تعلقات کی خبر پا کر جو عتاب نامہ تم نے کلکتہ سے بھیجا تھا اس کے جواب میں میں نے لاڈلے صاحب مہتاب کا یہ شعر کافی سمجھا تھا ؎

فریفتہ مجھے عالم کے رنگ و بو نے کیا

بڑا ستم ترے ملنے کی آرزو نے کیا

کبھی تم نے سوچا ہے کہ زندگی کی کتنی بڑی حقیقت اس شعر میں بند ہے نظر کا مطلوب اور روح کا انتخاب جب کسی شخص سے چھین لیا جاتا ہے تو یہی ہوتا ہے ——— یہی ہوتا کہ باغ کا ہر پھول جاذب نظر ہو جاتا ہے ہر کلی دعوت دیتی ہے ہر خوشبو پکارتی ہے کہ ادھر آ جس چیز کی تجھے تلاش ہے وہ میرے پاس ہے ——— شوق کی ماری ہوئی روح ایک ایک کلی کو سونگھتی ایک ایک پھول کا رس لیتی ہے اور جب وہ چیز نہیں پاتی جس کی تلاش ہے تو بھاگتی ہے یہ کہتی ہوئی بھاگتی ہے کہ

ع۔ تم سے جہاں میں لاکھ سہی تم مگر کہاں

اور بھاگتی رہتی اسوقت تک جب تک کہ اسکی چیز اسے نہ مل جائے وہ اس زندگی میں ملے یا کسی دوسری زندگی میں لیکن تلاش ختم نہیں ہوتی ——— یہی ہے فطرت کی آوارگی اور اسی کا نام ہے عیاشی سماج کی اصطلاح میں۔ کاش ان عیاشوں کے دل کی آگ کوئی پہچانتا۔ کاش انکی بیقراری کی حقیقت تک پہونچنے کی کوئی کوشش کرتا۔ خدا کی اس دنیا میں کوئی نہیں جو ان غریبوں پر رحم کھائے۔ مذہب ان سے تیوریاں چڑھائے ہے۔ قانون ان سے ہمدردی کی ضرورت نہیں سمجھتا ——— سوسائٹی انکا مضحکہ اڑاتی ہے اور سماج انکی آوازوں پر کان نہیں لگاتا۔ یہ کیسا اندھیر ہے کہ روح اگر روح کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتی پھرے تو اس گھڑی کا ان قابل رحم گھڑی کا اس معصوم گھڑی کا نام گناہ رکھدیا جائے۔ سلیمہ ؟ جو پیاسا نہیں وہ پیاس کی قدر کیا جانے وہ تمام اخلاق کی بلندیوں سے گرے ہوئے لوگ جو معاشرت کی سیدھی سڑک سے کٹ کر بازار حسن کی خاک چھان رہے ہیں اگر ان کے دلوں کو ٹٹولا جائے ان کے وجود کے پردوں کو چاک کر کے دیکھا جائے۔ انکی زندگیوں کے اوراق الٹے جائیں تو ہر کتاب یہی کہانی کہے گی کہ جس چیز کی تلاش تھی وہ نہ ملی اور اگر ملی تو چھین لی گئی۔ ان کشتگان تلاش میں کچھ تو ایسے ملیں گے جنھوں نے پاکر کھویا اور کچھ ایسے جنھوں نے پایا ہی نہیں روح کا مقصود نظر کے دائرے میں آیا ہی نہیں۔ اس لئے نہیں آیا کہ دونوں کے درمیان میں زمان و مکان کی بہت سی دیواریں حائل تھیں۔ زندگی کی دوڑ میں ایک پیچھے رہ گیا تھا اور ایک آگے بڑھ آیا تھا یا پھر آدم و حوا کی طرح ایک لنکا میں اتارا گیا تو دوسرا حجاز کے ریگستان میں۔ آدم و حوا کا افسانہ جو تحقیق جدید کی روشنی میں واقعی ایک افسانہ ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اسی تلخ حقیقت کی ایک تمثیل ہو۔ بہت ممکن ہو کہ انسانیت کے سلسلۂ ارتقا کی موجودہ کڑی کے آدم نے اپنے جوڑے کی تلاش میں اسیطرح مشرق و مغرب کی خاک اڑائی ہو۔ وہ آنسو وہ روایتی آنسو جو بہشت کے فراق میں آدم کی آنکھوں سے نکلے بہت ممکن ہے کہ وہ بہشت کے فراق میں نہ ہوں اس محبوب کی تلاش میں ہوں جو عالم ازل میں اس کے وجود کا شریک ہو۔ بہت ممکن ہے کہ اس عہد کا فوق البشر فوق البشر کو ڈھونڈھ رہا ہو روح اعظم روح اعظم کی متلاشی ہو ایک نئی نسل کی اشاعت کے لئے ایک نئی دنیا کی تعمیر کے لئے ایک نئی حقیقت کے ظہور کے لئے اور جب وہ جوڑا زمین کے کسی حصے پر مل گیا ہو تو اس کے اتحاد سے یہ نسل چلی ہو۔ اور شاید یہی وجہ ہو کہ انسانیت کی اس نسل میں تلاش جنسی کا یہ جذبہ تمام جذبوں سے زیادہ قوی ہے اور زیادہ سرکش اس طرح کہ نہ معاشرت اس پر اخلاق کا پہرہ بٹھلا سکی نہ قانون اسے اپنے دائرے میں نظر بند کر سکا۔ بہر حال یہ ہمارے تاریخی عہد سے پہلے کی داستان ہے کیوں نہ اپنے بیان کی تصدیق میں تاریخ کے اوراق تمہارے سامنے کھول کر رکھدوں۔ نورجہاں کو تم جانتی ہو جہانگیر کا یہ روحانی جوڑا جہانگیر کو بہت دیر میں ملا اور جب تک نہیں ملا اس کے نفس کی آوارگی محبت نئے گھروندے بناتی اور توڑتی رہی۔ شاہجہاں کو ممتاز محل ابتدائے عمر ہی مل گئی اس لئے شہزادہ ہونے کے باوجود اسکی پوری جوانی بے داغ رہی لیکن عمر کی دوپہر ڈھلنے سے پہلے موت نے ممتاز محل کو اس سے چھین لیا اور مورخ جانتا ہے کہ اس حادثے کے بعد اس نے اپنا اخلاقی توازن کسی بری طرح کھو دیا۔ انگلستان کا بادشاہ ہنری ہشتم جنتری کی طرح بیویاں بدلتا رہا تلاش جنسی کا یہ جذبہ نہ صرف اسکی زندگی بلکہ اسکی سیاست پر بھی حکمراں رہا اور مورخ آج بھی مشتبہ ہے کہ مسلسل آٹھ بیویاں کرنے کے بعد بھی اسے جنسی اور روحانی سکون میسر ہوا یا نہیں۔ مصر کی ملکہ قلوپطرہ کی پوری جوانی اسی تلاش میں صرف ہو گئی ہر رات ایک نیا مرد اس کے پہلو میں ہوتا اور ہر صبح اسکی نظر ایک نئے جوان کی تلاش میں اپنا سفر شروع کر دیتی جوانی کی شام ہو رہی تھی کہ روم کا سپہ سالار انٹونی اس سے ملا اور تلاش دفعتاً ختم ہو گئی ——— مشہور رومانی شاعر شیلی کی ساری زندگی اسی تلاش جنسی کی سوگوار رہی اور باوجود اس اخلاقی حس کے جو ایک مفکر اور شاعر ہونے کی حیثیت سے اس میں بہت قوی تھی وہ اپنی بیوی کو "ہمدردی"

سے زیادہ کچھ نہ دے سکا۔ اور تمام عمر اپنی روح کی بیقراری پر ماتم کرتا رہا۔ کون جانتا ہے کہ میری زندگی بھی انہیں افسانوں کی طرح ایک افسانہ نہیں بنا رہی ہو۔

یہاں پہونچکر تم یہ سوال کر سکتی ہو کہ عشق یا اس نوع کا کوئی تعلق اگر نتیجہ ہے دو روحوں کی دو مانوس روحوں کی باہمی کشش کا باہمی میلان کا تو اکثر حالتوں میں یہ کشش یہ میلان یہ جھکاؤ یک طرفہ کیوں ہوتا ہے، ہر حالت میں محبت کا جواب محبت سے کیوں نہیں ملتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک روح دوسری روح کو کسی عالم یا کسی زندگی میں آزردہ کر دیتی ہے، اپنی کسی حرکت یا کسی عمل سے اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ آزردگی دوسری زندگی میں طبیعت کی رکاوٹ بنکر نمایاں ہوتی ہے اور بعض اوقات تو یہ رکاوٹ اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ اس کے مقابلے میں کشش عنصری بھی کمزور پڑ جاتی۔ شاید اسی قسم کی کوئی رکاوٹ میری جانب سے تمہاری طبیعت میں بھی ہے —— ورنہ تم اور میری محبت کے حملوں کا مقابلہ سلیمہ؟ —— فطرت کا سیلاب فرض کا حصار باندھنے سے نہیں رکتا۔

سلیمہ! میری اپنی سلیمہ —— یقین کرو کہ میں جب اپنی روح کی گہرائیوں میں اتر کے دیکھتا ہوں مجھے نظر آتا ہے کہ تم نہ صرف ایک زندگی میں بلکہ کئی زندگی میں میرے جیون کی ساتھی تھیں میرے جذبات کی شریک تھیں بلکہ اس سے بھی زیادہ میری ہستی کی شریک تھیں۔ عالم ازل میں میرے وجود کا نصف حصہ تھیں۔ عالم ارواح میں میری روحانی رشتہ دار تھیں اور عالم عناصر میں جسمانی حیثیت سے مجھ سے میرے عناصر سے میرے ذرات سے قریب تھیں ——

تم یہ سنکر تعجب تو نہ کرو گی کہ روحیں روحانی تعلق کے علاوہ جسمانی تعلق سے بھی متاثر ہوتی ہیں اور ان تاثرات کو کئی زندگیوں تک لئے رہتی ہیں۔ عشق کیا ہے روح کے اندر انہیں تاثرات کا ایک شعور —— اور حسن کیا ہے روح کے حافظے میں ان مانوس چہروں کی ایک جھلک جو کسی عالم یا کسی زندگی میں ہمیشہ پیش نظر تھے۔ اور روح جنکی قربت سے لطف اندوز تھی ——

چہرے کی ترکیب اور جسم کی بناوٹ میں تناسب و ترصیع کی فنی قلم کاریوں کا شعور جو تہذیب کی برکت سے ہم میں پیدا ہو گیا ہے قطع نظر اس کے حسن اگر کچھ ہے تو وہی چہرے کی مانوسیت —— وہ مانوس صورتیں —— جن سے کسی عالم میں انس تھا جب ان کا عکس کسی دوسرے چہرے میں نظر آتا دل بے اختیار کھنچتا ہے اور طبیعت بے ساختہ لپکتی ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی صورت فنی اعتبار سے کتنی ہی معیاری کیوں نہ ہو مگر آنکھوں میں نہیں کھپتی اور اگر نظر میں چڑھ بھی جاتی ہے تو دل میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتی —— کچھ تو یہ مانوسیت عشق کا باعث ہوتی ہے۔ اور کچھ روحانی رشتہ داری یعنی عالم ارواح میں روحوں کی باہمی قربت۔ یا پھر بعض حالتوں میں عناصر کی کشش ان عناصر کی کشش جو پچھلی زندگی میں اپنے جسم کے شریک تھے اور اس زندگی میں ایک دوسرے کے جسم کے اجزا بنے ہوئے ہیں —— اس کے علاوہ ان اجزائے نور میں بھی روح کی جن سے ترکیب ہے، کشش ہوتی ہے۔ یہ کشش تمام کششوں سے زیادہ بے پناہ ہے۔ روحوں میں جنسیت کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ یوں سمجھو کہ نور کے ایک ٹکڑے سے جب دو روحیں بنتی ہیں تو ایک ٹکڑے میں دوسرے ٹکڑے کے لئے قدرتاً کشش ہوتی ہے اور یہی کشش زندگی میں جنسی کشش بن جاتی ہے اور ایک جزو نور دوسرے جزو نور کو بے اختیار ڈھونڈھتا ہے۔ زمانہ حال کے صوفیوں کا خیال ہے کہ جب تک دونوں بچھڑے ہوئے ٹکڑے ایک انفرادیت میں آ کر گھل مل نہیں جاتے۔ اس وقت تک وہ وصال حقیقی حاصل نہیں ہوتا جو روحوں کے ارتقا کی آخری منزل ہے۔

اب تو تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ حسن عشق کا تم مضحکہ اڑاتی ہو اس کی بنیادی حقیقت کیا ہے؟ ہر انسان انفرادی حیثیت سے کیوں بیقرار ہے؟ حقیقی سکون اسے کیوں نہیں ملتا؟ عام طور پر ازدواجی زندگی کیوں کامیاب نہیں ہوتی —— تم نے دیکھا ہوگا اور دیکھا نہیں تو سنا ہوگا کہ ہماری سوسائٹی کے اکثر منچلے لوگ حسن کی سینکڑوں دوکانوں پر اشرفیاں کوڑیوں کے مول لٹانے کے بعد سینکڑوں حسین کھلونوں سے کھیلنے کے بعد ایک کالی کلوٹی کمرو عورت پر بری طرح ریجھتے ہیں۔ اور زندگی بھر کے لئے اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں آنکھوں کا سرکش سے سرکش جادو اور وفا و محبت کا مہلک سے مہلک منتر انہیں اس عورت سے جدا نہیں کر سکتا۔ ایسی درجن سے زیادہ مثالیں میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ کہو تو گنوا دوں اس کے علاوہ پندرہ سال کی چھوکریوں کو ساٹھ سال کے بوڑھوں پر اور چودہ آغاز جوانوں کو پچاس سال کی بڑھیاؤں پر جان چھڑکتے بھی دیکھا

ہے۔ دنیا یہ سارے تماشے حیرت کی آنکھوں سے دیکھتی ہے اور نہیں
جانتی کہ یہ کیا ہو رہا ہے ——— صرف چیختی ہے اور غل مچاتی ہے
وہ روحانیت کا یہ گہرا راز کیا سمجھے وہ کیا جانے کیا زندگی کے سفر میں
چند قدم آگے یا پیچھے رہنا محبت کی نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا
وہ تو صرف یہ جانتی ہے کہ سلیمہ محمود سے چند مہینے پہلے دنیا میں آگئی اس لئے
برادری کے قانون اور عورتوں کی شریعت کے رو سے محمود کی بیوی
بن سکتی ——— سلیمہ! مجھے تم سے کوئی شکایت ہے تو یہ کہ تم دوڑ کے کیوں
چلیں اور مجھ سے پہلے کیوں پہنچ گئیں۔ یہ کیوں نہ دیکھا کہ میں پیچھے آرہا
ہوں۔ مجھے آگے کیوں نہ بڑھنے دیا۔ یہ کیوں نہ سمجھیں کہ چند قدم سست
چلنے کے جرم سے تم مجھ سے چھین لی جاؤ گی ایک پوری زندگی کیلئے چھین
لی جاؤ گی سلیمہ اگر تناسخ کا عقیدہ صحیح ہے تو تم کئی زندگیوں میں میری رہی ہو
اور میں کئی زندگیوں سے تمہارا پیچھا کر رہا ہوں اگر تناسخ کے عقیدے
کے مطابق روحیں اس دنیا میں پچھلا قرض ادا کرنے کے لئے آتی ہیں تو میں
بھی تم سے بچھڑ کر اپنا قرض ادا کر رہا ہوں۔ یاد نہیں آتا کہ یہ قرض کیسا ہے۔
پچھلی زندگی میں مجھ سے کونسی ایسی بھول ہوئی تھی یہ جدائی جس کی پاداش
ہے ——— تمہیں بتاؤ کہ تم کس جرم پر مجھے چھوڑ کر بھاگ آئیں۔ اچھا کیا بھاگ
آئیں۔ میں بھی بھاگ رہا ہوں ——— بھاگ جاؤنگا اتنی تیزی سے بھاگونگا
کہ تم پیچھا نہ کر سکو اتنی دور نکل جاؤنگا کہ کئی زندگیاں میرے اور تمہارے
درمیان میں حائل ہو جائیں۔

بس اب زیادہ نہیں لکھ سکتا دماغ جذبات سے مغلوب
ہو رہا ہے۔ تمہاری یاد آوری کا شکریہ میری حالت نہ پوچھا کرو اپنی زندگی
کا ماتم دار ہوں۔ کاش تم اس ماتم میں شریک ہوتیں تعزیت دیتیں
ہمدردی کرتیں۔ آنسو پونچھتیں لیکن الٹے گھروندے کی بیوفا ساتھی
——— تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا ——— اپنی
ہی آستین اور اپنے ہی آنسو ——— قابل رحم ہے یہ بیکسی
جن آنسوؤں کو تمہارے دامن میں جگہ ملنی چاہئے انہیں بمبئی کی خاک
جذب کر رہی ہے ——— کیا کسی زندگی میں تم اپنی یہ امانت
اس سے واپس لے سکو گی؟ اچھا خدا حافظ! دل کی آنکھیں کھول کر
دیکھو ایک ٹوٹی ہوئی کشتی سمندر کی لہروں سے کھیلتی طوفان کے
جھونکوں کا مضحکہ اڑاتی ——— ساحل سے قریب ہوتی
جا رہی ہے ——— پہچانتی ہو؟ یہ کشتی نہیں میری زندگی ہے
——— میری زندگی کی ہولائی ہوئی ناؤ جس پر چڑھنے سے
تم نے انکار کیا تھا اور میں جسے آج کل تنہا کھے رہا ہوں
گو تنہا نہیں کھے سکتا بازو شل ہو رہے ہیں اور دم پھول رہا ہے
——— بہت ممکن ہے کہ پتوار ہاتھوں سے چھوٹ پڑے
اور میں اپنے کو موجوں کے رحم پر چھوڑ دوں ——— مگر
نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ——— پر دیکھو! سب پیچھے تیرتی
ہوئی آرہی ہے وہ میری کشتی پر زبردستی چڑھنا چاہتی ہے ———
میں اپنی کشتی تیز بھگاؤنگا اور بہت جلد اسکی پہونچ سے باہر ہو
جاؤنگا ——— اچھا سلام لو ———
ساحل قریب ہے اور ——— تم بہت دور ———

اپنی زندگی کا سوگوار۔

محمود

مجھے خط کی ہر سطر میں محمود کا دل کروٹیں لیتا ہوا نظر آرہا تھا
میں خط پڑھتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی دل اس کے قلم کے چرکوں
سے تلملا رہا تھا اور میں محسوس کر رہی تھی ان چرکوں کے بعد میرا
احساس فرض پھر پنپ نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے
فلسفہ عشق کی تفسیر شروع کی اور میرا دماغ اپنی نیم شعوری حالت
سے چونکنے لگا اور جذباتی کیفیت کی جگہ ایک ذہنی کیفیت مجھ پر
طاری ہونے لگی۔ اسکی دلیلوں کے جواب خود بخود میرے سامنے آنے
لگے۔ لیکن خط کے اختتام پر پھر ایک طوفان اٹھا اور میری خودی
پھر اس میں ہچکولے کھانے لگی ——— آخری سطروں میں
اس نے اپنی زندگی کا کشتی سے استعارہ کیا تھا ———
نظر وہاں تک پہونچی ہی تھی کہ مجھے اپنا ہولناک خواب اپنی تمام
ہولناکیوں کے ساتھ یاد آیا ——— اور میں پھر بے چین
ہو گئی۔ دو دن تک میں خط کو بار بار پڑھتی رہی اپنے اوہام کو تائید
اور اپنے دل کو سمجھاتی رہی۔ اسی عالم میں میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے
فوراً کلکتہ واپس جانا چاہئے ورنہ جو زندگی آج کل شروع ہو گئی
ہے وہ مجھے ایک نہ ایک دن گرہست آشرم کی چار دیواریوں سے
باہر نکال کر رہے گی۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے محمود کے خط کا جواب
لکھنے سے پہلے اپنے شوہر کو خط لکھا اور یہ فرمائش کی پہلی فرصت میں
مجھے کلکتہ بلوا لیا جائے۔ طبیعت کچھ ٹھکانے ہوئی تو محمود کے خط کا
جواب لکھنے بیٹھی اور یہ سوچ کر بیٹھی کہ اپنے دل کی تمام کیفیتوں کو کھولکر
اس کے سامنے رکھ دوں گی ——— اس لئے کہ مجھے خوف
تھا کہ وہ میری محبت کی طرف سے قطعی مایوس ہو کر کہیں واقعی خودکشی
نہ کر لے ——— اور میں اسکو ہر قیمت پر زندہ

دیکھنا چاہتی تھی ——— بہرحال میرا خط ملاحظہ ہو

۷۸۶

میرے اچھے محمود خدا تمہیں توفیق دے کہ تم مجھے اور میرے دل کو پہچاننے کی کوشش کرو ایک گھروندے کے کھیلے ہوئے دو بچے جوان ہو کر ایک دوسرے سے اتنا بھی اجنبی ہو سکتے ہیں؟ ——— جتنا کہ تم اپنی سلیمہ سے ہو ——— ارے دیوانے! محبت کوئی چراغ نہیں ہے جسے پھونک مار کے بجھا دیا جائے ——— یہ دل کی آگ تو ہڈیوں تک کو سلگا کے رہتی ہے یہ اور بات ہے کہ دھواں نہ اٹھے یا نہ اٹھنے دیا جائے۔ چولھے میں آگ جب موجود ہو تو یہی غنیمت ہے کہ شعلے نہ بلند ہوں ——— اس سے زیادہ تو میں نے کبھی بھی حوصلہ نہیں کیا ——— آنچ تیز تھی اسے دھیمی کرنے کی کوشش ضرور کرتی رہی اور کئی مرتبہ اسے دبا رکھنے میں کامیاب بھی ہوئی۔ لیکن نہ جانے کون سا ہاتھ تھا؟ ——— کس کا ہاتھ تھا؟ جو سلگائی ہوئی چنگاریوں کو اکساتا رہا اور آنچ دھیمی ہو ہو کر تیز ہوتی گئی ——— اے جذب و کشش کے فلسفی ——— دیکھ تو کہیں اس آگ کو بھڑکائے رکھنے کی ذمہ داری تجھ پر تو نہیں ہے ——— میں نے چاہا تھا کہ جلنا جب مقدر ہو چکا ہے تو خود جلوں گھر کو نہ جلنے دوں ——— مشیت نے جس امتحان میں ڈال دیا ہے اس سے سرخرو ہو کر نکلوں ——— زندگی کے معرکے میں ——— فرض کی قربان گاہ پر ——— ایک مجاہد کی طرح ثابت قدم رہوں۔ بزدلوں کی طرح میدان چھوڑ نہ بھاگوں ——— اپنے کام نہیں آسکتی تو دوسروں کے کام آؤں خود دوسروں کے لئے جیتی رہوں ——— اور تجھے اپنے لئے جیتا رکھوں ——— لیکن اپنے کارزار حیات کے بزدل سپاہی جب تجھے یہ منظور نہیں ——— اور زندگی سے بھاگ کر موت کی گود میں پناہ لینا ہی تیری نظر میں حیات عشق کا سب سے بڑا کارنامہ ہے ——— تو اے مشیت کے سٹیلے ہے بسم اللہ کر ——— تیری سلیمہ اس راہ میں تجھ سے پیچھے نہ ہوگی۔

صحرائے زندگی کی آوارہ گردی مبارک

لیکن اے منزل کی طرف تیزی سے بھاگنے والے مسافر! قریب آکر دیکھ ——— وہ درخت وہ سایہ دار درخت جس کی چھاؤں میں تیرا بسیرا تھا اور جس کے نیچے کسی دوسرے نے اپنا بستر پھیلا دیا ہے زندگی کے کیڑے اسکو چاٹ رہے ہیں اور حالات کی رفتار اس میں گھن لگا رہی ہے گو اب بھی کھڑا ہے لیکن گرد و پیش کی تند و تیز ہواؤں کا مقابلہ اب اس سے نہیں کیا جاتا طوفان کا ایک تند جھونکا اور بس ——— گر رہا ہے اور گر جائے گا اسکو گرتا ہوا دیکھ لے ——— اور اس کے بعد اپنی راہ لگ

بیوفائی کا الزام شکریے کے ساتھ قبول لیکن اے میرے دل کس نے کس سے بیوفائی کی ——— میں نے ایک سے محبت کرنے کے بعد دوسرے سے محبت کی ہوتی ——— دل کا تحفہ ایک سے چھین کر دوسرے کو بڑھا دیا ہوتا تو شاید یہ الزام انصاف کی نظر میں کوئی وقعت رکھتا۔ لیکن واقعات تو کچھ اور کہتے ہیں ——— میں زبردستی ایک مرد کی گود میں پھینک دی گئی اور تم شوق سے ایک عورت کے آغوش کی طرف بیتابانہ بڑھے ——— محمود گریبان میں سر ڈالو۔ کیا یہ حقیقت نہیں؟

میں نے تم سے محبت ضرور کی لیکن پیمان محبت باندھتے ہوئے میں نے تم سے یہ معاہدہ کب کیا تھا کہ میں تمہیں وہ سب کچھ دیدوں گی جو میرا نہیں ہے۔ دل میرا تھا سو وہ میں نے تم کو بہت پہلے سونپ دیا جب اپنی ننھی عمر میں اپنے کو تمہیں کیونکر دے ڈالتی۔ تم اپنے کو اپنی ملکیت سمجھو لیکن میں اپنے کو اپنی ملکیت کیوں کر سمجھتی میں اپنی نہ تھی اپنے ماں باپ کی تھی۔ اپنی برادری کی تھی اپنے خدا اور اپنے سماج کی تھی اور انھوں نے اپنی چیز جس کو چاہا اٹھا کر دیدی ——— میں نے بہت سے لوگوں کی امانت چپکے سے اٹھا کر تمہیں کیوں نہ دیدی سماج اور فرض کی دیوار پھاند کر تمہارے ساتھ نکل کیوں نہ کھڑی ہوئی ——— ہندوستان کے بہت سے رومانی افسانوں میں حسن و عشق کی ایک رنگین داستان کا اضافہ کیوں نہ کر سکی ——— اگر یہی میرا جرم ہے اور اسی جرم کا نام تمہاری لغت میں بیوفائی ہے تو مجھے فخر کے ساتھ اعتراف ہے کہ میں بیوفا ہوں

اب رہا اس بیوفائی کے جرم میں اگر تمہاری عدالت کا فیصلہ ہے کہ تمہارا دل مجھ سے چھین کر پریزین کو دیدیا جائے تو یہ فیصلہ بہت مبارک ہے ضرور دیدیا جائے لیکن عذر صرف یہ ہے کہ جس چیز کو میرے پاس سمجھا جا رہا ہے وہ میرے پاس نہیں اگر ہے

پاس ہوتی تو ثریا کے پاس کیونکر پہونچ جاتی ——— وہ شاید ثریا ہی کے کوٹھے پر چھوٹ گئی ہے ——— مجھی تو پروین غریب اس سے اب تک فائدہ نہ اٹھا سکی - تم کہتے ہو کہ پروین اس کی مستحق بھی ہے اور قدرداں بھی ہے - بہت درست لیکن میرے خیال میں ایک استحقاق اس کا اور بھی ہے یعنی یہ کہ وہ مستحق اور قدرداں ہونے کے علاوہ اس کی منھ مانگی قیمت بھی دے رہی ہے جو کم از کم میں نہ دے سکی اور یہ حقیقت کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو لیکن بہرحال حقیقت ہے کہ کچھ لوگ محبت کرتے اور کچھ لوگ محبت کے نام سے تجارت کرتے ہیں ——— تم شاید عاشق نہیں عاشق کے بھیس میں تاجر تھے جو کسی کو دل دے کر اس کی قیمت مانگتے رہے - اس کے معاوضے میں اپنے نفس کے مطالبات کی ایک طولانی فہرست پیش کرتے رہے اور جب وہ مطالبات پورے نہیں کئے گئے تو بدمعاملگی کا الزام دیتے رہے - میں بدمعاملہ ضرور ہوں لیکن تم سے نہیں تمہارے بھائی سے ——— اس شریف ترین انسان سے جس نے مجھ پر اعتماد کیا مجھ سے محبت کی ——— محبت نہیں غلامی کرتا رہا اور میں اس کے ان مخلصانہ جذبات کے معاوضے میں اپنے دل کا ایک ٹکڑا بھی توڑ کر نہ دے سکی - کیوں نہ دے سکی! اس لئے نہ دے سکی کہ دل میرا نہ تھا یہ چیز دوسرے کی ہو چکی تھی ایک کے ساتھ خوش معاملگی دوسرے کے ساتھ بدمعاملگی ہو جاتی ——— میں اپنے شوہر کی قرضدار ہوں لیکن یہ قرضداری کسی بدنیتی کی بنا پر نہیں ہے میری مفلسی کی بنا پر ہے' میں دل کی پونجی اور جذبات کا سرمایہ لٹا کر مفلس ہو چکی تھی' قرض کہاں سے ادا کرتی ——— نتیجہ یہ ہوا کہ قرض رہ گیا - اور قرضداری کے احساس نے روح کو اتنا ڈرپوک کر دیا کہ وہ اب اس سلسلے میں کسی دوسری خیانت کا تصور بھی نہیں کر سکتی -

محمود؟ ہوش میں آؤ کیسی تلاش اور کیسا سکون ——— یہ چیز تو انہیں ملتی ہے جو کچھ نہیں چاہتے ——— جو کچھ چاہتے ہیں یہ چیز انہیں نہیں ملا کرتی ——— وہ کہ جو اپنی ہر خواہش کا پجاری ہو ——— وہ کہ جس کی زندگی اس کے نفس کے مطالبات کی آواز ہو ——— وہ کہ جو اپنے دل کے حکم پہ غلاموں کی طرح دوڑتا ہو ——— سکون کی تلاش کا حق اسے حاصل نہیں ——— خواہش اور سکون نیازمندی اور بے نیازی - آگ اور پانی - یہ اچھا رشتہ ہے تم نے لگا رکھا ہے تڑپنا بھی چاہتے ہو اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی چاہتے کہ نہ تڑپو - یہ کیسی دیوانگی ہے تم نے تڑپنا چھوڑا ہوتا خواہش کی غلامی ترک کی ہوتی' نفس کی باگ موڑی ہوتی تو سکون بھی شاید نہیں کہیں نہ کہیں مل جاتا - اور پھر یہ کہ سکون کی اگر تلاش ہی تھی تم نے اسے لال پانی کی رنگین بوتلوں میں کیا ڈھونڈھا بازار حسن کی چمکیلی دوکانوں پر کیا تلاش کیا - ڈھونڈھنا ہی تھا تو ایک دن ماں کی گود میں اسے ڈھونڈھا ہوتا - ماں کے پیار سے مانگا ہوتا - ماں کے پیار سے اس ماں کے پیار سے جو روزانہ آدھی رات سے پچھلے پہر تک تمہارے جینے کی دعائیں مانگا کرتی ہے ——— اور جب سے تمہارے بمبئی جانے کی خبر سنی ہے اس دن سے آج تک جس کی آنکھوں کی برسات کسی طرح ختم نہیں ہوتی - حالانکہ موسم بدل رہا ہے جاڑا تھا گرمی آئی لیکن اس کے آنسوؤں کی جھڑی جو لگی تھی سو لگی ہوئی ہے - تمہاری بہنیں تمہارے لئے بے چین ہیں' تمہارا بھائی تمہارے مستقبل کے لئے متفکر ہے لیکن تم کس عالم میں ہو کہ وہاں تک کسی کے دل کی آواز نہیں پہونچتی - محمود! اگر وہ تمام جذبات لطیف جو کل تک تمہارے سینے میں موجود تھے اگر آج مجھے پا لیتے اور مجھے پا کر خوب بھینچ بھینچ کے پیار کرنے کی خواہش میں گم نہیں ہو گئے تو میرے بھائی تمہیں شرم آنی چاہئے کہ تمہاری ایک ذلیل سی خواہش نے کتنے مقدس جذبوں اور کتنی معصوم تمناؤں کو پامال کیا ہے - کاش تم نے یہ دیکھنے کی ضرورت سمجھی ہوتی کہ جس راہ میں تم چل رہے ہو اس راہ میں کتنے دل تمہارے قدموں کے نیچے بچھے ہوئے سسک رہے ہیں ——— مگر نہ جانے تمہارا ضمیر کتنی گہری نیند سو رہا ہے - تم اپنی موجودہ حالت پر غور کرنے اور شرمانے کی جگہ الٹا اس پر اصرار کرتے ہو - اپنی کمزوریوں میں فلسفے کا رنگ بھرتے ہو اپنی حماقتوں کو خرد کا فیصلہ بتلاتے ہو ——— محمود اس دنیا میں تم شاید پہلے شخص ہو جس نے عیاشی کے جواز میں روحانیت کی مدد سے ایک فلسفیانہ استدلال پیش کیا ہے - کہتے ہو کہ جب نظر کا انتخاب اور روح کا مطلوب کسی سے چھین لیا جاتا ہے تو یہی ہوتا ہے ——— میں پوچھتی ہوں کہ کیوں ایسا ہوتا ہے؟ کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ اپنے محبوب نظر پھول کے چھین لئے جانے کے بعد دنیا کا ہر پھول نظر سے گر جائے ——— کوئی کلی بہ اعتبار رنگ و بو کتنی ہی جاذب روح کیوں نہ ہو لیکن جدائی کی ہو کر [illegible] اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے ——— یہ بات تو خیر یہ ہے سمجھ میں آتی ہے

کہ جب تک روح کا مقصود نظر کے دائرے میں نہ آئے اسوقت تک آتما اس کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتی رہی لیکن مل جانے کے بعد اگر وہ چیز اپنی ملکیت نہ ہو تو ادھر ادھر اسکی تلاش میں سرگرداں پھرنے کے کیا معنی؟ ——— سلیمہ کو کھو کر ثریا کی چوکھٹ پر سجدہ کرنے کے کیا معنی، کیا تمہاری سلیمہ نے ثریا سے اپنا جسم بدل لیا تھا، محمود میاں؟ یہ آپ نے عشق کی تعریف کی ہے یا عشق کا مضحکہ اڑایا ہے ذرا سوچیے تو

ہم الزام انکو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

مصیبت یہ ہے کہ آپ نے ضرورت کے احساس کو عشق سمجھ لیا ہے خود فریب میں مبتلا ہیں اور مجھے بھی اسکی دعوت دیتے ہیں - اگر آپ یہ کہتے کہ سلیمہ کو کھو کر مجھے ایک ثریا کی ضرورت تھی تو آپ کی ضرورت کے اس احساس پر مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا مگر آپ تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ سلیمہ کی تلاش میں ثریا تک پہونچے حالانکہ سلیمہ ثریا کے کوٹھے پر نہیں - کلکتہ میں تھی اور یہ جاننے کے باوجود آپ نے ثریا کے کوٹھے کے سفر کو کلکتے کے سفر پر ترجیح دیا

شاید اس اقدام میں روحانیت کا کوئی بہت ہی گہرا راز ہو کوئی بہت ہی پیچیدہ فلسفہ ——— کوئی بہت ہی لطیف شاعری جو کم از کم میری سمجھ سے باہر ہے -

اب رہا اس سلسلے میں دوسرے مسائل

تو کشش روحانی کی میں قائل ضرور ہوں اور یہ بھی سمجھ سکتی ہوں کہ روحیں اپنے پیکر خاکی میں آنے سے پہلے ایک عالم میں رہتی ہیں اور اس عالم میں ایک دوسرے سے محبت اور نفرت بھی کر سکتی ہیں اور انکی اس محبت و نفرت کا اثر اس دنیا کی زندگی میں بھی نمایاں ہو سکتا ہے - اس کے ساتھ اجزائے نور کی کشش بھی مسلم ذرات کے مقناطیسی جذب کا فلسفہ بھی صحیح اور روحانی رشتہ داریوں کا تصور بھی غلط نہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ کیونکر نکالا جا سکتا ہے کہ بعض حالات کے ماتحت اگر دو اجنبی روحوں میں ازدواج کا رشتہ قائم کر دیا جائے تو یہ رشتۂ ازدواج فطرت کے قانون کی خلاف ورزی ہوگی

فطرت کا تو کاروبار یہی ہے کہ وہ موافق اور ناموافق ذرات کے اختلاط سے زندگیاں بناتی ہے - آگ و پانی کے امتزاج سے خاک و باد کے اتحاد سے نور و ظلمت کی ترکیب سے طبیعتیں تعمیر کرتی ہے ——— عناصر کی دنیا میں اگر اس کا قانون یہ ہے تو اس کے ساتھ اگر میں یہ بھی سمجھوں کہ روح کی دنیا میں بھی اس کا یہ قانون اسیطرح کام کرتا ہے تو میرا یہ عقیدہ کیوں غلط سمجھا جائے میں کیوں یہ نہ سمجھوں کہ فطرت کا قانون اجنبی عناصر اور اجنبی ذرات کی طرح اجنبی روحوں میں رشتۂ ازدواج و رشتۂ اتحاد باندھ کر روحانی رشتہ داری اور روحانی برادری کے دائرے کو وسعت دینا چاہتا ہے ——— اور ہمارا سماج اور اس کا قانون بھی اسی قانون طبیعت کی پیروی میں دو اجنبی روحوں کو میاں بیوی بنا کر یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ خیالات سے مفاہمت کرنا سیکھیں ——— اور باہمی تعلقات سے ایک دوسرے کی روحانی اجنبیت کو دور کرنے کی کوشش کریں ——— ہمارا تمدن اور ہمارا سماج اپنے بچوں کو جزو نور کی جستجو اور روحانی رشتہ داری کی تلاش کے لئے مطلق العنان کیونکر چھوڑ دے ان میں سے ہر ایک کو وہ شاعر نہیں آدمی بنانا چاہتا ہے ——— ہر ایک سے کچھ کام لینا چاہتا ہے - ایک انسانیت کبریٰ کی تعمیر اس کے پیش نظر ہے - اس کے تمام بچے بچیاں اگر لیلیٰ مجنوں ہی بن جائیں گے تو اس کا کارخانہ کون چلائے گا - اسکے خوابوں کو پورا کون کرے گا - فطرت کے مقصد آفرینش کی تفسیر کیونکر ہوگی ——— ...... تم شاعر آدمی شاید بول اٹھو کہ مقصد آفرینش تو یہی تلاش ہے اچھا مقصد آفرینش ہے کہ انسانیت اگر اجتماعی حیثیت سے جی کھول کے اس کا حق ادا کرنے لگے تو شاید نصف صدی کے اندر تمدن کی یہ محفل نجد کا جنگل بن جائے جس میں اس کنارے سے اس کنارے تک سوائے ماتم فراق کے کوئی آواز سنائی نہ دے - اچھا مقصد آفرینش ہے کہ خالق جہان آفریں نور کے ایک ٹکڑے سے دو روحوں کی آفرینش کرے اور دونوں کو محبت کی تڑپ دیکر ایک کا سراغ دوسرے پر گم کر دے اور گم کرکے انکی گمرہی اور پریشانی کا تماشا دیکھے - غور تو کرو کہ یہ چلبلی ہوئی یا بازی گری ——— عوام کی ٹھیٹھ اصطلاح میں ایسے آدمی کو شیخ چلّی کہتے ہیں ——— اور خدا شیخ چلّی نہیں ہے

بس کھل گئی حقیقت نقاشی خیال
سب اپنے رنگ بھر دئے تصویر یار میں

روحانی رشتہ داری کو میں حقیقت ضرور سمجھتی ہوں لیکن اس مسئلے میں میرے فکر کی لکیر بالکل سیدھی ہے جو تمہاری فکر کی لکیر کی طرح خم کھاتی اور قدم قدم پر نئی نئی پگڈنڈیاں نکالتی ہوئی نہیں چلتی یہی وجہ ہے کہ میرا سفر ایک نتیجے پر پہونچ کر ختم ہوتا ہے اور تمہارا دماغ چوراہوں پر ٹھٹک کر رہ جاتا ہے - اچھا یہ تو بتاؤ کہ جنسی تفریق کا تعلق

جسم سے ہے یا روح سے؟ پھر یہ کہ ایک نور کے ٹکڑے سے صرف دو ہی روحیں ایک زنانی اور ایک مردانی کیوں بنتی ہیں دو سے زیادہ کیوں نہیں بن سکتیں۔ فرض کرو کہ اگر تین بن جائیں تو تیسری کا جنسی جوڑا کہاں سے لایا جائے گا؟

بات یہ ہے کہ یہ سب تمہاری شاعرانہ خوش فکری ہے تم روح کی ترکیب میں خواہ مخواہ جنسیت کو شامل کرکے غلط بنیاد پر غلط تصور قائم کرتے ہو۔ ورنہ روحوں میں نہ کوئی جنسی تفریق ہے نہ جنسی لگاؤ۔ ہاں روح کا وجود نورانی ہے اور اجزائے نور بھی مادی عناصر کی طرح آپس میں کشش رکھ سکتے ہیں اور اس کشش کے ماتحت روحیں عالم ارواح میں ایک جگہ رہ سکتی ہیں۔ اور ایک ملک ایک سماج ایک خاندان اور ایک بطن میں جمع کرائی جا سکتی ہیں دوسرے لفظوں میں ہمارے دنیاوی تعلقات اور یہ دنیاوی رشتہ داریاں اسی روحانی رشتہ داری کا پرتو ہو سکتی ہیں —— تمہارے روحانی تعلق کے فلسفے سے اگر کوئی معقول نتیجہ نکالا جا سکتا ہے تو بس یہی —— ورنہ ہمارے جنسی میلانات کا ہماری روح سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہارا فلسفہ رومانی طبیعتوں کے لئے کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو لیکن اجتماعی حیثیت سے اس کا عملی رخ اتنا بھیانک ہے کہ انسانیت اسے کبھی قبول نہیں کر سکتی اس لئے کہ اس کے قبول کر لینے کے بعد زندگی کے سامنے کوئی مستقل نہیں رہتا —— ظاہر ہے کہ جب ایک مغرب میں پیدا ہو سکتا ہے اور دوسرا مشرق میں تو غور کرو کہ ایک عمر تک جنون ساتھی کی تلاش میں زندگی کا سرمایہ لٹانے کے بعد انسان کی جھولی میں کیا رہ جائے گا جسے لیکر وہ ارتقاء کا سفر شروع کریگا۔ زندگی کی شام ہونے کے بعد روحانی جوڑا کسی شخص کو اگر مل بھی گیا تو کیا؟ ارتقا کی منزلیں تو یوں ہی رہ جاتی ہیں اور پھر یہ کہ مل جانے کے بعد بھی کون جانتا ہے کہ فطرت کا بیرحم قانون پھر جدائی کی خلیج پیدا نہ کر دے گا۔ فرض کرو کہ موت نے اسے چھین لیا اور عدم کے سفر میں ایک دوسرے سے پیچھے رہ گیا تو پھر وہی تلاش۔ فرض کرو کہ تلاش کا سودائی اپنی زندگی ختم کرکے اسکی تلاش میں عالم ارواح تک پہنچے لیکن اس کے وہاں پہونچنے سے پہلے اس کا ساتھی عالم عناصر کی طرف منتقل کر دیا جائے تو پھر وہی تلاش۔ آخر تلاش کے اس غیر متناہی سلسلے کا کچھ اور چھور بھی ہے کوئی مقصد بھی کوئی نتیجہ بھی یا بس یونہیں اللہ میاں کا ایک شاعرانہ ذوق اور کارکنان قضا و قدر کی ایک شاعرانہ خوش فعلی۔

میں نے ایک مسلمان گھر میں آنکھیں کھولی ہیں میری فکر ایک خالص اسلامی ماحول میں پلی ہے اس لئے تناسخ کے عقیدے سے مجھے طبعاً کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی لیکن چونکہ تم تناسخ کے قائل ہو چکے ہو اس لئے تم سے پوچھتی ہوں کہ زندگیوں کا یہ تسلسل اور حیات مادی کی یہ تکرار اگر تربیت روح کی غرض سے ہے اگر مختلف زندگیوں کے مختلف تجربات سے روحوں کی ارتقا مقصود ہے تو ذرا سمجھ کے جواب دو کہ روح کی ارتقا اپنی خواہشات پر قابو پانے میں ہے یا اپنی خواہشات کے پیچھے آوارہ پھرنے میں۔ روح کی عظمت اور روح کی پاکیزگی کائنات کی تمام اجنبی روحوں سے مانوس ہو جانے میں ہے یا صرف اپنے جزو نور سے محبت کرنے میں اور اسکی محبت میں تمام خلق اللہ کے حقوق سے بے پروا ہو جانے میں۔ ایک روح حالات سے مفاہمت کر سکتی ہے دوسری نہیں کر سکتی" ایک روح زندگی کے معرکوں کو جھیل رہی ہے دوسری اس سے بھاگ رہی ہے ایک روح اپنی ہر خواہش کی غلامی کر رہی ہے دوسری اپنے ہر جذبے پر ایک شاہانہ تسلط کے ساتھ حکمراں ہے۔ اپنے روحانی گرو سے پوچھو کہ ان دو روحوں میں کون منزل سے قریب ہے اور کون صراط مستقیم سے بھٹکی ہوئی ہے اگر یہ جواب ملے کہ" وہ روح جو نفس پر حکمراں ہے" تو پھر کوشش کرو اپنے نفس اور اس کے تمام میلانات پر حکومت کرنے کی ترک کرو غلامی اس خواہش کی جو تم سے کبھی سلیمہ کو بچواتی ہے کبھی ثریا کی چوکھٹ پر ناک رگڑواتی ہے اور کبھی پروین کے نخل حیات پر جھولنے ڈالتی ہے۔ اگر کسی زندگی میں کسی خاص چہرے کی کوئی خاص نوک پلک تمہیں محبوب تھی اور اس زندگی میں تمہارا ذوق نظر اسکی جھلک میرے یا ثریا کے چہرے میں دیکھ رہا ہے تو تم اپنے نفس کی ضد پر ادھر نہ دیکھو —— اور سماج کے قانون کے رو سے رشتہ ازدواج باندھو ایک ایسی عورت سے جس کی آنکھیں میری آنکھوں کی طرح بڑی اور کشیلی نہ ہوں بلکہ بلی کی آنکھوں کی طرح گول اور چھوٹی ہوں۔ جس کی ناک میری ناک کی طرح اونچی اور سڈول نہ ہو بلکہ بندر کی ناک کی طرح چپٹی اور سپاٹ ہو۔ جس کا رنگ میرے رنگ کی طرح شہابی نہ ہو بلکہ جلے ہوئے رنگ کی طرح آبنوسی —— مجبور کرو اپنے دل کو ایک ایسی عورت سے محبت کرنے پر —— مجبور کرو اور کرتے رہو یہاں تک کہ واقعی وہ اس سے محبت کرنے لگے۔ اگر ایسا کر سکتے ہو تو پھر روحانیت کے دائرے میں بیٹھنے کا تمہیں حق ہے ورنہ نفسانیت کا کوئی ادارہ تلاش کرو۔ قیس و فرہاد

جیسے لوگ جس کے سرگرم ممبر ہوں "شبابیات" اور "زنانیات" کی ترویج واشاعت جس کا محبوب مقصد ہو۔ ماتا کی کراہ فرض کی پکار اور ملت کا پیام جس کے دروازوں تک نہیں پہونچ سکتا ہو ایک ایسے ادارے کی صدارت تمہارے لئے بہت موزوں ہوگی اس لئے کہ ــــ ایک عورت کے لئے تم نے ایک کنبے کے حقوق کو اپنے پاؤں سے روندا ہے۔ ایک دنیا کی ذمہ داریوں کو پس پشت پھینک کر بھاگے ہو ــــ ماں کو رولایا ہے بہنوں کو ٹھکرایا ہے بھائی سے حسد کیا ہے تمدن سے خفا ہو سماج سے بگڑے ہو ــــ خدا سے الجھے ہو ــــ اور نفسانیت کی تاریخ میں نفس کی غلامی کی مثال اس سے زیادہ بہتر اور اس سے زیادہ مکمل کیا ہوگی۔ تمہارے روحانی ادارے کے "اصول دین" سے تو میں واقف نہیں ہوں لیکن تمہارے بھائی نے تمہاری سوشیل سوسائٹی کا ایک رسالہ مجھے لاکر دیا تھا جسے ــــ دیکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچی کہ یہ نئی روشنی کے صوفی بھی ہمارے قدیم صوفیوں کی طرح اپنے نفس اور اپنے نفس کی ہر خواہش سے جہاد کرنے میں روح کی ارتقا سمجھتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو روح کی اس خواہش کا جس کا تعلق جذبات جنسی سے ہے تو اتنا احترام کیوں کیا جائے آرزو کے اس تخم کو جو روح کا ایک ہمیشہ رسنے والا ناسور ہو جائے ایک ہمیشہ رسنے والا ناسور جو بقول تمہارے ہر زندگی میں رستا رہتا ہے ٹپکتا رہتا ہے ــــ کیوں نہ اسے کاٹ کے پھینک دیا جائے کیوں اسے پال کے رکھا جائے۔ کیوں اسکی پرورش کی جائے۔ کیوں اس کے لئے اپنے پندار کو اپنی خودی کو اپنی عزت نفس کو اپنے مقصد حیات کو اپنے روحانی ارتقا کو خطرے میں ڈالا جائے۔

تم کہوگے اسی پندار اسی غرور اور اسی خودی کے علاج کے لئے تو محبت کی جاتی ہے ــــ یہ کہوگے اور شاید مولانائے روم کا یہ شعر پڑھوگے ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما

اے طبیب جملہ علت ہائے ما

میں تم سے نہیں مولانا سے کہونگی کہ ہماری جملہ علتوں کا یہ علاج خود ایک بہت بڑی علت ہے۔ ایک ایسی علت، ایک ایسی بیماری جو نفس سرکش ترین پندار کو اپنے آغوش میں لئے ہے جس کا نام ہے اگر ذوق نظر کی ایک فرمائش کا اور عشق نام ہے اس فرمائش پر مسلسل اصرار کا۔ تو کیا یہ مسلسل اصرار خودی سے خالی ہے

اور کیا یہ خودی انسان کو حقوق العباد اور حق الناس سے بے پرواہ اور زندگی اور اس کے فطری تعلقات کی طرف سے بے رحم نہیں بنا دیتی ــــ اپنی زندگی کا جائزہ لو اور جواب دو۔ کیا تم نے اپنے جذبے کے مقابلے میں کسی دوسرے کے جذبے کا احترام کیا ــــ اپنی شکستگی پر دوسروں سے ہمدردی کے مدعی رہ کر کبھی دوسروں کی شکستگی پر رحم کھایا ــــ سچ بولو کیا تم نے اپنے خیال کے گھروندے میں ایک ایسی دنیا نہیں بنائی جس میں تم اور تمہاری سلیمہ کے سوا تیسرا کوئی نہیں ــــ کیا یہ خالص ترین خودغرضی نہیں۔ اور کیا محبت خودغرضی خودفروشی اور خودپرستی کا ایک خوبصورت نام نہیں ہے۔ لیکن اگر تم خودی کو بےخودی کہو ــــ اور خرد کا نام خواہ مخواہ جنون رکھ لو تو اس کا ہمارے پاس بجز یہ کہنے کے اور کیا علاج ہے کہ ؎

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اب اگر یہاں پر یہ سوال پیدا ہو کہ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں عشق سے عشق مجازی نہیں عشق حقیقی یعنی خدا کا عشق مراد لیا ہے۔ تو میں یقیناً ہار جاؤنگی اس لئے کہ میری نظر میں نہ خدا سے عشق کیا جا سکتا ہے اور نہ اسکی اسکو ضرورت ہے اور نہ وہ اپنے بندوں سے اس کا مقتضی ہے۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی کی تفریق کی میں قائل ہوں لیکن میں اسکو اس طرح سوچتی ہوں کہ عشق اس وقت تک مجازی ہے جب تک کہ وہ ایک کے لئے ہے۔ ایک کو پوج رہا ہے ایک پر مٹ رہا ہے۔ لیکن جب کسی سے محبت کرتے کرتے طبیعت میں یہ گداز پیدا ہو جائے کہ دنیا میں کسی کا درد دیکھا نہ جائے ہر سانس لینے والی مخلوق کے لئے دل میں ہمدردی کی تڑپ ہو۔ ہر رونے والی کی آنکھ کے لئے تمہاری آنکھوں میں آنسو ہوں۔ ہر حالات کے ستائے اور روندے ہوئے انسان کیلئے تمہاری روح میں اعانت کا جذبہ ہو تو سمجھ لو کہ عشق حقیقی کی منزل آگئی۔ سچ پوچھو تو خدا کا عشق اگر کچھ ہے تو یہی عالمگیر ہمدردی اور یہی عالمگیر جذبہ ہے۔ جو اسکی مخلوق سے محبت نہیں کرتا وہ اس سے بھی محبت نہیں کرتا۔ اس کے قانون سے محبت نہیں کرتا۔ اس کی سنتوں سے محبت نہیں کرتا۔

اپنے اس نظریہ عشق کی روشنی میں جب تمہیں دیکھتی ہوں تو دیکھتی ہوں کہ تم اس راستے پر چل کر بھی الٹے پاؤں چل رہی ہو ــــ تم کیا الٹے پاؤں چل رہے ہو۔ تمہارا "ادب"

جس نے تمہاری ذہنیت بنائی الٹے پاؤں چل رہا ہے ہمیشہ سے
الٹے پاؤں چل رہا ہے ——— کسی سے محبت اور کسی سے
محبت کے بعد ترکِ علائق اور ترکِ فرائض اور ترکِ علائق و ترکِ
فرائض کے بعد خدا سے عشق یہ ترتیب عمر بھر میری سمجھ میں نہیں آسکی
محمود! چہرے کی نوک پلک کا دھوکہ نہ کھاؤ - یہ آب و گل کی
ایک افتادگی عناصر کا ایک طلسم ہے فطرت کا ایک مذاق ہے ہماری
تمہاری آنکھوں سے ——— مجاز سے حقیقت اور سراب
سے پانی نہ مانگو، اپنی پسند پر اصرار نہ کرو۔ مشیت کے دروازے
اور سماج کی عدالت جو مل جائے اس پر قناعت کرو - گو خود نہیں
قناعت کر سکی - جو پوچھنے کی چیز ہے اسے نہیں پوچھ سکی اور جسے نہیں
پوچھنا چاہیے اسے پوچھ رہی ہوں ——— مگر تمہاری طرح اپنی کمزوری
کو فلسفہ نہیں بناتی ——— جانتی ہوں کہ یہ کمزوری یہ نفس کی کمزوری
یہ فتنہ یہ شعور کا فتنہ۔ یہ فساد یہ آب و گل کا فساد - یہ اوچھا پن یہ
جذبات کا اوچھا پن بہت دنوں کے لئے نہیں ہے اسکی عمر شباب کی
دوپہر کے ساتھ ڈھل جائیگی ——— اور خون کی حرارت اور
ذرات کی گردش کم ہوتے ہی وہ چراغ جو آج لو دے رہا ہے خود بخود بجھ
جائے گا ——— آندھی رک جائے گی طوفان تھم جائے گا۔
اور حقیقت اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ زندگی کے ہر گذرتے ہوئے
لمحے سے اپنا خون بہا مانگ رہی ہوگی اور لمحہ یہ فریاد کر رہا ہوگا کہ
معاف کرو میں تجھے نہیں جانتا تھا ——— ڈرتی ہوں اس
وقت سے ——— محمود! ڈرو اس وقت سے جب تمہارے
شوق کی آنکھوں کے سامنے ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہوگا اور میرے
چہرے کی جھریاں تمہارے جذبات عشق کا منہ چڑھا رہی ہونگیں
اگر میں اس دن تک زندہ رہی اور تمہارے بھائی
خدانخواستہ زندگی کے سفر میں مجھ سے آگے بڑھ گئے
تو اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کے جواب دو کہ کیا تم اس وقت
بھی مجھے اپنا اپنے شبستانِ حیات کی دلہن بنانے پر اسی طرح
بیچین ہوگے یا ایک ٹھنڈی سانس بھر کے ایک [illegible] نعرۂ انتقام
کرو گے ——— ہاں تو جواب دو ——— میرے اس سوال
کا جو جواب ہوگا اعتبارات کی دنیا اسی کے موافق تمہارے جذبات
کی قیمت لگائیگی

محمود! اپنی زندگی کی قدر کرو ——— یہ گنوانے کی چیز
نہیں۔ اس کے ایک [illegible] استعمال سے تم لاکھوں انسانوں کی
قسمتیں بدل سکتے ہو ——— تمہارا وہ حوصلہ جو ہندوستان میں
ایک اشتراکی جمہوریت کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس جمہوریت میں
اپنے لئے صدر کی کرسی تجویز کر رہا تھا آخر کس کروٹ سو گیا ہے
اس کو جگاؤ - سلیمہ نہ ملی تو نہ ملے تمہاری کوشش سے ہندوستان کو
ایک اشتراکی جمہوریت تو مل جائے - ہندوستان کے بھوکوں کو روٹی
تو مل جائیں ——— جان ہی دینا ہے تو سلیمہ کے لئے کیوں
جان دو - وطن کے مستقبل کے لئے کیوں نہ جان دو - مرنا ہی ہے تو
سمندر میں ڈوب کے یا موت کے بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کے کیوں
مرو - برطانوی سنگینوں کی چھاؤں میں سینہ پر گولیاں کھا کے
کیوں نہ مرو - یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ اس بچے کی طرح جو کسی
بھیانک چیز سے ڈر کے ماں کی گود کی طرف بھاگے زندگی سے
ڈر کے موت کی طرف بھاگے جا رہے ہو ——— اگر اس فریب
میں مبتلا ہو؟ اگر یہ حرص تمہیں موت کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی
ہے کہ کسی دوسری زندگی میں مشیت کا ہاتھ تمہاری روح کے
شریک کو تمہاری روح تک پہونچا دے گا ——— تو مشیت کی
نبض کس نے ٹٹولی ہے کون جانتا ہے کہ اس زندگی میں تمہاری بہن نہ
ہو جاؤں گی ——— بہت ممکن ہے کہ ذرات نور کی کشش جو
آج ایک دوسرے کو کھینچ رہی ہے کل ہمیں اور تمہیں ایک ہی بطن میں
کھینچ کر لے جائے ——— اور پیدا بھی کرے تو اس طرح کہ میں
بھائی ہوں اور تم بہن - اس لئے کہ جہاں تک میں تناسخ کو جانتی
ہوں اس کی روحانی رشتہ داریوں میں جنسیت کو کوئی دخل نہیں
گو عناصر کی کشش اور روح کا میلان نہیں بدلتا لیکن زندگی کے ساتھ
جنسیت بدل سکتی اور اکثر بدل جاتی ہے پھر یہ کیوں سمجھتے ہو کہ سلیمہ
پہلی زندگی میں تمہاری بیوی ہی تھی بہت ممکن ہے کہ شوہر ہو بہت
ممکن ہے کہ بھائی ہو ——— بہت ممکن ہے کہ تم پچھلی زندگی میں ایک
عورت ہو - ایک حسین عورت - اور تمہاری باجی جو آج بھی تم پر جان
چھڑکتی ہیں پچھلی زندگی میں مرد ہوں، تمہاری عاشق ہوں تم سے
اپنے جنسی ذوق کی تسکین چاہتی ہوں اور تم ان سے بھاگتے ہو -
بہت ممکن ہے آج بھی انکی یہ خواہش شعور کی گہرائیوں میں غیر
محسوس ہو - اور ایک دن دفعتاً محسوس ہو جائے اور وہ تم
سے تناسخ کی روشنی میں وہی تقاضا شروع کریں - تو تم ان کی اس
خواہش کا کیا جواب دو گے؟ محمود! جھنجھلاؤ نہیں تم ہار گئے اور
یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تم بچپن سے بحث میں مجھ سے ہارتے رہے

ہو رو ٹھتے رہے ہو اور میں مناتی رہی ہوں اس وقت بھی جھنجھلا رہے ہو گے ——— اچھا روٹھو نہیں میں تصور کی آنکھوں سے تمہاری جھنجھلاہٹ کو پیار کرتی ہوں ——— لو اب تو خوش ہو گئے؟

اچھا ایک سوال ——— ایک گذارش

ایک بھیک ——— وہ سلیمہ جو بقول تمہارے تمہارے دل کی تمہارے جذبات کی تمہاری تمناؤں کی سرمایہ دار ہے۔ آج اس کی پھر تم سے کچھ مطالبہ کر رہی ہے ——— کیا تم اس کے مطالبے کو ٹھکرا دو گے ——— نہیں سلیمہ بیوفا ہے تم تو بیوفا نہیں۔ اچھا تو اے وفا کے مبلغ دل کی آنکھیں کھول کر دیکھو کہ تمہاری سلیمہ تمہارے پاؤں پر سر رکھے آنکھوں میں خون جگر کا تحفہ لئے تم سے تمہاری زندگی کی بھیک مانگ رہی ہے ——— خدا کے لئے اس چیز کو جو تمہاری نظر میں اتنی حقیر ہے کہ اسے سمندر میں پھینک دینے کا ارادہ کر رہے ہو ——— غریب سلیمہ ہی کو دے ڈالو۔ اس کی نظر میں اسکی بڑی قیمت ہے۔ وہ اسکی قدر کرے گی اور اس کا صحیح مصرف بیکی دیتے ہو؟ دیکھو میرا آنچل پھیلا ہوا ہے ——— دیدو خدا کے لئے دیدو اور آج سے اس چیز کو میری امانت سمجھو ——— اور میں اس کے متعلق جو فیصلہ کروں اس میں مداخلت نہ کرو ——— یہ ہے میری معصوم محبت کا معاوضہ اور یہ ہے میرے ان انمول آنسوؤں کی قیمت جو میں فرض کے مندر میں بیٹھ کر تمہارے لئے بہاتی رہتی ہوں۔ یقین کرو کہ میں تم سے بچھڑ کر زندگی کا ہر کام کر سکتی ہوں صرف جی نہیں سکتی ——— مجھے جھنے دو اور اگر وفادار ہو تو کر صبر۔ تڑپو۔ جلو۔ مگر جیتے رہو۔ گو یہ جانتی ہوں کہ عشق کی خلقت میں بیرحمی ہے وہ کبھی اور یہ تو خیر خود حسن پر بھی رحم نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود تمہارے عشق کی عدالت سے انصاف چاہتی ہوں ——— ہاتھ جوڑتی ہوں۔ ناک رگڑتی ہوں۔ روتی ہوں گڑگڑاتی ہوں۔ کیا یہی انصاف ہے کہ خود پروانوں کی طرح جلنے اور تڑپنے کے ڈر سے موت کی طرف بھاگو اور مجھے شمع کی طرح صبح تک جلتے رہنے کے لئے اکیلا چھوڑ جاؤ ———

خیر اگر موت مجھ سے زیادہ محبوب ہے تو میں نہیں روکتی خدا حافظ جاؤ ——— لیکن جانے سے پہلے اپنی روانگی کی اطلاع تو دیتے جانا تاکہ میں بھی رخت سفر باندھ لوں۔ اگر یہ بھی وعدہ نہیں کر سکتے تو سمجھ لو کہ تم انتہا درجہ کے خود غرض ہو اور دوجہان کی لعنتیں تمہاری منتظر ہیں۔ خبردار محمود!! اگر ایسا کیا تو یقین جانو کہ تم میری روح کو اس حد تک آزردہ کروگے کہ نکلنے کے بعد بھی روح تو روح میرے عناصر وجود کا ایک ذرہ بھی تمہارے ذروں سے ہم آغوشی گوارا نہیں کرے گا۔

بہر حال خط ختم کرتی ہوں ——— اور ایک بار پھر تمہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی ہوں کہ تم میری زندگی میں ایک تلخ حقیقت کی طرح شامل ہو اور رہو گے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

اب تک

تمہاری سلیمہ

عورت اور شدت

از پروفیسر محمد مسلم صاحب ام۔ اے

اُس زمانہ کا ذکر ہے جب ہندوستان میں گاندھی جی کا ایجاد کیا ہوا مدافعت کا وہ عجیب حربہ چل رہا تھا جس نے دنیا کو متحیر اور انگریزوں کو زچ کر رکھا تھا، جسے مقاومت انفعالی یا مجہولی یاستیہ گرہ کہتے ہیں اور تاریخ سیاست میں ایک انوکھا چٹکلا سمجھا جاتا ہے۔ مگر نوجوان بنوے کمار گھوش اُس جماعت کا رکن تھا جو آزادی کے لئے اپنی جان آپ کھپانے کی قائل نہ تھی۔ وہ بھوک ہڑتال اور اپنی مرضی سے زنداں کی سیر سے عاجز و متنفر تھی۔ وہ حریت کے لئے اپنے خاص نسخہ پر اعتقاد رکھتی تھی۔ حکومت نے اس گروہ کی طرف غیر معمولی اعتنا کر کے اسکی عزت و شہرت کو چار چاند لگا دئے۔ اس کے پیچھے جاسوسوں کی فوج لگا دی۔ ذہین۔ خوبصورت اور باوقار بنوے اس گروہ کا ایک معزز رکن تھا۔ اس نے اپنے سرداروں کو یہ یقین دلا کر کہ وہ ان کے سیاسی پروگرام کی پیروی میں اپنی جان تک عزیز نہیں سمجھتا۔ خفیہ فوج کے کپتان کے عہدے کا منتظر اور پھر سپہ سالاری کا آرزو مند تھا۔ اور انجام کار آمر مطلق (ڈکٹیٹر) کے درجہ کا خواب دیکھا کرتا۔

مگر ایک خواب اس سے بھی زیادہ شیریں جو وہ سوتے جاگتے چلتے پھرتے ہر وقت دیکھا کرتا۔ وہ اُس کی مونی تھی اسی کی باغیانہ یا حریت پرور زندگی کی محرک، روح رواں پٹرول بلکہ بارود۔ وہ خود صرف جلنے والی بتی تھا اور وہ آگ۔ اگر بنوے کی ساری زندگی کے مخلوط محرکات کا تجزیہ کیا جاتا تو بہ آسانی ثابت ہو جاتا کہ وطن پرستی، حریت طلبی وغیرہ صرف ضمنی اور ماتحت اجزا تھے۔ اصل طاقت جو کام کر رہی تھی وہ مونی کا عشق تھا۔

مونی ایک سیماب سن آتش خو، پر جوش بہادر جوان کو، خواہ وہ قاتل ہو ڈاکو ہو یا ڈکٹیٹر ایک سنجیدہ باوقار صلح پسند، علم دوست، پاکباز شخصیت سے افضل ہی نہیں بلکہ قابل محبت و پرستش سمجھتی تھی۔ اس کا معیار علم و فضیلت تھا نہ اخلاق، بلکہ شدت، حدت، حرارت، فتنہ۔ وہ دیوتا جس کے ایک ہاتھ میں بم دوسرے میں پستول ہو۔ بنوے اس حسین شعلہ کے لئے ہر خطرہ جھیلنے اور عزیز سے عزیز قربانی دینے کو تیار تھا۔ وہی اس کی حب وطن تھی وہی سیاست بلکہ دین و ایمان۔

بنوے اپنی جماعت کی سرداری اور آمریت کے صرف خواب ہی نہیں دیکھا کرتا بلکہ ان مدارج کے استحقاق کے لئے ایسے موقع کی تاک میں تھا کہ عملی صلاحیت کا ثبوت دے سکے اور قابلیت کی دھاک بٹھا سکے۔ راتوں کو اس کی آنکھیں چاند تاروں پر گڑی ہوتیں اور دل میں یہ اُدھیڑ بن کہ دن میں جن سفید فام صاحبوں کا پیچھا کرتا رہا ہے ان میں سے کس کو شکار منتخب کیا جائے اور حملہ کی کیا تدبیر اختیار کی جائے۔ دقت یہ تھی کہ کلکتہ کی سڑکوں پر صاحبوں کی کثرت تو تھی مگر کالے کوّوں کی طرح یہ گورے بھی سب یکساں ہی نظر آتے۔ یہ معلوم کرنا مشکل کہ ان میں کون انگریز ہے کون فرانسیسی کون امریکی۔ کون جرمن ہے کون اطالوی۔ کون روسی۔ بالخصوص جرمن اور روسی کو دوست سمجھتا اور کوئی ضرر پہنچانا نہ چاہتا۔

ایک رفیق نے صلاح دی اخبار "دوست ہند" موزوں شکار ہوگا۔ جس کے دشمن ہند اور انگریز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ متواتر چار روز دفتر دوست ہند کے سامنے گشت لگاتے رہنے پر بھی کسی انگریز اڈیٹر کی شکل دکھائی نہ دی تو بنوے کو شبہ ہونے لگا کیا اس اخبار کا کوئی انگریز اڈیٹر ہے بھی، اور اگر ہے تو سیاسی قاتلوں کے خوف سے کہیں مضافات میں رہتا ہو، جہاں سے وہ افتتاحیئے اور شذرات دفتر میں بھیج دیا کرتا ہو۔ بہرحال وہ اڈیٹر کا پیچھا چھوڑ کر دوسرے شکار کی فکر میں پڑ گیا۔

ایک رات بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس کے دماغ میں یہ خیال کوند گیا۔ "میں شکار کی تلاش میں ناحق باہر مارا مارا پھرا

اور وقت ضائع کرتا رہا جب برابر کے کمرے میں ایک قیمتی شکار موجود ہے۔ میرے ماما وہ ماما ہیں سرپرست ہیں باپ کی جگہ پر ہیں، تو کیا ہوا۔ وطن کی محبت سب رشتوں سے زیادہ مضبوط اور عزیز ہے۔ وہ سرکاری وکیل ہیں۔ انھوں نے سرفروشانِ وطن کے خلاف قانونی پیروی کرکے ان کو پھانسی دلائی پر اور جیل بھیجا ہے۔ ان کا داغِ معصیت اگر دھل سکتا ہے تو انھیں کے خون سے انھیں بھارت ماتا پر اپنی جان کا بلدان دے کر آتما کو پاک کرنا چاہئے۔ یہ ان کے قریب ترین رشتہ دار خود میرے ہاتھ سے زیادہ قابل قبول ہوگا۔ وطن کو یہ میری نذر ہوگی۔ سب سے عزیز، گراں بہا جیسے اسرائیلیوں کے پیغمبر ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کو اپنے معبود پر بل دیا تھا۔ اس قربانی سے جماعت میں میرا وقار داقتدار بھی سب سے آگے بڑھ جائے گا۔" صدر دفتر کو اپنی تجویز کی باقاعدہ اطلاع دے کر منظوری کا انتظار کرنے لگا۔

اب ایک لمحہ ضائع کرنے کا وقت نہ تھا۔ جب تک منظوری آئے سب سامان تیار رہنا چاہئے۔ بہترین موقع اور سہم گھڑی اختیار کرنا چاہئے۔ سب سے اہم مسئلہ ہتھیار کا انتخاب تھا۔ پہلے زہر کا خیال آیا جو سب سے آسان تھا مگر یہ طریقہ آلہ نہیں۔ سپاہی قاتل کو زہر خورانی سے کام لیتے نہیں سنایا گیا۔ نہیں ریوالور سے زیادہ کوئی ہتھیار موزوں نہیں۔ مگر یہ آئے کہاں سے؟ ملک بھر کے پستولوں اور بندوقوں پر حکومت کی عقابی نگاہ ہے۔ ماما کے لئے اس کا لیسنس حاصل کرنا کتنا آسان تھا۔ مگر انھوں نے اس کی کبھی پرواہ نہ کی اپنے اوپر پورا بھروسا رکھتے ہیں۔ کسی دشمن کا خوف ہی نہیں۔ اور خبر نہیں کہ بھانجے کے ہاتھ سے ہی موت لکھی ہے۔ بوڑھے ماموں کی فراخ کن پٹی سے بہتے ہوئے خون کا تصور کر کے مسکرانے لگا۔

ایک شام نرمل بابو عدالت سے تھکے ہارے گھر آکر حقہ پی رہے تھے۔ وہ ہر طرح مغربی معاشرت کے دلدادہ ہونے کے باوجود کبھی سگریٹ سگار کو منہ نہ لگاتے تھے۔ ایک خط میز پر دھرا تھا۔ اٹھایا، پڑھا۔ کاتب کا نام نہ تھا مگر وہ رات کے بارہ بجے ان سے ملنا چاہتا تھا۔ لکھا تھا "آپ اور آپ کا خاندان سخت خطرے میں مبتلا ہیں۔ میں بچا سکتا ہوں۔"

نرمل بابو گھبرا گئے۔ یہ آدھی رات کی ملاقات اور خطرے کی تنبیہ! وہ کسی خطرے کا گمان نہ کر سکتے تھے۔ وہ عملی سیاسیات میں حصہ ہی نہ لیتے تھے، نہ ان کے علم میں ان کا کوئی دشمن تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے وکیلوں کی طرح چھچھورے کم ظرف نہ تھے۔ مقدمات میں اپنے موافق ثبوت کے ایجاد و اختراع، غیر ضروری بیہودہ جرح .... و بحث یا اور کمینہ ہتھکنڈوں سے کبھی کام نہ لیتے تھے۔ ان کے نجی اور خانگی معاملات بھی صاف تھے پھر یہ خطرہ کیسا؟ شاید کسی نے مذاق کیا ہے یا کوئی سیاسی ٹھگ استحصال بالجبر کا خواہاں ہے۔ یہ خط پولیس کے حوالہ کر دیا جائے؟ پھر تسکین استعجاب کے شوق نے انھیں اس کارروائی سے باز رکھا اور وہ وقت مقررہ کا انتظار کرنے لگا۔

وہ اپنے کتب خانہ میں دیر تک پڑھتے رہے۔ بارہ کی گھنٹی بجتے ہی دروازے کی طرف نظر اٹھائی آنے والے کے انتظار میں سوا بارہ بج گئے۔ کتاب بند کر کے کرسی سے اٹھے، برقی لیمپ گل کیا، خوابگاہ کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ایک سایہ دروازے سے داخل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ انھوں نے بٹن دبا کر پھر روشنی جلا دی، ایک خوش اندام قدرے پست قامت شکل بنگالی لباس میں سر پر نائٹ کیپ رکھے کھڑی تھی۔ آواز آئی "اندر آنے کی اجازت ہے؟" "آجائیے۔" آ گئی۔ "بیٹھ جائیے" بیٹھنے سے پہلے اس شکل نے ٹوپی اتار دی، نقلی مونچھیں جدا کیں، شیروانی کے بٹن کھول دئے اور ایک خوبصورت نوجوان شریف زادی بن گئی۔ وکیل صاحب کسی عورت ملاقاتی کے لئے تیار نہ تھے۔

نرمل بابو :۔ مجھے امید نہ تھی کہ میرا گمنام کرم فرما ایک خاتون ہوگی۔

لڑکی :۔ بجا ہے مگر اس سے زیادہ خلاف امید باتوں کے لئے تیار ہو جائیے۔"

وہ چاروں طرف دیکھنے لگی۔ وکیل صاحب مطلب سمجھ گئے۔

نرمل بابو :۔ نہیں کوئی متنفس آس پاس نہیں۔ تم آزادی سے باتیں کر سکتی ہو۔"

لڑکی کرسی قریب کرکے بولی " آپ خطرے کی نوعیت معلوم کرنے کے لئے بے چین ہونگے - اور اس سے متنبہ کرنے والی ایک لڑکی کو دیکھ کر اور بھی حیران ہوں گے - پہلے میں اس دوسری حیرانی کو دفع کئے دیتی ہوں - دو پشتیں گذریں آپ کے خاندان کے ایک رکن شاید پر دادا نے ہمارے خاندان کی آڑے وقت میں گرانقدر اعانت کی تھی جس کے بغیر ہمارا خاندان تباہ ہو گیا ہوتا شاید آپ کو اپنے بزرگ کے اس کارنامہ کی خبر نہ ہو - خود مجھے صاف طور پر معلوم نہیں کہ وہ کیا تھا - بہر حال ہمارے بزرگوں نے اس احسان کی یاد ہمیشہ ہمارے دلوں میں تازہ رکھی ہے "

نرمل بابو کے چہرے پر مسرت اور فخر کی چمک دوڑ گئی " ہاں میں نے بھی سنا ہے کہ میرے پر دادا نہایت رحمدل اور فیاض بزرگ تھے - اور ان کو سخاوت و فیاضی کے مواقع بھی زیادہ تھے - وہ بنگال کے سب سے دولتمند زمینداروں میں سے تھے "

لڑکی :- بے شک - اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ دو پشتیں گذر جانے پر بھی ان کے ممنون کرم خاندان کی ایک لڑکی اس احسان کا شکر ادا کرنے کے قابل ہوئی - مگر آپ کو وعدہ کرنا پڑیگا کہ کوئی سوال نہ کریں خصوصاً میری ذات سے متعلق ، کہ میں اس کے افشا سے قطعاً مجبور ہوں - آپ سے اس وقت تنہائی میں ملنے کا موقع نکالنے کے لئے مجھے جن خطروں سے گذرنا پڑا ہے وہ کچھ میں ہی جانتی ہوں - آپ اس سے زیادہ سمجھ سکیں گے - جب آپ کو معلوم ہو گا کہ جس سرکار کا نمک آپ کھاتے ہیں اسی کی نمک خوار میں بھی ہوں "

نرمل بابو :- " کیا تم کسی سرکاری ملازمت ——"

لڑکی :- (بات کاٹ کر) " جی ہاں - میں محکمۂ تفتیش جرائم کی ادنیٰ افسر ہوں "

نرمل بابو :- " خوب ! اچھا اب میں سوال نہ کرونگا "

لڑکی :- " خوشی کی بات ہے کہ آپ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہیں اور آپ نہ سمجھیں تو کون سمجھ سکتا ہے - خیر اب جو کچھ میں جانتی ہوں عرض کئے دیتی ہوں "

سرکاری وکیل نے سر آگے بڑھا دیا اور کان لگا دئے جیسے وہ موکلوں کی باتیں سننے کے وقت عادۃً کیا کرتے ہیں - لڑکی نے دبی آواز میں کہا " آپ نے کبھی یہ بھی محسوس کیا ہے کہ آپ کے خاندان میں کوئی سیاسی مخوف ہو سکتا ہے ؟ "

نرمل بابو چونک کر پیچھے کی طرف جھک گئے مگر فوراً اپنے آپ کو سنبھال کر بولے " ناممکن ! پشتہا پشت سے ہمارا خاندان سرکار کا وفادار رہا ہے - اور ہمارے بچوں کو سرکار کی عزت کرنے اور ہر طرح کی بغاوت اور غداری سے نفرت کی تعلیم دی گئی ہے - اسی خاندانی روایت سے ہمارا کوئی فرد کبھی ایک انچ باہر نہ ہوا "

لڑکی :- " جی ہاں سچ ہے - مگر سرکار تو آپ کے بیٹے اور بھانجے میں کوئی فرق نہیں کرتی ، خصوصاً جو بھانجہ آپ کے ساتھ ایک گھر میں آپ کی زیر نگرانی و سرپرستی رہتا ہو "

نرمل بابو :- " ہیں کیا کہا ؟ کیا تمہاری مراد یہ لڑکا بورے —— وہ جملہ تمام نہ کر پائے تھے کہ

لڑکی :- " جی ہاں - یہ ایک دردناک واقعہ ہے مگر واقعہ ہے کہ وہ سیاسی مخوفین میں شامل ہو گیا ہے "

(نرمل بابو سامنے کتابوں کی قطار پر نظر گاڑے سوچنے لگے)

" آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا عزیز بھانجہ اسوقت کہاں ہے ؟ "

نرمل بابو :- " یقیناً وہ اپنے کمرے میں پڑا سوتا ہوگا "

لڑکی :- " آپ ذرا تکلیف فرما کر وہاں جائیں اور دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کا یقین کہاں تک صحیح ہے (مسکراتے ہوئے) جناب عالی اس دم کہ ہم آپ باتیں کر رہے ہیں بورے مخوفین کے ایک جلسہ میں حصہ لے رہا ہے - ممکن ہے صدارت کر رہا ہو - وہ اپنے حلقے کا سرغنہ ہے - ہمیں خبر ہے کہ آج ایسا ایک جلسہ ہے گو اب تک جگہ کا ہمیں پتہ نہیں "

نرمل بابو :- " میں ابھی دیکھے آتا ہوں - ایک منٹ میں "

نرمل بابو اٹھتے ہوئے بولے - انھوں نے آہستہ سے دروازہ کھولا - اور پنجوں کے بل زینوں پر چڑھ گئے - فوراً لوٹے - " واقعی وہ وہاں نہیں ہے "

لڑکی :- " میں نے آپ سے کیا عرض کیا تھا ؟ خیر اب وکیل کی طرح آپ مجھ سے پوچھ سکتے ہیں ایا رات کو گھر سے غائب ہونا اس الزام کا کافی ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ مخوفین کی مجلس میں شریک ہے ؟ مگر جناب عالی اس شبہ کی گنجایش بھی باقی نہ رہے اگر ایک دفعہ اور زحمت فرما کر بورے کی کتابوں پر ایک نظر ڈال لیں - آپ انقلابی ادبیات کا ایک کافی ذخیرہ پائیں گے "

نرمل بابو :- (پھر اٹھتے ہوئے) " تمہیں پورا یقین ہے ؟ "

لڑکی :- "ایسا ہی یقین کہ یہ رات ہے اور میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔ میں یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ یہ ناپاک چیزیں کمرے کے کس گوشہ میں ہیں"؟

نرمل بابو :- (دروازے سے مڑتے ہوئے) "کہاں"؟

لڑکی :- "کمرے کے جنوبی گوشے میں ایک لکڑی کے پرانے صندوق میں ان کے پرانے اخبار ہیں۔ ان کو اٹھائیے۔ نیچے وہ خزانے گا"۔

اکیلے نرمل بابو دس منٹ غائب رہے۔ اور ہاتھوں میں کتابیں اور پرانے رسالے لئے لوٹے۔ اور میز پر رکھ دئے۔ حیات لینن۔ انقلاب آئرلینڈ۔ اصول فلسفہ میکیاویلی۔ رسالوں کے سرورق غائب تھے۔

لڑکی :- "اب میں کچھ باتیں اور بتاتی ہوں"۔ بڑے سے ایک خط نکال کر پڑھایا۔

نرمل بابو :- (لیتے ہوئے) موجودہ قانون تعزیرات اور آرڈیننس کی رو سے اس کے گلے میں طوق اسیری ڈالنے کے لئے یہ کافی ثبوت ہے۔ اس سے زیادہ کی ضرورت نہ تھی"۔ عینک لگا کر خط کھولتے ہیں

لڑکی :- "آپ اس کا ہر لفظ شاید سمجھ نہ سکیں۔ یہ لوگ کچھ علامات استعمال کرتے ہیں۔ پھر بھی سلیس بنگلہ میں اتنا کچھ موجود ہے کہ آپ کو سازش اور بنوے کی اس میں شرکت کا اندازہ مل جائیگا"۔

نرمل بابو نے خط پڑھ کر کانپتے ہوئے ہاتھ سے اسے میز پر رکھ دیا۔

لڑکی :- "آپ کو اس تحریر میں کوئی شبہ تو نہیں"؟

نرمل بابو :- "بالکل نہیں۔ یہ بنوے کی تحریر ہے"۔ چھت کی طرف دیکھنے لگے۔ گویا جلائے آسمانی کی طرف گھور رہے تھے۔

لڑکی :- "نرمل بابو آپ گھبرائیں نہیں۔ اب تک وقت ہاتھ سے نہیں نکلا"۔

نرمل بابو کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے جیسے کچھ سنا نہیں پھر ایک بھاری سانس لے کر :-

"عزیز خاتون! تم کہتی ہو کہ کبھی میرے خاندان نے تمہارے خاندان کی کوئی خدمت انجام دی ہے۔ یاد رکھو اگر تم نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائی تو مجھے اور میرے خاندان کو ہمیشہ کے لئے خرید لوگی"۔

نوجوان خفیہ افسر کے خوبصورت لب ہمدردی کے تبسم سے پھیلے اور سمٹے۔ کھلے اور بند ہوئے۔

——— نرمل بابو آخر اس سمئے میں آپ کے پاس آئی کس لئے ہوں؟ سنئے ہمارے پاس لے دے کر یہی (کتابوں اور خط کی طرف اشارہ کرکے) شہادتیں ہیں۔ بالخصوص ایک اور خط کے جو بدقسمتی سے ان سبھی سے زیادہ ناطق ثبوت ہے۔ وہ میرے ایک رفیق کے پاس ہے۔ آپ کو معلوم ہو یا نہ ہو کہ ہمیں کسی مقدمہ کی تفتیش میں تنہا کام کرنے کی اجازت نہیں۔ ہر مقدمہ میں کم سے کم دو کارکن ہوتے ہیں۔ بہرحال اگر وہ خط حاصل کیا جا سکے تو کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔ بشرطیکہ آپ اپنے بھانجے کو آیندہ ایسی حماقتوں سے باز رکھ سکیں"۔

نرمل بابو :- "تم اطمینان رکھو میں اس کی سبیل کرونگا۔ ضرورت ہوئی تو (دانت پیس کر) میں بنوے کو گھر میں مقفل بھی کر دونگا۔ مگر بیٹا یہ بتایئے کہ وہ خط حاصل کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ تم غالباً اس رفیق افسر کا نام پتہ تو بتاؤگی نہیں جس کے قبضہ میں وہ خط ہے"؟

لڑکی :- اول تو وہ میرا دوست نہیں صرف رفیق کار ہے۔ بہر صورت میں اس کی شخصیت پر سے پردہ نہیں اٹھا سکتی۔ اور اگر آپ اسے جانتے بھی ہوتے تو اس سے خط واپس لینے کی توقع کیسے کرسکتے ہیں؟

نرمل بابو :- "عزیز خاتون" میں سوچ رہا تھا کہ اس افسر کے ذاتی حالات معلوم ہوتے تو ممکن تھا کوئی کوشش کی جاتی ——— کہ وہ ——— آ آ آ ———"

لڑکی :- "ہاں ہاں۔ میں آپ کا مطلب سمجھ رہی ہوں۔ روپیہ رشوت؟ تو واقعی وہ کوئی خوشحال آدمی نہیں۔ میں اتنا ہی بتا سکتی ہوں۔ کسی بہانے سے اس کو آپ کے پاس بھیج دے سکتی ہوں معاملہ طے کر لیجئے گا"۔

نرمل بابو :- "نہیں نہیں۔ یہ معاملہ طے کرنا کچھ ٹھیک نہیں۔ رفیق کار کی حیثیت سے تم کو سربراہ کرنے کا بہتر موقع حاصل ہے"۔

لڑکی :- (تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد) "نرمل بابو میں آپ سے کچھ وعدہ نہیں کرتی۔ آخر وہ انسان ہے اور ممکن ہے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جا سکے"۔

نرمل بابو :- "تمہارے خیال میں کتنی رقم درکار ہوگی"؟

لڑکی :- "میں کوئی صحیح اندازہ نہیں بتا سکتی۔ مگر قیاس کرتی ہوں کہ اگر اس نے مان بھی لیا تو دو ہزار تک شاید راضی ہو جائے"۔

نرل بابو :- (اٹھتے ہوئے) "تو روپیہ آپکے حوالہ کر دوں۔ چیک تو یقیناً خارج از سوال ہے؟"

لڑکی :- "ظاہر ہے۔ بالکل بیکار۔"

آخر جب وہ خفیہ پولیس کی نوجوان خوبصورت افسر نوٹوں کی گڈی اپنے دستی بیگ میں رکھ کر اُٹھنے لگی تو میز کے کاغذات کی طرف اشارہ کر کے بولی "نرل بابو شاید یہ یاد دلانا آپ کے لئے غیر ضروری ہے کہ ان سب کو فوراً جلا کر فنا کر دیجئے"

"ہاں ہاں! ابھی ابھی! مگر بتاتی جائیے کہ پھر آپ سے حال کب معلوم ہوگا؟"

"کل اسی وقت - یا آپ کے ہاتھ میں وہ خط ہوگا یا یہ نوٹ۔"

نوٹ لوٹانے کا ذکر نہ کیجئے۔ خدا کرے آپ خط ہی واپس لائیں۔ شکریہ۔

صبح صادق کے دھندلکے میں میدان کے درخت کے نیچے مونی بنوے سے آملی۔ اور نوٹوں کی گڈی بڑھاتی ہوئی بولی "پیارے بنوے۔ یہ لو روپئے جن کے لئے تم اتنے فکرمند تھے۔ جیسے ہم نے نقشہ بنایا تھا ٹھیک ویسے ہی ظہور پذیر ہوا۔ بڑے میاں سے مجھے زیادہ زحمت نہ ہوئی۔ اب نصف درجن ریوالوروں کے لئے کافی سے زیادہ رقم مہیا ہو گئی۔"

بنوے :- پیاری مونی! اب ہمیں روپے کی کیا ضرورت رہی؟

مونی :- کیوں؟ کیا ہوا؟

بنوے :- پیاری مونی! کیا یہ افسوسناک واقعہ نہیں کہ جب ہم نے اتنی پریشانیوں کے بعد سب سے بڑا مرحلہ طے کر لیا۔ تم ایسی چالاکی سے ماموں جان جیسے فرزانے سے روپیہ اینٹھ لائیں۔ صدر مقام نے پالیسی ہی بدل دی۔ جس وقت تمہیں کے پاس تھیں صدر مقام سے جواب آیا کہ انجمن نے گورنمنٹ کے ہندوستانی طرفداروں کے قتل کی تجویز کو مسترد کر دیا۔ اب کیا کروں؟"

مونی :- اس میں افسوس اور مایوسی کی کیا بات ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں یہ اچھا ہی ہوا۔ سچ پوچھو تو تمہارے ماما سے ملنے کے بعد ان کو خاک دنوں میں تڑپتا دیکھ کر مجھے بڑا دکھ تھا۔"

بنوے :- آخر ہو نہ عورت؟ سچ نہیں۔ افسوس میری قتل کی یہ گیارھویں کوشش تھی جو یوں برباد ہوئی۔ شاید میرے ہاتھ سے کچھ بر آنا مقدر رہے۔ نہ تمہارا ہاتھ آنا۔"

مونی :- پست ہمت منصوبے سوچتے اور جھکتے رہ جاتے ہیں اور کرنے والے کر گذرتے ہیں۔"

مونی آہستہ بولی مگر بنوے نے سن لیا اور ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

ہفتوں گذر گئے بنوے کو جانبازی دکھانے کا موقع نہ ملنا تھا نہ ملا۔ شاید وہ اس جنون سے نجات پا جاتا اگر آزاد ہوتا۔ مگر مونی کی توجہ اور اختلاط میں کمی دیکھ کر اور ایک آدھ بار چبھتا ہوا فقرہ سنکر اس کا خون تازہ جوش سے کھولنے لگتا۔ آخر گورنر بنگال کے اسپشل ٹرین کو پٹری سے اتارنے والی جماعت میں بنوے کا انتخاب ہو گیا۔

پٹری کے فش پلیٹ کھول دیئے گئے مگر فلیتہ لگانے کی کوشش میں سب پکڑے گئے۔ بنوے چاہتا تو بھاگ نکلنے کا موقع تھا مگر بھاگنا ایک خطرے سے نکل کر دوسرے خطرے کے منہ میں جانا اور انقلابیوں کے ہاتھوں کتوں کی موت مرنا تھا۔ خوف سے دل لرز رہا تھا مگر کوئی جنون سہارا دیئے ڈھٹائی سے اسے پولیس افسر کے روبرو کھڑا کئے تھا۔ مقدمہ ہوا۔ انتہا میں بیباکی سے اس نے سارا الزام قبول کر لیا مگر اسے وطن کی خدمت اور قربانی سے تعبیر کیا۔ اخباروں میں اس کا بیان شائع ہوا۔ واہ واہ ہوئی۔ شہید حریت قرار دیا گیا۔ بنوے نے سکون سے چھ سال قید بامشقت کا فیصلہ سنا۔

اس کا ہاتھ چکی کے ہتھڑے پر اور دل مونی کے پاس رہتا۔ "اسے اپنے جانباز شہید وطن پر کتنا ناز ہوگا اور وہ اپنے بنوے سے ملنے کے لئے کتنی بیتاب ہو گی! چھ سال چھ لمبے پہاڑ سال! پھر؟ پھر مونی، حسین دلیر مونی! اس کی ناگن جیسی زلفیں، نشیلی آنکھیں، حزیمت نشان پیشانی، بھبھوکے گال، بنوے کی ملک ہوں گے۔ وہ راجہ ہوگا، مونی رانی۔ وہ ہیرو ہوگا مونی ہیروئن۔ وہ رام چندر ہوگا مونی سیتا۔"

مگر مونی کبھی جیل میں اس سے ملنے نہ آئی۔ بنوے نے سوچا مونی کو تاب ملاقات نہ ہوگی، یا جیل کے افسروں کی اجازت نہ ہوگی۔

بنوے ایک فرمانبردار، نیک چلن، فرض شناس قیدی ثابت ہوا۔ کسی مشقت سے جی نہ چراتا۔ جو خدمت اسکے ذمہ ہوتی ہمت سے پوری کرتا۔ جیلر کلیم خاں ایک تنومند، خوبصورت، بلند خیال جوان تھا۔ بنوے سے اس کی دلچسپی ہونے لگی جو دوستی کے درجہ پر پہنچ گئی۔ کلیم خاں اور بنوے میں سیاسیات کے ساتھ اکثر ہندو مسلم اتحاد پر گفتگو رہتی۔ کلیم خاں اس اتحاد کے جوش میں ہندو مسلم مخالفت، معاونت، موآکلت کی تجویز سے گذر کر مناکحت تک کی حمایت کرتا۔ اور لے دے کر اسی اتحاد نسل دخون کو ہندوستان اور دنیا کی آزادی وصلح کا واحد علاج قرار دیتا۔ بنوے اپنی سیدھی نیکی کے اعلان اور اشتراکی مشربکے اقرار کی بنا پر کلیم کے دعوے سے اختلاف نہ کرتا۔ مگر اس خیال سے اتنا شغف نہ دکھاتا جتنا اور انقلابی پروگرام سے۔ انقلابی دونوں جوان تھے مگر دونوں کی راہیں دو تھیں۔ ایک سیاسی استبداد، تخویف، قتل و غارت، سرفروشی و بغاوت کا قائل تھا۔ دوسرا سماجی انقلاب کو سیاسی انقلاب کا پہلا زینہ قرار دیتا تھا۔ کلیم جس طرح تندرستی اور وجاہت ظاہری میں بنوے سے برتر تھا۔ علم و تجربہ اور قوت گویائی میں بھی اس پر فضیلت رکھتا تھا۔ بنوے زیادہ تر اس کی منطق سے قائل ہو جاتا۔ وہ کلیم خاں کی عزت کرنے لگا تھا اور کلیم خاں اس کی۔ بیش وکم دونوں کے خیالات ایک دوسرے سے متاثر ہو رہے تھے۔ کلیم کی بدولت بنوے کی زندگی نسبتاً آرام اور گونہ دلچسپی سے گذرنے لگی۔

پانچ برس کی طویل مدت میں ملک کی سیاست میں عظیم الشان تغیر پیدا ہو چکا تھا۔ جدید اصلاحات سیاسی کو آزما دیکھنے کے لئے حکومت و رعایا دونوں کے طرز عمل میں مفاہمت شروع ہو چکی تھی۔ تخویف و تشدد کی پالیسی برطرف اور انقلابی سازشیں موقوف ہو چکی تھیں۔ ہند و مسلم اتحاد کی ہوا چل رہی تھی۔

ایک روز کلیم بنوے کی کوٹھری میں بشاش اور شگفتہ داخل ہوا۔

بنوے:۔ "خاں صاحب آج آپ بہت خوش ہیں۔ کوئی نئی خبر ہے"؟

کلیم:۔ "بنوے بابو آخر میری اس غیر شاعرانہ پھیکی زندگی میں شیریں شعر کے دخل پالیا۔ شعر بھی کیسا؟ مطلع تا باں سمجھے؟ کیا سمجھے"؟

بنوے:۔ "سمجھا۔ آپ کی شادی ہو رہی ہے۔ خدا کرے یہ شعر آپ کی زندگی کا وہ لازوال نغمہ ہو جو آپ کو عمر بھر مست رکھے کاش میں بھی آپ کی خوشی میں شریک ہو سکتا"؟

ساتھ ہی مونی کی یاد میں اسکی آواز بھرّانے اور آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

کلیم:۔ "بنوے بابو گھبرائیے نہیں۔ آپ کیلئے بھی جانفزا خوشخبری لایا ہوں۔ آپ کی نیک چلنی کی بنا پر آپ کی میعاد سے ایک سال گھٹا دیا گیا۔ جس دن آپ آزاد ہوں گے وہی میری شادی کی تاریخ ہوگی"

آخر وہ ہزاروں حسرتیں دل میں دبائے زنداں سے نکلا۔ جیلر صاحب کے اصرار سے ان کا مہمان ہوا۔ ان کی طرف سے اسے ایک نفیس جوڑا تحفہ ملا۔ اس نے سوچا خاں صاحب کی دلہن کیلئے بہترین تحفہ کیا ہوگا؟ مونی کو آسمانی ساڑی اور فیروزی بلاوز سے بہت رغبت تھی۔ لاؤ یہی لباس میں اس محسن دوست کی دلہن کو پہنا کر تصور ہی میں مونی کی ایک جھلک تو دیکھ لوں

کلیم خاں نے از راہ محبت اسی کا نذر کیا ہوا جوڑا بیوی کو پہنا کر اسی سے ملایا۔ مسز کلیم مونی کے لباس میں نہایت شاندار دکھائی دی۔ سامنے آکر اس نے ایک ادائے حیا سے ذرا منھ پھیر لیا اور آنکھیں جھکا لیں تو بنوے "مونی" پکار کر گرتے گرتے سنبھلا۔ وہ صرف مونی کے پسندیدہ لباس ہی میں نہ تھی بلکہ خود مونی تھی۔

اب بنوے پر کھل گیا کہ اس کے ساتھ مسٹر کلیم خاں کی رعایت و مروّت اور شادی میں دعوت شرکت، سب مونی ہی کی ستم ظریفی تھی اور یہ قیمت تھی اس کی جانبازیوں کی۔ بول اٹھا "آہ عورت! کمزوری تیرا نام عورت ہے"۔ مگر جب وہ باہر نکلا اور نئی دنیا دیکھی تو ماننا پڑا "کمزوری تیرا نام انسان ہے"۔ "فریب تیرا نام زندگی ہے"۔ "مایہ ہے سب مایہ ہے"۔

بنوے اب جہاں گرد سنیاسی ہے۔

دماغ کی شکست

از جناب پروفیسر شبلی ابراہیمی ایم اے

ہندوستان کی موجودہ معاشی حالت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شادی خانہ آبادی نہیں بلکہ خانہ بربادی ہے۔ پھر اگر کوئی نوجوان دیس، جنتا، اور انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہو تو اُس کے لئے تو زہرِ ہلاہل ہے۔ عورت ایک دلکش فریب ہے۔ اُس کے خوبصورت جال میں ایک بار پھنسکر پھر رہائی مشکل ہے.....

..................."

جوتش یہیں تک کہنے پایا تھا کہ بمالا نے بات کاٹکر کہا "اچھا! اچھا!! یہ سب لکچر کسی اور کو پلاؤ۔ سب مرد اسی طرح بکتے ہیں، لیکن جب وقت آتا ہے تو دیوی کی طرح پوجا کرنے لگتے ہیں"

"لیکن میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں"

"اچھا دیکھوں گی، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا"

بمالا اُٹھ کر چلی گئی، مگر جوتش بہت دیر تک شادی کے فلسفہ پر غور کرتا رہا، سوچتے سوچتے وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور کوٹ پہن کر باہر نکل گیا ——— وہ آہستہ آہستہ بدبداتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

میں کبھی بیاہ نہیں کروں گا ——— اِس کمبخت بمالا نے مجکو معمولی مردوں کی طرح سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ مجکو مصطفےٰ کمال اور مسولینی بننا ہے۔ پھر میں اس جال میں کیونکر پھنس سکتا ہوں۔ خود بمالا ہی نے مجھ پر کیسے کیسے وار کئے کہ میری جگہ پر کوئی دوسرا ہوتا تو اب تک کب کا تہید ہو چکا ہوتا ——— اُس کو غرور ہے اپنی جوانی اور حسن پر اور اس بات کا کہ ایم۔اے میں پڑھتی ہے۔ مگر وہ جانتی ہی نہیں کہ میرا جگر لوہے کا اور دل پتھر کا ہے۔ جس پر کوئی تیر اثر نہیں کر سکتا..........

یکایک پیچھے سے کسی نے اُس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ جوتش چونک پڑا۔ اُس نے اپنے داہنی طرف ایک شخص کو دیکھا جس کا منہہ حبشیوں کے جیسا کالا، آنکھیں چھوٹی چھوٹی، گال پچکے ہوئے اور قد بہت ہی چھوٹا تھا، کمر قدرے جھکی ہوئی تھی ——— بوڑھا آدمی تھا۔

"کیا تم سُنیل کمار چیٹرجی کو بھول گئے۔ تمہارے باپ بینش بابو سے میری کتنی دوستی تھی ——— مگر ہاں اُس وقت تم بچے تھے اسکول میں پڑھتے تھے۔ اب جوان ہوئے، ایم۔اے میں پڑھتے ہو، مجھے سب خبر ہے۔ میں تمہارے بارے میں برابر لوگوں سے پوچھتا رہا ہوں۔ تم بچے ہی تھے کہ میں رنگون چلا گیا تھا....

......"جی ہاں اتنے زمانہ کی بات ہے، اسی لئے مجھے یاد نہ رہ سکا" جوتش نے بات کاٹ کر کہا۔

"ہاں بیٹا تم بچے تھے، تمہیں کیونکر یاد رہتا جیتے رہو بیٹا۔ میری تو لَو لگی ہوئی ہے کہ تم ڈپٹی کمشنر پولیس ہو جاؤ۔ بیاہ کرو۔ خوبصورت بہو لاؤ۔ اور یہ کوئی بڑی.....

..........."

آپ کہاں رہتے ہیں۔ اپنا نمبر دیجیے، میں آپ سے پھر ملوں گا۔ اِس وقت مجھے ایک بہت ضروری کام ہے" جوتش نے گھبرا کر کہا۔

کیا بیٹا اپنی چچی کو اپنی پیاری صورت دکھا کر اُس کا دِل خوش نہ کرو گے۔ کتنا تم کو یاد کرتی ہے۔ سچ پوچھو تو میں کبھی کبھی بھول بھی جاتا ہوں۔ لیکن وہ تو برابر تمہاری رٹ لگائے رہتی ہے"

جی ہاں! جی ہاں!! ضرور ملوں گا۔ مگر اس وقت ایک بہت ضروری کام ہے۔ آپ اپنا پتہ دیدیں۔ میں پھر کسی وقت مل لونگا"

"اچھا بیٹا! جیسی تمہاری مرضی۔ مگر ملو ضرور۔ اُس کو کتنی تمنا ہے کہ تم ڈپٹی کمشنر پولیس ہو جاؤ، تمہارے سر سونے کا سہرا چڑھے، خوبصورت بہو لاؤ ——— جس کا سِن سولہ برس کا ہو اور جو ہمیشہ سنہری گوٹ کی گلابی ریشمی ساڑی پہنے رہتی ہو ——— یہی رٹ برابر لگائے رہتی ہے........"

"اچھا تو اب اجازت دیجئے" جوتش نے گھبرا کر کہا۔

"تم کدھر کو جاؤ گے بیٹا" بڈھے نے کہا۔

"میں اس وقت پارک سرکس جا رہا ہوں" جوتش نے جواب دیا۔

" میرا ڈیرہ بھی تو اسی طرف ہے۔ ـــــــ چلو پھر تو ساتھ ہی چلتا ہوا۔ ـــــــ تو ہاں بیٹا! اس بوڑھے کی بات مان لو۔ تمہارے ماں باپ تو اسی تمنا میں سُرگباشی ہو گئے ـــــــ تو اب بیٹا میں اور تمہاری چچی ہیں یہ بیاہ دیکھنے کو زندہ رہ گئے ہیں۔ کیا چاہتے ہو کہ ہم لوگ بھی مر لیں تب اپنا بیاہ رچاؤ گے۔ تو یہ نہ ہوگا، نہ ہوگا۔ ہرگز نہ ہوگا۔ ـــــــ رشیوں کا پرمان ہے۔ بیٹا کہ بیس برس میں انسان کو بیاہ کر لینا چاہیئے اور اکیس سال میں لڑکا ہونا چاہیئے ـــــــ بس بیٹا تم بیس برس کے ہو گئے۔ بس اب بیاہ کرو اور بہو لاؤ ـــــــ سندر، منوہر، چندرما ایسی بہو ـــــــ سولہ برس کی۔ ریشمی کی گلابی ساری والی، جس کا کور سنہری ہو ـــــــ اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ بس ہاں کرو ـــــــ اور میں ہوں کس دن کے لیئے؟ "

" اچھا تو اب پارک سرکس کا موڑ قریب آ گیا۔ مجھے ذرا جلدی جانا ہے۔ اجازت دیجیے " جوتش نے گھبرا کر عاجزی کے لہجے میں کہا۔

" اچھا بیٹا! تمہاری خوشی ـــــــ مگر ذرا کچھ کھا تو لو، ہوٹل وہی سامنے ہے ـــــــ "

" نہیں! نہیں!! میں جلپان وغیرہ اچھی طرح کر کے باہر نکلا ہوں " جوتش نے کہا۔

" بس بیٹا! یہ کوئی بات ہے ـــــــ جب میں تمہاری عمر کا تھا تو دن بھر میں سات آٹھ مرتبہ کھاتا تھا۔ یہ تو تم بوڑھوں کی سی باتیں کرتے ہو "

بڈھے کی ہیئت کذائی، اُس کی بکواس، اور اُس کا باربار بیاہ کا رٹ لگانا، ایسی باتیں تھیں کہ جوتش کو اُس سے گھِن آنے لگی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ کسی صورت سے اپنی جان چھڑا کر بھاگ جائے۔ لیکن بڈھا تسمہ پیرا تھا اور جوتش اپنی گردن چھڑانے میں کامیاب نہ ہوتا تھا۔ نہیں نہیں کر کے اُس کو ہوٹل بھی جانا ہی پڑا۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بوائے سامنے سے نمودار ہوا اور آتے ہی بڈھے سے کنکھی مار کر بولا " کیا کوئی شکار پھنسا ہے؟ "

بڈھے نے جواب میں جھنجھلا کر کہا " جا جا جلدی سے توس، کیک، انڈے، مٹن چاپ اور چائے لا "

بوائے گیا مگر " شکار " جوتش کے کانوں میں اب تک گونج رہا تھا۔ اُس نے چند منٹوں تک غور کیا کہ اس کے کیا معنی ہیں؟ پھر اُس نے کہا کہ شاید یہ مختار کاری وغیرہ کرتا ہوگا اور شاید بوائے مجھکو موکل سمجھ رہا ہے۔ یہ سوچ کر جوتش چپ ہو گیا۔

اتنے میں بوائے نے چائے اور کھانے کی چیزیں ٹیبل پر لا کر رکھ دیں۔

" بس بیٹا! شروع کر دو۔ شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو بوڑھا آدمی ہوں صبح کو جو کھا کر چلا ہوں وہی ابھی ہضم نہیں ہوا ہے۔ میں تو کھانے سے رہا ـــــــ ایں تم شرما رہے ہو ـــــــ لو یہ کیک تو کھاؤ ـــــــ اور لو اس انڈے کو تو ختم کرو ـــــــ اور ہاں یہ مٹن چاپ تو کھا لو ـــــــ جب سسرال جانا تو شرما لینا۔ یہاں شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سسرال میں سالیوں کی ہنسی کے ڈر سے نہ کھانا ـــــــ یہاں کیا ہے........ "

جوتش واقعی شرما رہا تھا اور اُس نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا " جی نہیں میں کھا تو رہا ہوں ـــــــ اصل یہ ہے کہ میں کھا کر چلا ہوں، اسلئے زیادہ کھانے سے مجبور ہوں "

" نہیں بیٹا! تم کو ہمارے سر کی قسم یہ سب کھانا ہوگا۔ ـــــــ دیکھوں گا جب تمہاری دولہن کھڑی ہو کر کھلائیں گی تو کیسے عذر کرتے ہو۔ بیٹا! میں بھی جوان تھا اور سب جانتا ہوں، اور آج بھی تمہاری چچی ایک نہیں سنتی ہے ـــــــ تمہارے سر کی قسم بیٹا کیا کہوں اُس کو کتنی تمنا ہے کہ تمہارے سر سہرا دیکھے اور برابر یہی رٹ لگائے رہتی ہے کہ جوتش کی ایک خوبصورت چاند ایسی، سولہ سال کی دلہن آئی جو ہمیشہ سرخ سنہری کور کی ریشمی ساری پہنے رہتی........ "

جوتش اس اثنا میں چائے وغیرہ سب ختم کر چکا تھا، اور بغیر انتظار کیے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بڈھے سے رخصت طلب کی۔

" ہاں بیٹا! اب تم جا سکتے ہو ـــــــ کیا کہوں بیٹا! تم کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا........ "

جوتش بغیر انتظار کیے ہوئے چل کھڑا ہوا۔ لیکن پیچھا بھی

ساتھ ساتھ تھا - اُس کے بک بک کے خوف سے جوتش دم سادھے چلا جا رہا تھا، یکایک ایک موڑ ملا اور بڈھے نے بڑھ کر جوتش کے کاندھوں پر شفقت سے ہاتھ رکھ دیا۔

"بیٹا! اتنی جلدی کیا ہے - کام کرنے کو بہت سارا وقت پڑا ہوا ہے - بس اسی گلی میں ہمارے دوست مسٹر سوشل کمار مکرجی ڈپٹی کمشنر پولیس رہتے ہیں، کیا کہوں بیٹا ایسے اخلاق کے آدمی ہیں، بس آدمی کا ہے کو ہیں دیوتا سمجھو دیوتا ــــــــــــ"

جوتش مسٹر مکرجی کا نام سن چکا تھا اور اُس کا بھی جی چاہا کہ اس کا موقع مل گیا ہے تو مل لینا چاہئے - اس لئے جلدی سے بات کاٹ کر اُس نے کہا " اگر آپ کی یہی اِچھا ہے تو مجھے کوئی عذر نہیں ہے "

"ہاں بیٹا! بڑے لوگوں سے ملنا بھی ایک قسم کی تعلیم ہے، جو بات آدمی کتابوں میں پڑھ کر نہیں سیکھ سکتا ہے وہ ایسے لوگوں سے مل کر سیکھ سکتا ہے ــــــ"

مسٹر مکرجی کا پھاٹک سامنے آ گیا اور بڈھے نے جوتش کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا آؤ بیٹا -

پھاٹک پر دربان تھا مگر اُس نے بڈھے سے کوئی تعرض نہیں کیا - پھاٹک کے بعد احاطہ اور احاطہ سے بیس قدم کے فاصلہ پر ایک خوبصورت دو منزلہ مکان تھا - بڈھا جوتش کا ہاتھ پکڑے ہوئے تیزی کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا جا رہا تھا، اُس کی تیزی دیکھ کر جوتش ہکا بکا ہو رہا تھا - لیکن بڈھا بغیر کسی بات کا خیال کئے ہوئے کوٹھی میں چلا جا رہا تھا اور اُس نے ایک دم دوسری منزل پر جا کر دم لیا - اور ایک بڑے کمرہ کے دروازہ پر جس پر خوبصورت پردہ پڑا ہوا تھا جا کر رکا - پاؤں کی آہٹ پا کر ایک قوی ہیکل خوش شکل آدمی جس کا سن تقریباً چالیس یا بیالیس کا ہوگا، کمرہ سے باہر نکل آیا اور بڈھے کو دیکھتے ہی اُس نے نہایت گرمجوشی کیساتھ اُس کا ہاتھ پکڑ لیا -

"میں آپ کا تعارف مسٹر جوتش چندر بنرجی سے کراتا ہوں - مسٹر مکرجی! یہ ایم - اے کے طالب علم ہیں - ان کے باوجی یہیں ہائیکورٹ کے بہت بڑے وکیل تھے، اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ وراثت میں چھوڑ گئے ہیں - باوجود اس کے ہمارے جوتش بابو ایسی سادگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں - جیسی کہ طالبعلم کو چاہئے - میں ان کی کیا تعریف کروں ــــــــ"

بڈھا یہیں تک کہنے پایا تھا کہ مسٹر مکرجی نے جوتش سے گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا -

"اور ہاں! آپ کی تعریف کرنا تو میں بھول ہی گیا - مسٹر مکرجی" بڈھے نے تیزی کے ساتھ کہا -

"ہاں جوتش! یہ مسٹر مکرجی ہیں - ڈپٹی کمشنر پولیس - مسٹر مکرجی سب انسپکٹر سے اپنی قابلیت کی بدولت آج اس عہدۂ جلیلہ پر پہونچے ہوئے ہیں - ہمارے ملک میں بھی ایسے ایسے لوگ ہیں - ان پر ہم جتنا فخر کریں کم ہے ـــــــــ اور کیا تعریف میں ان کی کروں ــــــــ"

بس بس!! میں اپنی تعریف خود کر لوں گا - آپ زیادہ تکلیف نہ کریں" مسٹر مکرجی نے ہنس کر کہا -

مسٹر مکرجی جوتش کو اپنے ڈرائنگ روم میں لیگئے اور ایک کوچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "تشریف رکھئے جوتش بابو!"

بڈھا بھی جوتش کے بغل والے کوچ پر بیٹھ گیا،

"آپ کے باوجی سے کافی ملاقات تھی اور میں نے آپکو بچپن میں بارہا دیکھا تھا - آپ اُس وقت اسکول میں پڑھتے تھے - بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" مسٹر مکرجی نے جوتش سے مخاطب ہو کر کہا -

جوتش کے لئے کچھ جواب دینا ضروری تھا - لیکن اس وقت اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ تنہا اس کمرہ میں رہتا اور کوئی اس سے بولتا چالتا نہیں، کیونکہ کہیں بغل کے کمرہ میں کوئی میٹھے میٹھے سُروں میں گا رہی تھی - آواز میں ایسا رس اور درد تھا کہ دل بے اختیار کھنچا چلا جاتا تھا - مگر اُس نے اپنے کو سنبھال کر جواب دیا "مجھے بھی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی - آپ کی تعریف میں نے بہت سنی تھی اور آج میرے اچھے بھاگ تھے کہ آپ کے درشن ہو گئے -"

"مجھے پانچ منٹ کی اجازت دیجئے جوتش بابو! میں ابھی آیا" مسٹر مکرجی نے کہا -

یہ کہہ کر مسٹر مکرجی چلے گئے -

اب جوتش بالکل محو تھا - گانے کی آواز صاف آ رہی تھی ...

ـــــــــــ ......

پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں، تج کے سب سنسار۔
پریم سدھا میں سنان کروں گی، پریم کی ہونگی دھار
پریم ہی دھرم ہے، پریم ہی کرم ہے، پریم ہی سب سنسار
پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں........

....

یکایک گانا ختم ہو گیا مگر جوتش اب تک محو تھا۔ وہ اس وقت ایک دوسری دنیا میں تھا، "پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں" کی مدھر تان اب بھی اس کے کانوں میں ناچ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر جذبات کی تھرتھرائی ہوئی لہریں کھیل رہی تھیں۔۔

"یہ مسٹر مکرجی کی لڑکی گا رہی تھی ——— میں کیا کہوں جوتش بابو کیسی پیاری لڑکی ہے۔ ابھی صرف سولہ سال کا سن ہے مگر ایسی سندر، منوہر، گمبھیر، گیانی کہ بس کیا کہا جائے۔ برابر سنہری کور کی سرخ ریشمی ساری پہنے رہتی ہے ——— اور گانے میں تو ایسی اُستاد ہے کہ بڑے بڑے استاد گھبراتے ہیں ———"

بڈھا نہ معلوم کب تک بکتا رہا مگر یک بیک پردہ ہٹا اور جوتش چونک پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اُس پر کڑکڑاتی ہوئی بجلی گر پڑی ہے۔ اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھی۔ اُس کے نازک ہاتھوں میں سونے کی خوبصورت چوڑیاں زیب دے رہی تھیں اور ان نازک ہاتھوں میں ایک چاندی کا طشت تھا جس پر چائے کی خوبصورت پیالیاں اور کھانے کی چیزیں تھیں ——— اُس کا چمپئی رنگ جس پر ملاحت کی چھاؤں نے دلکشی کو دوبالا کر دیا تھا، اُس کے خوبصورت سیاہ عنبر فشاں بال، اُس کا گدرایا ہوا بدن، اُس کا سولہواں سال، اُس کی سنہری کور کی سرخ ریشمی ساری ——— ایسی چیزیں نہ تھیں کہ نوجوان جوتش اپنے ہوش و حواس نہ کھو بیٹھتا۔

اُس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسری دنیا میں پہونچ گیا ہے ——— "پریم نگر" میں، ڈرائینگ روم کی در و دیوار، فرنیچر، نقش و نگار، غرضکہ گوشہ گوشہ اور ذرہ ذرہ سے پریم کی تیز شعائیں نکل رہی تھیں اور جوتش اُن میں غرق تھا۔ وہ پریم کے اتھاہ سمندر میں بہتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

دو ہفتہ کے بعد اتوار کے دن تقریباً نو بجے بمالا اپنی سکھی کملا سے ملنے کے لیے گئی۔

"کہو بمالا! آج کہاں سے راستہ بھول پڑیں۔ جوتش کے یہاں سے آ رہی ہونا...... ہاں! ایک بات تو میں ہمیشہ پوچھنا بھول ہی جاتی ہوں۔ تمہاری شادی کب ہے؟" کملا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پاگل لڑکی! شادی! کیسی شادی! کس کی شادی! کس سے؟ ہمیشہ وہی شرارت کی باتیں۔ ایم۔ اے میں پڑھتی ہے۔ مگر اب تک تیرا چھوکری پن نہ گیا ——— اچھا ہوا اب میں سمجھی تیرا بیاہ ہونے والا ہے اور تو اس طرح گھما کے مجھ سے کہنا چاہتی ہے۔ بول! وہ کون بدقسمت ہے جو تجھ جیسی چھوکری سے بیاہ کرنے پر تیار ہو گیا ہے" بمالا نے کملا کو اُس کے گالوں پر آہستہ آہستہ مارتے ہوئے کہا۔

"بھلا تم کچھ جانتی ہو۔ اوں رے تیرا بھولا پن، کس کا بیاہ؟ تمہارا اور کس کا ——— کس سے؟ ——— جوتش سے اور کس سے" کملا نے مُنہ چڑھاکر کہا

بمالا نے ایک آہ سرد بھری اور یکایک اُس کے چہرہ پر سنجیدگی اور متانت چھا گئی۔

"کیوں بمالا؟" کملا نے حیرت سے پوچھا۔

"آج کا اخبار تم نے پڑھا ہے" بمالا نے کہا

"ہاں! ہاں!!" کملا نے ہمہ تن توجہ ہو کر جواب دیا۔

"تو جوتش کے متعلق تم نے اس میں کچھ نہیں پڑھا؟" بمالا نے کہا۔

"نہیں تو! کیا ہوا جوتش کو .... موٹر یا ٹریم کے ساتھ ٹکر وکر تو نہیں لگی۔"

"ارے نہیں پاگل ——— مگر تو نے کون سا اخبار پڑھا ہے؟" بمالا نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"اسٹیٹسمین! ——— اُس سے بڑھ کر کون اخبار ہے؟" کملا نے جواب دیا۔

"سب کچھ سہی مگر اسٹیٹسمین میں اغوا اور شادی بیاہ کی خبریں کہاں؟ امرتا بازار پتریکا پڑھو۔ امرتا بازار پتریکا" بمالا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ کیا کہہ رہی ہے۔ پگلی کہیں کی۔ جوتش اور اغوا!

کملا نے حیرت سے کہا۔

"ارے نہیں پاگل! جوتش کا بیاہ ہونے والا ہے آج کے ہیرنا بلزار پیتر یکا میں یہ خبر شائع ہو ...."

بمالا یہیں تک کہنے پائی تھی کہ کملا زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگی اور ہنستی ہوئی جانے کے لئے مڑی۔ بمالا نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا پاگل تو نہیں ہو گئی ہے۔ کہاں جاتی ہے۔

"ماں کو یہ خوشخبری سنانے جاتی ہوں" کملا نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیسی خوشخبری ؟" بمالا نے اچنبھا ہو کر پوچھا۔

"کیسی خوشخبری! کیسی خوشخبری!! لو لو! لو لو!!" کملا نے منہ چڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں! کیسی خوشخبری ؟" بمالا نے بہت زیادہ اچنبھا ہو کر پوچھا۔

"خوشخبری یہ کہ تمہارا بیاہ جوتش کے ساتھ ہونے والا ہے جس کا اعلان آج کے پیتریکا میں ہو گیا۔ اب سمجھیں۔ تم تو بالکل بھولی ہو۔ تم کیا سمجھوگی" کملا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دور! دور!! پاگل جاہل کہیں کی۔ نہ معلوم تو نے بی۔ اے کی ڈگری کس طرح حاصل کر لی۔ پہلے پوری بات سن لے" بمالا نے کہا۔

"ہاں ہاں!! تو پھر کہہ نہ ڈالو۔ یوں چبا چبا کر باتیں کرنے سے کون سنے گا" کملا نے کہا۔

"ارے پگلی! بات یہ ہے کہ جوتش کا بیاہ مسٹر مکرجی ڈپٹی کمشنر پولیس کی لڑکی سے دوسرے مہینہ میں ہونے والا ہے' اس کا اعلان آج کے پیتریکا میں ہوا ہے" بمالا نے کہا۔

"نہیں میں ہرگز نہ مانوں گی۔ اول تو جوتش شادی ہی کے خلاف ہے۔ پھر دوسرے یہ کہ اگر وہ شادی کرے گا بھی تو ایک جاہل لڑکی سے کیوں کرنے لگا۔ مسٹر مکرجی سے میری دور کی رشتہ داری ہے۔ میں اُن کی لڑکی ارمیلا کو خوب جانتی ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ لڑکی خوبصورت اور سلیقہ مند ہے۔ گانا بجانا جانتی ہے مگر اس کی تعلیم محض معمولی ہوئی ہے۔ کچھ انگریزی اور بنگلہ پڑھی ہوئی ہے پھر بھلا جوتش ایسی جاہل لڑکی سے کیوں بیاہ کرنے لگا۔ تمہاری ایسی بیوی اُس کو چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملے گی۔ نہیں بمالا تم کو دھوکا ہوا ہے" کملا نے کہا۔

"کملا! یہ خبر غلط نہیں بالکل صحیح ہے۔ میں نے خود پیتریکا میں پڑھا ہے۔ یقین نہ آتا ہو تو پیتریکا منگوا کر پڑھ لو۔ میں جھوٹ کیوں کہوں کملا! مجھے بھی اس خبر کو پڑھنے کے بعد دو گھنٹہ تک جوتش پر غصہ رہا کہ اُس نے میری محبت کو یوں ٹھکرا دیا۔ مگر جب میرا غصہ تھما اور میں نے غور کیا تو میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ اور میں نے حقیقت کو پا لیا۔"

"تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ وہ گنوار ہے۔ ہرگز اس قابل نہیں کہ تم جیسی تعلیم یافتہ خاتون سے اُس کی شادی ہو........"

"نہیں کملا! میرا یہ مطلب نہیں ہے" بمالا نے بات کاٹ کر کہا۔

"تو پھر تمہارا کیا مطلب ہے؟ اور تمہاری یہ رائے اُس پڑھے لکھے جاہل کے متعلق ہو یا نہ ہو۔ میری رائے تو یہی ہے۔ میں تو اُس کو بالکل دیہاتی سمجھتی ہوں اور ایشور کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ اُس نے تم کو بچا لیا" کملا نے کہا۔

"لیکن اگر تم سوچ وچار سے کام لوگی تو تمہیں بھی میری طرح ماننا پڑیگا کہ جوتش نے جو کچھ کیا ٹھیک" بمالا نے کہا

"یہ کیسے ؟" کملا نے حیرت سے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ ہم لوگوں نے اونچی تعلیم پائی ہے اور غور و فکر میں، بحث مباحثہ میں، آزادی رائے میں، اور اپنے ہوش میں ہم لوگ مردوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ لیکن یہ سب پا کر بھی ہم لوگ گھاٹے ہی میں ہیں۔ کیونکہ ہم لوگوں نے اپنی نسائیت کھو دی ہے۔ ہماری اونچی تعلیم کی جو کچھ بھی قدر و قیمت ہو لیکن یہ سچ ہے کہ مردوں کے لئے اُس میں کوئی موہنی نہیں ہے۔ کیونکہ قوت فکر اور علم و فضل میں عورتیں مردوں کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتیں"

"ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتیں! یہ تم کیا بک رہی ہو، آخر یہ سروجنی دیوی، خالدہ خانم، مارگریٹ مادام، میڈم صوفیہ وادیا، میڈم میری مونٹسوری عورتیں نہیں تو کیا مرد ہیں پھر ہے کوئی مرد جو ان کا مقابلہ کرے" بمالا نے چلا کر کہا۔

"ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو کملا! ارے یہ عورتیں بیشک بڑی ودوان ہیں، لیکن اُن ہی کے مقابلہ کے مردوں سے اُن کا مقابلہ کرو تو بہت نیچی نظر آئیں گی" بمالا نے کہا۔

"اچھا میں ہار گئی۔ جانے دو۔ مرد ہی بڑے دماغ والے ہوتے ہیں۔ مگر اس سے تم یہ کیسے منوانا چاہتی ہو کہ جوتش نے ایک جاہل لڑکی سے بیاہ کر کے اچھا کیا" کملا نے جھنجھلا کر کہا۔

"میرا مطلب تو بالکل صاف ہے تمہاری سمجھ کا پھیر ہے۔

تاریخ بہار کا ایک خون آلود ورق فسانے کے رنگ میں

میر قاسم کے دو ننھے معصوم بچے

جناب رحمت علی صاحب صابر مظفر پھلوی

صوبہ بہار میں مونگیر کا قلعہ ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ بنگال و بہار کے آخری ہندوستانی فرمانروا نے آزادی کی آخری جدوجہد کا مرکز مونگیر کو ٹھیرایا تھا۔ بلکہ میری نظروں میں اس کی اہمیت اس لئے تھی کہ اس کے ساتھ ایک نہایت ہی المناک اور دردانگیز کہانی وابستہ تھی جسے عرصہ ہوا، میں نے پروفیسر ایس۔ سی چٹرجی کی مشہور کتاب "بنگال کے نواب" میں پڑھا تھا۔ مجھے اسے دیکھنے کی ایک عرصہ سے تمنا تھی کہ کوئی واقف کار مل جائے تو اس کی سیر کروں۔ اور قدرت خدا سے ایک ایسا موقع مل گیا، اور میرے عزیز دوست سید آل حسن میرے شریک سفر ہونے پر آمادہ ہوگئے۔ گو اس کا افسوس مجھے عمر بھر رہیگا کہ میں نے اس قلعہ کو زلزلے سے پہلے کیوں نہ دیکھا۔ ورنہ ہر ایک چیز جس پر مرمت کا غلاف چڑھ گیا ہے یا پھر بالکل ہی شکستہ ہوگئی ہے۔ اپنے اصلی رنگ و روپ میں نظر آتی۔

ہماری گاڑی صبح آٹھ بجے کے قریب ہی وہاں پہنچ گئی۔ میرے دوست کے ایک عزیز مونگیر کی عدالت میں پیشکار تھے۔ سب سامان اُن کے یہاں چھوڑ کر ہم لوگ سیر کی غرض سے نکلے۔ ۳۴ء کا زلزلہ...... خدائے قہار و جبار کے قہر و غضب کی نشانیاں کھنڈروں اور ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر رہا تھا۔ صوبۂ بہار میں شاید مونگیر ہی وہ بدنصیب شہر ہے۔ جسے زلزلے کی ہولناک تباہی کا خصوصیت سے شکار ہونا پڑا۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔ ساکنان شہر میں سے بہت سے تو ہجرت کر کے دوسرے دوسرے مقامات پر پہنچ چلے تھے باقی ماندہ جن کا کہیں ٹھکانا نہ تھا، کس مپرسی کے عالم میں یہیں مارے مارے پھر رہے تھے۔ امدادی انجمنیں، غلے اور کپڑوں کی شکل میں حتی الامکان امداد پہنچا رہی تھیں۔ اس پر بھی تباہ حال مکینوں کی آہ و پکار سے گلی کوچے گونج رہے تھے۔ جابجا ملبہ کھود کر لاشیں اور سڑی ہڈیاں نکالی جا رہی تھیں۔ ورثا کی اُس وقت کی گریہ وزاری اور بیخ بکا کو لفظوں میں بیان کرنا ناممکن نہیں تو محال تو ضرور ہے۔ اس زہرہ گداز منظر سے ہم اتنے متاثر ہوئے کہ باوجود کوشش ضبط کے آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ ابل پڑا۔ اور با دلِ ناخواستہ قلعے کی طرف روانہ ہوگئے۔

میر قاسم کا قلعہ، جس کے دو طرف دریائے گنگا کا پُرشور پانی فصیل سے ٹکراتا ہوا بہتا تھا۔ شہر کی طرف ایک مستحکم فصیل تھی۔ اور فصیل سے باہر کافی گہری خندق تھی جو ہر وقت گنگا کے پانی سے لبریز رہتی تھی۔ قلعے کے دروازوں پر ہر وقت مسلح سپاہیوں کا پہرہ رہتا تھا۔ اٹھارہ برج تھے، جس میں کم و بیش چالیس نبرد آزما ہر وقت غنیم کے چھکے چھڑانے کے لئے "لیس" رہتے تھے۔ مگر آج...... قلعے کی فصیل...... برج کے کنگرے اور مضبوط و مستحکم دروازے زلزلے کی تاب نہ لا کر سرنگوں پڑے ہوئے اپنے بنانے والے کی ناکامی کا افسانہ دہرا رہے تھے۔ خندق جو کبھی پانی سے لبریز رہتی تھی۔ جس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہ تھا، آج کوڑہ کرکٹ سے پُر ہو جانے کے بعد مشکل سے اٹھارہ اُنیس فٹ گہری رہ گئی تھی۔ کتنا الم انگیز انقلاب تھا۔ کہ قلعہ جو کل تک آزادی کے لئے مر مٹنے والوں کا مسکن تھا، آج مختلف شعبوں کے دفاتر کا کام دے رہا تھا۔ پبلک گارڈن۔ کچہری اور دوسری عمارتوں کو جو آجکل گورنمنٹ کے قبضے میں ہیں، گھوم پھر کر دیکھا۔ باوجود اس ہماہمی کے ہر جگہ فسردگی کا دَور دورہ معلوم ہو رہا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ان شاندار عمارتوں کو بنانے والے کو چپہ بھر زمین بھی سر چھپانے کو ملی یا نہیں اور آج نہ جانے وہ کہاں ابدی خواب کے مزے لے رہا ہوگا۔ طبیعت پر فسردگی سی چھائی ہوئی تھی، جی بہلانے کی نیت سے مردانہ گھاٹ، کشٹ ہرنی گھاٹ، پبلک گارڈن اور بیگمات کے نہانے کے حمام کو یکے بعد دیگرے سیر کی۔ میر قاسم کا محل جو آجکل جو نیائل جیل کا کام دے رہا ہے، ہر وقت بند رہتا ہے۔ میرے دوست جلیسر صاحب سے اجازت لینے کی غرض سے چلے گئے۔ اور میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ماضی کے واقعات میں کھویا ہوا ایک اونچے سے چبوترے پر آبیٹھا، جو محض دریا کی سیر کی غرض سے ہی تعمیر کیا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دریائے گنگا کا شفاف پانی اپنی روایتی آن بان کے ساتھ بہ رہا تھا۔ دُور تک پانی ہی پانی تھا۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو ملاح کھیتے ہوئے لئے جا رہے تھے۔ گھاٹ پر اشنان کرنے والوں کے مدھ بھرے گیت ماضی کی داستان دہراتے

ہوئے معلوم ہوتے تھے - موسم خوشگوار تھا - میری پشت پر میر قاسم کا قلعہ تھا - اور سامنے گنگا کا لہریں لیتا ہوا پانی ، آسمان پر گہرے سیاہ رنگ کے بادل دوش ہوا پر اڑے جا رہے تھے - دریائی بگلے کی کرخت آواز سے کبھی کبھی فضا مرتعش ہو جاتی ، اور پھر وہی اشنان کرنے والوں کے سہانے گیت ، اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اُن کی سماعت میں کھویا ہوا تھا - اتنے میں میرے دوست نے مجھے جھنجوڑ کر اس خواب محویت سے بیدار کیا - اور نادل ناخواستہ اُن کے ہمراہ جیل کے پھاٹک سے اندر داخل ہوا - پیپل کی گھنی چھاؤں میں سُرنگ کے دہانے کو لوہے کی ایک مضبوط چادر سے بند کیا گیا تھا - اور یہی وہ سُرنگ تھی ، جس کی ایک شاخ میں بھاگلپور میں دیکھ چکا تھا - اور جس کی راہ سے ، بدنصیب میر قاسم اپنی شکست کا سامان دیکھ کر فرار ہونے پر مجبور ہو گیا تھا - میں نے اُس میں اترنا چاہا ، مگر وارڈر نے منع کر دیا - کہ اس میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں - کیونکہ سُرنگ جابجا شکستہ ہو چکی ہے - اور زہریلی گیس سے بھری ہوئی ہے - فوراً مجھے میر قاسم کے دو معصوم بچے یاد آ گئے جن کی حسرت ناک موت مجھے آج تک خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیتی ہے -

غدار میر جعفر جب سراج الدولہ کو دھوکہ دے کر انگریزوں سے مل گیا ، اور اُنہوں نے اُسے بہار و بنگال کا نواب بنا دیا - تو اُس کی حکومت شطرنج کے مہرے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی - کیونکہ لارڈ کلایو نے اپنی فطری چالاکی سے کام لیکر تمام املاک اور نظم و نسق پر اپنا قبضہ کر لیا تھا - اور میر جعفر برائے نام نواب تھا - مگر میر جعفر کا داماد میر قاسم جو شروع سے ہی بہادر اور خوددار شخص تھا - جب تخت پر بیٹھا تو اُسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ وہ لارڈ کلایو کے ہاتھ میں کاٹھ پتلی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا - تو اُس نے اپنے ملک کو فرنگی اثر سے محفوظ کرنے کے موقعے سوچنے شروع کر دیئے - مگر اپنے حقوق کی واپسی اور آزادی کے لئے جدوجہد وہ مرشد آباد میں رہ کر نہ کر سکتا تھا - اس لئے اُس نے سب سے پہلے تو اپنا دار الخلافہ مونگیر کو بنایا - اور اس تحریک میں شاہ اودھ اور شاہ دہلی دونوں اس کے ہمراز و مددگار تھے - فوج کی بھرتی کے بعد اُس نے مونگیر میں ایک شاندار اور مضبوط قلعے کی بنیاد ڈال دی - سامان حرب کافی تعداد میں جمع کیا جا چکا تھا - مگر اُنکی ان تیاریوں کی اطلاع قبل از وقت ہی لارڈ کلایو کو ہو گئی - اور وہ ایک کثیر فوج لیکر مونگیر کے نواح میں پہونچ گیا - جب اُسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ میر قاسم انگریزوں ہی سے لڑنے کی تیاریاں کر رہا ہے - تو اُس نے حملہ کر دیا - نواب کی فوج نے کمال بے جگری سے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا - مگر آخر کو قلعہ بند ہو گئی - اور انگریزی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا - اِکّے دُکّے حملے ہوتے رہے - مگر کوئی فیصلہ کن جنگ نہ ہو سکی - کئی روز تک محاصرہ جاری رہا - اور آخر کار قلعے کا دروازہ توڑ کر انگریزی فوج اندر داخل ہو گئی - اور قتل و خون کا معرکہ ہونے لگا - حریفین نے خوب ہی داد شجاعت دی - میر قاسم اُس وقت اپنے سپہ سالار کو کچھ ہدایات دے رہا تھا کہ یہ دلشکن خبر پہنچی کہ محل کے وزیر سپہ سالار نے اُسے فرار ہونے کی رائے دی - پہلے تو اُس نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا - مگر موقع نازک تھا - اور مصلحت کا تقاضہ یہی تھا - کہ اُسے کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچانی چاہیئے - زندہ رہنے پر وہ پھر بھی کسی وقت اپنے ملک کو واپس لینے کے لئے جدوجہد کر سکتا تھا - اگر وہ اس وقت بھاگنے سے انکار کر دیتا ، تو نتیجہ معلوم تھا - قید ہو جانے کے بعد خدا معلوم فاتح فوج اُس کے ساتھ کیا سلوک کرتی - جانے سے پہلے اُس نے تمام بچوں اور بیگم سے ملنا چاہا - مگر غنیم کی فوج پہلے ہی محل پر قبضہ کر چکی تھی ۔ اپنے معتمد نوکر اور بچوں کے اتالیق کو کچھ ہدایات دے کر بدنصیب نواب سُرنگ میں اتر گیا - کچھ عرصہ بعد جیسے ہی نوکر بچوں کو ہمراہ لیکر سُرنگ کی طرف آیا - تو اُس نے انگریزی فوج کے سپاہیوں کو شکاری کتوں کی طرح ہر چہار طرف گھومتے دیکھا - اُس نے بچوں کو جو اس مصیبت سے بے خبر تھے ایک مخفی مقام پر چھپا دیا - اور خود کسی اچھے سے موقع کا منتظر رہا - رات کے دوسرے پہر اُس نے خوابیدہ بچوں کو گود میں اُٹھا لیا - اور بچتا بچاتا سُرنگ میں اُتر گیا اور دروازہ بند کر دیا - اُس نازک موقع پر نوکر کی جسارت اور بہادری حقیقت میں ایک قابل ستائش فعل تھا - آج ایسے وفادار نوکروں کا ملنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے - کیونکہ میر قاسم اور اُس کے بچوں کے لئے انعام کا اعلان ہو چکا تھا - ناز و نعمت میں پلے ہوئے بچے سنگین اندھیرے میں گھبرا رہے تھے - اُدھر میر قاسم دریا کے اُس پار ایک جھونپڑی میں بیٹھا ہوا نوکر اور بچوں کا انتظار کر رہا تھا - بار بار باہر نکل کر دیکھتا - مگر اُن کو نہ آنا تھا اور نہ آئے - گھنٹوں پر گھنٹے گذر گئے - انتظار کی سختی سے گھبرا کر اور بچوں کی طرف سے مایوس ہو کر بدنصیب نواب کسی طرف کو نکل گیا -

---

بچوں کو لیکر جب نوکر سُرنگ کے باہر نکلا ، تو اُسے نہ تو حسب وعدہ میر قاسم ہی ملا ، اور نہ ہی کشتی کا کہیں نشان ملا - وہ کافی عرصہ تک اُس کی تلاش میں ادھر اُدھر گھومتا رہا - مگر ناکام رہا - اُسے خیال گذرا ، ممکن ہے دیر ہو جانے کی وجہ سے نواب پھر لوٹ کر قلعے میں چلا گیا ہو - اُس نے بچوں کو ایک محفوظ جگہ پر بٹھا دیا اور جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے وہ نواب کی تلاش میں پھر سُرنگ میں داخل ہو گیا - سُرنگ کا دہانہ قلعے کے اندر قبرستان میں

ایک پیپل کے درخت کے پاس تھا، اُس نے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ مگر بدقسمتی سے پہرہ دار کی نظر پڑ گئی۔ انہوں نے لاکھ پوچھا، دھمکایا، مگر اس نے نواب یا بچوں کے بارے میں کچھ بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ سُرنگ کا دروازہ بھی نہ بتایا۔ نتیجتاً گرفتار کر لیا گیا۔

بچے بڑی بے صبری سے اپنے اتالیق کا انتظار کر رہے تھے۔ جو جلد ہی آنے کا وعدہ کر گیا تھا، مگر ابھی تک اُس کا کہیں پتہ نہ تھا، منتظر نگاہیں ہر آہٹ پر اپنے نجات دہندہ کی تلاش میں اُٹھ جاتی تھیں۔ مگر ناکام لوٹتیں۔ جب کافی عرصہ گذر گیا تو گلُ (لڑکے کا نام) نے گٹھڑی کھولی، جو آتے وقت نوکر اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور اس میں سے شیر کی کھال کا لباس نکال کر پہنا، شاید بھیس بدلنے کی نیت سے ہی یہ کپڑے لائے گئے تھے۔ اور ہاتھ میں ستار لیکر سُرنگ کی طرف بڑھا۔ اور اپنی بہن صنوبر کو تسلی دیتا گیا کہ تم یہاں ٹھیرو، میں ابھی آیا اور مجّی (نوکر کا نام) کو ڈھونڈ لاتا ہوں۔" یہ سُنتے ہی غریب کا ننھا سا دل سینے میں لرز کر رہ گیا۔ باپ کی جدائی، مجّی سے معتمد نوکر کی گمشدگی، تنہائی اور رات کا سناٹا۔ اس پر طرّہ اُس کا عزیز بھائی بھی ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ پہلے تو وہ خاموشی سے اُسے کھڑی دیکھتی رہی، پھر دوڑ کر اُس سے لپٹ گئی، اور اُسے جانے سے روکنے لگی۔

"نہ جاؤ بھیّا! مجھے اکیلے میں بہت ڈر لگے گا" وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔

"پگلی ہوئی ہو" گلُ بولا "میں ابھی لوٹ آؤنگا۔ اس میں خوف کی کون سی بات ہے........ اور پھر ہم لوگ یونہی اُن کے انتظار میں کب تک بیٹھے رہیں گے؟"

"یہ دیکھو!..... میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے" وہ اپنی آخری کوشش اُسے روکنے کیلئے کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے خوف ہے کہ میں تمہیں پھر...... دیکھ نہ سکوں گی........"

گلُ بےچین سا ہو گیا، اور صنوبر اُس کے سینے سے لگ کر سسکیاں لے کر رونے لگی۔ اُس نے اُسے دلاسہ دینا چاہا۔ مگر الفاظ ہی نہ ملتے تھے۔ پھر آنسوؤں کا ایک پھندا سا اُس کے اپنے گلے میں بھی پڑا ہوا تھا۔ آخر کار اُس نے محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھ سے اُسے دیکھتا ہوا سُرنگ میں داخل ہو گیا، اور صنوبر سسکیاں لیتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی۔

میر قاسم کے ڈوب کر مر جانے کی خبر پا کر انگریزی فوج اطمینان سے خواب نوشین کے مزے لے رہی تھی۔ گلُ ٹھوکریں کھاتا ہوا سُرنگ کے تنگ و تاریک راستے میں بڑھا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ سُرنگ کے دہانے کے قریب پہنچ گیا جس کو اُس نے معمولی سی کوشش کے بعد کھول لیا۔ اور باہر نکل کر وہ قبرستان میں سے ہوتا ہوا اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ بدنصیب باپ جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا، یہاں موجود نہ تھا، اور مجّی کا بھی کہیں پتہ نہ تھا۔ فراق و غم نے اُسے نیم پاگل کر دیا۔ اور جہاں تک اُس سے ہو سکا۔ وہ تلاش میں سرگرم رہا۔ مگر جب باوجود کوشش کے اُسے دونوں میں سے کوئی بھی نہ مل سکا، تو پھر لوٹ کر سُرنگ کی طرف بڑھا۔

بچپن سے ہی اُسے علم موسیقی سے بہت شوق تھا، بنگال میں اس فن کو جو اہمیت اور وقعت حاصل ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کو موسیقی کی طرف مائل دیکھ کر نواب نے ایک ماہر فن موسیقی داں کو اُس کی تربیت کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ جس نے کچھ ہی عرصے میں اُسے اس فن میں طاق کر دیا تھا....

.... یہ بات بار بار تجربہ میں آ چکی ہے کہ مجبور و مغموم انسان رنج و غم کی تاب نہ لا کر بجائے رونے کے اپنے دل کی بھڑاس اور اپنے جذبات کا اظہار درد بھرے نغموں سے کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس کُلیے نے یہاں بھی کام کیا........ ٹھنڈی ہوا۔ کامل سکوت، ماضی کے خوشگوار زمانے کی یاد۔ اور مستقبل کے ہولناک تصوّر نے نواب زادہ کو سوز و غم میں ڈوبے ہوئے نغمے بلند کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ستار کو سنبھالا۔ اور پیپل کی جڑ پر بیٹھ کر اُس پر اُنگلیاں چلانے لگا۔ ستار کی محویت طاری کر دینے والی آواز اور غم نصیب نوابزادے کے مضطرب کر دینے والے نغموں نے فضائے سکوت کو گرما دیا۔ آواز لحظہ بہ لحظہ بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ اور اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ موجودات عالم اور فطرت کی ہر شئے اُس کی آواز کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ رقص کر رہی ہے۔

انگریزی فوج کے سپاہی خواب غفلت سے بیدار ہو گئے، اور رائفلیں سنبھالے ہوئے آواز کی طرف بڑھنے لگے۔ چاند آہستہ آہستہ اُفق سے طلوع ہو رہا تھا۔ دور ہی سے اُنہوں نے پیپل کی جڑ پر کسی سماوی مخلوق کو محو مضراب دیکھا۔ جو ایک ہی گت کو بار بار بجا کر گا رہا تھا۔ گت ختم ہو گئی اور اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ وہ افسردگی کے عالم میں اُٹھا۔ اور ستار بغل میں دبا کر آہستہ آہستہ سُرنگ کے دہانے کی طرف بڑھا۔ لارڈ کلائیو ایسے وقت میں پہنچا، جب کہ اندھیرے میں بدنصیب نوابزادہ ٹھوکر کھا کر گر جانے کی وجہ سے جھک کر گھٹنے کو سہلا رہا تھا۔ اس نے لباس کو دیکھ کر یہی خیال کیا کہ کوئی شیر ہے۔ اور پھر سرعت سے اُس کی طرف بڑھا۔ جب نوابزادہ چونک کر پیچھے کی طرف گھوما۔ اور پھر متعاقبین سے آگاہ ہو کر

سُرنگ کی طرف دوڑا۔ تو کلا یو نے رائفل داغ دی۔ ایک مدھم سی چیخ فضائے سکوت کو چیرتی ہوئی آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ سب سپاہی مُردہ شیر کی لاش کی طرف دوڑے۔

"آہ ..... یہ کیا!" کلایو گھٹنے ٹیک کر لاش پر جھکتے ہوئے بولا۔ "یہ شیر تو نہیں ..... بلکہ ..... کوئی ساوی مخلوق ہے۔ جسے میں نے شیر سمجھ کر مار دیا ......" اُس نے آہستگی سے اُس کا سر اُٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا اور پھر کہنے لگا "خدایا مجھے معاف کر۔ میں نے ایک ناقابل معافی گناہ کیا ہے۔ ایسا حسین اور معصوم بچہ ..... اور میری گولی کا نشانہ بنا ......" وہ ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

گولی ٹھیک بائیں پہلو کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ نرم و نازک ہاتھ میں ابھی تک ستار تھاما ہوا تھا۔ جس کسی نے دیکھا اُس کی بے وقت اور حیرت خیز موت پر متاسف ہوا۔ اور کئی ایک تو اس زہرہ گداز منظر سے اتنے متاثر ہوئے کہ آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔ اور کلایو اسے ابھی تک غیر ارضی مخلوق سمجھ رہا تھا۔ اور اگلی صبح اُسے عزت و احترام کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔

ساری رات اور دوسرا دن تنہائی میں انتظار کرتے کرتے معصوم بچی نے گزار دیا۔ اُسے کامل امید تھی کہ میرا پیارا بھائی ابھی میرے مہربان اتا کو لیکر آئے گا۔ مگر وائے ناکامی اُس کی یہ آرزو شرمندۂ تکمیل نہ ہوئی۔ اس صبر آزما انتظار کا اندازہ کچھ وہی کر سکتے ہیں جن کو ایسی ہی ناکامی و نامرادی میں اپنے کسی عزیز کی آمد کا انتظار رہا ہو۔ اور ایسے ہی مصائب کا سامنا ہوا ہو۔ مگر میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس ہولناک واقعے کا تصور بھی کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ سات آٹھ سالہ معصوم سی جان۔ غم و الم کے پہاڑ۔ بھائی اور باپ کی جدائی۔ ڈراؤنی اور بھیانک رات۔ جنگلی جانور کرخت آوازیں نکالتے ہوئے اور شور برپا کرتے ہوئے پاس سے گذرتے تو ننھا سا دل پہلو میں زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ وہ خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیتی۔ اور موت ...... بھیانک موت اُسے اپنے گرد منڈلاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ خوف و دہشت اور غم و ہراس کے مارے نیند یکسر موقوف تھی۔ بھوک کے مارے آنکھوں کے آگے تارے سے اُڑ رہے تھے۔ پیارے باپ سے ملے ہوئے تیسرا دن تھا۔ مہربان چچی جو بمنزلہ باپ کے تھا، وہ بھی ساتھ چھوڑ کر چلتا بنا۔ ایک غمگسار بھائی تھا جو اوّل الذکر کی تلاش میں ایسا گیا کہ خود بھی نہ لوٹا ...... وہ ان کا فضول ہی انتظار کر رہی تھی۔ اے کاش اُس کو معلوم ہوتا کہ باپ سے ملنا امر محال۔ نوکر جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بند، اور ..... جان سے پیارا بھائی گوشۂ لحد میں ابدی نیند سو رہا تھا۔ جس سے بیدار کرنا انسانی قوت میں نہ تھا۔ مگر وہ ابھی تک انتظار کر رہی تھی۔ اور آنکھ اب بھی پھڑک رہی تھی۔

دوسری رات مصیبت آزما گھڑیوں کی تاب نہ لا کر وہ خود اُن کی تلاش میں جانے کے لئے تیار ہوئی۔ پہلے پہل اُسے سُرنگ کی تاریکی میں بہت خوف معلوم ہوتا رہا۔ اور وہ چند قدم جا کر پھر چیخ کر باہر نکل آئی۔ مگر قانون فطرت کے مطابق وہ غم اُٹھاتے اُٹھاتے بہت حد تک دلیر ہو گئی تھی۔ اور جی مضبوط کر کے وہ سُرنگ میں اُتر گئی اور اندھیرے میں ٹٹولتے ٹٹولتے آگے بڑھنے لگی۔ تاریکی کی وجہ سے سینے میں دم گھٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا مگر اُس نے ہمت نہ ہاری۔ اور اپنے سفر کو جاری رکھا۔ سُرنگ کے دہانے کے قریب پہنچی تو دروازہ بند پایا۔ نرم و نازک ہاتھوں نے اُس رات وہ دلیری اور مشقت کا کام کر دکھایا۔ جو شاید ناز و نعمت کے پلے ہوئے نوجوان بھی نہ کر سکیں۔ اپنی پوری قوت سے کام لیکر اُس نے دروازہ کا پٹ کھول دیا۔ اور باہر نکل آئی۔ چار سُو اندھیرا تھا۔ آدھی سے زیادہ رات گذر چکی تھی۔ کانٹوں اور جھاڑیوں سے اُلجھتی ہوئی وہ آگے بڑھنے لگی۔ آخر کار وہ ایک کھلے میدان میں پہنچ گئی۔ اور اپنے بھائی کا نام لیکر آوازیں دینا شروع کر دیں۔ رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی، اُس کی آواز بلند ہوئی۔ انگریزی فوج کے خوابیدہ سپاہی چونک کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بندوقیں سنبھالے ہوئے آواز کے رُخ پر بڑھنے لگے۔ اندھیرے کے مارے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ بدنصیب لڑکی گرد و پیش کے حالات سے بے خبر اپنے بھائی، باپ اور اپنے مہربان اتالیق کا نام لے لیکر آوازیں دئے جا رہی تھی۔ مگر اُس کی اپنی آواز کے سوا جواب میں کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر وہ پیپل کی جڑ کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ جہاں پر کل رات اُس کا بھائی سوز و ساز میں مصروف تھا۔ اُسے اپنی پشت پر کچھ کھٹکا سا محسوس ہوا۔ اُس نے گھوم کر دیکھا تو لالٹین کی دھیمی روشنی نے عجیب و غریب نقشہ اُس کے سامنے پیش کر دیا اور وہ جان کے خوف سے چیخ کر سُرنگ کے دہانے کی طرف بھاگی۔ پیشتر اس کے کہ وہ دروازے تک پہنچے، رائفل کی گولی نے اُسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ فائر کی آواز سے قلعے میں ہل چل سی مچ گئی۔ تمام سپاہی اندھا دھند ہتیار لیکر اُس مقام کی طرف بھاگے، جہاں بدنصیب نوابزادی گولی کھا کر گری تھی۔ اور سب سے پہلے جو شخص لاش کے پاس پہنچا، وہ کلایو تھا۔ جیسے ہی اُس نے اپنے ہاتھ کی بتی کو اوپر اُٹھا کر لاش پر ایک نظر ڈالی۔ تو بے اختیار اُس کے مُنہ سے نکل گیا:-

"آہ میرے خدا ! یہ خواب ہے یا حقیقت !! کل ہی تو یہ بدنصیب مخلوق میری گولی کا نشانہ بنی تھی - اور آج پھر کہاں سے آ گئی" اتنے میں بہت سے سپاہی بتیاں لیکر لاش کے گرد جمع ہو گئے ، اور جھک جھک کر دیکھنے لگے -

" اگر یہ کوئی غیر ارضی مخلوق نہیں ،" کلائیو اپنی پریشانی کو خشک کرتے ہوئے بولا " تو پھر کس بدنصیب کی آوارہ بخت روح ہے - جو رات کی تنہائیوں میں درد بھرے نغمے بکھیرتی پھرتی ہے ... کل بھی اسے قبرستان میں ہی دیکھا ..... آج پھر یہ اسی جگہ طواف کرتی ہوئی پائی گئی ..... آخر اسے کس کی تلاش ہے ......" اُس نے پہلی رات کی طرح پھر اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور افسوس بھرے لہجے میں بولا :

" چہرے پر کتنی معصومیت برس رہی ہے ، اور نقاہت بھی .... اگر یہ کوئی انسانی بچہ ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سے حسین انسانی بچے کا ہونا ممکن نہیں ......" وہ اُس کے پریشان بالوں میں انگلیاں چلانے لگا - اور پسلی کے پاس سے سرخ خون کی دھار بہ کر زمین پر جمع ہو رہی تھی -

" آج اس نے لباس بھی تو بدلا ہے " ایک افسر نے اُس کے ریشمی لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا -

" کچھ بھی ہو ،" دوسرا بولا - " لباس چاہے کسی قسم کا پہنے - مگر ہماری نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتیں - اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہی ہے جسے کل ہم نے دفن کیا تھا " —— " بیشک یہ وہی ہے " سب سپاہی بول اُٹھے -

حقیقت میں دونوں بھائی بہن شکل و صورت میں مبالغے کی حد تک ملتے جلتے تھے - بعض اوقات ماں باپ اور نوکروں تک کو مغالطہ ہو جاتا تھا کہ گُل کون ہے اور کون صنوبر !!!

اگلی صبح بڑے احترام کے ساتھ اس کے بھائی کی بغل میں قبر کھود کر میر قاسم کے سرمایۂ حیات اور نخل تمنا کے آخری خوبصورت ثمر کو سپرد خاک کر دیا گیا - اور اِس مضمون کا کتبہ لارڈ کلائیو نے اُن کے قبروں پر نصب کر دیا -

" کلائیو نے اپنی عمر میں دو بیگناہوں کا خون کیا ہے - جس معصیت کی پرسش کے تصور سے ہی وہ کانپ جاتا ہے - حقیقت میں وہ نوری فرشتے تھے - اور سماوی مخلوق سے تعلق رکھتے تھے - میرے بے رحم ہاتھوں نے انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گلگشت جہاں سے محروم کر دیا - خدا اُن پر اور مجھ پر رحم کرے - آمین ! "

میں نے اُن کی آخری یادگاروں کو ڈھونڈنے کی لاکھ کوشش کی ، مگر ناکام رہا - کیونکہ زلزلۂ بہار نے مکان اور مکینوں کو ہی صرف پامال نہ کیا تھا بلکہ مرنے والوں کی آخری یادگاروں کو بھی اُنکے نام کے ساتھ ہی دنیا سے ناپید کر دیا تھا - .... اے کاش ! میں ان معصوم کشتگان ستم کی آخری آرامگاہوں کو دیکھ سکتا - اور اپنی عقیدت و محبت کا اظہار چند حقیر آنسوؤں اور پھولوں سے کر سکتا تھا - جن سے وہ گرچہ خود بے نیاز ہیں

ہڑبونگ سبھا

از حضرت مانپوری

یوں تو ہمارا جسم عموماً ٹھہر گیا اپنی قدامت اور مذہبی تقدس کے باعث آئے دن آل انڈیا قسم کی انجمنوں کانفرنسوں اور سبھاؤں کے سالانہ جلسوں کی آماجگاہ بنا ہی رہتا ہے لیکن گذشتہ سال آل انڈیا ہڑبونگ سبھا یعنی کسان سبھا کے جلسہ کے موقع پر جو سارا شہر چھپر کا میلہ بن گیا تھا وہ بھی ایک قابل دید تماشا تھا۔ جدھر دیکھئے ہاتھ میں لاٹھی لئے سر پر پگڑی لپیٹے کاندھے پر دوہر یا لحاف رکھے کمر کی پچھلی جانب ستو یا چوڑے کی گٹھری باندھے دیہاتیوں کی مسلسل ٹولیاں آگے آگے جھنڈا لہراتے "بدیسی راج ناس ہو۔ زمینداری ناس ہو" کا نعرہ لگاتے ہوئے دن کی طرف جا رہی ہیں۔ میں میشا کی اس بے قاعدہ فوج کے کوچ کا تماشا کمرہ کے باہر سائبان میں بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ میرے کانگریسی بلکہ کسان سبھائسٹ دوست میاں مظہر پہونچے اور آتے ہی انھوں نے کہا۔ چلتے ہو کسان سبھا کے جلسہ میں؟ میں نے انکار کیا۔ نا بھائی! کس کی شامت آئی ہے کہ اس طوفان بدتمیزی میں جا کر دھکے کھاتا پھرے۔ اسپر انھوں نے طنزاً کہا ٹھیک ہے۔ زمیندار ہو کر تم کیوں کسانوں کی ہمدردی میں شریک ہونے لگے۔ باقی رہا دھکے کھانے کا سوال تو اس کا وعدہ کہ میں اپنے ساتھ لے جا کر ڈائس پر بٹھا دونگا۔ میرے دل میں اس محشرستان کے دیکھنے کا شوق ضرور تھا لیکن دہی کس مپرسی کی وجہ سے تذبذب میں تھا۔ مظہر کے اس کہنے پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ اُن کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر کرجا کے میدان کی طرف روانہ ہو گیا۔

اب جو جلسہ گاہ کے پھاٹک پر پہونچکر دیکھتا ہوں تو بانس سے دور تک گھرے ہوئے احاطے کے اندر بھیڑ یا دھسان گھسے ہوئے دیہاتیوں کا عظیم الشان مجمع بغیر فرش کی ناہموار زمین پر بیٹھا ہوا اپنے شور و شغب سے پورے جلسہ گاہ کو مچھوا بازار بنائے ہوئے ہے۔ فرش تو خیر۔ دھوپ سے بچنے کے لئے شامیانہ تک ندارد۔ اس کھلے میدان میں "تلے آسماں کے بسیرا تھا" سب کا البتہ اُتر جانب ایک بڑے شامیانے کے نیچے مٹی کے اونچے چبوترہ پر دری بچھا کر کسان لیڈروں کے بیٹھنے کے لئے ڈائس یا اسٹیج بنایا گیا تھا۔ جس کے بیچ میں پریسیڈنٹ کے لئے اسی شامیانہ کے نیچے ایک چتر نما چھوٹا سا کارچوبی شامیانہ تھا گویا "چھوٹا سا ایک مزار کے اندر مزار تھا"۔ شہ نشین کے سامنے گنگا جمنی عطردان۔ گلاب پاش، چاندی کے طشت میں رکھے تھے۔ دونوں جانب چاندی کے عصا لئے دو مسٹنڈے دیہاتی کھدر پوش راجہ اندر کے دیو کی طرح ایک عجب شان سے کھڑے تھے۔ مظہر نے (مسکراتے ہوئے) کہا۔ یہ کارچوبی شامیانہ زرین مسند گاؤ تکیہ عطردان گلاب پاش عصا وغیرہ جو دیکھتے ہو ایک زمیندار صاحب نے کسان سبھا کے سکریٹری کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے از خود خوشامدانہ عاریتاً پیش کیا ہے۔ اس چبوترہ کے پورب اور پچھم دونوں جانب فرش زمین پر پیال بچھا کر ڈیلیگیٹوں کے لئے پھوس کا چھپرہ ڈال دیا گیا تھا جس میں ڈیلیگیٹ بے دھلے کھدر کی بھاری بھاری پگڑی باندھے بیٹھے ہوئے اپنی شان ڈیلیگیٹی نمایاں کر رہے تھے

ان سب کا جائزہ لینے کے بعد مظہر نے چاہا کہ ساتھ لے جا کر ڈائس یعنی لیڈر گاہ پر مجھے بٹھا دے۔ مگر پھاٹک سے اسٹیج تک جانے کے لئے پیال بچھا کر جو بیچ سے ایک راستہ بنایا گیا تھا۔ ناہموار زمین کے ڈھیلے گڑنے کی وجہ سے کسان بھائی سب سے پہلے اسی پر براجے۔ اس لئے اسٹیج تک پہونچنے کے لئے سروں کو پھاند کر جانے کے سوا اور کوئی

صورت ہی نہیں تھی۔ میں اور منظر اسی حیص بیص میں تھے کہ چند والنٹیروں کی نظر پڑ گئی۔ کامریڈ منظر کا مرید منظر کہتے ہی ہاتھوں ہاتھ سر نے اونہیں لے لیا اور لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتے بیچ میں راستہ بناتے ڈائس کی طرف لے چلے " بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم" کے اصول پر منظر کا دامن تھام کر دل میں یہ شعر :-

"بہیں دریائے بے پایاں۔ دریں طوفان موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسا ہا"

پڑھتا ہوا میں بھی پیچھے ہو لیا۔ مگر عام محاورہ کے مطابق تل رکھنے کی تو جگہ ہی نہیں تھی دو دو مسلم پاؤں رکھنے کی گنجائش کہاں۔ مجبوراً منظر کا دامن چھوڑ کسی کے سر۔ کسی کی گردن۔ کسی کے مونڈھے پر ہاتھ رکھنا سہارا لیتا احتیاط کے ساتھ پاؤں رکھتا ہوا آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود کسی کی ران پر پاؤں پڑ گیا تو گرگرا دین نے کہا "عجب گنوار ہے، سوجھے نا"۔ کسی کی بغلی پیڑوں کے نیچے آگئی تو بے ساختہ اسکے منہ سے نکلا "اندھیا پھوٹ گلو نہ دیکھ کے نہ چلیں جاؤ"۔ کسی کی انگلی دب گئی تو سور داس اندھا کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی چبھتے ہوئے فقرے کہہ ڈالے۔ میں اپنی شان میں کلمات خیر سنتا۔ لوگوں سے معافی مانگتا۔ جلدی جلدی اس مرحلہ کو طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور لوگوں کی کھسر پھسر کہہ رہی تھی ؎

آہستہ خرام بلکہ مخرام
زیر قدمت ہزار جان است

کامریڈ منظر تو والنٹیروں کی مدد سے کسی طرح ڈائس پر پہونچکر ہم لباس کھدر پوشوں کے ساتھ خوش گپی میں مصروف ہو گئے اور میں بے یار و مددگار بیچ منجدھار میں کھڑا اسٹیج اور والنٹیروں کی طرف نگاہِ حسرت سے دیکھ دیکھ کر دل میں یہ شعر پڑھ رہا تھا ؎

رہِ ناپید و بیم کشمکش، مجمع چنیں حائل
کجا دانند حال ما رضاکاران محفل ہا

میں نے سوچا کہ جب اتنی ذلت و رسوائی کیساتھ نصف راہ طے کر کے آدھی مصیبت ختم کر چکا ہوں تو ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔ چند سخت و سست جملے اور سہی۔ آگے بڑھ کر پیچھے قدم ہٹانا بزدلی ہے چنانچہ ہمت کر کے ایک دیہاتی کا مونڈھا پھاند کر جیسے ہی ایک پیر آگے رکھنا چاہا کہ ایک چوڑے کی گٹھری سے جو لاٹھی میں بندھی ہوئی تھی۔ اس طرح الجھ گیا کہ گرنے سے بچنے کے لئے ایک گھٹے ہوئے سر کی ٹیک مضبوطی سے تھام لینے کے باوجود لڑھک کر ایک شخص کی پیٹھ پر آ رہا۔ وہ "باپ رے باپ ٹیک نوچائل" چلاتا ہوا الگ برا بھلا بکنے لگا اور جس کی پیٹھ پر گرا وہ جدا لڑنے پر تیار۔ اس کے اور ساتھیوں نے علیحدہ ملے دے شروع کر دی۔ کوئی بولا۔ "کتنا جوت ہو میاں جی۔ جبکہ جوم (زعم) میں سب کے سر پر کو دل چل ہیں"۔ دوسرے نے کہا "ای ہے بڑا سوکھین (شوقین) ہے کہ سب کے آگو جا کے بیٹھل چاہی ہے"۔ تیسرے نے زہر افشانی کی "نہ کھدر کے کرتا ہے نہ سر پہ گاندھی ٹوپی اور چلل جاہی لیڈرن کے ساتھ برابر بیٹھے لا"۔

غرض جو تھا حسب استطاعت کچھ نہ کچھ بدزبانی کے پھول مجھ پر نچھاور کر رہا تھا اور میری حالت گویا :-

"نرغہ میں دشمنوں کے اکیلا امام ہے"

دل ہی دل میں منظر کو کوس رہا تھا کہ اس بیہودہ نے کہاں لا کر پھنسا دیا۔ ساتھ ہی آپ اپنے اوپر بھی لعنت بھیج رہا تھا کہ کیا شامت آئی تھی کہ بیٹھے بٹھائے یہ مصیبت مول لی۔ مول کیا کہ بلکہ مفت خریدی۔ چاروں طرف سے یہ بوچھار ہو رہی تھی جس کو نہایت تحمل کے ساتھ مجبوراً برداشت کر رہا تھا اسپر ایک اور نئی آفت کا یہ اضافہ ہوا کہ اس گھٹے ہوئے سر والے ٹیک چند نے کسی کے پوچھنے پر جب کہا کہ "دیکھو نہ بھیا۔ ای مسلمنواں نے ناہک (ناحق) ہمر ٹیکیا پکڑ کے نوچے لگل"۔ یہ سنکر میں کچھ گھبرا سا گیا کہ یہ ٹکیا کہیں فلنگ کی آگ بھڑکا کر لوگوں کو مشتعل نہ کر دے۔ جلدی سے ٹیک کے وہ چند بال جو کھنچکر میرے ہاتھ میں رہ گئے تھے اوس کے سامنے پیش کر کے کہنے لگا "لے بھائی! اپنی ٹیک واپس لے لے۔ میں کھا تھوڑے ہی گیا ہوں"۔ ساتھ ہی سب کو مخاطب کر کے میں نے کہا "ایسے سمے میں جبکہ ہم سب کسان بھائی مل کر زمینداری کے مٹانے کے لئے سر تک دینے کو تیار ہیں تو معمولی ایک ٹیک کے واسطے آپس میں سر پھٹول کرنے سے کیسے کام چلے گا۔ اور پھر جب ہم کسانوں کے ہندو مسلمان لیڈر داڑھی مونچھ کے ساتھ

ٹیک بھی لگا کر آپس میں ایسے مل جل گئے ہیں کہ دونوں کی صورت شکل میں بال برابر فرق نہیں رہا تو ہم سب ڈاڑھی یا ٹیک کے واسطے بال کی کھال نکال کر کیوں جھگڑا کریں"۔ میری اس صلح جویانہ تقریر کا اچھا اثر پڑا اور فوراً ہی کسانی بھائی چارہ قائم ہو گیا۔ چنانچہ اسی وقت ایک کسان بھائی نے اپنے بٹوے سے کھینی یعنی تمباکو کی پتی نکال کر اپنی ہتھیلی پر ملتے ہوئے مجھ سے اخلاقاً فرمایا کہ "بھائی صاحب! تو ذرا پاس چنوٹی تو ہوت۔ کھینی میں ملا کے لا جرا چونا تو ڈیل جائے"۔ بھلا چنوٹی سے مجھے کیا واسطہ۔ میں نے کہا "بھائی صاحب! چنوٹی تو گھر چھوٹ گئی"۔ یہ کہہ کر جھٹ جیب سے پان کی "بٹی" نکالی اور بنے ہوئے پان سے چونا پونچھ کر کھینی کے لئے دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک دوسرے نے اپنی چنوٹی اسی طرف بڑھا دی اس وجہ سے میری پیش کش شرف قبولیت نہ حاصل کر سکی۔ اب اسی کسان بھائی نے کھینی کو چٹکی میں لیکر منہ میں رکھنے کے چند ہی منٹ بعد بیچ سے ایک پیک پھینکی جس کی چھینٹ کچھ میرے جوتے اور کچھ پاجامے کی مہری پر آ پڑی تو بیچارے نے اخلاقاً خود اپنے گرد آلود پاؤں سے پونچھ کر معذرت کرتے ہوئے کہا "ما ف (معاف) کریں گسہ (غصہ) کی بات نا ہے۔ گلتی سے (غلطی سے) پڑ گیل۔ جان کے نہ پھینکلی ہے"۔ میں نے دل میں کہا۔ جان کے کیا بلکہ نیت باندھ کر بھی پھینکتے تو ایسے نازک موقع پر مجھے غصہ تھوک دینے کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک دوسرے کسان بھائی نے از راہِ اخلاق میری طرف بیڑی بڑھاتے ہوئے کہا "ذرا ماچس تو نکالی بھائی صاحب" میں نے اس اخلاق کا جواب یوں دیا کہ جیب سے نکالکر صرف سلائی کی ڈبیا ہی نہیں بلکہ پاسنگ شو سے بھرا ہوا سگرٹ کیس بھی حوالے کر دیا۔ میں نے سمجھا تھا کہ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو سگرٹ لے کر واپس کر دیگا۔ مگر اس نے میرے اخلاق کو جو صرف اسی تک محدود تھا اور زیادہ وسیع کر دیا یعنی اپنے اور ساتھیوں کے سامنے بھی پیش کر کے پورا سگرٹ کیس خالی کرانے کے بعد مجھے واپس کیا۔ اسی کو میں نے غنیمت سمجھا اگرچہ نا یا کھینی رکھنے کے لئے کسان بھائی کا مال سمجھ کر کوئی کسان بھائی لے لیتا تو اپنے برادران یوسف کے سامنے میں کیا ہوتا۔ اس پر یہ ارشاد ہوا "ای سگریٹ میں اد مجا کہاں۔ آدمی سگریٹ پیئے تو ہوا گانڑی دالا کہ ایک ایک ہی کس (کش) میں منہ دھواں سے بھر جائے"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ "انقلاب زندہ باد۔ زمیندار ناس" کے نعرہ کی آواز سنکر سب سمجھے کہ سبھاپتی آ گئے۔ پورے جلسہ میں کھلبلی مچ گئی مگر جب یہ معلوم ہوا کہ ایک دوسرے لیڈر کی آمد پر یہ نعرہ بلند ہوا تھا۔ سبھاپتی کے آنے میں دیر ہے تو پھر اطمینان سے اب رعایا اور زمیندار کے تعلقات پر گفتگو ہونے لگی۔ مزید بے تکلفی بڑھانے کے خیال سے میں نے ان میں کئی آدمیوں کے نام و پتہ بھی دریافت کر لئے۔ بھائی بدھن گوپ نے مجھ سے پوچھا "کہئے بھائی صاحب! تو ہر مالک کے جور ظلم (زور ظلم) کے کا حال ہے۔ دودھ۔ گھی۔ بیگاری۔ جرمانہ طلبانہ۔ سب اموکوف (موقوف) بھیل کی اب تک باکی ہے (باقی ہے)"۔ جی تو چاہا کہ اپنی حیثیت ظاہر کرنے کے بعد کہدوں کہ میرا کون مالک ہوگا۔ خدا کے فضل سے میں تو خود بلا شرکت غیرے اپنے مواضعات کا مالک ہوں۔ باقی رہا دودھ گھی اور جرمانہ طلبانہ۔ بیگاری وغیرہ تو اسامی کی کیا مجال جو چوں بھی کرے۔ گھر نہ اجاڑ دوں تو زمیندار نام نہیں، مگر ایسے موقع پر ان صحیح واقعات کو ظاہر کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ اس لئے میں نے دوسرے پہلو سے کہنا شروع کیا۔

میں :۔ بھائی صاحب! بات اصل یہ ہے کہ میرے یہاں کے زمیندار ذرا بگڑے دل واقع ہوئے ہیں اور ان کے گماشتہ براہل بھی ویسے ہی کڑے مزاج کے ہیں۔ ذرا کسی نے عذر کیا اور جوتا برسنا شروع ہو گیا اور یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ مار کے آگے بھوت بھی بھاگتا ہے۔ ہم سب تو آخر آدمی ہیں۔

رگھو سنگھ :۔ سب اسامی آپس میں بندش کر کے کریا کسم (قسم) کھا کے ایک رائے ہو جائیں تو براہل۔ گماشتہ کے مجال ہے کہ کوئی رعیت پر جلم (ظلم) کرے اور اگر کچھ چیں چپڑ کرے تو او کرا ایسن ٹھوک دیل جائے کہ سب حکومتے بھول جائے۔ بلا اس کے ای ناجائج (ناجائز) رسم رسوم اٹھنے والا نا ہے۔

میں :۔ بات تو ٹھیک ہے لیکن فوجداری کرنے اور عملوں کو مارنے پیٹنے کے بعد زمینداری کے طلبانہ جرمانہ سے کہیں زیادہ خرچ پولیس کے رسم رسوم نذرانہ سلامی پر بیٹھ جاتا ہے۔

سرجو پانڈے :۔ پولیس کے تو بات ہی دوسر ہے۔ او حاکم ہو کر اپن نجر (نذر) سلامی کاہے چھوڑے مگر جمیندار (زمیندار) کے ناجائج (ناجائز) رکم (رقم) لے وے کا کا ہک (حق) ہے۔

پھکت (فقط) اپن مالگجاری سے اوکرا سروکار۔ اوبھی سال بھر کھا پی کے۔ سادی بیاہ۔ کیڑہ لتہ کے بعد اگر بچل اور کسان کے حق میں آئل تو مالگجاری کچھ اداتے کر دیت نہیں تو جمیندار کے ناس کرنے کھیت نیلام کراوے کے سوا اور کا اکھتیاری (اختیاری) کا ہے کی کانگریسی گورمنٹ میں تو نیلامی (نیلامی) کھیت پر ٹپر کبجہ (قبضہ) دلائی دیل جائی۔ پھر تو جمیندار سرون کہ بھیک مانگے نہ ملت۔

نتھو اہیر:۔ (خوش ہوکر) کسان راج میں سب جمیندارن کے گردن میں ہر (ہل) باندھ کے کھود کاس (خود کاشت) جوتاول جائے تو بڑا مجا (مزہ) آوے۔

ایک زمیندار کے سامنے زمینداروں کی ایسی توہین آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر غصہ آور بات تھی۔ جی میں کہا۔ کاش! اس وقت ہوتا میرے ساتھ برا ہل اور یہ سب مردود میرے اسامی اور نہ ہوتی کانگریس حکومت تو مشک باندھ کر خوب پٹوا تا اور ہل پھال بھی چھین کر ضبط کرالیتا۔ پھر دیکھتے زمینداروں سے ہل جتوانے کا منصوبہ۔ لیکن کسان سبھا کے اندر اتنے کسانوں کے بھیڑ میں اس کا موقع کہاں تھا مجبوراً جواب جاہلاں باشد خموشی پر عمل کر کے بحالت مجبوری اپنے غصہ کو فرو کر ہی رہا تھا کہ سکرما نجھی نے منگر مہتو کو مخاطب کر کے کہا۔

سکرمانجھی:۔ بھائی منگر مہتو۔ تورا تو مکدمہ (مقدمہ) کے پیری (پیروی) میں سہر میں برابر آمدرپھت (آمد و رفت) لگل رہبے کرد ہوا اور توہرا اکھبار (اخبار) کے کھبر (خبر) کے بھی بڑا سوکھ (شوق) ہو۔ اہی تو بتائی کہ اکھبار میں کسان راج کب تک ہوے کے کھبر (خبر) ہی

منگر مہتو:۔ (واقف کارانہ شان سے) ارے بھائی! سوباس بابو کو مہاتما جی کانگریس سے نکال دیہن ہل تو کسان راج کب نہ ہو جائیت ہل۔ کا ہے تیواری جی۔ مکتیار (مختار) صاحب تورا سامنے نہ گاندھی جی اور سوباس بابو کے جھگڑا کا کھسہ (قصہ) کہر ہل تھن ہل۔

تیواری جی:۔ مہاتما جی کا کہنا ہے کہ اچھوت ادھار ہم کریں۔ کھدر پرچار ہم کریں۔ لنگوٹی ہم پہنیں۔ بات بات پر برت ہم رکھیں۔ دیہات سدھار ہم کریں۔ پھن (پھر) ای سوباس بابو بیچ میں کود کے کسان کے ہمدرد (طرفدار) بن کے جنتا کے لیڈر بننے والا کون اور سب کے سردار بنے والے انگریج (انگریز) بہادر کے کھلاپھ (خلاف) جو جہر (زہر) اگلتے پھرتے ہیں۔ دیکھوں تو کیسے ہندوستان سے سرکار بہادر کو نکال کے سب کے لیڈر بن جاتن۔

بُدھن گوپ:۔ تو توہرا کہے کے مطلب (مطلب) ای ہے کہ انگریج (انگریز) بہادر کے میل میں گاندھی جی اکیلن ہیں؟

منگر مہتو:۔ مہاتما جی کا سوچنا بھی ایک طرح ٹھیکے ہے کہ جادہ (زیادہ) دِک (دق) کرے سے کہوں سرکار بہادر گسہ (غصہ) میں ہندوستان چھوڑ چھاڑ کر اپن ملک چل گیل (چلے گئے) اور دوسر پردیسی راج توپ بندوک لیکے کبجہ (قبضہ) کرے واسطے ہندوستان پر چڑھ دوڑل تو ہم سب دسمن بھوج (فوج) کے آنکھ میں چرکھہ (چرخہ) کے ٹکوا بھونک بھونک کے مکابلا (مقابلہ) تو کر نہ سکی۔ ای واسطے تک ہر ملک کے بھوج (فوج) لوگ نن بلینس (نون وائلنس) کا کسم (قسم) کھاکے لڑائی جھگڑا سے باج (باز) نہ آدیں اوکھڑی ملک ہندوستان کے حپھاجت (حفاظت) واسطے انگریج بہادر کا رہنا جروری ہے اور انگریجی سرکار کے رہے سے مہاتما جی کا ننکسان (نقصان) کا ہے۔ اُنکر حکم رکم چل ہی رہل ہے۔ چھوٹے لاٹ سے بڑا لاٹ تک بلا بلا کے صلاح لے تے ہی رہن ہیں۔ پھن سرکار سے مپھت (مفت) سوباس بابو کے جوگ (طرح) لڑائی لیوے سے کا پھائدہ (فائدہ)

رگھو سنگھ:۔ سنا ہے کہ سوباس بابو کے ساتھ کوئی بوس بابو بنگالی بھی انگریجی سرکار کے کھلاپھ لکچر دئے چل رہت ہن (لکچر دیتے چلتے ہیں)۔

منگر مہتو:۔ (اُسی واقف کارانہ شان سے) ارے بلے کو بھ (بیوقوف) سوباس بابو اور بوس بابو دونوں ایکے ہیں۔ اصل نام سوباس بابو اور پکار و نام بوس بابو ہے جیسے گاندھی جی کا اصل نام گاندھی جی اور پکارو نام مہاتما جی ہے اسے ہی طرح سب لیڈرن کے دو دو نام ہے۔ ہم اسے نہ سب کا حال سن۔ تلم بھائی پٹیل۔ بولا بھائی دیا سلائی۔ ....

سرجو پانڈے:۔ ای دونوں تو ہر دستہ میں کیسن بھائی ہو ہتھن (کیسے بھائی ہوتے ہیں)

منگر مہتو:۔ پانڈے جی تو ایکدم نپٹ گیر جاہل ہی رہ گیلا۔ بھلا ہم بھائی کا ہے لا ہوتن (بیرے بھائی کیوں ہونے لگے) ای سب لیڈرن کے جات پات کھائے پیئے کے کچھ ٹھکانہ تو ہئی نہیں۔ انکا سے نا تا جوڑ کے کون اپن دھرم برباد کرے۔ اصل بات ای ہے کی تلم بھائی اور بولا بھائی دیاسلائی دونو آپس میں بھائی بھائی ہتھن۔ بولا بھائی بڑ بھاری بونکر لیڈر ہتھن اور تلم بھائی گاندھی جی کے منہ لگوا چیلا ہتھن جیسے مہدلی اور سوکنتلی دا دنوں

بھائی کے علی برادر نام پڑگیل ہے جیسی طرح ای دونوں بھائی کے نام کے ساتھ ہمی بھائی جوڑ دیل گیل ہے۔

مدسوھن گوپ:۔ (فخریہ انداز سے) ابھی اور نام سن۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد عرف (عرف) راجن بابو۔ بڑا کابل آدمی ہتھن۔ ڈاکٹری اکثو حرف (حرف) نہ پڑھلن ہے۔ کھالی دمہ کے دوائی کھاتے کھاتے ڈاکٹر ہوگلن اور مولانا عبدالکلام اجات (آزاد) گاندھی جی کے بڑا بھاری بھگت اور مسلمین کے بڑا بھاری پنڈت ہتھن۔ رات دن حدیثے کران (قرآن) بتاوتے رہا ہتھن۔ اور ایک ٹھو بڑا بھاری لیڈر کوئی پنڈت جی ہتھن۔ روس۔ جپان۔ سب ملک سے گھوم کے ائلن ہتھن۔ انکا کہنا ہے کہ روس کے ائسن ہندوستان میں بھی کسان راج جلدی ہونا چاہیئے۔

منگر مہتو:۔ ہم اسے سن۔ او پنڈت جی کا نام نہرو لال جواہر ہئی پنڈت تو کھالی کہلاوے کے ہتھن۔ دھرم اور م سے انکا کوئی سروکار ناہی۔ البتہ کسان کے طرفدار اور بدیسی انگریجی راج کے کھلاپھ میں سوباس بابو کے ساتھی ہتھن۔ ہما تما جی جب دیکھلن کہ سوباس بابو اور ای پنڈت جی اگر ایک رائے ہو جیتن تو ہم اکیلے رہ جائب اپن دھرتی سے پوٹ پاٹ کے پنڈت جی کے اپن ساتھ ملالے لن۔ نہیں تو سرکار بہادر ہندوستان چھوڑ چھاڑ کے کہئے نہ اپن ملک بھاگ جتئل ہل۔ کاہے کہ جرمنی سرکار کے دشمن ہئی ہے۔ روس سے لاگ ڈانٹ چلل ہی جاہے۔ جپان دھمکی دے ہی چکل ہے کہ ہمرا ایسیائی بھائی ہندوستان کو اجاد کردو نہیں تو ہم ہندوستان پر کبجہ کرلے گا۔

راگھو سنگھ:۔ مہتوجی! ای ہم نہ سمجھ لی۔ ای جپان بودھ مت کے ہے اور ہمنی سب سناتن دھرمی ہی۔ ای تو ن دونوں کے عیسائی بھائی کا کہدے لا۔

منگر مہتو (ہنس کر) تم سب پالٹیس (پولٹکس) کیا جانو۔ ارے بھائی! عیسائی نہیں ایسیائی بھائی۔ بمبئی سے پچھم یورپ وراکرے بگل جرمن پھر روس اور بلات ہے اور بمبئی سے پورب ہندوستان کلکتہ۔ چین۔ جپان اور امریکہ وگیرہ (وغیرہ) ایسیا کہلاہے۔ ای حساب سے جپان کے ہندوستانی ایسیائی بھائی ہوئن کی نا۔

مختصر یہ کہ مہتو جی اندھوں میں کانا راجہ بنے ہوئے ایک ماہر سیاسیات کی حیثیت سے لوکل پولٹکس۔ انڈین پولٹکس ہندوستانی لیڈروں کے حالات اور ان کی پالیسی۔ دنیا کی جغرافیائی پوزیشن پر تبصرہ کرتے کرتے فارن پولٹکس اور سلطنتوں کے بین الاقوامی تعلقات پر روشنی ڈال ہی رہے تھے کہ پھر انقلاب زندہ باد۔ کسان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں نے سب کی توجہ اس طرف پھیری اور اس سلسلۂ تقریر کو درہم برہم کر دیا ورنہ خدا جانے ابھی اور کیا کیا سیاسی معلومات کا خزانہ لٹایا جاتا۔ پریسیڈنٹ کی آمد کی اطلاع ملتے ہی پورا مجمع زندہ باد۔ مردہ باد کا نعرہ لگاتا ہوا سبھاپتی کو دیکھنے کھڑا ہو گیا اور شوق دیدار میں ایک دوسرے پر اس طرح گرنے لگا کہ سارے جلسہ میں ایک ہڑبونگ مچ گئی۔ سبھا پتی کے ڈائس پر آنے کے بعد بھی پندرہ منٹ تک وہ ہنگامہ و شور برپا رہا کہ خدا کی پناہ! مسلسل بدیسی راج ناس۔ شیطانی گورنمنٹ ناس۔ زمیندار ناس۔ زمینداری ناس کا نعرہ اتنے زوروں سے بلند ہوا کہ گھبرا کر رد بلا کے طور پر میں بھی سورہ ناس پڑھنے لگا۔ اس طرح ان ستیا ناسیوں کے ناس میں میں بھی ہم آواز ہو گیا۔ اسٹیج سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ کی کئی ہدایت کے بعد جب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے لگے تو "ای ہمار ہے۔ ارے ہم کہاں جائیں۔ لے ہم موڑ یا پر بیٹھ گئیل۔ دیکھے نا ہمرا جگہیا (جگہ) پر کبجہ کرلے لک" کا ہنگامہ شروع ہوا۔ پھر اسی لاوڈ اسپیکر کے ذریعہ خاموش۔ خاموش کی آواز آئی تو اب ہر شخص ایک دوسرے کو چپ رہنے کی چلا چلا کر ہدایت کرنے لگا۔ جس کی وجہ سے خاموش چپ۔ ہلا مت کرو۔ شور بند کرو کی آواز دیر تک ہر طرف سے آتی رہی۔ آخر خدا خدا کر کے یہ خاموش کرنیوالا شور قدرے کم ہوا تو کسانوں کے مہاراجہ سبھاپتی بہادر! پھولوں کے بھاری بھاری گجرے۔ جس میں نوٹے فی صدی گیندے اور سورج مکھی کے پھول تھے گلے میں ڈالے اپنے سنگھاسن سے اٹھے اور اسی مردہ باد زندہ باد کے شور میں سامنے اسٹیج پر آکر خطبۂ صدارت شروع کر دیا۔ دس پندرہ ہی منٹ گذرے ہونگے کہ آپس میں یہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

مدسوھن گوپ:۔ سبھاپتی جی یہ رامائن کا پڑھ رہی ہیں۔

سکر مانجھی:۔ رامائن نہیں بھگوت گیتا سو جھاہو۔

نھوا میر:۔ ہم اجانئے تو بید کے اسلوک پڑھ رہی ہیں۔

منگر مہتو:۔ تم سبھے تو اکل (عقل) سے کچھ سروکار تے ناہی ارے بھائی! یہاں پوجا پاٹ ای گھڑی تھوڑے ہو رہل ہے کہ گیتا اور بید پڑھل جائے۔ یہ جو سبھاپتی جی پھرمار (فرما) رہلن ہیں یہ اکرا اڈریس کہل جاہے۔ ای میں ہم سب کسان کے بھلائی کی

بات چیت ہو۔

بدھن گوپ:- تو جب کسان کے بھلائی کی بات ہے تو ہم سب کے بولی میں کاہے نہ سمجھائیں۔ ایسن پنڈتائی جبان میں بولے کما کا پھائدہ جیکرا (جس کو) کوئی نہ سمجھے۔

اب ان ناسمجھوں کو کون سمجھائے کہ ہم لوگوں کی بھاشا زبان صرف ہندوستانی نہیں بلکہ اسّی فیصدی عربی و فارسی کے بگڑے ہوئے الفاظ کے غلط تلفظ سے بنی ہے اور سبھاپتی جی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندی سہابتیا سمیلن اور ناگری پرچارنی سبھا کے ممبر ہیں۔ اب صرف عوام کے سمجھنے سمجھانے کی خاطر سنسکرت پرچار کے موقع کو کیوں ہاتھ سے جانے دیں۔ مختصر یہ کہ سبھاپتی جی کی سنسکرت کے بھاری بھاری مٹھنے ہوئے الفاظ والی تقریر ختم ہونے کے بعد لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اعلان ہوا کہ بابو اودھے پرکاش کسانوں کے بہت بڑے نیتا کا لیکچر اب شروع ہوتا ہے۔ پرکاش جی بھی اسی نعرۂ ناس کے ہنگامہ کے ساتھ اسٹیج پر تشریف لائے۔ انکا لیکچر نسبتاً عام فہم تھا۔ لوگوں نے دلچسپی سے سنا اسکے بعد پھر حسب معمول سبھا کے سکریٹری نے اسی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ کہا کہ "آپ لوگ شانتی سے لیکچر سنئے۔ کامریڈ مظہر جو ایک بہت بڑے زمیندار کے ہونہار پوت ہیں۔ صرف کسانوں کی سیوا کے واسطے خاندانی زمینداری کو لات مار کر دیہات دیہات گاؤں گاؤں مارے مارے پھرتے ہیں۔ زمیندارانہ خیالات اور زمینداری کو ملک کی ترقی میں روڑا سمجھتے ہیں۔ اسی لئے تمام زمیندار برادری سے اپنا ناتہ کاٹ کر آج کسانوں میں شریک ہیں۔

اسپرویرتک زمیندار ناس۔ بدیسی راج ناس۔ شیطانی گورنمنٹ ناس کا اس طرح شور رہا کہ ناک کے بدلے کان ناس سے بھر گیا۔ جب قدرے اس بحرانی دورہ سے لوگوں کو افاقہ ہوا تو مظہر نے اسٹیج پر آکر دیوانہ رہا ہوئے بس است کا سا سماں پھر مجمع کے لئے پیدا کر دیا۔ چنانچہ اسٹیج پر آتے ہی انھوں نے پہلے ہاتھ اوٹھا کر بلند آواز سے کہا "انقلاب" مجمع نے پوری قوت سے چلا کر اس ادھورے جملہ کو زندہ باد کہہ کر پورا کیا۔ اسیطرح مظہر کے ساتھ پورے مجمع نے ہاتھ اوٹھا اوٹھا کر بآواز بلند تین بار تکبیر کی طرح نعرہ زنی کا فرض ادا کیا جس سے مجمع میں ایک خاصا جوش پیدا ہو گیا اسی جوش کے عالم میں کامریڈ مظہر کی تقریر شروع ہوئی "کسان بھائیو۔ اٹھو۔ زمینداروں کو تباہ کر ڈالو۔ انکی جائدادوں کو لوٹ لو۔ ان کے کھیتوں پر قبضہ کر لو" اس پر کامریڈ مظہر کی جے" زمینداری کی چھیئے۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ مسلسل اتنی دیر تک بلند ہوتا رہا کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ واقعی انقلاب برپا ہو گیا۔ منگر مہتو! (اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر) "بس لیڈر ہو تو ایسن ہو۔ کیسن کس کس کے پھرسیلک (فرمایا) "اگر جمیندار (زمیندار) کے پوت ہے نہ دوسر کے ایسن دماگ (دماغ) کہاں! مظہر نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "سوویٹ روس میں زمانہ ہوا کہ زمینداری ختم ہو چکی۔ زمینداروں کی کل زمین کسانوں میں ہر ایک کی ضرورت کے مطابق تقسیم کر دی گئی۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان میں بھی انقلاب برپا کرکے کل کاشت کسانوں کو بانٹ دی جائے"

بدھن گوپ۔ (اپنے ساتھیوں سے) ہم تو بڑکا آہر کے پچھاڑی آ بیٹھو بکہ کھود کاس (خود کاشت) والا سب (لیں گے)۔

راگھو سنگھ:- اتروار (اتوار) پین لگل نیلامی کھیت کے نیوے (نزدیک) تو ہم لہاؤ کے ہے۔ اوکر پر تو ہمر ہک (حق) ہے۔

سرجو پانڈے:- ہم اہری کے پیٹ والا بکاس (بکاشت) ربعہ لا لیب۔

منگر مہتو:- (ساتھیوں کو ڈانٹ کر) ابھی کاہے لا توں سب آپس میں جھگڑا کرا ہا۔ ہندوستان میں انکلاب جندہ باد ہو جائے کے بعد جب سرکار بہادر ہندوستان چھوڑ کے اپن ملک جائے لگتن تو ہم سب کہب کہ سرکار! توں ہی نصاف (انصاف) سے سب بہاؤ دیکھ کے تکسیم (تقسیم) کر کے جا ہنیں تو تورا جائے پیچھے کھیت کے بٹوارہ واسطے آپس میں بڑای پھوجداری ہو جایت"۔

منگر مہتو کے اس ثالث کو سب نے پسند کیا۔

مسٹر مظہر نے اپنی تقریر کے سلسلہ میں کہا:-

"کسان بھائیو! تم کو اپنی قوت کا اندازہ خود نہیں۔ ہندوستان کی قسمت کی باگ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم اسمبلی سے جیسا چاہو قانون پاس کرا سکتے ہو بشرطیکہ اپنا صحیح نمایندہ اسمبلی میں بھیجو۔ موجودہ کانگریسی حکومت کی باگ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے وہ جو نما گندم فروش بلکہ کھدر نما قوم فروش ہیں۔ اگر واقعی کسان راج چاہتے ہو تو پہلے اسمبلی پر قبضہ کرو"

بدھن گوپ:- (منگر مہتو سے) مہتو جی! توں ابکی الکسن میں کاہے نا کھڑا ہو جا۔ اور جات (ذات) کے چھوڑ کے تو ہر کھود کرمی

بھائی بند کے اتنا اوٹ ہو کہ اپن ساتھ ایک اور ممبر بنا سکا ہی -
منگر مہتو :- ہم اکیلے سبھا میں جائے سے کا ہوت - ادہاں تو سب ممبر کے ایک ایک الگ چٹائی ہی اور کہ نام پارٹی ہی - سو ہم رائے ہی کہ سب کسان اپن اپن جات کے پنچایت کر کے کریا کسم (قسم) کھا کے اگرای بات کا حلپھ (حلف) اوٹھائیں کہ اپن جات کے چھوڑ کے دوسر کے اوٹ نہ دیب تو .. .. بھائی کویری بھائی کورمی سب جات کسان بھائی ممبرن کے سبھا پر قبضہ کر لیں اور ہم سب ایک رائے ہو کے ہر جات کے کسان کو ایک ایک محکمہ کا منسٹر بنا دیں تو پھر کسان راج ہوے میں باکی کا رہت
نتھو اہیر :- مہتو جی ! تو را پالٹکس (پولیٹکس) کے سب بات مالوم ہی - ای واسطے تو ن تو سب منسٹر کے سردار ہو کے جنگرا جے کام سپورد (سپرد) کر دیب اُو تو ہرے رائے سے کام کرت -
منگر مہتو :- منسٹر کے سردار یا سر پنچ کو چیپ (چیف) منسٹر کہل جائی - اگر تو ن سبکے ای رائے ہی تو ہم کا کوئی اُجر (عذر) نا ہی ہم ارائے ہی کہ راگھو سنگھ بھوجداری میں سب کے آگو دوڑ جاتھن انکا پھوج کے منسٹر اور سکرا تھی لاٹھا چلا وے میں حاتم ہو اوکرا امپاسی (آب پاشی) کے منسٹر - سرجو پانڈے کے روپیہ پیسہ ادھر ادھر نکل بجھل ہی کھیت کے ساتھ بہا جنی بی کرا تھن - انکا پھائننس (فائننس) منسٹر - مینی تیواری بھوجداری میں جہل سے ہوا ہلین ہی - انکا جہل منسٹر - اسے ہی طرح جنگرا جیکرا جے کام سے لگاؤ ہی اوہی کام کا منسٹر بنا دل جائے اور ہم تو سبکے راہ بتاوے لا موجود ہی رہب -

ادھر منسٹری فورم ہو رہی تھی ادھر میں دل میں کہہ رہا تھا' ہاں ! تب البتہ ہندوستان کی صحیح نمائندہ اسمبلی کا دعویٰ ناقابل تردید ہو گا -

یہ لوگ وزارت مرتب کرنے میں کچھ اس طرح منہمک تھے کہ کسی نے اسکی طرف دھیان بھی نہیں دیا کہ مقرر کیا کہہ رہا ہی جب مسٹر مظہر نے لکچر ختم کرنے کے کچھ قبل لوگوں کو جوش دلانے کے لئے یہ کہنا شروع کیا کہ " کسان بھائیو ! ہمت مت ہارو - کسان راج قائم کرنے کے لئے جان لڑا دو - بدیسی راج کو ختم کر دو - زمینداروں کو اکھاڑ پھینکو " - اس جوشیلی تقریر پر پھر زندہ باد - مردہ باد - جے ہے اور ناس کا ایسا شور ہوا کہ یہ لوگ بھی اسمبلی سے نکل کر پھر کسان سبھا میں چلے آئے اور سب کے ساتھ " آنچہ مردم میکنند بوزینہ ہم " میں شریک ہو کر ناس کا نعرہ لگانا شروع کر دیا -

جس جگہ میں بیٹھا تھا اس کے آٹھ دس قدم کے فاصلہ پر ایک دہاتی جوش میں کھڑے ہو کر اور ہاتھ اوٹھا اوٹھا کر بلند آواز سے زمیندار ناس - زمیندار مردہ باد چلّا رہا تھا - منگر مہتو نے جب ڈانٹ کر اسے کہا کہ ہو تو گیل اب بیٹھ جاؤ - اسپر اس نے منگر مہتو کی طرف گردن موڑ کر دیکھا تو میں نے پہچانا' یہ تو میرے موضع کا اسامی سنیچر اگوا لا ہی - اب جو اس کی نظر مجھ پر پڑی تو زمیندار ناس کے بجائے گھبرا کر لگا جھک جھک کر سلام سرکار - سلام سرکار کہنے - ساتھ ہی خوشامدانہ معذرت کے انداز میں بولا کہ سرکار اپنے بھی ایلی ہی - ہم یوں کھالی تماسا دیکھے چلل ایلی - سرکار تو گھونسے جان بے کرا ہی کہ ای سب بات میں ہم نا ہی - اپنے مالک ہیں - مالک کے کھلا پہد ہو کے ہم کہاں جائب -

میں نے دل میں کہا انا للہ .. .. اس مردود نے تو میرا سارا بھانڈا ہی پھوڑ دیا - اب یقینی میری شامت آئی - میں تو کبوتر باکبوتر باز با باز کے اصول پر اس جھنڈ میں کبوتر بنا ہوا کبوتروں کی غٹرغوں میں شریک تھا مگر اس کمبخت نے کبوتروں کا شکاری مجھے باز ظاہر کر کے عجیب نازک پوزیشن میں ڈال دیا جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ ادھر تو سب نے غصہ اور نفرت کی نگاہوں سے مجھے گھورنا شروع کیا اور ادھر میں غضب آلود نگاہوں سے اپنے اس بد تمیز اسامی کو دیکھنے لگا جس نے سرکار سرکار کہہ کر اس بھرے مجمع میں مجھے ذلیل و رسوا کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا اور جسنے خواہ مخواہ سب کی غصہ آلود نگاہوں کا مجھے نشانہ بنا دیا تھا -
یہ سوچکر کہ حقیقت عریاں ہو جانے پر یہ سب غصہ میں زمیندار مردہ باد کے زبانی نعرہ کو کہیں عملی جامہ پہنانا شروع نہ کر دیں - میرے دل کی جو حالت تھی اسکو خدا ہی بہتر جانتا ہی - دل میں دعا کرنے لگا کہ بار الٰہا - " نرغہ میں ان کسانوں کے تنہا غلام ہی " عزت و آبرو کے ساتھ گھر واپس پہنچا "

میں تو ادھر دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا اور ادھر سب نے بگڑے ہوئے تیوروں سے مجھے دیکھ کر آپس میں چہ میگوئیاں شروع کر دیں - کسی نے کہا - یہ اچکن پیجامہ دیکھ کے ہم کا تو پہلے ہی سو بہہ (شبہہ) بھیل ہل کہ ای لبا چوڑا نیپھا پھار (لفافہ) پہننے والا کسان کبھو نہ رہ سکے ہی - دوسرے نے کہا - جرور کوئی

جمیندار کے گو ئندہ ہو۔ تیسرے نے کہا ہم اجانتے تو کھوجیہ پولیس (خفیہ پولیس) مالوم ہوتے۔ چوتھے نے گہرا نشانی کی کردیکھ تو اتیجر جمینداری کے چال۔ کسان بن کے ہم سب کے بھید لیوے آئیل ہے۔ اسپر راگھو سنگھ اور تیواری جی نے میری طرف غصہ سے گھور کر سب کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر تو ہنی کارائے ہوے تو ابھی ایکر سب جمینداری جھلا ۔۔۔۔ یہ جملہ پورا ہونے بھی نہ پایا تھا کہ مسٹر مظہر کی تقریر ختم ہونے کے ساتھ ہی سبھاپتی نے اعلان کردیا کہ اسوقت کا جلسہ برخاست ۔ آج رات کو آٹھ بجے سے باہر کے آئے ہوئے بڑے بڑے نیتاؤں کا لکچر ہوگا ۔ اس اعلان کے ساتھ ہی پورے جلسہ میں ہڑبونگ مچ گئی ۔ ہر شخص سب سے پہلے جلسہ سے باہر نکلنے کی کوشش میں ایک دوسرے پر اس طرح گرنے لگا کہ کسی کو سر پیر کا ہوش نہ تھا۔ موقع کو غنیمت سمجھ کر میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر جلدی سے دوسری طرف جا گھسا اور ادھر ادھر دھکے کھاتا ہوا پھاٹک تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتفاقاً ایک ریلا ایسا آیا کہ بلاارادہ صحیح سلامت جلسہ کے باہر پہنچ گیا۔ اب ایک منٹ بھی ٹھہرنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ جان بچی لاکھوں پائے کہتا ہوا اس ہڑبونگ سبھا سے سیدھا گھر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا۔ وہاں سے خیروخوبی کے ساتھ گھر پہنچنے کے بعد میں کئی روز تک سوچتا رہا کہ اگر مہاتما جی کی تجویز کے مطابق ہندوستان کی صحیح نمائندہ اسمبلی اور صحیح معنی کی عوام کی حکومت ہوگئی تو ہندوستان کا کیا حشر ہوگا۔ اس کا بہتر علم مہاتما جی ہی کو ہوگا۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی
— اقبال

اور کچھ ہو یا نہ ہو اتنا مگر ہوگا ضرور
ہر جگہ ہڑبونگ کی قائم سبھا ہو جائے گی
— مانپوری

ٹل ٹل کی موت

از جناب عبدالباقی خانصاحب بی اے، جامعی پبلسٹی پروپگنڈا آفیسر صوبہ بہار

(اسے افسانہ سمجھنا یا کوئی واقعہ، ایڈیٹر کے اختیاراتِ خصوصی میں سے ہے۔ تاہم یہ پچھلے دنوں کا ایک واقعہ ہے، جب کچھ دوست ہزاری باغ جیل میں جمع ہو گئے تھے۔ آج کہ جے پرکاش جیل میں ہیں، اور میں ایک سرکاری نوکر، میں ان کی یاد میں ماضی کی ایک کہانی دہراتا ہوں۔ شاید وہ میری یہ خطا کبھی نہ معاف کریں گے۔ عبدالباقی)

جیل میں جہاں انسان بہت سے کام بے سوچے سمجھے کرتا ہے، ہمارا ایک کام پشو اور پنچھیوں کی رکشا کرنا بھی تھا۔ اور میں صاف کہہ دوں کہ اس میں میرا حصہ سب سے کم تھا۔ سید احمد حبیب صاحب ندوی بلیوں، طوطوں، بگلوں اور گوریوں کے بڑے پریمی تھے۔ "بگھا" (یہ جیل کی اصطلاح تھی، جس کا مطلب بِلّا تھا) سے کھیلتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کرشن جی گوپیوں سے کھیل رہے ہیں۔ یا مہاتما گاندھی اپنے چرخے سے۔ ایک دھاگے کو ہلکی ہلکی جنبش دی۔ 'بلا' اس پر جھپٹا، دھاگا زمین پر چوہا کی طرح رینگنے لگا، 'بلا' چوہا سمجھ کر اس پر لوٹتا۔ سید حبیب صاحب پورے پورے کھلاڑی معلوم ہوتے، اور وہ بھی ندوی جو ایک ہاتھ سے ہاکی، کا ڈنڈا پکڑ کر کارنر، سے گول کرتا ہے۔

لیکن سچ یہ ہے کہ چڑیوں کے 'پالن پوسن' میں ہمارے کامریڈ جے پرکاش نرائن، کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اور مجھے کبھی کبھی خوشی ہوتی کہ ان کی یہ پدرانہ جبلت کس خوبصورتی سے جیل میں تربیت پا رہی ہے۔ ہم چاروں میں سے ہر شخص کا کوئی نہ کوئی خاص شوق تھا جو (Hobby) جنون کی حد کو پہنچ گیا تھا۔ مثلاً سید حبیب صاحب کسرت کرتے تھے، اور للو لال کی پریم ساگر پڑھتے تھے، اور ہمیشہ 'داستان امیر حمزہ'، اور 'طلسم ہوشربا' کو یاد کیا کرتے تھے۔ بینی پوری دھڑا دھڑ لکھے جاتے تھے، یہاں تک کہ ان کا یہ خواب بھی شرمندہ معنی نہیں رہا تھا۔ کہ جیل کے لکھے ہوئے کاغذوں سے "میں اپنا کفن تیار کراؤں گا۔" لیکن جے پرکاش جی ایک طرف تو 'Capital' پر نظر ثانی کرتے، کتاب لکھتے جس میں پروفیسروں اور وکیلوں کی درگت بتاتے، دوسری طرف زیادہ وقت اسی شاعری میں صرف کرتے 'جسے انقلاب پسندی' کی طرح 'پرند پسندی' نہیں تو اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اور کچھ روز بعد میں نے محسوس کیا کہ ایک طرف کتاب پڑھنا اور لکھنا، دوسری طرف چڑیں پالنا، دونوں کام یکے وقت نہیں ہو سکتے، خواہ گاندھی جی روٹھ جائیں یا جواہر لال۔

ہمارے لمبے باڑے کی چھت میں جو کوئی فٹ چوڑا، اور کئی فٹ لمبا تھا، سیلانی گوریوں کی ایک بڑی فوج نے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ چھت اور شہتیر کی مدد سے جتنے زاویے بن سکتے تھے، سب میں کوئی چڑی اپنے چڑے کے ساتھ آرام کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ برسات ابھی نہیں آئی تھی، لیکن چڑوں کا جھنڈ، قیدی کے قفس میں بسیرا لینے آگیا تھا جیسے آزادی کا پیامبر آیا ہو۔ باہر جانا، چونچوں میں تنکے چن کے لانا، انہیں سجانا اور گھونسلے بنانا، تاج محل کی تعمیر سے کم اہم نہ تھا۔ جہاں زندگی تھی، چلتی پھرتی زندگی، دو جانیں تھیں، اپنی رفاقت پر مسرور۔ پرندوں کا یہ بے فکر قافلہ اپنے نئے مکانوں میں بہت جلد بس گیا۔ یہاں کوئی راون تو تھا نہیں جو ان کی خوشگوار زندگی میں ٹانگ اڑاتا۔ انہوں نے اپنی زندگی شروع کر دی۔ ہر جوڑا دانا چرنے جاتا، چڑا چگ کر آتا تو چہلیں کرتا، ناچتا، تھرکتا، پر جھاڑتا، اور چڑا چڑی کی چونچ سے چونچ ملا کر پریم کتھا کا دیباچہ چھیڑ دیتا، چڑی دُم ہلاتی، پر تولتی، اڑ جاتی، چڑا بھی اس کے ساتھ ساتھ جاتا، اور دونوں میں آخر سمجھوتہ ہو جاتا۔ وہ سمجھوتہ جس پر جنسیات کی بنیاد قائم ہے۔ مادی زندگی کا اٹل قانون، کبھی کسی دوسرے جوڑے کے چڑے کی جو شامت اعمال آجاتی تو وہ رشک سے جل اٹھتا۔ اور ان جوڑوں کے رنگ میں بھنگ ڈالتا۔ وہ جھپٹ کر چڑی کے سر پر چونچ مارتا۔ چڑی دبک کر الگ ہو جاتی۔ چڑا اب پھدک پھدک کر حملہ آور کے چونچیں مارتا، کوشش کرتا کہ رقیب روسیہ کے بازوؤں کو اپنے پنجوں سے لہولہان کر دے اس کے حملہ میں جوش ہوتا، شدت ہوتی۔ یہ لڑائی کبھی کبھی تو فوراً ختم ہو جاتی، کبھی کبھی دوسری بڑی بڑی طاقتیں مداخلت کرتیں۔ کچھ غیر جانبدار ہو جاتے۔ ایک جنگ عظیم چھڑ جاتی۔ ان کی دانتا کل کل۔ ہم چیخ سے میں کبھی کبھی اکتا کر کہتا وہ یہ کس قدر بدتمیز لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ

سکون میں خلل ڈالتے ہیں۔ بھلا اس حالت میں کوئی کیا لکھیگا۔"
لیکن جے پرکاش جی ہماری کبھی تائید نہ کرتے۔ وہ یہ لڑائی غور سے دیکھتے۔ معلوم ہوتا جیسے Love instinct (مزاجِ محبت) اور Economic instinct (مزاجِ معیشت) میں جو قدر مشترک ہے، اسے تلاش کر رہے ہوں۔ بھلا جو لوگ ایک ساتھ رہتے ہوں، ایک ساتھ دانا چُننے جاتے ہوں، ایک ساتھ زندگی کا سہارا ڈھونڈتے ہوں، انہیں کون سا احساس، کون سا محرک، کون سی جبلّت آمادۂ پیکار کر رہی ہے !!

اہلی زندگی یا سماجی ربط کا لازمی نتیجہ آبادی میں اضافہ ہے۔ جس کی پہلی شکل ان پرندوں میں انڈے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ چڑی، چڑے کے ساتھ کچھ روز تک باہر نہ نکلی۔ اس کے تیور بدلے ہوئے تھے، اس کے پر اکثر کھڑے رہتے۔ سر کے بال اکثر الجھے رہتے۔ دُم کے بال اکثر جھڑتے رہتے۔ چڑا باہر سے آتا تو وہ اس سے کھُل کر نہ ملتی، اس سے باتیں نہ کرتی۔ چونچیں نہ ملاتی، جیسے بیزار ہو۔ وہ ایک مہتم بالشان کام میں مصروف تھی، جو اس کی زندگی کا حاصل تھا۔ ایک روز اتفاق سے ایک چڑی کے تین انڈے ہمارے بارڈے کے فرش پر گر پڑے۔ ٹوٹے تو اس میں بچوں کے خط و خال ابھر چکے تھے، سر پورا بن چکا تھا، باقی جسم نے دھندلے دھندلے نشان تھے، ابھی جان نہیں پڑی تھی۔ چڑی شاید اپنے انڈوں کو گنتی نہ تھی۔ شاید ریاضی مجھ سے بہتر جانتی ہو۔ شاید فیثاغورث نے ریاضی کے مسئلے اسی سے سمجھے ہوں۔ یا یہ بہرحال انداز سے، احساس سے، گھونسلے کے خلا سے، وہ سمجھ گئی کہ اس کے انڈے ضایع ہو گئے، کوئی چور اچکا اڑا لے گیا۔ جانے وہ ہمیں چور سمجھی، یا ہمدرد، چیخنے لگی، اس شہتیر پر سے اس شہتیر پر، اس کھڑکی پر سے اس کھڑکی پر، وہ بیتابانہ پھُدکتی، اسے ایک لمحہ کیلئے قرار نہ تھا، وہ ہر گھونسلے میں جاتی، اپنے ہم جنسوں سے اپنی زبان میں کچھ کہتی پھر لوٹتی اپنے گھونسلے میں جاتی۔ کچھ دیر بعد نر آیا۔ جانے اس نے اپنی زبان میں کیا کہا، اور چُپ ہو گئی۔ شاید اس نے نر سے یہی کہا ہو۔

"دیکھو جی! تم مارے مارے پھرتے ہو، اور انڈے کوئی اڑا لے گیا۔"

نر بولا: "پریشان کیوں ہوتی ہو، دوسرے توڑ میں بہت انڈے مل جائیں گے۔"

"واہ کیا بات کہی، میں دن رات انڈے ہی سیتی رہوں۔"

"لیکن تمہیں فکر ہی کیا ہے۔ میں تو اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ تمہیں کھلاتا ہی ہوں۔ آرام سے بیٹھی رہو۔"

"دانا لاکر آپ بڑا احسان کرتے ہیں نا۔ نوچ ایسے انڈے کو۔"

"احسان تو نہیں کرتا، ہاں فرض پورا کرتا ہوں۔"

چڑی روٹھ گئی۔ لیکن کچھ دیر بعد یہ سوچ کر اس نے چڑے سے ملاپ کر لیا کہ "ٹھیک تو کہا ہے۔ مجھے کتنا آرام دیتا ہے۔ میں گھونسلے کی ملکہ بن کر بیٹھی رہتی ہوں، اور وہ مارا مارا پھرتا ہے۔" غرضکہ دانا دُنکا بہم پہنچانے کی قوت نے نر کی سرداری اس سماج پر آخر جما ہی دی۔ دونوں پھر ساتھ چہچہانے لگے۔

انڈوں کے بعد اب بچوں کی باری آئی۔ شہتیر کافی چوڑی تھی گھونسلے بھی کافی بڑے تھے۔ لیکن چڑی بچوں کو دانا کھلانے میں کچھ اس طرح جلدی کرتی کہ بچے نیچے گر پڑتے۔ وہ لال لال گوشت کا لوتھڑا جس کی رگوں میں زندگی بھی دوڑتی ہوتی، کس قدر قابل نفرت ہونے کے ساتھ ہی لائق ہمدردی بھی ہوتا۔ زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو شاید وہ ایک قطرہ ہو۔ سیّال۔ ناپاک، کیا یہ خیال کراہیت کے لئے، ہر بچے کو قتل کر دینے کے لئے کافی نہیں۔ لیکن اس کا منطقی تجزیہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ناپاک قطرہ بننے سے پہلے شاید یہ بہت سی پاکیزگیوں کا نچوڑ ہو۔ جوہر ہو، اور اب ان پاکیوں اور ناپاکیوں کی کیمیاوی ترکیب سے ایک تیسری چیز بننے والی ہو جسے زندگی کہتے ہیں۔ جو سب سے زیادہ مقدس، پاک اور لائق احترام ہے۔

بچے جب نیچے گرتے تو میں تو اپنی کرسی پر بیٹھا، ہیگل کا فلسفہ پڑھتا ہوتا۔ لیکن جے پرکاش بےچین ہو جاتے۔ بچے کی ماں ادھر اپنے نالوں سے آسمان سر پر اٹھائے رہتی۔ ادھر ہمارا کامریڈ تڑپتا رہتا۔ وہ جی ہی جی میں کہتا بچے کو گھونسلے تک کیسے پہنچاؤں، ماں کا کلیجہ کیسے ٹھنڈا کروں۔ میری بھی تو ماں تھی۔ میں امریکہ سائنس پڑھنے چلا گیا تھا، تو اس نے بھی سائنس پڑھنے کی ٹھانی تھی کہ ہوائی جہاز بنائے گی اور ہوائی جہاز پر اڑ کر مجھ تک امریکہ پہنچے گی۔ وہ میرے امریکہ آنے کے بعد مری تھی تو مرنے کے بہت دیر بعد بھی اس کی خوبصورت آنکھوں کی کالی کالی پتلیوں میں ہم دونوں بھائیوں کی مورت ناچ رہی تھی۔ آج اس چڑی کا کیا حال ہوگا۔ اور چڑی جے پرکاش کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ شاید سمجھتی ہو کہ یہ میرے بچوں کا اغوا کریگا یا انہیں دوست سمجھتی۔ اللہ ہی جانے۔ چھت اور فرش میں قریباً پندرہ فیٹ کا فرق ہوگا۔ لیکن جے پرکاش جی کو اپنی لمبائی پر

بھی بڑا غرور تھا۔ جلدی میں ہاتھ بڑھا کر بچے کو گھونسلے میں رکھنا چاہتے، پھر جھپٹ کر کرسی لاتے، پھر بھی ناکامی ہوتی تو ایک اور کرسی ڈال کر زینہ بناتے۔ بید ھڑک چڑھ جاتے اور گھونسلے میں بچے کو ڈال دیتے۔ نپولین کو شاید اپنی فتوحات پر اتنی خوشی نہ ہوئی ہو جتنی جے پرکاش کو اس کارنامہ پر ہوتی۔ طمانیت اِن کے لبوں پر مسکراتی ہوتی۔ وہ طمانیت جو کامیاب زندگیوں کا راز ہے۔

بچوں کا روز گرنا اور جے پرکاش جی کا انہیں پھر گھونسلے میں بٹھانا۔ ہبوطِ آدم سے بھی زیادہ کچھ دلچسپ واقعہ ہو گیا تھا۔ اسلئے کہ حضرت آدمؑ کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچانے والا کوئی دوسرا نہ تھا۔ اور اگر تھا تو یقیناً وہ حضرت آدمؑ کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ بینی پوری اور سید حبیب صاحب بھی اس مشغلہ میں جے پرکاش جی کا ساتھ دیتے۔ لیکن میں ہمیشہ "غمگساروں" میں رہتا۔ یہ پارٹ میں کالج لائف سے برابر کھیلتا آیا ہوں۔ اور اب کوئی وجہ نہ تھی کہ اسے چھوڑ دیتا خصوصاً جبکہ جے پرکاش ایسا دلچسپ آدمی یہاں موجود تھا۔ ایک روز بات یوں طے پائی کہ ہم جو روز روز بچوں کو گھونسلوں میں رکھنے کی زحمت گوارہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں کچھ فائدہ بھی ہونا چاہیے۔ کچھ مزدوری بھی ملنی چاہیئے۔ کسی نے کہا "چڑی کے انڈے اتار لیے جائیں۔ انہیں تل کر کھایا جائے۔" لیکن جے پرکاش جی کو اس تجویز سے گھن آئی۔ انہوں نے کہا "بھلا گناہ بے لذّت سے فائدہ؟ اجی اب کے بچے گرے تو انہیں گھونسلے میں نہیں رکھوں گا، پالونگا" ایک دوست نے کہا "اگر مر جائے تو!" منہ توڑ جواب ملا "اور اس کے مرنے سے پہلے میں ہی مر جاؤں تو۔ قیامت ہی آجائے تو"، جواب مسکت تھا۔ اور باتفاق رائے فیصلہ ہو گیا کہ کل سے جے پرکاش جی بچے پالیں گے" اور ہم بھی دامے، درمے، قدمے، سخنے اس سماج کی پرورش و پرداخت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔

اتفاق کہیے کہ چڑیا سے پھر دوسرے روز غلطی ہوئی، اور اتفاق سے ایک نہیں دو بچے ایک ساتھ گرے۔ جیسے آدمؑ کیلئے حوّا کا پہلے ہی سے بندوبست ہو گیا تھا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ چڑیا نے بہت شور مچایا، ہاتھ پاؤں ملا، روئی بلکی، لیکن ہم نے صاف کہہ دیا کہ یہ بچے تو ہمارے پاس رہیں گے۔ یہاں سوشلسٹ اسٹیٹ قائم ہو گیا ہے۔ اور بچوں کی پرورش کا بار بھی اسٹیٹ ہی پر ہے۔ تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ خواہ مخواہ گلا پھاڑنے سے کچھ نہ ہوگا"

جے پرکاش جی نے اب باقاعدہ اپنا انسانی فرض ادا کرنا شروع کیا۔ ھمت خانہ کے اوپر پرانے صابن کے کٹھے کے ڈبے سے گھونسلا بنا۔ گھاس چُن چُن کر لائی گئی۔ انہیں بڑے جتن سے بچھایا گیا۔ نیچے کپڑے کا گدا دیا گیا۔ اور دونوں بچوں کو اس میں رکھ دیا گیا۔ جب دیکھو جے پرکاش جی ان گھونسلوں کے پاس ہیں، کبھی بچوں کی ٹانگ سیدھی کر رہے ہیں۔ کبھی سر کو سہارا دے رہے ہیں۔ کبھی غور کر رہے ہیں کہ ان بچوں کی فطری نشست کیا ہونی چاہیئے۔ یہ کس طرح بیٹھتے ہیں۔ کس طرح سوتے ہیں۔ کس طرح جاگتے ہیں اور سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ یہ کس طرح کھاتے ہیں۔ کچھ قیاس سے، کچھ انسانی تجربے سے۔ کچھ اٹکل پچو، بچوں کا پالن پوسن، باقاعدہ شروع ہو گیا۔ اتفاق سے ان دو بچوں میں سے ایک بچہ ذرا زیادہ بڑا تھا۔ اس کے روئیں بھی کافی مکمل آ گئے تھے۔ وہ ہمکتا تو سمجھا جاتا کہ کھانا مانگتا ہے۔ رینگتا تو سمجھا جاتا کہ کروٹ بدلنا چاہتا ہے۔ پہلے تو کوشش کی گئی کہ دونوں بچے "کودو ساواں" کے مہین مہین چاول کھائیں۔ لیکن اس تجربہ میں ناکامی ہوئی، چھوٹے چھوٹے پھنگے مارے گئے۔ انہوں نے یہ بھی نہ کھائے۔ آخر یہ ترکیب سوجھی کہ بچوں کو ذرا اور بلندی پر ماں کے قریب رکھ دیا جائے، وہ بچوں کو دانا کھانا سکھائے گی، اور ممتا کی ماری اپنا دل بھی بہلائے گی۔ یہ ترکیب کارگر ہوئی۔ ہم جب کھانے اور ناشتہ کے لئے باہر سائبان میں جاتے تو ماں چپ چاپ آتی، بچوں کو چونچیں مار مار کر کھلاتی، خوب ناچتی، اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر۔ بچے بھی گردن اٹھاتے، مٹکاتے، خوش ہوتے۔ ادھر جے پرکاش کھڑکی سے ٹک ٹک کر یہ تماشا دیکھتے، اور اس "لیلا"، کی ادنے سے ادنی تفصیل ہمیں سناتے۔ میں کبھی کبھی سوچتا کہ یہ شخص اس ادھیڑ بن میں جتنا وقت برباد کرتا ہے۔ وہ تو ایک کتاب لکھنے کے لئے کافی ہوتا۔ لیکن یقین جانئے، جے پرکاش کتاب ہی تصنیف کر رہے تھے۔ اور اس کی اہمیت کوئی ان کے دل سے پوچھتا۔ میں بھی اِس کی اہمیت سمجھنے لگا تھا۔

بچے جوں جوں بڑھتے، جے پرکاش جی کی دل کی کلی کھلتی جاتی۔ مستقبل درخشاں معلوم ہوتا۔ زندگی کی تمام مشکلات پر غلبہ پانے کا یقین ہوتا چلا جاتا تھا۔ اور واقعی یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ایک غیر جنس، گوشت کے ایک لوتھڑے کو یوں زندگی بخشنا، اِس شخص کے لئے جو اپنی نجی زندگی میں بھی ان جھمیلوں سے نچنت ہی رہا ہو، کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ ایک بچہ بہت بڑھ گیا۔ اس کے پر اتنے بڑھ گئے

کہ وہ اڑنے لگا - تمنا ہوئی کہ دنیا کی سیر کرے - اب تک وہ صرف اس دنیا کو جانتا تھا، جو اس مصنوعی گھونسلے میں اسے پناہ دے رہی تھی - اور ممکن ہے اس کے باہر وہ کچھ روشنی بھی پاتا رہو - اب وہ اڑنا چاہتا تھا، آسمان کی فضاؤں میں، سورج کی ضیاؤں میں - اور وہ اڑ گیا - جے پرکاش اور ان کے ساتھ ہم نے بھی گوشہ گوشہ چھان مارا، اپنے "ہنھیا" (بھنگی) کو درخت پر چڑھا کر دیکھا - اس کا کہیں سراغ نہ لگا - افسوس ہوا، لیکن بہت زیادہ نہیں - اس لئے کہ جے پرکاش کو اس کے پوسنے میں بہت زیادہ زحمت نہیں ہوئی تھی - انہیں اس کے بارے میں یہ فخر نہ تھا کہ میں نے اسے زندگی بخشی ہے - تیسرے روز معلوم ہوا کہ سزاری باغ کے جنگلوں کا خطرناک "کوا" جس کی چونچیں نشتر کے سینے سے زیادہ تیز ہوتی ہیں، گوریا کے ایک بچے کو چیر پھاڑ کر کھا رہا ہے - بچے کی ایک ٹانگ بھی ہنیا نے لا کر دکھائی جے پرکاش نے کہا "یہ وہی بچہ ہے، وہ دیکھئے اس کے پاؤں کے اوپر کے بھورے اور سیاہ بال" یہ اس کی خاص پہچان تھی - میں کیا کرتا - وہ آپ سے آپ اڑ گیا - اسے قبل از وقت دنیا دیکھنے کا شوق چرایا - شاید اس کی یہ خصلت، میری مصنوعی پرورش غیر فطری پرداخت کی بنا پر نشو و نما پا گئی ہو، شاید اس کی ماں جانتی ہوگی کہ اس کے اڑنے کا ٹھیک وقت کون ہے مجھے تو اس کا کوئی تجربہ نہ تھا۔

دوسرے بچے سے جے پرکاش زیادہ مانوس تھے - اور شاید وہ بھی ان سے زیادہ مانوس تھا - لیکن بڑے بچے کے اس حسرتناک انجام نے انہیں مایوس سا کر دیا - انہوں نے سوچا کہ اس بچے کو ماں کے ساتھ گھونسلے میں رکھ دینا چاہیئے - کرسیوں کا زینہ بنا کر چڑھنا، ایک نامعقول سی بات ہے - اس میں زحمت بھی ہے اور زحمت سے زیادہ خطرہ (اس موضوع پر میری ایک مبسوط تقریر ہو چکی تھی) ہمارے لوہے کے ہسپتالی پلنگ کے چار پاؤں سے بندھے ہوئے بانس کی قمچیاں جن پر مچھر دانی ڈالی جاتی تھی، ہمارے آڑے آئیں - ایک قمچی نکال لی گئی - اور اس کے سرے پر بچہ کو احتیاط سے بٹھا کر گھونسلے میں ڈال دیا گیا - جے پرکاش جی نے اگرچہ ہم سے نہیں کہا تھا، لیکن وہ جانتے تھے کہ معاملہ اس آسانی سے طے نہ ہوگا - بچے کے پہنچنے کی دیر تھی کہ ماں چائیں چائیں کرنے لگی - جیسے بھیم سین سانیوں کے دیس سے کئی ہفتہ بعد اپنی غم زدہ ماں 'کنتی' کے پاس آئے ہوں - میں لکھنے میں مصروف تھا - لیکن جے پرکاش کی نگاہیں گھونسلے کا طواف کر رہی تھیں - ماں فوراً

اڑ کر باہر گئی، جیسے بچے کے لئے کچھ کھانے پینے کا سامان کرنے گئی ہو، اس کرموں جلی کا لال مدتوں بعد پردیس سے لوٹا تھا - اتنے میں باپ پہنچ گیا بچہ کو ٹکٹکی لگا کر اس نے دیکھا، اور فوراً کچھ فیصلہ کیا - اب اس نے بچے کو چونچیں مارنا شروع کیں - گیدا، بچہ اور بدا کر نیچے گر پڑا - جے پرکاش دوڑے، بچہ کو اٹھایا - چمکارا، اور پیار کرنے لگے، جے پرکاش جب موجود ہی تھے، تو باپ نفرت کیوں نہ کرے - انسانی فطرت اور حیوانی فطرت میں یہ زبردست فرق ہے - میں نے سوچا، میں بھی کبھی باپ تھا، ماں کے مقابلہ میں مجھے بچے سے شاید کم محبت تھی، لیکن میں اپنے بچے کے ساتھ ایسا سلوک کبھی نہیں کر سکتا تھا - لیکن پرندوں کا یہ سماج، سماج کی ایک شکل ہی ہے - کیا عجب ہے کہ کسی وقت ماں اور بیٹے میں بھی جنسی رابطہ ممکن ہو - اس لئے باپ بیٹے سے نفرت کرتا ہو - وہ زمانہ بھی کیا عجیب ہوگا - بچے سے نر کی نفرت کی شاید ایک اور وجہ بھی ہو - توالد و تناسل کے اس سلسلہ میں نر اور مادہ کے درمیان انڈے حائل ہوتے ہیں - اور یہ بھی سبب ہوگا کہ نر میں وہ پدرانہ احساس نہ پیدا ہوتا ہوگا جو انسانیت کا طبعی خاصہ ہے -

جے پرکاش اتنی جلد ہمت ہارنے والے نہیں تھے - انہوں نے سوچا کہ ماں کے غائبانہ میں باپ نے یہ بے رحمی دکھائی ہو، ماں کے سامنے شاید اسے یہ ہمت نہ ہو - اب ایسا بندوبست کرو کہ ماں کو باہر جانے کی ضرورت ہی نہ ہو - انہوں نے کچھ پکے ہوئے چاول منگائے - بانس کے چھپٹے کی مدد سے پہلے چاول گھونسلے میں رکھ دیئے گئے - پھر بچے کو بانس کے ہنڈول پر بٹھایا اور گھونسلے میں رکھ دیا - مادہ پھر چہکنے لگی، نر کہیں باہر گیا تھا، مادہ دُم ہلانے لگی، بچہ کے پر دیکھنے لگی - کبھی اس کی پیٹھ پر بیٹھتی، کبھی اسے نچاتی - کبھی خود ناچتی، کبھی اسے چونچ سے چاول کھلاتی - کبھی کبھی دُم کے پاس بھی جاتی - اتنے میں نر آ گیا - اور اس نے اپنے گھر میں یہ ہنگامہ شادی دیکھا تو جل گیا - مادہ کا بچے کی دُم کے پاس جانا، اسے ایک آنکھ نہ بھایا - اس نے بچے کو پھر گرانا چاہا، مادہ آڑے آئی - اب دونوں میں نوچ کھسوٹ، لپاڈگی، داؤ پیچ ہونے لگا - پھر دونوں خاموش ہو گئے - شاید تھک گئے تھے، لیکن نر اپنے موقع کی تاک میں تھا - اس نے اچانک بچہ پر پھر حملہ کیا اور بچہ پھر لڑھکتا ہوا فرش پر تھا ہم نے کانفرنس کی، ہم میں سے اکثریت کی رائے یہ تھی کہ بچے کی جان پیاری ہے تو اب اسے گھونسلے میں نہ رکھا جائے - ورنہ یہ ظالم باپ اسے مار ہی ڈالے گا - لیکن جے پرکاش کی یہ رائے نہ تھی - سمجھوتہ ہوا کہ ایک بار اور بچے کو گھونسلے میں

رکھ کر دیکھا جائے۔ بچہ گھونسلے میں رکھ دیا گیا۔ اتنی دیر میں مادہ اپنے پڑوس میں گھوم آئی تھی۔ صلاح مشورہ کر چکی تھی۔ اور اس کی پنچایت کوئی آخری فیصلہ دے چکی تھی۔ اسلئے کہ اب جو بچہ گھونسلے میں پہنچا تو ماں باپ دونوں ایک کونے میں دم سادھے بیٹھے تھے۔ دونوں نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ بچے پر ڈالی اور پھر چونچیں ملا کر باتیں کرنے لگے۔

نر بولا " ہاں دیکھو! اب تم بھی نہ بولنا "

مادہ بولی " نہیں جی، میں کبھی نہ بولوں گی "

نر۔ " بھلا ان انسانوں کو کیا حق ہے کہ پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑائیں "

مادہ۔ " اور کیا، اور بھلا ہم اس بچے کی خاطر کیوں لڑیں "

نر۔ " ٹھیک تو کہتی ہو، کل کو اس کے پر اگ جائیں گے۔ یہ اڑ جائیگا۔ بیاہ کرے گا۔ دانا لائے گا۔ میاں بیوی مل کر کھائیں گے اور ہمیں پہچانے گا بھی نہیں کہ یہ بڑھیا کون ہے "

مادہ۔ " ہاں، ٹھیک ہے۔ پر اس کی دم بڑی سستی ہوئی ہے "

نر۔ " پھر وہی دم کی بات، اور میرے سامنے۔ دیکھو اچھا نہ ہوگا "

مادہ۔ " تو جانے بھی دو، یہ تو انسانوں میں رہتا ہے، انکی سی عادتیں سیکھتا ہے۔ ہمارے سماج کا دروہی (باغی) ہے۔

اور تھوڑی دیر بعد نر آیا اور اس نے بچہ کو آہستہ سے گرا دیا۔ ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تماشا ہی دیکھتے رہ گئے۔ اس واقعہ کے بعد جے پرکاش جی نے اپنی ذمہ داریاں دو چند محسوس کیں۔ اور تھوڑے سے غور کے بعد یہ نظریہ بھی قایم کیا گیا کہ شاید اسباب، ماحول، اور سماج کے بدلنے سے اس بچے کے طبعی خواص میں کوئی ایسا انقلاب ہو جائے جو BIOLOGY (علم التشریح) اور علم نفسیات میں ایک نئے باب کا اضافہ کرے۔ اور سچ مچ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ جے پرکاش جی کو یہ بھی فکر رہی کہ اس کا جوڑ ملنا چاہیے۔ ورنہ تجربہ ادھورا رہیگا۔ نام کا مسئلہ بھی اکثر زیر غور آیا، یہ بچہ چونکہ نر تھا، اسلئے کسی نے آدم نام تجویز کیا۔ کسی نے باغی، کسی نے بدھو، لیکن اتفاق کسی نام پر نہ ہوا۔ باغی سب سے بہتر نام تھا معناً اور لفظاً بھی، لیکن چونکہ ...... کا ہم قافیہ تھا، اس لئے مسترد کر دیا گیا۔

جیل کی مختصر لائبریری کا تمام برا بھلا ذخیرہ ہم چاٹ جانے پر تلے ہوئے تھے۔ ہم نے جہاں ایک۔ ۔ ۔ اور بہت سی کتابیں منگوائیں وہاں مشہور تمثیل نگار مٹر پالنگ کے شاہکار "نیلی چڑیا" کا ضمیمہ بھی منگوایا۔ یہ کتاب سید حبیب صاحب کے سوا سبنے پڑھی۔ یہ کتاب بچوں کے لئے نہایت ہی دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ اس کا ہیرو ایک ۱۶ سالہ لڑکا "ٹل ٹل" ہے۔ مٹر پالنگ اس کی شادی کرانا چاہتے ہیں۔ ایک پری کو بلاتے ہیں، پری 'ٹل ٹل' کو خواب میں عالم مثال اور عالم ارواح کی سیر کراتی ہے۔ حسین سے حسین لڑکیوں کو بلاتی ہے، ٹل ٹل کو انتخاب کی آزادی دیتی ہے، اور اس کے بعد ٹل ٹل کی آنکھ کھلتی ہے تو کچھ روز میں وہ اسی لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ جس کا انتخاب اس نے عالم مثال میں کیا تھا۔ یہ ایک عجیب تخیلی ڈراما ہے، اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لوگوں کو یا سقراط کیوں پسند ہے۔ تخیل کا کچا دھواں پوری بے پناہی سے اڑایا ہے۔ جس میں پریوں، دیووں، اور روحوں کے دھندلے نقوش کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ نہ ذوق کسی منظر سے ٹکراے، نہ وجدان، نہ تعشق۔ وہ دنیا تھی جس میں نہ عمل ہو نہ ردِ عمل، بھلا کوئی دُنیا ہوئی۔

بہرحال، اس پر سب کا اتفاق ہو چکا تھا کہ "ٹل ٹل" بڑا اچھا نام ہے۔ اور دوسرے روز سے چڑی کے بچے کا نام 'ٹل ٹل' پڑ گیا۔ اور اس نام کے ساتھ ہمارے سماج میں اس کا باقاعدہ اضافہ ہوا۔

ٹل ٹل کی ہر ادا نرالی تھی۔ اب ماں نے بھی اس سے بالکل بے تعلقی اختیار کر لی تھی۔ جے پرکاش ہی اسے کھانا کھلاتے، پانی پلاتے، انہوں نے جہاں دو چار بار اپنی انگلی کو حرکت دی، اس نے چونچ کھول دی۔ ذرا ابھرا دیا اور وہ اچکنے لگا، جہاں ٹل ٹل کہہ کر آواز دی، اس نے گردن کھڑی کر لی۔ سید حبیب صاحب کو حسرت ہی رہ گئی کہ کبھی ان کی آواز پر بھی 'ٹل ٹل' میاں بازو تولتے، لیکن بیکار۔ جے پرکاش کی آواز اس کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ وہ اس صورت کو پہچانتا تھا۔ ان انگلیوں کی ہر جنبش کو پہچانتا تھا۔ آنکھوں کے اشارے تک کو جان گیا تھا، پرکھ چکا تھا۔ جے پرکاش اکثر اسے ڈانٹتے تو وہ لاڈلے بیٹے کی طرح اترانے لگتا۔ پھدکتا، پر تولتا، اڑنا چاہتا۔ جے پرکاش کو ایک ہی فکر تھی کہ 'ٹل ٹل' اب بڑا ہو رہا ہے، اڑ جائے گا، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی اطمینان ہو جاتا کہ "میں نے اسے کافی سدھا لیا ہے۔ یہ مجھے کبھی نہ چھوڑیگا"۔

شادی کا مسئلہ بھی کچھ کم اہم نہ تھا۔ ایک روز قیدیوں کے دوسرے باڑے سے نہ جانے کس طرح ایک بچہ آ گیا، جیسے کوئی پری لائی ہو، ٹل ٹل اور یہ نووارد اکٹھا ہوئے تو ٹل ٹل نے پر پرزے جھاڑنے شروع کئے۔ کان سے کان ملا کر کچھ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ خوشی کے مارے پر بار بار پھڑ پھڑانے لگے، ہم نے قرینہ سے سمجھا کہ نووارد مادہ ہے، اور 'ٹل ٹل' اپنی فطرت کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہے۔ طبیعت کی یہ افتاد خطرناک تھی اور سر دست بے نتیجہ بھی۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ ان "نووارد صاحبہ" کو مٹر پالنگ صاحب کی پیروی میں "خواب کی دلہن" سمجھ کر سر دست واپس کر دیا جائے۔ ٹل ٹل صاحب نیند سو جائیں گے تو انہیں عالم مثال یا عالم واقعی سے ڈھونڈھ نکالیں گے چنانچہ نووارد کو واپس کر دیا گیا۔ جنہیں جانے آسمان نگل گیا یا زمین۔

جے پرکاش جی اکثر ٹل ٹل کے ساتھ کھیلتے - میں ایک دن ان کی یہ ادا دیکھ کر مسکرانے لگا - اس کے بعد ذرا وہ محتاط ہو گئے - مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہ بہت بڑا ظلم کیا - ہمارا معمول تھا کہ شام کے پانچ بجنے کے بعد ہم کوٹھری سے باہر نکل جاتے، کوئی غسل کرتا، کوئی احاطہ کا چکر لگاتا، اور بعض لوگ غسل بھی کرتے اور چکر بھی لگاتے اور یہ قابل تعریف بات تھی کہ میں انہی میں سے تھا - ایک روز ہم حسب عادت باہر نکلے - تو جے پرکاش جی نے ہمارا ساتھ نہ دیا - میں کچھ سمجھا مگر انجان بن گیا - غسل کر کے جب میں واپس آیا تو جے پرکاش چپ چاپ بیٹھے تھے، جیسے کسی بہت حسین آدمی سے لڑنے کا ملال ہو - ٹل ٹل ان کے ہاتھ میں تھا - چہرہ سرخ تھا - آنکھوں میں تشویش تھی، انداز میں مجرمانہ تامل تھا، لب دانت سے بھینچے جا رہے تھے - میں نے پوچھا "ٹل ٹل خیریت سے تو ہے - بولے "ہاں" - لیکن یہ ہاں، کسی خونی مجرم کے اقبال جرم سے کم نہ تھی جے پرکاش اس کے بعد بارہ گھنٹے تک کچھ نہ بولے - بھتوں میں بات چیت میں، کھانے پر وہ کھوئے کھوئے سے رہے - انہوں نے کئی بار ٹل ٹل کو گھونسلے سے نکالا، دیکھا، رکھا - میں سمجھ رہا تھا کوئی حادثہ ہو گیا ہے - لیکن کیا بولتا - مجھے بھی ان کی رازدارانہ خاموشی کے خلاف خاموش احتجاج کرنا تھا - دوسرے روز صبح آپ ہی آپ فرمانے لگے "ٹل ٹل کی ٹانگ ٹوٹ گئی، اب نہ جیئے گا" "کیسے ٹوٹی" "میں کیا جانتا تھا کہ وہ ایسا نازک ہو گا - میں اس سے کھیل رہا تھا - ذرا جھٹکا دیا بس یکایک اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی"

جے پرکاش کے لئے یہ حادثہ کیا معنی رکھتا تھا - مجھے اس کا اندازہ تھا، لیکن ہم سب نے تسلی دی اور پورے وثوق کے ساتھ کہا - "گھبرانے کی کوئی بات نہیں - ٹل ٹل ضرور جیئے گا"

جیل کے بنگالی ڈاکٹر بھی بہت دلچسپ آدمی تھے - اور ہماری نبض شناسی میں انہیں کمال حاصل تھا - وہ آئے تو ٹل ٹل مریض کی حیثیت سے ان کی خدمت میں پیش کیا گیا - جے پرکاش بڑی سنجیدگی سے بولے "ذرا دیکھئے تو اس کی ٹانگوں میں موچ آ گئی ہے" ڈاکٹر صاحب نے اطمینان سے معائنہ کیا، اور بولے "ہلدی پیس کر لگائیے! ہلدی" - اور اپنا تجربہ بیان کرنے لگے "میرے پاس بھی ایک کبوتر تھا - ایک بلی بھی تھی - ہم نے بلی کو اس طرح سدھایا تھا کہ وہ کبوتر پر حملہ نہیں کرتی تھی لیکن ایک روز جانے کیا وحشت سوار ہوئی کہ بلی نے کبوتر کو جا دبوچا - اور سینہ پھاڑ دیا - میں آیا تو میری چھوٹی بچی بلک بلک کر رونے لگی - مجھے تاؤ آ گیا - میں نے بندوق اٹھا اور بلی پر داغ دی - بلی بات کی بات میں ٹھنڈی ہو گئی - اب کبوتر کا علاج میں نے یوں کیا کہ پھٹے ہوئے چمڑے کو سوئی سے سی دیا - اور اس کے زخم پر ہلدی لگانے لگا - کبوتر چند دنوں میں چنگا ہو گیا - آپ بھی وہی کیجئے میرا کبوتر اچھا ہو سکتا ہے تو آپ کا ٹل ٹل بھی اچھا ہو سکتا ہے"

ڈاکٹر صاحب کے علم الجراحت نے انہیں یہی سکھایا تھا کہ بلی نے کبوتر کا جو سینہ پھاڑا اور جے پرکاش نے ٹل ٹل کی ٹانگ توڑی تو دونوں میں کوئی فرق نہیں - صرف مرہم چاہیئے - جے پرکاش جی نے ٹل ٹل کی ٹانگ پر ہلدی چڑھانی شروع کی - ۸ بجے صبح سے لیکر شام کے ۵ بجے تک پانچ مرتبہ ہلدی کا لیپ چڑھایا جاتا - شام لال (یہ غریب جیل میں آنے سے پہلے اچھا خاصہ سنار تھا - اور اب ہم سوشلسٹ قیدیوں کا اچھا خاصہ باورچی بن گیا تھا) ہلدی پیس لی؟ "ہاں پیس لی" "دے جاؤ" "ہلدی اچھی نہیں پسی" "مہین مہین پیسا کرو - دیکھو یہ ہلدی کی گانٹھیں - اس سے ٹل ٹل کو تکلیف ہو گی نا - ذرا خیال کیا کرو" اور واقعی ایک طرف تو ہلدی کے ان لیپوں سے ٹل ٹل اچھا ہو رہا تھا - اور دوسری طرف شام لال کو ہلدی پیسنا آ رہی تھی - ہلدی پیسنا کوئی آسان کام تھوڑا ہی ہے؟"

ٹل ٹل کو ابھی شفا ء عاجل و کامل تو نہیں ہوئی تھی لیکن وہ پھر پھدکنے لگا تھا - ہم شام کو ٹہلتے تو ٹل ٹل جے پرکاش کے ہاتھ میں ہوتا - کبھی وہ اسے اپنے انگوٹھے پر بٹھاتے - کبھی ہتھیلی پر - کبھی انگلیوں کا اڈہ بنا کر ہوا میں اڑا دیتے - کبھی زمین پر پھینک دیتے - ایک روز ہم گھاس پر بیٹھے تھے - ٹل ٹل کی تیز آنکھوں نے گھاس پر سرسوں کے کچھ دانے پڑے دیکھے اور چونچ مارنے لگا - بس اتنی سی بات تھی - ہم میں مکالمہ چھڑ گیا - اس مشاہدہ پر بحث ہونے لگی - آدھ گھنٹے کے بعد بحث کا موضوع یہ طے پایا کہ "انسان اور پرندوں میں کیا فرق ہے؟" بحث کے نکلا کے پیش نظر سب نے یہ بھی مان لیا کہ قرآن و احادیث - وید، شاستر اور پران کی سند اس وقت تک نہیں مانی جا سکتی جب تک سید احمد حبیب صاحب کے آلۂ سماعت کی بیٹری انگلستان سے نہ آ جائے - (سید صاحب اتنا اونچا سنتے ہیں کہ آلۂ سماعت کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے - اور آلہ کی بیٹری جب ختم ہو جاتی ہے تو انگلستان سے منگائی جاتی ہے -

یہ معاملہ بھی ابھی اسی اسٹیج میں تھا۔) ایک گھنٹہ تک خوب عجیب دلیلیں دی گئیں۔ یہ بھی بتایا گیا کہ فلسفہ اور منطق جنم کے بیری ہیں، اور ہر بات میں منطق کی رٹ لگانا کوئی دانشمندی نہیں لیکن آخر ایک فیصلہ ہو ہی گیا اور اسکے الفاظ یہ تھے:-

"انسان اور پرندوں میں فرق یہ قرار پایا کہ انسان اپنے کھانے کیلئے چیزیں پیدا کر لیتا ہے، پرند نہیں پیدا کر سکتا۔ نیز یہ جلسہ "پیدا کرنے" کے الفاظ پر خاص طور سے زور دیتا ہے۔ جس کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ انسان فطرت پر قابو پا سکتا ہے۔ چیزیں پیدا کر سکتا ہے اور اگر ٹِل ٹِل بھی اپنا پیٹ پالنے کے لئے چیزیں پیدا کرنے لگے تو اس کا شمار بلا شبہ انسانوں میں ہو گا۔"

یہ فیصلہ بہت اہم تھا، اور لارڈ ڈلن تھگو کی تقریر سے بہت پہلے کیا گیا تھا۔

اس بحث میں جے پرکاش جی نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ٹِل ٹِل کو انسانیت کے دائرے میں داخل کرنے کی تجویز ان کے دماغ کا نتیجہ تھی، جس کی پُرجوش تائید میں نے کی تھی۔

اتفاق کی بات کہیے کہ اسی روز رات کو ٹِل ٹِل صاحب بار بار اپنے گھونسلے سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ گرمی بھی زیادہ نہ تھی، جے پرکاش جی بہت پریشان تھے، اسے بار بار گھونسلے میں رکھتے بار بار اپنی میز پر بیٹھ لاتے، آخر ٹِل ٹِل خاموش ہو گیا۔ جے پرکاش اس روز بارہ بجے رات کو سوئے۔

صبح اُٹھے تو ٹِل ٹِل اپنے گھونسلے میں دائمی نیند سو رہا تھا اور دنیا کی کوئی طاقت اسے جگا نہیں سکتی تھی، گھونسلا، اس کی قبر بن چکا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں، ہاتھ پاؤں اینٹھ گئے تھے، پر بدن سے جھڑ گئے تھے۔ سید احمد حبیب صاحب نے دیکھا تو انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پڑھا۔ بینی پوری نے دیکھا تو ودیاپتی کا کوئی شعر پڑھ دیا۔ میں نے دیکھا تو جے پرکاش نرائن کو دیکھا جو آنکھیں روئی ہوئی، آواز بھرائی ہوئی" کی تصویر درد بنے ہوئے تھے۔ اور وہ یکایک بولے "دیکھئے نا! کسی زہریلے کیڑے نے اسے ٹانگ میں ڈس دیا ہے۔ یہ دیکھئے! یہ خراش، یہ خون جم گیا ہے"۔

ٹِل ٹِل کی موت کی کوئی وجہ نہ تھی، اس کی ٹانگ اچھی ہو رہی تھی، لیکن اتفاقات ــــــ زندگی اور فلسفۂ زندگی میں اتفاقات کو کتنا دخل ہے۔

دن کے ۱۲ بجے ٹِل ٹِل کو کھانا کھلایا جاتا تھا ــ جے پرکاش اس وقت اس کے گھونسلے کے قریب چپ چاپ کھڑے تھے۔

ٹِل ٹِل کی موت ہماری زندانی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ تھی، جس نے بارد طبیعتوں میں بھی ایک خلش پیدا کر دی تھی۔

شادی

از جناب آفتاب حسن صاحب ایم - ایس سی علیگ

شام کے وقت جب شکری ندی کے پار سورج ڈوب رہا تھا اور مغربی آسمان سنہرا گلابی اور نارنجی ہوگیا تھا، اور مویشی آہستہ آہستہ چلتے گرد اڑاتے، اپنی گھنٹیاں بجاتے ندی سے بستی کی طرف لوٹ رہے تھے، چند بوڑھے، کچھ نوجوان اور بہت سے بچے ندی کے اُس پار بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔

شکری ندی کسی زمانے میں ندی ہوگی، اب تو خشک ہے، اور ندی سے سرے بھرے میدان میں تبدیل ہوگئی ہے۔ پاٹ اس قدر چوڑا ہے کہ اُس پار کے درخت تو نظر آتے ہیں، لیکن شام کے وقت آدمیوں کا نظر آنا مشکل ہے۔ لوگ دیکھ ہی رہے تھے کہ دُور سے انگریزی باجے کی آواز آئی ——— برات نزدیک پہنچ گئی۔

صبح ہی سے بستی میں بڑی چہل پہل تھی۔ مولوی سلطان احمد کی بچی کا بیاہ تھا۔ گاؤں کی بچی کا بیاہ تھا۔ گاؤں کے سارے لوگ خوش تھے۔ ایک گھر میں غمی سارے گاؤں والوں کو رلاتی ہے اور ایک گھر کی خوشی سب لوگوں کو خوش کردیتی ہے۔ سلطان احمد کی خوشی سے سارے بستی والے خوش تھے۔ یہی دیہات کا دستور ہے۔ برات کو باغ میں ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ باغ کے بنگلے کو فرش فروش سے آراستہ کرلیا گیا تھا۔ ادھر اُدھر روشنی لگادی گئی تھی۔ ایک طرف کورے مٹکوں اور گھڑوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ دوسری طرف ایک بڑی دیگ میں شیرچا، اور دوسری میں شربت تیار تھا، بستی کے چند نوجوان انتظامات میں مشغول تھے۔

باجے کی آواز کے بعد کچھ لوگ بھی نظر آئے، لیکن وہ ندی کے اُس پار ہی جمع ہونے لگے، اور ساتھ ہی ساتھ دو تین گیس کی روشنیاں بھی نظر آئیں۔ اُسی وقت فضلو دوکاندار شکر اور گھی بیچنے میں اپنی دوکان پر بہت منہمک تھے۔ برات آنے کا شور جو ہوا تو انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دوکان اپنے چھوٹے بیٹے کے حوالے کر لپکتے جھپکتے ندی کے کنارے پہونچ گئے اور بیٹھ گئے۔ اب براتی ہیں کہ آتے ہی نہیں اور فضلو کی دوکان کھلی تھی، یہ ذرا بےچین ہوئے۔ کہنے لگے :-

"بھئی یہ لوگ آخر وہاں سے ملتے کیوں نہیں ؟ "

ان کے ساتھی نے کہا "تمہاری شادی کو کتنے دن ہوئے ؟"

فضلو کو اس سوال سے تعجب ہوا۔ کہنے لگے "مطلب ؟ "

"جو پوچھتا ہوں جواب دو "

"میری شادی کو ؟ "

"ہاں "

"یہی کوئی پندرہ بیس سال "

"پھر اتنی جلدی بھول گئے ؟ ارے بھئی وہ لوگ ذرا برات کو ٹھیک کر رہے ہیں۔ سج دھج کر جلوس کیساتھ آئیں گے۔"

"اچھا یہ بات ہے "

"اور نہیں تو تم تو جانتے ہو کہ برات کہیں سے جانا گویا ایک طرح کی فوج سے چڑھائی کرنا ہے۔ لڑکے والے تو ہمیشہ اپنے کو فاتح ہی سمجھتے ہیں۔ مصیبت تو لڑکی والے کی ہوتی ہے "

یہ سُن کر فضلو نے سر ہلایا، کیونکہ چند سال بعد انہیں بھی ایک لڑکی بیاہنی تھی۔

دامودر حلوائی نے جب یہ گفتگو سنی تو کہنے لگے "سُنا ہے بھیا! بلایت میں تو عورت ہی کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ اور میم لوگ صاحب لوگن کو خوب مارتی ہے۔ کیا سچ بات ہے ؟ "

بہاری حجام کو اس وقت اپنی معلومات کا اظہار کرنا ضروری تھا۔ "بھیا ہم تو جب پٹنہ، گیا، گئے تو میم لوگ کو کتے ہی کے ساتھ کھیلتے دیکھا۔ جب دیکھو سڑک پر گتا آگے آگے۔ میم صاحب پیچھے پیچھے۔ ایک کھن ساماں ہمرا دوست ہے "

یہ کہہ کر انہوں نے مجمع کی طرف نظر اٹھائی دیکھنے کے لئے کہ خانساماں کی دوستی کے بیان نے ان کو لوگوں کی نظر میں کتنا بلند کیا ہے "وہ کھن ساماں مجھ سے کہتا تھا کہ گھر کا پہلے کتے کو ناشتہ دیا جاتا ہے، پھر صاحب لوگ کھاتا ہے۔"

دامودر نے اس گفتگو کو نہایت متانت سے یوں ختم کیا کہ "نا بھائی! ہم میم سے شادی نہیں کریں گے "

اتنے میں برات کا جلوس چل پڑا۔ اور فضلو بڑے شوق سے دیکھنے لگے۔ ابھی منٹ بھر بھی دیکھنے نہ پائے ہونگے کہ ان کا لڑکا دوڑتا ہوا آیا، کہنے لگا " ابا ابا! اماں بہت خفا ہو رہی ہیں، دوکان کھلی چھوڑ دی ہے" فضلو بیچارے ان نیک لوگوں میں تھے جو دل میں بیوی سے بہت ڈرا کرتے ہیں لیکن پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا جائے جب بھی باہر والوں کے سامنے اس کا اعتراف نہیں کریں گے۔

بچے نے غصہ کی خبر جو آکر سنائی تو بہت گھبرائے لیکن بستی والوں کے سامنے وقار جا رہا تھا۔ گھبراہٹ کو ہنسی میں ٹال کر بولے " ارے بیٹا! اب دوکان دیکھیں یا برات دیکھیں، تم بھی دیکھو آؤ بیٹھو "

لیکن بچہ اپنی ماں کو جانتا تھا، کہنے لگا " نہیں اماں مارینگی کہتی ہیں کہ پہلے بلا کرلے آؤ پھر دیکھنا "

فضلو بیچارے دوکاندار ضرور تھے لیکن تاجر نہ تھے۔ ان کے نزدیک اگر شادی دیکھنے کے سلسلہ میں ایک آدھ گاہک نکل جائے تو ایسی کوئی نقصان کی بات نہ تھی۔ اور پھر اس وقت گاؤں کا کون سا بیٹھا رہتا جو برات دیکھنے کے لئے وہیں پر موجود نہ تھا۔ منشو دھوبی۔ رحیم درزی، بہاری حجام، جھری مستری بڑھئی، چراغن خلیفہ معمار، پھوٹا پارچہ باف، اور حد یہ کہ دامودر حلوائی جو رات دن اپنی دوکان سے مکھیوں کے ساتھ جونک کی طرح چمٹا رہتا تھا وہ بھی موجود تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ احتیاطاً مٹھائی کا ٹوکرا بھی ساتھ لیتا آیا تھا کہ شاید کچھ بکری ہو جائے۔ پھر فضلو اور دامودر میں کچھ فرق بھی تو ہونا چاہیئے۔

لیکن فضلو پریشانی میں تھے۔ ادھر تماشے کا شوق۔ ادھر بیوی کا ڈر۔ اور پھر شرمندگی کا خوف۔ اور لونڈا ہے کہ کسی طرح مانتا ہی نہیں، چلنے کے لئے اصرار کر رہا ہے۔ مجبوراً انہوں نے نہایت وقار سے جواب دیا " جاؤ کہہ دو ابھی آتے ہیں " بچہ یہ جواب لیکر نہایت تیزی سے گھر کی طرف دوڑا۔ اسے بھی تماشہ دیکھنے کی جلدی تھی۔ دو منٹ میں واپس آیا اور کہنے لگا " اماں کہتی ہیں کہ بڈھے ہو گئے ہو اور بچے سے بدتر ...."

بچہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ سارا مجمع زور سے ہنس پڑا، اور فضلو اپنی خفت مٹانے کو اس کو مارنے کو دوڑے۔ بچہ یہ دیکھ کر بدحواس بھاگا، اور فضلو اسی بہانے دوڑتے ہوئے دوکان کی طرف روانہ ہوئے۔

برات باجوں کے شور، گھوڑوں کی ہنہناہٹ، لوگوں کی چیخ و پکار، اور بچوں کے رونے چلانے کے درمیان نہایت شان سے پہونچی۔ سب سے پہلے سمدھی صاحب اپنی پالکی سے اترے اور ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ اس کے بعد ان کے عزیز اقربا اور سب سے آخر میں دولہا میاں مع اپنے ننھے بھائی کے پالکی سے اترے اور مسند پر بٹھائے گئے۔

سواریوں میں گھوڑوں کی کثرت تھی اور جیسا کہ اکثر شادی بیاہ میں ہوا کرتا ہے، ہر سوار اپنے گھوڑے سے اجنبی تھا اور ہر گھوڑا اپنے سوار سے ناواقف۔ نتیجہ صاف تھا، بعض سواروں نے اپنے گھوڑوں پر فتح پائی تھی اور گھوڑے پسینے سے سیاہ ہو رہے تھے لیکن بہت سے گھوڑے سواروں پر غالب رہے تھے۔ سوار ادھ موئی حالت میں اترنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور ہاتھ پاؤں کو جکڑا ہوا پاتے تھے۔ چند چھوٹے چھوٹے ٹٹوؤں پر لمبے لمبے سوار جمے ہوئے تھے، اور لگام سیدھی رکھنے کی بجائے اس فکر میں تھے کہ ٹانگیں زمین پر رگڑ کھانے سے بچی رہیں۔ جس طرح لوگ گھوڑوں کو پانی میں ڈالنے سے پہلے اپنی ٹانگیں اوپر اٹھا لیا کرتے ہیں، اسی طرح یہ بیچارے اپنے پیر اوپر سمیٹے چلے آ رہے تھے۔

ایک سوار کا تھکن کے مارے یہ عالم تھا کہ اپنے پیر کو اس طرح ڈھیلا چھوڑے ہوئے تھا کہ اس کی ٹانگیں گھڑی کے رقاص کی طرح ہل رہی تھیں۔

مجمع میں ہر شخص کا انداز جداگانہ اور ہر کا انداز فاتحانہ تھا۔ کوئی رات کے وقت انگریزی ہیٹ لگائے ہوئے گاؤں والوں پر رعب جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور کوئی شروانی سے رنگین رومال نکال کر بار بار منہ پونچھ رہا تھا۔

ہر شخص کچھ نہ کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عام طور پر

" ارے کوئی گھوڑے کو پکڑنے والا ہے؟ "

" بدھوا! ارے بدھوا کہاں گیا۔ میرا بستر لا "

" فلانے میاں! میرے بیگار کو بھی دیکھا ہے؟ "

اس قسم کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایک باپ صاحب نے اپنے گمشدہ بیٹے کی تلاش شروع کی۔

" چنو بیٹا۔ ارے چنو بیٹا کدھر گئے تم؟ "

سلطان احمد صاحب تو چند بستی کے دوسرے بزرگوں کے ساتھ

ایک طرف علیحدہ بیٹھے ہوئے تھے ۔ لیکن ان کے بڑے لڑکے سعید الدین اور ان کے پھوپھی زاد بھائی جعفر نوجوانوں کی ایک ٹولی کو ہدایت دیتے پھرتے تھے ۔

"کیوں بھائی سب انتظام ٹھیک ہے ؟"

جواب ملتا " سب ٹھیک ہے ۔"

"کہیں مہمانوں کو تکلیف نہ ہو ؟"

"آپ اطمینان رکھیے ۔"

ایک طرف سے آواز آئی " ارے بھئی کوئی ہم لوگوں کی خبر لینے والا بھی ہے ۔ اُس وقت سے آئے بیٹھے ہیں ، کوئی بات تک پوچھنے والا نہیں ہے ۔"

سعید بھاگتے ہوئے اُس طرف گئے " فرمائیے کیا حکم ہے ؟"

شکایت والے صاحب نے فرمایا " حکم کیا ، اُس وقت سے بیٹھے ہوئے ہیں ، اس بچے کو دیکھئے ! پیاس کے مارے رو رہا ہے ، آخر یہاں دو دن کس طرح گذریں گے ؟ "

سعید اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ بچہ چھوہارا ہے ۔ اس لائق نہیں کہ خواہ مخواہ گھوڑے کی پیٹھ پر باپ کے آگے بیٹھ کر سفر کرے ، اور پھر یہاں پہونچنے پر بجائے اس کے ۔ ۔ ۔ کہ کپڑے بدلواتے ، اس کا ہاتھ منہ دھلاتے ، آپ فرش پر جم کر بیٹھ گئے اور سارے کپڑے پہنائے ہوئے اسے بھی بٹھائے رہے ۔ سعید بولتے کیا خاموش رہے ۔ صرف اتنا کہا " میں ابھی شربت بھیجواتا ہوں "

تھوڑی دیر میں ایک لڑکا شربت کا جگ لیکر آگیا ۔ شربت پی لینے کے بعد ننھے میاں کے ابا کہنے لگے " بہت سست کام کرتے ہیں آپ لوگ ۔ بچہ پیاس کے مارے مرا جارہا تھا ۔"

لڑکے نے کہا " صاحب ! آپ کے سامنے پانی کا گھڑا بھرا رکھا ہے "

اتنا سُننا تھا کہ ننھے کے ابا بگڑ ہی تو گئے " خوب مہمان بلایا ہے آپ نے ، اب پانی بھی ہم لوگ خود ہی اُٹھ کر پئیں "

—— لڑکا اس جواب ہی دینا چاہتا تھا کہ جعفر جو اس کے نزدیک کھڑا تھا اُس کو ہٹاتے گیا اور کہنے لگا " اگر تم ان کو جواب دیتے تو ساری برات روٹھ جاتی —— ابھی یہ گفتگو ختم بھی ہونے نہ پائی تھی کہ دوسری طرف سے آواز آئی ۔

" لاحول ولاقوۃ ۔ ارے صاحب ! میں آپ سے شربت مانگ رہا ہوں ، اور آپ ہیں کہ چائے پہ چائے لائے چلے جارہے ہیں "

تیسری آواز نے کہا " حضرت چلئے لائیے ۔ اب اس وقت شربت کون پیئے گا ؟ "

عجیب عالم تھا ۔ برات کسی حال خوش ہونا نہیں چاہتے تھے ۔ چائے دو تو شربت کی پکار ۔ شربت لاؤ تو چائے کے لئے ہنگامہ ۔ بیچارے سعید کبھی ادھر بھاگتے کبھی اُدھر ۔ جعفر نے کہا " آپ کیوں خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں ۔ ہم تو موجود ہی ہیں آپ کھانے وانے کا سامان کرائیے ۔"

ایک دوسرا لڑکا بھاگا ہوا آیا " بھئی یہ لوگ تو عجیب ہیں ، کسی چیز سے خوش ہی نہیں ہوتے ۔ "

جعفر نے کہا " یار عجب سیدھے مسلمان ہو ۔ دونوں چیزیں سامنے لے جاؤ ، خوش ہوجائیں گے ۔"

جب چائے اور شربت بالکل ختم ہوگیا تو براتیوں کو کچھ سکون ہوا ۔

گھنٹے بھر بعد لڑکے والوں نے بری کا سامان کیا اور دولہن کا جوڑا سہاگ پڑے کے ساتھ دولہن کے گھر پہنچا آئے ۔ ان کی غیر حاضری میں یہاں کھانے کا سامان ہوگیا ۔ طے یہ ہوا کہ پہلے کھانا کھلایا جائے ۔ اس کے بعد نوشہ کو خلعت پہنانے کے بعد نکاح ہو اور پھر دوسری رسمیں

دسترخوان بچھ گیا اور کھانا چن دیا گیا ۔ کھانے کے سامان کرنے والوں میں بستی کے تقریباً سارے نوجوان تھے ۔ خیال یہ تھا کہ کھانے میں برات والوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو ۔

تماشہ دیکھنے کے لئے بستی کے چند غریب بچے وہیں پر آکر بیٹھ گئے ۔ دسترخوان جو بچھا تو ان معصوموں کو کیا معلوم کہ کس کے لئے ہے ، وہ بھی بیٹھ گئے ۔ برات والے جو واپس آئے اور دسترخوان بچھا دیکھا تو وہ بھی ہاتھ دھوکر بیٹھنے لگے ۔ بہت سے باپوں نے دیکھا کہ ان کے بچے لاپتہ ہیں ، فوراً تلاش شروع ہوئی اور فرش پر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور انہیں سوتا پاکر ان کے قریب پہونچے " اٹھو بیٹا کھانا آگیا "

بچے کو کھانے سے نیند پیاری ہوتی ہے ۔ اس نے ایک بار " اوہوں " کہا اور پھر سو رہا ۔ " بیٹا اُٹھتے نہیں کھانا " اب بھی نہ اُٹھا تو اس کو جھنجھوڑنا شروع کیا ۔ اور پھر دونوں ہاتھ پکڑ کر اُٹھا دیا ۔ اب وہ اُٹھ کر بیٹھ تو گیا مگر اس حالت میں کہ آنکھ بند ہے ۔ ادھر باپ نے ہاتھ چھوڑا ۔ اُدھر وہ فرش پر پھر لمبا ہوگیا ۔

اکثر لوگوں نے دیکھا کہ بچوں کے سبب سے کھانے کا نقصان ہو رہا ہے۔ اس لئے ان کو اٹھاتے اٹھاتے ہاتھ منہ دھونے کی جگہ پر لے گئے۔ باقی کے دو تین چھینٹے مارے اور پھر اٹھائے اٹھائے دسترخوان پر لے گئے اور کچھ ان کی اور کچھ اپنی طرف سے کھانے لگے۔

ہمارا دستور کچھ ایسا ہے کہ جس برات میں شکایت نہ ہو وہ کامیاب برات نہیں کہی جا سکتی، اور جس میں رنجش نہ ہو وہ برات کہے جانے کی مستحق ہی نہیں ہے۔ روٹھ نہ جانا، بیٹی والوں کو بس بھر تکلیف نہ پہنچانا، لڑکے والوں کی رسم اور شان کے خلاف ہے۔

شاید ہی کوئی ایسی برات ہو جس میں شکایت کرنے والے موجود نہ رہتے ہوں۔ اس دسترخوان پر بھی اس کی کمی نہ تھی، ایک صاحب کو جب شکایت کی کوئی خاص چیز نظر نہ آئی تو کہنے لگے "وہ پیالہ ذرا دور ہے، نزدیک کر دیجئے گا" ——— پیالہ نزدیک کر دیا گیا۔

دوسرے صاحب فرمانے لگے "واہ حضرت یہاں سے پیالہ ہی ہٹا دیا۔ دوسرا لائیے" دوسرا آ گیا

تیسرے صاحب کی نظر ان بچوں پر پڑ گئی۔ وہ صاحب کہنے لگے "یہ کون بچے ہیں؟"

دوسرے نے کہا "معلوم نہیں ہمارے ساتھ کے تو معلوم نہیں ہوتے"

"ارے تم کون ہو جی؟" بچے کھانا کھانے میں مشغول تھے انہوں نے جواب نہ دیا۔

"ہیں! بولتے نہیں۔ تم ہو کون؟"

بچوں نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا اور "جی" کہا۔

"کون ہو تم! پوچھ رہا ہوں، کیا نام ہے باپ کا؟"

"بفاتی"

"کیا کہا۔ بفاتی؟"

"جی ہاں"

"کیا کام کرتے ہیں؟"

"کھانا پکاتے ہیں۔"

انہوں نے بڑے زور سے ڈانٹ کر کہا "کیا غضب ہے، اٹھو، فوراً اٹھو!"

بچے ڈر گئے، اور کھانا چھوڑ کر گھبرا کر اٹھ گئے۔ براتی صاحب کا غصہ بڑھ رہا تھا "کیا غضب ہے۔ اس بستی کے لوگوں کو عزت اور ذلت کا کچھ خیال ہی نہیں۔ کس نے تم کو یہاں بیٹھنے کے لئے کہا" ——— ان کو بلند آواز سے بولتے دیکھ کر لوگ ادھر جمع ہو گئے ——— جعفر ایک طرف دیکھ بھال کر رہا تھا، وہ بھی آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں بچے کھڑے ہیں۔ ڈر کے مارے ان کے منہ سے آواز نہیں نکلتی، اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں۔ براتی صاحب بولے چلے جا رہے ہیں "بتاؤ تم کو یہاں بیٹھنے کے لئے کس نے کہا؟"

"جی...... جی" بچوں نے کہا۔

جعفر اس کی تاب نہ لا سکا، کڑک کر کہنے لگا "میں نے کہا" اور بچوں سے مخاطب ہوا۔ "تم بیٹھ جاؤ" بچے بیٹھ گئے۔

براتی صاحب اب ادھر مخاطب ہوئے "آپ نے ان کو ہمارے ساتھ بٹھایا ہے؟"

"جی ہاں! آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"بےشک اعتراض ہے۔ آپ کو کوئی حق نہیں تھا کہ ان کو ہمارے ساتھ دسترخوان پر بٹھا دیں"

"کیا میں اس کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟"

"کیا یہ نوکروں کے لڑکے نہیں ہیں؟"

"نوکروں سے کیا مطلب؟"

"آپ نوکر کے معنی بھی نہیں جانتے۔ کیا ان کا باپ کسی کا نوکر نہیں ہے؟"

"کیا آپ کسی کے نوکر نہیں ہیں؟"

"لیکن میں کھانا نہیں پکاتا"

"خدا کا شکر کیجئے قسمت اچھی تھی" سب لوگ ہنس پڑے اور ان حضرت کا پارۂ حرارت نقطۂ اعتدال سے اوپر چڑھ گیا۔

"آپ ہم لوگوں کی بےعزتی کرتے ہیں، اور پھر مذاق اڑاتے ہیں؟"

"بےعزتی خدا نہ کرے آپ کی ہو"

"پھر نوکر کو ساتھ بٹھانے کے کیا معنی؟"

"جناب آج شادی کا دن ہے۔ خوشی ہے۔ اگر بچے آپ کے ساتھ کھانا کھا لیں گے تو کیا حرج ہے؟"

براتی صاحب بےحد غصہ میں تھے "جناب ہم لوگ غیرت دار لوگ ہیں عزت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ برات میں آئے ہ

ہیں، کچھ سرات کے نہیں ہیں۔ آپ کے یہاں نوکروں کو ساتھ بٹھانے کا رواج ہو تو ہو، ہمارے یہاں نہیں ہے"

جعفر کو بھی اب غصہ آرہا تھا "جناب عالی! آپ خواہ مخواہ خفا ہوئے چلے جارہے ہیں۔ برات میں آنے سے کیا آپ کے لعل لگ گئے؟ ہمارے یہاں اس کو بُرا نہیں سمجھتے اس لئے لڑکا کھا رہا ہے۔"

براتی نے اُسی انداز سے جواب دیا "اگر آپ بُرا نہیں سمجھتے تو اپنے دسترخوان پر کیوں نہیں کھلاتے؟"

"تو کیا یہ دسترخوان آپ اپنے ساتھ لیتے آئے تھے؟"

اتنا سُننا تھا کہ براتی صاحب کو جیسے کسی باؤلے کُتّے نے کاٹ لیا۔ چیخ کر کہنے لگے "کہاں گئے ہمارے سمدھی صاحب؟ دیکھ رہے ہیں ہماری بے عزتی؟ کیا اسی لئے ہمیں یہاں لائے تھے؟"۔۔۔ پھر جعفر سے مخاطب ہوئے "سُن لیجیے جناب! اگر آپ ہم لوگوں کو کھانا کھلانا چاہتے ہیں تو ان لڑکوں کو یہاں سے ہٹائیے"

جعفر نے ایک مصمم انداز میں جواب دیا "اب یہ لڑکے بیٹھ چکے ہیں، کھانا کھائے بغیر نہیں ہٹائے جاسکتے"۔ "بہتر تو ہم ہی اُٹھ جاتے ہیں"۔ "آپ کی خوشی" ـــــــــ یہ سُن کر براتی صاحب دو چھلانگ میں کمرے سے باہر ہوگئے۔ اور شور کرنے لگے ـــ "کہاں گیا میرا سائیس۔ کدھر ہے میرا سائیس۔ لاؤ جلدی سے گھوڑا۔ اب یہاں ایک منٹ کے لئے بھی میں ٹھیر نہیں سکتا۔"

ہر طرف ایک طرح کا ہنگامہ ہوگیا۔ سعید سمدھی کی طرف چلے، اور کچھ لڑکے رُوٹھے صاحب کو منانے کے لئے دوڑے ـــــ "ارے صاحب جانے دیجیے، ایسی باتوں کا کہاں تک خیال کیجیے گا۔"

"اب اس وقت اندھیرے میں آپ کہاں جائیں گے۔"

"آپ کے سائیس ہی کا پتہ نہیں ہے۔ شاید سو گیا"

"جانے بھی دیجیے غصّے کو تھوک دیجیے۔"

ادھر سمدھی صاحب رُوٹھ گئے اور بڑبڑانے لگے "میرے براتی کی توہین ہوئی ہے۔ میں ساری برات لوٹائے جاؤنگا۔ لڑکا سلامت رہے، لڑکیاں بہت مل جائیں گی"

سعید نے دانتوں سے انگلی کاٹ لی "آپ کیا فرمارہے ہیں، ایسا بُرا کلمہ تو مُنہ سے نہ نکالیے" ـــــــــ

اِدھر جعفر پر لوگ لعن وطعن کر رہے تھے کہ ساری خرابیوں کے تم ہی ذمہ دار ہو۔ اس کے مخالفوں کو ہنسنے کا موقع مل رہا تھا "یہی ہم کہا کرتے تھے۔ اصلاح کا بھی موقع اور محل ہوا کرتا ہے" جتنے مُنہ اتنی ہی باتیں تھیں۔ سلطان احمد بہت پریشان تھے، کہ کہیں سچ مچ سمدھی برات واپس نہ لے جائیں۔ بہت کہنے سُننے پر سمدھی صاحب راضی ہوئے کہ اگر جعفر صاحب باضابطہ معافی مانگیں تو خیر اب بھی معاملہ درست ہو سکتا ہے۔"

سعید جعفر کو علیحدہ لے گئے "جعفر اب تو بڑی مشکل کا سامنا ہے، وہ لوگ رُوٹھے چلے جارہے ہیں"

"تو فرمائیے اب کیا کیا جائے؟"

"وہ تم سے معافی منگوانے کے لئے کہہ رہے ہیں"

"اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو بسر وچشم۔ لیکن کس بات کی معافی مانگوں؟"

"غالباً ان سے سختی سے گفتگو کی تھی اس کی"

"لیکن سعید بھائی میں نے تو صرف واقعات کا اظہار کیا تھا"

"واقعات میں جب سچی باتیں ہوں تو تلخ معلوم ہوتی ہیں"

اتنے میں سعید کے والد بھی وہیں پر آگئے۔ بیچارے بے حد پریشان تھے کہنے لگے "بیٹا جعفر! میں جانتا ہوں، تم نے کوئی ایسی بُری بات نہ کی، لیکن اس وقت اپنے خاندان کی عزت اُنہیں لوگوں کے ہاتھ میں ہے"

جعفر کو ان کی پریشانی دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ کہنے لگا "میں نہایت نادم ہوں، میری وجہ سے ایسی پریشانی ہوئی۔ ماموں جان آپ اطمینان رکھیے۔ میں ابھی جاتا ہوں، مجھے یقین ہے وہ لوگ مان جائیں گے۔" مگر دل ہی دل میں وہ بہت ڈر رہا تھا۔ وہ جہالت کی ضد سے واقف تھا۔ وہ تنگ خیالی کی ہٹ کو جانتا تھا۔ وہ دل میں عہد کر چکا تھا کہ اپنے سماج کی خرابیوں کو دُور کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ چاہے اس میں بدنامی ہی کیوں نہ ہو۔ آج اس کا امتحان تھا۔ یا تو اپنے اصولوں پر قایم رہے یا پھر مخالفت کے آگے سر جھکا دے۔

برات میں بڑا شور وغل ہو رہا تھا۔ ہر شخص بحث کرنے کی اور اپنے کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صرف ایک نوشہ تھا جو ایک طرف گم سُم بیٹھا تھا۔ دوسری طرف اس کے والد اور رُوٹھنے والے صاحب گفتگو کر رہے تھے۔ روٹھنے والے صاحب ابھی تک گرم تھے۔ بار بار کہہ رہے تھے "میں براتی

دو تین براتوں میں جاتا ہوں - جوار کی کون سی مشہور برات ہے جس میں میں نہیں گیا - اجی یہ تو بہت بڑی بات ہے - حسن الدین خاں کے لڑکے کی شادی میں تو صرف اس واسطے کہ گوشت میں نمک زیادہ تھا ساری برات لوٹ گئی - اور اُس کے بعد جو مقدمہ بازی چلی تو دونوں دو تین لاکھ کے مقروض ہو گئے - اور دونوں گھر تباہ ہو گئے یہ لوگ تھے غیرت پر مر مٹنے والے - خدا جانے آپ کو کیا ہو گیا ہے"

سمدھی اپنے کو حسن الدین خاں سے نیچا کب سمجھتے تھے، ان کا غصہ بھی بڑھ رہا تھا ——— سعید اور ان کے ساتھی جو آتے نظر آئے تو روٹھے حضرت اور زور سے بولنے لگے "بس اب ہم سب لوگوں کو یہاں سے واپس چلنا چاہیئے - سمدھی صاحب! آئندہ آپ کسی کو شرکت کی دعوت دیں تو اس کا خیال رکھیں کہ اس کی توہین تو نہ ہو" نوشہ کے والد بھی ہاں میں ہاں ملاتے چلے جا رہے تھے -

سعید اور جعفر وغیرہ نزدیک آ گئے اور ادھر کے لوگ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے - سعید کے پیچھے بستی کی پوری خلقت تھی - انہوں نے سمدھی سے کہا "معاف فرمائیے - ہم لوگوں کے سبب آپ کو بہت پریشانی ہوئی - جعفر صاحب موجود ہیں"

رُوٹھنے والے صاحب نے بات کاٹ کر کہا "بس بس اب ہم لوگ کچھ سُننا نہیں چاہتے - اس کا آپ کو اسی وقت خیال ہونا چاہیئے تھا"

سعید نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "جعفر صاحب معافی مانگنے کے لیئے تیار ہیں"

سمدھی جعفر سے نہایت پُرغرور انداز میں مخاطب ہوئے -

"آپکو معلوم نہیں کہ براتی کا درجہ بلند ہوا کرتا ہے"

"جی نہیں یہ تو مجھے نہیں معلوم"

"اور میرا ہر مہمان اتنی ہی عزت کے لائق ہے جتنا میں ہوں"

"یہ آپ بالکل درست فرما رہے ہیں -"

پھر آپ نے کس طرح میرے مہمان کی توہین کی"

"میں نے آپ کے مہمان کی کوئی توہین نہیں کی"

"آپ پھر وہی بات دہرائے چلے جا رہے ہیں - کسی نوکر کو ساتھ بٹھا دینا آپ کے نزدیک توہین نہیں ہے"

"لیکن آپ تو خود صاحب عقل ہیں - اس کے بیٹھ جانے سے ہمارے معزز مہمان کی توہین کس طرح ہو گئی؟"

"ہمارے آباد اجداد نے اس اصول کو پسند نہیں کیا ہے، اور ہمیں آپ سے زیادہ اپنے بڑوں کا اصول پسند ہے -"

"لیکن مہمانِ محترم! کیا آپ کے آبا و اجداد کے پسند ناپسند سے اسلام کے اصولوں میں فرق پڑ جائیگا - کیا آپ کے سماج کو خوش رکھنے کے لئے اسلامی مساوات کا اصول بھُلا دیا جائیگا - کیا ہماری معاشرت میں بھی چھُوت چھات کی لعنت نے اپنا گھر بنا لیا ہے؟"

روٹھے ہوئے صاحب پھر بول اٹھے "آپ کو لعنت کرنا ہو اپنے اوپر کیجیئے، اور وعظ کرنا ہو، مسجد جائیے"

اس کج بحثی سے جعفر جھلا اُٹھا "آپ کی سمجھ تو اُلٹی معلوم ہوتی ہے، میں لعنت بھیج رہا ہوں چھُوت چھات پر اور آپ اپنے اوپر لئے چلے جا رہے ہیں"

رُوٹھے صاحب ایک دفعہ پھر خفا ہو گئے - کھانا نہ کھانے سے ذرا ان کا مزاج تیز ہو گیا تھا "اور سُنئے میری سمجھ اُلٹی ہے، کیوں صاحب! میری سمجھ اُلٹی ہے؟" سُن رہے ہیں سمدھی صاحب! میری رسوائی ہو رہی اور آپ کے کان پر جوں نہیں رینگتی - میں نے ایسی بودی برات آج تک نہیں دیکھی تھی - اچھا خدا حافظ" ——— یہ کہہ کر وہ اپنے سائیس اور گھوڑے کو پکارتے ہوئے پھر آگے بڑھے - سمدھی نے ان کو پکڑ لیا - "ذرا ٹھیر جاؤ - اس میں تمہاری میری دونوں کی بے عزتی ہے - میں ابھی فیصلہ کئے دیتا ہوں" ——— یہ کہہ کر وہ غصہ میں بھرے ہوئے سلطان احمد صاحب کے قریب گئے "سُنئیے جناب آپ نے لونڈوں کو انتظام سپرد کر کے میری بڑی بے عزتی کرائی ہے اب تک میں بہت خاموش رہا - براتیوں کو چائے ٹھنڈی ملی - میں کچھ نہ بولا - شربت پھیکا تھا، میں خاموش رہا - لیکن صبر کی ایک حد ہوتی ہے - آپ اس قصّہ کو فوراً یہیں پر ختم کیجیئے - ورنہ میں واپس جاتا ہوں - ساری برات کو واپس لے جاؤنگا - نوشہ کو واپس لیجاؤنگا"

سلطان احمد صاحب پر جوش اور اضطراب سے لرزہ طاری ہو گیا - برات واپس لیجانے کے لفظ نے ان کے ذہن کو موجودہ واقعات کے لئے بیکار کر دیا - اور ان کے سامنے انیس سال پہلے کا نقشہ پھر گیا - ان کو وہ وقت یاد آیا جب یہ بچی پیدا ہوئی تھی - اور اس کو دیکھنے کے لئے وہ پہلی بار گھر کے اندر گئے تھے - اور اس کی ماں نے جس کے چہرے پر مسرت کی ایک خفیف جھلک تھی، بچّی کو سامنے کرتے ہوئے پوچھا "کیا آپ مایوس ہوئے؟"

سلطان احمد نے حیرت سے کہا "نعوذ باللہ! ایسا کیوں کہتی ہو؟

خدا مبارک کرے "

" لوگ کہتے ہیں کہ بیٹا ہو تو اچھا ہے "

" زمانہ جاہلیت کی باتیں ہیں "

" لوگ کہتے ہیں کہ بیٹی کی شادی کی فکر میں والدین کو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ اس سے بیٹی نہ ہی پیدا ہو تو اچھا ہے "

" توبہ کرو۔ توبہ کرو! اس میں شک نہیں کہ ہم لوگوں میں غیر قوموں کی بری رسمیں بہت آگئی ہیں۔ لیکن ہماری قوم گر گر کے بھی اتنا نہیں گری ہے کہ بیٹی کو برا سمجھنے لگے "

" تو آپ خوش ہیں؟ "

" بہت خوش۔ بہت دنوں کے بعد گھر میں چاند آیا ہے "

بیوی نے ہنس کر پوچھا " اور ہمارے بیٹے؟ "

" بیگم! گھر کی رونق تو گھر ہی کے چراغ سے ہوتی ہے۔ سڑک پر گیس جلے یا بجلی۔ ذرا اپنے بیٹوں کو کچھ اور بڑھ لینے دو۔ تھوڑے دنوں میں نہ وہ میری سنیں گے نہ تمہاری۔ وہ تو باہر ہی کی روشنی بن کر رہیں گے "

اس گفتگو سے دونوں ہنس پڑے۔

پھر سلطان احمد کو وہ زمانہ یاد آیا جب ان دونوں نے مل کر اس بچی کی تعلیم تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اور پوری کوشش کی تھی کہ بچی کو ایسی سلیقہ شعار اور ہنر مند بنا دیں، جس گھر میں وہ جائے مبارک قدم ثابت ہو اور اپنے ماں باپ کا نام اونچا کرے۔

اس کے بعد ان کو وہ وقت یاد آیا جب بچی سولہ برس کی ہو چکی تھی اور بیوی کے اصرار سے انہوں نے لڑکے کی تلاش شروع کی تھی۔ اس وقت اور صرف اسی وقت ان کو معلوم ہو سکا تھا کہ ان کی قوم کس درجہ نیچے گر چکی ہے اور اس کے نوجوان کس قدر بے غیرت ہو چکے ہیں ـــــ کیا کوئی گھر انہیں ایسا بھی ملا جو چھوٹتے ہی یہ سوال نہ کرے کہ آپ کتنا روپیہ دیں گے؟ نہیں ـــــ کیا کوئی باپ ایسا دکھائی دیا جو یہ کہے کہ آپ جو کچھ دیں گے، اپنی بیٹی کو دیں گے۔ مجھے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ میری بہو کیسی آئیگی؟ ـــــ نہیں ـــــ کیا انہیں کسی نے یہ بھی کہا کہ میں شادی بیاہ میں مطالبات کا قائل نہیں۔ یہ تو خوشی کی بات ہے جو ہم سے ہو سکے گا ہم کریں گے۔ جو تم سے ہو سکے تم کرو؟ نہیں ـــــ کیا انہیں کوئی ایسا غیرت دار نوجوان نظر آیا جو اپنے کو ایک بے جان بے حس لکڑی کے ٹکڑے کی طرح بکتا ہوا دیکھ کر جوش میں آجائے۔ اور صاف کہہ دے کہ میں شادی روپیہ سے نہیں کروں گا ـ نہیں نہیں نہیں۔

وہ جہاں گئے روپیہ کی فرمائش۔ جدھر نگاہ اٹھائی لین دین کا قصہ۔ کہیں جواب ملتا لڑکا بی اے ہے۔ شادی سے پہلے استاد دینا ہوگا۔ کہیں کہا جاتا کہ شادی کے لئے تیار ہیں لیکن نوکری دلانے کا وعدہ کرنا ہوگا۔ کہیں مطالبہ ہوتا کہ آپ اپنی بیٹی کو جتنا زیور دینا چاہتے ہیں پہلے اس کی فہرست دیجئے ـــ اور پھر غضب پر غضب یہ کہ بہت سے نوجوان ایسے بھی نظر آئے جنہیں ہونے والی سسرال سے روپیہ کا مطالبہ کرتے کسی قسم کی شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔

تین سال کی کوشش اور محنت کے بعد ایک لڑکا ایسا نظر آیا جس کے گھر والوں کے مطالبات کچھ کم تھے۔ اور وہ خود تعلیم یافتہ تھا اور اس کے ساتھی اس کو روشن خیال کہا کرتے تھے۔

سلطان احمد صرف نکاح کے قائل نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ نکاح اور رخصتی ساتھ ساتھ ہو۔ لیکن لوگوں نے انہیں سمجھایا کہ زمانہ کی روش کو دیکھئے۔ اگر آپ دیر کریں گے تو کیا معلوم کہ کوئی دوسرا بیٹی والا اونچی بولی بول دے۔ کم از کم بات پکی کر کے منگنی کر لیجئے اور جلد از جلد شادی طے کیجئے۔ چنانچہ منگنی ہو گئی اور طے یہ پایا کہ چھ مہینے بعد شادی ہو جائے۔ اس کی خبر تمام اطراف و جوار کے لوگوں کو ہو گئی۔

بات پکی ہو گئی۔ منگنی ہو گئی۔ لیکن لوگ یہ بھول گئے کہ کوئی چاہے تو اس موقع سے کافی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ سلطان احمد کے سمدھی نے روپیہ کا مطالبہ نہیں کیا۔ لیکن اپنی مجبوری اور اپنے روپے کی کمی کو ان پر ظاہر کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی۔

چھ مہینے ہو گئے، لیکن لڑکے والوں کی طرف سے شادی کا کوئی ذکر نہیں ہوا تو لوگ ذرا چونکے ہوئے۔ خط و کتابت شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ روپیہ کا انتظام ہو رہا ہے۔ تین مہینہ بعد شادی ہو جائیگی۔ تین مہینے جب گذر گئے تو جواب آیا کہ ابھی تک انتظام نہیں ہوا ہے۔ لوگوں نے سلطان احمد کو رائے دی کہ یہ سب بہانہ ہے قیامت تک انتظام نہ ہو سکے گا۔ آپ کسی بہانے سے روپیہ ان کو بھجوا دیجئے ـــــ چنانچہ یہی ہوا۔ کپڑے کے بہانے روپیہ بھیجا گیا، اور برات آگئی۔

اتنی مالی زیر باری اور پریشانی کے بعد تو برات آئی - اب اسکے واپس جانے کا خیال کرکے اور اپنی بے عزتی کو محسوس کرکر ان پر سکتہ طاری ہوگیا - وہ بولنا چاہتے تھے، لیکن بول نہ سکے۔

جعفر نے آگے بڑھ کر کہا "جناب! جھگڑے کا بانی میں ہوں - آپ ماموں جان سے کیا کہتے ہیں - مجھ سے کہئے "

" آپ کو معافی مانگنی ہوگی - "

" میں حاضر ہوں - کس بات کی معافی مانگوں؟ "

" آپ نے ان کی توہین کی ہے، اس کی معافی مانگئے "

" اگر میری باتوں سے آپ کی توہین ہوئی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں - "

" روٹھے باراتی کچھ خوش ہوئے - لیکن اُسی مصنوعی آواز میں کہنے لگے " آپ کی باتوں سے نہیں، آپ کی حرکات سے میری توہین ہوئی ہے، آپ اس کی معافی مانگیں ورنہ ابھی ابھی برات واپس جاتی ہے "

" صاحب کہہ تو رہا ہوں کہ اگر میری باتوں یا میری حرکات سے آپ کی توہین ہوئی ہے تو اس کی معافی مانگتا ہوں - "

" آپ معافی مانگتے ہیں یا ڈانٹتے ہیں؟ کہئے کہ دسترخوان پر جو آپ نے ان لڑکوں کو بٹھا دیا وہ بڑی غیر شریفانہ بات تھی "

جعفر بڑی مشکل سے ضبط کر رہا تھا -

" جناب عالی! میں اس کو ماننے کے لئے تیار ہوں کہ ان کے بٹھانے سے ممکن ہے کہ آپ کی توہین ہوئی ہو - لیکن میں اسے غیر شریفانہ بات نہیں کہہ سکتا، میں مجبور ہوں - "

" سمدھی نے خفا ہو کر کہا کہ تو آپ معافی نہیں مانگیں گے؟ "

" جناب میں معافی تو مانگ چکا - لیکن آپ معاف ہی نہ کرنا چاہیں تو میں کیا کروں - آپ کو خوش کرنے کیلئے میں اپنے عقائد تو نہیں بدل سکتا "

سمدھی جوش میں آکر کہنے لگے " ہم لوگوں کو خوش کرنا آپکا فرض ہے - ہم لوگ اس وقت غرض کے بندے نہیں ہیں، آپ ہیں - کنواں پیاسے کے پاس نہیں آتا - سمجھ لیجئے "

رُوٹھنے والے صاحب بولے " معلوم ہوتا ہے ان لوگوں میں شرافت نہیں ہے - لڑکے کیلئے آپ کو کہیں اور دیکھنا تھا "

سمدھی بولے " ٹھیک کہتے ہو، بالکل ٹھیک کہتے ہو - میں نے یہاں نسبت کرنے میں اپنی عزت کھوئی - "

اتنا سُننا تھا کہ سلطان احمد ضبط کی حد سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر کہا " بس بس بہت ہوا - دنیا میں ایک عزت والے آپ ہی تو رہ گئے ہیں؟ شام سے عزت - عزت - عزت - ایک رٹ لگا رکھی ہے - اگر تم لوگوں میں غیرت اور شرافت ہوتی اور دوسروں کی عزت کا ذرا بھی خیال ہوتا تو اس وقت جو کچھ بول رہے ہو ہرگز نہ بولتے ——— لڑکے کیلئے آپ دوسرا گھر ڈھونڈ لینگے - آپنے یہاں نسبت کرکے عزت کھوئی جیسے آپ نے ہم پر بڑا احسان ہی تو کیا؟

جاہلو! بدتہذیبو! تم کو عزت اور بے عزتی سے کیا مطلب تم کو تو پیسہ چاہئے - پیسہ، میرا لڑکا بی اے ہے، اس کی قیمت میں زیور لاؤ - نوکری لاؤ - جہیز لاؤ - سب کچھ لاؤ - اور نہ ہو سکے تو قرض لیکر لاؤ - گھر بیچکر لاؤ - تم کو کیا خبر کہ آجکل کے بی اے گھاس کھودنے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے - "

سمدھی صاحب بھی ترکی بہ ترکی جواب دینا چاہتے تھے - " اب ہم لوگ زیادہ نہیں سُننا چاہتے - خاموش رہیئے ورنہ بعد میں پچھتایئے گا "

سلطان احمد کا غصہ اور بھی بڑھ گیا " بہت ہوئی خاموشی، اور بہت ہوئی معافی - جب تک تمہاری ذہنیت کے لوگوں کا دماغ درست نہ کیا جائیگا، ہماری تباہی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا - آخر تم یہ دھمکیاں کیوں دے رہے ہو؟ صرف اسی سبب سے کہ تم جانتے ہو کہ ہماری سماج کا باوا آدم ہی نرالا ہے - برات واپس جائیگی، لڑکی والوں کی جگ ہنسائی ہوگی - چاہے ان کا قصور کچھ نہ ہو - لڑکی کی تباہی ہوگی چاہے وہ معصوم ہی کیوں نہ ہو - تم تو لڑکے والے ہو - کہیں نہ کہیں سودا کر ہی لوگے "

اتنا سُننا تھا کہ سمدھی آپے سے باہر ہوگئے " بس قصہ ختم ہے اُٹھاؤ سامان - بس ہم لوگ ابھی ابھی واپس ہو جائیں گے - یہاں اب ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتے - ہم کوئی گرے پڑے نہیں ہیں - میرا لڑکا تعلیمیافتہ ہے - اس پر سے ہزاروں لڑکیاں قربان - اٹھاؤ سب سامان چلو ابھی چلو "

سعید کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا - غصہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے - اس نے اسی شور و غل میں چیخ کر کہا " چلے جاؤ ابھی چلے جاؤ - جہنم میں ملو - اپنا منہہ کالا کرو - اور جہاں زیادہ دام ملیں اپنے لڑکے کو بیچ دو - تم کو لڑکی کی رسوائی اور لڑکے کی خوشی سے کیا بحث .... "

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا - اتنے میں آواز آئی " ذرا ٹھہر جائے "

شادی کے تحفے

از جناب پروفیسر سیّد اختر احمد صاحب اختر۔ اورینوی ایم اے

اِس کا مجھ سے پردہ تو نہیں تھا، مگر میرے اور ثروت کے درمیان حجاب حائل تھا، گہرا حجاب۔ اس کی شادی ہونیوالی تھی۔ اس بات نے شرم میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ جیسے جھاڑیوں کے درمیان ہرن چھپ جائے اور پھر نمودار ہو، اسی طرح وہ سائبان میں چلتی پھرتی ہوئی، پایوں کی آڑ میں مجھے دیکھ کر روپوش ہو جاتی تھی اور کبھی دوڑ کر مچلتی ہوئی چوٹی کے ساتھ در و دیوار کی اوٹ میں غائب ہو جاتی۔ میں نے اسے بال سنوارتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اس کے سیاہ گھنیرے گیسو بڑے پیارے تھے، گھنے اور شاداب جنگل کی طرح سکون آفریں۔ وہ اپنی کوٹھری کی چوکھٹ پر اندر کی جانب رُخ کئے نادان سی کھڑی ہو جاتی۔ اس کے آبشار نما بال اس گوری گردن اور بھری بھری پیٹھ پر اس طرح چھا جاتے جیسے سنگ مرمر پر کائی جم گئی ہو۔ ثروت جانتی بھی ہوتی کہ میں کہیں سے یہ منظر دیکھ رہا ہوں، تو بھی وہ انجان بنی ہوئی دیر تک اپنی زلفوں کو اپنی نازک کمر کی طرح مچلنا اور بل کھانا سکھاتی رہتی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ یک بہ یک پیچھے مڑ کر دیکھتی، میری اس کی آنکھیں چار ہوتیں اور وہ شرمائی ہوئی مسکراہٹ کی کلیاں کھلاتی ہوئی ساون کی ہوا کی طرح لہرا کر روانہ ہو جاتی۔

ایک روز میں گھر کی لائبریری میں بیٹھا ہوا دل بہلانے کو اُردو رسالے اور کتابیں اُلٹ پلٹ رہا تھا، محض دل بہلانے اور پریشانیوں سے دو گھڑی کے لئے نجات حاصل کرنے کو۔ میں دو سال سے ملازمت کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا تھا۔ میری شادی کو چار سال ہو چکے تھے اور اب بیکار رہنا میرے لئے دوبھر ہو رہا تھا۔ باپ اور سسر کی عنایتوں پر جیے جانا، دوسروں کے نزدیک اگر باعثِ ننگ نہ بھی ہو تو میری اُدرح کے لئے سوہان ضرور تھا۔ پھر باپ اور سسر بیچارے بھی کیا۔ وہ لوگ اپنے انتہائی خلوص کے باوجود بھی میری پوری مدد نہیں کر سکتے تھے۔ آجکل شرافت نبھانا بھی بہت ہی کٹھن کام ہے۔ کالج کی تعلیم کا خرچ برداشت کرنے کے بعد والد صاحب میں بھی اب اتنا دم کہاں تھا۔ کہ وہ میری بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرتے رہتے۔ اور میرے سسر صاحب کو بھی کئی اور لڑکیاں بیاہنی تھیں۔ غرض میں غمِ روزگار کی گتھیاں سلجھانی چاہ رہا تھا، اور اُلجھنیں اور زیادہ بڑھتی جا رہی تھیں۔ رسالوں اور کتابوں کے اوراق میں بے معنی طور پر اس طرح اُلٹ رہا تھا، جیسے خزاں کی ہوا باغ میں آم کے پتے اِدھر اُدھر اڑاتی پھرتی پھر رہی ہو۔ میں دل میں زندگی کا نشتر اور بے روزگاری کی چبھن محسوس کر رہا تھا۔ میرے جذبات کے دھارے بیزاری اور تلخی کی سوت سے ملے ہوئے تھے۔ میں اسی حال میں تھا کہ میں نے سائبان میں اُبلتی ہوتی شیریں زندگی کے قہقہے سُنے۔ چند لڑکیاں گنگھرو کی طرح ایک دوسرے سے اُلجھی ہوئی نغمہ آفریں تھیں۔ کچھ پیاری چہلیں تھیں، کچھ طنز آمیز منت سماجت۔ کچھ حسین مسکراہٹیں، اور کچھ ایسی ادائیں جن میں رقص، نغمہ اور تصویر کا جمال ملا جلا پایا جاتا تھا۔

"دُلہا بھائی.......! یہ ہے ثروت.......!
آپ ہی دوڑ کر آ جائیے نہ....... اری ثروت! تو نخرے کیا کرتی ہے!"
یہ نزہت کی آواز تھی۔

"اُوں اُوں....... مجھے چھوڑ دو....... میں بگڑ جاؤنگی" ثروت نے نخرے کئے۔

"چل! بڑی بگڑنے والی آئی ہے! ہر گھڑی دولہا بھائی کو تکتی رہتی ہے اپنی کوٹھڑی سے اور یہاں آ کر باتیں بناتی ہے.......
......" ثریا نے شوخ لہجے میں کہا۔

"تو بڑی تکتی ہوگی دولہا بھائی کو۔ واہ میں کیوں تکوں!
... میں دولہا بھائی سے پردہ تھوڑا ہی کرتی ہوں" ثروت منمنائی۔

"تو پھر سیدھی ہو کر چلتی کیوں نہیں دلہا بھائی کے پاس"
——— ثریا بولی۔

"تو مجھے چھوڑ تو دے۔ میری چوڑیاں گئیں———"
ثروت نے ناز کیا۔

"لے چھوڑ دیا۔ اب آ! لائبریری میں دُلہا بھائی بیٹھے ہیں
.... دُلہا بھائی بھی تو عجب اُلّو ہیں۔ دوڑ کر آ کیوں نہیں جاتے"
نزہت اور ثریا نے ثروت کو چھوڑتے ہوئے ایک ساتھ کہا۔ دوسری لڑکیوں کی ہنسی کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں........ ٹھیک اسی

موقعہ پر میں لائبریری سے باہر سائبان میں آنکلا۔

"لو میں آ گیا" میں نے کہا۔

جھپاک سے ثروت لڑکیوں کے ہاتھ سے چھوٹ کر بھگی۔ یہ گئی وہ گئی۔ مگر جاتے جاتے ایک دفعہ مڑ کر پیچھے دیکھ ہی لیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اُس کا چہرہ لالہ گوں ہو رہا تھا، اُس کا آنچل ناہموار تھا۔ اور اُس کی موٹی سی چوٹی ابروان کے پلو میں اُلجھ کر کیچلی دار سیاہ ناگن کی طرح بل کھا گئی تھی۔ لڑکیاں عقد ثریا سے کہکشاں بن گئیں، اور میں ایک شہاب ثاقب کی طرح ثروت کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔ نہ معلوم میرے احساس کی تلخی اور بے کیفی یک بہ یک دُور کیسے ہو گئی۔ ہم لوگوں نے ثروت کو اس کی کوٹھڑی میں جا پکڑ پایا۔ اور اُس کے بعد ثریا نے اُسے فریب دہی کی خوب خوب سزائیں دیں۔

ثروت کی سزا ہوئی سو یا نہیں، مگر مجھے تو دوڑ دھوپ کی فوری جزا مل گئی۔ میں نے ثروت کو جی بھر کے دیکھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے بعد سے حجاب کہرے کی طرح غائب ہو گیا اور اب ثروت مہر درخشاں کی طرح میرے سامنے آیا کرتی تھی۔

ثروت دن میں کئی بار میرے پاس آ کر بیٹھا کرتی اور کبھی میں خود اُس کی کوٹھری میں جا نکلتا۔ وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ اور میں اُس سے کافی ہل مل گیا تھا۔ ثروت دیر دیر تک باتیں کرتی رہتی، معمولی معمولی سی باتیں، بیکار بیکار سی باتیں، مگر ان باتوں میں بڑا رس ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ادنیٰ سی باتیں بہت ہی ضروری ہیں۔ اُس کی آنکھیں بہت زیادہ خوبصورت نہ تھیں مگر بڑی زندہ اور گویا آنکھیں تھیں۔ اُن میں گلابی گلابی نازک ڈورے رگِ گُل کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ ان آنکھوں میں سکون پرور گہرائی تھی۔ میں اپنا درد و غم اس رسیلے ساگر میں غرق کر دیتا تھا۔ مگر راکشش کی طرح اگر ایک غم کا سر کاٹ بھی لیا جائے تو اس کے سیکڑوں شاخسانے نکل آتے ہیں۔ میں جب ثروت سے علیحدہ ہو جاتا تو غم روزگار کے ہزاروں آرے دل پہ چلنے لگتے۔ لہٰذا میں کوشش کرتا کہ اکثر ثروت سے باتیں کروں اور اس کی تسکین بخش آنکھوں کے سایہ میں زندگی گذاروں۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ ثروت بھی مجھ سے باتیں کر کے خوش ہوتی ہے۔ اس کی حسین آنکھیں گفتگو کے وقت چمکنے لگتیں۔ اور گلابی ڈوریاں سُرخ ہو جاتیں۔ اثنائے گفتگو میں وہ یک بہ یک شرما بھی جاتی۔ اُس کے اس اچانک اظہار حیا میں ایک خاص دلفریبی تھی۔

میری بیوی پروین بہت ہی اچھی دلہن تھی۔ میں اُسے بیحد چاہتا تھا۔ اور وہ بھی مجھ سے والہانہ محبت کرتی تھی۔ ہم لوگ اچھی اچھی باتیں بھی کرتے تھے اور بہت سے امور میں باہم مل کر دلچسپی لیتے تھے۔ مگر جب سے میری پریشانیوں کی سرحد ناامیدی سے جا ملی تھی میں اپنی بیوی سے آنکھیں چراتا تھا۔ میں اس کے پاس یہ محسوس کرتا تھا کہ میں ناکامیاب حیات ہوں۔ اس کے قرب سے میرے وقار کو ٹھوکر لگتی تھی۔ میں ناکارہ ہوں اور اپنی بیوی کی کفالت نہیں کر سکتا، یہ خیال مجھے ستانے لگتا تھا۔ میری بیوی میری اس سریع الحسی کو اپنی نسائی جبلت سے محسوس کرتی تھی۔ اور غمگسارانہ طور پر اندر ہی اندر گھُلتی رہتی تھی۔ میں جب خوش نظر آتا تو وہ میری کمیاب خوشی کا خیر مقدم کرتی۔ میں ایک دو سال سے اپنے سسرال میں تھا۔ اور سسرال کے رشتہ داروں سے کافی واقف ہو گیا تھا۔ اب کوئی انوکھا نہیں رہا تھا۔ سالے، سالیاں، سرہجیں سبھی روزانہ کی چیزوں کی طرح پھیکی ہو چلی تھیں، اور میری موجودہ مایوسانہ حالت میں تو کسی بات میں بھی مزہ نہیں ملتا تھا۔ سیر دریا، شکار، صحبت احباب، نازنینانِ حرم کی چہلیں سب بے مزہ تھیں۔ لے دے کر اچھی ہوئی کتب بینی اور ادھوری مضمون نگاری رہ گئی تھی، میرا زیادہ وقت لائبریری میں گذرتا تھا یا بستر پر۔

ثروت کو میں نے پہلے پہل دیکھا تھا۔ میں نے جانا کہ اس کا نیا پن شاید میرے لئے سامانِ کشش ہے۔ ممکن ہے یہی ہو مگر مزید تجزیۂ حالات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ثروت میں کچھ ایسی باتیں بھی تھیں جو دوسروں میں نہیں تھیں۔ مثلاً اُس کی سادگی اور ایک گونہ دیہاتی پن۔ ان کے علاوہ چند اور ایسی معمولی خوبیاں جن کا اگر میں تذکرہ کروں تو آپ ہنس دیں گے کہ یہ باتیں بھی سامانِ کشش ہوتی ہیں۔ مگر اکثر یہی ناقابل بیان چھوٹی چھوٹی باتیں ہی دل موہ لینے والی ثابت ہوتی ہیں۔ ثروت حسین نہیں تھی، لیکن اس کی اداؤں میں انہیں چھوٹے چھوٹے سادہ، مگر چمکتے ہوئے نشتروں کی ارزانی تھی۔

ثروت کی شادی کو اب گنے ہوئے چند دن رہ گئے تھے۔ مہمان آنے شروع ہو گئے تھے۔ گھر میں زندگی اور شادمانی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ میں کہ اپنا زیادہ وقت الگ تھلگ ہی

گزارا کرتا تھا۔ اب اپنے حجرے سے باہر نکل آیا تھا۔ عام دلچسپیوں کی کشش سے نہیں بلکہ ثروت کی جادو نگاہوں کے اثر کے ماتحت۔ ہم لوگوں کے درمیان ایک بہت ہی لطیف یگانگی کا احساس تھا۔ آپ کہیں گے جنسیات۔ جی ہاں جنسیات مگر جنسی اپیل کی بہت سی سطحیں ہوتی ہیں۔ دنیا میں کونسا جذبہ، کون سی خواہش ایسی ہے۔ جس کا نفسیاتی تجزیہ آپکو جنسیات تک نہ پہنچا دے۔ میں جیٹھ کے جھلسے ہوئے پودے کی طرح تھا۔ بارش کا ایک ننھا قطرہ بھی میرے لئے امرت سے کم نہ تھا۔ عورت زندگی کی سب سے بڑی رحمت ہے۔ اگر عورت کی فردوس بہ کنار نگاہوں کے ایک گوشے میں بھی زندگی کی لڑائی سے تھکے ہوئے مرد کو تھوڑی سی جگہ مل جائے تو وہ اس کے لئے ایک نعمت سرمدی ہے۔ عورت کی صرف ایک نظر التفات، ایک ہلکی سی یگانگی، ایک حقیر سی توجہ بھی کمہلائی ہوئی زندگی کے لئے سامان شگفتگی ہے۔ مگر زندگی کے اتھاہ ساگر میں عورت کی مسکراہٹ بھی سورج کی کرنوں کی طرح سطح سے تھوڑی ہی نیچے جا سکتی ہے۔ اس کے بعد تاریکیاں اور ایک سنجیدہ گہرائی

ثروت میرے لئے بہار کی ہوا کی گذر جانے والی ایک لطیف و نازک لہر تھی۔ جس نے میرے احساسات کو گدگدایا اور بس۔ دوسری لڑکیوں نے مگر اس سے کچھ زیادہ محسوس کیا ——— میں ان کے تخیل کو کیا کروں ———!

"ثروت بہت خوبصورت ہے دلہا بھائی؟" ایک دفعہ ایک لڑکی نے خاص تیور سے دریافت کیا۔

ایک صاحبہ نے طنز سے فرمایا ——— "نئی سالی کے سامنے پرانے لوگوں کو کون پوچھتا ہے"

میں ان سوالوں کا جواب کچھ اس طرح دیتا ———

"آپ لوگ شادی کے ہنگاموں میں اُلجھی ہوئی ہیں بتائیے باتیں کس سے کروں ——— اُلٹی بات! آپ لوگوں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے یا میں نے؟ ...."

میں نے لڑکیوں کو آپس میں بھی چہ میگوئیاں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میری بیوی کو اس چھیڑ چھاڑ میں بہت لطف آتا تھا۔ ایک دفعہ وہ کہنے لگی۔

"آپ کی سب سالیاں اور سرہجیں آپ سے بگڑی ہوئی ہیں۔ ثروت پر فقرے کسے جاتے ہیں ......" میں ہنس دیتا۔

ثروت بھی اپنی بڑی بہن سے اکثر میری ہی باتیں کرتی۔ آج دولہا بھائی سے یہ باتیں ہوئیں۔ آج انہوں نے یہ کہا، آج یہ ہوا وہ ہوا۔

"تو تو دولہا بھائی کے لئے پاگل ہو رہی ہے ....."

ریحانہ ٹالتی ہوئی مسکرا کر کہتی۔

"نہیں دلہا بھائی بہت اچھے ہیں آپا۔ آپ تو اُن سے ناحق کا پردہ کرتی ہیں۔ وہ بڑے ملنسار ہیں، اور پھر باتیں کتنی بنانی جانتے ہیں ...."

"دفعہ ہو اپنے دلہا بھائی کے پاس پھر۔ مجھے کام کرنے دے۔ ابھی درجنوں شلوکے گوٹ ٹانکنے کو پڑے ہوئے ہیں۔ اور اس ہفتہ میں تیری برات آرہی ہے" ریحانہ آپا ثروت کو ہونٹ کے غصے کے ساتھ جواب دیتیں۔

ثروت کو مائیوں بٹھا دیا گیا تھا۔ اب اس سے ملنے کا بہت کم موقعہ ملتا۔ پھر بھی شام کو جب لڑکیاں اور مہمان بیبیاں دوسری انگنائی میں گیت گانے میں مشغول ہو جاتیں تو ثروت اپنی بڑی بہن کے لڑکے کو بھیج کر مجھے مردانہ سے پختہ آنگن میں بلوا بھیجتی اور کہتی کہ ہر شخص مشغول ہے، اکیلے طبیعت نہیں لگتی، باتیں کیجیے۔

ثروت کی شادی کے دن بہت ہی قریب آگئے۔ ایک روز میری بیوی نے رکتے رکتے کہا۔

"سبھی رشتہ دار عورتیں مانجا دے رہی ہیں۔ میں تو خیر اپنی ہی کوئی نئی ساری اور دوسرے کپڑے دیدونگی ...... مگر مرد عزیز بھی تو ثروت کو شادی کے تحفے دیں گے ......" اتنا کہہ کر وہ رک گئی اور میرے سامنے تاریکیوں کے حلقے مگرمچھ کے کھلے ہوئے جبڑے کی طرح نظر آنے لگے ....

میں فوراً اپنی بیوی کے پاس سے اُٹھ گیا اور اُس روز سارا دن چڑچڑا رہا۔ دو تین بار لوگوں سے معمولی معمولی باتوں کے لئے الجھ پڑا۔ خارجی حالت کے کھردرے پن سے زیادہ میری داخلی کیفیت متلاطم ہو رہی تھی۔ عین نخلستان کے اندر دم لیتے ہوئے میں نے بادِ سموم کی ایک تیز لپٹ محسوس کی۔

اب ثروت کا خیال بھی میرے لئے محرومی و ناکامیابی کا اشاریہ تھا۔ اُف! بیسویں صدی کا نوجوان کتنی تمنائیں، کتنے ارمان اپنے دل میں رکھتا ہے اور اُن میں سے اکثر آرزوئیں گھٹ گھٹ کر دم توڑتی جاتی ہیں۔ اور جو پوری بھی ہوتی ہیں وہ کچلا کچلا اور مسلا مسلا کر پوری

ہوتی ہیں۔ میں دن بھر ایک وحشی بن جانے کی خواہش میں گھٹتا، کھولتا، پگھلتا اور منجمد ہوتا رہا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر جائز تمناؤں کے گرد بھی زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔ اگر معصوم خواہشوں کی گردن میں بھی بھاری بھاری سلیں ہیں تو پھر دنیا کسی ستارۂ تخریب سے ٹکرا کیوں نہیں جاتی۔ زلزلہ صرف بہار اور کوئٹہ میں کیوں آتا ہے۔ سارے عالم میں بہ یک وقت زلزلہ کیوں نہیں آجاتا۔ ......

شام کو ثروت کا بلاوا آیا۔ میں نہیں گیا۔ اس نے کئی بار بلوا بھیجا۔ میں نے ہر بار انکار کیا۔ رات کو مجھے نیند بہت دیر میں آئی، اور جب آئی بھی تو خیالات کو اور بھیانک روپ دیتی ہوئی آئی۔

دوسرے دن میرے سر میں درد تھا اور دل و روح میں اس سے زیادہ دن کو ایک ہفتہ کے انتظار کے بعد والد صاحب کا کارڈ ملا جس میں انہوں نے اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا تھا۔ —— اب میری ناامیدی مکمل ہوگئی، اور شادی کے تحفہ کا خیال ہزاروں آرزوؤں کے ساتھ مدفون ہوگیا۔ دوپہر اور سہ پہر کو میں فلم کے ستاروں کا تصویری البم دیکھتا رہا۔ ایک ایک ستارے کی نوک پلک کا بہت ہی گہرا جائزہ لیا اور آج ایک ایسے صاحب سے اس کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا۔ جن کو میں کبھی منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس شام کو میں غیر معمولی طور پر خوش و خرم اور ہنسوڑ تھا۔ یہاں تک کہ میں نے بذلہ سنجی کے علاوہ سوقیانہ مذاق کو بھی صرف روا ہی نہیں رکھا، بلکہ اس کی بہتات کر دی۔

سر شام ثروت نے کہلوا بھیجا کہ کیا آج بھی نہیں آئے گا آسمان پر تارے چھٹکے اور زنانخانہ سے گیتوں کی جھنکار اٹھی میں ثروت سے ملنے چلا۔ اب وہ کوٹھری میں مایوں بیٹھی تھی مستقل طور پر مقید۔ میں کوٹھری میں داخل ہوا اور ذرا جھجکا۔ ثروت کے پہلو سے پیوند ایک نئی کمسن سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔

" آیئے دولہا بھائی! یہ میری ممیری بہن فرحت ہے آپ کو دیکھنے کو دیر سے بیٹھی ہے۔" ثروت نے مجھے جھجکتا دیکھ کر کہا۔

" بہت خوب! میں حاضر ہوں۔ دیکھئے فرحت صاحبہ مجھے۔" میں نے مسکراتے ہوئے ذرہ شوخی کی۔ اور فرحت سے قریب پلنگ پر بیٹھ رہا۔ فرحت ثروت کے دوسرے پہلو کی طرف جا کر سمٹ گئی۔

" کیوں دولہا بھائی! کل تو آپ بہت خفا تھے۔ فرحت کل ہی آئی ہیں اور کل ہی سے آپ سے ملنے کے لئے بے چین ہیں۔"

ثروت نے اپنی مدھ بھری آنکھوں کا رس میری آنکھوں میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

" فرحت مجھے کیا جانیں؟" میں بات ٹالتے ہوئے بولا۔

" اور میں جو جانتی ہوں آپ کو!" ثروت نے جواب دیا۔

" تو پھر یہ فتنہ آپ کا پھیلایا ہوا ہے؟" میں نے احساس پندار کے ساتھ کہا۔

" آپ لوگ ابھی سے مجھے بھلا رہے ہیں؟۔ کل آپ کو کتنی دفعہ بلایا۔ آپ نے ہر بار مایوس کیا ......" ثروت کی آنکھوں کے سمندر میں موتی جھلکنے لگے۔ شادی کے دنوں میں ایک ہندوستانی لڑکی موم کی طرح پگھلی رہتی ہے۔ اس کی آنکھیں اگر میکے کی محبت میں ہر وقت ساون بھادوں کا سماں نہ بھی پیش کریں تو ان کی لامحدود وسعتوں میں بن برسے ہوئے بادل سرگرمی مچلتے ضرور رہتے ہیں۔

" ثروت تم رونے لگیں! کل میری طبیعت اچھی نہیں تھی اسلئے نہ آیا۔" میں نے ثروت کو چپ کرتے ہوئے کہا —— ثروت کچھ دیر تک روتی رہی ......

" تو میں چلا ثروت! میں باتیں کرنے آیا ہوں، اور تم رو رہی ہو ......" میں نے پلنگ پر سے اٹھتے ہوئے، جھوٹ موٹ کی دھمکی دی —— ثروت نے آنسو پونچھ ڈالے اور چپ ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے بہت سی دلچسپ باتیں کیں، اور خوب خوب ہنسی رہی۔

ثروت ڈھیلے ڈھالے جوگیا رنگ کے کپڑے میں ملبوس شفق کی دیوی معلوم ہو رہی تھی۔ اور اس کا کاہیدہ چہرہ شفق بہ کنار ہلال کی نزاکتوں کا آئینہ دار تھا۔ اس کے کھلے ہوئے بال کی لٹیں اس کے سینہ و شانہ پر اس طرح بکھری ہوئی تھیں جیسے افق رنگیں پر سرمئی بادل کے ٹکڑے ایک خوابناک فضا پیدا کر رہے ہوں۔ وہ ابٹنے کی خوشبو سے بسی ہوئی تھی۔ کنتم اور بیلے کے پھول کی مہک کے ساتھ زعفران کی خوشبو مشام جاں کو معطر کر رہی تھی۔

" تم انار کی کلی کو شرما رہی ہو ثروت!" میں نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

" آپ کو بھی میں انار کلی بنا دوں!" یہ کہتے ہوئے ثروت نے بہت سا ابٹنا میرے چہرہ پر مل دیا۔ اس کی آنکھوں میں جرأت طلب شرارت مچل رہی تھی۔ میں دعوت نگاہ کو قبول کر کے بدلا لینا ہی چاہتا تھا کہ ایک چھپاکے نے مجھے بیوقوف سا بنا دیا۔ فرحت نے مجھ پر رنگ کی بے پناہ بوچھار کی تھی۔ میں شرابور ہوگیا اور کچھ

اس ناگفتہ بہ انداز میں کہ فوراً میں مردانے کی طرف بھاگا۔

دوسرے روز ثروت کی برات آگئی۔ گھر باہر بڑی رونق تھی۔ ہر طرف لباس و زینت کی نمایش ہو رہی تھی۔ زنان خانے میں دن کو ہر سو قوس قزح کے رنگوں اور طاؤسانہ اداؤں کی دلفریبیاں نازفرما رہی تھیں، نوجوان تیتریاں گھڑی گھڑی لباس تبدیل کر کے اپنی ہوا باندھ رہی تھیں۔ رات آتے ہی گھر کا گھر جیسے ستارہ کی زرکار ساریوں سے رشکِ کہکشاں بن گیا۔ ہر نوخیز پھلجھڑی تھی، ہر جوان لڑکی چھوٹتا ہوا انار، اور ہر عورت مہتابی۔ میں اس رنگ و نور کے جلوۂ سینائی کے دیکھنے میں محو تھا کہ ایک گوشہ میں میری ہوی شست اور مضمحل کھڑی ہوئی نظر آئی۔ وہ ایک پایہ سے لگی ہوئی کھڑی تھی اُسے دیکھ کر میرا دل دھک سے ہوگیا۔ میں سب کچھ سمجھ گیا، اب یہ جلوے میرے لئے جلوۂ طور نہ تھے، بلکہ آتشِ نمرود۔ میری ہوی بیچ اسی ایک لباس میں تھی۔ کاسنی رنگ کی کامدانی کی ایک پرانی ساڑی اس کی گرگابی بھی بہت ہی مفلوک الحال تھی۔ اس کی ہجولیاں کپڑوں پر کپڑے بدل رہی تھیں۔ اور یہ پرانی جلد کی کتاب کی طرح بے رونق معلوم ہو رہی تھی۔

اُف! میں اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور فوراً گھر کے ایک دور افتادہ گوشے میں جا کر کھری پلنگ پر لیٹ رہا۔ یہ بڑی پُررونق رات تھی، مگر میں کسی تقریب میں شریک نہ ہوا۔ اور رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ میں ایک روح فرسا احساس کے عالم میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ ذہن پر ایک سر دتاریکی چھائی ہوئی تھی۔ دل ایک خاموش اذیت۔ ایک افسردہ درد محسوس کر رہا تھا۔

صبح ہوئی۔ آج ثروت رخصت ہونے والی تھی۔ اگلے دن کو سردعزیز اپنے تحائف کے ساتھ اُس سے ملنے زنان خانہ میں گئے۔ میں نہ گیا۔ میرے پاس کیا تھا۔ غم، وحشت اور احساسِ ناداری کا تحفہ!

ثروت رخصت ہوگئی۔ اور پانچویں دن سُنا کہ واپس بھی آگئی۔ یہ پانچ دن کس طرح بیتے میں نہیں بتا سکتا۔ ثروت سے چھوٹنے کا غم؟ جی نہیں۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ ثروت واپس ہی نہ آئے میں اُس سے آنکھیں چار کرنی نہیں چاہتا تھا۔ مگر ثروت آئی۔

شاید ثروت نے سسرال سے واپس آنے کے ساتھ ہی مجھے ملنے کو بلوا بھیجا تھا۔ مگر میں ایک ہفتہ تک اُس سے نہیں ملا۔ خدا جانے کیونکر میں خود بخود ایک مرتبہ ملنے چلا گیا۔ وہ اپنے عروسی کمرے میں چیزوں کی درستی میں مشغول تھی۔

"اللہ! آپ آخر ملنے آگئے مجھ بدنصیب سے دولہا بھائی!"

ثروت نے شکوہ سنجانہ مسرت کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا۔

"خدا نہ کرے تم بدنصیب ہو؟ بدنصیب تو میں ہوں ثروت" میں نے جواب دیا۔

"آپ کیوں خفا ہیں مجھ سے دولہا بھائی؟ آپ مجھے رخصت کرنے بھی نہیں آئے تھے۔ میں مجمع میں آپ کی آواز کی منتظر تھی۔ میری آنکھیں بند تھیں، مگر جی چاہتا تھا کہ آنکھیں کھول کر دیکھوں کہ آپ ہیں یا نہیں" ثروت نے بڑی مایوسی سے کہا۔

"کوئی وجہ نہیں۔ یونہی میں نہیں آیا۔ یونہی ثروت ——— مجھے خود معلوم نہیں میں کیوں نہ آیا ...." میں چاہتا تھا کہ اس بارے میں باتیں نہ ہوں۔

"سُناؤ شادی کا تجربہ کیسا رہا۔ نئے لوگوں سے ملاقات ہوئی؟ اچھے لوگ تھے؟" میں نے موضوعِ گفتگو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"آپ سے اچھے نہیں" اُس نے ایک پُرمعنی حجاب کے ساتھ جواب دیا۔

"آیئے دولہا بھائی! آپ کو چیزیں دکھلاؤں۔ میرے مصرف کی چیزیں سب میرے ساتھ واپس چلی آئی ہیں۔ دُلہا بھائی غیر جگہ عزیزوں کی دی ہوئی چیزیں بھی کتنی پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ ہر تحفہ مجھے عزیزوں کی یاد دلا رہا تھا۔ میں اکثر دیکھ دیکھ کر رو دیتی تھی ...... آپ مجھے بیوقوف کہیں گے۔ ہے نہ؟ میں آپ کو ہر وقت یاد کرتی تھی۔ آپ مجھے یاد کرتے تھے؟" ثروت آج اتنی بہت سی باتیں کر رہی تھی اور میری زبان پر مُہر سی لگی ہوئی تھی۔ "بولتے کیوں نہیں آپ؟ یہ دیکھئے! یہ سنگار بکس احمد بھائی نے دیا ہے۔ یہ ہے ان کا نام لکھا ہوا۔ اچھا سا ہے نہ؟" وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بکس سے دوسری چیز نکالنے لگی۔

"دیکھئے اس بکس میں سلائی کا سٹ ہے۔ اور اس میں کروشیا اور کشیدہ کاری کی مشین ہے .... دُلہا بھائی سب نے اپنا اپنا نام چھوٹے چھوٹے کارڈ پر لکھ کر لٹکا دیا ہے ...... یہ ایرنگ ہیں دولہا بھائی! یہ محمود بھائی کی دی ہوئی ہے .... اور یہ دیکھئے! آف میں تھک گئی! کتنی ساری چیزیں ہیں! .... وہ تو بکس کی تہ میں ہے .... ایرنگ ہے نہ بہت پیاری سی؟ ...... میں آپ کو ایک اور بہت ہی اچھی سی چیز دکھلاتی ہوں ......" ثروت اپنا ایک بکس اُلٹ پلٹ رہی تھی اور میں اپنے تخیل کے تاریک خلا میں ارمانوں کی لاشوں کو دانت نکالے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ تحفہ! تحفہ! ...... زندگی کے ہاتھ میں موت

بھوک

از جناب سہیل عظیم آبادی

بھوک نے جب کروٹ لی تو آنتوں کے ساتھ ہی رامو کے دل اور دماغ میں بھی ہلچل مچ گئی- وہ سوچنے لگا، اب کیا کرنا چاہیئے- بھوکے رہنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے- فاقہ کو چار شام تو ہوچکے- صبح ہوگی تو پانچواں ہوگا- تین دن سے کام ڈھونڈتا پھر رہا ہوں، لیکن کام نہیں ملتا- اب صبح ہوتے ہی کام کہاں سے مل جائیگا- اور اگر کام ملا بھی تو کس کے بدن میں اتنا بوتا ہے جو کر سکے' کام ہوگا کیسے؟ وہ بھوک سے تلملا رہا تھا- اُس کے دماغ میں صرف ایک بات تھی کھانا کہاں سے ملے گا- اِس کے دل میں صرف ایک خواہش تھی- کچھ بھی ہو، مگر بھر پیٹ کھانا ملے- اس نے سوچا اگر صبح بھی کوئی کام نہ ملا تو، وہ کہیں سے کوئی چیز اُٹھا کر بھی کھا لیگا- یا بھیک ہی مانگ کر مل جائے- یا پھر میونسپلٹی کے ٹین ہی کے اندر ملے ——— مگر یکایک اُس کے دل میں امید کی روشنی پھیل گئی- اُسے یقین ہوگیا کہ کل اُسے کوئی کام ضرور ہی مل جائے گا- اس خیال کے آتے ہی معلوم ہوا جیسے اُس کے بدن میں کھوئی ہوئی طاقت واپس آرہی ہے- وہ دوسرے دن کے بارے میں سوچنے لگا سورج نکلنے سے پہلے ہی اُٹھ کر وہ ہاٹ جائے گا- وہاں بہت سی عورتیں ترکاریاں خریدنے آتی ہیں، اُن میں سے کوئی نہ کوئی اپنا بوجھ پہنچانے کے لئے ضرور ہی کہے گی- پھر وہاں سے مارکٹ جائے گا- وہاں بہت سے بابو لوگ اور میم صاحب پھل یا ترکاریاں خریدنے آتے ہیں اُن سے کچھ مزدوری مل جائے گی، یا اور کوئی دوسرا کام- کچھ ہی کیوں نہ ہو- مگر اُس کو کوئی کام ضرور ہی مل جائے گا، اور اتنی مزدوری بھی مل جائیگی، جس سے وہ پیٹ بھر کر کھانا کھا سکے گا- اس خیال ہی سے وہ خوش ہوگیا- معلوم ہوا جیسے اس کا پیٹ بھر گیا- اُس نے دل ہی دل میں کہا- ایشور بڑا انصاف ور ہے- وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا- پھر میں بھوکا کیوں رہوں گا-

تھوڑی ہی دیر میں اُس کی بھوک پھر جاگ اُٹھی، اور وہ تلملا گیا- دوسرے دن کے بارہ میں اُس کی جتنی امیدیں بندھی تھیں وہ آہستہ آہستہ مٹنے لگیں- جیسے نیند ٹوٹنے کے بعد خواب فراموش ہونے لگتا ہے- وہ سوچنے لگا، روز ہی اسی طرح امید بندھتی ہے مگر پوری کبھی نہیں ہوتی- دن بھر پایپ سے پانی پی پی کر پیٹ کی آگ بجھانی پڑتی ہے- لیکن آخر کیا کیا جائے- اس روز روز کے اُپاس سے چھٹکارا کیسے ملے؟ میں نے پرماتما کا کون سا اتنا بڑا قصور کیا ہے جو یہ سزا ہے- دنیا میں سبھی آدمی کچھ نہ کچھ گناہ کرتے ہیں- لیکن سب تو بھوکے نہیں- مجھی پر یہ عذاب کیوں؟ گناہ تو سبھی آدمی کرتے ہیں مگر کسی کو تکلیف اور کسی کو آرام وہ کیوں دیتا ہے؟ مگر اس کا دماغ اُلجھ کر رہ گیا- اُس نے دل ہی دل میں کہا- ایشور بڑا انصاف ور ہے- وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا- باقی دنیا میں آدمی تو ہر طرح کے ہوتے ہی ہیں یہی تو دنیا کی سوبھا ہے .... مگر اس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی- اس نے دل ہی دل میں کہا- نراس ہونے کی کوئی وجہ نہیں- صبح ہوگی تو دیکھا جائے گا- وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور پانی کے نل کی طرف بڑھا کہ چل کر پانی پیئے- مگر جب نل کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ پانی آنا بند ہوچکا ہے- اُس کا جی سن سے ہوگیا- سر چکرا گیا- وہ نل کو پکڑے کھڑا رہا-

آخر رامو تھوڑی دیر کے بعد سر جھکائے اور کچھ سوچتا ہوا نل کو چھوڑ کر ہٹا- اُس کا ہر قدم ڈھیلا پڑ رہا تھا- مگر دماغ میں ہلچل تھی شاید اُس کے دماغ میں ایسی ہلچل پہلے کبھی نہ مچی ہوگی- وہ سوچ رہا تھا کہ اس بھوک کی مصیبت سے کس طرح بچے- فٹ پاتھ پر سونے سے کس طرح چھٹکارا پائے- اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کے طور پر کہا، اب اس زندگی سے نکلنا ضرور ہے- اور .... کل ہی صبح اُٹھ کر زندگی بالکل بدلی ہوئی ہوگی- وہ یہی باتیں سوچتا اور اپنے آپ کو سمجھاتا آگے بڑھتا گیا ——— اس کا ارادہ پکا ہوچکا- اس نے یہاں تک سوچ لیا کہ اگر کل بھی اسے بھوکا رہنا پڑا تو پھر وہ "جے ماں" کہہ کر گنگا میں کود پڑے گا- اس فیصلہ کے بعد وہ سوچنے لگا کہ ترکیب کیا کی جائے- نوکری ——— نوکری کہاں ملتی ہے- مزدوری ——— مزدوری تو ہر روز ہی ڈھونڈتا پھرتا ہے- پھر ——————؟؟

اُس نے بہت سی باتیں سوچ لیں- بہت سی ترکیبیں اُس کے

دماغ میں ایک ہی وقت آگئیں، جیسے زمین پر دانہ دیکھ کر کبوتر اُتر پڑتے ہیں، مگر پھر ایک ہی بار سب کی سب غائب بھی ہو گئیں۔ صرف ایک ترکیب اُس کے دماغ میں جم کر رہ گئی۔ اور یہی آخری ترکیب تھی۔ خوشی سے نہیں۔ بالکل مجبور ہو کر۔ دیر تک وہ ایک عجیب عالم میں رہا۔ دل کہتا یہ بڑی بری بات ہے۔ اس دنیا میں سزا بدنامی، اور مرنے پر بھی سزا دماغ کا جواب ہوتا۔ ہزار برا سہی، مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں آخر دل کی ہار ہوئی۔ دماغ جیت گیا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا۔ وہ چوری کرے گا ——

پھر دل اور دماغ میں کھینچ تان شروع ہوئی۔ مگر وہ اسے نتیجے پر پہنچا کہ چوری کرے اگر بچ نکلا تو کچھ دنوں کھانے اور رہنے کا بھی سامان ہو جائے گا، اور اگر پکڑا گیا تو بھی گھاٹے میں نہیں رہے گا۔ پولس کے لپڑ تھپیڑ کے بعد کھانے کو مل ہی جائے گا۔ اور رہنے کو حوالات پھر جیل کی کوٹھری کمبل اور کپڑے۔ واہ سب کچھ مل جائے گا۔ وہ مسکرا دیا۔ مگر دل نے پھر ایک بار کروٹ لی۔ اور اُس نے آپ ہی سوال کرنا اور جواب دینا شروع کیا ٹھیک ہے۔ کھانا تو مل ہی جائے گا۔ مگر پکڑا گیا تو بڑی بے عزتی ہوگی۔ اور جیل گیا تو پھر واپس آ کر لوگوں کو کیا منہہ دکھائیگا ؟ —— مگر آج چوری نہ کرنے پر کون بڑی عزت ہے جس میں بٹہ لگ جائے گا۔ جیل میں یہ شہر، یہ بازار کہاں ؟ —— مگر باہر رہ کر تو اس کا بھی موقع نہیں —— کچھ بھی ہو۔ کسی طرح سہی لیکن ہاں پیٹ بھر کر کھانا تو ملے گا۔ اس کا ارادہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔

وہ چوری کرنے کا پکا ارادہ کر چکا، اور بدن میں طاقت بھی محسوس کرنے لگا۔ وہ بھوک کو بالکل بھول گیا۔ اسے ذرا بھی احساس نہ رہا کہ وہ کس حال میں تھا۔ اُس کی نگاہوں میں روپیوں کا ڈھیر تھا۔ کانوں میں روپیوں کی کھنک گونج رہی تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ قدم بڑھانے لگا۔ اور بغیر کسی ارادہ کے ایک طرف تیزی سے چلنے لگا۔ اس کے دماغ سے تھوڑی دیر کے لئے چوری کرنے کا خیال بھی نکل گیا۔ اور شیخ چلی کی طرح خیالی قلعے بنانے لگا۔ چوری کرنے کے بعد وہ مالدار آدمی ہو جائے گا۔ بوڑھی ماں کو آرام پہونچائے گا۔ اسی چوری کے روپے سے وہ کاروبار شروع کریگا۔ اور لوگ اُسے اچھی نظر سے دیکھنے لگیں گے۔ پھر بیاہ کرے گا۔ اچھی سی عورت مل جائیگی۔ اب تک صرف غریبی کی وجہہ سے اس کا بیاہ نہیں ہو سکا۔ جب روپیہ ہو گا تو پچیسوں آدمی بیٹی دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ بیاہ کے خیال سے رامو کو بڑی خوشی ہوئی۔ وہ طرح طرح کی باتیں سوچنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خوبصورت عورت کی تصویر پھر گئی۔ جیسے شام کے وقت اُس نے موٹر میں جاتے دیکھا تھا۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کو اُس عورت سے کم خوبصورت نہ چاہتا تھا۔ سوچنے لگا۔ وہ کام کر کے واپس جائے گا۔ تھکا ماندہ عورت ضد کر کے اچھی اچھی چیزیں کھلائے گی۔

کھانے کا تصور آتے ہی سارا خیالی قلعہ چکنا چور ہو گیا۔ آنتیں اینٹھنے لگیں، اور وہ بے چین ہو گیا۔ وہ چوری کے فیصلے کو بھول چکا تھا۔ پھر وہ ارادے کو مضبوط کرنے لگا۔ اب اُس کے حوصلے میں ایک نئی طاقت تھی، اُس نے چاروں طرف نظر گھما کر دیکھا۔ ہر طرف اونچے اونچے مکانات تھے اور بجلی کی تیز روشنی۔ کسی مکان میں گھسنے کا موقع ہی نہ تھا۔ پھر وہ سوچنے لگا۔ آخر چوری کہاں کی جائے ؟ —— کچھ دیر سوچنے کے بعد اُسے خیال آتا۔ شہر کے آخری حصے میں چھوٹے چھوٹے بنگلے ہیں۔ چار دیواری بھی نیچی ہے۔ سڑک پر دونوں طرف گھنے پیڑ بھی ہیں۔ وہاں آسانی کے ساتھ چوری کی جا سکتی ہے۔ وہاں کافی اندھیرا رہتا ہے۔

خوب اچھی طرح سوچنے کے بعد وہ اُسی طرف چلا۔ دُور سے گھنٹہ گھر سے دو بجنے کی آواز آئی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ وقت بھی اچھا ہے —— اب وہ تیزی کے ساتھ قدم بڑھا رہا تھا —— مگر یکا یک اُس کو خیال آیا۔ اُن بنگلوں میں کُتے پلے ہوئے ہیں —— یہ خیال آتے ہی وہ سہم گیا۔ ہمت ٹوٹ گئی۔ اس کو یقین ہو گیا کہ بنگلے کے اندر قدم رکھتے ہی کُتے اُسے نوچ ڈالیں گے ...... اس کا ارادہ ڈانوا ڈول ہو گیا ——

بھوک نے پھر کروٹ لی، اور وہ سوچنے لگا، سب سے پہلے اُسے کچھ کھانے کو ملنا چاہیئے۔ اگر بنگلے میں گیا بھی تو اس وقت کچھ کھانے کو مل نہیں سکتا۔ بابو لوگوں کے یہاں اتنا کھانا بچتا ہے کہ باسی رہے۔ بنگلوں میں اس وقت کھانے کی کوئی چیز نہیں مل سکتی، سب کچھ ختم ہو چکا ہو گا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس وقت کھانے کی چیز کہاں مل سکتی ہے۔ آخر اس کے دماغ میں بات آ گئی کہ اس وقت کھانے کی کوئی چیز صرف حلوائی کی دوکان میں مل سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی معلوم ہوا جیسے اُسے سب کچھ مل گیا۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ چوری کرنے کے لئے حلوائی کی کون سی دوکان مناسب ہے۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اُسے ایک حلوائی کی دوکان یاد آئی۔ یہ دوکان شہر کے آخر حصے میں تھی۔ وہاں پر کی آبادی بھی کم تھی۔ رامو کو چوری کرنے کے لئے یہ جگہ ہر طرح مناسب معلوم ہوئی۔ وہ اُسی طرف چلا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح دبے پاؤں دوکان میں گھسیگا کس طرح الماری کھولے گا کس طرح کھانے کی چیزوں پر ہاتھ مارے گا۔ اور کس طرح روپے نکالیگا۔ مگر وہ کبھی کبھی ڈر کر چونک سا جاتا تھا۔ اس کو خیال ہوتا تھا کہ شاید چوری نہ کر سکے۔

یا پکڑ لیا جائے ۔ مگر چوری کرنے کا وہ پکا ارادہ کر چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کاش اُسے کوئی منتر معلوم ہوتا، یا مسان کی راکھ مل جاتی کہ تھوڑی دیر کیلئے جسے چاہتا بے ہوش کر لیتا۔ پھر وہ اطمینان کے ساتھ جاتے ہی منتر پڑھتا یا مسان کی راکھ کو سوئے ہوئے آدمیوں پر چھڑک اطمینان سے چوری کر لیتا اُسے ایک پل کے لئے معلوم ہوا جیسے اُسے سب کچھ آتا ہے اور اُس نے حلوائی کو بے ہوش بھی کر لیا ہے۔ مگر اُس کا یہ خیال فوراً ہی مٹ گیا۔ پھر اُس نے سوچا کہ کبھی کسی چور سے مل کر وہ ضرور پوچھے گا۔ مگر تھوڑی دُور جا کر اس کا خیال یکایک اُچٹ گیا۔ دو کتے اُسے دیکھ کر بھونکنے لگے۔ اس نے سوچا۔ کُتے چور کو دیکھ کر بھونکتے ہیں۔ یہ سچ ہے —— چار قدم پر آگے بجلی کا ایک کھمبا تھا۔ سڑک پر کی روشنی جل رہی تھی۔ چار پانچ آدمی فٹ پاتھ پر ٹاٹ بچھائے۔ اس روشنی میں تاش کھیل رہے تھے۔ رامو ان لوگوں کے پاس سے ہو کر گزرا۔ لیکن کسی نے دھیان نہیں دیا۔ ایک آدمی جلدی جلدی اپنے پتوں کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرا آدمی ٹاٹ پر پڑے ہوئے پتوں کو۔ تیسرا سر اور انگلی ہلا ہلا کر کچھ سوچ رہا تھا۔ چوتھا اس شان سے بیٹھا تھا، جیسے سب کو اُس نے ایک چال میں مات دے دی ہو۔ ایک اور آدمی کسی دوسرے کے پتوں کو دیکھ رہا تھا۔

ایک نے بیڑی جلائی، اور لمبا دم لگایا۔ دوسرے نے پان کی لمبی پیک پاس ہی پھینک کر کہا۔

"یہ بازی ہماری ہے چھٹو بھتیا!"

چھٹو نے جواب دیا۔

"دیکھا جائے گا"

رامو اور آگے بڑھا۔ تھوڑی دُور پر ایک آدمی فٹ پاتھ پر بیٹھا گا رہا تھا —— "مرے دل کی لگی تو بجھی ہی نہیں۔ ارے ہاں ہاں رے - ارے ہاں ہاں رے" —— رامو جب پاس پہنچا تو اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ رامو ڈر گیا۔ مگر وہ پھر گانے لگا —— "تری آنکھ میں مدھ ابھری ہے مگر۔ مرے دل کی لگی تو بجھی ہی نہیں۔ ارے ہاں ہاں ——"

پروائی تیزی سے چل رہی تھی۔ جیٹھ کا مہینہ تھا۔ رامو کا دل بھی گانے کو چاہا۔ اُس نے گانا چاہا — "جاتی جوبنا پہ نہ ......" مگر وہ نہیں گا سکا۔ کچھ گنگنا کر رہ گیا۔ حلق سوکھا تھا۔ آواز نکل ہی نہ سکی۔ اُسے معلوم ہوا جیسے کلیجے میں طاقت ہی نہیں۔ اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور گلا صاف کر کے کھنکھارتا ہوا آگے بڑھا۔ یکایک اُسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ ساتھ ہی دوسرا آدمی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ غریب فٹ پاتھ پر سویا ہوا تھا۔ رامو کو اُسی سے ٹھوکر لگی تھی۔ رامو نے بڑی عاجزی کے ساتھ اُس سے معافی مانگ لی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے پوچھا "تم کون ہو" اور میل جول ہو گیا۔ اُس نے رامو کو اپنے ٹاٹ پر بٹھا لیا، اور بیڑی پینے کو دی۔ رامو کا دل بھی چاہ گیا۔ اُس نے بیڑی پی لی، مگر اس کا سر چکرا گیا۔ اُس نے بیڑی پھینک دی اور سر تھام کر بیٹھ گیا۔ دیر تک وہیں بیٹھا رہا، اُٹھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

جب اُس کی طبیعت سنبھلی تو وہ پھر آگے بڑھا۔ حلوائی کی دوکان اب بھی اُس کی نگاہوں میں پھر رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ امرتی اور بیسن کا لڈو کھائے۔ اس خیال کے آتے ہی اُس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اب وہ ایک تین منزلہ مکان کے پاس سے ہو کر گزر رہا تھا۔ یکایک کسی نے اُس پر مکان پر سے تیز روشنی ڈالی۔ اُس نے نظر اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ مکان کی دوسری منزل پر ایک کھڑکی سے دو آدمی نیچے دیکھ رہے تھے۔ کمرے میں بجلی کی روشنی تھی۔ اُن دونوں پر بھی روشنی پڑ رہی تھی۔ لیکن چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر رامو نے اتنا سمجھ لیا کہ ان میں ایک مرد تھا اور ایک عورت تھی۔ عورت بولی۔

"کوئی غریب آدمی ہے، چور نہیں ہے"

مرد بولا - "تمہارا خیال ٹھیک ہے"

رامو آگے بڑھتا گیا۔ عورت نہ جانے کسی بات پر ہنسی - رامو سمجھا کہ وہ اُسی پر ہنس رہی ہے - اُس کے دل پر چوٹ لگی۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا - "اگر میرے پاس بھی دو منزلہ مکان ہوتا۔ روپیہ اور عورت ہوتی تو زندگی مزے سے کٹتی۔ کوئی مجھ پر ہنستا بھی نہیں" اس کا دل مچل کر رہ گیا۔ وہ اور آگے بڑھا۔ کچھ دُور آگے جا کر ایک اندھیری گلی سے دو چار آدمیوں کی کانا پھوسی کی آواز آئی - وہ رُک گیا۔ لیکن اس کے رُکتے ہی آواز آتی بند ہو گئی - رامو بغیر کچھ سوچے سمجھے آگے بڑھ گیا۔ اور اس راستہ پر ہو لیا جو حلوائی کی دوکان کی طرف جاتی تھی -

تھوڑی دُور جا کر وہ ایک نکڑ سے جیسے ہی مڑا ایک موٹر کھڑی نظر آئی - ایک بابو صاحب موٹر کو دھکا دے رہے تھے - اور ایک عورت کھڑی تھی - رامو بھوک سے نڈھال تھا۔ اس کا ایک ایک قدم رُک رُک کر اُٹھ رہا تھا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچا، بابو صاحب بولے -

"اے! سنو - تم موٹر کو پیچھے سے دھکا دو - ہم تم کو انعام دیگا"

رامو نے اُس عورت کو دیکھا۔ دیکھتے ہی اُسے خیال آیا کہ اس عورت کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر اسے کہاں دیکھا ہے۔ بابو صاحب بولے "اے! سُنتا نہیں ہے! تم موٹر کو دھکا دو ہم انعام دیگا"

رامو نے انعام کا لفظ سُنا تو اُس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور

اُس کے مُنہہ سے نکل گیا۔

"کتنا ؟"

"حرامزادہ، سُور ——— دو سو روپیہ لے گا۔"

رامو کا خون کھول گیا۔ جی چاہا کہ جو بھی ہو، مگر ان کی ساری باؤ ہوائی نکال دے۔ مگر غم کھا کر رہ گیا۔ انعام کے لالچ میں موٹر کو دھکا دینے کو آگے بڑھا۔ زور لگایا مگر موٹر بڑا تھا اور بدن میں طاقت کم۔ موٹر بال برابر بھی نہ سرکا، اور رامو ہانپنے لگا۔ تھک کر الگ کھڑا ہو گیا۔ بابو صاحب بولے

"بس سالے! اسی پر کتنا انعام دیں گے ؟"

دونوں نے مل کر دھکا دینا شروع کیا اور کچھ دُور لے گئے۔ رامو کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اُن دونوں کے جانے کے بعد رامو کو یاد آیا۔ گاؤں کے زمیندار نے بیٹے کے بیاہ میں اس عورت کو بلایا تھا۔ وہ گانے کیلئے گئی تھی۔ رامو کو اس وقت اس کی شیخی پر غصہ آیا اور بولا" پتریا سالی"۔ تھوڑی دیر میں موٹر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رامو پھر آگے بڑھا۔ چلتا گیا۔ آخر اُس حلوائی کی دوکان پر پہنچا، جس کو اس نے تاکا تھا۔ دُکان بند تھی۔ حلوائی دُکان کے سامنے ایک لمبے بنچ پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ زمین سے چھو رہا تھا، پروائی تیزی سے چل رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ حلوائی کے حلق سے خراٹے کی ہلکی ہلکی آواز نکل رہی تھی ——— رامو کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اس کا ارادہ بدل گیا۔ اس نے سوچا۔ چوری کرنا بُرا کام ہے۔ چاہے کیسی ہی مجبوری میں کیوں نہ ہو۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ حلوائی کو اُٹھا کر اُس سے کچھ مانگ لیا جائے۔ یہ بھی معمولی آدمی ہے۔ کوئی بڑا آدمی نہیں ہے جو دھتکار دے گا۔ اُٹھا کر مانگنے سے کچھ دے دیگا ——— مگر کہیں چوری کی اور جاگ گیا، تو پھر خیریت نہیں یہ سوچ کر رامو حلوائی کے پاس گیا۔ چاہتا تھا کہ اُٹھائے۔ حلوائی کے مُنہہ سے بھک سے دیہی شراب کی بُو آئی۔ رامو سمجھ گیا کہ یہ نشے میں چور ہے۔ اگر اس حال میں اُٹھائے گا تو وہ ضرور ہی خفا ہو گا۔ تعجب نہیں کہ مار پیٹ بھی کرے ——— پھر اُس کو چوری کرنے کا خیال ہوا۔ اب حلوائی کی طرف سے اُس کو اطمینان تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کو چوری کی خبر بھی نہ ہوگی نشے میں انٹا چت ہے۔

رامو ہمت کر کے دوکان کے اوپر چڑھ گیا۔ ایک دو بار وہ اس دوکان پر بیٹھ کر کچھ کھا بھی چکا تھا۔ اُسے ہلکا سا اندازہ تھا کہ کون سی چیز کہاں دھری ہے۔ اسی لئے ہر طرف اندھیرا ہونے پر بھی الماری تک پہنچ گیا۔ اُس نے جیسے ہی الماری کو ہاتھ لگایا، کھٹ سی آواز پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اندر کا کواڑ کھلا اور دھیمی آواز آئی۔

"دروازہ ادھر ہے جگن!"

رامو کے سارے بدن کا خون سُوکھ گیا۔ وہ بالکل چپ کھڑا رہ گیا۔ ویسی ہی دھیمی آواز پھر آئی۔

"جگن تمہاری عادت بہت خراب ہے۔ اتنی دیر کر دیتے ہو۔ دو بجے بہت دیر ہوئی اور تم بھٹی سے اب آ رہے ہو۔"

مگر رامو ہلا تک نہیں۔ ڈر سے سارے بدن میں کپکپی پھیل گئی۔ پھر وہی دھیمی آواز آئی۔

"ارے آتے کیوں نہیں۔ اب ہم تم کو پیسہ نہیں دیں گے۔"

اتنا کہہ کر ایک عورت دروازے سے نکل آئی، اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

"اب تم بہت راہ دکھاتے ہو ———"

رامو کے دماغ میں ساری باتیں آ گئیں۔ وہ سمجھ گیا کہ عورت کسی کے انتظار میں تھی ——— اور اسے دھوکہ ہوا ہے ——— اوہ بوڑھا حلوائی اور یہ کڑیل جوان عورت!! تو ندل کیسا بے پروا پاؤں پھیلائے پڑا ہے۔ وہ کمرے میں چلا تو گیا۔ مگر ڈر رہا تھا کہ کہیں پہچان نہ لے۔ عورت اُسے کمرے میں لیجا کر ایک پلنگ پر بٹھاتی ہوئی بولی۔

"اب تم کو پیسہ نہیں دینگے جگن! تم پی کر پگلے ہو جاتے ہو۔"

اتنا کہہ کر اُس نے رامو کے گلے میں باہیں ڈال دیں، اور پیار سے اُسے اپنی طرف کھینچا۔ رامو نے اُس کی محبت کا جواب ایک "چپ" سے دیا۔ عورت نے رامو کے مونڈھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"پیسہ کم تھا اس لئے خفا ہو؟ جانتے ہی ہو ہمیں زیادہ پیسہ نہیں ملتا۔"

رامو بہت سی باتیں سمجھ گیا۔ بوڑھا کنجوس بھی ہے۔ گھر میں روشنی بجھی تھی۔ وہ خوش تھا۔ بوڑھے کی کنجوسی اُس کے لئے فائدہ کی ثابت ہوئی۔ رامو نے سوچا۔ آج تو خوب جاترا بنا۔ کھانے کو تو ملے گا ہی۔ عورت بھی "بھاؤ" میں ملی ——— عورت کا خیال آتے ہی اس کے سارے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ دل گدگدانے لگا۔ مگر اس کا دل الماری میں لگا ہوا تھا۔ بھوک نے بہت جلدی اس کے خیال کو دوسری طرف لگا دیا۔ وہ اندھیرے میں آنکھ پھاڑ پھاڑ کر کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کہیں کھانے کی کوئی چیز تو رکھی نہیں ہے۔ مگر اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہ آیا۔

عورت نے سمجھا کہ وہ نشے میں ہے۔ بولی

"اسی لئے زیادہ پیتے ہو۔ ہزار بار منع کیا۔ تم مانتے ہی نہیں۔ آؤ!!"

اتنا کہہ کر عورت نے پھر رامو کو اپنی طرف کھینچا۔ رامو نے مزے میں آ کر اپنا سر اُس کی گود میں ڈال دیا۔ اس میں اُسے بڑا مزہ آیا۔

سارے بدن میں گدگدی سی ہونے لگی - سانس زور زور سے چلنے لگی - عورت کی سانس کی گرمی اُسے اپنے گالوں پر محسوس ہوئی - اِس گرمی میں لطف بہت زیادہ تھا - اُس کا دل چاہا کہ عورت کو کھینچکر اپنی گودی میں لے لے مگر وہ اُسی طرح اُس کی گود میں پڑا رہا - آخر وہ عورت اُس پر جھکنے لگی - رامو نے اُٹھ کر اُس کو اپنی گودی میں کھینچ لیا - عورت اُس کی گودی میں تھی اس کا بدن بالکل ڈھیلا پڑ چکا تھا - اُس نے اپنا ڈھیلا ڈھیلا ہاتھ رامو کی گردن میں ڈال دیا - رامو کا دل مچل گیا - اُس نے چاہا کہ اس کو اسی طرح لئے ہوئے سو جائے - مگر بھوک نے پیٹ میں مچل کر اُسے بیچین کر دیا - آنتیں اینٹھنے لگیں - بھوک نے سارا مزا کرکرا کر دیا - وہ عورت کو چھوڑنا نہ چاہتا تھا - مگر یہ بھی چاہتا تھا کہ پہلے کچھ کھانے کو مل جائے - وہ عورت کو پلنگ پر چھوڑ کر دیوانوں کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا - عورت بولی

"آج تم بالکل بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہو جگن !!"

مگر رامو کچھ بھی نہ بولا - بھوک سے بدحواس دیوار کے چاروں طرف ٹٹولنے لگا - شاید طاق پر کھانے کی کوئی چیز مل جائے - ایک تھالی میں لڈو دھرے ملے - اُس نے اُٹھا کر کھانا شروع کیا — ایک ، دو —

عورت یکایک اُٹھ کھڑی ہوئی - تھالی اُس سے چھین کر الگ رکھ دی اور بولی

"جانتے ہو جگن ! لڈو وہ گن کر رکھتے ہیں -"

رامو کو پھر وہ پلنگ پر بٹھا کر پیار سے اُس کی طرف بڑھی - مگر دو لڈو پیٹ میں پڑ چکے تھے - سوئی ہوئی بھوک جاگ چکی تھی - اُس نے عورت کی طرف ذرا دھیان نہ دیا - وہ پھر لڈو کی تھالی کی طرف بڑھا - دو لڈو اُس کے اور بھی ہاتھ آئے - عورت تھالی لے کر دوسرے کمرے میں رکھنے چلی گئی - رامو کو بڑا غصہ آیا - اُسکا جی چاہا کہ اسے قتل ہی کر دے - مگر وہ لڈو کھانے لگا - یکایک اس کو کچھ خیال آیا - اور وہ ادھر ادھر ٹٹولنے لگا - بستر پر سرہانے اُس کو ایک چیز ہاتھ لگی "ہنسلی"، اُس نے دل ہی دل میں کہا ارے واہ گہنا - ہنسلی بھاری تھی اُس نے اپنی کمر میں رکھ لی - پھر ادھر ادھر ٹٹولنا شروع کیا - ایک کونے میں پانی کا بھرا لوٹا رکھا - اُس نے اُٹھا کر پینا شروع کیا - اتنے میں عورت واپس آئی اور دوسری تھالی لیکر چلی - رامو نے جھپٹ کر تھالی پر ہاتھ مارا - عورت بولی - "ارے کل دن ہیں - مت لو -"

عورت نے پلٹ کر اس سے چھیننا چاہا - لیکن رامو نے اُسے زور کا دھکا دیا اور کمرے سے نکل کر بھاگ گیا -

حضرت جمیل مظہری

جناب عابد نقوی

جناب شیدا کیوروی

جناب خواجہ عبدالقیوم

جناب قیصر عثمانی

"بہر زمیں کہ رسیدیم ......"

از حضرت الیاس اسلام پوری

(۱)

اگر شاعری محض قافیہ و ردیف کا نام نہیں ہے اور جذبات سے بھی اس کا کوئی تعلق ہے تو اقبال صحیح معنی میں شاعر پیدا ہوا تھا۔ وہ فطرت کی طرف سے حد درجہ حساس دل لے کر آیا تھا ——————
طلوع و غروب کے حسین مناظر کو دیکھتا اور محو ہو جاتا۔ وہ گلاب کی رنگینیوں اور شادابیوں پر نظر ڈالتا اور خود شاخ گل کی طرح مستانہ وار جھومنے لگتا۔ پپیہے کی صدا سنتا اور تڑپ اٹھتا۔ سمندر کی موجوں کا نظارہ کرتا اور خود اپنا وجود فراموش کر جاتا، غرضکہ چاند سورج، بہار و خزاں اور فطرت کے وہ تمام مناظر جو ایک سطحی انسان کیلئے قدرت کے روزانہ کے معمولات سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے! اقبال کیلئے ان میں وہ تمام ہنگامہ جذبات اور ہیجان کے سامان پنہاں تھے، جن کے زیر اثر انسان کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

صفیہ سے محرومی ایسی چیز نہ تھی جسے اقبال کی فطرت آسانی سے برداشت کر لیتی، وہ متاثر ہوئی اور بری طرح متاثر ہوئی۔ اس میں ایسی شدت رونما ہوئی جس نے اقبال کے دل میں دنیا اور اس کے بسنے والوں کی طرف سے ایک استکراہ و احتراز کی کیفیت پیدا کر دی۔ شہر کے ہنگاموں سے پہلے بھی اسے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن اب تو اسے نفرت سی ہونے لگی تھی اور وہ ان سے نجات پانے کو بیتاب نظر آرہا تھا۔ بالآخر گھر کا کاروبار ایک بوڑھے ملازم اور بھائی کے سپرد کر کے اپنی سکونت گنگا کے کنارہ ایک چھوٹے سے گاؤں فرید پور میں اختیار کی۔ وجہ معاش کی طرف سے اسے بے فکری تھی۔ اس کی موروثی جائداد اس کے چھوٹے سے خاندان (جس میں اسکی ضعیف ماں اور ایک چھوٹا بھائی تھا) کی کفالت کے لئے بالکل کافی تھی زیادہ کی اسے تمنا نہ تھی، اس کی سادہ زندگی نے کبھی ان چیزوں کی ضرورت محسوس نہیں کی جو محض دولت اور تفوق و برتری کے احساس کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہی سبب تھا کہ اقبال کی نئی طرز زندگی میں کسی اختلال کا اندیشہ نہ تھا، اور وہ اپنی تمام تلخیوں کو سینہ میں دبا کے ایک خود فراموشی کی حالت میں بسر کرنے لگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ناکامیاں اب بھی اسے کبھی کبھی سخت آزمائش میں مبتلا کر دیتی۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس کا یہ جذبہ اس کے سکون و طمانیت میں بڑی حد تک معاون ثابت ہوا، کہ سوسائٹی کے ظلم کا عوض اس نے اسے ترک کر کے لے لیا ہے۔
اور اب اس کے چہرہ کی رونق اور ظاہری رکھ رکھاؤ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ زمانہ آج نہیں تو کل اس کے زخموں کو بھی مندمل کر دیگا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس کی تحریک نے ملک کے طول و عرض میں ایک ہنگامہ سا مچا دیا تھا، اور حکومت نے نئے قانون کے ذریعہ اس آگ پر پانی ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اقبال کو اخباروں سے ہمیشہ دلچسپی رہی اور یہی وجہ تھی کہ دنیا سے بالکل بے تعلق رہنے کے باوجود بھی تمام حالات کا اس نے بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن ملک کی یہ نئی شورش بن خود اس میں اور اس کی طرز حیات میں کوئی تحریک پیدا نہ کر سکیں، وہ اسی طرح خاموش اپنے گوشہ سکون میں بسر کرتا رہا۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کتنی مدت انہیں خود فراموشیوں میں گزار دیتا اگر اس کا پرانا رفیق ممتاز ایک دن آکر اس کے دماغ کو ایک بار پھر دوسری طرف مائل کرنیکی کوشش نہ کرتا۔

ممتاز اور اقبال نے ساتھ ہی کالج میں تعلیم پائی تھی، اور ایک ہی سال بی۔ اے کیا تھا۔ ممتاز تعلیم ختم کرنے کے بعد کاروباری زندگی بسر کرنے لگا اور اس میں اس نے کافی ترقی بھی کی تھی، گرچہ اقبال نے اس کی آمد پر کبھی کسی تکلف کی نمائش نہیں کی "لیکن اقبال کے خلوص اور اس کی فطرت کی سادگیوں میں وہ کچھ ایسی کشش اپنے لئے پاتا تھا کہ ناممکن تھا کہ وہ سال میں دو تین بار آکر اقبال سے مل نہ جایا کرے۔

شام کا وقت تھا اقبال اور ممتاز ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول تھے، ممتاز نے آخر کار گفتگو کا رخ سیاست کی طرف پھیر دیا، اور اقبال سے پوچھا۔

" اقبال صاحب ! آخر آپ نے اپنی رہبانیت کا حاصل کیا سمجھا ہے ؟"
اقبال" کیا کہتے ہو ممتاز ! میں ہوں کس کام کا - میں کسی کے لئے مفید ثابت ہو نہیں سکتا، اور نہیں تو یوں سمجھو کہ میں کسی کو اپنے موافق نہیں پاتا - تمہیں بتاؤ میرے لئے کیا رہ جاتا ہے، سوائے اس کے کہ کسی ایسے گوشہ میں زندگی بسر کروں گویا میرا شمار دنیا کی آبادی میں ہی نہیں "
ممتاز - ممکن ہے آپکا نظریہ آپ کی تسکین کے لئے کافی ہو لیکن ان حقوق کو تو آپ صرف یہ کہہ کر ٹال نہیں سکتے جو نوع انسان کے ہر فرد پر کسی نہ کسی صورت میں از خود عاید ہو جاتے ہیں - یہ تو آپ کو ماننا ہی پڑیگا کہ مادر وطن کی طرف سے کچھ نہ کچھ فرایض اس کے تمام فرزندوں پر لازم ہیں، پھر اگر وہی لوگ جن سے کچھ توقع ہو سکتی ہے سرے سے اس کے احساس ہی سے منکر ہو جائیں، تو بتاؤ ملک کا کیا حشر ہوگا - اقبال ! "میں تمہاری صلاحیتوں سے ناواقف نہیں، تم میں وہ سب کچھ ہے جس کی وطن کو ضرورت ہے "
اقبال - ممتاز ! میں نے اب اپنی دنیا الگ بنالی ہے اور چاہتا ہوں پرانی آلائشوں کا میرے سامنے تذکرہ بھی نہ آئے - اور یوں بھی تم جانتے ہو میرا نقطۂ نظر کتنا علحدہ ہے - میں ہر چیز پر نظر ڈالتا ہوں خود اپنی صلاحیت فکر کے اعتبار سے مجھے اگر تم یہ کہنے کی اجازت نہیں دیتے کہ دنیا صرف سطح کو دیکھتی ہے تو مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ جس شے کا مطالعہ کروں میری نظر سطح کو چیر کر بالکل اس کے قلب میں پہنچ جائے اور ان تمام حقیقتوں کا نظارہ کرے جن پر چند در چند خوشنما غلاف چڑھا کر دنیا کے سامنے پیش کرنیکی کوشش کی گئی ہو - اور معاف کرنا ممتاز ! اگر میں اس تلخ حقیقت کے اظہار پر اپنے کو مجبور پاتا ہوں کہ چمکنے والی تمام چیزوں میں بہت کم ہی سونا ثابت ہوتی ہیں -
ممتاز - اول تو مجھے آپ کے تمام دعوؤں کے صحیح تسلیم کرنے ہی میں تامل ہے - کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہندوستان کے یہ لیڈر، مادر وطن کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے حد درجہ بیتاب نظر آتے ہیں اور انتہائی قربانیوں کو گوارا کرنے کو تیار ہیں پھر کیا یہ چیزیں ایسی ہیں جنہیں آسانی سے فراموش کیا جاسکتا ہے - ان میں کون سی شے ایسی ہے جسے حقیقت کے خلاف پردہ سے تعبیر کیا جاسکے - اور اگر تھوڑی دیر کے لئے میں یہ مان بھی لوں کہ وہ سب کچھ صحیح ہے جو آپ کہتے ہیں، پھر بھی آپ اس سے کیونکر انکار کر سکتے ہیں کہ آپ کی یہ تاویلیں ادائگی فرض سے خود آپ کو سبکدوش نہیں کر سکتیں۔
اقبال - صحیح ہے، مجھے بھی اس سے انکار نہیں - لیکن جب دیکھتا ہوں کہ ملک میرے مزعومات کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تو میں ان سطحی چیزوں کے نتائج سے واقفیت کے بعد کیوں اپنے ایمان و ایقان کی قربانی گوارا کر لوں - پھر میرا اس تحریک میں ہاتھ ڈالنا کیا معنی رکھتا ہے، بالخصوص اس صورت میں جب میں جانتا ہوں میں موجودہ اصول کار کی ہمنوائی نہیں کر سکتا - ایسی صورت میں میری ذات سے اس تحریک کو نقصان ہی پہنچنے کا زیادہ اندیشہ ہے - تم نے لیڈروں کا تذکرہ کیا ہے - میں جانتا ہوں تم میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو اور وہ سب کچھ کہلوانا چاہتے ہو جس کا نہ کہنا بہتر ہے - نہ کہنا بہتر اسلئے کہ ان پر کان دھرنے والا مشکل ہی سے کوئی مل سکے گا - باور کرو ممتاز ! تمہاری جگہہ کوئی دوسرا ہوتا تو اسکی یہ تمنا کبھی پوری نہ ہوتی - لیکن تمہیں معلوم ہے، میرے احباب میں صرف ایک تم ہو جس سے میں کچھ توقعات رکھتا ہوں - صرف تمہاری ایک ہستی ایسی ہے جسمیں اپنے لئے کچھ سامان سکون پاتا ہوں - تم نے ایک اہم موضوع پر گفتگو شروع کردی ہے - اور مجھ سے جواب کے لئے اصرار بھی کرتے ہو - تم یہ نہ سمجھو میں اس تحریک سے قطعی بے خبر رہا ہوں - میں نے بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اور جس نتیجہ پر پہنچ سکا ہوں اس کا تنزل بڑی مشکل چیز ہے، تم لیڈروں کو کہتے ہو ان میں کا ہر شخص یا تو خود فریب نفس میں مبتلا ہے یا دوسروں کو فریب میں مبتلا کرنے میں، اور میں سمجھتا ہوں موخر الذکر اتنا خطرناک نہیں جتنا اول الذکر -
ممتاز ! دنیا میں کسی انقلاب کا مطالعہ کرو تمہیں صاف پتہ چل جائے گا کہ وہ اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکا جب تک اس قوم کے پست افراد میں خود انقلاب کی احتیاج اور اس کی برکات کا احساس پیدا نہیں ہوگیا - ان ممالک کا بھی یہی حال ہے جہاں کثرت تعلیم سے بہرہ ور اور تہذیب و مدنیت کی برکتوں سے لطف اندوز رہی ہے - اب اس ملک کی بدنصیبی پر غور کرو جس کی نوے فی صدی آبادی دیہاتوں پہاڑوں اور جنگلوں میں زندگی بسر کرتی ہے اور موجودہ تہذیب کے لذائذ و نعائم کا کیا ذکر وہ تو معمولی انسانی ضرورتوں سے بھی واقف نہیں تعلیم سے وہ ابتک اسی درجہ نا آشنا ہے کہ جتنا انسان دور وحشت و درندگی میں تھا - غور کرو ہماری اس نوع کی سعی کیا کارآمد ہو سکتی ہے جبکہ ۹۰ فی صدی آبادی کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو - آج جلسے ہوتے

ہیں اور ہنگامی نمائش میں روپے پانی کی طرح بہادئے جاتے ہیں لیکن انہیں کون سمجھائے کہ انہیں روپیوں سے غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی تعلیم کا سامان کیوں نہیں کیا جاتا۔ سب سے بڑی ضرورت عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی ہے۔ جب تک وہ آزادی کے مفہوم سے نا آشنا ہیں یاد رکھو یہ ہنگامی شورشیں کوئی دیرپا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتیں۔ ضرورت ہے ان میں ایسی کیفیت ایقان و رسوخ کے پیدا کرنے کی جو نتیجہ ہوتی ہے محض انسان کے خود اپنے دماغی احساس و شعور کا اور جس سے ایک بار آشنا ہونے کے بعد آزادی کے لئے وہ اپنے سر کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ سب سے پہلے ان میں یہ احساس پیدا کرنا چاہیئے کہ ان کی معیشت و معاشرت حد درجہ پست ہے، اور صرف آزادی ہی اسے اتنا بلند کر سکتی ہے جس کا وہ آج خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ لیڈروں کو دیوتا کی شکل دیکر عوام میں ایک طرح کی بندگی کا جذبہ تو پیدا کیا جا سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وقتی ہنگاموں میں ان کی جماعتیں بھی لیڈروں کے پیچھے پیچھے نعرے لگاتی ہوئی نظر آجائیں۔ لیکن ان میں وہ احساس و شعور کہاں سے آئیگا جو خود ان کے قلب و دماغ کو بے تاب بنا کر حشر سے بھی بے نیاز کر دیتا ہے۔ تم انہیں غلامی سے آزادی کا سبق دیتے ہو، لیکن دوسری غلامی میں مبتلا کرتے ہو۔ حیرت ہے ہمارے لیڈر اپنے تمام ادعائے آزادی کے باوجود اتنی سی معمولی شئے نہیں سمجھنا چاہتے اور صرف عارضی جلسوں عوام کے نعروں اور اپنی گاڑیوں کو نوجوانوں کے کندھوں پر دیکھ کر مسرور ہوتے ہیں، حالانکہ یہ چیزیں اتنی پست ہیں کہ ان کی کوئی وقعت کم سے کم میری نظر میں تو پیدا نہیں ہو سکتی۔ معاف کرنا ممتاز! یہ لیڈری کا ہیکو ہوئی ایک تجارت ہوئی کہ دوکاندار اس سے زیادہ دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اس کے یہاں کتنے گاہک آتے ہیں۔ یا کتنے روپیہ کا لین دین ہوتا ہے۔ اس وقت تک اگر کسی بڑی سے بڑی کوشش کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ اچھوت ادھار ہے۔ یہ چیز یقینی قابل توجہ تھی لیکن افسوس یہ بھی خود غرضی ہی سے ملوث نظر آتی ہے۔ سوچو تو ہندوستان کا مسلمہ لیڈر اتنے بڑے پروگرام کو محدود کر دے صرف ایک طبقہ کے لئے اور وہ بھی مندروں میں داخلہ تک۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس طرح ان میں وہ عروج و استعلا کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ آج بھی ہندوں کے مختلف فرقے ایک ہی طرح ایک ہی مندر میں پوجا کرتے ہیں، پھر بھی معاشرت کے بہت زیادہ اختلافات ان میں پائے جاتے ہیں، اور ہزاروں برس کی پوجا کے بعد بھی ان میں کوئی فرق پیدا نہیں ہو سکا۔ ہمیں تو دراصل اس احساس کو مٹانا چاہیئے جو اس تفریق کا سبب بنا ہوا ہے۔ اور اس کی میرے خیال میں صرف یہی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ ہمارے لیڈروں کو عوام سے براہ راست تعلق پیدا کر کے ان میں وہ سب کچھ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیئے جسے اب تک وہ صرف زبان سے کہتے رہے ہیں۔ عوام سے میری غرض شہر کے بسنے والے نہیں کہ وہ تو یوں بھی تھوڑا بہت حالات کا علم رکھتے ہیں بلکہ وہ طبقہ ہے جو ملک کے دور دراز رہنے میں زندگی بسر کرتا ہے اور یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ غلام بھی ہے یا نہیں اور آزادی و غلامی میں فرق کیا ہے؟

آج ہم روتے ہیں کہ ہمارے یہاں مختلف اقوام میں اتحاد اور یگانگت نہیں پایا جاتا۔ ہر طبقے نے الگ الگ مجلسیں بنا رکھی ہیں اور آپس میں دست و گریبان نظر آتے ہیں۔ لیکن اس پر کبھی غور نہیں کیا گیا کہ اس کا اصلی سبب کیا ہے۔ میں ہرگز اسے برا نہیں سمجھتا کہ ہر قوم کو اپنی رہنمائی کے لئے الگ الگ مجلسیں بنانے پر اصرار ہے۔ یہ تو بہترین طریقہ کار ہو سکتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے ہر ملک میں مختلف صوبے، پھر مختلف اضلاع ہوتے ہیں۔ کیوں؟ صرف سہولت کار کے لئے۔ اسی طرح اگر مختلف جماعتوں کے لیڈر اپنے پیروؤں کی ایمانداری سے رہنمائی کرتے رہیں تو اس میں کیا حرج واقع ہوتا ہے۔ اگر یہ چیز پوری ذمہ داری کے احساس کے ساتھ انجام پا جائے تو عوام بھی بڑی آسانی سے راہ پر لگائے جا سکتے ہیں، اور پھر ہر قوم کی اپنی خصوصیتیں اور انفرادی حیثیتیں بھی قایم رہ سکتی ہیں۔ ہمیں اپنے بزرگوں کی اس کاوش پر ہنسی آتی ہے کہ وہ مختلف اقوام کو ملا کر ایک قوم بنانے کے جنون میں مبتلا ہیں۔ حیرت ہے ملک کی رہنمائی کا دعوی اور اس درجہ بے خبر کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ قومیں ہزاروں برس میں بنا کرتی ہیں اور ہر قوم کی روایات ایسا اہم جزو اس کی زندگی کے ہیں کہ صرف وہی چیزیں اس کی سربلندی و نجات کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ دوسری قوموں کی روایات اور رسوم اسے ہرگز اپیل نہیں کر سکتے۔ اس لئے اگر ایک بار ان سے یہ چیز چھین لیگئی تو پھر صدیوں کے لئے وہ قوم کبھی سر نہیں اٹھا سکتی۔ بتاؤ یہ لیڈری ہوئی یا دشمنی، اس طرح ہندوستان کی ساری قومیں اپنی خصوصیات ضایع کر دیں گی، اور پھر معلوم نہیں کتنے طویل عرصہ کے لئے غلامی سے نجات ناممکن ہو جائے۔ کیا کروں ممتاز! ان تمام حقیقتوں پر غور کرنے کے

بعد میں صرف اسی نتیجہ پر پہنچ سکا ہوں کہ انقلاب کو کامیاب بنانے کی واحد صورت یہی ہو سکتی ہے کہ عوام کی ذہنیت میں بلندی پیدا کر کے ایسا عزم و رسوخ ان میں پیدا کر دیا جائے کہ انہیں کسی راہ نما کی ضرورت ہی باقی نہ رہے اور ان میں خود اپنی رہنمائی کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ لیکن ممتاز! مجھے جو چیز سب سے زیادہ بدحواس کرنے والی نظر آتی ہے وہ ایمانداری و راست بازی کا فقدان ہے۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ ملک کہیں آگے بڑھنے کے عوض پیچھے نہ ہٹ جائے

ممتاز - یہ کہنا تو غلط ہو گا کہ آپ کی تقریر کا بیشتر حصہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ لیکن یہ بتائیے کہ اس پر عمل کرنے کی کیا صورت ہے۔ جو لیڈر ہیں وہ آپ کے خیال کے مطابق ....،، ممتاز یہ کہہ ہی رہا تھا کہ سامنے سے سنتھال قوم کی ایک عورت گزری۔ اقبال ممتاز کی گفتگو سے بے توجہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور جب تک وہ اس کے سامنے سے گزرتی رہی وہ غور سے دیکھتا رہا۔ پھر ممتاز سے مخاطب ہوا" دیکھو یہ ہیں وہ افراد جن کی طرف توجہ کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ لیکن ہے کون جو اس لوہے کے چنے کو گوارا کرے ——— ممتاز! کبھی تم نے ان کی اصلی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ میرا تو ارادہ ہے کہ کچھ روز ان کی صحبت میں رہکر اس سادہ زندگی کا مطالعہ کروں۔ جس میں ابتدائے آفرینش سے اب تک مشکل ہی سے کوئی تبدیلی پیدا ہو سکی ہے۔ چلو ممتاز! ایک بار تاریخ کے ان بوسیدہ اوراق کا مطالعہ کریں جسے آج کے ذہن انسانی نے تقریباً فراموش کر دیا ہے ....،،

(۲)

اقبال اور ممتاز ایک ہفتہ سے سندر پہاڑی کے بنگلہ میں مقیم ہیں۔ تمام دن سنتھالیوں کی بستیوں میں گھوم گھوم کر ان کی طرز زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور شام کو اپنی قیام گاہ پر واپس آجاتے ہیں تھوڑے ہی عرصہ میں وہ ان سے بہت مانوس ہو گئے - اور کوشش کر کے انکی زبان بھی سیکھ لی - اس عرصہ میں ممتاز بہت گھبرا گیا - اسے ان چیزوں سے فطرتاً کوئی خاص لگاؤ نہ تھا، اسلئے پہلے تو اقبال کو بھی واپس لے چلنے کی کوشش کی لیکن جب اقبال کسی طرح اتنا جلد واپس چلنے پر رضامند نہ ہوا تو تنہا روانہ ہو گیا۔ اقبال بھی اپنی جگہ تنہا رہ گیا لیکن اسے اس کی چنداں فکر نہ تھی، وہ فطرتاً تنہائی پسند بھی تھا اور اس کی تلخیوں نے اس میں شدت پیدا کر کے بڑی حد تک اس کا عادی بھی بنا دیا تھا ———

——— اقبال نے ایک پاٹ شالہ کی بنیاد ڈالدی اور پہاڑی قوموں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسی طرح اس کی مشغولی کا بھی سامان ہو گیا۔ وہ اس میں بے حد دلچسپی لینے لگا اور تھوڑے ہی دنوں میں پہاڑیوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں اسے کامیابی ہوتی نظر آنے لگی ....

اقبال تمام دن انہیں مشاغل میں بسر کرتا لیکن شب کی تنہائیاں اس کے دماغ کے لئے ایسے ہیجان کا سامان پیدا کر دیتیں، جن سے وہ تھوڑا پریشان ہو جاتا۔ اس کے لئے ماضی میں کوئی دلچسپی نہ تھی کہ انہیں خیالات سے چندے دل بہلا کر اتنا وقت کاٹ دیتا کہ پھر نیند اسے تمام افکار سے نجات دلا دیتی اور نہ مستقبل ہی سے وہ کوئی امید وابستہ کرنا چاہتا تھا۔ ایسی ہی گھڑیوں میں گھبرا کر وہ اکثر چاندنی شب میں جنگل کی سیر کو نکل جاتا یا پہاڑی کی کسی چٹان پر بیٹھ کر شب کی اولین چند ساعتیں بسر کر دیتا۔

سندر پہاڑی کے جنگل بہار کی شفاف چاندنی میں کچھ اتنا دلکش منظر انسانی نگاہوں کے سامنے پیش کرتے ہیں جن کا ایک بار تجربہ کرنے کے بعد مشکل ہی سے کوئی شخص دنیا اور اس کی رنگینیوں کی کوئی وقعت اپنے ذہن میں قایم کر سکے۔ وہاں کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں جو خودرو جھاڑیوں سے آراستہ نظر آتی ہیں، انسان کے قلب و دماغ میں ایسی آگ لگا دیتی ہیں کہ پھر وہ چاہتا ہے کہ انہیں میں گم ہو جائے۔ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر فضائے بسیط کا مطالعہ کتنا دلکش تجربہ ہے۔ چاند کا دریائے نیل میں تیرنا، ستاروں کی سبک رفتاری، ہوا کے تیز جھونکے اور ماحول کی لامحدودیت یہ سب چیزیں کچھ ایسی کیفیتیں انسانی ذہن و ادراک پر مسلط کر دیتی ہیں کہ اس میں گم ہو کر اسے دنیا کی ایک ایک چیز حرکت کرتی معلوم ہوتی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قوت متخیلہ اتنی تیز ہو گئی ہے کہ وہ ہر حرکت کو محسوس کرنے لگی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اسے پر لگ گئے ہیں اور وہ فضا میں پرواز کر رہا ہے، اور یہ ساری حرکتیں حقیقتاً اعتباری ہیں جو نتیجہ ہیں خود اسی کی حرکت و پرواز کا۔

چاندنی کی ایک ایسی ہی پرسکون اور خنک شب میں اقبال معمول کے مطابق ایک چٹان پر بیٹھا، فطرت کے مطالعہ میں مصروف تھا کہ ایک خاص طرح کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ جنگل کے معمولی خروش یا محض ہوا کے تیز جھونکے کا نتیجہ نہ تھی، ایک بانسری کی آواز تھی جس نے اقبال کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ آواز اقبال کے لئے اس علاقہ میں بالکل نیا تجربہ تھا۔ یہ کسی جنگلی باشندے کی بانسری کی آواز نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا لحن اور اس کا تسلسل اس سے قطعی

علیحدہ اور انوکھا تھا۔ اقبال اُٹھا اور اُسی طرف روانہ ہوا۔ پہلے وہ پہاڑی سے اتر کر جنگل کی طرف چلا۔ لیکن اسے فوراً ہی معلوم ہوا کہ آواز کی گونج اور باز گشت نے اسے غلط راستہ پر لگا دیا ہے۔ اسے دوسری پہاڑی پر چڑھنا تھا۔ جوں جوں چڑھتا گیا آواز زیادہ صاف آنے لگی۔ اوپر پہنچ کر وہ مبہوت رہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی مصروف نغمہ ہے جو تصویر سامنے تھی وہ ماحول کے اعتبار سے پرے تھی، وہم و قیاس سے، وہ کچھ ایسا محسوس کرنے لگا کہ نغمہ کی کوئی دیوی آسمان سے دنیا والوں کو لوری دینے کو اتر آئی ہے۔ اقبال دیر تک اپنے خیالات سے لطف اٹھاتا رہا۔ اور وہ بانسری سے کھیلتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بانسری بند کی اور ایک طرف خاموش روانہ ہو گئی۔

اقبال کی جولانگاہ بڑی حد تک اب محدود ہو گئی، اس پہاڑی تک۔ اس کے لئے اس نئی سیرگاہ میں بہت زیادہ دلچسپی تھی، وہ تقریباً روزانہ وہاں جاکر لطف میں بسر کر دیتا۔ بار ہا اسکے دل نے تجسس حال کے لئے اکسایا بھی لیکن اس خوف سے مبادا اس دیوی کو اس کے وجود کا علم ہو جائے اور پھر وہ اس مسرت سے جو روزانہ اسے حاصل ہے محروم ہو جائے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

ایک روز اسی طرح اقبال اپنی جگہ بیٹھا تھا کہ وہ آئی اور بالکل اس کے مقابل میں ایک چٹان پر اپنی نشست قایم کی۔ اقبال پہلے تو کچھ گھبرا سا گیا، لیکن پھر اسے بالکل اتفاقی چیز سمجھ کر خاموش رہا۔ ابھی اقبال پوری طرح مطمئن نہیں ہونے پایا تھا کہ اس نے اقبال کو مخاطب کیا "آیئے اقبال صاحب آپ اتنی دور کیوں کھڑے ہیں"

اقبال کے کان مشکل ہی سے یقین کر سکے کہ حقیقتاً وہی اس کا مخاطب ہے۔ وہ سخت حیرت زدہ تھا کہ اس کا نام اسے کیونکر معلوم ہوا اور پھر اپنی اس حرکت پر کہ وہ روزانہ چھپ چھپ کر اسے اس طرح دیکھتا رہا ہے، کچھ ندامت سی محسوس کرنے لگا۔ بہر حال وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس کے قریب جاکر بیٹھ گیا اور پھر بڑی ہمت کر کے اس نے پوچھا "آپکو میرا نام کس طرح معلوم ہو گیا"

"اس میں حیرت کی کیا چیز ہے اقبال صاحب" اس نے جواب دیا "جب اول اول آپ اس علاقہ میں تشریف لائے، اور یہاں کے لوگوں سے آپ نے ملنا جلنا شروع کیا، آپ کی شہرت میرے کانوں تک بھی پہنچی۔ اُسی وقت سے میں برابر تقریباً آپ کی ہر نقل و حرکت کا مطالعہ کرتی رہی ہوں۔ آپ جس روز سے اس جگہ آنے لگے اس سے بھی بے خبر نہیں۔ آپنے اپنے کو میری نگاہوں سے اوجھل رکھنے کی کوشش ضرور کی لیکن آپ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے، جی تو چاہا تھا کہ اُسی روز آپ کو مخاطب کروں، لیکن میں باز رہی اس خیال سے کہ ممکن ہے آپ کا ادھر آنکلنا بالکل اتفاقی امر ہو اور میری یہ جسارت آپ کو ناگوار گزرے مگر آپ کا یہ سلسلہ قایم رہا اور بالآخر آج میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس خموشی کو توڑ دونگی اور آپ سے پوچھونگی کہ آپ تو اس دنیا کے رہنے والے ہیں جس کی رنگینیوں کے لطف سے آگاہ ہونے کے بعد انسان کسی دوسری طرف دھیان دینا کبھی گوارا نہیں کرتا۔ پھر آپ کے لئے اس جنگلی علاقہ میں کیا لطف ہے؟"

اقبال جب تک اس کا مطالعہ دور سے کرتا رہا تھا اقبال کے تاثرات اس کے نغمہ تک محدود تھے۔ لیکن اب کہ اس کے چشم و ابرو کا سحر جلال، پیشانی درخشاں کا رنگ نور، اعضاء جسم کا تناسب و موزونیت، کمر و سینہ کا نشیب و فراز، زلفوں کی انعیت اور زبان و طرز کلام کی شیرینی تقریباً عریاں ہو کر سب کی سب اس کے سامنے آ گئیں تو اقبال بالکل مبہوت ہو کر اس کا منھ تکنے لگا۔ اس کا وجود تبا کے لئے بالکل معمہ تھا۔ اس علاقہ میں کسی ایسی ہستی کا پایا جانا جو حسن صورت کے علاوہ تہذیب شائستگی سے بھی بڑی حد تک آگاہ ہو قطعی محال تھا۔ وہ کبھی اس آب و گل کی پیداوار نہیں ہو سکتی ....

اقبال کو ابھی ان خیالات سے فرصت نہیں ملی تھی کہ اس نے پھر سوال کیا "کیوں اقبال صاحب! آپ بالکل خاموش کیوں ہو گئے۔ آپ کچھ کھوئے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں"

اقبال - صحیح ہے، میں یقیناً کھو گیا تھا اپنے سلسلۂ خیال میں۔ یکا یک میری آنکھوں کے سامنے ایک ایسا منظر آ گیا ہے کہ مشکل ہی سے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کا وجود میرے لئے ایک معمہ ہو کر رہ گیا ہے اور باور کیجئے اسے سلجھانے کی صلاحیت میرے دماغ میں موجود نہیں۔ خدا کے لئے مجھے بتایئے کہ آپ کون ہیں۔ آپکا نام کیا ہے اور آپ یہاں کیوں رہتی ہیں؟"

"میرا نام مس جیمس ہمرودم ہے - میں یہیں کی رہنے والی ہوں۔ کہیں دوسری جگہ سے نہیں آئی۔ دیکھئے وہ جو سامنے پہاڑی ہے اُس کے دوسرے نشیب پر میرا جھونپڑا ہے جہاں میں تنہا رہتی رہتی ہوں۔ ہاں اقبال صاحب! آپنے میرے سوال کا جواب نہیں دیا"

اقبال - آپ کا سوال اتنا اچانک ہے کہ شاید میں اس وقت اس کے

جواب کے لئے تیار نہیں اور ہاں ...."

اقبال کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ مس ہمروم یہ کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی "آج بہت دیر ہوگئی پھر کبھی باتیں ہونگی۔"

آج اقبال روزانہ سے زیادہ پریشان تھا، مس ہمروم کی گفتگو نے اس کی حیرت میں چند در چند اضافہ کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر وہ اسی آب و گل کی پیداوار ہے (جس پر یقین کرنے کو اب بھی اس کا جی نہیں چاہتا تھا) تو اس میں یہ تہذیب اور علم کہاں سے پیدا ہوگیا اور پھر فطرت کی یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک ایسے شگفتہ پھول کو ایسی سرزمین میں پیدا کر دیا ہے جہاں نہ تو کسی کی نگاہیں اس کی رنگینیوں سے لطف حاصل کر سکتی ہیں اور نہ کسی کے مشام اس کی عطر بیزیوں سے سرمستی ——— شاید فطرت کو اپنے ہی قلب و جگر کی تسکین منظور ہو ....

دونوں روزانہ ملتے رہے اور بے تکلف بھی ہوتے گئے۔

اقبال نے بھی اپنے لئے ایک جھونپڑا اسی پہاڑی پر بنا لیا جس پر مس ہمروم کا تھا۔ اور فرصت کے بیشتر اوقات اس کی معیت میں بسر کرنے لگا۔ اس عرصہ میں اقبال کے بار بار کے استفسار پر مس ہمروم نے اسے بتا دیا کہ "میرا باپ ایک انگریز مسٹر جیمس ایک عیسائی مشن کا پادری تھا، جو مذہب کی تبلیغ کے لئے یہاں آیا تھا اور مستقل یہیں بود و باش اختیار کر لی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب باہر کے کسی انسان کا یہاں گزر بڑی مشکل چیز تھی۔ اور آپ کو جو یہ چند عیسائی نظر آتے ہیں وہ اُسی کی تبلیغ کا نتیجہ ہے اور تھوڑی بہت جو ان لوگوں میں آپ کو آدمیت دکھائی دیتی ہے وہ اسی کی تعلیم کا اثر ہے۔ میری ماں پہلی عیسائی تھی اس سے میرے باپ نے شادی بھی کر لی۔ میری ماں کو اس نے کافی تعلیم دی تھی۔ ایک روز جب میں ابھی چھوٹی تھی کسی ضرورت سے میرا باپ باہر گیا اور آج تک نہیں پلٹ سکا۔ میری ماں جوں توں دن کاٹتی رہی۔ دو گائیں تھیں جن پر ہم دونوں کا گزر تھا۔ یہاں تک کہ ایک سال ہوا میری ماں بھی مجھے تنہا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئی۔ میں نے جو کچھ تعلیم حاصل کی وہ ماں سے یا پھر اس چھوٹی سی لائبریری سے جسے میرے والد اپنے ہمراہ لائے تھے اور اب وہی تنہا میری مونس ہے۔ آپ کی دنیا کا تھوڑا بہت علم تو بچپن میں والد سے ہوا یا پھر انہیں کتابوں سے، ورنہ وہ تو میرے لئے ماورائے سرحد اور اک کا حکم رکھتی ہے .... کیسی رنگین دنیا میں آپ لوگ بسر کرتے ہیں اقبال صاحب! جہاں ہر وقت ایک جھنکار سی انسان محسوس کرتا ہوگا"

اقبال۔ میری دنیا رنگین ہے آپکو کیا معلوم مس ہمروم کہ اس پر کتنے مصنوعی رنگوں کے غلاف چڑھے ہوئے ہیں، اگر ایک بار اس کا اصلی خط و خال آپ کی نگاہوں کے سامنے آجائے تو پھر آپ کو ایسی نفرت ہوجائے کہ ادھر دھیان دینا بھی شاید آپ گوارا نہ کریں" اس کے بعد اقبال نے اسے بتایا کہ اسے خود اس کی دنیا اور اس کی سوسائٹی نے کس طرح تباہ کیا ہے اور اس کی سوسائٹی نے کیسے کیسے امتیازات رنگ و نسل، مذہب و ملت اور جاہ و ثروت کے قایم کر رکھے ہیں۔ اور کس کس طرح انسانیت کا خون وہاں بہایا جاتا ہے۔

اقبال یہ کہہ رہا تھا اور مس ہمروم گہری فکر میں مبتلا ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے چہرہ کا تغیر اتنا نمایاں تھا کہ اگر شب کی تاریکی حائل نہ ہوتی تو ممکن تھا اقبال بھی اس سے متاثر ہو کر اپنا موضوع بدل دیتا۔

(۳)

اب تک اقبال اور مس ہمروم جس طرح ملتے رہتے تھے اس میں وہی جذبہ کارفرما نظر آرہا تھا جو وطن سے بہت دور دو ہمجنس یا ایک ہی تہذیب کے دو آشناؤں کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ ان میں ایک طرح کا خلوص بھی پایا جاتا ہے اور ایک دوسرے کے مددگار بھی رہتے ہیں۔ اقبال بھی مس ہمروم کے کاموں میں مدد دیتا اور مس ہمروم بھی اقبال کے مشاغل میں ہاتھ بٹانے لگی۔

اقبال کی گذشتہ زندگی کا تجربہ اتنا تلخ تھا کہ وہ ایک لمحہ کیلئے بھی کسی مسرت کا خواب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ صنف نازک کی طرف سے ایک ایسی حقارت و نفرت اس کے دل میں پیدا ہوگئی تھی کہ سمجھنے لگا تھا کہ اس طبقہ کی آفرینش سے فطرت کی غرض بجز تباہی و ہلاکت پھیلانے کے کوئی دوسری ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے یقین تھا کہ اسے اگر یہ کھڑاگ مچانا ہوتا تو حوا کی پیدائش کا کوئی دوسرا مفہوم ہی متعین نہیں ہوتا....

.... لیکن اب کہ اس کے دماغ کو ذرا فرصت ملی تھی اور زمانہ نے اسکے زخم میں اندمال پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے سامنے اس کی تلخیاں تھیں لیکن وقت و زمانہ کا ایک حجاب ان پر پڑتا جا رہا تھا اور اب ان میں وہ شدت نہ تھی جو ابتداً اسے بہت زیادہ پریشان کئے ہوئے تھیں۔ حالات کی اس رو میں مس ہمروم کا وجود اس کے سامنے آیا اور وہ ایک بار پھر کچھ سوچنے لگا۔ اول اول اس نے زیادہ اہمیت نہیں دی، لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا اقبال کا ہیجان ایک بار

پھر عود کرتا ہوا اسے معلوم ہوا۔ اور وہ صاف طور پر محسوس کرنے لگا کہ جب مس ہمروم اس کے سامنے ہوتی ہیں تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے اور وہ اس میں ایک خاص طرح کی لذت محسوس کرتا ہے اور جب وہ سامنے نہیں رہتیں تو اس کی آنکھیں بے اختیار راہ تکتی رہتی ہیں ـــــ اقبال بُری طرح محسوس کر رہا تھا کہ اس کے دل کو مس ہمروم سے ایک خاص وابستگی ہوتی جا رہی ہے۔ اول اول تو وہ اس خیال ہی سے کانپ گیا، لیکن آخر اپنے دل کی تسکین کے لئے اس طرح تاویلیں کرنے لگا کہ دنیا کے گرد و غبار کا اس گوشۂ فردوس میں کیا ذکر۔ یہاں وہ کون سی شے ہے جو اسے ایک حور کی آغوش سے محروم کر سکتی ہے ـــــ

ایک روز صبح کے ایسے تڑکے میں جب آسمان پر ابھی کچھ کچھ ستارے باقی تھے اور فطرت کا وہ سُرخ مخملیں فرش جو شاہ خاور کی آمد پر وہ کائنات پر بچھاتی ہے، ابھی تاریکی سے پوری طرح نمایاں نہیں ہو سکا تھا کہ مس ہمروم کی بانسری ہواؤں میں گونجنے لگی۔ اقبال کی آنکھ کھل گئی، کچھ دیر تک اپنے بستر ہی پر پڑا پڑا کروٹیں بدلتا رہا لیکن تیر و پیکان کی مسلسل بارش اس کی برداشت سے باہر کی چیز تھی وہ بے اختیار اپنی جائے پناہ سے نکل کر مس ہمروم کے پاس ہی آ کر بیٹھ گیا، مس ہمروم نے اسی طرح اپنا شغل جاری رکھا۔ اقبال بُری طرح متاثر ہو رہا تھا اور حد درجہ بیتاب، وہ بالکل خاموش سُن رہا تھا اور آنسو بہا رہا تھا۔ اس کا ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا گویا سیلاب کے بند کو توڑ دینا تھا۔ لیکن انتہائی کوششوں کے باوجود بھی وہ ضبط پر قادر نہ رہ سکا اور بالآخر پھوٹ پڑا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"یہ آپ کی کیا حالت ہے اقبال صاحب!" مس ہمروم نے پوچھا، "میں دیکھ رہی ہوں آپ چند دنوں سے بہت اداس رہنے لگے ہیں۔ شاید وطن یاد آ گیا ہے"

اقبال ۔ "ہاں یاد آ گیا ہے، لیکن اس طرح نہیں جس طرح آپ سمجھتی ہیں۔ میں خود نہیں کہہ سکتا یہ کیا انقلاب مجھ میں پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ باور کیجئے، میری زندگی کا وہ دیرینہ باب جسے میں قلب کے کسی گوشہ میں دفن کر کے خاموش ہو چکا تھا ایک بار پھر ننگا ہوں کے سامنے آ گیا ہے۔ مس ہمروم! میں نے ایک بار پھر قسمت کی بازی لگائی ہے۔ میں نے اپنی زندگی دنیا سے بالکل علیحدہ گذار دینے کا عہد کر لیا تھا لیکن فطرت نے مجھے اس عہد پر استوار نہیں رہنے دیا۔ میرے قدموں کو لغزش ہو چکی ہے اور کوئی شے مجھے آپ کے قدموں میں گرنے سے روک نہیں سکتی۔ مس ہمروم! میں کئی دنوں سے اپنے ان جذبات سے جنگ کر رہا ہوں۔ لیکن اب کہ زیادہ کا یارا نہیں، صاف صاف سُن لیجئے کہ میں بُری طرح آپ کو چاہنے لگا ہوں ـــــ

ـــــ کیا خبر تھی، ہر جگہ کا آسمان ایک ہی سا ہے اور فلکِ روزگار کی گردش ایک ہی طرح کارفرما"

مس ہمروم ۔ "میں بھی آپکی حالتوں کا اندازہ لگاتی رہی ہوں اقبال صاحب! میں نے آپ کا مطالعہ ابتدا سے کیا ہے، اور باور کیجئے بڑی حد تک آپ کے تاثرات سے واقف رہی ہوں۔ یہ کہنا شاید غلط ہو گا کہ میں خود ان سے متاثر نہیں ہوتی رہی۔ آج میں بھی کچھ چھپا نہیں رکھوں گی۔ اس سے انکار نہیں کہ میں اسی جنگل میں پل کر بڑی ہوئی۔ لیکن شاید کچھ خون کے رابطے اور کچھ تعلیم نے بعض ایسی خصوصیتیں مجھ میں پیدا کر دی ہیں جن سے میری قوت ادراک احساس میں ایسی تیزی پیدا ہو گئی ہے۔ کہ میں خفیف سے خفیف دل کی دھڑکن کو بھی محسوس کر سکتی ہوں۔ اسی بنا پر میں اپنی زندگی میں ایک ایسے انقلاب کی آرزو کرنے لگی ہوں جو اس خشک اور یکساں طرز میں دلچسپی کا کوئی شائبہ پیدا کر سکے۔ یہ جنگل اور اس کی دلفریبیاں جن کا تذکرہ آپ نہ جانے کس کس جوش و ولولہ سے برابر کرتے رہے ہیں، میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی ہیں ان میں ایسی غیر دلچسپ یکسانی پاتی ہوں کہ میری بے تابیاں ان کے شبانہ یوم کے تجربہ کے بعد بھی کم نہیں ہوتیں۔ ہر طرف ایک سناٹا ہے اور ایسا بے معنی خلا جس میں تمام عمر پرواز کرنے کے بعد بھی سوائے تکان کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میں تشنہ تھی لیکن یہاں کی تمام جوئباریں مجموعی طور پر بھی میرے کام و دہن کی سیرابی کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ یہ سکون مسلسل جسے آپ اپنے درد کی دوا بناتے ہیں برابر میری بے چینیوں میں اضافہ کرنے کے بجائے کوئی کیفیت طمانیت کی پیدا نہیں کر سکا، میں سرگرداں تھی لیکن یہ معلوم نہ تھا کس کی جستجو میں ـــــ

ـــــ یہاں تک کہ میری نظر آپ پر پڑی اور آنکھوں نے ایک مبہم پیغام دل کو پہنچایا۔ اور جوں جوں میں آپ کا مطالعہ زیادہ قریب سے کرتی گئی، میں یقینی طور پر یہ محسوس کرنے لگی کہ آپ جب پاس بیٹھے ہوتے ہیں میرے جذبات میں ایک ہیجان بپا ہو جاتا ہے، اور ایسا دل خوش کن ہیجان کہ دل چاہتا ہے کہ اس کا ثبات و قیام اپنے بس کی چیز ہوتی ـــــ جذبات کے اس رو میں میں بہتی چلی جا رہی تھی اور باور کیجئے میں اپنے کو طوفان کے حوالے کر دینے کے

بعد بھی اس سے نجات کیلئے ہاتھ پاؤں مارنا گوارہ نہیں کر رہی تھی، واقعات میرے ساتھ اسی طرح گزر رہے تھے کہ آپ نے افسانہ چھیڑا اسی کے ساتھ مجھے علم ہوگیا کہ آپ کے طبقے نے کیسے کیسے امتیازات رنگ ونسل اور مذہب و ملت کے، اور کیسی کیسی تفریقیں دولت و ثروت کی نوع انسانی میں قایم کر رکھی ہیں - اب میری المناکیوں کا اندازہ کیجیئے اقبال صاحب! جب میں یہ سمجھنے پر مجبور کر دی گئی تھی کہ آپ بھی اسی طبقہ کے ایک فرد ہیں ——
میں ایک بار پھر تڑپنے لگی، بلکہ زیادہ شدت کے ساتھ ——
—— اُف! توقع کی شکست کس قدر تلخ ہے!"

اقبال - مس ہمدم! آپ جس درجہ ذہین ہیں میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا - میں نے اگر اپنا افسانہ آپ سے دہرایا تھا تو اس کے ساتھ ہی اپنے جذبات سے بھی آپ کو ناواقف نہیں رکھا تھا - پھر ایک حصّہ پر یقین کرنا اور دوسرے کو نظر انداز کر جانا آپ ہی بتائیے کہاں کا انصاف ہے - آپ دیکھ رہی ہیں کہ میری سوسائٹی سے مجھے کوئی واسطہ نہیں رہا - پھر اس کے مکروہات سے مجھے ملوث کرنا آپ کیوں جائز قرار دیتی ہیں - ممتاز کئی کئی بار آ آکر مجھ سے واپس چلنے پر اصرار کرتے رہے - لیکن میرے فیصلہ میں کوئی لغزش پیدا نہیں ہو سکی پھر اگر بس چلتا تو ساری دنیا میں آگ لگا دیتا کہ موجودہ تہذیب و معاشرت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے اور پھر خاک کے اسی ڈھیر پر ایک ایسی نئی دنیا کی بنیاد ڈال دیتا جس میں یہ رسمی امتیازات بار آور ہی نہ ہو سکیں ایک ایسی دنیا ہوتی جس میں صرف انسانیت ہی کو میزان ٹھہرایا جاتا اور پھر انسان جنت کے خواب دیکھنا بھی فراموش کر جاتا"

مس ہمدم - سب کچھ صحیح ہے اقبال صاحب! اور میرے لئے کس قدر دل خوش کن ہیں یہ جذبات، لیکن ڈرتی ہوں کہ جس ماحول میں آپ پل کر بڑھے وہ یقیناً آپ کی فطرت بن چکی ہوگی - ابھی آپ کا زخم پوری طرح مندمل نہیں ہوا ہے - لیکن زمانہ اپنے اصول کے مطابق آپ کے دماغ سے بھی اسے فراموش کر دیگا
اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو گئی اور آپ کے وہ نقوش جو فی الحال غیر متشاعر حصّہ دماغ میں دب کر رہ گئے ہیں، اگر ایک بار پھر سطح پر اُبھر آئے تو آپ ہی بتائیے میں کیا کرونگی اقبال صاحب

اقبال - قطعی ناممکن ہے مس ہمدم - اب ان دیرینہ جذبات کو اتنی مدت ہو چکی ہے دفن ہوئے کہ اس کی شاید خاک بھی باقی نہیں اور اگر بفرض محال آپ کے توہمات نے کوئی شکل اختیار بھی کی تو باور کیجئے ایک آپ کے لئے میں ساری دنیا سے جنگ کروں گا - میں دوسری دفعہ سوسائٹی کو ایسی آسانی سے چھوڑ نہیں سکتا - میں اسے بھی تباہ کرکے رکھ دوں گا"

اقبال کی گفتگو میں ایک ایسا خلوص اور استقلال عزم کی ایسی جھلک پائی جاتی تھی کہ مس ہمدم کا دل متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا وہ خود اقبال ہی کی طرف سے ایک جذبۂ پذیرائی اپنے دل کے اندر پاتی تھی اور چاہتی تھی کہ ایسی ہی کوئی صورت پیدا ہو جائے، اسلئے وہ اور زیادہ بُری طرح متاثر ہوگئی - اور بالآخر ایک بار اقبال کی آغوش میں گر کر اپنے کو اس کے حوالہ کر ہی دیا -

(۴)

اقبال اور مس ہمدم کے نکاح کو کئی ماہ گذر چکے ہیں، اور اب ان کی محبت کے طوفان میں ایک ایسا سکون پایا جاتا ہے جو بالکل فطرت ہے - اس عرصہ میں کئی بار ممتاز آ آکر اس سے مل گیا - اس کی والدہ کی بے چینیوں کا حال بھی بیان کیا لیکن اقبال نے کچھ زیادہ اس طرف دھیان دینے کی ضرورت نہ سمجھی یہ بھی صحیح ہے کہ اقبال کو بعض اوقات والدہ کی جدائی کی ٹیس محسوس ہوئی، لیکن اس کی تلخیوں کی یاد نے اسے دبا دبا دیا - اور نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال اسی طرح اور کتنی مدت گزار دیتا اگر ممتاز یکایک آکر اس کی والدہ کی شدید علالت کے سبب زندگی سے مایوسی کی خبر اسے نہ دیدیتا - اقبال گھبرا گیا اور اب اس کے دماغ کو کچھ اور سوچنے کی فرصت نہ تھی وہ چلنے کو تیار ہوگیا - اقبال کی روانگی کی تیاریوں سے مس ہمدم بھی سخت متوحش ہوئی اور ہمراہ چلنے پر اصرار کرنے لگی - اقبال نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن بے سود، وہ کسی طرح رضامند نہ ہوئی اور آخرکار تینوں کے تینوں روانہ ہوئے -

گھر پہنچ کر اقبال ماں کے سامنے پہنچا اور سلام کرکے پٹی کے نیچے بیٹھ گیا - ماں حد درجہ نحیف ہوگئی تھیں - ماں نے آنکھیں کھولیں "آخر تم آئے بیٹا!" ماں نے کہا "اقبال! تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ ایسے وقت میں جب تم میرے محتاج تھے میں نے تمہیں نہیں چھوڑا تھا بیٹا! لیکن جب مجھے تمہاری خدمتوں کی ضرورت ہوئی، تم مجھ سے کنارہ کش ہوگئے - سچ ہے میں اُس پر

قادر نہ تھی اور تمہیں اپنے فعل پر اختیار تھا - یہی فرق ہے اقبال! والدین اور اولاد میں" یہ کہتے کہتے ماں نے آنکھیں بند کرلیں اور آنکھ سے آنسو کے قطرے ٹپک ٹپک کر بستر میں جذب ہونے لگے - اقبال بھی بُری طرح متاثر ہو رہا تھا اور بچوں کی طرح بلبلانے لگا - ماں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور کچھ بولنا چاہتی تھی کہ مسز اقبال پر نظر پڑگئی، تھوڑی دیر کے لئے لب کھلے کے کھلے رہ گئے - اور چہرہ پر ایک خفیف سی سُرخی نمودار ہوئی - گرچہ وہ اتنی خفیف تھی کہ اگر اقبال کی ماں بہت صاف رنگ کی عورت نہ ہوتیں تو شاید دوسروں کی نظریں اسے دیکھ بھی نہ سکتیں، لیکن پیشانی کی چلن اور لبوں کا ارتعاش یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کی کمی جذبات کے برانگیختگی کی صحیح آئینہ دار نہیں، بلکہ بیماری کے سبب خود خون کی کمی کا نتیجہ ہے - ورنہ وہ اپنے جذبات کے اعتبار سے ایک طوفان میں مبتلا ہیں -

" اقبال! یہ لڑکی کون ہے ؟" آواز میں خفیف سی تیزی اور لہجہ میں کافی خشونت تھی " ہاں سمجھی شاید یہی ہے وہ لڑکی جس نے تمہیں اپنی طرف مائل کر کے گھر بار سب سے علیحدہ کرا دیا - تم اسے یہاں کیوں لائے - تم نے کیسے ہمت کی کہ ایک مرنے والی ماں کے سینہ پر جس نے تمہاری تمناؤں میں زندگی بسر کی ہو کودوں دلو - ابھی میرے خون میں شرافت باقی ہے، میں ہرگز یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ ایک غیر معلوم خاندان کی لڑکی ایک سید خاندان سے متعلق ہو کر اسے داغدار بنا دے - تمہیں اپنی جوانی کے جھونک میں کچھ سوجھائی نہیں دیتا - جانتے ہو تم نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے - کیا تم سمجھتے ہو تمہاری سوسائٹی اسے گوارا کرسکتی ہے؟ میں نے مانا تم سوسائٹی کی پرواہ نہیں کرتے، لیکن کبھی تم نے سوچا کہ تم دونوں کی زندگی صرف تمہارے ذاتی تعلقات پر ختم نہیں ہوجاتی - اس سے آیندہ ایک نسل کی قسمت وابستہ ہے - کیا تم نے خود اپنی ہونے والی اولاد کے ساتھ ظلم نہیں کیا ہے - اسے ذلیل سمجھا جائیگا اتنا ذلیل کہ وہ کسی سے آنکھ بھی برابر نہیں کرسکیں گی - سوچو اور جواب دو تم اسے گوارا کرسکتے ہو - حیرت ہے جس سوسائٹی کے ظلم کی شکایت تم کرتے ہو - اس سے تم نے یہ توقع کیسے قایم کرلی کہ تمہارا پاپ وہ برداشت کرے گی " اقبال کی ماں کا دم پھولنے لگا " اقبال! خدا کے لئے اسے کہو کہ جلد یہاں سے چلی جائے ... دَ ... رَ ... نہ مے ... رِی ... رُو ... حُ کو ... بِھی ... ہچے ... لُ ... نَ ... رِصی ... بُ ... نَ ... ہیں ...... لب ساکت ہوگئے، اور آنکھیں بند ہوگئیں - اقبال کو آنسوؤں سے جو ذرا فرصت ملی تو ماں رخصت ہوچکی تھیں -

اقبال سخت پریشان تھا، اتنا پریشان کہ جب تک تجہیز و تکفین سے اسے فرصت نہ ہوئی اسے مس ہمروم کا خیال بھی نہ آیا - جب فرصت ہوئی تو اسے معلوم ہوا کہ آمد کے چند ہی ساعت بعد مس ہمروم گھر سے باہر گئیں اور پھر پلٹی نہیں - اقبال بدحواس تھا لیکن پھر یہ سمجھ کر کہ وہ سندر پہاڑی کی طرف چلی گئی ہونگیں اپنے قلب کی تسکین کرتا رہا اور انہیں خیالات میں بڑی مشکل سے سوم تک دو تین یوم بسر کئے - اس کے بعد وہ بھی اسی طرف روانہ ہوگیا -

اقبال نے سندر پہاڑی پہنچ کر جو کچھ دیکھا اس نے اس کی نظروں میں دنیا تاریک کر دی - جھونپڑی کی جگہ محض خاک کا سیاہ ڈھیر تھا - دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ ہی روانگی کے بعد مس ہمروم کو وہاں کسی نے نہیں دیکھا - دو دن بعد کسی نے اس کی جھونپڑی میں آگ بھی لگا دی -

اقبال ایک طرف جنگل میں گھس کر غائب ہوگیا، اور پھر اس کا کہیں پتہ نہ تھا، یہاں تک کہ ایک دن اس کی لاش ایک پہاڑی کے دامن میں پڑی پائی گئی - سر اور سینہ زخموں سے چور تھے

اب اسے دنیا کے گرد و غبار سے نجات مل چکی تھی -

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
غالب

تالی

از جناب کامریڈ انیس الرحمٰن صاحب

ہم تین بھائی بہن تھے۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن اور اُس سے چھوٹا بھائی۔ میں دس گیارہ سال کا تھا کہ ابّا جان نے دنیا سے مُنہ موڑا۔ ابّا جان کے مرنے کی عمر نہ تھی، اور تھے بھی اچھے خاصے ٹانٹھے۔ لیکن موت کا کوئی کیا کرے بچ رہی تھیں دائم المرض اُمّی، سو وہ بھی ایک سال کے اندر ابّا جان کے پائنتی میں جا لیٹیں ——— بیچاری اِس پہاڑ سے صدمہ کو نہ سہہ سکیں۔ اب ہم تین رہ گئے۔ ننھی سی عمر تھی، کھیل کود میں ہم نے ابّا اور اُمّی کو بھلا دیا۔ ہم کھیلتے کودتے قبرستان میں بھی چلے جاتے۔ سعید سے پوچھتے "ابّا کہاں ہیں" وہ کہتا "یہاں چھپے (سوئے) ہیں"۔ اور اُمّی؟ ——— "اُمّی یہ ہیں" اُن کی قبر کو بتا کر کہتا۔ اِس پر ہم دونوں ہنس پڑتے اور سعید کو پیار کرنے لگتے۔ لیکن مُنّا کچھ مغموم سی ہو جاتی، اور سعید کو بہت سنجیدہ ہو کر ڈھارس دینے لگتی۔

میرے گھر سے ذرا ہٹ کر چھوٹے ابّا (والد کے چھوٹے بھائی) رہتے تھے۔ وہ ہماری یتیمی پر بہت روتے۔ وہ سدّو کو گود میں لیکر پوچھتے "ابّا کہاں ہیں؟" وہ کہتا "درگاہ میں چھپے ہیں" چھوٹے ابّا کہتے "نہیں بیٹا! تمہارے ابّا تو ہم ہیں"۔ تب مُنّا کہتی "اور اُمّی؟" "اُمّی وہ بیٹھی ہیں"۔ چھوٹی چچی کو بتلا کر کہتے۔ غرضکہ سدّو اور مُنّا کو ابّا بھی مل گئے۔ اور اُمّی بھی لیکن خورشیدی اور شمّی سے ان کی بڑی لڑائیاں ہوتیں۔ وہ کہتی "نہیں یہ تو میرے ابّا ہیں"۔ غرضکہ ۴-اور ۶ سال کے یہ دونوں فرشتے مزے میں بہل گئے۔

ایک دن پکڑ کر ان دونوں کا مدرسے میں نام لکھوا دیا۔ مدرسے جانے میں یہ روزانہ کسر مسر لگاتے لیکن میں بھی بغیر انہیں روانہ کئے اسکول نہ جاتا۔ چند ہی دنوں میں اسکول میں جو دل لگ گیا، تو بس روزانہ آکر مجھ سے اسکول ہی کا تذکرہ ہے۔ کبھی مِس باجی، کی تعریف ہو رہی ہے۔ کبھی اسکول کا سکھلایا ہوا گانا گا یا جا رہا ہے۔ اور کبھی قواعد ہو رہی ہے۔ قابلیت اتنی آگئی کہ اب مجھ ہی سے سوالات ہونے لگے ——— "اچھا بھائی جان! بتلاؤ تو دنیا کا سب سے بڑا دریا کون ہے؟" میں کہتا "بھائی میں نہیں جانتا"۔ دونوں زور سے قہقہہ لگا کر کہتے "اہاہا مسی سپی، مسسی سپی"۔ یہ دونوں یہ سمجھتے کہ ان کی مِس باجی سے زیادہ پڑھا لکھا آدمی دُنیا میں کوئی نہیں۔ میں بھی ہاں میں ہاں ملا دیتا میرا دل انہیں دونوں میں بہلتا۔ سدّو کی یہ عادت تھی کہ وہ اٹھلا اٹھلا کے چلتا اور تالیاں بجایا کرتا۔ اور مُنّا میں یہ خصوصیت تھی کہ وہ ہنستی بہت۔ ہر وقت کِھل کِھل، کِھل کِھل ہو رہی ہے۔ سدّو کو ہر بات میں تالی بجانا ضروری تھا۔ اور مُنّا کو بلا وجہ بات بات پر ہنسنا لازمی تھا۔ اگر مرغی کا بچّہ اپنی ماں کی پیٹھ پر بیٹھ جاتا، تو مُنّا کو ہنسی آتی، اگر کوئی ٹیڑھی ٹوپی پہن لیتا تو وہ ہنسی سے لوٹی جاتی، اگر کوئی تتلا کر بولتا تو جانو اُسے گدگدی لگ جاتی ——— بس ہر وقت کِھل کِھل۔ کِھل کِھل۔

(۲)

میرا مکان دریا کے کنارے تھا۔ مکان لق و دق تھا لیکن یہ بھی ان کے کھیلنے کے لئے کافی نہ تھا۔ یہ دونوں اکثر محلے کے بچوں کے ساتھ بغل کے میدان میں کھیلتے رہتے۔ میں اکثر اپنے کوٹھے کے برآمدے میں بیٹھا بیٹھا ان کا کھیل دیکھا کرتا۔ وہ کھیلتے کھیلتے کچھ دور بھی نکل جاتے۔ لیکن پھر بھی مُنّا کی ہنسی اور سدّو کی تالیاں بہت نمایاں رہتیں۔ میں اسی سے سمجھ لیتا کہ یہ دونوں شیطان کہاں ہیں۔ ان کے گانوں سے تو میرے کان بھر گئے۔ کبھی فلموں کے گانے، کبھی ریکارڈ کی نقل ——— لیکن کسی گیت کے دو تین مصرعوں سے زیادہ نہیں۔ ان کے اسکول میں بھی طرح طرح کے بچوں کے گانے ہوتے تھے۔ یہ سب بچوں کی نظمیں سدّو اور مُنّا کو زبانی یاد ہوتیں۔ اور کھیل ہو رہا ہے، اور ساتھ ساتھ گانا بھی ———

یہ سب گانے بڑی اچھی دھنوں میں ہوا کرتے اور پھر بچوں کی مہین سُریلی آواز۔ یہ باتیں میرے دل پر ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا کرتیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ میں ایک

نہایت پاک اور روحانی دُنیا میں آگیا ہوں، جہاں فرشتے مجھے گیت سُنا رہے ہیں۔ میرا گھر اور خاصکر میرا کمرہ ان معصوم نغموں سے گونجتا رہتا تھا اور پھر گانا ختم ہوا تو مُدّا کی کھِل کھِل اور سدّو کی تالیاں، رات کے مطالعے کے خیال سے میں انہیں اپنے ہی کمرے میں سُلاتا۔

(۳)

میں آئی۔ اے کے دوسرے سال میں تھا۔ مُدّا گیارہ برس کی ہوچکی تھی، اور سدّو نو برس کا۔ یہ دونوں بچے اب تقریباً میرے ہی ساتھ رہتے تھے۔ کھانا پینا بھی چھوٹے ابا کے یہاں سے علیحدہ کرلیا تھا۔ ایک نوکر تو تھا ہی، بچوں کی نگرانی کے لئے ایک دائی بھی رکھ لی۔ میں گیارہ سے چار بجے تک عموماً کالج میں ہوا کرتا۔ مُدّا آب گرلز اسکول میں بگھی گاڑی میں پڑھنے جایا کرتی، اور سدّو لڑکوں کے اسکول میں۔ ان دونوں کے معمولات میں کچھ زیادہ فرق نہ آیا تھا۔ مُدّا کے ہنسنے اور سدّو کی تالی میں بھی کوئی کمی نہ تھی۔ بلکہ اب تو مُدّا ہارمونیم بھی سیکھ رہی تھی۔ ہاں فرق صرف اتنا ہوا تھا کہ مُدّا کی طرح طرح کی فرمائشوں سے قافیہ تنگ تھا۔ اور سدّو کا سینما کا شوق روز افزوں ترقی پر تھا۔ عید کے دن مُدّا طرح طرح کے کپڑے پہن کر گویا "بٹیا" ہی بن جاتی۔ اسے دیکھ کر میں فخر اور خوشی سے پھُول جاتا ———— "میری بہن کیسی اچھی ہے ————" میں دل میں کہتا اور سدّو میاں تو سوٹ بوٹ بدل کر ایسے معلوم ہوتے کہ فرسٹ کلاس کے مسافر ہیں۔ کبھی ربڑ کے غبارے اڑائے جاتے، اور کبھی نقلی ہارمونیم بجایا جاتا ———— اور مجھ پر نظر پڑی اور بس "بھائی جان فلاں چیز دلوا دیجئے، فلاں چیز منگوا دیجئے" ———— یعنی بھائی جان کا زندگی میں سوائے اس کے اور کوئی کام ہی نہ رہ گیا تھا کہ وہ ان کی فرمائشیں پوری کرتے رہیں۔

ہماری اس چھوٹی سی زندگی میں بعض مسائل بھی آجاتے ہیں۔ میمونہ اب سیانی ہوگئی تھی، اس کی شادی کرنا ضروری تھا، جوان بیٹی کو کب تک گھر میں بٹھائے رکھتے۔ اسلئے مُدّا کی فرمائش ہوئی کہ میں اُس کا دولہا تلاش کروں۔ بڑا مشکل سوال تھا۔ آپ سمجھے یہ میمونہ کون تھی؟ ———— مُدّا کی چہیتی گڑیا۔ لیکن سدّو نے اس معاملے میں میری بڑی مدد کی۔ اُس نے یہ تجویز پیش کی کہ میمونہ کی شادی اُس کے کاٹھ کے خرگوش سے کردینی چاہیئے۔ ہار مان کر مُدّا بھی اس پر راضی ہوگئی آخر اس طرح بیچاری میمونہ کا انجام ہوا۔ غرضکہ ان دونوں سے میرا گھر کھِلا کھِلا جاتا۔

(۴)

برسات کا موسم تھا۔ ندی لبالب بھری ہوئی تھی۔ یہ وہی ندی تھی جس کی ریت پر کبھی میرا بچپن پڑا تھا۔ بالو پر ہم کبڈی کھیلا کرتے اور بالو کے چھوٹے چھوٹے محل بنایا کرتے، اور پھر کبھی ٹہلتے ٹہلتے دُور دیار کے کھیتوں میں نکل جایا کرتے۔ جب برسات کے موسم میں ندی اُمڈ آتی تو ہم اس میں نہانے جایا کرتے۔ موٹر کے ٹائر لیکر تیرتے، کشتی اور گھرنئی پر سیر کرتے۔ یہ ندی میرے لئے بڑی جاذبیت رکھتی تھی، اس سے میرا بچپن چمٹا ہوا تھا۔ میرا بچپن تو مُردہ ہوچکا تھا، لیکن ندی ابھی تک زندہ تھی۔ بائیس سال سے اس کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی بیچاری خشک ہوکر ریگستان ہوجاتی۔ کبھی اُمنڈ کر طوفان بن جاتی۔ غرضکہ اس کے دن بھی کبھی خوشحالی اور کبھی تنگی ترشی سے گذر رہے تھے۔

برسات میں ابا جان اور سب ہی بزرگوں کے بچوں کو سخت تاکید رہا کرتی کہ ندی میں نہانے نہ جایا کریں۔ لیکن کون مانتا ہے ———— موقع دیکھا اور نکل بھاگے گھاٹ پر۔

اتوار کا دن تھا۔ میں باہر سے تھکا ماندہ لوٹا۔ بائسکل گھر میں رکھی اور پکارا "دِلّو"، کوئی جواب نہ ملا۔ مُدّا اور سدّو بھی نہ تھے۔ لیکن سلائی کی مشین کھُلی ہوئی تھی، اور کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مُدّا ابھی یہاں سے کہیں گئی ہے۔ میں لپک کر چھوٹے ابا کے یہاں چلا گیا۔ مُدّا وہیں تھی۔ میں نے پوچھا "دِلّو کہاں گیا ہے" تو بولی کہ بازار گیا ہے۔ اور "سدّو؟"

"سدّو ابھی تک نہیں آیا"، مُدّا بولی

"وہ کہاں گیا ہے؟"

"مجھ سے تو کہا دریا نہانے جارہے ہیں" محمودہ بولی

دریا نہانے کا لفظ سُنکر میرے اعصاب جھن سے رہ گئے۔

میں بولا "اور تم نے منع بھی نہ کیا"

"منع تو کیا، لیکن مانتا کون ہے۔ لنگی لی اور یہ جا وہ جا"

"اُس وقت دِلّو کہاں تھا"

"وہ بازار گیا تھا"

(۵)

سدّو تین ہی بجے دریا نہانے گیا تھا، اور اب پانچ بج رہے تھے۔ دوڑا ہوا گھاٹ پر گیا۔ وہاں سناٹا تھا۔ کچھ لوگوں سے دریافت کیا کہ سدّو کو نہاتے دیکھا ہے۔ لیکن کچھ پتہ نہ ملا۔ آخر ایک پڑوسی کی

گوالن نے کہا کہ سدّو بابو کو میر صاحب کے لڑکے کے ساتھ نہاتے دیکھا تھا۔ میں بے تحاشا میر صاحب کے یہاں گیا۔ لطیف کو پکڑا اور اس سے پوچھا۔ اُس نے کہا "ہم پانچ لڑکے ایک ساتھ نہا رہے تھے۔ نہا دھو کر ہم سب گھر چلے آئے۔ لیکن یہ خیال نہیں آتا کہ معبد (سدّو) ہمارے ساتھ دریا سے آئے یا نہیں" بقیہ تینوں نے بھی یہی بیان دیا۔ بلکہ ایک نے تو قطعی طور پر کہہ دیا کہ سدّو ہم لوگوں کے ساتھ پانی سے نہیں نکلے۔ جوں جوں میں ان کے بیانات سنتا جاتا تھا، میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ شہر میں ہر طرف آدمی دوڑائے گھاٹ پر اور اس کے آس پاس ملاحوں سے جال ڈلوایا لیکن کہیں پتہ نہ ملا۔ اب اندھیرا ہوتا جاتا تھا ——— اور اس کے ساتھ ساتھ سدّو کی آس بھی ٹوٹتی جاتی تھی۔ مگر امید بھی بڑی سخت جان چیز ہوتی ہے۔ دس گیارہ بجے رات تک دل میں یہ خیال آتا رہا کہ شاید ٹہلتے پھرتے یا کسی کھیل تماشے کے پیچھے کہیں دور نکل گیا ہو۔ لیکن جب بارہ کا گھنٹا پڑا، تو مجھے یقین ہو گیا کہ پیارے سدّو نے ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اب محسوس ہوا کہ میرے سارے جسم سے کسی نے جان نکال لی۔ میں ایک پلنگ پر گر پڑا اور ایک چادر تان کر دراز ہو گیا۔ سارا گھر عورتوں اور مردوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مُدّا دھاڑیں مار کر رو رہی تھی، اُسے غش پر غش آ رہے تھے۔

یہ خبر نہیں کہ رات کیسے کٹی۔ ہاں جب جب ذرا غنودگی آ جاتی تو ابا جان کو دیکھتا کہ بال بکھرائے پریشان، آنگن سے دروازے تک جاتے ہیں اور پھر واپس آتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ میں کسی بچے کے پیر کا جوتا ہے۔ جوتے کو دیکھتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں "یہ کہاں گیا" صبح سے پھر تلاش جاری ہوئی، لیکن بے سود۔ سدّو کی قبر پانی کے نیچے کب کی بن چکی تھی۔ آخر شام کے اخبار میں ایک بچے کی لاش پائے جانے کی خبر بھی درج تھی۔ حُلیہ سدّو ہی کا تھا۔ اب شک اور شبہ کی کیا گنجائش رہ گئی تھی۔ اچھی طرح رو پیٹ لیا۔ دس برس کی کمائی چند منٹوں میں پانی میں مل گئی۔

(۶)

تین سے اب دو ہو گئے۔ سدّو کی جگہ ہر وقت خالی نظر آتی۔ لیکن میں مُدّا کے ڈر سے نہ روتا۔ وہ تو چھوٹی اماں اور بہنوں کے ساتھ رو دھو کے اپنے دل کا بھڑاس بھی نکال لیتی۔ لیکن اس ضبط کا اثر میرے دماغ پر بُری طرح پڑنے لگا۔ مُدّا بھی اکثر سست رہنے لگی۔ میں نے سوچا اگر یہی لیل و نہار رہے تو یہ ننھی سی جان گھبرا کر مر ہی جائیگی۔ سدّو اب واپس نہیں آ سکتے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ——— یہ سوچ کر اب میں نے اپنے پروگرام میں تبدیلی کی۔ دوست احباب سے ملنا جلنا شروع کیا، کلب بھی جانے لگا۔ اور گھر پر بھی دوستوں کو اکثر بلانے لگا۔ مُدّا بیچاری کو سینما سے کچھ زیادہ شوق نہ تھا۔ لیکن میں ہی اُس کا شیطان بنا، اُسے سینما کا چسکا دلایا۔ اُس کے کپڑے، لیس اور شوق کی چیزوں کے لئے بھی ہر مہینے ایک رقم نکالنے لگا۔

میرا مکان لبِ دریا ہے۔ سامنے پشتہ بندھا ہوا ہے۔ پشتے کے اوپر کوٹھا ہے، جس میں دو کمرے ہیں۔ دریا گویا اس کے نیچے ہی سے بہتا ہے۔ مُدّا و مُدّا کی دائی اور میں برابر اسی میں سوتے تھے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا اور دریا خشک ہو چکا تھا، ایک دن ہم تینوں چھت پر سوئے ہوئے تھے۔ کسی ضرورت سے میں اُٹھا۔ ضرورت سے فراغت کر کے پھر پلنگ پر چلا آیا۔ دیر تک نیند نہ آئی۔ چاندنی رات تھی۔ رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ میں اپنے دل کی دھڑکن بھی صاف سن رہا تھا۔ اُسی وقت ایک عجیب غریب آواز آئی۔

"ٹھک! ٹھک! ٹھک ———"

جیسے کوئی تالیاں بجا رہا ہو۔

میں پلنگ سے اُٹھ بیٹھا۔ پھر غور سے سننے لگا ———

"ٹھک! ٹھک! ٹھک! ———"

تالیوں کی آواز تھی اور بالکل اسی طرح، جس طرح سدّو بجایا کرتا تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ دور تک نظر دوڑائی۔ ریت پر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ دریا کا ایک مہین سوتا کوٹھے کے نیچے سے بہہ رہا تھا۔ نہ دریا میں کوئی دکھائی دیا اور نہ ریت پر۔ چاند کی روشنی میں جتنا منظر نظر آ سکتا تھا اتنی دور میں کوئی بھی نہ تھا ——— "پھر آخر یہ تالیاں کون بجا رہا تھا" میں نے سوچا ——— خوف و دہشت کی ایک لہر میرے دل تک دوڑ گئی۔ دل میں ایک کپکپی سی معلوم ہونے لگی۔ میں پھر پلنگ پر لیٹ گیا۔

"ٹھک! ٹھک! ٹھک! ———"

پھر آواز آئی۔ یہ تیسری بار آواز آئی تھی۔ میں سہما ہوا دم بخود لیٹا تھا۔ آواز آتی ہی رہی۔ یہاں تک کہ پانچ چھ منٹوں کے بعد یک لخت موقوف ہو گئی۔ میں نے اسی طرح دم بخود آنکھوں آنکھوں میں صبح کر دی۔

اب تو روزانہ رات کو یہ معمول سا ہو گیا کہ میں پلنگ پر گیا اور تالیوں کی آواز آنی شروع ...... ہوئی۔ اور تالیاں بالکل اُسی طرح جیسے

سدّو بجایا کرتا تھا۔ مصلحتاً مدّا کو اس کی خبر نہ کی اور اُسے چچی جان کے ہاں سونے کے لئے بھیجدیا کرتا اور اُس کی دالی کو بھی۔ ان کی جگہ ملازم کو اوپر سُلانے لگا۔ میں نے سوچا، یہ ممکن ہے میرا خیال ہو۔ میں نے چچا سے یہ حال کہا۔ وہ بھی کئی دن میرے کوٹھے پر آکر سوئے۔ پہلی رات جب میں نے اُنہیں یہ بتلایا تو انہوں نے کہدیا — "میں تو نہیں سُنتا، یہ تمہارا محض خیال ہے۔" — لیکن دوسری رات اُنہوں نے بھی یہ آواز صاف سُنی، اب شبہ کی کونسی گنجائش تھی ——————

سدّو کی روح تالیاں بجاتی ہے" مجھے یہ یقین ہوگیا۔

تالیاں سُنتے ایک سال گذر گیا۔ رات کیا آتی تھی ایک بھیانک عذاب بن کر آتی تھی۔ ایک دن کا واقعہ ہے جب شام کو میں کالج سے واپس آیا تو مدّا کو بُری طرح قے اور دست ہورہے تھے۔ معلوم ہوا کہ کسی سودے والے سے ہرے چنے کی گھنگنی لیکر کھائی تھی۔ شہر کے ایک حصّے میں کولرا پھیلا ہوا تھا۔ جلدی سے ڈاکٹر کو بلالیا۔ ڈاکٹر نے کہا — "کالرا ہوگیا ہے"

پیر تلے کی زمین کھسک گئی۔ صبح شام دونوں وقت ڈاکٹر کو لاکر دکھاتا تھا —————— تیسرے دن ڈاکٹر نے کہدیا۔ "بچنے کی کوئی امید نہیں"

مُدّا بھی مر گئیں۔ میں نے کہا "چلیئے قصّہ تمام ہوا۔" اُس رات بڑے بھیانک بھیانک خواب نظر آئے۔ اب وہ گھر مجھے کاٹے کھاتا تھا۔

میں چند مہینوں کے لئے پہاڑ پر چلا گیا۔ اور پھر کچھ چھوٹے شہروں کا چکّر لگاتا رہا۔ تقریباً ایک سال کے بعد اسی مکان میں آیا۔ پہلی ہی رات سے پھر وہی تالیوں کی آواز آنے لگی —— لیکن اب صرف تالیوں ہی کی آواز نہ تھی —— بلکہ اس کے ساتھ ہنسی بھی۔ بالکل اُسی طرح جیسے مدّا قہقہے لگایا کرتی تھی —————— "تالیاں" ۔ اور "کھل کھل،

کامریڈ

از جناب خواجہ عنایت اللہ صاحب گیاؔ

رجو کے باپ سے ایک بھول ہوئی تھی، جس کا خمیازہ وہ اپنی ضعیفی تک بھگتا رہا - اور صرف اسی ایک بھول نے اس کو چین سے مرنے بھی نہ دیا - اس کی بھول کوئی بہت بڑا اخلاقی گناہ نہ تھی، بلکہ ایک سماجی غلطی تھی - یعنی اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی پر برادری میں اپنی ناک اونچی رکھنے کے لئے اپنی زمین پر کچھ روپے آیندہ فصل کی امید پر قرض لے لئے تھے، اور چونکہ چار مہینے میں تو روپیہ ادا ہی کر دینا تھا اسلئے سود کی زیادتی کا بھی کوئی خیال نہ کیا - شادی تو خوب دھوم دھام سے ہوگئی، باجے بجے - آتشبازی چھوٹی، اور رجو کو ایک بہت خوبصورت بیوی بھی مل گئی، مگر نئی فصل کے پیدا ہونے کے پہلے ہی غلہ کا بھاؤ اتنا گر گیا کہ ہر کاشتکار کی آمدنی نصف سے بھی کم رہ گئی -

سرکاری مالگذاری وہی رہی - چوکیداری ٹیکس میں کوئی کمی نہ ہوئی اور گھر کا خرچ نئی نویلی بہو کے آجانے سے بہت بڑھ گیا - اور آمدنی کا صرف ایک ہی ذریعہ یعنی غلے کی بکری، وہ نصف ہوگئی - قرض تو کیا ادا ہوتا، سود کا بھی کچھ حصہ باقی ہی رہ گیا - غرض اسی طرح ہر سال فصل پکنے پر ہوتی تو توندوالا مہاجن کھلیان ہی میں پہنچ جایا کرتا، اور سب کچھ لیجانے پر بھی اپنا بقایا بڑھا کر دونوں باپ بیٹوں سے انگوٹھے کا نشان لگوا کر لیجاتا -

رجو کا وہ گھرانا جو اس کی شادی کے پہلے فراغت سے کھاتا پیتا تھا، بلکہ ضرورت کے وقت اپنے غریب ہمسایوں اور رشتہ داروں کی بھی گاہے بگاہے مدد کر دیا کرتا تھا - اب سخت تنگی سے گیہوں اور چاول کھا کر نہیں بلکہ ستو اور کھساری وغیرہ سے اپنی بسر اوقات کرنے لگا - رجو جوان تھا، اس کا باپ گرچہ بتقاضائے عمر اور خاص اس رنج سے بوڑھا ہو چکا تھا مگر پھر بھی محنت کرنے میں رات کو رات اور دن کو دن نہ سمجھتا مگر قرض کی رقم سود در سود سے بڑھتی ہی گئی - اور آخر اس غم نے بوڑھے کسان کی کمر توڑ دی - اور ایک دن موت کے فرشتے نے اس کو سود کے اس چکر سے نجات دلائی -

باپ کی موت نے نوجوان محنتی اور جفاکش رجو کو ظالم مہاجن کے ہاتھوں میں اکیلا چھوڑ دیا - اس نے مہاجن کو اپنی نصف یا اس سے بھی زیادہ زمین دیکر اس کا حساب میباق کر کے اپنا پیچھا چھڑانا چاہا، مگر مہاجن جو جونک کی طرح اس کا خون چوس رہا تھا اور پہلے ہی دن سے پوری جائداد پر دانت لگائے بیٹھا تھا اور اسی نیت سے وصولی میں بھی نرمی کیا کرتا تھا کب ماننے والا تھا - بلی کے بھاگوں چھیکا ٹوٹا - رجو کو تو اس نے گول مول جواب دیکر ٹال دیا اور اپنی رقم کی وصولی کے لئے قانونی چارہ جوئی شروع کر دی -

رجو کے پاس عدالت سے سمن آگیا، وہ مقررہ تاریخ پر بیس میل پیدل چلکر شہر پہونچا - لوگوں نے وکیل رکھ کر مقدمہ لڑنے کا مشورہ دیا، مگر رجو کے پاس فیس دینے یا پیشکار کو پیشی ادا کرنے کی ہمت کہاں تھی، کئی پیشیوں میں عدالت کے انصاف کی موہوم امید پر ٹھوکریں کھانے کے بعد آخر حشر وہی ہوا جو عدالتوں میں امیروں کے مقابلے میں غریبوں کا ہوا کرتا ہے، یعنی رجو پر پندرہ سو کی ڈگری ہوگئی، اور ڈگری کے چند ماہ بعد ہی رجو کے سب کھیت مع اس سال کی پیداوار کے مہاجن نے ہڑپ کر لئے -

رجو، اس کی بیوی رسولن اور تین ماہ کا ایک بچہ دنیا میں مفلس تو پہلے ہی تھے، اب بے سہارا ہوگئے - صرف دو تین دبلے پتلے رجو کی طرح بھوک کے مارے ہوئے بیل، ہل کھرپہ اور کدال وغیرہ ان کی زندگی کا سہارا باقی رہ گئے - مگر رجو نے مصیبت کے اس پہاڑ کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکے، اس کا بہادر دل مایوس نہ ہوا - وہ اپنی بیوی اور تین ماہ کے لخت جگر کی پرورش کے لئے ہر مشکل سے مشکل کام کرنے کو تیار ہوگیا - اور اسی مہاجن سے دو بگھہ زمین سالانہ مالگذاری مقرر کر کے جوتنے لگا - غریب رسولن نے بھی اپنے فرض کو پہچانا اور بچے کو گود میں لیکر اپنے محنتی شوہر کا ہاتھ بٹانے لگی، جیٹھ بیساکھ کی جھلسانے والی لو - ساون بھادوں کی موسلا دھار بارشیں، اور پوس ماگھ کی کپکپا دینے والی سرد ہوائیں ان بہادروں کی محنت اور مزدوری میں کوئی خلل نہ ڈال سکتیں، جب رجو کدال چلاتا ہوتا تو رسولن پانی باندھتی ہوئی نظر آتی - جب رجو ہل چلاتا ہوتا، رسولن بیلوں کے لئے چارہ کاٹتے

میں مشغول پائی جاتی - غرض دونوں میاں بیوی اپنا اور اپنے ننھے بچے کا پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کے لئے اپنا اپنا خون پسینہ ایک کر دیتے مگر سال کے آخر میں زمین کے مالک کو مالگذاری دینے کے بعد ان کے حصہ میں سوائے صبر کے اور کچھ نہ آتا۔ گھر کا اناج تو مالگذاری ادا کرنے کے لئے بک جاتا، اور دودھ گھی، ترکاری وغیرہ مالک کے علے نام نہاد قیمت دیکر چھین لے جاتے، اور اس طرح پسینہ بہا کر ساری چیزوں کو پیدا کرنے والے یہ غریب دنیا کی ہر نعمت سے محروم کے محروم ہی رہ جاتے -

تین سال اس طرح بھی کٹ گئے - اور شاید ساری عمر اسی طرح کٹ جاتی مگر اُن کے بوڑھے سُود خوار مالک کی موت نے اُس کے عیاش نوجوان بیٹے کو اُن کا مالک بنا دیا - اور ایک دن جب کہ وہ نوجوان مالک اپنے چند عیاش دوستوں کے ساتھ شکار کے بہانے اپنی زمینداری کا دورہ کر رہا تھا اُس کی نظروں نے ایک شب کے لئے رسولن کا انتخاب کر لیا، اور غریب مگر عصمت مآب رسولن کے انکار کا نتیجہ بہت جلد مالگذاری کے بقایا کی نالش میں نکلا - پہلے مقدمہ کی طرح اس کا بھی حشر مالک کے موافق اور رجو کے مخالف ہوا، کیونکہ عدالت کے انصاف . . . . . . کی قیمت ادا کرنا رجو کی استطاعت سے باہر تھا - اور رجو کا رہنے والا مکان بیل اور گائے وغیرہ اس ڈگری یا رسولن کی عصمت کی بھینٹ چڑھ گئے -

رجو اور اس کی بیوی اپنے تین سال کے بچے کو لیکر ایک لوٹا، ایک ٹوٹی ہوئی تھالی اور چار سیر ستو باندھ کر اپنے گاؤں اور ساتھیوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے شہر کو چل دیئے -

(۲)

شہر کے ایک گنجان محلہ میں ایک پتلی سی تین فٹ چوڑی گلی ہے، گلی کے دونوں طرف دو منزلہ اور سہ منزلہ عالیشان عمارتیں ہیں دونوں طرف کی عمارتوں کے پاخانے اسی گلی کے راستے صاف کئے جاتے ہیں، کسی مکان کا بھی صدر دروازہ اس گلی میں نہیں کھلتا - اور چونکہ کبھی کسی بڑے آدمی کو اس طرف آنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی، اسلئے اس گلی کی نالیوں پر جن میں غلاظت بہتی رہتی ہے اور طرح طرح کے گندے کیڑے رینگتے رہتے ہیں، میونسپلٹی کے جمعداروں اور چپراسیوں نے کبھی کوئی توجہ نہیں کی۔ قطب شمالی یا قطب جنوبی میں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات رہتی ہے - مگر اس گلی کی زمین نے سالہا سال سے سورج کی ایک شعاع بھی نہیں دیکھی اسی گلی میں ایک عالیشان محل کی سنڈاس کے نزدیک ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رجو اُس کی بیوی اور اُن کا تین برس کا بچہ اپنی زندگی کی سانسیں پوری کر رہے ہیں - رجو تو صبح سویرے ہی مزدوری کی غرض سے باہر نکل جاتا ہے سورج ڈوبنے کے بہت دیر بعد واپس لوٹتا اُس کو کیا معلوم کہ اُس صابر عورت اور بچے کا دن اُس آٹھ فٹ کی اندھیری چار دیواری میں کس طرح کٹتا ہے - وہ صرف اسی پر مطمئن ہے کہ اُس کے بازوؤں میں ابھی اتنی طاقت موجود ہے کہ وہ ہر روز کی سخت محنت کے بعد دونوں کے پیٹ بھرنے کا سامان بہم پہونچا سکتا ہے -

پرندوں کی طرح کھلی فضا میں رہنے والوں نے اس قبر نما تاریک کوٹھری میں گرمیوں کا زمانہ تو کاٹ ہی لیا، مگر جاڑے کی آمد نے اُن کا جینا محال کر دیا - دور اندیش رجو اور کفایت شعار رسولن نے گرمیوں کے زمانہ میں بہتیری کوششیں کیں کہ آنے والی سردی سے بچنے کے لئے کوئی کپڑا اپنانے کا سامان ہو سکے، مگر پانچ آنہ روز میں وہ بھی آٹھ دس ناغہ کے ساتھ کس طرح ممکن ہو سکتا تھا، اور جب کبھی رسولن نے جاڑے کے خوفناک خیال سے اپنا پیٹ کاٹ کر کچھ جمع بھی کیا تو گھر کی گندی فضا نے بچے کو بیمار کر دیا اور خیراتی ہسپتال کے ہوتے ہوئے بھی وہ اندوختہ ختم ہو گیا -

غرض قدرت کا اٹل قانون اپنے راستہ پر چلتا رہا، اور بدن کو جھلسا دینے والی گرم لُو کی بجائے رگوں میں پیوست ہو جانے والی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں، امیروں نے تہ خانے چھوڑ کر گرم حماموں کی آرائش کر لی، خس کی ٹٹیاں اور بجلی کے پنکھے اُتار کر الکٹرک آتشدان اور انگیٹھیاں سُلگا لیں - مسوری اور نینی تال کی سیر گاہوں سے واپس آ کر بند اور گرم کمروں میں تاش اور شطرنج کے شغلوں میں مشغول ہو گئے ململ اور تن زیب کے کپڑے اوتار کر مخملی گدوں اور ریشمی لحافوں میں مُنہ چھپا لئے، مگر غریب رجو اُس کی بیوی رسولن اور تین برس کا معصوم بچہ اُسی کوٹھری میں اپنے جسم کی قدرتی گرمی کو برقرار رکھنے کے لئے ایک دوسرے کے بدن سے مدد لیکر دن کاٹنے لگے - جاڑے کی ان لمبی راتوں کو جب کہ اُس شہر کے سیکڑوں امیروں کے کتے بھی سردی سے بچائے جا رہے ہیں، یہ تین نفوس نہیں بلکہ ایسے ہزاروں اشرف المخلوقات بھی پرانی سیکڑوں چھیدوں والی گندی گدڑیوں میں اپنے جسموں کو سکیڑے دن بھر کی محنت سے چور ہونے کے باوجود بھی نیند کو ترس رہے ہیں -

دن چھوٹے ہوگئے، اس لئے رجو اب پیٹ پالنے کے لئے کما بھی نہیں سکتا، آخر ایک روز ماں نے بچے کی بھوک اور سردی میں نیم برہنگی نہ برداشت کر کے خود بھی مزدوری کرنے کی ٹھان لی، غیور رجو بھی مجبور تھا، اُس نے اجازت دے دی اور چند روز کی تلاش میں رسولن کو ایک پولیس آفیسر کے گھر میں نوکری مل گئی۔ اب کچھ اطمینان سے کٹنے لگی۔ کیونکہ اپنا اور اپنے بچے کے لئے کھانا تو رسولن کو وہاں سے ہی مل جاتا اور جو پیسے رجو کماتا اُس میں ایک دو پیسے کے ستو کھا کر باقی سے کچھ کپڑے وغیرہ کا بھی سامان ہونے لگا۔

شاید دنیا میں غربت سے بڑھکر کوئی اور بڑا گناہ نہیں۔ ان لوگوں نے ابھی ٹھیک سے اطمینان کی سانس بھی نہ لی تھی کہ امارت کے حریص دیو نے ایک اور وار کیا۔ ان کی جائداد۔ صحت اور محنت کا پھل تو وہ پہلے ہی ہضم کر چکا تھا، اب ان کی غیرت، عصمت اور عزت کو تاکا۔

رسولن غربت کے باوجود بھی حسین تھی، اُس کو چند روز پیٹ بھر کھانا اور کھلی فضا میں رہنے کا موقع ملا تو اُس کا چہرہ پھر نکھر آیا۔ بس پھر کیا تھا امیر تو غریب کی ہر چیز پر اپنا جائز حق سمجھتا ہے، غریبوں کی دولت امیروں کے خزانے بڑھانے کے لئے۔ غریب کی محنت امیروں کے آرام کے لئے۔ حتیٰ کہ غریب کی عصمت امیروں کی عیاشی کے لئے وقف ہوتی ہے۔

رسولن جس کا سب کچھ امیروں کے ظلم پر بھینٹ چڑھ چکا تھا، غریب تو ضرور ہو چکی تھی مگر اُس نے بھی ایک شریف کسان کے گھر جنم لیا تھا۔ اُس کی رگوں میں بھی مالک کی بہو بیٹوں کی طرح شرافت کا خون موجزن تھا، اُس کو معلوم تھا کہ گئی ہوئی سب چیزیں واپس آسکتی ہیں، اور اگر نہیں واپس آسکتی تو عصمت۔ یہی وہ شیشہ ہے جس پر بال آنے سے عورت اپنی نسوانیت کھو دیتی ہے۔ اسلئے اُس نے اپنے نئے مالک کی اس خواہش کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ نوکری چھوڑ دی۔ امیر اور وہ بھی پولیس افسر اپنی خواہش کا خون ہوتا دیکھے اور وہ بھی ایک غریب کے ہاتھوں پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اُس کا بہادر خون کھولنے نہ لگے، اس کے اقتدار کو ٹھیس نہ لگے اور اُس کے انتقام کی آگ اپنے حریف کو جلا نہ دے۔

شہر میں چوری کی ایک واردات ہوئی، اور رجو گرفتار ہوگیا۔

دیوانی عدالتوں کے انصاف کا تو اُس کو کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ مگر اس مرتبہ فوجداری عدالت بھی اُس کے لئے کچھ نہ کر سکی۔ اور کرتی بھی تو کیونکر، نہ رجو کے پاس وکیل، نہ کوئی صفائی کا گواہ۔ استغاثہ کی طرف سے اُس کے خلاف مضبوط شہادتیں۔ چال چلن مشکوک، اور سب سے بڑی بات غربت اور بیکاری، چوری کرنے کے کافی وجوہ۔ رجو کو چھ ماہ کی سزا ہوگئی۔

فیصلے کے دن اپنے بچے کو لیکر رسولن عدالت کے دروازہ پر کھڑی قسمت کو رو رہی تھی۔ رجو نے پولیس کی حراست میں اُس کے پاس سے گذرتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا اور اپنے بچے کو پیار کرنے کے لئے ایک لمحہ رکنا چاہا۔ مگر دنیاوی قانون کے محافظوں نے قانون محبت کو ایک ٹھوکر سے توڑ دیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور اپنے ناسمجھ معصوم بچے کو اپنی طرف محبت کے ہاتھ پھیلائے ہوئے بڑھتا دیکھ کر بھی آگے بڑھنے پر مجبور ہوگیا۔ ناسمجھ بچہ رونے لگا۔ روتی ہوئی ماں نے اُس کو چھاتی سے لگا لیا۔ دیکھنے والوں کو بھی ترس آگیا۔ باپ کے قدم رک گئے۔ مگر سپاہیوں کے دلوں کو جنبش نہ ہوئی۔ اور ہوتی بھی تو کیسے ہوتی جبکہ اس غریب قیدی کے اور اُس کی بیوی کے نہ تو کپڑے سفید تھے، اور نہ ہی اُن کی جیبیں بھاری تھیں۔ رسولن کو یقین تھا کہ رجو بے گناہ ہے۔ اُس نے چوری نہیں کی اور وہ بھوک سے مرجانے پر بھی چوری نہیں کر سکتا، اس لئے وہ خوش تھی۔ اس نے اپنی عصمت کو بچانے کے لئے پہلے اپنا گھر قربان کیا تھا۔ اب اپنے شوہر کی زندگی کا ایک چھوٹا سا حصہ قربان کر رہی تھی۔

رسولن اپنے بچے کو چھاتی سے لگائے گھر واپس آئی۔ اُس نے کمر ہمت باندھ کر آسمان کی ہر گردش کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ وہ کئی دن تک دربدر ماری پھری۔ مگر کہیں نوکری نہ پا سکی۔ جہاں جاتی ایک چور کی بیوی اور داروغہ صاحب کی چوٹی دائی کہہ کر دھتکار دی جاتی۔ اُس نے مکان بنانے والے مزدوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہا مگر بچے والی عورت ہونے کی وجہ سے وہاں بھی اُس کو ناکامی کا منہہ دیکھنا پڑا۔ اس بیکاری اور بھوک کی مصیبت پر ایک اور ستم ٹوٹ پڑا یعنی غذا کی کمی اور ناکافی کپڑے ہونے کیوجہ سے اُس کا لڑکا بیمار ہوگیا۔ گھنٹوں خیراتی ہسپتال کے دروازہ پر بیٹھے رہنے کے بعد اُس کو دوائی تو ملتی مگر ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہ ملتا۔ موسم سرما کا شباب، علاج کی بے پرواہی۔ خوراک کی کمی، اور ٹھنڈا مکان، نتیجہ یہ نکلا کہ بچے کو نمونیا

ہو گیا - اور حالت روز بروز خراب ہونے لگی۔ سرکاری ہسپتال کے عملے کی سرد مہری نے ماں کی مامتا کو دوسرے ڈاکٹروں کی طرف متوجہ کرنے پر مجبور کیا - مگر اس دروازہ کو کھولنے کے لئے تو زر کی کنجی چاہیئے - ڈاکٹر کی فیس، دوائی کی قیمت، اینٹی فلو جسٹین (ــــــــ -) کے ڈبے بچاری رسولن کہاں سے لاتی - ایک ماں کا اکلوتا بیٹا، اس کی امیدوں کا سہارا آنکھوں کا نور اور دل کی ٹھنڈک نمونیہ جیسے مہلک مرض میں اپنی آخری سانس گن رہا ہے۔ ماں کی مامتا اپنے خون کا آخری قطرہ دیکر بھی اس کی جان بچانے کو تیار ہے، مگر مفلسی اور غربت اس کے کسی ارادہ کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچنے دیتی - چاروں طرف سے مایوس ہو کر اس نے شہر کے قومی اداروں کا دروازہ کھٹکھٹایا - لیڈروں کے سامنے اپنا دکھڑا رویا - مولویوں اور پیروں کی خوشامدیں کیں، مگر ان قوم کے درد سے گھل گھل کر مرنے والوں اور جنت دوزخ کے اجارہ داروں کے کان پر جوں تک نہ رینگی - مایوسی میں روشنی کی ایک کرن اسے نظر آئی - تقریباً ایک ماہ اس نے ایک پولیس افسر کے گھر نوکری کی تھی، جس کی شیطانی خواہش کے خوف سے پھر وہ کبھی اس کے گھر اپنی تنخواہ بھی مانگنے نہ گئی تھی، آج وہ اپنے بیٹے کے لئے سب کچھ بھول گئی - اور اس نیت سے اس کے گھر پہنچی کہ اپنی تنخواہ کا بقایا قریباً دو روپیہ مانگ کر اپنے بچے کا علاج کرے - اس کو دیکھتے ہی پولیس افسر فاتحانہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا

"کہو رسولن آج کدھر راستہ بھول گئیں"۔

رسولن (آنکھوں میں آنسو بھر کر) "سرکار میرا بچہ سخت بیمار ہے۔ اس کا باپ جیل میں ہے - میرے پاس علاج کے لئے ایک پیسہ نہیں - میں آپ سے اپنی تنخواہ نہیں بلکہ بھیک مانگنے آئی ہوں - خدا کے واسطے میری میرے بچے کی جان بچانے میں مدد فرمائیے۔ مجھ پر نہیں تو اس معصوم بچے پر رحم کیجیے"۔

پولیس افسر "تو پاگل ہے - یہ سب مصیبتیں تیری اپنی بلائی ہوئی ہیں - ورنہ آج تو اس طرح در بدر کی ٹھوکریں نہ کھاتی ہوتی - اور اب بھی کچھ نہیں بگڑا - دن کا بھولا شام کو گھر واپس آ گیا ہے - اؤ یہ اسی طرح رہو - بہت سے ڈاکٹر ہمارے دوست ہیں - تمہارا لڑکا بہت جلد اچھا ہو جائے گا - مگر ...." اس نے شیطانی جذبے سے مغلوب ہو کر رسولن کا ہاتھ پکڑ لیا -

عصمت کے خیال اور ماں کی مامتا میں جنگ ہونے لگی -

شیطان نے ملک الموت کی شکل میں اس کے لخت جگر کی جان کا لینے کا بھیانک تصور آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دیا - شدت مرض سے کراہتے اور بھوک سے بلبلاتے ہوئے بیٹے کی تصویر مدد کے لئے روتی ہوئی سامنے آ گئی - نیکی کے فرشتے نے شوہر کی امانت اور بزرگوں کی عزت کا دھیان دلوایا - مگر آہ غریب عورت کی مامتا کے چرنوں پر اس کی عصمت بھی بھینٹ چڑھا دی گئی، اور اپنی نسوانیت کی قیمت لیکر اپنے بچے کو موت کے پنجے سے چھڑانے دوڑی -

مرض آخری درجہ پر پہنچ چکا تھا - مرض موت میں اسکی ماں کی عصمت کے آبدار موتی بھی اس کو حل کر کے پلائے گئے - مگر ماں کی سب سے بڑی قربانی بھی بیٹا کو زندہ نہ رکھ سکی - غریب رسولن شاید ابھی اور ظلم سہنے کی ہمت کرتی - مگر آہ اپنی نسوانیت کے جوہر کو کھو دینے کے بعد رحمو کو وہ کیسے منہ دکھا سکتی - اس کا جواب اس کے بس میں نہ تھا - دوسرے دن اس گلی میں دونوں ماں بیٹے کے لاشے گور و کفن کو محتاج پڑے سڑ رہے تھے - راہ کے چلنے والوں نے تھانہ میں اطلاع دی - اور پولیس کا سب انسپکٹر اپنے قتیل ہوس کی میت پر واقعہ کی تحقیقات اور مجرم کی تلاش میں اس گلی میں آیا -

(۳)

چھ ماہ کے بعد رحمو جیل سے چھوٹ کر آ گیا - وہ جیل میں بہت کچھ بدل چکا تھا - اتفاق سے اس کو جیل میں چند سیاسی قیدیوں کی صحبت ملی اور اس کی آنکھیں کھل گئیں - گھر آ کر جب اس نے بچے کی موت اور رسولن کی خودکشی کے پردرد واقعات سنے تو اس کا سرمایہ داری کے خلاف وہ جذبہ جس کا بیج اس کے دل میں پڑ چکا تھا، اور جس کی پرورش اس کی اپنی زندگی کے واقعات کر رہے تھے، بیدار ہو گیا - اب کسی کی پرورش کی فکر اسے باقی نہیں رہی تھی - وہ اپنی دولت - بیوی، بچہ اور عزت سب کچھ کھو چکا تھا - اب اس نے سرمایہ داری کے خلاف جنگ کرتے ہوئے اپنی جان بھی قربان کر دینے کی قسم کھا لی - وہ عوام میں انقلاب پیدا کر کے اپنا اور اپنے جیسے ہزاروں مظلوموں کا انتقام لینے پر تل گیا - اور آجکل دنیا و مافیہا سے بے خبر اسی دھن میں مگن رہتا ہے - کئی دفعہ پولیس کے ڈنڈے کھا چکا ہے - اور جیل کو تو اپنا گھر سمجھتا ہے - اب وہ کامریڈ رحمو ہے اور ہزاروں ہزار کسان اور مزدور اس کے ادنیٰ اشارہ پر اپنی جان چھڑکنے کے لئے تیار ہیں -

وطن کی قربانی

(ایک ترکی شاہکار افسانہ کی ایک جھلک)

از جناب جی - آر - قیس صاحب شیخوپوری

سلمی پیاری اگر میں مر جاؤں تو تم کیا کرو گی ———— ؟

سلمی جو تخیل کی دنیا میں بیٹھی ہوئی اپنی زندگی کی سنہری ساعتوں کو کچھ اور سنہری کر رہی تھی - اس اچانک سوال سے گھبرا گئی - مخمور آنکھیں اُداس ہو گئیں - شگفتہ چہرہ پر افسردگی کے آثار پیدا ہو گئے - گلابی ہونٹوں پر جو تبسم کھیل رہا تھا ماند پڑ گیا، اور ایک شکستہ پر کبوتر کی طرح دھیمی آواز میں بولی ———— !

اُونہہ ———— ! بس تمہیں ایسی ہی دل لگی سوجھتی ہے - یہ دل لگی مجھے اچھی نہیں لگتی - تمہاری ان باتوں سے میرے دل کو دکھ پہونچتا ہے - خدا نہ کرے تم مرنے لگو - پہلے میں مر جاؤں پھر تم - عورت کا پہلے مر جانا اچھا ہوتا ہے، وہ ہر آفت، مصیبت دکھ، ستم، سے محفوظ رہتی ہے - خدا نہ کرے کسی عورت کو یہ منحوس دن دیکھنا نصیب ہو -

سلمی کی رسیلی آنکھوں میں آنسوؤں کی بوندیں چھلکنے لگیں - کمال نے سلمی کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے محبت سے کہا :-

پیاری ———— تم اتنی سی بات پر رونے لگیں - میں تو یونہی ہنسی کر رہا تھا - تم جانتی ہو کہ میں ایک سپاہی ہوں، اور سپاہی کی زندگی ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے - اس کی جان دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے - میں ایک سپاہی ہوں میری زندگی کا کیا بھروسہ - میری زندگی تلواروں، اور تیروں کی چھاؤں میں کٹتی ہے - ابھی ہنس بول رہا ہوں - تھوڑی دیر کے بعد کچھ بھی نہیں !

سچ ہے پیارے ———— ! میں موت سے نہیں ڈرتی ہوں - اور نہ مرنے سے - میں بھی ایک سپہ سالار کی بیٹی ہوں میری رگوں میں بھی وہی خون اور وہی جوش ہے جو تمہارے جسم میں ہے - جس وقت میدان عمل میں جاؤں، بھوکی شیرنی کی طرح جھپٹ پڑوں - لڑ کر بہادروں کی طرح جان دے دوں، پیچھے ہٹ کر بزدلوں کی طرح کبھی نہ بھاگوں - لڑائی میرا ایمان ہے، تلوار اور تیر میری جوانی کے خوشنما زیور ہیں -

سلمی ! تم رنگین تتلی ہو، حسین پھول ہو، اور خوبصورت - تم میری زندگی ہو - تمہاری ہر ادا میں ایک سحر ہے - ہر تبسم میں پہلی صبح کی بہار ہے - تم راحت ہو، چین ہو - کمال بہت دیر تک اس قسم کی محبت آمیز باتیں کرتا رہا - جس سے سلمی کے دل کو بہت کچھ تسکین ہوئی - اور اس کی بیقرار روح جو پژمردہ ہو گئی تھی پھر بشاش ہو گئی - سلمی کی باہیں، کمال کی گردن میں حائل ہو گئیں - اور وہ دونوں محبت کی دنیا میں ڈوب گئے ————

وہ مسرت کا دریا جو ہر وقت سلمی کے دل میں لہریں مارا کرتا تھا سوکھ گیا - اُس کے دل کا چراغ اس طرح دفعتاً بجھ گیا، جیسے جگنو جگمگا کر اپنے پروں کو سمیٹ لیتا ہے - اور اُس کی روشنی غائب ہو جاتی ہے - وہ بار بار کمال سے منت اور التجا کر رہی تھی -

پیارے ! آج تمہارے سُندر چہرہ پر افسردگی اور غمگینی کی گھٹا کیوں چھائی ہے ؟ تمہاری موہنی صورت - اور کامنی رنگت میں یہ اُداسی کیسی ؟ تمہارا رعب دار چہرہ بہت نڈھال معلوم ہو رہا ہے آج تم مجھ سے ہنستے بولتے نہیں - کیوں ———— ؟ پیارے مجھ سے محبت نہیں ہے ؟ تمہارا یہ حال دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں جاتا -

"میری اچھی سلمی ! کچھ نہیں ہے - یہ تمہارا محض وہم ہے"

نہیں پیارے، تم چھپا رہے ہو - غم کا رنگ کبھی چھپائے نہیں چھپتا یہ تمہاری آنکھیں نمناک کیوں ہیں ؟ دیکھو آواز بھی بھاری ہوتی جاتی ہے - مجھ سے اپنے دل کا راز نہ چھپاؤ - جلدی سے کہدو - میں تمہاری شریک زندگی ہوں - پیارے جلد بولو - میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے - میرے دل کی پریشانی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی ہے -

سلمی میری پریشانی اور افسردگی کو سنکر کیا کرو گی - گھبرا جاؤ گی - تمہارا ننھا سا نازک دل ٹوٹ جائے گا - کانپ اٹھو گی - مجھے میرے حال پر چھوڑ دو - مگر ہاں یہ میری پریشانی تمہارے کسی آنیوالے

وقت کا دینا بہت ضروری ہے۔

پیارے ———— میں نہیں سمجھی۔ اب زیادہ نہ ستاؤ اور اپنی پریشانی کا حال کہہ دو۔

سلمےٰ کی پریشانی دیکھ کر کمال نے سلمیٰ کو گلے سے لگالیا اور پھر نہایت غمگین آواز میں کہا:۔

سلمیٰ! کیا تم نہیں دیکھ رہی ہو کہ آج وطن کی سرزمین پر کس قدر ظلم وستم ہو رہا ہے۔ صفحۂ تخلیق سے بے گناہوں کو قتل کرکے اُن کے گھروں میں آگ لگائی جارہی ہے۔ ننھے معصوم بچوں کو ماں کی گود سے چھین کر تہ تیغ کیا جارہا ہے۔ حق وصداقت کی صدا بلند کرنے والوں کی گردن پر خنجر چلائے جاتے ہیں۔ ہمارے بھائیوں پر جبکہ یہ ظلم ڈھایا جارہا ہے تو ہم یہ دیکھ کر کس طرح بیٹھ سکتے ہیں۔ میری رگوں میں بھی اسلامی خون ہے۔ اور یہ تلوار جس کو تم دیکھ رہی ہو۔ اور جسے میں مقدس سمجھتا ہوں۔ جنت اسی کے سایہ کے نیچے ہے۔ جب تک میں باغیوں کا قلع قمع نہ کردوں مجھ پر دنیا کی تمام چیزیں حرام ہیں۔ اسلئے آج میں نے مظلوموں کی حمایت کی خاطر دنیا کی ہر راحت کو خیرباد کہدیا ہے۔ میں تمھیں یہیں چھوڑ کر میدان جنگ کو جارہا ہوں۔ شاید اس معرکہ سے پھر زندہ نہ آسکوں۔ اسلئے میں تمہارے پاس صرف اس لئے آیا تھا کہ تم مجھے میری خاطر نہیں، بلکہ ———— ملک کی خاطر قربان کردو۔ اور شوق سے چلے جانے کی اجازت دیدو بس اب صرف تمہاری اجازت کی دیر ہے۔

سلمیٰ بالکل سرد ہوگئی، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو وہ کچھ جواب نہ دے سکی۔ زبان بند، لب خاموش، اور آنسوؤں کا چشمہ اُبلنے لگا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ کمال نے پھر بڑے پیار کے ساتھ آخری لہجے میں کہا

"کیا سوچ رہی ہو، اب کچھ نہ سوچو۔ تم نہیں جانتیں کہ نافرمان باغیوں نے یلغار بول دیا ہے۔ جنگ کے وقت بیوی اور بچوں کا خیال جائز نہیں۔ ملک کے امن کی خاطر زندگی کی ہر بیش بہا شئے قربان کردینی چاہیئے۔ مسلمان بہادری، دلیری۔ اور جنگی قوتوں کے سامنے ملک کے غداروں کا سر جھکانے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ جھکنے کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ مجھے بھی شورماؤں اور بہادروں کی طرح میدان جنگ میں جاکر اپنی شجاعت اور مردانگی کے جوہر دکھانے چاہئیں۔

مظلوموں کی مدد کے موقع پر اپنی ہر خواہش کو عزت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دینا چاہیئے۔ تاکہ مرنے کے بعد لوگوں کی زبان پر ہمارا نام نیکی سے لیا جائے۔ چرواہے بھی ہمارے نام کے گیت گائیں۔ مغنی اپنے دھرپدمیں ہمارے نام کی نغمہ سرائی کریں۔ اور محفلِ نشاط میں ہماری بہادری کے نغمے سنا کر سامعین کو بیخود بنائیں۔ مظلوموں کی محبت میں اپنے کو حوالہ قضا کرنا ایک جنگجو سپاہی کے لئے مایۂ فخر و اعزاز ہے۔

پیاری میری محبت کو ٹھکرادو۔ لیکن اپنے فرض کو نہ ٹھکراؤ ورنہ قیامت کے روز ہم دونوں جوابدہ ہوں گے۔

"آج خدا کے سامنے میرا فرض وطن پر جان دینا ہے۔ اور تمہارا فرض مجھے مرنے کی اجازت دینا ہے۔ میں اپنے فرض کیلئے تیار ہوچکا۔ اب تم ———— اپنے فرض کے لئے تیار ہوجاؤ۔"

سلمیٰ غم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ یہ سُن کر معاً اس کا کُندن سا چہرہ خوشی سے جگمگا اُٹھا اور وہ بولی:

"پیارے! جاؤ .... خداحافظ! میں بھی تمہیں اجازت دیتی ہوں۔ جاؤ اور کامیاب واپس آؤ!!

"بہ سلامت روی و باز آئی"

کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ واپس آنا مشکل تھا۔ سلمیٰ نے اجازت دینے کو دے دی، لیکن اُس کی نظروں میں ساری دنیا سیاہ خون میں ڈوبی ہوئی، اور گھنونی نظر آنے لگی۔ سینہ بیتاب اور روح میں ہیجان پیدا ہوگیا۔

میدان جنگ کی خونی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگی۔ تلوار کی جھنکار، اور بجلی کی چمک قتل، غارت، لوٹ مار، غیظ وغضب کے زور، شعلہ، طوفان، آندھی، پھر ایک دم تیرہ وتاریک ————!

سلمیٰ چونک کر اُٹھی۔ مگر صرف چونک کر رہ گئی۔ وہ اپنی بڑھتی ہوئی محبت کا خون کرکے شوہر کو وطن پر قربان کردینا اچھا سمجھی۔

کمال نے سلمیٰ کو آخری پیار کیا۔ گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اور تکبیر پڑھتے ہوئے میدان جنگ کو چلا گیا۔

(۳)

ہر کھلنے والا پھول خاموشی کے ساتھ دنیائے احساس پر قیامتیں توڑ رہا تھا۔ شام کا سناٹا تھا۔ سورج کی کرنیں زرد پڑ چکی تھیں۔ ہوا موت کی طرح سرد تھی۔ سلمےٰ اپنے کوٹھے پر کسی گہرے خیال میں

جنّات

از جناب کامریڈ خیر النسا، بیگم

(۱)

شام ہوتی اور میں کہتی

" دادی جان کوئی کہانی سُناؤ "

بچپن کا زمانہ تھا - قصہ کہانیوں میں بڑا جی لگتا تھا - اور دادی جان بھی گویا اس کے لئے تیار ہی رہتی تھیں، بس اشارہ پاتے ہی وہ شروع ہو جاتیں، اور جن بھوت کے لچھے دار قصے لے بیٹھتیں، یہاں تک کہ رات آجاتی - ایسا معلوم ہوتا کہ گھر کے ایک ایک دروازے سے بھوت نکلے چلے آرہے ہیں - میں سہم سہم کر دادی جان کے قریب ہوتی جاتی ــــــ یہاں تک کہ آنکھیں بند کر کے انکے کلیجے میں چپک جاتی - اور اسی حالت میں نیند آجاتی - سوتے میں بھی سفید سفید کپڑا پہنے بڑی بڑی داڑھی والے جن نظر آتے -

۱۸ - ۱۹ - سال کی میری عمر ہوئی، لیکن میں نے اب تک اپنی آنکھوں سے جنات کی شکل نہ دیکھی - ہاں قصہ کہانیوں میں البتہ سُنا - لیکن اَبّا جان، اور چچا میاں کو اب بھی " جن " کے متعلق اسی طرح گفتگو کرتے سُنتی ہوں - جیسے " جن " کوئی ٹھوس حقیقت ہو -

دوسری طرف میرے کالج کی مسٹریس یہ کہتی ہیں - کہ جن بھوت وغیرہ کوئی چیز نہیں - یہ سب اپنے خیالات اور وہم کی پیداوار ہے، میں نے جو کتابیں پڑھیں، ان میں بھی کہیں یہ لکھا نہ پایا کہ واقعی جنات کوئی حقیقت رکھتے ہیں - نام تو بہت سُنا - لیکن میں نے بھی اپنی زندگی میں " جن " کو کبھی نہیں دیکھا - کسی چیز کو بغیر دیکھے مان لینا کس قدر حماقت ہے - انسان خدا کو بغیر دیکھے مان لیتا ہے تو کیا وہ ہر چیز کو بغیر دیکھے تسلیم کر لے[۱] -

دُور کیوں جاؤں میرے محلّے ہی میں کسی ایک صاحب کے بالاخانے پر جنات رہتا ہے، ایک دوسری بی بی کی آنگن میں نیم کا پیڑ ہے، اُس پر رہتا ہے - کسی کے پاخانے میں رہتا ہے، اور کسی کے کھنڈر میں، لیکن جب ان بیچاروں سے پوچھو کہ کیا تم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے تو جواب ندارد - اسی لئے مجھے لوگوں وہابی، نیچری، دہریہ، لامذہب اور نہ جانے کیا کیا مشہور کر رکھا ہے

گرمیوں کا زمانہ تھا میں اپنے میکے میں تھی - سُنا کہ پڑوس میں شیخپورہ کی رابعہ بیگم آئی ہوئی ہیں - یہ رابعہ بیگم کون تھیں میری دل سے پیاری فاطمہ کی والدہ - فاطمہ اور میں برسوں اسکول میں ساتھ پڑھی - لیکن انٹرنس میں آکر اُس نے پڑھنا ترک کر دیا، کیونکہ اُس کی شادی ہو گئی - میں نے تعلیم جاری رکھی اور کالج میں چلی گئی - ہاں تو میں نے اُن کے آنے کی خبر سُنی تو جھٹ دوسرے دن انہیں چائے پینے کے لئے اپنے ہاں بلا لیا - ناشتے کا سامان آنگن ہی میں کیا گیا - محلّے ٹولے کی چند اور بیبیاں بھی آئی تھیں - سب آنگن میں بیٹھی خوش گپی کر رہی تھیں - رات آچکی تھی، رات اُجیالی تھی، سب آنگن ہی میں بیٹھی رہیں میں نے بیگم صاحبہ سے پُوچھا -

" فاطمہ کے کتنے بچے ہیں ؟ "

میرے مُنہ سے یہ بات نکلنی تھی کہ وہ یک بہ یک خاموش ہو گئیں ٹھنڈی آہیں بھرنے لگیں آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں -

" بیٹی ! فاطمہ کی قسمت میں اولاد کہاں ؟ بچے تو تین ہوئے، لیکن دو چار دنوں سے زیادہ جینا انہیں نصیب نہ ہوا، فاطمہ پر جن کا سایہ ہے - بس بچہ ہوا اور جن نے اُسے گود سے چھین کر گور میں ڈال دیا - تین بچے اسی طرح خدا کے گھر جا چکے - "

میں یہ سُن کر اُن کا مُنہ تکنے لگی " جنات - جنات آکر گود سے بچہ چھین لیتا ہے - یہ میں کیا سُن رہی ہوں " مجھے یقین نہ آیا - میں نے اُن سے تین مرتبہ یہی سوال کیا، اور انہوں نے بھی یہی جواب دیا - میں اسی سوچ میں پڑی ہوئی تھی کہ لوگوں نے اسے دوسرا پہلو دیدیا وہ سب لگیں مجھ پر مُنہ آنے - مجھ پر طرح طرح کے آوازے کسے جانے لگے - میرے مخالفوں کو موقع مل گیا - میں اس کا کیا جواب دے سکتی تھی - چُپ چاپ بیٹھی رہی لیکن میرے دل میں یہ خواہش ضرور ہو رہی تھی کہ اب یہ مجلس برخاست ہو جائے تو اچھا ہے ــــ میں تنہائی میں کچھ سوچنا چاہتی تھی -

کچھ دیر کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھر چلی گئیں - میں رات کو

[۱] ندیم - ان اس چیز کی حقیقت تو بغیر دیکھے ہی تسلیم کرنی پڑے گی جس کو بن دیکھے خدا نے بن دیکھے ہی مان لینے کو ہدایت کر دی ہے - البتہ اس کی حرکتوں اور کرتوتوں کو بغیر

دیر تک اس واقعہ کو سوچتی رہی۔ دوسرے دن بیگم صاحبہ کو پھر اپنے گھر لائی کوٹھے پر جاکر تنہائی میں ان سے پھر اس واقعے کو چھیڑا۔ انہوں نے تفصیل سے سارا قصہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا :۔

"میرے خاندان میں آج تک کسی پر جن یا بھوت کا سایہ نہ ہوا۔ عاصمہ پر بھی بچپن سے لیکر شادی تک ایسا کوئی اثر نہ پایا گیا۔ شادی کے بعد عاصمہ زیادہ تر سسرال میں رہی۔ اُن لوگوں کا بھی بیان ہے کہ عاصمہ کے بول چال، حرکات و سکنات میں کوئی غیر معمولی بات نہ پائی گئی۔ جب عاصمہ کو ولادت ہونے والی تھی تو وہ شیخپورے چلی آئیں۔ بہت خوبصورت بیٹا پیدا ہوا۔ دن بھر بچہ اچھا بھلا رہا۔ رات آئی تو سب لوگ سو گئے رات کے وقت دو بجے کا عمل ہوگا کہ آنگن میں ایک زور دار چیخ کی آواز آئی۔ پھر رونے کی۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ کوئی چیز دھماکے سے کنوئیں میں گری۔ ہم سب لوگ دوڑ پڑے عاصمہ کو پکڑ کر کوٹھری میں لائے۔ وہ بیہوش تھی۔ جب ہوش و حواس بجا ہوئے تو کہا——

"ایک بہت لانبا سفید داڑھی والا آدمی آیا اور میری گود سے بچے کو چھین لیا، وہ بچہ کو گود میں لیکر آنگن کی طرف آیا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا لیکن میں جیسی ہی اس کے قریب پہنچی اُس نے بچے کو کنوئیں میں ڈالدیا......"

کنوئیں میں آدمی اتارا گیا، لیکن لڑکا تو مرچکا تھا۔

اتنا کہنے کے بعد انہوں نے آنکھوں سے آنسو پونچھے، چند منٹ کے بعد پھر کہنے لگیں :۔

"دوسری مرتبہ جب ولادت ہونے والی تھی، تو اُن کے سسرال والوں نے عاصمہ کو میرے یہاں نہ بھیجا۔ میں نے سوچا کہ بچہ بچ جائے تو غنیمت بات ہے، اس لئے زیادہ اصرار نہ کیا۔ لیکن یہ خبیث کب کسی کا پیچھا چھوڑنے والے ہیں۔ اس مرتبہ عاصمہ کو جاپان بچیاں ہوئیں۔ مجھے تو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ لیکن سُنا کہ بہت خوبصورت تھیں عاصمہ کے سسرال والوں نے بڑی حفاظت کی، لیکن ایک بچی چوتھے دن، اور دوسری بچی ساتویں دن آنگن کے کنوئیں میں مری ہوئی ملی۔

میں نے بیگم صاحبہ سے جرح کے طور پر متعدد سوالات کئے۔ لیکن میرے جتنے شکوک تھے سب رفع ہوگئے۔ نہ اُن سے بستی میں کسی سے ایسی دشمنی تھی کہ وہ ایسی حرکت کرتا۔ نہ اس خون سے کسی کو وراثت مل سکتی تھی، نہ گھر کی کسی دائی، نوکر پر اس کا شبہہ کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ سب پُرانے اور بھروسے کے آدمی تھے——لیکن میری جرح پر انہوں نے دو باتیں ایسی کہیں جنہیں میں حل نہ کرسکی——

"عاصمہ جب جب آنگن میں پائی گئی تو وہ چپل پہنے ہوئے تھی—— اور عاصمہ کی چیخ کی آواز ہر مرتبہ آنگن ہی سے آئی، کمرے سے نہ آئی۔"

ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ پہلے حادثے کے بعد کمرے کا دروازہ برابر رات کے وقت بند رہا کرتا تھا، ہاں جب میں نے پوچھا کہ دوسری بار عاصمہ سے بچہ کیوں نہ لے لیا گیا، تو انہوں نے کہا کہ عاصمہ کسی طرح اپنے بچے کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتی تھی۔

میں اب تک کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکی تھی۔ بہرحال یہ بڑی افسوسناک بات تھی، اور خاصکر میری غریب عاصمہ پر یہ آفت تھی، اسلئے میں نے بیگم صاحبہ سے باصرار یہ کہہ دیا کہ خدا کرے عاصمہ کو آیندہ ولادت ہونے والی ہو تو آپ مجھے بلوالیں۔ ممکن ہے میری کوشش سے بچہ بچ جائے۔

میں نے یہ سب واقعہ ممتاز صاحب (میرے شوہر) کو کہہ سُنایا۔ وہ باتوں کو بہت جلدی سمجھ جاتے ہیں۔ وہ ہر چیز کا کچھ نہ کچھ سبب نکال کر بتا دیتے ہیں۔ وہ کسی اہم مسئلے کو "خدا کی قدرت" کہہ کر ٹال نہیں دیا کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے دماغ کو روشن کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ میں نے سمجھا شاید وہ اس گتھی کو سُلجھا سکیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بول اُٹھے :۔

"دیکھو، عاصمہ احتیاط سے نہیں سوتی ہے اور جب......"

......"بچہ دب کر مرجاتا ہے، تو وہ اپنی شرمندگی چھپانے کے لئے بچے کو کنوئیں میں ڈال دیتی ہے۔" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا :۔

"بالکل ٹھیک"

"نہیں! اسلئے کہ ایک بچہ تو کنوئیں سے کچھ زندہ بھی نکلا۔"

اس واقعے کو دو سال گذر گئے۔ عاصمہ کے جنات کی گتھی دماغ کے کسی گوشے میں گرد سے اٹی ہوئی پڑی تھی۔ ایک دن مبارک کریم صاحب (عاصمہ کے والد) کا لانبا چوڑا خط آیا جس میں میری "خیر و عافیت خداوند عزّوجل سے نیک خواہاں و جویاں" رہنے کے بعد مجھ "نورچشمی مدعمرہا" سے یہ استدعا کی گئی تھی کہ میں اس خط کو تار سمجھ کر فوراً شیخپورہ چلی آؤں" کیونکہ عاصمہ سلمہا کو ولادت ہونے والی ہے"

ممتاز صاحب نے بخوشی مجھے اجازت دیدی۔ تیسرے دن میں شیخپورے کے لئے روانہ ہوگئی۔

میں چھ یا سات دن رہی ہونگی کہ عاصمہ پر ولادت سے

آثار شروع ہو گئے۔ اس عرصے میں ہم لوگوں کا صرف یہ کام تھا کہ پلنگ پر بیٹھے گپیں اڑایا کریں، لیکن جب عاصمہ کی یہ حالت ہوئی تو پھر گھر بھر سنجیدہ ہوگیا۔ شاید ہی کسی کے لب پر مسکراہٹ آتی ہو۔ ایک دن اور ایک رات یونہی گذر گئی، دوسرے دن کوئی دس گیارہ بجے ولادت ہوئی، سارا گھر خوشی میں ڈوب گیا۔ چار بجے شام کو میں اور کئی لڑکیاں زچہ خانہ میں گئیں عاصمہ کا چہرہ پیلا اور نڈھال ہو رہا تھا جس سے اُس کے حسن میں عجیب دلکش کیفیت پیدا ہو گئی تھی ننھی مُنّی بچی گود میں تھی، جیسے سیپ کے اندر موتی ہو۔ بچی کیا تھی موم کی گڑیا تھی۔ بالکل عاصمہ کی شکل، میں نے پہلے بچی اور پھر عاصمہ کا مُنہ چوما۔ بچی کو گود میں لیا اور دیر تک دیکھتی رہی، عاصمہ کی ایک خاص بات اُس وقت مجھے نظر آئی —— وہ بچی کو اپنے پاس سے جدا نہ ہونے دینا چاہتی تھی اور اسے ناگوار ہوتا تھا۔

یہ سب تو ہوا، لیکن اب میرے امتحان کا وقت بھی آ گیا تھا۔ مجھے جن سے لڑنا تھا، کوئی معمولی بات نہ تھی —— کہاں مٹی کا بنا ہوا انسان اور کہاں آگ کے بنے ہوئے حضرت جن، ان کا کیا مقابلہ۔ جیسے جیسے رات آئی گئی میں اپنے کو مقابلے کے لئے تیار کرنے لگی۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دماغ کے ایک کونے میں جنات اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ موجود تھا۔ اور کبھی کبھی دل دھک دھک کرنے لگتا تھا —— بہر حال رات کا پورا چارج میں نے لے لیا۔ کمرے کے تمام دروازے بند کر دئے۔ کھڑکیاں تمام کھول دیں۔ میں کمرے کے اندر سوئی، اور ناظمہ اور سعادت (عاصمہ کا بھائی) کو بھی وہیں سُلایا۔ کمرے کے دروازے پر سخاوت براہل کو جو بہت دلیر اور پرانے ملازم تھے، سُلایا۔ بڑی بی (عاصمہ کی والدہ) اور کئی مخلصوں نے زور دیا کہ ہم بھی وہیں رہیں گے، لیکن میں نے پوری ڈکٹیٹر شپ کے ساتھ انہیں روک دیا۔ بوڑھے لوگ کام تو کچھ کریں گے نہیں، خواہ مخواہ ہنگامہ کریں گے۔ نو دس بجے تک یونہی بھی کمرے میں لوگ موجود تھے، اس کے بعد ہم لوگ پلنگ پر گئے۔ الارم گھڑی سرہانے رکھ لی، اور وقت مقرر کر لیا، کون کتنے گھنٹے جاگے گا۔ یہ سب طے ہو چکے بعد ہم لوگ لیٹ رہے۔ روشنی خوب تیز جلا کر چھوڑ دی۔ ناظمہ اور سعادت میں یہ فیصلہ ہونے لگا کہ جب جن آئے گا تو اُس کے ساتھ اُن کا کیا طرزِ عمل ہو گا —— کون اُس کا ہاتھ پکڑے گا، کون اس سے بچہ چھینے گا۔ تقریباً بارہ بجے تک یہ گپ رہی، اس کے بعد سناٹا ہو گیا۔ کہیں ایک پتہ بھی گرتا تھا تو زور کی آواز ہوتی تھی۔ کوئی ایک بجے رات کو میاں سعادت بولے :-

"باجی"

"ہوں" میں نے ہونکاری بھری

"ابھی کچھ آپ نے سُنا"

"ہاں سُنا۔ کسی چیز کے گرنے کی آواز تھی"، میں نے کہا۔

"اچھا اب چُپ چاپ غور سے سنتی رہیے"

"چُپ چاپ سُنتے رہو تم! بھلا وہم کا بھی کوئی ٹھکانا ہے میں تو اب سوؤنگی"

وہم بھی عجیب بلا ہوتی ہے۔ سعادت کو رات بھر نیند نہ آئی۔ کئی بار اُس نے مجھ سے پوچھا، باجی! یہ کیا ہوا۔ وہ کیا ہوا —— میں 'ہوں' 'ہاں' کرتی گئی۔ ایک بار اُس نے براہل جی کو مخاطب کیا انہوں نے کہا "کچھ نہیں بیٹا" بلی ولی ہو گی، سو جاؤ۔ ہم تو جاگ ہی رہے ہیں" پھر بھی میاں سعادت بولتے ہی رہے۔ ایک دو بار تو ناظمہ بھی چونکی، اور پوچھا "کیا ہے بھیا۔ میں نے اسے ڈانٹ کر کہا "سو رہو سب لوگوں کے جاگنے کی ضرورت نہیں"۔ مگر میری آنکھیں نیند سے کسی جا رہی تھیں، میں نے سعادت سے کہا "لو اب اُٹھ جاؤ، تمہاری باری ہے، میں سوتی ہوں۔ تم اُٹھ بیٹھو پھر سونے میں دو گھنٹے ہے، اسی طرح گذار دو۔ مجھے نو بجے سونے کی عادت تھی۔ اگر نہ سوؤنگی تو بیمار ہو جاؤں گی"، میں سو گئی۔

صبح کو جو آنکھ کھُلی تو میں نے فوراً بچے کی پلنگ کی طرف دیکھا بچہ موجود تھا، اور وہ چیخ چیخ کر دودھ کا مطالبہ کر رہا تھا۔

اسی طرح پانچ دن گذر گئے۔ اور ہمارا منظم پہرہ بھی جاری رہا۔ ہاں اس درمیان میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ولادت کے تیسرے دن لوگوں میں زیادہ گھبراہٹ پائی جاتی تھی۔ رابعہ بیگم تو بدحواس ہی ہو رہی تھیں مسٹر شہیدی (عاصمہ کے شوہر) بھی جو مردانے میں تلاوت کر رہے تھے اور نفل پر نفل پڑھتے جا رہے تھے، اُس دن ایک قدم اندر اور ایک قدم باہر بوکھلائے پھر رہے تھے۔ اس گھبراہٹ سے میں نے ایک نتیجہ نکلا "یہ لوگ مجھ پر زیادہ بھروسہ نہیں کرتے، اور میرے اطمینان دلانے کے باوجود وہ نہیں سمجھتے کہ مجھ جیسی معمولی لڑکی اتنے بڑے جن کا مقابلہ کر سکے گی۔ اس خلفشار کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ آج تیسرا دن تھا، اور بڑی بوڑھیاں یہ کہتی تھیں "آج تیسرا دن ہے۔ خدا اپنا فضل رکھے" یعنی جنات تیسرے دن زیادہ آتا ہے —— بہر حال اس گھبراہٹ کا

یہ نتیجہ ہوا کہ زچہ خانے کے دروازے پر براہل جی کے پلنگ کے قریب مسٹر شہید کا پلنگ آگیا، ور بڑی بی خواہ مخواہ اندر دھنس پڑیں۔

بارہ بجے رات تک تو یوں بھی گپیں ہوتی ہیں لیکن اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ مکان میں ایک تنکا بھی گرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ شہتیر گرا۔ کوئی دو بجنے کا عمل ہوگا کہ جس اُسارے میں براہل جی وغیرہ سوئے تھے، اُس کے سامنے والے اُسارے سے "کرڑ کرڑ کرڑ کرڑ" کی آواز آنے لگی۔ ناظمہ نے کہا:۔

"اماں"

"کیا ہے جی" رابعہ بیگم نے کہا

"کچھ سُن رہی ہیں"

"ہاں سُن تو رہے ہیں۔ اچھا مہرو کو اٹھاتی ہوں"

یہ کہہ کر بیگم صاحبہ مجھے جگانے لگیں ——— میں تو جاگ ہی رہی تھی، میں نے بھی ہونکاری بھری۔ اتنے میں پھر آواز ہوئی۔

"کرڑ کرڑ کرڑ کرڑ"

"سخاوت نانا، سخاوت نانا" ناظمہ نے چیخنا شروع کیا۔

"کیا ہے بیٹی"

"یہ کرڑ کرڑ کی آواز کیسی ہے، یقینی کوئی دروازہ کاٹ رہا ہے" "کرڑ کرڑ" کی مسلسل آواز جاری تھی۔ اس گفتگو کے بعد سب لوگ پانچ چھ منٹ تک بالکل خاموش رہے۔ اس کے بعد براہل جی کے اُٹھنے کی آواز آئی، وہ سیدھے باہر گئے اور مبارک کریم نصیب اور دو تین آدمیوں کو بلا کر لیتے آئے۔ سبھوں کے ہاتھ میں لاٹھی یا جھڑی تھی۔ کریم صاحب اپنی دونالی بندوق کارتوس بھر کر احتیاط سے لئے ہوئے تھے۔ ہم نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ مکان چھان ڈالا گیا لیکن جن بھوت کا کوئی سراغ نہ ملا۔ سعادت نے کہا۔ ابا چُپ چاپ بیٹھ جایئے دیکھیے پھر آواز آئیگی۔ سب لوگ جہاں تھے وہیں دم سادھ کر بیٹھ گئے۔ دو تین منٹ کے بعد

"کرڑ کرڑ کرڑ" پھر وہی آواز آئی

"آواز اُس طرف سے آرہی ہے" سعادت نے کہا، اور سب لوگ اُسی طرف بڑھ گئے۔ اُسارے میں لکڑی کا ایک بڑا کُندہ رکھا ہوا تھا اور اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ براہل جی کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ وہ آگے بڑھے اور کُندے پر روشنی ڈالی۔

"لاحول ولاقوۃ یہ ارے کُندے پر بھنورا بیٹھا لکڑی کاٹ رہا ہے" براہل جی نے کہا۔

اس پر سبھوں کو بڑی ہنسی آئی اور ہم لوگ ہنستے ہوئے عاصمہ کے پاس آ گئے۔

یہ تیسری رات کا واقعہ تھا۔ اب چھٹی رات سامنے تھی، جبکہ میں نے اپنی زندگی میں خوفناک ترین سین دیکھا۔ جب تیسری رات کوئی نو عد یگر نہ ہوا تو گھر والوں کو تھوڑا سا اطمینان ہوا لیکن ابھی خطرے کا احساس دُور نہیں ہوا تھا۔ اس رات کو شہیدی صاحب سونے نہیں آئے۔ اور ہم لوگوں نے سمجھا بُجھا کر بڑی بی کو بھی اندر سونے سے منع کر دیا۔ کیونکہ بڑی بی کی موجودگی سے اول تو ہماری بے تکلف گپ میں رخنہ ہوتا تھا۔ اور دوسرے وہ رات بھر مخدوم بہاری سے بڑے پیر تک سب کا سایہ مانگتیں، اور خدا معلوم کیا کیا پڑھ پڑھ کر ہر آدھے گھنٹے کے بعد بچی اور عاصمہ پر دم کرتیں۔ بہر حال اس دن ہماری تعداد وہی رہی جو اوّل دن تھی ناظمہ سعادت اور میں۔ ناظمہ دس بجے سے ایک بجے رات تک کا اپنا پہرہ ختم کر کے سو چکی تھی۔ اس نے سوتے وقت مجھے جگا دیا۔ میں اُٹھی اور اُٹھ کر پانی پیا۔ اپنے دل کا ڈر مٹانے کے لئے ایک گیت گنگنائی رہی اور اس کے بعد خاموش پڑ گئی۔ سارا مکان سائیں سائیں کر رہا تھا۔ مجھے اپنے دل کی حرکت تک سُنائی دے رہی تھی۔ غرضکہ اس سناٹے کے عالم میں جب کوئی ڈھائی بجے ہونگے۔ مجھے پلنگ کی چچپاہٹ سُنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتی ہوں کہ عاصمہ اُٹھ کر بیٹھ گئی ہیں اور پلنگ سے پاؤں لٹکا کر گھسر گھسر چپل تلاش کر رہی ہیں۔

"کیا ہے عاصمہ" میں نے پوچھا۔

کوئی جواب نہیں۔ میں نے سمجھا کہ پانی پینا چاہتی ہیں۔ اُٹھ کر گلاس ڈھونڈھا، صراحی سے پانی ڈھالا، پانی ڈھال ہی رہی تھی کہ

"کوں اُوں"

ننھی کے آہستہ سے رونے کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا ——— کیا دیکھتی ہوں کہ ننھی کو گود میں لیکر عاصمہ بالکل دروازے کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

"عاصمہ" میں نے کچھ زور سے پکارا۔ لیکن عاصمہ نے کچھ خیال نہ کیا۔

"عاصمہ عاصمہ" میں گھبرا کر جلدی جلدی پکارنے لگی۔

سعادت اور ناظمہ بھی جاگ گئیں۔ گلاس میں نے پھینک دیا اور عاصمہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس وقت عاصمہ کہہ رہی تھی۔

"میرا بچہ"

بتو کہتی ہوں۔ بتو بڑی خوبصورت ہے مجھے بڑی پیاری لگتی ہے۔ کل ہی تو اُس کا خط آیا ہے۔ مجھ سے "سوال" "روشنائی" کی فرمائش کی ہے۔ روشنائی "ع" سے (رشنائی لکھا ہے) اور "و...

آیا ہوگا - کباب پراٹھوں کی طرف رجوع ہوگیا - باقی کا ہاکی فیلڈ پر گھوم نکلا جارہا تھا - جی تھا کہ دھرا ہی کھانے میں - کہاں ایک حسینہ کا چہرہ اور کہاں ایک بھری پلیٹ مٹھائی - واقعہ یہ ہے کہ لفظ "شباب" کے بدلہ شعر میں لفظ "کباب" نہ آئے اور ایسے موقعہ پر کہ دال ساگ کئی دن سے چھپے ہوں تو شعر گنجت میں پھر دھرا گیا ہے۔

اور جب ہنسی بحد بے تکی ہوگئی اور "بہاری صاحب" کے لئے باعث شرمندگی اور مخلس شعرا کی شان میں کھلی گستاخی تو ہم نے ہنسنے کی وجہ دریافت ہونے پر بحث شروع کر دی - یہ کہ لفظ کباب بجائے شباب کے زیادہ بہتر رہیگا - اور واقعہ یہ ہے کہ ہماری بحث صدق دل سے اور علمی بحث تھی لیکن اس کے معنی دوسرے لے کر ہمیں نکال باہر کیا گیا اور "بہاری صاحب" نے آکر ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہا کہ کس طرح ہم نے اسکول کا نام بدنام کیا اور کیسی بدتمیزی کی - نتیجہ ظاہر ہے۔

اور اب ہم بھی ہار گئے - جوگی کا بن ہم نے لیا یار کی خاطر - ارے صاحب شاعر بنے تھے بہاری صاحب کے خوش کرنے کو، سو یہ راس نہ آئی - چولھے میں جائے شاعری - ہم بھی آخر آدمی ہیں - بہاری صاحب کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کی - اب ہار گئے خدا مالک ہے۔

اور بہاری صاحب کی یہ خفگی شباب ہی پر تھی کہ ایک عجیب معاملہ پیش آیا - ہمارا ایک برا ہی شاباش کے لائحل مسایل کی طرف کچھ ایسا رجوع ہوا کہ شادی کر لایا اور آں محترمہ ہم لوگوں کی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے "کبابیات" کے مسایل کی طرف رجوع ہوئیں - کہنے لگا کہ صاحب کباب پراٹھے تو ایسے پکانی ہے کہ جو کھائے وہ یاد کرے - اور ہم نے سوچا کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہم بھی یاد کریں گے - گر کبھی اطمینان سے اُس نے کہ جو کھائے وہ روپیہ بھی تو فوراً دے۔

اور جب ہم دو تین ساتھی سیر کو آگرہ جانے لگے تو بیرے کو ایک روپیہ دیا اور یہ سیدھا اسٹیشن کباب پراٹھے لے کر پہونچا گاڑی سے بہت قبل آ گئے تھے - اب یہ کبابوں کی آفت آئی - جی ہاں آفت، ہر دم خیال یہ لگا کہ بقیہ ساتھی کہیں بغیر ہمارے شروع اور ختم نہ کر ڈالیں - ریل آتے ہی پہلا کام یہ ٹھہرا کہ لاؤ کھانا کھائیں تاکہ اس آفت سے نجات ملے - درجہ نسبتاً خالی تھا صرف دو تین آدمی اور تھے - اب کھانے جو لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پاس ہی ایک بڑا بھاری ناشتہ دان کہ قطب مینار شرمائے ایک بڑے بکس تلے کے پاس ڈٹا ہوا ہے! یہ کس کا ہے؟ معلوم ہوا ایک صاحب ہیں جو گاڑی رکتے ہی سکنڈ کلاس میں کسی سے بات کرنے گئے ہیں اور یہی حرکت ہر اسٹیشن پر دہراتے ہیں - بادش بہاں بیکتی ٹھہری - دو سیٹوں کے درمیان ایک اونچے سے بکس پر کھانا تجویز تھا - خیال آیا کہ اس ناشتہ دان میں کیا ہوگا - تجویز ہوئی کہ کچھ ہی سہی نکالو نا - چشم زدن میں ناشتہ دان کے خانے اتارنا شروع کئے - بھئی واہ! کیا کہنا - بہت سا انڈوں کا خاگینہ - گول کباب جیسے بم کے گولے - پھوڑا جو سہی تو اندر انڈے بھرے - شامی کباب اور پورا ایک خانہ لبالب بھرا بیسن کا وہ سوندھا سوندھا حلوا کہ ہم نے تو وہیں سے شروع کیا - اور یہ دو کان لگائی ہی تھی کہ "السلام علیکم" ایک صاحب کوئی پچاس اور ساٹھ کے درمیان عمر ذرہ چھدری ڈاڑھی - گٹھا ہوا بدن - سیاہ نیچی سی اچکن - تسبیح ہاتھ میں - سر پر سیاہ الپکے کی مختصر سی پگڑی - اور ان کے پیچھے بہاری صاحب! اشارہ سے بلاتے ہیں - کھڑکی ہی سے نکالا - بہاری صاحب نے بتایا "والد صاحب قبلہ ہیں"۔ اب صاحب فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ پکڑ کر کھانے میں شریک کیا - زبردستی ہاتھ دھلائے اور زبردستی شریک کر لیا بہاری صاحب بھی قریب آکر بیٹھ گئے اور جلدی جلدی خفیہ طور پر ہمارے کان کے اندر تعارفی یا تعریفی امور ارشاد ہو رہے ہیں - اور ادھر والد صاحب قبلہ لگا رہے ہیں ہٹ پہ ہٹ

معلوم ہوا کہ نہ صرف تہجد گذار بلکہ "صاحب مراقبہ" واقع ہوئے ہیں - بڑی زبردست صوفی کیا بلکہ ولی اللہ قسم کے آدمی ہیں بشارتیں ہوتی ہیں بزرگان دین اور اولیا اللہ سے ڈائرکٹ وائرلیس لگتا ہے اور مراقبوں میں ملاقاتیں ہوتی ہیں - رات ہی کو کسی بزرگ نے آگرہ سے دھر کھینچا - گھبرا کر اُٹھے - اسی وقت بستر باندھ لیا اور صبح کھانے سے بھی انکار کیا کہ جب تک روانہ نہ ہوں کھانا پینا حرام - اب جا کر حقیقت کھلی! یہ جو ہٹ پہ ہٹ لگ رہی تھی ہمارا اصل وطن آگرہ - کیسے نہ قیام کی دعوت دیتے - جبکہ یہ بھی کہا گیا کہ روانگی زیر بشارت عمل میں آرہی ہے لہذا خدا معلوم کہاں ٹھہریں گے کوئی انتظام نہیں - اور فقیر کا ٹھہرنا کیا - مگر صاحب بزرگوں کی کشش سے جا رہے تھے کھانے کا یوں انتظام ہوا ٹھہرنے کا کیسے نہ ہوتا - اور پھر ویسے بھی استاد کے باپ ٹھہرے - ہم نے

سو چلئے کہ بہاری صاحب کے والد صاحب قبلہ کی میزبانی کے بعد کم از کم ان کے اوپر احسان کا وہ لداؤ ہو جائے گا کہ گھنٹہ اپنا ہو گا۔ واضح رہے کہ کھانا میں بھی زور سے کھا ہی رہا تھا۔

اور ریل کی سیٹی ہوئی ہے کہ "صاحب کھانا" آ گئے وہ جو سکنڈ کلاس میں بے خبر کسی دوست سے گپ شپ ہانک رہے تھے۔ اور ان کے آتے ہی۔ ہم سب نے بڑے اخلاق اور پورے اسلامی جوش کے ساتھ انکو بھی کھانے پر مدعو کیا۔ اب وہ کھڑے دیکھتے ہیں کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ ایک بزرگوار کی قیادت میں چند لڑکے قیامت ڈھائے ہیں۔ اور والد صاحب قبلہ بولے "حضرت تکلف کیا۔۔۔۔۔ بسم اللہ۔۔۔۔"

"اجی آپ تو تکلف کرتے ہیں۔۔۔" میں نے بھی محبت سے کہا۔ مسکرا کر جائزہ سا لیا۔ اور کہا "کھائیے خدا زیادہ دے۔۔۔ تو لائیے۔۔۔۔" میں نے برجستہ طریقہ سے عرض کیا "کچھ اور بھی ہے" اور اب وہ ذرا بھنائے۔ اور اب والد صاحب قبلہ ذرا دیکھتے ہیں کبھی انکو اور کبھی ہم لوگوں کو۔ مگر مہم سر ہو چکی تھی اور گاڑی بھی چل رہی تھی۔ اور قدرے اطمینان کے بعد آپ انھوں نے ذرا گرفت کی۔ والد صاحب قبلہ سے نام پتہ وغیرہ وغیرہ دریافت کرکرا کے کہا۔ "معاف کیجئے گا یہ کہاں کا اور کون سا اسلامی شعار ہے" یعنی پرایا کھانا یوں کھا گئے۔

اور قبل اس کے کہ کچھ جواب دیں میں نے ان حضرت کو ذرا علیحدہ سر جھکا کر رازدارانہ طریقہ پر بتایا کہ حضرت جملہ کارروائی جو ندم خورندم زیر بشارت عمل میں آئی۔ ایسے بزرگ دین بہ سبب احکام روحانی اپنے پر کھانا پینا حرام کئے ہوئے تھے۔ اس میں آپ مخل نہ ہوں۔ یہ سب کارروائی بزرگان دین کے اشارہ سے عمل میں آ رہی ہے۔ جنھوں نے اپنے اس پیارے مہمان کے لئے کہاں تو کھانا پکوایا اور کہاں کھلوایا۔ آپ مفت میں ثواب لوٹتے ہیں کہ کھانے کو روتے ہیں۔ شکر بجا آر۔۔۔۔۔!

ارے صاحب یہ تو آگ بگولہ ہو گئے سخت برہم ہوئے۔ بہت پڑے مجھے احمق بناتے ہیں! میرا مذاق اڑاتے ہیں بے شرم نہیں آتی۔۔۔۔" بکھر گئے سمٹے دشمنیں سا اور سارا نزلہ بہاری صاحب کے ابا پر "یہ تو لڑکے ہیں مگر جناب کو۔۔۔۔۔ اب میں کیا کہوں۔ بڑے شرم کی بات ہے۔

افسوس۔۔۔۔۔ لاحول ولا قوۃ۔"

اب وہ لاکھ سمجھاتے ہیں پر مجھنا شروع بھی تو ہوا جب وہ ٹھنڈے پڑے تب والد صاحب قبلہ نے افسوس ظاہر کر کے واقعہ بتایا جس کی دوسرے ہندو مسافروں نے تائید کی جو سارا تماشہ شروع سے دیکھ رہے تھے۔ ہم کیا کہتے۔ ہم نے کہا کہ "صاحب آج ہمارا تو عجیب عالم ہوا۔ ہمیں کسی پوشیدہ قوت نے مجبور کیا ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی بالاتر قوت ہے جو حکم دے رہی ہے کہ جلد دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے چنو۔"

اور ٹونڈلے کے اسٹیشن پر ہم والد صاحب قبلہ کو اس بات کا یقین دلانے میں کامیاب ہو چکے تھے اور انکی بزرگی سے خائف سے بن کر کہتے تھے کہ صاحب ہمیں تو ایسا معلوم دے رہا تھا جیسے حکم ہوا ہے۔ اور خود والد صاحب قبلہ نے کہا کہ قطعی ایسا ہی ہوا۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیوں؟ بس یہیں سے رموز شروع ہو جاتے ہیں۔" تم کیا جانو۔"

آگرہ میں مکان کا بالائی حصہ مقفل تھا۔ اسکو کھلوا۔ جہاں قیام کا پورا انتظام تھا اور چھوٹے کمرے میں قبلہ کو تنہا مقیم کر دیا۔ ہمارے دو ساتھی ہمارے اور مہمان تھے۔ مہمان اس طریقہ پر تھے کہ یہاں نوکر نہ چاکر۔ نہ کھانے پینے کا انتظام عزیزوں رشتہ داروں کو کھانے کے لئے حیران کرنا۔ خود ان کے اخلاق سے حیران ہونا۔ لہذا خود اپنے آپ مہمان تھے۔ جو خرچہ ہو اس میں سب برابر کے شریک۔ کھانا ہوٹل میں ناشتہ دوسرا پہلا چاہئے کا جو قریب ہی مل گئی۔ دوسرا ہوٹل میں زوردار۔ قبلہ فری! گویا سب کے مہمان۔

مگر ہمارے اور قبلہ کے مقاصد میں زمین و آسمان کا فرق انکا مقصد طواف قبور و مزارات بزرگان دین۔ ہمارا مقصد سیر سپاٹا۔ ہم سمجھے تھے کہ قبلہ اپنی راہ دیکھیں گے پردہ تو ہم سے چمٹ گئے۔ حماقت خود اپنی ہوئی۔ ساتھ انکو لے گئے اور تانگہ کا کرایہ دیا۔ کرایہ دوگنا پڑا اس لئے کہ سیر و تفریح کے مقام دیکھنے کے بعد کسی کے مزار پر جو "ڈاؤن" ہو گیا تو وہاں بیٹھے ہیں مزار کے پاس مراقبہ میں۔ اب کون کہے کہ حضرت تانگہ فی گھنٹہ پر ہے۔ وہ تو مراقبہ میں اور ہم کو ہلتے ہیں۔

اور قبلہ نے جو تانگہ کا خرچہ یوں پایا تو سرے سے ہمارے

پروگرام میں شریک۔ شریک کیا۔ مخل۔ ایک صاحب مسجد میں مل گئے جو مزارات کی ڈائرکٹری کرنے تھے اور میرے شبیر نے چن چن کر مزارات بتا دئیے۔ ہم کہیں جائیں اسی کے ساتھ ساتھ راہ میں یا بس ذرا ادھر یا ادھر ایک صاحب مزار باعث آزار۔ اور اب ہم نے دیکھا کہ بزرگوں نے تو تانگے گھیر رکھے ہیں۔ قصہ مختصر حیران ہو گئے۔ سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ چھوڑ چھوڑ کے بھاگنے لگے۔ بڑی مصیبت یہ کہ تانگے والے تین آدمی سے زائد بٹھانے میں حجت کریں اور بسا اوقات یا تو دوسرا بکہ کریں ورنہ ایک ساتھی چھوٹے۔ پر مولوی صاحب ہیں کہ چمٹے ہوئے ہیں۔

تاج محل دیکھ کر صدر دروازہ پر آئے اور واپسی میں سیدھی سڑک چھوڑ کر داہنی طرف باغ میں سے ہو کر میدان میں جا نکلو تو بیچ میں پرانا قبرستان اور پھر مردگھٹا ہے۔

میں اور قبلہ والد صاحب۔ اب مصر ہیں کہ ادھر سے ہو کر نکل چلو۔ قبرستان ہی سے گذر دو۔ کہوں؟ "ایسے ہی" میں کیا عرض کروں۔ میں بھی اڑ گیا اور وہ بھی نہ مانے۔ ایسی ضد انھوں نے کاہے کو کی تھی۔ چاروناچار چلا۔

اور قبرستان میں جو پہونچے تو بیچ میں ایک بلندی پر سفید عمارت چمک رہی ہے۔ "اوہو! یہ کس کا مزار ہے؟"

"ہوگا کسی کا۔" "نہیں دراصل نام بھول گیا۔" "آہا.... سبحان اللہ ...... کیا کہنے ہیں .... کوئی بزرگ ہیں .... کیا مقام ہے ...... بھئی عجیب جگہ ...... اللہ ہو ......"

اور میں چپ۔ مگر دیکھتا ہوں کہ راستہ کترا رہے ہیں اور بولا نہیں کہ تجویز کر دیں گے کہ آؤ فاتحہ پڑھیں۔

اور ان کے "اللہ ہو" قسم کے جملے بڑھتے گئے اور کتراتے گئے حتیٰ کہ "لو نکل چلو"

اور میں بگڑ کھڑا ہوا۔ مگر بات بھی ہو۔ ذرا سا کتراتے قریب سے گذر جائیں گے۔ اور واقعی ہوا کیسے فراٹے سے چل رہی تھی۔ مقام سنسان۔ ویران۔ سامنے مزار دھوپ میں چمک رہا تھا اور وہ مزار پر نظریں گاڑے ٹھوکریں کھاتے از خود کتراتے راستہ چھوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ "واللہ کیا مزار ہے ...... بڑے بزرگ ہیں کوئی ...... ماشاء اللہ ......"

قریب پہونچے، بہت مختصر سی عمارت اوپر سے آدمی جھانکتا تھا۔ پکار کر اوس سے پوچھا کس کا مزار ہے۔ ہوا اس قدر فراٹے بھر رہی تھی کہ کچھ سنائی نہ دیا۔ اور قریب ہوئے۔

"ایں۔ ایں ...... کس کا ...... سیدنا ......"

اور قریب ہم دونوں پہونچے کہ مزار کے خادم نے زور سے پکار کر کہا:۔

"سیدنا جلال بخاری ......"

اس کے منہ سے یہ نکلنا تھا کہ مولوی صاحب کے گولی سی لگی۔ منہ سے ایک زور کی چیخ نکلی اور بل کھا کر گرے اور تڑپ رہے ہیں مرغ بسمل کی طرح! خدا کی پناہ! میں نے یہ سین کاہے کو دیکھا تھا۔ گھبرا گیا۔ اب سنبھالتا ہوں تو اٹھ اٹھ کر گرتے ہیں۔ چیختے ہیں، اٹھتے ہیں اور گرتے ہیں

اور مجاور دوڑا آیا اوپر سے۔ مزار کی چونری اور خاک کی چٹکی اور اس نے فوراً سنبھال لیا اور اب یہ گرتے پڑتے ٹھوکریں کھاتے چاروں ہاتھ پیروں سے رینگتے اور بیٹھتے تیزی سے سیڑھیوں کی طرف جھکے۔ میں نے اور مجاور نے سنبھالا اور وہ اسطرح ہم دونوں کی امداد سے سیڑھیاں چڑھ کر ایک زبردست چیخ کے ساتھ مزار کے قدموں میں گرے اور آنکھیں بند سانس زور زور سے چل رہا ہے۔ پڑے ہیں سناٹے میں۔ اب میں چپ کہ الٰہی یہ کیا معاملہ ہے۔ مگر تو قطعی نہیں ہے۔ مجاور برابر نگہبانی کرتا رہا۔

اللہ ہو کا نعرہ مار کر اٹھے۔ مزار کو بوسہ دیا۔ اور ہاتھ باندھ کر "اللہ ہو" کرکے جو مراقبہ میں ڈوبے ہیں تو غائب۔ اب عالم یہ ہیں کہ آنکھوں سے بہ رہی ہیں۔ جھڑی لگ گئی۔ سسکیاں لینا شروع کیں۔ بڑھتی گئیں بڑھتی گئیں۔ ایک چیخ مار کر پھر بیہوش مجاور پھر ضروری کارروائیاں کرنے لگا اور میں تو تنگ آ کر دروازہ پر بیٹھ گیا۔

ہوش آیا تو پھر مراقبہ میں چلے گئے۔ بمشکل رفتہ رفتہ آپے میں آئے۔ مگر جذبات متلاطم اور "افوہ" کا نعرہ۔

بڑی مشکل سے یہاں سے رقت آمیز سین کیساتھ رخصت ہوئے۔ ہر سیڑھی کو چومتے الٹے بیٹھ کر اترا رہے ہیں کہ گرنہ تو پھر مراقبہ میں جانا پڑے۔ میں حد درجہ مرعوب رہا۔ سوال کرنے کی جرأت نہ پڑی۔ پھر خود بتایا۔ بات صرف اتنی تھی کہ یہ حضرت

اس سلسلہ کے مریدوں میں تھے۔ جن میں حضرت سیدنا جلال بخاریؒ کا بڑا پایہ ہے۔ اور یہ سمجھے تھے کہ انکا مزار بخارا میں ہوگا غرض کچھ پتہ نہ تھا۔ خیال نہ تھا۔ کہ ایکدم سے یہ واقعہ ہوا۔ اور اب معلوم ہوا کہ حضرت ہی بلاتے تھے اور حضرت ہی کی نامعلوم کشش تھی اور آج دل ہلکا ہوا ہے۔ گویا حضرت ہی نے بشارت دی تھی اور بلا دیا تھا۔

اور دوسرے دن مولوی صاحب تہجد کے بعد ہی چودہ روز کے روزے سیدے پیدل مزار پر پہونچیں۔ تو سیدے صبح میں ناشتہ کے وقت بعد مراقبہ واپس۔ ناشتہ ناغہ نہیں ہوا۔ اور شام کو جائیں سوار ہوکر۔ ایک حد تک جان چھوٹی اپنی۔

رات کا ذکر ہے کہ ہم لوگوں نے مولوی صاحب کی "قبہ بازی" اور مراقبہ پر اعتراض کیا۔ اور محض ضد اور بحث کے زور میں نہ معلوم کیا کیا رموز تصوف معلوم کر لئے۔ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب فاتحہ کو ہاتھ اٹھاتے ہیں تو مردہ قبر میں اٹھ بیٹھتا ہے۔ اس کے مدارج سب معلوم ہو جاتے ہیں اور مدارج ہی کے لحاظ سے اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ اور راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں اور حصول فیوض ہوتا جو نہیں بتایا جا سکتا۔ مثال کے طور پر مولوی صاحب کی زبان سے نکل گیا کہ انھوں نے سچ مچ حضرت سیدنا جلال بخاریؒ کے قدم چومے بڑی دیر تک یہی گفتگو رہی اور ہم لوگوں کو خاموش ہونا پڑا۔

دوسرے روز کا ذکر ہے کہ مراقبہ کے ذریعہ کئی مزارات پر سے فیض حاصل کرکے لوٹتے تھے کہ میری شامت جو آئی ایک پرتکلف مزار پر فاتحہ خوانی کی سفارش کر دی کہ مولوی صاحب اس مزار پہ فاتحہ نہ پڑھیئے گا۔" اسپہ بھی ہو"۔

ذرا قریب پہونچکر مولوی صاحب فاتحہ پڑھکر آنکھیں جھکا کر لگے اوپر کی طرف دیکھنے۔ میں بھی قریب آگیا تھا۔ میں نے کہا "کہئے کیسے بزرگ ہیں"۔ ہنسکر کہنے لگے "کیا کہنے ہیں"۔ میں نے کہا فیوض حاصل ہوئے۔ کہنے لگے "نہ پوچھو۔ ۔ ۔ ۔"

ہر مزار پہ مزاح کے طور میں اسی قسم کے سوال ضرور کرتا تھا اور مولوی صاحب ہنسکر جواب دیتے تھے۔

جیب میں سے عینک نکال کر جو مولوی صاحب نے اوپر کی طرف دیکھا تو نہ پوچھئے! لاحول ولا قوۃ! جز بز ہو گئے۔ صاحب قبر پر لعنت اور پھٹکار۔ اور ادھر میرا مارے ہنسی کے یہ حال کہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب بگڑ کر کھڑے ہوئے۔ "میرا مذاق اڑاتے ہو۔" یہ قبر آگرہ کے مشہور بھانڈ علی بخش کی تھی۔ خدا کی پناہ کیا مسخرا تھا۔ صورت دیکھتے ہنسی آتی تھی اب مرگیا تو مزار دیکھو اور ہنسو۔ جو قبر پر آتا ہے بجائے درس عبرت لینے کے ہنسنے لگتا ہے مزار پر اوپر کی طرف بڑے بڑے الفاظ میں لوگ خدا اور رسول کا نام لکھواتے ہیں مگر یہاں لکھی ہوئی ہے۔ بھانڈوں کی مخصوص گالیؔ! اور اشعار علیحدہ۔ اسوقت سب شعر تو یاد نہیں۔ صرف دو بے ربط مصرعے یاد ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس بھانڈ نے قبرستان ایسے پرہول و عبرت انگیز مقام کی سنجیدگی کو کس درجہ برہم کر رکھا ہے کہ جو شخص بھی شہر خموشاں میں آتا ہے ہنسنے لگتا ہے:-

سو برس کی عمر تھی اور حال یہ شوخی کا تھا

.. ..

.. ..

آگرہ کی رنڈیاں اس بات کی سب ہیں گواہ

میں اس جگہ کبھی نہیں آیا تھا نہ مجھے یہ معلوم کہ یہ علی بخش کی قبر ہے اور اس پر یہ مہمل باتیں لکھی ہیں۔ لیکن مولوی صاحب نے یقین نہ کیا اور اس قدر زیادہ خفا ہوئے کہ بیان سے باہر۔

یہ میری بد قسمتی ہے کہ ان فیوض کے بارے میں [illegible] کچھ دریافت نہ کر سکا جو خود مولوی صاحب نے ابھی ابھی علی بخش مرحوم سے حاصل کئے تھے۔ خود لکھا ہے۔ پوزیشن صاف کرنا مشکل ہو گئی۔ خطا وار ضرور تھا کہ فاتحہ کے لئے اشارہ میں نے کیا۔ مولوی صاحب اس درجہ برہم تھے کہ کوئی صورت سلجھنے کی نظر نہ آئی۔ اور اسی حالت میں ایک اور بھی عجیب معاملہ پیش آگیا۔

حضرت سیدنا ابو العلےٰؒ کے مزار اقدس پر حاضری دی۔ مولوی صاحب تانگہ پر سے تیزی سے اتر کر آگے بڑھ گئے ---

---

لہ "ب ..... ح ....." یہ مخصوص گالی ناچ و رنگ کی محفل میں ایک شستہ بدتمیزی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور اگر قارئین کو نہ بتائی جائے تو ایک طرف قصہ کا لطف جاتا ہے اور دوسری طرف مرحوم بھانڈ کے بارہ میں غلط فہمی واقع ہوتی ہے۔ لہٰذا لفظ گالی کے بجائے بھانڈوں کا مخصوص لفظ کہنا زیادہ موزوں ہے

کچھ تو خفا سے تھے اور کچھ اس لئے کہ تانگہ یہاں پر رخصت کرنا تھا اور ایسے موقعہ پر مولوی صاحب تانگہ والے کو چھوڑ کر ہدایت کر کے چل دیتے تھے۔ مولوی صاحب لپک کے آگے بڑھے۔ دروازہ ہی پر ایک پاکیزہ مزار ہے۔ مزار پر چادر پڑی ہوئی۔ سب سے زیادہ صاف ستھرا۔ پاکیزہ۔ شاندار۔ قریب اگردان سلگ رہا۔ مور کے پر کی جھاڑو رکھی ہوئی۔ اور مولوی صاحب تانگہ کی چقلش سے بچنے کو ایکدم سے فاتحہ میں مشغول ہو گئے۔ میں نے تانگہ والے کو کرایہ دیا۔ دراصل مولوی صاحب کرایہ کی باتوں ہی سے بچنا چاہتے تھے۔ اور پھر ویسے بھی مزار کس قدر پرکشش۔ میں بھی کرایہ دے کر پہونچا۔

ایک لڑکا آ گیا تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا "یہ کن بزرگ کا مزار ہے؟"

لڑکا کچھ چپ۔ میں نے پوچھا "ارے یہ کس کی قبر ہے؟"

"منی رنڈی کی"۔۔۔ ۔۔۔ کس قدر دلچسپ جواب تھا۔ مولوی صاحب سچ مچ ہاتھ بھر اچھل پڑے اور اس بری طرح ہاتھ جھٹک کر لاحول پڑھی ہے کہ گویا فاتحہ واپس چھین لیں۔ اور میرے اوپر پھر ہنسی کا اور بھی خطرناک دورہ طاری ہو گیا۔ اور یہ میری سمجھ میں آج تک نہ آیا کہ رنڈی کو یہ نواح کیسے نصیب ہو گئے۔ منی آگرہ کی بڑی مشہور طوائف گذری ہے اور اتنا روپیہ چھوڑا کہ آج تک اس کے مزار کی نگہداشت ہوتی ہے۔ یہاں بھی میں کچھ نہ پوچھ سکا کہ کیا فیوض حاصل ہوئے۔ مگر مجھے اس قدر ہنسی آئی ہے کہ اُسی شام کو مولوی صاحب باوجود ہر طرح کے روکنے کے اپنا پروگرام توڑ کر واپس چلے گئے۔ اور ہم سے بیحد خفا ہو کر گئے اس لئے کہ ہنسی کا روکنا ہمارے لئے اس قدر محال تھا کہ عرض نہیں کر سکتے اور یہ بات مولوی صاحب کو گوارا نہ تھی۔

ایک دفعہ عجیب جرم میں گرفتار ہوئے۔ چوری میں نہیں ڈاکہ میں نہیں، جوئے میں نہیں بلکہ میلاد شریف کی شرکت کے جرم میں! شام کا وقت تھا، راہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ زور کا میلاد شریف ہو رہا ہے اور عین توڑ کا وقت ہے۔ سلام پڑھا جا رہا ہے۔ دو اور ساتھی سے مشورہ ہوا کہ کیوں نہ ثواب میں شریک ہو جائیں اور جھٹ سے تبرک لے کر موا ہوں۔ ہمت کر جھٹ جا کھڑے ہوئے۔ ہم بھی اور ہاتھ باندھ کر آنکھیں میچ کر۔ یا نبی سلام علیک اور ایک دو لے کھینچی تھیں کہ فاتحہ اور پھر تبرک آئے۔ اکٹھے چار لڈو ملے۔ صف در صف لوگ تبرک لیتے چلے جاتے تھے۔ تبرک دینے والے نے ایک چار قدم چلے تھے

کر لو کا" اسکول کے لڑکے ہیں آپ؟ جی۔ اور چار لڈو فی کس اور اب ان لڈوؤں کو رکھ بھلا کیا سکتے تھے۔ کھانے کی ایسی شئے دھری کیا کچھ نہ غلیان پیدا کرتی۔ سڑک ہی پر ذرا راستہ بچا کر منہ چلاتے جاتے تھے کہ سامنے سے ایکدم سے گویا آسمان سے ٹپک پڑے! بہاری صاحب۔ کیا کھاتے ہو؟ کہاں سے آتے ہو وغیرہ وغیرہ۔ سچ سچ بتا دیا۔ سنکر مولوی صاحب نے ایکدم سے کہا "اوخ۔۔۔ اچھا۔۔۔ ہوں۔۔۔" اور سیدھے چلے گئے۔ اور اس عجیب و غریب بظاہر بے معنے "اچھا" کے معنی جب سمجھ میں آئے جب ایک انتہا سے زیادہ غصیل ماسٹر صاحب کے سامنے پیشی ہوئی۔ اور پیشی بھی ایسی کہ عدالت کا پارہ ایک سو دس سے متجاوز۔ الہی خیر! کیا معاملہ ہے۔ آخر کوئی بات بھی ہو۔ زبان کھولی کہ گرج پڑے، برسنے کو تیار۔ چپ رہا کیا کرتے۔ اور ہمیں آگاہ کیا گیا کہ ہماری شرارتوں کی اب حد ہو چکی اور سارا نزلہ ہمارے اوپر۔ ایک حرف نہ بول سکے اور چپ چاپ چلے آئے۔ سخت سزا ملی۔ از قسم حبس وغیرہ

اب باہر جو آئے تو اپنے ناکردہ جرم کا پتہ لگا۔ معلوم ہوا کہ خیر سے یہ میلاد شریف ایک طوائف صاحبہ نے کرایا تھا۔ وہ خود بھی تھی مع اپنی صاحبزادی صاحبہ کے اور صاحب قسم لیجئے کہ ہمیں پتہ بھی ہو۔ ہم نے وہاں دیکھا ہی کیسے بہت دور "دو آنہ والے" قسم کے لوگوں میں ذرا دیر کھڑے تو ہم ہوئے اور نظر تبرک پر رہی اور اب ہمیں ہوئی کرید۔ معلوم ہوا کہ وہ لڑکی اس درجہ خوبصورت ہے کہ شہر دیوانہ ہے۔ اے واہ رے حسن و شباب! جس کے صدقے ہم یوں مارے جائیں۔ بھلا کون ہماری سنتا اور کون یقین کرتا کہ ہم ان صاحبزادی صاحبہ کے چرچۂ عام تک سے محض غافل اور ناواقف تھے۔ بالخصوص جبکہ بہاری صاحب کے والد صاحب قبلہ کے ساتھ جو بھی "حرکتیں" ہم نے نادانستہ طور پر کی تھیں ان سے قطع نظر کرتے ہوئے نہ صرف ہم چھ ماہ کے "رسٹی کیشن" شدہ طالب علم تھے بلکہ ایک طوائف کے سلام شدہ بھی تھے۔ اور اس قسم کی "حرکتوں" سے باز آنے والوں میں نہیں تھے۔

اور اس کے بعد ہماری وہ ناگفتہ پوزیشن بہاری صاحب نے کر دی ہے جس کا اندازہ دشوار ہے۔ کوئی بھی استاد دشمن ہو جائے تو طالب علم کے لئے کبھی کچھ مصیبت نہیں لا سکتا۔ اور ہماری عقل

کام نہ کرتی تھی کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں کہ خدا نے عجیب و غریب طریقہ پر ہماری مشکل حل کر دیں۔ غرض یہ کہ اس واقعہ کے بعد ہماری معلومات میں یہ اضافہ ہوا کہ ان نیک و پارسا طوائف نے بھی عجیب دوہرا کھاتہ کھول رکھا ہے۔ کباب پراٹھوں اور دیگر مرغنیا کا جیسا کچھ بھی حصول جنت میں دخل ہے سب جانتے ہیں۔ اب یہ اپنی اپنی تقدیر ہے۔ کوئی خدا کی نمازوں اور روزوں کے زور سے جنت میں جائے اور کوئی جائے کباب پراٹھوں ہی کے زور سے۔ یہ نیک بخت خاتون قوالی اور عرسوں سے لیکر میلاد و مجلس تک بلکہ ہر مذہبی معاملہ میں مرغنیات کا ہنگامہ بپا کرتیں۔ اور طالب علم جو ہماری طرح غفلت مآب نہ تھے جا نکلتے تو دوہرا حصہ لائے۔ اور خاطر علاوہ۔

اور محرم پر یہ نیک بخت کیا کچھ نہ کرتیں مجلس۔ لنگر تک تو صبر مگر عین دسویں کے روز کربلا میں خیمہ لگا کر وہاں نہ صرف لنگر بلکہ مزید برآں! اپنا تعزیہ دفن کرنے کے بعد دو باتوں کا سا موسیخ کے دو کباب او۔ ایک کھیر کا پیالہ ہر اس لفنگے یا لفنگے کا حصہ جو وہاں جا پہونچے اور ہم ایسے طالب علم معصوم دوسے ترسیں۔

محرم کی دسویں۔ کربلا میں تعزیوں کا آخر نظارہ قابل دید تھا۔ تعزیوں کی چمک پر ڈھولوں کی گرج اور باجوں کا شور اور اس پر آدمیوں کا بے پناہ ہجوم۔ ایک سے ایک جنت کا سودائی حسینؑ کا شیدائی۔ ہر سائز کے بچے اور ہر قطع و تجم کے مردوں سے لیکر ہر رنگ کی عورتیں۔ وہ ریل پیل کے خاک کہیں کچھ تجھ کہیں کچھ تجھ سنو کچھ۔ اور اس چپقلش میں اسکول کے ہم ایسے معصوم لڑکے لڑکے۔ دینے کی تمنا دل میں۔ کھڑے تک رہے ہیں ادھر ادھر کبھی شرو کی غیر دلچسپ و دل آزار صورتوں کو تو کبھی مجمع کو۔ میلہ کا لطف ہی یکسر غائب۔ اور بہاری صاحب کی پہلے تو یہ تجویز تھی کہ کوئی لڑکا کربلا نہ جائے پھر ترمیم ہو کر یہ ہوئی کہ مقررہ مقام پر بیٹھے یا کھڑے ہوئے دیکھو۔ بالفاظ دیگر خود دیکھنے کا لطف تھے بن جاؤ۔ اور کھانے کو جی جاتا تو کرکرے کباب یا پھلکی پھلکیاں جھپٹ گئیں۔ تو یہ ہی تھی۔

اس شور و شغب سے پرے ہٹ کر ایک درخت کے نیچے! افوہ! دوڑے تیزی سے پر پہونچتے پہونچتے نیا یار تھی۔ بمشکل باقرخانی کا ٹکڑا ہاتھ آیا۔ ہارے تھکے بھوکے ویسے۔ کھایا جو یہی تو ذائقہ کی لکیر سی حلق میں بن گئی۔ یہ ہمارے ایک دوست تھے جو یہ مال اڑا لائے اور ہم نے حسرت سے اوس طرف دیکھا۔

وہ سامنے۔ بہت فاصلہ پر۔ بالکل کنارے۔ انہی نیک بخت خاتون کے خیمے دور ہی سے چمک رہے تھے۔

اور گل بکاؤلی کو بھی تو کوئی لے ہی آیا۔ راستہ میں ایک ایک دیو موجود۔ وہ دیو کھا جائیں یہ دیو نہیں کھائیں۔

کوئی میل بھر کا چکر کاٹ کر تن تنہا کربلا کی پشت پر پہونچے۔ جنگل ویران بیہڑ۔ اور میل بھر کا چکر اور دیا جو صحیح راستہ پر آئے۔ درمیان میں بیہڑ کی پہاڑیاں اور خندقیں حائل۔ گھرے ہوتے ایک جگہ۔ بیشک قناتوں کے وسیع احاطہ کی پشت پر نکلے ان قناتوں کے اندر کھانا پک رہا تھا۔

فاصلہ پر دو خیمے تھے۔ پھر واپس ہوئے اور خیموں کے دروازوں کی سیدھ میں آنے کے لئے بڑا لمبا چوڑا چکر کاٹا۔ ایک خیمہ بالکل علیحدہ تھا اوس پر سامنے چق پڑی تھی۔ کوئی عورت سبز دوپٹہ پہنے دور سے جھک رہی تھی۔ اب پھر واپس لوٹے۔

قناتوں کی نشست کی طرف ہوتے ہوئے پہلا خیمہ چھوڑا۔ وہاں کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ دوسرے خیمہ کی عین پشت پر جا نکلے۔ اور لگا کر کان سننا۔ خاموشی۔ مگر نہیں کچھ۔ باتوں کی آوازیں۔ کان لگائے۔ منہ دوسری طرف سنتے ہی تھے کہ آہٹ ہوئی۔ مڑ کر دیکھتے ہیں تو ارے! کلیجہ دھک دھک ہونے لگا۔ یہی نیک اور پارسا خاتون کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

"آؤ.. میاں اندر آؤ۔ تبرک کھانے آئے ہیں.. آئیے....."

آخری آئیے کے ساتھ ہی آ گئے۔ چق اٹھا کر خیمہ میں داخل ہوئے۔ بھی واہ۔ کمال ہو گیا! ہمارے ایک کلاس فیلو بیٹھے کس تیزی سے کھیر اڑا رہے ہیں!۔ ساتھ ایک وارثی حضرت۔ بڑی بڑی زلفیں۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔ انتظار کاہی کا۔ ہم بھی جھک پڑے اور یہ ہمارے دوست کھا چکے تھے لاکھ روکا پر نہ رکے۔ یہ وارثی حضرت بھی فارغ ہو چکے تھے۔ یہ بھی اٹھ گئے۔ اب ہم نے خیمہ کو دیکھا۔ کیسا صاف شفاف فرش تھا۔ پر ایک چھوٹا سا جھاڑ۔ اور متعدد بلوری ہانڈیاں۔ قالین صاف ستھرے گاؤ تکیے لگے اور بیچ میں ایک لکڑی کی سینی میں کھانا تھا۔ گرما گرم

باقرخانیاں سیخ کے کباب - مولی کی قاشیں - پنیر کے ٹکڑے اور کھیر کے پیالے - ہم خوش ہوئے کہ کوئی نہیں اور یہ پارسا خاتون کس قدر خاموش طبع اور نیک ہیں -

لیکن ایک چار لقموں سے سوا نہ لئے تھے کہ آگئی آفت ماسٹر صاحب کی عکی دلنے کی سی آواز یہ وہ ماسٹر جن کے روبرو میلاد کی پیشی ہوئی - سن سے بجلی کانوں سے پار - اور ان نیک بخت خاتون نے سر کو جھٹک کر ہاتھ سے اشارہ کیا - خیمہ کے دو حصے تھے پشت کے حصہ پر پردے پڑے تھے - لپک کے ہم اندر رکھے اور گھسے ہی تھے کہ ششدر رہ گئے - صاحبزادی صاحبہ بلند آفتا لیا ایک رضائی اوڑھے قالین پر بیٹھی سگرٹ پی رہی تھیں - ماتھے پر پٹی کسی تھی - انھوں نے مسکرا کر فرمایا - آیئے بیٹھئے - اور ساتھ ہی ماسٹر صاحب کے خیمہ میں داخل ہونے کے ساتھ آنکھ کو جدا راز اور میں نے اشارہ سے بتایا - لڑکی سمجھدار تھی - اشارہ سے انہیں پاس بیٹھنے کو اشارہ کیا -

ماسٹر صاحب شکاری کتے کی طرح دراصل ہمارے اُن دوست کے تعاقب میں آئے تھے جو کھابی کر چل بھی دئے کیا صاف نکلا ہے - ان خاتون سے مکرر سہ کرر پوچھا کہ کوئی لڑکا تو نہیں آیا اور حلیہ بتایا - انھوں نے انکار کر دیا - پھر پوچھا - پھر پوچھا اور ہر دفعہ نرمی سے انھوں نے جواب دیا کہ کوئی نہیں آیا - اور تبرک کھانے کی دعوت -

ماسٹر صاحب قدرے بگڑ کر بولے کہ "دیکھئے آپ نہیں مانتیں لڑکوں کو چھپا کر کھلاتی ہیں اور ہم جو آپ کے یہاں آتے ہیں تو دراصل محض اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے کہ لڑکے تو نہیں آتے - اور اخلاقاً اگر ہم یہاں بے تکلفی برتیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ لڑکوں کو اپنے ہاں آنے کی ترغیب دیں - اور ان نیک بخت خاتون نے بڑی نرمی سے ماسٹر صاحب کو ٹھنڈا کیا - ماسٹر صاحب نے شب میں تبرک کھانے کا وعدہ اور پھر صاحبزادی صاحبہ کو پوچھا معصومہ کیسی ہے - اور قبل اس کے کہ وہ جواب دیں وہ ادھر ہی آئے نہ سوچنے کی مہلت نہ بھاگنے کی فرصت - معصومہ نے جلدی سے مجھے اپنے پاس ہی لٹا کر رضائی ڈھک دی اور میں اس میں بالکل گٹھری مٹھری ہو گیا - ایسا کہ سر انکی پشت کی طرف اور ایک رضائی میں دو کیسے آئیں! ضرورت سے زیادہ بے تکلفی نہ برتوں تو ٹانگیں کھل جائیں - اب ہم دونوں ایک رضائی میں وہ بیٹھی کیا میرے اوپر لدی ہوئی - اور میں گٹھری بنا - دل ہے کہ انجن کی طرح چل رہا ہے - یا میرے اللہ - عمر میں ایسا سخت وقت کب پڑا -

ماسٹر صاحب نے پردہ اٹھا کر جھانکا - "جیتی رہو.... پیو پیو...." سگرٹ کے بارہ میں کہا جو انھوں نے خاکدان میں رکھ دیا تھا اور سلگ رہا تھا - اور مختصر مزاج پرسی.... "یہ کون ہے؟"

"میری ایک بہن ہیں.... میری سہیلی ہیں...."

ماسٹر صاحب خاموش! برسوں لگ گئے - اُفوہ! کس قدر طویل خاموشی تھی - برسوں کی طوالت -

"سو رہی ہیں کیا؟"

"جی ہاں"

"کیا کچھ طبیعت...."

"جی ہاں.... کئی راتیں جاگتے کٹی ہیں...."

"کون ہیں یہ....؟"

اب میرے حواس اس درجہ زایل ہو چکے تھے کہ سوچا کہ اٹھ کر بھاگوں زور سے نکل کر اسٹیشن کی طرف اور چلا جاؤں گھر - اور نہ معلوم میں کیا کچھ نہ کر گذرتا کہ معصومہ نے (نام اصل اور نقام) قدرے غیر شیریں لہجہ میں ایک وقار کے ساتھ کہا -

"میری ایک سہیلی ہیں آپ نہیں جانتے...."

اور اس جملہ کا مطلب تھا - کالا آدمی تم فوراً بھاگ جاؤ اور ماسٹر صاحب چل دئے -

اور میں اس قابل رشک پوزیشن میں سچ مچ اس غیر معمولی کش مکش کی تکلیف سے ادھ مرا سا ہوا پڑا تھا کہ خطرے سے بچنے کا احساس ہوا - اُسی کے ساتھ اپنے نو عمر اور خوبصورت ساتھی کی معطر اور معنبر رضائی اور کپڑوں کا دماغ پر ایک پر سرور اثر ہوا -

"گئے.... گئے.... اٹھئے...." رضائی گھسیٹتے ہوئے وہ بولی - اور میں اٹھا - اس کا روشن اور خوبصورت چہرہ کس قدر دلکش اور کس قدر جاذب نگاہ تھا - اور چہرہ پر ایک دلچسپ مسکراہٹ مسلط - آنکھوں میں شوخی - اور عجیب چمک - اور مجھے غور سے دیکھ رہی ہے -

"آپ تو بہن ہیں میری...." اس نے ہنستے ہوئے کہا "دیکھ لیجئے کیسا بچایا...."

میں نے کہا "بچایا تو خوب...."

اور مسکراتی ہوئی وہ نیک بخت خاتون آئیں۔ "تبرک تو کھا لیجئے۔۔۔۔"

"کھانے سے بھاگنا پڑا تھا۔۔۔۔" اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا، جس کی آواز کی کھنک عمر میں پہلی دفعہ محسوس ہوئی۔ اور اُٹھے اور بھولا ہوا سبق پھر سبق پھر شروع کیا۔ ابکی دفعہ ان نیک بخت خاتون نے ایک پہرہ دار بٹھا دیا کہ دیکھتے رہو کوئی ماسٹر نہ آنے پائے۔

گرم باقرخانیاں اور آئیں اور ہم نے بھی نئے سرے سے کھانا شروع کیا۔ بڑے جنجال سے چھوٹے تھے۔ مگر قسمت بھی تو عجیب لے کر آئے تھے۔

معصومہ نے ماں سے سر میں درد کی شکایت کی اور چلنے کو کہا۔ تانگہ موجود تھا اور ماں بیٹیاں دونوں جانے لگیں۔ ماں بیٹی کو تانگہ تک پہونچانے۔ مجھ سے معذرت خواہ ہوئیں اور کھانے کی سخت تاکید کرکے روانہ ہوئیں کہ "ابھی آئی۔ بس ابھی۔ ابھی آئی۔۔۔۔" تین دفعہ تکرار کے ساتھ اور تاکید کے ساتھ کھانے کی فرمائش۔

اور پانچ منٹ بھی بہت ہوتے ہیں۔ بمشکل ایک دو نوالے لئے ہوں گے کہ وہ آ گئے۔۔۔۔۔ "مولوی بہاری"! نوکر افیونی اونگھتا تھا۔ اس نے بتایا کہ "ادھر" گئی ہیں۔ میں دسترخوان سے اُٹھ ہی چکا تھا اور قلعہ کی طرف بڑھ کر پردہ تھامے کھڑا تھا۔ کہ اگر یہ حضرت خیمہ کے اندر آنے لگیں تو پھر اُسی طرح چھپ جاؤں اب اس نالائق افیونی کو دیکھئے کہ یہ نہیں بتاتا کہ بیٹی بھی گئی ہے۔ نہ ان حضرت کو "خالی" خیمہ میں آنے سے روکتا ہے! حق کی طرف بڑھے ہیں کہ میں جھپٹ سے خیمہ کے دوسرے حصہ میں پہونچ کر اسی رضائی میں لپیٹ کر پھر گر ہی پڑی! اور مولوی بہاری صاحب ایک عجیب بے تکلفی کے لہجہ میں آواز دیتے ہیں۔ "معصومہ بی۔۔۔۔"

اور یہ کہتے ہوئے سیدھے وہ میرے پاس پہونچے یا اللہ اب میں کیا کروں۔ مولوی صاحب رُکے اور آہستہ سے بولے "سو رہی ہو۔۔۔۔ معصومہ بی۔۔۔۔ معصومہ۔۔۔۔ ارے کیوں ٹھنٹی ہو۔۔۔۔"

خاموش ہو گئے اور میں سمجھا کہ دفان ہوئے کہ وہ بولے "تم یوں نہ مانو گی۔۔۔۔ نہیں کیسے اُٹھے گی"۔

اور یہ کہہ کر میرے قریب آ کر انگلی سے حضرت لگے گدگدانے۔ ٹٹولنے۔ ہلانے "ارے۔۔۔۔ بڑی شریر ہے۔۔۔۔ ٹھہر تو جا۔۔۔۔ اون۔۔۔۔ ن۔۔۔۔ ن۔۔۔۔ (ٹھنک کر) ہم نہیں بولتے۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔ (چمکار کر۔۔۔۔) ۔۔۔۔ اٹھو۔۔۔۔ آنکھیں میچے کون اُٹھے۔۔۔۔"

اور ممکن ہے کہ یہ "آنکھیں میچیں کون اُٹھے" والا لافانی جملہ بھی بیکار جاتا۔ اس سے بہتر کون موقعہ ہو سکتا تھا۔ لیکن میں ایسی مصیبت میں تھا کہ اب بھی نہ اٹھتا اگر ساتھ ہی مولوی صاحب نے ایک "اور" کارروائی نہ کی ہوتی۔ میرے کوٹ کے مٹن رضائی کے اوپر ہی سے کم از کم میرے تجربات زندگی کے لحاظ سے کچھ اپنے نئے طریقہ سے ٹٹولے اور کہا جو یہ "آنکھیں میچیں کون اُٹھے"۔ کہ بندہ پھڑ پھڑا کر اُٹھ بیٹھا! اور رضائی الگ پھینک کے مودبانہ سلام عرض کیا! اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ صیغۂ راز میں رہے گا۔ دو عدد بھرے پیالے۔ دو شیرمالیں اور کباب لے کر جو بندہ وہاں سے غائب ہوا تو سیدھا جنگل کی طرف سے ہوتا خالی ہاتھ اپنے ساتھیوں میں آ ملا۔

گذشتہ سال اسی قسم کا مضمون بعنوان "معذرت" ندیم میں شائع ہوا تو پٹنہ کے ایک رسالہ کے ایڈیٹر صاحب نے خط لکھا کہ میں بھی اسی اسکول کا اولڈ بوائے ہوں اور پہچان گیا تمام مقامات وغیرہ اور تصدیق چاہی۔ میں نے جواب نہیں دیا۔ اس قسم کی باتیں کسی قومی اسکول یا ادارہ کے بارہ میں غلط فہمی پیدا کرتیں علاوہ اس کے "کہانی" کا لطف غائب لہذا کوئی حضرت اس بارہ میں خیال آرائی نہ فرمائیں اور اسکو افسانہ ہی سمجھیں۔ اور سنہ ۳۴ء میں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں کلکتہ سے واپسی میں حضرت انجم سابق ایڈیٹر ندیم کے در دولت پر معرکہ کیا گرم تھا کہ ایک صاحب "بمصداق "ٹولیٹ" چھڑی ہاتھ میں ترکی ٹوپی عینک لگائے تشریف لائے۔

حضرت انجم نے تعارف کرایا اور قبل اس کے کہ میں کچھ عرض کر سکوں۔ "ابھی حاضر ہوا" کہہ کر جو وہ غائب ہوئے ہیں تو۔

"کبھی اے حقیقت منتظر۔۔۔۔۔۔"

"......بخیر گذشت"

از جناب محمد ایوب صاحب آبگلوی بہار شریف

میں جانتی بھی نہ تھی کہ عشق و محبت کس کا نام ہے لیکن میں نے دیکھا کہ آپا جن کو میں اور میری دوسری ہم جماعت لڑکیاں مذاقاً عاقلہ بوا کہا کرتی ہیں وہ میاں فہیم پر بری طرح لٹو ہیں۔ میاں فہیم ہمارے ہی درجہ کے طالب علم ہیں اور کوئی خاص بات نہیں اندر نہیں رکھتے، البتہ خوش پوش اور جاذبِ نظر ضرور ہیں تو بھلا میں اُن سے کب کم تھی۔ جس جماعت میں آپا پڑھتی تھیں اسی جماعت میں، میں بھی پڑھتی تھی، جو جو سبجکٹ اُن کا تھا، وہی ہمارا۔ چلنے، پھرنے، دوڑنے ہنسنے، چھلانگ مارنے، ناک، کان، آنکھ، دانت سب میں برابر بلکہ داہنے ہاتھ میں ایک اُنگلی میرے ہی فاضل تھی، البتہ عمر میں آپا ہم سے دو ایک سال بڑی تھیں۔ تو اس کا چنداں اعتبار بھی نہیں، اور سعدی دادا نے تو فرمایا ہے "بزرگی بعقل است نہ بسال" وہ اپنا نام عاشقوں کی فہرست میں درج کرالیں، اور میں فیل ہو جاؤں۔

بس میں نے بھی عشق و محبت کا سودا خریدنے کی ٹھان لی۔ آن میں انسان کیا کچھ نہ کر گذرتا ہے۔ پیسہ کی کیا حقیقت ہے اور یہاں تو عشق کا سودا کرنے میں کچھ صرف نہ تھا۔ مفت ہی ہے۔ مفت تو پھر میں کیوں چوکتی۔

فکر یہ تھی کہ آپا کو تو ایک خوش پوش جاذبِ نظر معشوق دستیاب ہو گیا۔ میں کہاں تلاش کروں، کیا فرہاد کی طرح مجھے بھی جوئے شیر لانا پڑے گیا، مگر آجکل اپنا مقدر اوج پر ہے۔ بغیر جستجو کے ایک معشوق مل گیا، اور نہایت مناسب اور حسبِ حال، قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے آپا سنجیدہ اور متین، میں چلبلی اور شوخ مگر فیشن پرست آپا نے اپنی عادت کے خلاف معشوق منتخب کیا۔ یعنی معشوق اُن کا چنچل اور فیشن کا دلدادہ، مجھے تو صرف ریس کرنی تھی، عشق و عاشقی سے کچھ کام نہ تھا، میں نے سمجھا گھر سے دور دراز ہوں، طبیعت گھبراتی ہے لاؤ دلبستگی کا ایک سامان ہی خدا نے مہیا کر دیا ہے، ہم جماعت لڑکوں کو میں اکثر مذاق کر کے دق کیا کرتی تھی یہ بھی ایک مذاق ہی سہی، چنانچہ ایک سیاہ فام لاابالی قسم کا انسان جس کے بدن پر لکھیاں

بھن بھن کرتی رہتی تھیں، اپنی غربت کی وجہ سے ہفتوں ایک ہی لباس پہن کر کالج آتا، اور سب سے علیحدہ ایک گوشہ میں سیٹ پر بیٹھ جاتا، اسکو میں نے اپنا معشوق منتخب کیا۔ اور دل ہی دل میں خوش تھی کہ چھیڑ خوانی کا اچھا وسیلہ ہاتھ آیا۔

اب میرے سر دوہری ذمہ داری آن پڑی تھی۔ میں کیا جانوں عشق کس طرح کیا جاتا ہے۔ میں اس جستجو میں رہی کہ ہماری آپا اپنے عاشق کے ساتھ کیا کیا سلوک کیا کرتی ہیں، "جوئندہ یابندہ" مجھے خاطر خواہ کامیابی ہوئی، میں نے دیکھا آپا مسٹر فہیم سے نہایت ہنس ہنس کر گفتگو کرتی ہیں، مسٹر فہیم کی سیٹ کے پاس ہی انھوں نے اپنی بھی جگہ بنالی ہے۔ کالج سب سے پہلے آجاتی ہیں اور کلاس سے سب کے بعد جاتی ہیں، درجہ کا درجہ پروفیسر کا لکچر سنا کرتا ہے۔ لیکن آپا رخِ یار کے مصحف کے مطالعہ کرنے میں مشغول رہتی ہیں۔ میں نے بھی پیروی شروع کر دی، خلاصہ یہ کہ میں آپا کی نقل و حرکت کا جائزہ لیا کرتی اور جب کوئی نئی بات ذہن میں آئی، میں بھی عمل پیرا ہو جاتی، ان واقعات نے مجھے پکا جاسوس بنا دیا۔ اور میں ایک پختہ کار کی طرح حرکات و سکنات کی نگرانی کرتی رہی، مجھے جلدی ہی معلوم ہو گیا کہ درجہ میں قبل آنے اور بعد میں جانے کا سبب کیا ہے۔ دراصل اسی مہلت میں عشق و محبت کے متعلق اسلئے تبادلہ نامہ و پیام کیا کرتے ہیں، آپا گھر سے خط لکھ کر لایا کرتیں، اور رکھ دیا کرتیں۔ مسٹر فہیم کی طبیعت میں امنگ اور چلبلاپن ہے، درجہ ہی میں بیٹھے جواب لکھ کر دراز میں رکھ دیتے، آپا فرصت کے بعد انتظار میں رہتیں۔ تمام ہم جماعت کلاس سے باہر ہوئے نہیں کہ انھوں نے دراز سے خط نکالا اور گھر کی راہ لی،

خط و کتابت کا تو حال معلوم ہو گیا۔ لیکن کیا لکھا جاتا ہے، مضمون اور القاب کی خبر نہیں، بڑی پریشانیوں اور الجھنوں کے بعد یہ خیال دماغ میں آیا۔ کہ آپا فونٹن پن سے زیادہ پنسل استعمال کرتی ہیں اور پنسل کو ذرا دبا کر لکھنے کی عادی ہیں، اسی

لئے اُن کی پنسل بروزانہ قریب قریب بنا کرتی ہوں اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے ان کی تمام کاپیوں میں دس بارہ ورق سادہ کاغذوں کے بعد ایک ایک کاربن پیپر رکھ دیا اور اس ہوشیاری سے یہ کام عمل میں آیا کہ آپا کو مطلق اس کا علم بھی نہ ہو سکا۔ اس دن میں قصداً کالج نہ گئی اب جو کاپیاں دیکھتی ہوں، تو پہلا ہی تیر نشانہ پر لگا تھا۔ ایک کاپی میں اس مضمون کا خط دستیاب ہوا، میں نے نہایت ہوشیاری سے اُس صفحہ کو کاپی سے علیحدہ کر لیا۔ اور کاربن پیپر پھر اُسی جگہ چھپا دیا۔

۔۔۔

بمبئی

۲۵ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

ڈیر فہیم!

تم آزاد ہو، نہ ماں نہ باپ، اس پر اس قدر مجھ سے بے اعتنائی برتتے ہو اور میں ہر طرح پابند ہوں، سوسائٹی کا ڈر، والدین کا خوف، بدنامی کا ہراس، ان باتوں کے باوجود میں نے تم کو دل کی انتہائی گہرائیوں میں جگہ دی ہے، اور تم میرے قلعۂ دل کے واحد حکمراں ہو، تعطیل کی وجہ سے تم پر دو ایک روز نظر نہ پڑتی ہے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے، خدا کے لئے اس سلسلۂ خط و کتابت کو جو میری زندگی کا ذریعہ ہے، قطع نہ کرو۔ میں رات بھر تمہارے خط کو آنکھوں سے لگائے رکھتی ہوں، والسلام۔

تمہاری کنیز

عصمت آرا

ایک ہفتہ کے اندر متعدد خطوط دستیاب ہوئے۔ ہر خط میں اظہار محبت رہتا، اور مسٹر فہیم کی سرد مہریوں کی شکایت رہتی، ہم ان تحریروں سے مسکرا مسکرا کر خوب لطف اندوز ہوا کرتی۔ احسان کی بلند پروازیوں پر مجھے سخت حیرت تھی، میں خط پڑھتی اور اضطراری طور پر قہقہہ لگایا کرتی۔ لیکن بہرحال خطوں کا طور طریق معلوم ہو جانے کے بعد مجھ میں بھی گدگدی سمائی اور اپنے معشوق کو حسب ذیل محبت نامہ لکھ مارا:-

۔۔۔

جانِ عاشق

میں جب سے یہاں تعلیم حاصل کرنے آئی ہوں خدا معلوم کیا راز ہے کہ دل آپ کی طرف کھنچا جاتا ہے، ایک نامعلوم کشش ہے کہ بار بار مجھے آپکی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ دو ایک روز نظر نہ پڑنے سے کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ میں گویا کھوئی سی رہتی ہوں۔ اندرونی کرب و اضطراب کے ماتحت یہ خط لکھ رہی ہوں، امید کہ آپ مجھ غریب الوطن کی حالت ناگفتہ بہ پر رحم فرما کر سلسلۂ رسل و رسائل جاری فرمائیں گے، آپ کی موجودگی میں آپ کی دلکش صورت کو دیکھ کر اطمینان حاصل رہتا ہے۔ آپ کی غیر موجودگی میں آپ کی تحریروں کو دیکھ کر تسلی اور تشفی رہے گی۔

آپ کی

عصمت آرا

لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب سکوت کے اس مجسم تپلے نے میرے خط پر کوئی التفات نہیں کیا۔ یاددہانی کیلئے میں نے دوسرا، پھر تیسرا، یہاں تک کہ سات خط لکھ ڈالے مگر کسی کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اب میں سخت کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ میں چھیڑ چھاڑ کرنا چاہتی تھی، مگر وہ چڑیا ہاتھ نہ آ رہی تھی، آخر عاجز آ کر میں نے بناوٹ کے خاص انداز میں رونی صورت بنا کر مسٹر سہیل سے عرض کیا، "میں آپ کو خطوط لکھتی ہوں لیکن آپ مجھے جواب سے محروم رکھتے ہیں؟" اس وقت تو میاں سہیل خاموش رہے یہ کہتے ہوئے آنسوؤں کے دو قطرے اپنی تدبیر کی ناکامی سے میرے رخساروں پر ڈھلک گئے۔ یہ آخری نسخہ کارگر نکلا۔ چنانچہ دوسرے ہی روز میری دراز میں ایک خط موجود تھا۔

۔۔۔

بمبئی۔

محترمہ تسلیم

بلاشبہ آپ کے خطوط مجھے ملے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ غلط فہمی کی بنا پر مجھے خطوط مل جایا کرتے ہیں۔ اصل مخاطب کوئی اور ہی ہے۔ اور یہی میری خاموشی کا باعث تھا۔ لیکن آپنے کل بالمشافہ جو فرمایا، تو مجھے نہایت استعجاب ہوا۔ یہ آپکی ناتجربہ کاری نے آپ نے دیا نہیں

دیکھی ہے۔ میری ہستی اور آپ کی اعلیٰ شخصیت کے درمیان بعد المشرقین ہے۔ میں روٹیوں کو محتاج دوسروں کی اعانت کے بھروسے تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ اور ماشاءاللہ آپ کے والدین صاحب ثروت ہیں۔ آپ کی روٹیوں پر دوسرے پرورش پاتے ہیں۔ آپ حسین و جمیل ہیں اور صباحت اور ملاحت کی دولت سے مالا مال ہیں اور میں کندہ ناتراش ہوں۔ میری صورت رات کو دیکھ کر لوگ خوف کھاتے ہیں۔ اس لئے دست بستہ گذارش ہے کہ اس خیال کو آپ ہمیشہ کے لئے دماغ سے نکال دیں ورنہ اس کا انجام ہم دونوں کے لئے خراب ہوگا۔

آپ کا خیر خواہ

سہیل

خط پڑھکر میری شریر فطرت کو ایک ٹھیس لگی۔ میں گند پھینکتی ہوں مگر وہ زقند بھر کر گند سے باہر ہو جاتا ہے۔ میری فطرت بھی عجیب واقع ہوئی ہے۔ جب میں کسی کام کا تہیہ کر لیتی ہوں تو پھر اس خیال سے باز نہیں آسکتی۔ اور مسلسل کوشش کے باوجود جب ناکامیابی ہوتی ہے تو مجھ پر غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔

اس خط نے میری حسرتوں کا خون کیا تھا۔ میں سخت مغموم تھی اسی حالت میں ایک خوشامدانہ خط لکھ مارا۔ الحمد للہ اس حالت میں جو خط میں نے لکھا تھا وہ میرے موجودہ حالات اور جذبات کا آئینہ دار ثابت ہوا۔ مجھے عشق کی تو بیماری تھی نہیں، مگر ناکامیوں نے مجھے پریشان کر دیا تھا، جس سے مسٹر سہیل متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ راہ پر آئے، اور بعد کے خطوط نے تو انہیں رام کر لیا۔

میں اب ایک پختہ کار اداکار کی طرح اپنا پارٹ ادا کر رہی تھی اور میاں سہیل میدان عشق میں وامق، فرہاد، مجنوں سبھوں سے بازی لے جا چکے تھے۔

(۲)

دو برس گذر گئے کوئی خاص بات ظہور میں نہیں آئی، البتہ میاں سہیل پہلے سے زیادہ پڑھنے میں غرق نظر آتے تھے، خدا خدا کر کے سالانہ امتحان ختم ہوا سب لوگ اپنے اپنے مکان روانہ ہوئے، آپا اور مسٹر فہیم میں خدا معلوم گھنٹوں کیا کیا راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ میں نے بھی میاں سہیل سے تخلیہ میں پیار کی خوب خوب باتیں کیں۔ امتحان کا نتیجہ شائع ہوا۔ آپا اور ہم دونوں سکنڈ ڈویزن میں کامیاب ہوئے۔ مسٹر فہیم تھرڈ ڈویزن میں، لیکن وہ دہقانی سہیل پوری یونیورسٹی میں اول آیا۔ پروفیسروں کی کوشش اور سفارش اور میاں سہیل کی قسمت نے اس کے اقبال کے ستارہ کو چمکا دیا اور وہ آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان کے لئے لندن بھیجا گیا۔

اس کے بعد اتفاق دیکھئے وہ آئی۔ سی۔ ایس کے مقابلہ میں کامیاب ہو کر لندن سے واپسی کے بعد ہمارے ہی شہر میں بحیثیت جوائنٹ مجسٹریٹ اس کی تقرری ہوئی۔ لندن کے قیام کے دوران میں اور اس کے بعد بھی میاں سہیل مجھے عاشقانہ خطوط لکھتے رہے مگر وہ تو کالج کی زندگی تھی اور فضا و ماحول کی دلچسپیوں کے ماتحت میں اسے چھیڑا کرتی تھی ورنہ اس کی گھناؤنی صورت سے تو مجھے سخت نفرت تھی۔ چنانچہ میں اب بالکل خاموش تھی۔ اور اس سکوت کی وجہ سے بلائیں ٹلتی رہیں۔

(۳)

آپا کی شادی مسٹر فہیم سے ہو چکی تھی، میاں سہیل کی ان لوگوں سے آمد و رفت بھی تھی، کبھی میاں سہیل ان کے ہاں پہنچتے، اور کبھی یہ دونوں ان کے ہاں جاتے، فہیم بھائی نے ایک دن مجھ سے لفظوں میں سہیل کی سفارش کی اور آپا نے تو کھلم کھلا کہہ ہی دیا "تم کیوں اس کو ناحق پریشان کرتی ہو وہ تمہاری دن رات تسبیح پڑھا کرتا ہے، اور تمہارے ہی یاد میں وہ زندہ ہے۔ مگر تم اس قدر اس سے برگشتہ ہو آخر معلوم تو ہونا چاہئے اس میں کیا خامی ہے، اس کے کارنامے دیکھو برابر درجہ میں اول آیا، یونیورسٹی میں اول آیا۔ آئی۔ سی۔ ایس کے زبردست مقابلہ میں تمام ہندوستانیوں میں بھی اول آیا، اس وقت جوائنٹ مجسٹریٹ ہے، آئندہ مزید ترقی کی امید ہے"۔ مگر مجھے تو اسکی صورت سے نفرت تھی، اس وعظ و پند کا مطلق اثر نہ ہوا۔ بلکہ آپا فہیم بھائی اور میاں سہیل کی ہم جلیسی سے مجھے اندیشہ ہوا اور اکثر چھپ چھپ کر رو دیا کرتی کہ کہیں فہیم بھائی اور آپا میری شادی میاں سہیل سے کرانے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ البتہ اس خیال سے ڈھارس بندھتی تھی کہ والدین جب مجھ سے دریافت کرینگے تو اپنی فطری کمزوریوں کو بالائے طاق رکھ کر صاف انکار کر دوں گی پھر اس خیال سے مایوسی بھی ہوتی کہ ہندوستان میں لڑکیوں سے مزاج لینا بعید از شرافت سمجھا جاتا ہے۔ اب میں شب و روز ایک روحانی اذیت میں مبتلا تھی۔

بھکاری

از جناب ایم۔ ذکی اختر صاحب ہاشمی عظیم آبادی

ایک بھکاری مسجد ناخدا سے ہوکر اپنا دست سوال پھیلائے بغل میں ایک میلی سی جھولی لٹکائے "محتاج کی کمبر لو بابا۔ ۔ ۔ ۔ لاچار کی کمبر لو بابا" کی رٹ لگاتا ہوا ادھر سے اُدھر نکل جاتا۔ کبھی نے دیا کسی نے نہیں دیا۔ لیکن دنیا کا سرد گرم دیکھا اور سہا ہوا انسان کسی کے دینے اور نہ دینے کا خیال کئے بغیر اپنی زندگی کی راہ ناپتا اور سیاہ اوقات "کی ہو لو رے بابا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کو نھائی گیلو رے بابا" کی بے سری آواز سے الاپتا ہوا اور چلا جاتا۔ داڑھی کے الجھے ہوئے کچھ میلے کچھ پیلے بال اور چھوٹی چھوٹی گرد آلود آنکھوں سے اسکی پریشاں حالی اور تیرہ روزگاری کے آثار ہویدا تھے۔ پہاڑ جیسی مصیبتوں کے بار گراں سے وہ دبا جا رہا تھا۔ اسکی ہر سانس موت کی ہچکی معلوم ہوتی، لیکن جب اس سے اسکی افسردگی اور رنج و ملال کی وجہ دریافت کی جاتی تو کوئی حرف شکایت اس کی زبان پر نہیں آتا۔ ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال دیتا۔ "سنسار کی یہ ریت ہے بابا۔"

گرمی کی تعطیل تھی۔ نیشنل کالج طویل عرصہ کے لئے بند ہو چکا تھا۔ کدار ناتھ اس چھٹی میں کلکتہ کی سیر کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ اس لئے چھٹی کے دوسرے ہی دن اس نے اپنا رخت سفر باندھا۔ دوسرے دن وہ کلکتہ پہنچا اور ایک ہوٹل میں قیام پذیر ہوا۔ ایک دن وہ رکشے پر سوار مسجد ناخدا کے نزدیک پہنچا ہی ہوگا کہ سامنے سے وہی بھکاری میلی سی جھولی لٹکائے "کی ہو لو رے بابا ۔ ۔ ۔ ۔ کو نھائی گیلو رے بابا" کی بے لے راگ الاپتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ کدار کی آنکھیں اس پاگل بھکاری کی سرخ آنکھوں سے جا لڑیں اور اس کے نرم اور درد مند دل کو ٹھیس لگی اور اسکی زبان سے نکلا "یہ غریب ۔ ۔ ۔ ۔ پاگل ہے"

"کیا دیکھتے ہیں بابو ۔ ۔ ۔ اسکی تقدیر ہی خراب ہے" رکشے والے نے کھانستے ہوئے کہا۔

"تم اسکو جانتے ہو؟" کدار نے رکشے والے سے پوچھا۔

"جانونگا کیوں نہیں؟" رکشے والے نے جواب دیا "میرے مکان سے ایک ہی ڈیڑھ میل پر تو اس کا گھر تھا"

"زور زور سے یہ بک کیا رہا ہے؟" کدار نے حیرت سے تکتے ہوئے پوچھا

"ایسے ہی بڑبڑاتا رہتا ہے۔ ابھی تو کہہ رہا ہے کہ "کی ہو لو رے بابا ۔ ۔ ۔ کو تھائی گیلو رے بابا"

"ایسا کیوں ۔ ۔ ۔ ؟ کیا یہ خاندانی گداگر ہے؟" کدار نے بھکاری کو جھانک کر بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بابو! اسکی تقدیر ہی اندھی ہے ۔ ۔ ۔ زمانہ کے الٹ پھیر نے ایسے غریب بنا دیا۔ بابو! یہ دکھیا راہے۔ اسکی بپتا اسکا دکھ ایسا نہیں جو منٹ دو منٹ میں کہا جا سکے"

"اچھا۔ پارک میں چل کر سنیں اسکی بپتا شافی ہوگی" کدار نے زور دے کر رکشے والے سے کہا۔

ایک درخت کے پاس جو پارک کا آخری حصہ تھا دونوں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور رکشے والے نے کہانی یوں شروع کی ؟

اس کا نام کلوا ہے۔ اس کا باپ اپنے گاؤں کا ایک کھاتا پیتا کسان تھا لیکن جب کسی کے برے دن آنیکو ہوتے ہیں تو گھر میں بیماری آتی ہے۔ کلوا کے باپ نے اپنی طویل علالت کے زمانہ میں اور بیوی کی بیماری اور اسکے کفن دفن کے وقت گاؤں کے زمیندار کشن سنگھ سے بدفعات ایک سو بارہ روپے قرض لئے۔ اسی تھوڑے سے روپئے کو بابو صاحب نے چار پانچ سال میں سود در سود جوڑ کر اتنا بڑھا لیا کہ اس بچارے کیلئے ادا کرنا مشکل ہوگیا۔ گھر کے سامنے کا پورا کھیت اور آموں کا لمبا چوڑا باغ چودھری نے ہضم کر لیا لیکن اسپر بھی اصل چھوڑ بیاج بھی ادا نہ ہوا۔ آخر جب قرض کی ادائی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو بچارے نے مجبوراً بابو صاحب کے یہاں نوکری کر لی اور اُسکی پوری زندگی اُنہیں کی نوکری اور خدمت کرتے کرتے ختم ہوئی۔ لیکن پھر بھی قرض کا بھاری بوجھ ہلکا نہ ہوا اور یہ اب باپ کے اُٹھ جانے پر یتیم کلوا کے سر آ پڑا۔ کلوا کی اس مصیبت میں اس کا کوئی ساجھی

نہ تھا - اسکی بہن کے سوا جو باپ کے مرنے کی خبر سنکر میکہ آئی تھی کلوا کا حقیقی مددگار اور معاون کوئی بھی نہ تھا - سر سے باپ کا سایہ اٹھے ابھی دس دن بھی نہ ہوئے تھے کہ چودھری کشن سنگھ نے اصطبل کی صفائی کیلئے کلوآ کو اور اناج کی پھٹکائی کے لئے کلوآ کی بہن کو بلا بھیجا - باپ کا غم، مسلسل بھوک اور لگاتار شب بیداری نے انکو بالکل چور کر دیا تھا - ان میں اتنی طاقت کہاں باقی تھی جو کسی کی بیگاری کر سکیں - کلوآ نے پیادہ کی منت و سماجت کی اور کچھ دنوں کیلئے بیگاری سے سبکدوشی چاہی لیکن غریبوں کا عذر کون سنتا ہے ....

کلوا اور اسکی بہن چودھری کشن سنگھ کے غصہ سے بخوبی واقف تھے - پیادہ کا حکم کشن سنگھ کا حکم تھا - مرتا کیا نہ کرتا - یہ دونوں پیادہ کے ساتھ ہو لئے اور کشن سنگھ کے سامنے اپنا عذر لیکر حاضر ہوئے - لیکن ظالم اور سخت دل چودھری کو یتیم کلوآ پر کوئی رحم نہ آیا - ڈیوڑھی میں حاضر ہی ہونا پڑا - آخر اسی طرح کلوا اور اسکی بہن اس دن سے برابر چودھری کے یہاں کام کاج کرنے کیلئے آنے جانے لگے -

دن ہفتوں اور مہینوں میں تبدیل ہونے لگے - کلوا کی مصیبت کے دن کسی طرح گذرتے گئے - ایک دن کشن سنگھ کے چھوٹے بھائی کی بری نظر کلوا کی بہن پر پڑی اور وہ اس کے پیچھے لگے - آخر بچاری عزت اور عصمت کی حفاظت کے خیال سے اپنے بھائی کو آئے دن کی اذیتوں اور کلفتوں کے دلدل میں پھنسا چھوڑ کر اپنی سسرال چلی گئی -

کلوآ اب اس دنیا میں اکیلا تھا - بہن کی جدائی نے اسکی دنیا سونی کر دی اور وہ ہمیشہ مغموم اور متوحش رہنے لگا - اب وہ نہ صرف کشن سنگھ کے مظالم کا شکار تھا بلکہ اسکے بھائی کے انتقامی جذبہ کی سیری کے لئے مظالم کا ہدف بنا ہوا تھا - وہ اپنی تنہائی کی زندگی سے گھبرا اٹھا - اور نیک ساعت دیکھ کر "کرٹ ہوئی" پر ایک عورت کو بیاہ لایا -

کلوآ کی شادی کو ایک سال کا عرصہ گذر گیا - اب چند دنوں کا بچہ اسکی بیوی کی گود میں تھا - گرمی کا موسم تھا - کشن سنگھ کے بھائی کی شادی کی دھوم دھام شروع ہوئی - اسی کے ساتھ غریب کلوا کے سخت سے سخت پسنے کے دن آگئے - وہ ایکدن اس شادی کے کام کاج کی دوڑ دھوپ میں سخت حیران اور پریشان تھا - کہ اسکو لو لگ گئی اور بیہوش ہوکر گر پڑا - دوسرے دن وہ کام کرنے نہ گیا - پیادہ بلانے آیا تو اس نے معافی چاہی لیکن پیادہ نے اس کے جواب میں گھسیٹ کر لے جانے کی دھمکی دی - کلوآ کی بیوی سے ضبط نہ ہو سکا اور وارفتگی میں دو چار باتیں منھ سے نکل گئیں - پیادہ فوراً واپس ہو گیا

اور کچھ بڑھ چڑھ کر کشن سنگھ کے کان بھرے - اب بابو صاحب کے غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی - فوراً چار پانچ دیو ہیکل پیادے غریب کی جھونپڑی پر آدھمکے - کلوآ سہم کر جھونپڑی سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ ایک پیادہ نے گالیاں دیتے ہوئے کھینچ کر اسے دو طمانچے مارے - دوسرے پیادے نے کلوآ کی بیوی کی خبر لی - پھر کشاں کشاں دونوں کشن سنگھ کے سامنے حاضر کئے گئے - انہیں دیکھتے ہی کشن سنگھ کے غصہ کی آگ اور بھڑک اٹھی -

"...... کا منھ کالا کر دو ...... حرب آئی ہے ہر روز ایک نئی بات نکالتی رہتی ہے .... اس مردود نمک حرام کو دیکھو کہ باپ دادا نے تو ہمیشہ بیگاری کی .... مگر انکو اب نوابی ہو گئی .... مارو ...... کو"!! پیادوں نے کشن سنگھ کا تیور پہچان کر ان دونوں پر ٹوٹ پڑے - کلوا کی بیوی ابھی گویا زچہ خانہ ہی میں تھی اتنی مار کھا کر درد اور چوٹ سے تلملا اٹھی - پیادہ کا ایک جوتا اسکی گود کے بچہ کو بھی لگ گیا - چوٹ کی تاب نہ لا کر ننھا ایک ہلکی چیخ مار کر اس دنیا سے چل بسا - ماں کی ممتا نے زور کیا اور مارے قلق کے وہ بھی زمین پر گر پڑی - لوگوں نے سمجھا کہ بیہوش ہو گری مگر کچھ دیر بعد وہ کلوآ کو اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے سدھار گئی -

بدنصیب کلوآ دکھ مصیبت سہنے کے لئے تنہا زندہ بچ رہا - نہ بیوی تھی اور نہ بچہ - اب اسی انتہائی غم و اندوہ کا نتیجہ ہے کہ اس کے پاگل دماغ میں یہ بات سما گئی ہے کہ کھوج لگانے سے بیوی بچے مل سکتے ہیں اور اسی لئے جب ہوش میں نہیں رہتا تو اپنے بیوی بچہ کی عبث تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور بکتا پھرتا ہے "کی ہو لو رے بابا .... کو تھائی گیلو رے بابا ......"

یہ ہے اس کی صدا کی اصل حقیقت!

رکشا والے کی کہانی ختم ہوئی - کدار نے آہ سرد کھینچی اور رومال سے جلد جلد اپنی اشک آلود آنکھوں کو جو ابھی کھولتے چشمہ کی طرح ابل رہی تھیں خشک کیا اور آہستہ آہستہ بازار کی طرف روانہ ہو گیا -

مکافاتِ عملُ

(بھاگل پور کے دو افسانہ نویسوں کے مشترک قلم سے۔)

پہلا باب

(از جناب مخزوں چکنکوی)

موسم بہار کی ایک شام تھی ——— ہر شام سے زیادہ رنگین ——— فطرت جوان ہو گئی تھی اور ہمیشہ سے زیادہ حسین مگر سرلا کا فاقہ سے پژمردہ حسن اسے اب بھی شرمندہ کر رہا تھا ——— وہ حسن و معصومیت کی ایک پاکیزہ کلی تھی صنف نازک میں ایک انمول موتی۔

تین وقت گذر چکے تھے۔ اور سرلا نے ایک دانہ بھی نہ کھایا تھا ——— اس کا گھر بن اناج کے سنسان بن رہا تھا۔ جیسے چٹیل میدان بن گھانس کے ——— اس سنسان گھر میں اس کا مزدور باپ بیمار پڑا کراہ رہا تھا ——— اور اس کی ماں اس کے پائتی میں بیٹھی اشک بہا رہی تھی۔ غم کے آنسو اور بھوک کے آنسو۔

بھولی اور الھڑ سرلا ——— بھوک سے نڈھال دروازہ پر بیٹھی ——— کبھی ہاتھ سے سر کو دباتی ——— کبھی کمزوری سے تھر تھر کانپتی۔

سندر دروازہ کے سامنے ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا ——— سرلا کو دیکھا اور اپنی ناکامی پر افسوس کرنے لگا ——— یہ بستی کا امیرزادہ تھا ——— نوجوان اور آوارہ مزاج ——— سرلا کو اس نے اکثر اپنے دام ہوس کا شکار بنانا چاہا۔ مگر ناکام رہا وہ باغ ہستی کا پھول تھی ——— خوشنما اور خوبصورت ترین ——— جسے ہر ہاتھ توڑ لینے کا خواہشمند ہو ——— مگر اس نے گلچینوں کے دست بردسے خود کو بچائے رکھا ——— جیسے گنجان درخت کسی حسین چہرہ کو دھوپ کی تمازت سے ——— کوئی اسے چھو نہ سکا ——— کوئی اس کی ہوس میں کامیاب نہ ہو سکا ——— اس کا حسن پر رعب تھا ——— اسکی خودداری غیر کیلئے حوصلہ شکن۔

جس سرلا کے باپ دادے سندر کی جوتیاں سیدھی کرتے تھے ——— اس کے حسین اور بے جوتیوں والے پاؤں کو سندر خود چھونا چاہتا تھا ——— طلائی اور نقرئی سکوں کی جھنکار سنا سنا کر اسے موہنا چاہتا تھا ——— مگر سب بے سود!

وہ اسیر بغیر نگاہ ڈالے ——— اپنی سوکھی روٹی پھٹے کپڑے میں ——— حسن و عصمت کو انمول بنائے۔ جوانی کے راستہ پر گذرتی رہی۔

مگر اتفاق سے آج وہ سوکھی روٹی بھی نہ تھی ——— کپڑے بالکل جواب دے چکے تھے ——— زندگی و موت کا سوال اُسے دیوانہ بنا رہا تھا۔

زندگی تو بہر حال سب سے زیادہ عزیز ہے؟ ———

سندر نے اپنے ناپاک دل میں سوچا ——— جسے سرلا کی موجودہ حالت کا بخوبی علم ہو چکا تھا ——— اب وہ روپے کی قیمت پر زندگی بچانے کے لئے ——— اس چیز کو ضرور فروخت کرنے پر رضامند ہو جائے گی ——— جس کو وہ اب تک سب سے زیادہ عزیز سمجھتی رہی ہے ——— اس خیال کے ماتحت۔ اُس نے سرلا کی مزاج پرسی کی ——— دشمن عصمت کی زبان سے اظہار ہمدردی سن ——— اس کی نرگسی آنکھوں میں آنسو سمٹ آئے۔

اس کا دل پھٹنے لگا ——— اس کی خودداری کا رنگین ساغر چکنا چور ہو گیا ——— اور زندگی کی شراب بہ بہ کر مٹی میں ملنے لگی ——— اُس نے بھاگ کر خود کو جھونپڑی کی آڑ میں چھپانا چاہا۔ مگر سندر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ——— اور اس پر دس روپے رکھ دئیے ——— "میں تم سے کچھ نہیں چاہتا" ترپیہ وہ انسان گڑگڑا کر بولا ——— "لیکن تمہاری زندگی کی سلامتی؟ بیوقوف بن کر زندگی برباد مت کرو ——— اتنا کہہ کر وہ رفو چکر ہو گیا۔ سرلا وحشت میں الجھ کر رہ گئی ——— اس نے روپے کو دیکھا اور پھر اپنے حسین جسم کو ——— کیا یہ رقم اس جسم کو حاصل کرنے کے لئے پیشگی کے طور پر نہیں دی گئی ہے؟ ———

اس سوال کے ساتھ ہی ــــ اس کا شہابی جسم تھرتھرایا۔ اسکی سیاہ آنکھیں نمناک ہوگئیں۔

ان ردیوں نے اسکی زندگی کو تو پلٹا یا ــــ مگر اسکی روح کو نیم جاں بنا ڈالا ــــ اس کا حسن بلند پرواز ہوتا جسے کوئی چھو نہیں سکتا! ــــ اس کی خودداری و استغنا مستقل ہوتا ــــ دوسروں کی پرواہ سے بے نیاز ــــ مگر افلاس نے اس کے تمام خصوصیات چھین کر اُسے آسمان سے تحت الثریٰ میں دے مارا ــــ وہ یہ سوچا کرتی اور ہر دسے کی نیئوں سے رویا کرتی ــــ وہ اب خود کو گلاب کا پھول سمجھنے لگی تھی ــــ جو کسی حسین گلے میں ہونے کے بجائے گندی نالی میں پڑا سڑتا ہو ــــ اور اس پر گندے کیڑے دوڑتے ہوں ــــ کاش! وہ دولت مند ہوتی ــــ ورنہ بدصورت ہوتی ــــ تو اسکی عصمت کا کوئی خواہاں نہ ہوتا ــــ اسکی رنگین جوانی یوں نہ لٹتی جس حسن کا صرف تصور ہوسکتا تھا ــــ جو انمول موتی صرف شاہی تاج میں ٹک سکتا تھا ــــ اب اُسے گندے ہاتھوں سے مسلا جائے گا ــــ اسکی قیمت بالکل ادنیٰ بنا دی جائیگی۔

اور یوں ہی اگر زندگی بچانے کے لئے ــــ وہ روپیہ لینے کی عادی ہوتی رہی۔ تو ایک دن اُسے دام بھی چکانا پڑیگا۔ ایک بار ڈگمگانے سے ــــ ہر دم ڈگمگانا ہوگا۔ رفتہ رفتہ کتنے لوگ آئیں گے ــــ اور اس کے حسن و عصمت کی قیمت چکائیں گے۔ حتیٰ کہ ایک دن۔ اس کا حسن و عصمت زخم کھا کھا کر ــــ کریہہ و متعفن بن جائے گا۔ جس پر مکھیاں بھی نہ بھنبھنا سکیں گی۔ جس پر لوگ تھوکنا بھی گوارا نہ کرسکیں گے

اسی طرح وہ دن رات سوچا کرتی ــــ اور اپنی افلاس زدہ زندگی پر آنسو بہاتی۔

آخر وہ دن بھی گذر گیا ــــ جب سرلا کو اس کے دام چکانے پڑے ــــ ایک دکھیا کی عصمت سے ــــ حسن کے پھول جیسی صباحت سے ــــ جس کا لوگ گمان تک نہ کرسکتے تھے۔ افلاس نے اُسے کھوٹے داموں لٹا دیا۔ اور یوں ہی لٹاتا رہا ــــ حتیٰ کہ سرلا اس زندگی سے تنگ آگئی اور اُس نے سندر سے رحم کی بھیک مانگتے ہوئے کہا۔ یا تو تم مجھے اب مرجانے دو ــــ یا میرے عریاں جسم کو اپنی چادر سے ڈھک لینے دو ــــ سندر نے سماج کی اوٹ لی ــــ وہ نیچ ذات اور غریب عورت کو اپنا کیسے بنا سکتا تھا ــــ جس چیز کی اُسے خواہش تھی ــــ اس سے تو آسودہ ہو چکا تھا اب اس چوسے ہوئے پھول پر سے اُسے صرف اُڑنا باقی رہ گیا تھا ایک دن وہ یہ بھی کر گذرا۔

ایک شام تھی اور بالکل اداس ــــ سرلا گھانس پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ غم کے آنسو عصمت کے آنسو ــــ پھول کا رس خشک ہوچکا ــــ اور پژمردہ پھول زندگی کے سرد جھونکے سے مل کر تھرتھرا رہا تھا۔ سندر اسی راستہ سے گذرتا ــــ اپنی قیمتی اور خوبصورت فٹن میں بیٹھ کر اپنی حسین اور نئی بیوی کو ساتھ لے کر سرلا کو دیکھتا اور مسکراتا۔ یہ اسکی عریاں عصمت کی تضحیک تھی۔ جسے سندر کی آنکھوں سے دنیا کی کوئی چیز ڈھاک نہیں سکتی تھی۔ جب وہ سندر کو دیکھتی تو آنسو بہاتی اور رو دیتی۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ بالکل عریاں کھڑی ہے۔ اور سندر اس کے عریاں جسم پر تھوک رہا ہے ــــ وہ پھول جسے کسی کو سونگھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی ــــ آج اس پر تھوکا جاتا تھا ــــ عصمت کا درخت کٹ گیا تھا ــــ اور رنگین حسن دھوپ میں کملا رہا تھا ــــ اب سندر کے پیسے بھی نہ تھے۔ وہی غربت و افلاس بھری زندگی تھی۔ چار دن کے سکھ کیلئے وہ کیسی لوٹی گئی۔

دوسرا باب

از جناب عبدالکریم صاحب آزاد بھاگلپوری

غریب سرلا اب کچھ سے کچھ ہوگئی تھی ــــ اسکی سیاہ آنکھیں دھنس گئی تھیں اس کے سرخ گال زرد پڑ گئے تھے۔ وہ من ہی من میں کچھ بڑبڑاتی رہتی۔ آنکھوں سے آنسو بہاتی۔ مندر کے بڑے بت کے سامنے گردن جھکائے اپنے گناہ کی معافی مانگا کرتی۔ سندر کا تخیل اس کے دل میں کانٹے کی پھانس جیسا چبھتا وہ اس بیوفا کس سے انتقام لینے کی متمنی تھی۔ جو اب کسی دوسرے پھول پر اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔

دیو نندر کلکتہ سے کافی روپے کما کر آیا۔ اسکی بتتا تھا ہمیشہ یہی رہی تھی کہ خوبصورت سرلا اسکی ہو۔ حسین سرلا اسکو چاہتی۔ اسکی خاطر وہ سب کچھ کرنے کو تیار رہتا۔ وہ دولت جمع کر رہا تھا۔ صرف اس لئے کہ شاید اس کے ذریعہ بھی وہ سرلا کو حاصل کرسکے ــــ مگر سرلا کیلئے

اب روپیہ سکے کی چمک میں وہ کشش باقی نہ رہی تھی سنہرے زیور کی لالچ میں کسی کی زینت پہلو ہونے کا خواب اس نے بھلا دیا تھا امیروں کی سربفلک عمارتوں سے اُسے جھونپڑی اچھی معلوم ہوتی تھی —— دولت کے ظلم نے اب اُسے بتلا دیا تھا کہ وہ ہمیشہ اُس سے نفرت کرے۔ اور خود کو کسی غریب کی گود میں کھو دے —— جو اس کا قدرداں ہو جو اُسے فراموش نہ کرے جو اسکی سیہ کاریوں پر پردہ ڈال دے۔

دیوندر جب کلکتہ سے واپس آیا۔ تو اس نے سرلا سے پھر محبت کی التجائیں کیں۔ دل کی آہوں سے آنکھ کے آنسوؤں سے۔ مگر سرلا نے اسے نفی میں جواب دیا۔ کیونکہ وہ ڈرتی تھی کچھ تو مردوں کے جھوٹے عہد محبت سے کچھ اپنے کئے پاپ سے اسی نفی نے دیوندر کی امید کو شکستہ کردیا اسکی زندگی ویران ہوگئی۔ وہ دنیا کو بھول گیا۔ دیوانہ کی طرح نرکٹ کی بانسری بجا بجا کر وہ ہردے سے آنسو بہاتا۔ سرلا کی یاد میں سرلا کے عشق میں۔ سرلا جب پوجا پاٹ کے لئے مندر میں جاتی۔ تو صبح کی نمناک فضا میں مندر کے پیچھے سے دیوندر کی درد بھری بانسری رو رو کر اسے اپنی پریم کتھا سناتی۔ اور اسکی جیون کو کپکپا دیتی اُسے محسوس ہوتا کہ سری کرشن کی بانسری اسکی کثیف روح کو جگائے جا رہی ہو کیا دیوندر سچ مچ مجھ سے پریم کرتا ہے؟ کیا اس کی محبت سندر کی محبت سے مختلف ہے؟ وہ جیسے جیسے اسکو سوچتی اُسے دیوندر کے سچے پریم کا یقین ہوتا جاتا حتی کہ ایک دن وہ بھی آیا جب سرلا کی محبت میں اس امیرزادی کو بھی دیوندر نے تیاگ دیا جس سے اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اور وہ خود کو دنیا سے جدا کر بیٹھا سرلا کا یقین محبت اب کامل ہوگیا۔ مگر اسکی روح و ضمیر بے جان بن گئی۔ خشک پتے کے مانند جو شاخ میں تھر تھر کانپتا ہو وہ اپنے کو کپکپاتی وہ جب تصور کی آنکھوں سے اپنی عریاں زندگی کا نقشہ دیکھتی وہ جب اپنی عصمت کو کثیف اور میلا پاتی تو دیوندر کی پاکیزگی اور عظمت کا احساس اُس کے دل میں بڑھتا جاتا۔ وہ اپنی جیون کا سکھ اسی میں محسوس کرتی کہ وہ اپنے ناپاک وجود سے ہمیشہ کے لئے اس دھرتی ماتا کو خالی کردے۔

ایک شام تھی اور برسات کی شام سرلا دنیا سے بچھڑنے کیلئے اپنے پریم دیوتا کو اپنی گندگی سے دور رکھنے کیلئے اپنے جسم کو دریا کے سپرد کرگئی۔ مگر قدرت کو ابھی اسکی موت منظور نہ تھی بلکہ اسے سندر کے گناہ کی سزا دکھلانا مقصود تھا دیوندر نے اسے دریا میں کود کر اپنی آغوش محبت میں لے لیا۔ اور دونوں پریم کی جیون میں کامیاب ہوگئے۔

جہانِ اسلام ۔

نوخیز عراق

اور

اس کا پہلا بحری بیڑہ

از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کیٹلاگر اورینٹل لائبریری ۔ پٹنہ

جنگ عظیم کے بعد ترکوں کے پنجۂ اقتدار سے الگ ہونے پر عربی ملکوں کو جن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا وہ باخبر طبقہ سے پوشیدہ نہیں۔ شریف حسین بن علی کی مجوزہ عربی شہنشاہیت کا علاقہ چھوٹی چھوٹی نیم خود مختار ریاستوں میں بٹ گیا۔ شرق اردن[1] کا علاقہ امیر عبداللہ کے زیر نگیں کیا گیا۔ تو عملی دخل شاطران فرنگ ہی کا رہا۔ فلسطین پر برطانوی اقتدار کے ساتھ ساتھ صیہونیت کا عذاب مسلط ہو گیا۔ شام جس کی آبادی پچاس لاکھ بھی نہیں ہوگی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جمہوریہ لبنان، جبل الدروز، بلاد العلویین، لاذقیہ اور سوریہ کے نام سے پانچ حکومتیں فرانس کے زیر اثر قائم ہوئیں۔ اور آخری زخم یہ لگا کہ سکندرونہ کا خالص عربی علاقہ اصل باشندوں کی مرضی کے خلاف اور ان کے مسلسل احتجاج کے باوجود ترکوں کے حوالہ کر دیا گیا۔ جہاں آج مسلمانوں اور عربوں پر چنگیزی روح مسلط کی جا رہی ہے۔

کہنا یہ ہے کہ جنگ عظیم کے بعد عربوں کے حصہ میں انتشار اور مصیبتوں کے سوا کچھ نہ آیا۔ تمام سابق عثمانی مقبوضات کے حصے بخرے ہوگئے سارے علاقہ میں اگر کہیں بیداری اور زندگی کے ساتھ ذرا سکون اور اطمینان کے آثار آتے ہیں۔ تو وہ عراق ہے۔ یہ خیال نہ ہو کہ عراق کو یہ سکون و اطمینان کچھ غیروں کی نوازش سے میسر آیا ہے۔ بلکہ یہ سرا سر ان کی شجاعت و وحدت اور ان کے آزمودہ کار سرگروہ امیر فیصل بن شریف حسین کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جنگ عظیم کے بعد پہلے پہل امیر فیصل کو دمشق کا تخت و تاج عطا ہوا اور وہ شاہانہ کروفر کے ساتھ بنو امیہ کے دارالسلطنت میں منصب حکومت پر متمکن ہوئے۔ لیکن دمشق فرانس کے حصہ میں پڑ چکا تھا۔ جنرل گورو اسی ہزار فوج کے ساتھ دمشق داخل ہوا اور میسلون کے مقام پر یوسف العظمہ کی سرکردگی میں شام کے ہونہار و سجیلے جوان جو جان سفاک کی خون آشامیوں سے بچ رہے تھے کام آئے۔ گورو فاتحانہ داخل ہوا۔ امیر فیصل نے عراق میں قسمت آزمائی کی۔ نصیب نے یاوری کی۔ خود انگریز بھی عراقیوں کی مسلسل چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ گئے تھے۔ امیر فیصل کی بادشاہی مان لی گئی۔ سرکار برطانیہ اور عراق کے باشندے دونوں مطمئن ہو گئے۔

شاہ فیصل نے حکومت کچھ اس ڈھب سے کی کہ شاطر برطانیہ بھی رام رہا اور رعایا بھی خوش رہی۔ انگریزی سرکار سے پے بہ پے معاہدے

---

۱ مضمون .... انتیس ۳۹ء کی ایک خبر سے چار جنگی جہازوں کے نام لئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے ذاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

۲ اسکندرونہ .... سے عدن کے ساحل تک ایک قومی عربی حکومت (عرب امپائر)۔ الامبراطوریۃ العربیۃ) کا خواب اسے دکھایا گیا تھا۔

۳ جنگ عظیم سے پہلے یہ فلسطین میں شامل تھا۔ اب نہر اردن سے پورب کا حصہ شرق اردن کہا جاتا ہے۔

۴ عربی تحریک کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ملاحظہ ہو:

(۱) لوتھراپ اسٹاڈرڈ: دی نیو ورلڈ آف اسلام (اردو ترجمہ از جمیل احمد بدایونی)

(۲) زکی علی: اسلام ان دی ورلڈ

(۳) مسعود عالم ندوی: عربوں کی قومی تحریک۔ مندرجہ مدینہ جولائی ۳۷ء

(۴) ״ ״ : دنیائے اسلام ״ : معارف ״ ۳۹ء

عربی جاننے والوں کے لئے حاضر العالم الاسلامی ترجمہ شکیب ارسلان ، الثورۃ العربیۃ الکبریٰ (امین سعید) بہت کافی ہے

ہوئے تا آنکہ ۱۹۳۱ء کے معاہدہ کی رو سے عراق کی آزادی باضابطہ تسلیم کرلی گئی، عراق مجلس اقوام کا ممبر ہوا۔ عراقیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ فوجی بھرتی جبری قرار پائی۔ تعلیم بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگی، پوری قوم شراب حیات سے پرکیف نظر آنے لگی۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا کہ برات کا دولہا چل بسا۔ شاہ فیصل نے وطن سے دور، جان جانِ آفریں کو سپرد کی (سوئزرلینڈ ۱۹۳۳ء) باغبان کا تمناؤں بھرا دل باغ کو ہرا بھرا نہ دیکھ سکا۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ جو اس سال غازی تخت و تاج کی زینت بنا۔ حکومت کا کاروبار اپنے حال پر قائم رہا، نئے نئے منصوبے بنے اور عملی جامہ پہن کر باشندوں کے فلاح و بہبود کا باعث ہوئے۔ زمانہ نے ایک اور کروٹ لی۔ عراقیوں کی امیدوں اور آرزوں کا مرکز غازی بھی گذشتہ سال اپنے باپ سے جا ملا۔ اور آج تخت عراق پر ننھا فیصل (ثانی) اپنے دادا کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

اس دوران میں مختلف وزارتیں بنیں اور بگڑیں۔ کبھی یسین ہاشمی مرحوم اور جعفر عسکری کا دور دورہ رہا، تو کبھی سلیمان حکمت اور بکر صدقی کا، اور آج پھر شاہ فیصل کا دست راست نوری سعید عراق کی سیاست کا پشتیبان ہے۔ مگر ان وزارتوں کی آمد و رفت کا ملک کی خوشحالی اور آئندہ کے منصوبوں پر کوئی اثر نہ پڑا۔ تمام کام بنے بنائے پروگرام کے مطابق چلتے رہے اور چل رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج عراق کو اپنی معمولی آبادی اور حقیر ذرائع کے باوجود فوجی لحاظ سے مصر پر برتری حاصل ہے۔

عراق اس وقت عربی تحریک اور اتحاد عرب کی آرزوں کا محور ہے یہاں کی ہر چیز "عربیت" لئے ہوئے ہے۔ مصر میں آپ کو بنکوں اور بڑی دوکانوں پر تختے فرانسیسی زبان میں لکھے نظر آئیں گے، عراق میں صرف عربی کا چلن ہے۔ مصر میں فوجی روح مفقود تھی اب کچھ ابھر رہی ہے۔ عراق کا بچہ بچہ امنگوں سے معمور اور سپاہیانہ جذبہ رکھتا ہے۔ مصر میں باایں ہمہ کبھی کبھی طہٰ حسین جیسے قلب و نظر کے اندھوں کی زبانی "فرعونیت"[1] کی صدا سنائی دیگی عراق میں یہ بیہودگیاں نہیں۔

یوں تو عراق کی "عربیت" ہر چیز سے نمایاں ہے۔ پر عراق کے جنگی جہازوں کے نام سن کر آپ بھی داد دیں گے اور اس جذبہ کی تعریف کریں گے۔ شاہ فیصل مرحوم نے اول ہی روز یہ محسوس کر لیا تھا کہ ایک طاقت ور بحری بیڑہ کے بغیر خلیج فارس میں عراق کی پوزیشن مستحکم نہیں ہو سکتی۔ پر بے وقت اور ناگہانی موت کے باعث وہ اپنی آنکھوں سے اپنے خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکے۔ قدرت کو کچھ ایسا منظور تھا کہ شاہ غازی کے زمانہ میں بھی یہ تجویز مکمل نہ ہو سکی۔ آخر ننھے فیصل (ثانی) کے دور حکومت میں فیصل اول کے شیریں خواب کی تعبیر نظر آئی۔ اور چار جنگی جہازوں کا پہلا بحری بیڑہ عباسیہ کے دارالحکومت کے سامنے دجلہ کی موجوں سے ہمکنار ہوا (رجب ۱۳۵۹ھ)[3]۔ جماعت فتوۃ[2] کے نوجوانوں نے پرجوش نعروں سے استقبال کیا۔ جہازوں نے جواب میں ہارون الرشید کے محبوب شہر کو اکیس توپوں کی سلامی دی۔ بغداد کی چھاؤنی نے بھی اظہار محبت کے طور پر گیارہ توپوں کی سلامی پیش کی۔

تادیٔ زوال و انحطاط کے اس دور میں یہ عربوں کا پہلا بحری بیڑہ ہے، یہ کل چار جنگی جہازوں سے مرکب ہے جن کے نام یہ ہیں:۔

(۱) الجاسی: عبداللہ بن قیس الجاسی جنہوں نے ۲۸ھ میں جزیرہ قبرص فتح کیا۔ مصر اور شام کی فتح کے بعد یہ مسلمانوں کی دنیا میں پہلی بحری فتح تھی۔ یہ فتح حضرت عثمانؓ کے عہد میں ہوئی، حضرت عمرؓ نے امیر معاویہؓ کے پیہم اصرار کے باوجود بحری حملہ کی اجازت نہیں دی۔ انکی وفات کے بعد حضرت عثمانؓ نے اجازت دی اور ممتاز صحابہ کی معیت میں عبداللہ بن قیس حاکم ہو کر روانہ ہوئے اور مظفر و کامران رہے دشمنوں نے دب کر صلح کی اس کے بعد جاسی نے کوئی پچاس بحری حملے کئے اور ہمیشہ کامیاب رہے۔ (ابن خلدون جلد ۲ حصہ ۲ ص ۱۔ ۱۲۰ مطبوعہ مصر)

نیز ملاحظہ ہو مقدمہ ابن خلدون: باب قیادۃ الاساطیل اور طبری: حوادث ۲۸ھ۔ حضرت عمرؓ کے متعلق یہ غلط فہمی نہ ہو کہ وہ سمندر سے ڈرتے تھے علاء حضرمی نے ایران پر جو بحرین کی راہ سے بحری حملہ کیا تھا اور ناکام رہے (طبری: حوادث ۱۸ھ) اس لئے فاروق اعظم بحری حملہ کی اجازت

---

[1] مصر میں فرعونیت کی تحریک کبھی بہت زوروں پر تھی، جیسے آج ہندوستان میں پراچین بھارت کی احیا کی تحریک اندھا دھند چل رہی ہے اسی طرح کچھ پہلے مصر میں بھی فرعونی دور پر فخر کیا جاتا تھا اور عام عربی ادب سے الگ مصری ادب ڈھالنے کی کوشش کی جا رہی تھی الحمدللہ کہ اب یہ تحریک جان توڑ رہی ہے۔

[2] فتوۃ ایک فوجی تحریک ہے جو کم و بیش نازی تحریک کے نمونہ پر چل رہی تھی عہد نامہ ہو وطن اور قوم کی خدمت پر زور دے۔

[3] الفتح (مصر) ۳۱۹ میں غالباً غلطی سے ۱۳۵۸ھ چھپ گیا ہے

دینے میں مشاغل تھے۔

(ملاحظہ ہو: عربوں کی جہاز رانی[1] از علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ) (الضیا رجمادی الاخری ۱۳۵۳ھ)

(۲) جنادۃ: جنادہ بن امیۃ الازدی، اس مشہور اسلامی بیڑے کے کپتان جس نے ۵۳ھ میں جزیرہ رودس فتح کیا۔ جنادہ مشہور تابعی اور حدیث کے راویوں میں ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ سے روایت کی۔ ۸۰ھ میں وفات پائی۔

(جنادہ کے بحری کارناموں کے لئے ملاحظہ ہو: بلاذری: باب فتوح الجزائر)

(۳) عبدالرحمٰن: عبدالرحمٰن بن حبیب گورنر افریقیہ جنھوں نے صقلیہ پر نہایت کامیاب حملہ کیا اور مظفر و منصور لوٹے (۱۳۵ھ)

(تاریخ صقلیہ از سید ریاست علی ندوی۔ ج ---) ابن خلدون ج ۳ ص ۲۰۲)

(۴) ذات الصواریؓ: ذات الصواری، اس مشہور بحری معرکہ کا نام ہے، جو ۳۱ھ میں، عرب اور روم کے درمیان، فنکس پہاڑی کے سامنے وقوع پذیر ہوا تھا۔ اہل فرنگ اسے معرکہ فنلکس ہی کہتے ہیں۔ رومیوں کا قائد خود ہرقل کا بیٹا قسطنطین تھا، جس کا بیڑہ عربوں نے زیر و زبر کر دیا تھا تا آنکہ اس نے روم کے پائے تخت (قسطنطنیہ) میں پناہ لی۔

صاری کشتی کے پتوار کو کہتے ہیں۔ (الدقل الذی ینصب فی وسط السفینۃ۔ لسان العرب و تاج العروس) اسکی جمع صواری آتی ہے اس جنگ میں کشتیوں کے لنگر ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دئے گئے تھے کہ جم کر لڑ سکیں (رومیوں نے بھی کشتیاں اسی طرح اکٹھی کرلی تھیں) اسی لئے عربوں کے ہاں اس معرکہ کا نام ذات الصواری پڑ گیا (طبری: حوادث ۳۱ھ) ابن خلدون کہتا ہے کہ سواری کی کثرت کے باعث عبداللہ بن ابی سرح سپہ سالار نے اس جگہ اور معرکہ کا نام ذات الصواری رکھ دیا (ابن خلدون" جلد دوم حصہ دوم ص ۱۳۰) مطبوعہ مصر۔

طبری کی روایت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

ان ناموں سے آپ کو عراق کی امنگوں اور عربی نخوت و غیرت کا کچھ اندازہ ہوسکے گا۔

آج جبکہ قوت کا دیوتا غیظ و غضب میں ہے یہ مسکین چار جہاز کس شمار میں ہیں؟ پر ان کے نام بڑے ہیں، شاید کہ دن پلٹ آئیں اور بقول استاذ الاستاذ حضرت مولانا شبلی مرحوم و مغفور:-

عجب کیا ہے یہ بیڑہ غرق ہوکر پھر اچھل آئے　　کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

مولانا مرحوم کا شعر خود بخود زبان قلم پر آگیا، اسلامیت کے تفوق کا یہ بیڑا غرق ہوکر پھر نئے سرے سے سمندر کی گود میں اچھل کر آیا ہے۔ دعا ہے کہ ساحل مراد تک بخیر و خوبی پہنچے۔

---

[1] اس وقت اصل اردو پیش نظر نہیں عربی ترجمہ عاجز کے قلم سے "الضیا" میں مسلسل شائع ہوا تھا، مجبوری میں اس کا حوالہ دیا گیا [2] الفتح ۶۶۹ میں "ات الطلوی (سین سے) چھپ گیا ہے جو صحیح نہیں [3] الفتح ۶۶۹ میں ۲۱ھ درج ہے جو غالباً مطبع کی چوک ہے [4] تفصیل کیلئے دیکھو طبری حوادث ۳۱ھ طبع یورپ سلسلہ جلد اول ص ۲۸۶۵-۲۸۷۰

مصر کی نئی سیاسی تشکیل

(از جناب منصور کاکوی)

امریکہ کی جنگ آزادی کے بعد برطانی حکومت کی تمام تر توجہ مصر اور ہندوستان کی طرف رہی، یوں بھی سیاسی حیثیت سے مصر ایک خاص اہمیت رکھتا ہے - امریکہ اور ہندوستان کی طرح مصر کے بازار میں بھی ایک عرصہ تک فرانس اور انگلینڈ میں چھیڑ چھاڑ اور کشمکش رہی مصر کو ایشیا کی کنجی کہا جاتا ہے اور یہ بالکل درست ہے - یورپ کی سیاسیات میں "مشرقی مسئلہ" (Eastern Question) صرف ترکی سلطنت کو ختم کرنے کے لئے ایجاد کیا گیا تھا، یہ وہ وقت تھا جب کہ ترکی کی وسیع سلطنت آپس کی نااتفاقی، حکمرانوں کی نااہلی اور صدیوں کی مسلسل جنگوں کی وجہ سے دم توڑ رہی تھی اور یورپ کے گرگ باراں دیدہ موقع کے منتظر تھے جب مرکزی سلطنت کمزور ہوگئی تو ماتحت صوبے خودمختار ہوتے گئے، مصر کا گورنر محمد علی برائے نام سلطان ترکی کا باجگذار رہ گیا -

سنہ۱۸۲۱ء میں یونانیوں نے سر اٹھایا، روس، فرانس اور انگلینڈ ان کی امداد کر رہے تھے - گرچہ محمد علی پاشا نے سلطان کی مدد بھی کی لیکن سنہ۱۸۲۷ء میں انگریزی اور فرانسیسی بیڑے نے ترکی بیڑے کو نوارینو (Navarino) میں شکست دیکر سلطان کو یونان کی آزادی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہیں سے مصر میں فرانسیسی اور انگریزی اقتدار کی ابتدا ہوتی ہے - محمد علی پاشا کا انتقال سنہ۱۸۴۸ء میں ہوا، اس نے اپنے دور میں جدید تعلیم کو رواج دینے کی کوشش کی، طلبہ کی ایک بڑی تعداد فرانس تعلیم کے لئے بھیجی گئی - نئے مدرسے قایم کئے گئے اور اصلاحات نافذ ہوئیں - محمد علی کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل جانشین ہوا۔ بیٹے نے باپ کی پیروی کی، مصر میں نظم و نسق حکومت کی پھر سے تنظیم کی - محمد علی کے بنائے ہوئے فوجی اسکول کو از سر نو جاری کیا، جنگی گھر تعمیر کیا - اور اور بہت سے تعلیمی ادارے بنائے، ریلوے لائن کی توسیع کی اور نہر سویز کے کنارے بندرگاہ تعمیر کی گئی، ان تمام اسکیموں کے لئے کثیر رقم کی ضرورت تھی، اس کے علاوہ وہ خود بھی بڑا فضول خرچ تھا اور مصر کا خزانہ خالی، روپیہ کی صرف ایک صورت تھی اور وہ قرض، دھڑا دھڑ فرانس اور انگلینڈ سے قرض لینا شروع کیا - جب یہ بھی ناکافی ہوا تو سویز کمپنی کے حصے کو فروخت کر دیا۔

"ڈزرائلی" اس وقت برطانیہ کا وزیر اعظم تھا، اس نے وزارت کے ممبروں سے مشورہ کئے بغیر خدیو کے ۱۷۶۶۰۲ حصے ۳۹،۶۵۸۲ پونڈ میں خرید لیئے - پھر بھی مصر کی مالی حالت خراب ہوتی گئی - جب فرانس اور انگلینڈ کا لگا ہوا سرمایہ ڈوبتا نظر آیا تو اسمٰعیل پاشا کو ایک آئینی وزارت بنانے پر مجبور کیا گیا، ایک انگریز مشیر مالیات مقرر ہوا - اور ایک فرانسیسی امور عامہ کا انچارج، لیکن چند ہی مہینوں کے بعد اسمٰعیل کی سازش سے وزارت ٹوٹ گئی، سازش کا پتہ لگ گیا اور اسمٰعیل کو معزول کر کے اس کے لڑکے توفیق کو سلطان بنایا گیا - پھر نومبر سنہ۱۸۷۹ء میں ایک دہری (Dual) حکومت قایم کی گئی، انگریزی اور فرانسیسی اقتدار مصر کے باشندوں کے لئے ناقابل برداشت تھا، بیرونی اثرات کے خلاف لوگوں میں نفرت و عداوت کا جذبہ پیدا ہونے لگا - اس وقت مصر سید جمال الدین افغانی کی سرگرمیوں کا مرکز تھا - گو توفیق کی ایما سے انہیں مصر چھوڑنا پڑا - لیکن ان کا لگایا ہوا پودا آخر نخل بار آور ثابت ہوا۔ مصر کی سیاسی بیداری جمال الدین افغانی کی شرمندۂ احسان ہے - تمام قابل ذکر سیاسی رہنما ان کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد تھے، پان اسلامیزم کی تحریک نے آگ پر تیل کا کام کیا اور ملک میں غیر ملکی اقتدار کے خلاف جدو جہد شروع ہوگئی - احمد عرابی پاشا اس تحریک کا قائد تھا - عرابی ایک معمولی کسان کے گھر پیدا ہوا تھا لیکن اپنی غیر معمولی صلاحیت اور لیاقت سے وزیر جنگ کے عہدے تک پہنچ گیا - عوام نے بھی اس تحریک کو لبیک کہا، عرابی پاشا اور انگریزی فوج میں کھلی ہوئی جنگ ہوئی - خدیو نے فرار ہو کر اسکندریہ میں جان بچائی - برطانیہ نے ترکی اور فرانس سے اس شورش کو دبانے کے لئے امداد طلب کی، لیکن دونوں کے انکار کرنے پر اس مہم کو سر کرنے کی ذمہ داری خود اس نے اپنے سر لی - سر گارنٹ وولزلی کے ماتحت ایک فوج بھیجی گئی، عرابی پاشا کو گرفتار کر کے جلا وطن کر دیا گیا - اور لارڈ ڈفرن کو جو قسطنطنیہ میں برطانی سفیر تھا - ہائی کمشنر بنا کر مصر بھیجا گیا - جب

شورش ختم ہوگئی تو خدیو اسکندریہ سے واپس آیا اور شریف پاشا نے وزارت ترتیب دی۔ ۱۸۸۲ء کے بعد سے مصر پر برطانیہ کا پنجہ سخت سے سخت تر ہوتا گیا۔ یہ زمانہ یورپ میں بسمارک کے عروج کا تھا۔ جرمنی کی بڑھتی ہوئی طاقت فرانس اور انگلستان کے لئے ایک مستقل خطرہ بنی ہوئی تھی۔ اس لئے انگلستان اور فرانس جرمنی کے خلاف ایک متحدہ محاذ کی سخت ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ آخر ۱۹۰۴ء میں دونوں ملکوں میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے فرانس نے برطانیہ کو مصر میں اور برطانیہ نے فرانس کو مراکش میں بالکل آزاد چھوڑ دیا۔

قومی تحریک

لیکن قومی تحریک کی جو آگ برسوں قبل سلگ چکی تھی اور جو ایک بار ۱۸۸۲ء میں بھڑک بھی اٹھی تھی اندر ہی اندر بڑھتی گئی اور ۱۹۰۵ء میں مصطفےٰ کامل کی قیادت میں جدوجہد شروع ہوگئی۔ اخبار اور پلیٹ فارم دونوں سے اس تحریک کی آواز بلند ہونے لگی۔ جزیرہ نما سینائی کے بدوؤں نے بھی کچھ ہنگامہ کیا لیکن ان کو بھی سختی سے دبا دیا گیا۔ ۱۹۰۸ء میں مصطفےٰ کامل کی موت سے قومی تحریک میں پھوٹ پڑ گئی۔ اسی سال ہی فہمی پاشا پھر بطرس پاشا نے وزارت بنائی۔ بطرس پاشا کے خلاف نفرت اور حقارت کا جذبہ اتنا بڑھ گیا کہ وزارت قائم کرنے کے تیسرے دن اس کو قتل کر دیا گیا۔ اور محمد سعید پاشا وزیر اعظم ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں لارڈ کچنر کو مصر بھیجا گیا اور مجلس قانون ساز کو پھر سے ترتیب دیا گیا، اس سے پہلے دو ایوان تھے لیکن ابھی دونوں کو ایک کر دیا گیا۔ ممبروں کی کل تعداد ۸۳ رکھی گئی جس میں ۶۶ عوام کے منتخب کردہ اور ۱۷ حکومت کے نامزد کئے ہوئے تھے۔ ایوان کے صدر اور نائب صدر کی نامزدگی کا اختیار بھی حکومت کو تھا، انتظام سلطنت کی اصلاح اور کسانوں کو سود خواروں سے نجات دلانے کی کوشش بھی کی گئی لیکن قومی تحریک جو شروع ہو چکی تھی وہ بڑھتی ہی گئی۔ اس درمیان میں خدیو مصر، وزیر اعظم اور لارڈ کچنر کو قتل کرنے کی سازش کی گئی لیکن قبل از وقت اس کا پتہ لگ گیا اور سازش ناکامیاب رہی، نئے دستور کے مطابق جو اسمبلی بنی اس کے صدر سعد زاغلول پاشا ہوئے لیکن یہ دستور خدیو کو بالکل ناپسند تھا اسلئے انہوں نے ایسی سازش کی کہ زاغلول پاشا کو مستعفی ہونا پڑا زاغلول پاشا کے بعد حسین رشدی نے قلمدان وزارت سنبھالا، لیکن تحریک آزادی جاری رہی، ساتھ ساتھ وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں یہاں تک کہ جنگ عظیم شروع ہوگئی اور مصر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

جنگ عظیم اور برطانی انتداب

جب جنگ عظیم شروع ہوگئی تو لارڈ کچنر کو مصر سے واپس بلا کر وزیر جنگ بنایا گیا، جنگ شروع ہونے کے قبل خدیو مصر عباس حلمی روم قسطنطنیہ گیا ہوا تھا۔ مصر کی اسمبلی توڑ دی گئی اور ۱۸ دسمبر ۱۹۱۶ء کو حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ ——— ترکی کے اقدام سے جو صورت حال پیدا ہوگئی ہے اس کے پیش نظر اب سے مصر برطانیہ انتداب میں رہے گا۔ ترکی کا اقتدار ختم ہوگیا اور ملک معظم کی حکومت مصر اس کے مفاد اور اس کے باشندوں کی جان و مال کی حفاظت کے لئے تمام ضروری کارروائی کریگی۔

۱۸۸۲ء کے قریب مسٹر گلیڈ اسٹون نے اعلان کیا تھا کہ برطانیہ کے عزائم ہرگز یہ نہیں ہیں کہ مصر کو اپنی سیادت میں لیا جائے لیکن ۱۹۱۴ء میں بالکل اس کے خلاف کام کیا گیا اور مصر کو برطانیہ کی محافظت میں لے لیا گیا، اس اعلان کے دوسرے ہی دن خدیو عباس حلمی کو معزول کر کے شاہزادہ حسین کامل کو خدیو مصر بنایا گیا۔ حسین کامل کی حکومت بہت کم دنوں رہی، ان کے بعد فواد تخت نشین ہوئے جو ۱۹۳۶ء کے اوائل تک حکمران رہے۔ مصر کے ہائی کمشنر میکموہن مقرر ہوئے اور ان کے ہاتھ میں مصر کے خارجی معاملات کا چارج دیا گیا۔ برطانیہ کی اس کارروائی سے تحریک آزادی کی شدت اور بڑھ گئی، طلبہ نے بھی اس میں خوب حصہ لیا، سر میکموہن کے بعد سر ریجنالڈ ونگیٹ ہائی کمشنر ہو کر مصر آئے۔ صلح نامہ ورسائی کے وقت امریکہ کے صدر مسٹر ولسن نے جو اصول (Self - deter-mination) مرتب کئے تھے، اس کا اثر مصر کے لئے بہت دور رس تھا اس اصول کے مطابق ہر ملک کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ آپ کرے، لیکن اس کے باوجود عراق، فلسطین اور مصر پر برطانیہ کا، مراکش اور شام پر فرانس کا انتداب قائم ہوگیا۔ اور (Self determination) کا اصول دھرا کا دھرا رہ گیا۔ لیکن مصر کی تحریک آزادی بڑھتی ہی گئی۔ سعد زاغلول پاشا نے

"وفد" کی صورت میں لندن جاکر اپنے مطالبہ کو پیش کرنے کی اجازت طلب کی لیکن حکومت نے اجازت نہ دی، اس پر وزارت نے استعفے داخل کر دیا۔ 'وفد' کی (وطنی) تحریک اتنا زور پکڑ گئی کہ مارشل لا جاری کرنا پڑا۔ زاغلول پاشا کو تین جان نثار ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کرکے ۱۹۱۹ء میں مالٹا بھیج دیا گیا۔ قاہرہ میں مظاہرے ہوئے، جلسے کئے اور جلوس نکالے گئے، سپاہیوں پر حملہ کیا گیا۔ ریلوے لائن اکھاڑ دی گئی، تار برقی کے ستون کاٹ دئے گئے۔ دیروت اسٹیشن پر ایک انگریز انسپکٹر اور چند دوسرے فوجی افسروں کو دن دھاڑے گاڑی میں قتل کر دیا گیا۔ پورے ملک میں تحریک بجلی کی لہر کی طرح پھیل گئی۔ جامعہ ازہر کے طلبہ نے بھی خوب خوب حصہ لیا، اس شورش کو دبانے کے لئے لارڈ النبی کو فرانس سے ہائی کمشنر بنا کر مصر بھیجا گیا۔ زاغلول پاشا اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہا کر دئے گئے۔ برطانی حکومت نے اس ہنگامہ اور شورش کے اسباب معلوم کرنے کے لئے لارڈ ملز کی سرکردگی میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا، کمیشن کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی رائے دے کہ مصر کے لئے کون سا دستور بہتر ہوگا۔ لیکن مصر میں اس کمیشن کی سخت مخالفت ہوئی اور کمیشن کے ممبروں کو جان کے لالے پڑ گئے اور ایک بار تو وزرا کو قتل کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ کمیشن جہاں گیا مکمل بائیکاٹ کیا گیا۔ اس پر برطانیہ نے مصالحت کا ہاتھ بڑھایا۔ سعد پاشا اپنے سات رفقاء کے ساتھ لندن آئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مصر کو آزاد کر دیا جائے لیکن سمجھوتہ کی گفتگو آگے نہ بڑھ سکی اور یہیں پر ختم ہوگئی۔ ۱۹۲۱ء میں عدلی پاشا کی پارٹی طاقتور تھی، برطانیہ نے اعلان کیا کہ ——

ملک معظم کی حکومت ملز رپورٹ کو پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ اب محافظت مصری برطانی تعلقات کے لئے تشفی بخش حل نہیں ہے۔ ملز کمیشن کی سفارشات کے متعلق ملک معظم کی حکومت ابھی کسی قطعی فیصلے پر نہیں پہنچی ہے، لیکن حکومت برطانیہ خدیو کے نامزد کئے ہوئے وفد سے گفتگو کرنا چاہتی ہے کہ انتداب کے بجائے کوئی ایسا دستور مرتب کیا جا سکے جو ایک طرف برطانی مفاد کی حفاظت کا ضامن اور دوسری طرف مصر کے باشندوں کے مطالبات پورا کرے۔ —— عدلی پاشا کی پارٹی مضبوط تھی، اس لئے انہوں نے وزارت بنائی، اور سعد پاشا کو اشتراک کی دعوت دی۔ قوم پرستوں نے نئی وزارت کی مخالفت کی، کئی مقامات پر ہنگامہ اور فساد برپا ہوا۔ جولائی ۱۹۲۱ء میں ایک مصری وفد لندن گیا، اس وفد کے رہنما عدلی پاشا تھے، عدلی پاشا نے مطالبہ کیا کہ برطانیہ اپنی فوج نہر سویز کے کنارے سے ہٹا لے، لیکن حکومت برطانیہ نے یہ شرط قبول نہ کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار پھر مصالحت کی گفتگو ناکامیاب ہوئی۔ عدلی پاشا لندن سے خالی ہاتھ مصر واپس آئے اور آکر استعفا داخل کر دیا۔ مصالحت نہ ہونے سے ملک میں قومی تحریک پھر زور پکڑ گئی، زاغلول پاشا اور دوسرے لوگوں کو گرفتار کرکے جلا وطن کر دیا گیا۔ قتل کے واقعات عام ہو گئے۔ اور قاہرہ کی حالت بہت نازک ہو گئی۔ لارڈ النبی ہاتھ میں اپنی سفارشات اور جیب میں اپنا استعفا لیکر لندن گئے۔ ۲۸ ر فروری ۱۹۲۲ء کو برطانیہ نے اعلان کیا کہ

(۱) مصر سے برطانی انتداب ختم ہوتا ہے اور مصر کی آزادی تسلیم کی جاتی ہے۔

(۲) حکومت مصر جب عام معافی کا اعلان کر دیگی تو مارشل لا ختم ہو جائے گا۔

(۳) جب تک دوستانہ گفتگو اور رائے سے کوئی بات طے نہ ہو اس وقت تک کے لئے حسب ذیل امور ملک معظم کی حکومت کیلئے مخصوص رہیں گے:-

الف۔ مصر میں حکومت برطانیہ کے ذرائع رسل و رسائل کی حفاظت۔

(ب) بیرونی حملے سے مصر کی حفاظت۔

(ج) اقلیت اور غیر ملکی باشندوں کا تحفظ۔

(د) جب تک کوئی فیصلہ نہ ہو سوڈان کی حیثیت علیٰ حالہ قایم رہیگی۔

گرچہ برطانیہ نے آئینی طور پر مصر کی آزادی تسلیم کر لی، لیکن یہ آزادی نام کی تھی (۱) نہر سویز کی حفاظت۔ (۲) غیر ملکی باشندوں کی حفاظت۔ (۳) ذرائع رسل و رسائل کی حفاظت۔ (۴) سوڈان پر برطانی قبضہ۔ اتنی حفاظتوں کے آگے مصر کی آزادی بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی۔

ابکی بار ثروت پاشا وزیر اعظم ہوئے۔ لیکن خدیو اور وزارت سے نہ بن سکی۔ ثروت پاشا کے بعد توفیق پاشا وزیر اعظم ہوئے، اسی زمانہ میں پھر تحریک شروع ہو گئی۔ تین مصری طالب العلموں نے پروفیسر تھیوبی۔ ر۔ ابسن کو مار ڈالا۔ توفیق پاشا چاہتے تھے کہ سب سے پہلے دستور کا اعلان کر دیا

جائے، اس پر خدیو سے مخالفت ہوگئی اور ان کو استعفیٰ دے دینا پڑا، مارچ ۱۹۲۳ء میں یحییٰ ابراہیم پاشا نے وزارت ترتیب دی اور اپریل ۱۹۲۳ء میں دستور کو مشتہر کر دیا۔

نئے دستور نے دو ایوان رکھے، ایک مجلس النواب (Chamber of Deputies) اور دوسرا مجلس الشیوخ (Senate) ہاؤس آف ڈیپوٹیز کے ارکان کی تعداد ۲۰۰ رکھی گئی اور اُن کا انتخاب پانچ سال کے لئے رکھا گیا۔ سینٹ کی ۲/۵ ممبر خدیو کے نامزد اور ۳/۵ منتخب رکھے گئے اور وزارت کو سینٹ کے سامنے جوابدہ قرار دیا گیا۔ اسی اثنا میں زاغلول پاشا کو مصر واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ ۱۹۲۴ء میں نئے دستور کے مطابق جو انتخاب ہوا اس میں وفد پارٹی کی شاندار فتح ہوئی۔ اور زاغلول پاشا پھر وزیر اعظم ہوئے۔ زاغلول پاشا نے کوشش کی کہ سوڈان کو مصر کی ملکیت تسلیم کر لیا جائے، لیکن یہ کوشش ناکامیاب رہی اور زاغلول پاشا نے استعفیٰ داخل کر دیا۔ زاغلول پاشا کی طاقت اور ہر دلعزیزی کے سامنے خدیو کو استعفیٰ منظور کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ زاغلول پاشا پر کسی نوجوان نے قاتلانہ حملہ کیا۔ گولی تو لگی، لیکن جان بچ گئی مگر صحت خراب ہوگئی اور وہ تبدیل آب و ہوا کے لئے یورپ چلے گئے۔
وزیر اعظم برطانیہ نے زاغلول پاشا کو لندن آنے کی پھر دعوت دی، چنانچہ زاغلول پاشا لندن گئے اور مصالحت کی گفتگو بھی کی لیکن اس بار پھر مصالحت نہ ہوسکی اور خالی ہاتھ مایوس واپس آئے۔ واپس آکر اپنا استعفیٰ داخل کر دیا۔ خدیو کو استعفیٰ قبول کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسی وقت سوڈان کے گورنر جنرل سر ـ لی ـ اسٹیک کو کسی شخص نے دن دھاڑے قاہرہ کی سڑک پر قتل کر ڈالا۔ اس واقعہ سے عجیب سنسنی پھیل گئی اور برطانیہ نے نہایت سختی سے مطالبہ کیا کہ ـــــ (۱) حکومت مصر غیر مشروط معافی طلب کرے۔ (۲) مجرموں کو قرار واقعی سزا دے۔ (۳) تمام سیاسی جلسے اور مظاہرے بند کر دے۔ (۴) ۵۰۰۰۰۰ پونڈ بطور تاوان ادا کرے۔ اور (۵) ۲۴ گھنٹے کے اندر تمام مصری فوج اور افسروں کو سوڈان سے واپس بلالے۔

حکومت مصر نے پہلی چار شرطوں کو تو مان لیا لیکن آخری شرط سے انکار کر دیا۔ اس پر حکومت برطانیہ بھی سختی کرنے پر اُتر آئی۔ مصری پارلیمنٹ نے مجلس اقوام سے برطانیہ کے جور و تعدی کے خلاف اپیل کی، لیکن یہ مجلس بھی تو برطانیہ کی تخلیق تھی ـــــ غرضکہ وہاں بھی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

اسی اثنا میں "اتحاد" نام کی ایک پارٹی وجود میں آئی۔ اس کا اصلی مقصد زاغلول پاشا کی طاقت کو توڑنا اور قصر شاہی کی طاقت کو بڑھانا تھا۔ در پردہ خود خدیو اس کی حمایت کر رہا تھا۔ جب ۱۹۲۵ء میں اسمبلی کا اجلاس ہوا تو زاغلول پاشا اور ایک سرکاری امیدوار اسمبلی کی صدارت کے لئے امیدوار کھڑے ہوئے جس کا نتیجہ زاغلول پاشا کے حسب خواہ نکلا اور سرکاری امیدوار کو اپنے منہ کی کھانی پڑی۔ وزیر اعظم زیوار پاشا نے خدیو کو اسمبلی توڑ دینے کا مشورہ دیا۔ اس سے گیارہ مہینے کے بعد صدقی پاشا کی ماتحتی میں انتخابی دستور کو از سر نو ترتیب دینے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ یہ کاروائی صرف اس لئے تھی کہ قواعد ایسے بنا دئے جائیں تاکہ آزادی خواہ زیادہ تعداد میں منتخب نہ ہوسکیں اور پھر پارلیمنٹ پر "قصر" کا اثر غالب رہے لیکن کمیشن کی سخت مخالفت ہوئی اور اس عام مخالفت کے سامنے شاہ فواد کو جھکنا پڑا۔ انتخاب پرانے دستور کے مطابق ہوا اور وفدی بہت بڑی تعداد میں کامیاب ہوئے۔ زاغلول پاشا نے انتخاب کے قبل ہی اعلان کر دیا تھا کہ وہ وزارت بنانا نہیں چاہتے، اسلئے زیوار پاشا کے لئے وزارت بنانا ناممکن ہوگیا۔ عدلی پاشا نے ایک مشترکہ وزارت ترتیب دی۔ زاغلول پاشا ایوان کے صدر ہوئے۔ اس وزارت میں عدلی پاشا کی حیثیت کمزور تھی۔ اسلئے انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ ابھی ثروت پاشا کی وزارت قایم ہوئی تھی کہ سرکار برطانیہ سے فوجی مسئلے پر جھگڑا ہوگیا۔ شاہ فواد ثروت پاشا کے ساتھ لندن گئے۔ گفتگو کے بعد ایک معاہدہ مرتب ہوا لیکن قبل اس کے قاہرہ میں سرکاری طور پر اس کا اعلان ہو ۲۳ر اگست ۱۹۲۷ء کو سعد زاغلول پاشا کا انتقال ہوگیا۔ نئے معاہدے کے رو سے یہ طے پایا کہ :۔

(۱) اگر مصر پر حملہ ہوا تو حکومت برطانیہ مصر کی امداد کرے گی۔
(۲) اگر برطانیہ کو کوئی خطرہ پیش آیا تو حکومت مصر برطانیہ کے لئے تمام سہولتیں مہیا کرے گی اور برطانیہ کے خلاف حریفانہ رویہ اختیار نہیں کرے گی
(۳) انگریزی اصول پر مصری فوج کی تنظیم ہوگی۔

مصطفےٰ نحاس پاشا

سعد زاغلول پاشا کے مرنے کے بعد نحاس پاشا وفد پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں نحاس پاشا نے اپنی پہلی وزارت بنائی، یہ مخلوط وزارت تھی اور محمود پاشا وزیراعظم تھے، نحاس پاشا کی پالیسی تھی کہ برطانیہ کے خلاف ایک متحدہ محاذ پیش کیا جائے لیکن یہ وزارت بھی زیادہ دن تک نہ چل سکی۔ اس کے ٹوٹنے کے بعد علی یکن پاشا وزیراعظم ہوئے، اس درمیان میں مصر کی سیاسی حالت پھر خراب ہو گئی۔ مظاہرے اور ہنگامے ہوئے۔ نحاس پاشا پر حکومت نے رشوت ستانی کا جھوٹا الزام بھی لگایا۔ ان تمام ہنگاموں کے پس پردہ شاہ فواد کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ ۱۹۲۸ء کا پورا سال اسی ہنگامے میں گزر گیا۔ ۱۹۲۹ء میں مزدور پارٹی کے برسر اقتدار آنے سے انگلستان کی سیاست میں نمایاں تبدیلی ہو گئی۔ مصالحت کی پھر گفتگو چھڑی۔ نحاس پاشا لندن گئے۔ سر جان ہنڈرسن وزیر خارجہ تھے، گفتگو کا آغاز ہوا لیکن سوڈان کے مسئلے نے ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دیں کہ مصالحت نہ ہو سکی۔ نحاس پاشا خالی ہاتھ واپس آئے اور آ کر اپنا استعفےٰ داخل کر دیا۔ فواد کو موقع مل گیا، تمام طاقت اپنی مٹھی میں لے لی۔ صدقی پاشا وزیراعظم ہوئے اور مصر پر فوجی حکومت مسلط کر دی گئی۔ وفد پارٹی کے اخبارات پر پابندیاں عاید کر دی گئیں۔ اسمبلی توڑ دی گئی، جلسے جلوس اور مظاہروں کا جواب پولیس کے ڈنڈوں سے دیا گیا۔ عورت مرد بچے اور طلبہ نے اس ایجی ٹیشن میں خوب حصہ لیا۔ ملک و وطن کے لئے اپنی جانوں کی قربانیاں تک دیں۔ نحاس پاشا اور دوسرے لیڈروں نے فواد کے پاس اس نادر شاہی کو بند کرنے کے لئے درخواست دی۔ صدقی پاشا نے نیا انتخاب کرانا چاہا۔ لیکن اپنی شکست کا ایسا یقین تھا کہ ایسا نہ کر سکے۔ ان کی وزارت بہت بدنام ہو گئی۔ خود ان پر پستول سے حملہ ہوا، آخر ۱۹۳۳ء میں ان پر فالج گرا اور وزارت سے علیحدہ ہو گئے۔ نئے وزیراعظم عبدالفتاح یحیےٰ پاشا فواد کے ہاتھ میں بالکل کٹھ پتلی تھے۔ نومبر ۱۹۳۴ء میں توفیق نسیم پاشا کی وزارت قایم ہوئی، قوم پرستوں نے مطالبہ کیا کہ ۱۹۲۳ء کا دستور پھر جاری کیا جائے۔ جنوری ۱۹۳۵ء میں قومی کانفرنس کا دوسرا اجلاس نحاس پاشا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تمام ملک کے تیس ہزار نمائندے شریک تھے۔ اسکول اور کالج کے لڑکوں نے مظاہرہ کیا، پولیس سے تصادم بھی ہوا۔ برطانی حکومت نے قدرشاہی کا آڑ لیکر قوم پرستوں کو دبانے کی کوشش کی۔ ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی کہ جنگ حبشہ چھڑ گئی، سیاسی حالات میں کایا پلٹ ہوئی۔ بحر روم میں اٹلی کا اقتدار برطانیہ کے لئے خطرہ بن گیا۔ مسولینی کی امنگوں کے آگے سویز اور برطانیہ کے مشرقی مقبوضات خطرہ میں تھے۔ ادھر قوم پرستوں کو موقع مل گیا، اپنے مطالبے پر سختی سے اڑے رہے، مصر کی تمام سیاسی جماعتیں متحد ہو گئیں۔ آخر برطانی حکومت مجبور ہوئی کہ مصر سے مصالحت کر لی جائے۔ فروری ۱۹۳۶ء میں علی ماہر پاشا وزیراعظم ہوئے۔ لیکن فواد کے مرنے سے وزارت ٹوٹ گئی۔ اس بار نحاس پاشا وزیراعظم ہوئے، اسی سال اگست کے مہینے میں نحاس پاشا لندن گئے۔ اور ۲۶ راگست ۱۹۳۶ء کو مصری برطانی معاہدہ مرتب ہوا۔ اور اس پر لوکارنو ہال میں فریقین کے دستخط ثبت ہوئے۔ نحاس پاشا نے زاغلول پاشا مرحوم کے قلم سے اس پر دستخط کئے۔ نیز حسب ذیل مصری اور برطانی مدبرین نے دستخط کئے۔

(۱) نحاس پاشا ——— صدر وفد پارٹی

(۲) محمود پاشا ——— صدر احرار پارٹی

(۳) مکرم عبید پاشا ——— وزیر خارجہ مصر

(۴) اسمٰعیل صدقی پاشا ——— صدر جماعت شعب

(۵) عبدالفتاح یحیےٰ پاشا۔ (۶) عیسیٰ پاشا۔ (۷) ڈاکٹر احمد ماہر۔ (۸) ڈاکٹر حافظ عفیفی پاشا۔

(۹) محمود فہمی پاشا۔ (۱۰) حمدی سیف پاشا۔ (۱۱) واصف علی پاشا (۱۲) عثمان محرم پاشا

برطانی مدبرین:-

(۱) مسٹر انتھونی ——— وزیر خارجہ انگلستان

(۲) لارڈ ہیلی فیکس ———

(۳) مسٹر ریمزے میکڈانلڈ - (۴) سر مائلز لمپسن ہائی کمشنر مصر

اس معاہدہ میں کل سولہ دفعات ہیں، اس کی رُو سے مصر پر برطانوی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا - یہ معاہدہ بیس سال کے لئے تھا، دونوں ملکوں کی رضامندی سے اس میں ترمیم اور تنسیخ بھی ہو سکے گی - اصولی طور پر مندرجہ ذیل امور کو مدنظر رکھا گیا ہے -

(۱) دونوں ملکوں کے درمیان اتحاد رہے گا -

(۲) کوئی فریق ایسا رویہ اختیار کرے گا جو معاہدہ کے خلاف ہو یا ایسا معاہدہ نہیں کرے گا جس سے اس کی خلاف ورزی ہوتی ہو

(۳) اگر کوئی جھگڑا پیدا ہوا تو مشورہ سے طے کیا جائے گا -

(۴) جنگ کے موقع پر ایک دوسرے کی امداد کریں گے -

(۵) جنگ کے وقت یا فوری ضرورت کے موقع پر مصری بندرگاہ، ذرایع، رسل و رسائل، ہوائی اسٹیشن کے استعمال کا حق برطانیہ کو ہوگا، نہر سویز گرچہ مصر کی ملکیت ہے لیکن یہ عالمگیر رسل و رسائل کا رستہ ہے اس لئے حکومت برطانیہ مصری فوج سے تعاون کرتے ہوئے نہر سویز کی حفاظت کرے گی، نہر سویز کی حفاظت کے لئے فوجی بارکیں تعمیر کی جائیں گی - دس ہزار فوج اور چار سو ہواباز اس وقت تک وہاں رہیں گے - جب تک کہ فریقین کو اطمینان نہ ہو جائے کہ مصری فوج اب نہر کی حفاظت کرنے کے لائق ہوگئی - برطانی طیارے تمام ملک میں پرواز کر سکیں گے - ۱۹۲۳ء میں European bureau of public security department جو قایم ہوا تھا اب ختم ہو جائے گا - پانچ سال تک فوج میں یورپین عنصر موجود رہیگا - مشرقی بحر الکاہل میں برطانوی بیڑے کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اسکندریہ میں عارضی انتظام کر دیا جائے گا - مصر میں رائل - ایر فورس (R.A.F.) کے جو دستے مقیم ہیں ان کی تعلیم و تربیت کے لئے حکومت مصر سہولتیں مہیا کرے گی - اسکندریہ اور نہر سویز کے درمیان رسل و رسائل کا بہترین انتظام کیا جائے گا - حکومت مصر کو اپنی فوجی قوت بڑھانے اور مزید سامان حربی خریدنے کی اجازت ہوگی - انگریزی افسر مصری فوج کو قومی فوج بنانے میں مدد دینگے - مصری فوج کو سوڈان کی حفاظت کرنے میں دخل دینے کا حق ہوگا - اہل مصر کو سوڈان میں آباد ہونے اور وہاں تجارت کرنے کی اجازت ہوگی اور حکومت برطانیہ اس کی مدد کرے گی -

اس معاہدہ کے بعد حافظ عفیفی پاشا مصر کے پہلے سفیر بنا کر لندن بھیجے گئے - اور سر مائلز لمپسن جو قبل مصر میں ہائی کمشنر تھے برطانی سفیر بن کر مصر آئے - ۲۶ مئی ۱۹۳۷ء کو مصر مجلس اقوام میں بحیثیت ایک رکن کے شامل ہوا - جب یہ وفد مجلس اقوام کے اجلاس میں شریک ہو کر مصر واپس آیا تو ملک میں بہت خوشیاں منائی گئیں - جلسے کئے اور جلوس نکالے گئے - نحاس پاشا کا ہر جگہ شاندار استقبال کیا گیا - اس کے بعد سویز کمپنی نے بھی ایک معاہدہ کیا جس کی رُو سے

(۱) مصر کو بجائے ۲۰۰۰۰ پونڈ ۳۰۰۰۰۰ پونڈ سالانہ ملا کریں گے -

(۲) کمپنی پورٹ سعید سے اسمٰعیلیہ تک اپنے خرچ سے سڑک تعمیر کرے گی -

(۳) کمپنی کی ملازمت میں مصر کا تناسب ۳۳ فیصدی ہوگا -

مصر کی قومی اسمبلی نے ان معاہدوں کی تصدیق کر دی -

"معاہدہ کے بعد" اور "وفد کا زوال"

معاہدہ کے بعد وفد پارٹی برسراقتدار ہوئی - اور نحاس پاشا نے اپنی وزارت اس طرح ترتیب دی :-

(۱) نحاس پاشا ——— وزیر اعظم - (۲) مکرم عبید پاشا ——— وزیر مالیات - (۳) محمود فہمی النقراشی، وزیر مواصلات

(۴) محمد صفوت پاشا ——— وزیر اوقاف - (۵) عثمان محرم پاشا ——— وزیر امور عامہ

(۶) احمد حمدی ——— وزیر زراعت - (۷) علی فہمی پاشا ——— وزیر حرب - (۸) محمود غالب بک ——— عدلیہ

(۹) واصف جمال ——— وزیر خارجہ - (۱۰) علی زکی العرابی بک ——— وزیر معارف -

برسرِ اقتدار ہونے کے بعد وفد پارٹی نے تمام اصول کو بالائے طاق رکھ کر "برادر نوازی" شروع کر دی۔ مخالف اخبارات کی زبان بندی اور دوسرے الزامات جو وہ ثروت پاشا اور صدقی پاشا کی وزارتوں پر عائد کرتے تھے، خود ان کے شکار ہو گئے۔ اس سے ملک میں ان کی ساکھ گر گئی۔ ان حالات میں انہوں نے قصر شاہی سے ٹکر لی۔ قصر پر اب نوجوان اور ہر دل عزیز فاروق کا سکہ چل رہا ہے۔ فواد بھی ہر دل عزیز تھے، لیکن اپنی ہوشیاری اور ڈپلومیسی کی بدولت فاروق کی مقبولیت ان کے چال چلن اور اسلامیت کی وجہ سے ہے۔ نحاس پاشا نے شاہ کی منظوری کے لئے ایک دستور کا مسودہ پیش کیا۔ اس نئے دستور کا مطلب بادشاہ کے اختیارات کو کم کرنا تھا، اب تک مصر کے وزیر اعظم قصر شاہی کے نامزد کردہ ہوتے آئے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ شاہ اکثریت کے لیڈر ہی کو وزیر اعظم نامزد کرتا تھا۔ یہ ایک دستور تھا جو ابتدا سے چلا آتا تھا، لیکن نحاس پاشا نے چاہا کہ شاہ کے ہاتھ سے اس اختیار کو لے لیں۔ شاہ نے اختلاف کیا، اور وزارت گر گئی

کھلا انتخاب ہوا۔ اب وفد کی وہ بات نہیں رہی تھی۔ نحاس پاشا کی بعض حرکتوں سے پارٹی کے اندر پھوٹ پڑ چکی تھی۔ فہمی نقراشی اور احمد ماہر نے وفد سے الگ ہو کر سعد پاشا کے نام پر "سعدی" پارٹی بنائی۔ اس پر از ہر کی طاقت انکی پشت پر۔ انتخاب کا نتیجہ وفد پارٹی کے لئے ایک حادثہ تھا۔ نحاس پاشا اور ان کے دست راست مکرم عبید شکست کھا گئے۔ وفد کے کُل بارہ آدمی منتخب ہو سکے۔ نئی وزارت محمد محمود (لبرل) نے سعدیوں کی امداد سے بنائی اور دو سال کامیابی کے ساتھ چلتی رہی۔ دو تین مہینے ہوئے کہ بعض باہمی اختلافات کی بنا پر لبرل وزارت سے علحدہ ہو گئے۔ نئی وزارت علی ماہر پاشا (آزاد) نے سعدیوں کی امداد سے بنائی۔ اس وزارت میں مصر کے بعض ممتاز لوگ بھی۔ محمد علی علوبہ پاشا وفد فلسطین کے سلسلہ میں ہندوستان بھی آچکے ہیں اور جنہوں نے ابھی قاہرہ میں فلسطین کانفرنس بلائی تھی۔ ان کے علاوہ عبدالرحمن عزام جو تلوار کے دھنی اور قلم کے بادشاہ ہیں اور جو طرابلس کے جہاد میں اپنی شجاعت اور جوش جہاد کا ثبوت دے چکے ہیں وزارت میں اوقاف کے انچارج ہیں۔ نیز فہمی نقراشی سعدیوں کے رہنما بھی خاص شخصیت کے مالک ہیں۔

دنیا کی موجودہ متزلزل حالت میں مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے۔ حبشہ پر اٹلی کا قبضہ ہو جانے سے برطانیہ اور مصر ایک دوسرے سے موالات کرنے پر مجبور ہیں۔ معاہدہ کے بعد سے مصر مسلسل فوجی تیاریوں میں منہمک ہے۔ ابھی ایک ریزرو فوج (الجیش المرابط) عبدالرحمن عزام مشہور طرابلسی مجاہد کی نگرانی میں مرتب ہو رہی ہے۔

یہ تھا مصر کی نئی سیاسی تشکیل اور ارتقا کا مختصر خاکہ جو کم سے کم لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس سے ناظرین کو مصر کی سیاسی حالت کا اندازہ کرنے میں آسانی ہو گی۔

افغانستان

جنگِ عظیم کے بعد

از جناب سید محبوب احمد صاحب وارثی بی اے۔ ایل ایل بی۔ علیگ

جنگ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے اور ختم ہونے کے بعد تک افغانستان میں فی الحقیقت کوئی آزاد اور خود مختار حکومت نہ تھی، بلکہ حکومت برطانیہ کے زیر اثر یہ ایک ریاست کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس کے فرمانروا کو بادشاہ نہیں، بلکہ امیر کہا جاتا تھا۔ جنگ عظیم کے دوران میں افغانستان میں امیر حبیب اللہ خاں سریر آرائے حکومت تھے۔ برطانیہ سے اُن کی دوستی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ افغانستان میں صرف برطانوی حکومت قائم ہونی باقی رہ گئی تھی ورنہ برطانوی اثر اور اقتدار دوستی کی حد سے تجاوز کر کے ملک کو محکومیت کے درجے پر پہونچا چکے تھے۔

۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم ختم ہوئی، اور افغانیوں نے محسوس کیا کہ برطانیہ کی دوستی ملک کے حق میں مہلک ثابت ہو رہی ہے۔ امیر حبیب اللہ کو اس خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن ان کی دوستی عشق کی اُس حد تک پہونچ چکی تھی، جہاں خطرات کا احساس ممکن ہی نہیں ہے۔ لہذا ملک کے باشندوں کے دلوں میں بادشاہ وقت کے خلاف منافرت کے جذبات پرورش پانے لگے، اور ایک سال بھی گذرنے نہ پایا تھا کہ اس جذبہ نے خطرناک صورت اختیار کر لی اور ۱۹۱۹ء کے اوائل میں امیر حبیب اللہ خاں کو اپنی عزیز جان گنوا کر برطانیہ کی دوستی کا حق ادا کرنا پڑا۔

فروری ۱۹۱۹ء میں امیر امان اللہ خاں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ امیر امان اللہ خاں نے برطانیہ کی دوستی کا نتیجہ ملک اور بادشاہ کے حق میں بھی بخوبی دیکھ لیا تھا۔ ایک ہمدرد اور بہی خواہ وطن ہونے کی حیثیت سے ملک میں برطانوی اثر و اقتدار کو یکلخت ختم کرنا اُنھوں نے اپنا فرض اولین جانا۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کی خاطر امیر امان اللہ نے مئی ۱۹۱۹ء میں افغانی فوج کا ایک مضبوط دستہ ہندوستان کی سرحد پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔ جنگ عظیم کو ختم ہوئے ابھی ایک سال بھی نہ ہونے پایا تھا کہ برطانیہ کے سر مصیبت کا نیا پہاڑ افغانی فوج کی شکل میں ٹوٹ پڑا۔ دو تین مقامات پر افغانی اور برطانوی فوجوں میں سخت مڈ بھیڑ ہوئی۔ دو مقامات پر افغانستان کو فتح ہوئی۔ اور ایک مقام پر برطانیہ کو۔ جنگ عظیم کی ماندگی ابھی دُور نہیں ہوئی تھی اسلئے برطانیہ نے اس جنگ کو ختم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور بالآخر یہ طے پایا کہ برطانیہ اپنی قدیم پالیسی کو افغانستان میں جاری نہ رکھے گا۔ صلحنامہ پر راولپنڈی پر فریقین کے دستخط ہو جانے کے بعد افغانستان کی سرحد متعین کر دی گئی۔ اور فرمانروائے افغانستان کا لقب "ہز میجسٹی"، تسلیم کر کے برطانوی اثر اور اقتدار کو افغانستان میں ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔

اس کامیاب مہم سے فرصت پا کر امان اللہ خاں نے ملک کی اصلاح کی ٹھانی۔ امان اللہ ایک روشن خیال اور جدید روشنی کا دلدادہ فرمانروا تھا۔ ملک کی ابتری اور زبوں حالی نے اُس کے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ افغانستان کی ترقی اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ترقی کے وہ ذرایع جنھیں اختیار کر کے دوسرے ممالک نے ترقی کے زینے طے کئے ہیں۔ افغانستان میں بغیر ترمیم و تنسیخ عمل میں نہ لائے جائیں۔ یورپ کی ترقی نے اُس کے دل میں رشک کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اور اس کی دلی تمنا تھی کہ اس کا ملک بھی ترقی کے میدان میں یورپ کے دوش بدوش نظر آئے۔ مذہبی پیشواؤں نے اپنے ذاتی اقتدار کو قایم رکھنے کی غرض سے ملک کو مذہب کے خود ساختہ اصولوں کی آہنی زنجیروں میں اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ گویا اسلام اصلاح اور ترقی کا دشمن ہے۔ اور تغیرات زمانہ کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ امان اللہ خاں اس نتیجے پر پہونچنے پر مجبور ہوا کہ تاوقتیکہ ان آہنی زنجیروں کے ٹکڑے نہ کر دئے جائیں

ملک ہرگز ترقی نہیں کرسکتا ہے۔ مخالفتوں کی پرواہ کئے بغیر اُس نے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ ملک کے باشندوں کے علاوہ بیرونی طاقتوں نے حریفانہ کارروائیاں شروع کیں لیکن امان اللہ کو اُن کے ارادوں سے باز رکھنا کوئی آسان امر نہ تھا۔ چنانچہ باوجود شدید مخالفتوں کے اصلاحات کی متعدد اسکیمیں ملک میں جاری کردی گئیں۔

ملک کی اندرونی حالت کی درستی اگر ضروری تھی تو اس سے زیادہ ضروری ملک کے بیرونی اور بین الاقوامی تعلقات کا قیام تھا بین الاقوامی تعلقات قائم کئے بغیر افغانستان کی آزادی ناپایدار اور غیر مستحکم ثابت ہو رہی تھی۔ چنانچہ مارچ ۱۹۲۱ء میں امان اللہ نے سب سے پہلے ترکی سے دوستانہ تعلقات قایم رکھنے کا معاہدہ کیا۔ اُسی ماہ میں ایران سے خوشگوار تعلقات قایم کرنے کے علاوہ تجارتی اور سیاسی معاملات کے لئے بھی ایک معاہدہ کیا گیا۔ سمبتر ۱۹۲۱ء میں روس کا وفد افغانستان آیا اور افغانستان اور روس میں بھی ایک معاہدہ کے ذریعہ دوستانہ تعلقات قایم ہوگئے۔

ان معاہدوں نے افغانستان کو آزاد ممالک کے دوش بدوش لاکھڑا کیا۔ اور جب امان اللہ خاں کو اپنے ملک کے مکمل آزاد ہونے کا یقین ہوگیا تو اُس نے یورپ کی ترقی کا راز براہ راست معلوم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر امان اللہ سنہ ۱۹۲۷ء میں یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ کامل ایک سال تک یورپ کے مختلف ممالک کی سیر کرتے رہے۔ اور وہاں کے حالات کا بغور مطالعہ اور ان کی ترقی کا راز معلوم کرنے کے بعد ترکی اور ایران کو دیکھ کر سنہ ۱۹۲۸ء میں افغانستان واپس آگئے۔

یورپ کے سفر نے امان اللہ خاں کے خیالات میں انقلاب پیدا کردیا، اور اپنے ملک کو یورپ کی تہذیب کا جامہ پہنانے کی فکر نے انہیں اس درجہ بیچین کردیا کہ انہوں نے چشم زدن میں کابل کو پیرس اور قندھار کو لندن کی شکل میں دیکھنا چاہا۔ یورپ جانے سے پیشتر مذہبی پیشواؤں نے مخالفت کا علم بلند کردیا تھا۔ ملک سے مکمل ایک سال کی غیر حاضری سے مخالفین نے ہر قسم کا ناجائز فائدہ اٹھایا، چنانچہ امان اللہ کے واپس آنے کے بعد مخالفت کا طوفان اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ عمائد سلطنت و اکابر حکومت بھی مخالفین کی صف اوّل میں آکھڑے ہوئے تھے۔ امان اللہ خاں نے مصلحتِ وقت اور ہوا کا رُخ دیکھے بغیر شور اور سنگلاخ زمین میں اصلاحات کے پودے نصب کروائے۔ موسم کی غیر موزونیت اور مخالفت کی تند ہوا نے پودوں کو جڑ پکڑنے نہ دیا۔ امان اللہ خاں نے اپنے جوش کے عالم میں مُلّاؤں کے علاوہ با اثر عمائد سلطنت کے خلاف بھی جارحانہ قدم اُٹھایا اور یہ اُن کی زندگی کی پہلی اور آخری غلطی ثابت ہوئی۔ ملک میں مخالفت کا ایک ایسا شور برپا ہوا کہ امان اللہ اس کی تاب نہ لا سکے اور اس شورش نے مُلّائے شور بازار کو مخالفت کا علمبردار بنا کر مئی سنہ ۱۹۲۹ء میں امان اللہ کو جلا وطن کردیا۔

افغانستان کی اس خانہ جنگی نے بچہ سقہ نامی ایک جاہل غریب اور گمنام شخص کو تخت و تاج کا مالک بنادیا۔ پانچ ماہ تک ملک کی حکومت کی باگ ڈور بچہ سقہ کے ہاتھوں میں رہی اور اس عرصہ میں افغانستان کے شاہی قلعہ اور شاہی دربار میں جو ڈرامہ اسٹیج ہوا کیا اس کا تذکرہ بھی شرمناک ہے۔ اس ڈرامے کا ڈائرکٹر بچہ سقہ تھا، اور اس کے ایکٹر بچہ سقہ کے وہ ساتھی تھے جنہوں نے بغاوت میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

بچہ سقہ کی حکومت افغانستان کے شرفاء و رؤسا کی عزت و ناموس پر ایک ایسا حملہ تھا جسے وہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتے تھے، چنانچہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء میں نادر خاں کے زیر کمان افغانی فوج نے بچہ سقہ کی حکومت کا خاتمہ کرکے ملک کو مزید ذلت و رسوائی سے بچالیا۔ ۱۶/ اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء کو نادر خاں کو ملک کے باشندوں نے بہ اتفاق رائے اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ اس انتخاب نے افغانستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور جنرل نادر خاں، نادر شاہ کے لقب سے تخت حکومت پر بیٹھے۔

نادر شاہ کو ملک کا کافی تجربہ ہوچکا تھا۔ اور انہوں نے ملک کے باشندوں کی ذہنیت کا بھی صحیح اندازہ لگا لیا تھا اس لئے انہوں نے امان اللہ کی پالیسی کو برقرار رکھتے ہوئے اس احتیاط کے ساتھ اس پر عمل شروع کیا کہ مخالفتوں کا طوفان تھمتا گیا۔ اور خلاف توقع ایک قلیل عرصہ میں زمین از خود ہموار ہوگئی۔

اصلاحات افغانستان نادر شاہ کے عہد حکومت میں

دستور اساسی

نادر شاہ نے اصلاحات کے باب میں سب سے اوّل جگہ دستور اساسی کو دی کیونکہ سابق دستور اساسی کے رائج رہتے ہوئے ملک کی ترقی کے لئے مخالفت کے فتنہ کو جگائے بغیر کوئی اصلاح جاری کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے سنہ ۱۹۳۱ء میں نادر شاہ نے ایک مکمل جدید دستور اساسی کی تشکیل کرکے ملک کی ترقی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھول دیا۔ اور مخالفت کے سیلاب کی آمد کے تمام راستے بند کردئے۔ اس جدید

دستور اساسی کی رُو سے ملک میں پہلی مرتبہ دو ایوانوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ایک ایوان کا نام سینٹ رکھا گیا۔ اور دوسرے کا نیشنل اسمبلی۔ سینٹ کے اراکین کا انتخاب بادشاہ وقت کے ہاتھوں عمل میں آتا ہے، اور نیشنل اسمبلی کے اراکین کو ملک کے باشندے منتخب کرتے ہیں۔ ملک کے ہر بالغ اور صحیح الدماغ مرد کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ افغانستان کی بادشاہت موروثی ہے اور بادشاہ کا بڑا بیٹا تخت و تاج کا وارث ہوتا ہے۔ حکومت کے مختلف شعبے ہیں اور ہر شعبہ ایک وزیر کے سپرد ہے۔ وزیراعظم کی تقرری بادشاہ وقت خود کیا کرتا ہے اور دیگر وزرا کی تقرری بادشاہ کی منظوری سے وزیراعظم کرتا ہے۔ مختلف شعبوں کے نام حسب ذیل ہیں جو فی الحال ذیل کے وزرا کی نگرانی میں نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کے زینے طے کر رہے ہیں۔

۱۔ وزیر حربیہ = شاہ محمود خاں
۲۔ وزیر خارجیہ = فیض محمد خاں
۳۔ وزیر داخلیہ = محمد گل خاں
۴۔ وزیر عدلیہ = فضل احمد خاں
۵۔ وزیر معارف = احمد علی خاں
۶۔ وزیر تجارت و مالیہ = میرزا محمد خاں
۷۔ وزیر فوائد عامہ = اللہ نواز خاں
۸۔ مدیر مستقل طبیہ = محمد اکبر خاں
۹۔ ٹیلیگراف و ٹیلیفون = رحیم اللہ خاں

فوج

ایران کی مانند افغانستان کو بھی اپنی خوش قسمتی سے ایک فوجی سپہ سالار بادشاہ کی قیادت نصیب ہوئی، چنانچہ فوجی اصلاحات میں افغانستان کو بھی بڑی کامیابی ہوئی۔ نادر شاہ نے فوج میں اصلاح نہیں بلکہ ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ملک میں ——— بدامنی بغاوت اور خانہ جنگی کے باعث افغانی فوج کی ذہنیت حد سے زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ نادر شاہ نے اپنی پیہم کوششوں سے فوج میں ڈسپلن کی ایسی روح پھونک دی کہ آج افغانی فوج کی ڈسپلن دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے کہ چند سال پیشتر اس ملک میں اتنی سخت بغاوت بھی ہوئی تھی۔ فوج کی ڈسپلن درست کرنے کے بعد فوج کے لئے جدید ترین سامان حرب مہیا کئے گئے اور آج افغانی فوج کے پاس ہر قسم کے جدید ترین لوازم جنگ موجود ہیں۔ افغانی فوج کا سپاہی آج جرمن اور انگلینڈ کی فوج کے سپاہی سے ہرگز مختلف نہیں ہے۔ فوجی افسروں کی تعلیم کے لئے نادر شاہ نے ایک ملٹری اکیڈیمی بھی قایم کی جس میں اعلیٰ قسم کی جدید ترین فوجی تعلیم دی جاتی ہے۔

تعلیم

افغانستان کی جہالت ضرب المثل ہے اور بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ افغانستان کی خانہ جنگی کا واحد سبب یہاں کی عام جہالت تھی جس سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر مذہبی پیشواؤں نے مذہب کے نام پر ملک کی ترقی کی راہیں روکنی چاہیں اور اُنہیں ایک بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ نادر شاہ نے اپنے دورِ حکومت میں جہالت کے خلاف ایک عام جنگ کا اعلان کر دیا۔ ملک میں جہالت کا دورہ ختم کرنے کے لئے متعدد مدرسے اور اسکول قایم کئے گئے۔ حکومت کی طرف سے وظیفے دیکر طلبہ کو یورپ کے مختلف ممالک میں تحصیل علم کیلئے بھیجا گیا۔ عام تعلیم کے علاوہ طلبہ سینکڑوں کی تعداد میں صنعتی تعلیم کے لئے جرمنی، انگلینڈ اور امریکہ بھیجے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ افغانستان کے طلبہ کی سب سے بڑی تعداد اس وقت امریکہ میں صنعتی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ نادر شاہ نے اپنی حکومت کی قلیل مدت میں ایک یونیورسٹی بھی قایم کی جس میں عام تعلیم کے علاوہ صنعتی اور حرفتی تعلیم کا بھی معقول انتظام ہے۔

زراعت و تجارت

افغانستان دنیا کا ایک نہایت زرخیز ملک ہے۔ یہاں کی پیداوار کا مقابلہ دنیا کے کسی دوسرے ملک کی پیداوار سے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ نادر شاہی حکومت نے آبپاشی کا معقول نظم کر کے اور زراعت کی دوسری جدید سہولتیں بہم پہنچا کر زراعت کی ترقی لامحدود کر دی ہے۔ تجارت کی ترقی کے لئے غیر ممالک سے تجارتی سمجھوتے اور ملک میں متعدد دستکاریاں اور بنک وغیرہ بنائے گئے جن کا اثر ملک کی عام تجارت پر نہایت اچھا پڑا اور نئی تجارتوں کے دروازے کھل گئے۔

اسلامی ممالک سے تعلقات

دیگر اسلامی ممالک کی ترقی پذیر حالت کو دیکھتے ہوئے اور بین الاقوامی سیاست میں ان کے بڑھتے ہوئے اثرات کو محسوس کرتے ہوئے نادر شاہ نے یہ ضروری سمجھا کہ افغانستان دیگر اسلامی ممالک سے اپنے تعلقات قایم کر کے اپنا پوزیشن مستحکم کرے۔ چنانچہ نادر شاہ نے اسلامی حکومتوں سے نئے معاہدے کر کے ترکی، ایران، حجاز، مصر اور بغداد میں افغانی سفارت خانے قایم کئے، سفارت خانوں کے قیام نے افغانستان کے تعلقات اسلامی دنیا سے نہایت خوشگوار کر دئے ہیں۔ اور امید کیجاتی ہے کہ افغانستان کو کسی اسلامی سلطنت کے خلاف فوج کشی کی ضرورت کبھی پیش نہ آئیگی۔

ملاؤں کا خاتمہ

نادر شاہ کی حکمت عملی نے افغانستان کو دوبارہ زندگی عطا کی ہے۔ سب سے زیادہ خوش آیندہ امر یہ ہے کہ نادر شاہ کی دور اندیشی اور سیاست دانی نے خود غرض اور پیشہ ور ملاؤں کے اثر کو ایک بڑی حد تک ختم کر دیا ہے۔ اور یہی افغانستان کی آئندہ ترقیوں کا راز ثابت ہوگا۔ نادر شاہ نے ملک میں کوئی نئی پالیسی رائج نہیں کی۔ اُن کے دور حکومت میں سلطنت کا ہر شعبہ امان اللہ کے نقش قدم پر چلتا رہا۔ امان اللہ کو ان کی ناعاقبت اندیشی نے ناکام کیا اور نادر شاہ کو ان کی دور اندیشی نے کامیاب بنایا۔

نادر شاہ کا واقعہ شہادت

۸ر نومبر ۱۹۳۳ء کو افغانستان میں ایک دوسرا جانکاہ حادثہ پیش آیا۔ نادر شاہ بعد نماز ظہر ایک جلسے میں طلبہ کو انعامات تقسیم کرتے ہوئے گولیوں کا نشانہ بنائے گئے۔ نادر شاہ کی شہادت نے ملک میں ایک ہیجان برپا کر دیا اور دُنیا نے یہ سمجھا کہ افغانستان میں پھر ایک مرتبہ خونریزی اور خانہ جنگی کا بازار گرم ہوگا۔ لیکن ارباب حکومت نے فوراً ہی حالات پر قابو پالیا۔ اور دشمنوں کو اپنے ارادوں میں کامیاب ہونے کا موقعہ دئے بغیر نادر شاہ کے اکلوتے اور جواں سال بیٹے محمد ظاہر شاہ کو ملک کا تخت و تاج حوالہ کر دیا۔ تخت نشینی کے وقت محمد ظاہر شاہ تحصیل علم میں مشغول تھے۔ اور اُنہیں یہ گمان بھی نہ تھا کہ اتنی جلد اتنی بڑی ذمہ داری اُن کے سپرد کر دیجائے گی۔ لیکن ظاہر شاہ جواں سال ہونے کے علاوہ جواں ہمت بھی ثابت ہوئے۔ انہوں نے اپنی تاجپوشی کے بعد وزرا۔ عمائد حکومت اور حکام سلطنت کے نام جو فرمان جاری کیا اُس سے اُن کی بیدار مغزی اور اعلیٰ تعلیم و تربیت کا پتہ لگتا ہے۔ ذیل میں اُس فرمان کا آزاد ترجمہ مختصراً ناظرین کی دلچسپی کے لئے درج کیا جاتا ہے۔

خط مشی حکومت اعلیحضرت محمد ظاہر شاہ

بنام محترم محمد ہاشم خاں - صدر اعظم مملکت افغانستان -

(۱) موجودہ حکومت اسلام کے احکام اور حنفی مذہب کے اصول کے مطابق تمام امور سلطنت کو انجام دیگی۔ مجلس شوریٰ اور وزارت عدلیہ کا فرض ہو کہ شریعت محمدی کو ملک میں قایم رکھے۔ شعبۂ احتساب اس حکومت کا ایک جزو لازم ہے۔ سلطنت کے کاموں کی انجام دہی میں بلاتفریق قومیت و نسل ہر شخص کے حقوق مساوی تصور کئے جائیں۔ افغانستان میں پردہ اسی حد تک رہیگا جس حد تک شریعت نے تاکید کی ہے۔

(۲) رشوت اور شراب نوشی کی سخت ممانعت۔ میرے عہد حکومت میں سلطنت کے ہر رکن کو قرآن مجید کی قسم کھانی ہوگی کہ وہ سلطنت کے امور کی انجام دہی میں کسی شخص سے رشوت ہرگز قبول نہ کرے گا۔ اور اپنی تنخواہ پر اکتفا کر کے دیانتداری اور ایمانداری سے اپنے فرائض کو انجام دیگا۔ شراب نوشی کی سزا شریعت کے مطابق دیجائے گی۔ اور مامورین حکومت کو شرعی سزا کے علاوہ اُن کے عہدوں سے بھی برطرف کر دیا جائیگا۔ افغانستان میں شراب فروشی قطعاً ممنوع ہے اور اگر کوئی شخص اپنے مکان یا دوکان پر شراب بیچتا پکڑا جائے تو اس کی جائداد ضبط کر لیجائے۔ اور اس کی سزا شریعت کے اصول کے مطابق کیجائے۔

(۳) امور حربیہ۔ موجودہ حکومت کی خواہش ہے کہ اس مسئلہ کو کافی اہمیت دیجائے۔ کیونکہ اس شعبے سے افغانستان کی حیات و ممات وابستہ ہے۔ فوج کی جدید ترین اصولوں پر تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے اور جدید سامان حرب مہیا کئے جائیں۔ فوجی افسروں کی تعلیم کے لئے فوجی اسکول کو ترقی دینے کے تمام ذرایع عمل میں لائے جائیں۔ اور فوج کی دلجوئی اور خوشنودی کا خاص خیال رکھا جائے۔

(۴) شعبۂ خارجیہ۔ غیر ممالک سے وہ دوستانہ تعلقات قایم رکھے جائیں۔ جو سلاطین پیشین یعنی امان اللہ خاں اور نادر شاہ کے زمانے میں معاہدوں کے ذریعہ قایم کئے گئے تھے۔ اور افغانستان کے تحفظ و استقلال کیلئے اگر ضرورت پیش آئے تو نئے معاہدے بھی کئے جائیں۔

(۵) امور داخلہ۔ وزارت داخلیہ کا فرض ہے کہ وہ حکومت کے ہر چھوٹے بڑے افسروں اور حاکموں کے کاموں پر نظر رکھے اور اس بات کی کوشش

کریگا کہ جو شخص جس کام کا اہل ہو اُسی کے سپرد وہ کام کیا جائے اور تمام افسروں اور حاکموں کی مکمل فہرست رکھی جائے اور اُسے وقتاً فوقتاً مجلس انتخاب کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ اس پر غور و خوض کیا جا سکے، ٹیلیفون - ٹیلیگراف - سڑکوں اور دیگر ذرایع مراسلات کی ترقی و توسیع کے لئے ہر ممکن کوشش کو فوراً عمل میں لایا جائے۔

۶۔ وزارت مالیہ - ملک کے باشندوں کو اختیار دیا جائے کہ حکومت کے ٹیکس قسطوں میں ادا کریں اور باقی ماندہ ٹیکس کی وصولی اس طرح کیجائے کہ لوگوں کو ناحق پریشانی اور ذلت اُٹھانی نہ پڑے - اور حکومت کے خزانہ کو بھی نقصان کا متحمل نہ ہونا پڑے - باقیات میں جس طرح سابق حکومتوں نے معافی کا اعلان کیا تھا، موجودہ حکومت بھی اس اعلان کو برقرار رکھے - کوشش کیجائے کہ ملک کی آمدنی میں اضافہ ہو لیکن اضافہ کی خاطر ملک کے باشندوں کو ناحق زیر بار ٹیکس نہ کیا جائے۔

۷۔ تجارت و زراعت - افغانستان کی حکومت اس شعبہ کو ترقی دینے کی ضرورت آج سب سے زیادہ محسوس کر رہی ہے - حکومت کی خواہش ہے کہ بیرونی ممالک مثلاً ایران - ایطالیہ - فرانس - برطانیہ - اتحاد جمہوریہ اشتراکیہ امریکہ - بلجیم - جرمنی اور جاپان سے تجارتی تعلقات قایم کئے جائیں اور ملک کی تجارت کو فروغ دیا جائے - معدنیات افغانستان کو ترقی دینے کے تمام ذرایع عمل میں لائے جائیں - آبپاشی کے لئے نہریں تعمیر کیجائیں اور زراعت کی ترقی کے وسایل دریافت کئے جائیں - (سالنامہ کابل)

پھر تخت نشینی کے وقت ظاہر شاہ نے جو عہد نمایندگان سلطنت اور اکابر حکومت کی موجودگی میں کیا تھا اُسے ذیل میں بجنسہ نقل کیا جاتا ہے اس عہد نامے کی عبارت سے ظاہر شاہ کی حکومت اور پالیسی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے - اور انکی پالیسی کی وضاحت اس سے بہتر کرنی ممکن نہیں ہے۔

تعہد نامہ اعلیٰحضرت محمد ظاہر شاہ بمجلس شورائے ملی

"امروز کہ این خادم اسلام بہ فضل خدائے قادر متعال و اتفاق ملت عزیز بہ پادشاہی افغانستان انتخاب و سلطنت ما از طرف جمہور طبقات ملت تائید شدہ براساس اصولنامہ اساسی مملکت حاضر شدہ ایم، عہد نامہ را کہ قبول و تعہد آں بما متوجہ میشود بحضور شما نمایندگان ملت قرائت کردہ و صورت کتبی آنرا بنام سعادت مملکت امضا نمائیم - - - بہ خدائے عظیم و قرآن کریم عہد می کنیم کہ در اعمال و افعال خود خداوند جل شانہ را حاضر و ناظر دانستہ بحفاظت دین مبین اسلام و استقلال افغانستان و حفظ حقوق ملت و فراست و ترقی و سعادت وطن براساس شرع متین محمدی و مقررات اصول اساسی مملکت سلطنت نمایم و بہ برکت روحانیت مقدس اولیائے کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم برائے خود استمداد می نمایم - (سالنامہ کابل ۱۳۱۲)

صوبہ بہار کے چند موجودہ مشاہیر :-

سید سلیمان ندوی

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم۔ اے رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

سید صاحب موصوف کی ولادت ۱۸۸۴ء (۱۳۰۲ھ) میں دیسنہ (Desna) ضلع پٹنہ میں ہوئی جو صوبہ بہار میں سادات کا ایک مردم خیز گاؤں ہے۔ عربی کی تعلیم اپنے بڑے بھائی مولوی حکیم سید ابو حبیب صاحب رضوی مجددی سے شروع کی، پھر ایک برس پھلواری شریف میں، اور چند مہینے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں رہے۔ اس کے بعد ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ کے دار العلوم ندوہ میں داخل ہوئے اور وہیں سات برس رہ کر علوم عربیہ کی تکمیل کی۔ مدرسہ مذکور کے معتمدوں اور ارکان میں مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری، شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اور مولانا شبلی نعمانی تھے۔ موصوف کی ذکاوت و ذہانت کی بنا پر ہمیشہ اُن پر شفقت فرماتے تھے۔ غالباً ۱۹۰۳ء میں نواب محسن الملک دار العلوم آئے تھے، اسوقت شاہ سلیمان پھلواروی ندوہ کے معتمد تھے، نواب صاحب نے طلبہ کا امتحان لیا، اور عربی اخبار پڑھوا کر سنا۔ اس امتحان میں سید صاحب موصوف اول آئے ساتھ ہی انھوں نے نواب صاحب کی مدح میں اپنا عربی قصیدہ پڑھکر سنایا، نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ اور شاہ صاحب بھی بہت خوش ہوئے۔ اوس زمانہ کے اخبارات میں شاہ صاحب نے اس کا حال چھپوایا۔ اور لکھا تھا کہ انشاء اللہ ہر زمانہ میں ایک **سلیمان** بہار کی سرزمین میں علم اور دین کی خدمت کے لئے موجود رہے گا۔ ۱۹۰۴ء میں مولانا شبلی معتمد ہو کر آئے، تو مولانا شبلی نعمانی نے ان کو اپنے دامن تربیت میں لے لیا۔

سید صاحب کا خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ اہل خاندان چاہتے تھے کہ یہ طب پڑھیں۔ مگر موصوف کی طبیعت ادھر مائل نہ تھی۔ ۱۹۰۶ء میں مولانا شبلی پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ اور جسٹس مولوی شرف الدین صاحب یا مولوی خدا بخش خاں صاحب کے یہاں ٹھہرے تھے کہ اتفاقاً موصوف کے چھوٹے چچا مولوی ابو یوسف صاحب کی ملاقات مولانا سے ہوئی، مولوی صاحب موصوف نے عرض کی کہ سید سلیمان کو نصیحت فرمائی جائے کہ وہ طب پڑھیں۔ مولانا نے فرمایا "آپ لوگ اس کو کیوں خراب کرنا چاہتے ہیں، اسکو میرے حوالہ کر دیجئے، میں اوسکی تربیت کر کے اپنے کام کا بنا لونگا" چنانچہ اوس دن سے اہل خاندان نے اونکو مولانا کی نذر کر دیا۔

سید صاحب موصوف کو ادب کا شوق پھلواری کی علمی صحبتوں میں ہوا، دربھنگہ جب گئے تو داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ میں وہاں کے طلبہ کی انجمن میں ایسی اعلیٰ تحریر پڑھکر سنائی کہ ہر طرف سے تحسین و آفریں کا نعرہ بلند تھا، اور اوس ہفتہ کی وہی تحریر اخبار "پنچ" میں چھپنے کے لئے بھیجی گئی۔ سید صاحب کا سب سے پہلا مضمون "وقت" کے عنوان سے مخزن لاہور میں ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا، اسی سال اپنے وطن کی انجمن الاصلاح کے جلسہ سالانہ میں "علم اور اسلام" پر ایک بسیط تقریر لکھ کر پڑھی، جس کو اہل علم نے بہت پسند کیا، چنانچہ وہ تقریر علی گڈھ کے مشہور رسالہ "علی گڈھ منتھلی میگزین" میں اڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپی، اسکے بعد موصوف کی ادبی شہرت آہستہ آہستہ بڑھنے لگی، اوسی زمانہ میں ندوۃ العلماء کی طرف سے "الندوہ" نام مشہور علمی رسالہ نکلنا شروع ہوا تھا، جس کے اڈیٹر مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے، سید صاحب نے علم حدیث پر پہلا مضمون لکھا جس کی داد مولانا حالی نے مولانا شبلی کو دی۔

۱۹۰۶ء میں اونکی اور اون کے رفقاء کی دستار بندی کا جلسہ عام لکھنؤ میں ہوا، فلسفۂ جدید و قدیم پر انھوں نے تقریر کی، مجمع بہت بڑا تھا، اہل علم بھی شریک جلسہ تھے، اتفاقاً جلسہ میں سے کسی شخص نے اوٹھ کر کہا "اگر یہ عربی میں تقریر کریں تو جانیں کہ مدرسہ کی تعلیم کیسی ہے"۔ سید صاحب موصوف نے اسی وقت عربی میں ایسی تقریر کی کہ لوگ حیرت میں آگئے، یہ دیکھ کر مولانا شبلی مرحوم نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ یہ تقریر پہلے سے تیار کر لائے ہیں، اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت موضوع مقرر کریں، یہ تقریر کریں گے۔ مولانا شبلی مرحوم نے خط میں یہ واقعہ خود لکھ کر ۴ مارچ ۱۹۰۶ء کو مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کے نام بھیجا ہے :-

"جلسہ بڑی کامیابی سے ہوا۔ سلیمان کی طرف سے درخواست کی گئی کہ فی البدیہہ جو مضمون بتایا جائے اسی وقت اس پر عربی زبان میں لکچر دونگا۔ غلام الثقلین[1] نے ایک مضمون دیا۔ اور بغیر ذراسی دیر کے سلیمان نے نہایت مسلسل فصیح و صحیح عربی میں تقریر شروع کی تمام جلسہ محو حیرت تھا۔ اور آخر لوگوں نے نعرہ ہائے آفریں کے ساتھ خود کہا کہ اب حد ہو گئی۔

(مکاتیب شبلی ۱ص ۱۵۸)

استاد نے غایت خوشی میں اوٹھ کے اپنے سر سے عمامہ اوتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا۔ یہ فی البدیہہ عربی میں تقریر ہندوستان میں بالکل نئی بات تھی، تمام ملک میں شور مچ گیا اور عربی مدرسوں میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔ اور اوسی وقت سے مدرسوں میں عربی تحریر و تقریر کا وہ شوق پیدا ہوا، جو آج تک جاری ہے۔

سید صاحب موصوف کو طالب علمی سے "الندوہ" کی دیکھ بھال کی خدمت سپرد تھی، اب وہ ۱۹۰۶ء میں اوس کے سب اڈیٹر مقرر ہوئے اِن کے مضامین نے اونکی شہرت کو چار چاند لگا دئے۔ ۱۹۰۸ء میں دار العلوم میں علم کلام اور جدید ادب عربی کے استاد مقرر ہوئے دو برس کے بعد مولانا شبلی کے قائم کردہ شعبہ "سیرۃ النبیؐ" میں اون کے لٹریری اسسٹنٹ ہوئے یہ وہ زمانہ تھا جب تمام ہندوستان طرابلس کی جنگ کے ہنگامے سے پر شور تھا، پھر بلقان کی لڑائی شروع ہوگئی۔ اور مسلمانوں کی سیاسیات کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ خالص علمی مشاغل کو چھوڑ کر سیاسیات میں آ گئے۔ مولانا شبلی مرحوم خود بہت آزاد سیاست داں تھے، وہ سرسید کے ساتھ رہ کر بھی سیاست میں اون سے الگ اور ملک کی آزادی کے حامی تھے۔ اور اسلامی سیاسیات میں اتحاد اسلامی پر ایمان رکھتے تھے۔ اور وہ سب سے پہلے مسلمان عالم تھے جنھوں نے اسی جذبہ میں ۱۸۹۲ء میں ٹرکی کا سفر کیا۔ یہی اثر اون کے شاگردوں پر پڑا۔

جب ۱۹۱۰ء میں مولانا ابوالکلام نے جو خود بھی مولانا شبلی کے ہم نشیں اور صحبت یافتہ ہیں۔ کلکتہ سے "الہلال" نکالا جس کی دعوت بعینہ یہی تھی تو اس موقع پر سید صاحب موصوف علمی و تعلیمی مشاغل کو چھوڑ کر ۱۹۱۰ء میں الہلال کے اسٹاف میں داخل ہو گئے۔ اور اس کے اصلی ہیجان کے زمانہ میں اوس کے مضامین میں شریک رہے۔ بلقان اور مسجد کانپور کے زمانہ میں وہ کلکتہ میں مولانا ابوالکلام کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔ الہلال میں واقعۂ کانپور پر "مشہد اقدس" کے عنوان سے سید صاحب نے جو مضمون لکھا تھا۔ وہ بڑا انقلاب انگیز تھا۔ گورنمنٹ نے اوسکو ضبط کرلیا۔

واقعات کے سکون کے بعد وہ پھر دفتر سیرت میں آ گئے۔ اور یہاں سے ۱۹۱۳ء میں مولانا کے حکم سے بمبئی یونیورسٹی کے ماتحت دکن کالج پونہ میں السنۂ مشرقیہ کی معلمی قبول کی۔ ابھی دو برس بھی نہیں گذرے تھے کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی نے انتقال کیا۔ مرتے دم شاگرد کو تار دیکر بلوایا اور وصیت کی کہ وہ سب کام چھوڑ کر سیرۃ النبیؐ کی تکمیل کریں۔ جس کو وہ ناتمام و نامرتب چھوڑ گئے تھے۔ چنانچہ اونھوں نے اوستاد کی وصیت کے مطابق سرکاری نوکری سے استعفا دیدیا اور اُس وقت سے لے کر آج تک اس کام کے انجام میں مصروف ہیں۔ اور اس وقت تک اوسکی چھ ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ جلدیں اسلامی معلومات کا خزانہ اور جدید علم کلام کی اساس ہیں۔

موصوف کی سب سے پہلی تصنیف دروس الادب نام عربی کی دو ریڈریں ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا شبلی کے اشارہ سے لغات جدیدہ کے نام سے انھوں نے جدید عربی الفاظ کی ڈکشنری لکھی۔ اس کے بعد ارض القرآن کی دو جلدیں لکھیں، پہلی ۱۹۱۶ء اور دوسری ۱۹۱۸ء میں، اس کتاب نے ہندوستان کے علمی حلقہ میں ہلچل ڈال دی۔ بعد ازاں نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال کی فرمائش سے ۱۹۲۰ء میں سیرت عائشہ لکھی۔ ان تصانیف کے ساتھ ساتھ ملک کے دیگر علمی و تعلیمی و مذہبی مدارس و مجالس کی خدمات بھی بجا لاتے رہے۔

۱۹۱۵ء میں انجمن ترقی اُردو کے سالانہ اجلاس منعقدہ پونہ کی صدارت کی۔ اور اس میں وہ خطبۂ صدارت پڑھا جو

---

[1] خواجہ غلام الثقلین مرحوم۔

آگے چل کر اُردو کی تاریخ پر تحقیق کرنیوالوں کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوا۔

۱۹۱۴ء کے آخر میں ٹرکی نے حرب جنگ عظیم میں شرکت کی، تو مسلمانوں میں ہیجان ہوا۔ اور بڑے بڑے مسلمان ارباب فکر قید و بند میں ڈالے گئے۔ اس موقع پر جو نیا گروہ اون کی جگہ قائم مقامی کے لئے بڑھا اون میں ایک شخصیت اونکی بھی ہے۔ ۱۹۱۵ء سے لیکر ۱۹۱۶ء تک اونھوں نے مولانا عبد الباری فرنگی محلی کی سیاسی تحریکات میں شمولیت کی۔ ۱۹۱۷ء میں مجلس علمائے بنگالہ کلکتہ کے نہایت اہم اجلاس سالانہ کی صدارت کی، جس میں تمام رہنمایان ہند شریک تھے۔ اُس سال اسی کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی انہیں تاریخوں میں کلکتہ میں تھے۔ اس لئے مجلس علمائے بنگالہ کا یہ اجلاس بڑا اہم تھا۔ اس اجلاس میں موصوف نے جو خطبہ پڑھا وہ بنگال میں بڑا اثر انداز ہوا۔ یہ پہلا خطبہ تھا جس میں جنگ کے ہیبتناک اثرات کے باوجود مولانا ابو الکلام وغیرہ کا نام جو اوس زمانہ میں نظر بند تھے جرأت کے ساتھ لیا گیا۔ اور لوگوں کے دلوں سے رعب اوٹھا۔

۱۹۱۹ء میں خلافت کے سب سے پہلے اجلاس لکھنؤ میں ممتاز شرکت کی، بلکہ علماء اور خالص ارباب سیاست کے درمیان حلقۂ اتصال کا کام دیا۔ اور ایسی پرجوش تقریر کی کہ مسند صدارت سے پائیں تک ساری مجلس بزم ماتم بن گئی، اور مولانا عبد الباری مرحوم اور چودھری خلیق الزماں صاحب وغیرہ کے سارے اختلافات کے خس و خاشاک اس سیل نم میں بہ گئے۔

فروری ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی سرکردگی میں معاملات ٹرکی میں انصاف طلبی اور مسلمانان ہند کے مطالبات کی تشریح کے لئے جو خلافت ڈیپوٹیشن یورپ بھیجا گیا اوس کے تین ممبروں میں ایک ممبر وہ منتخب ہوئے۔ اس وفد کے ساتھ اٹلی، فرانس، اور انگلستان میں حقوق ٹرکی کے لئے زبان و قلم اور دعوت و اشاعت کے ذریعہ سے لڑتے۔ اور وہاں کے وزراء، ارباب سیاست اور آزاد مسلمانوں کے گروہ در گروہ سے جو فرانس، سوئزرلینڈ اور اٹلی میں تھے ملتے اور تحریکات میں شمولیت کرتے رہے۔

۱۹۲۰ء کے آخر میں یورپ کے سفر سے واپس آکر وہ کانگریس میں داخل ہوئے۔ اور ترک موالات کی تحریک میں دیگر علماء و زعماء کے ساتھ مل کر ملک کا دورہ کیا۔ خلافت کے اجلاس سالانہ منعقدہ میرٹھ میں صدر ہوئے۔ اور دوسری سیاسی مجلسوں میں شرکت کی۔ اخبارات میں مضامین لکھے۔ پلیٹ فارموں پر تقریریں کیں۔ ۱۹۲۱ء کی کانگریس احمد آباد میں اوسکی ورکنگ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوکر سال بھر تک کانگریس کے کاموں میں شریک رہے۔ اسی طرح خلافت اور جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ کے رکن مقرر ہوئے۔ اور ۱۹۲۷ء تک اوس کے جزو و کل میں شریک رہے۔

۱۹۲۴ء میں ابن سعود اور شریف حسین میں حرب جنگ کا آغاز ہوا۔ اور دونوں نے مجلس خلافت کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تو مسلمانان ہند نے موصوف کی صدارت میں ایک وفد حجاز کو بھیجا۔ تاکہ وہ فریقین کے سامنے مجلس خلافت کی تجاویز کو پیش کرے۔ اس سلسلہ میں اونھوں نے دو ماہ جدہ میں عین جنگ کے زمانہ میں رہ کر مفوضہ فرائض کو انجام دیا۔ اور بڑی دلیری سے شریف حسین اور سلطان ابن سعود کی حکومتوں سے حجاز میں عربوں کی ایک جمہوری حکومت کے قیام کے مسئلہ میں گفتگو اور خط و کتابت کرتے رہے۔ اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو خدیوی میل پر حجاز سے مصر کا سفر کیا۔ اور وہاں کے علماء اور اکابر سے مل کر حجاز کے معاملہ پر گفتگو کی۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ ازہر نے ان تجاویز پر اپنی رضامندی ظاہر کی۔ یہ اس وفد کی ایسی کامیابی تھی کہ ریوٹر نے اس کی خبر مصر سے ہندوستان بھیجی۔ اور دنیا کے دوسرے شہروں میں مشتہر کی۔

مارچ ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں جمعیۃ العلماء کا جو اہم سالانہ اجلاس ہوا۔ اس کے وہ صدر منتخب ہوئے۔ اس موقع پر موصوف نے جو خطبۂ صدارت پڑھا۔ وہ ہندوستان کے اسلامی سیاسیات میں یادگار ہے۔ اسی سال وہ پھر دوسرے وفد حجاز کے صدر منتخب ہوئے۔ یہ ہندوستان میں شدھی اور سنگھٹن کے زور کا زمانہ تھا۔ اس موقع پر دہلی میں مجلس خلافت کا خاص اجلاس ہوا اور حکیم اجمل خاں مرحوم کی تحریک پر موصوف نے اوسکی صدارت کی۔ اس اجلاس میں موصوف نے ہندو مسلمان تعلقات کی نسبت مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو علی [illegible] پیش کیا۔

اس کانفرنس سے فارغ ہوکر وہ حجاز کا وفد خلافت لے کر جس کے ممبر مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی اور شعیب قریشی تھے، حجاز کو

روانہ ہوئے۔ اس وقت سلطان ابن سعود نے تمام دنیا کے مسلمانوں کی کانفرنس مکہ معظمہ میں طلب کی تھی۔ ٹرکی۔ مصر افغانستان۔ یمن اور دوسرے اسلامی ملکوں کے نمایندے شریک اجلاس تھے۔ اور چند ہفتوں تک برابر اوس کے اجلاس ہوتے رہے۔ تمام دنیا کے نمائندوں نے بہت بڑی اکثریت سے موصوف کو اس اجلاس کا وائس پریسیڈنٹ (نائب الرئیس) منتخب کیا۔ اور متعدد دفعہ انھوں نے صدرِ اجلاس کی غیر حاضری میں اس اسلامی موتمر کے جلسوں کی صدارت کی۔ اسی سفر میں حجاز کے معاملات اور ابن سعود کے تسلط کی موافقت و مخالفت کے مسائل میں وہ اپنے رفقاء مولانا محمد علی صاحب وغیرہ سے اختلاف رائے کی بنا پر سیاسیات سے کنارہ کش ہوکر خالص اصلاحی و علمی و تعلیمی کاموں میں مصروف ہوگئے۔

سید صاحب موصوف کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ دارالمصنفین ہے۔ جو مولانا شبلی کی یادگار میں سنہ ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی کے موطن اعظم گڈھ میں قائم ہوا۔ اس ادارہ نے اسلامی علوم و فنون پر بہت سی کتابیں ہمارے نوجوانوں کے لئے شائع کی ہیں "معارف" اس کا ماہوار رسالہ ہے۔ جو پچیس برس سے اونکی اڈیٹری میں نکل رہا ہے دارالمصنفین اسوقت جو کچھ علمی خدمات انجام دے رہا ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں ہز مجسٹی شاہ نادر خاں کی دعوت پر ڈاکٹر سر اقبال اور نواب سر راس مسعود کے ساتھ کابل یونیورسٹی کے قیام کے مشورہ کے لئے کابل گئے۔ اور وہاں حکومت کے مہمان رہے۔ اور اسی سلسلہ میں غزنیں اور قندھار کا سفر کیا۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں ریاست حیدرآباد دکن نے ضابطۂ فوجداری شرعی کی تدوین کی خدمت اونکو سپرد کی۔ جس کو بخوبی انجام دیا۔ ریاست نے اس ضابطہ پر نظر ثانی کرنے کیلئے ایک کمیٹی مقرر کی جس میں ایک سابق جج ہائیکورٹ۔ مفتی ریاست اور آپ تھے۔ اس کمیٹی نے ایک مہینہ میں اپنا کام پورا کیا۔

ادھر مدت کی سیاسی خاموشی کے بعد فلسطین کے مسئلہ میں انھوں نے اپنی آواز بلند کی۔ اور سنہ ۱۹۳۶ء کی آل انڈیا فلسطین کانفرنس دہلی کی صدارت کی۔ اس موقع پر جو خطبہ انھوں نے پڑھا اوس نے سارے ملک بلکہ دنیائے اسلام میں تہلکہ مچا دیا۔ مصر اور شام کے اخبارات نے اوس کے ترجمے چھاپے۔ مجلس اعلیٰ فلسطین کے صدر سید امین الحسینی نے تار سے اونکا شکریہ ادا کیا۔

اب وہ زیادہ تر علمی و تعلیمی معاملات میں حصہ لیتے ہیں سنہ ۱۹۳۶ء میں ہندوستانی اکاڈمی کی ادبی کانفرنس لکھنؤ کی صدارت کی۔ دارالعلوم ندوۃ العلما کے معتمد۔ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ۔ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد۔ مدرسہ اگزامنیشن بورڈ پٹنہ۔ ہندوستانی کمیٹی حکومت بہار اور جامعہ ملیہ دہلی کے ممبر ہیں اردو زبان اور اردو ادبیات سے اون کو ہمیشہ ذوق رہا ہے انکے قلم کی نکلی ہوئی تحریریں ادب اردو کا اعلیٰ نمونہ سمجھی جاتی ہیں ہندوستانی زبان کی تحریک کی بنا انہی نے ڈالی ہے جو آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے۔ اسوقت تک اونکی جو تصنیفات شائع ہوچکی ہیں۔ اون کے نام یہ ہیں۔

دروس الادب (عربی ریڈر) لغات جدیدہ (جدید عربی لغات) ارض القرآن دو جلدیں۔ سیرۃ عائشہ۔ سیرۃ النبی کی پانچ ضخیم جلدیں۔ حیات امام مالک۔ خطبات مدراس۔ عرب و ہند کے تعلقات۔ عربوں کی جہازرانی۔ خیام۔ خلافت اور تعلیم کے موضوع پر چند رسالے اور بے شمار علمی و ادبی مضامین۔ اور ابھی حال میں اونکے ادبی مضامین کا مجموعہ "نقوشِ سلیمانی" کے نام سے چھپا ہے۔ ان کتابوں میں سے سیرۃ عائشہ اور سیرۃ النبی کے ترجمے ترکی اور فارسی میں اور خطبات مدراس۔ عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی کے ترجمے انگریزی میں کئے گئے ہیں۔ خیام کی داد ہندوستان سے لیکر ایران و کابل اور یورپ تک کے فضلاء نے دی۔ فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف دئے ان میں ایک تحفہ "خیام" بھی تھا۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اسکو سال کی بہترین کتاب قرار دیکر اوس کے مصنف کو پانچ سو روپے انعام دئے۔ خطبات مدراس۔ عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی۔ درحقیقت علمی خطبات کے مجموعے ہیں۔ پہلا مجموعہ خطبات مدراس میں وہاں کی اسلامی جنوبی کانفرنس کی فرمائش پر سنہ ۱۹۲۶ء میں دیا گیا تھا۔ یہ مجموعہ ملک میں بیحد مقبول ہوا اور کئی دفعہ چھپکر شائع ہوچکا ہے اس خطبہ کے معاوضہ میں کانفرنس مذکور نے ایک ہزار کی رقم پیش کی۔ دوسرا مجموعہ جو عرب و ہند کے تعلقات پر ہے ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کی فرمائش پر سنہ ۱۹۲۹ء میں پڑھا گیا تھا۔ اوس کا ترجمہ ہندی اور انگریزی میں بھی شائع ہوچکا ہے۔ اکاڈمی نے اس خطبہ کا معاوضہ ایک ہزار ادا کیا۔ تیسرا مجموعہ جو عربوں کی جہاز رانی پر ہے سنہ ۱۹۳۱ء میں بمبئی کی وزارت تعلیم کی سرپرستی میں بمبئی کی انجمن اسلامیہ ہال میں سنایا گیا تھا اور جس کے معاوضے میں گورنمنٹ نے پانچ سو روپے پیش کئے۔

اعلیٰحضرت سرکار عالیہ بیگم صاحبہ مرحومہ بھوپال کی فرمائش پر آپ نے سیرت عائشہ لکھی تھی جس کے معاوضہ میں سرکار عالیہ مرحومہ نے پانچسو روپیئے انعام مرحمت فرمایا۔ اعلیٰحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ نے کئی بار آپ کو شرف باریابی بخشا اور اپنے دست مبارک سے آپ کو لطف نامے لکھکر ...... علم و فضل کی قدر بڑھائی۔ اور سنہ ۱۹۳۰ء سے از خود ازراہ کمال قدردانی سو روپیے ماہوار کا منصب عطا فرمایا۔

ڈاکٹر سیّد محمود

از سید علی مظفر امام آنجلوی مدیر معاون و مہتم رسالہ ندیم گیا

کسی ملک میں ایسے نفوس معدودے چند ہوتے ہیں۔ جن کی شخصیت سے ملک قوم یا کسی محدود زمانہ کی تاریخ وابستہ ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کے دور حاضر کی تاریخ میں مسلمانان ہند کی انفرادی تحریکات کی سرگذشت اگر مرتب کی جائے تو سرسید کے بعد مسلمانان ہند نے جو سیاسی کروٹ لی ہے اس دور کے بنیادی پتھر کے رکھنے والوں میں ڈاکٹر سید محمود کا وجود گرامی بھی نظر آئے گا۔ اس دور میں ہندوستان کے اسلامی سیاسیات کا مرکز علی گڈھ تھا۔ نوجوان محمود وہاں موجود تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری عبدالمجید خواجہ اور نقدتی احمد شروانی گو یا یہ چار یار تھے۔ جدھر رخ کرتے ایک ساتھ جدھر قدم بڑھاتے ایک ساتھ۔ جس تحریک کو ہاتھ میں لیتے' اپنی پوری طاقت سے' ایک ساتھ چلاتے' نواب محسن الملک نواب وقار الملک' اس دور میں اسلامی سیاسیات کے سرخیل تھے اور یہ چار یار ان کے قدم قدم کے محتسب اور ان کی پشت پناہی کیلئے اس دور کے علی گڈھ کالج کے "کھلنڈرے گستاخ" لڑکوں کی بے پناہ فوج ۔ اکابر ان نوخیزوں کے ہاتھ کبھی جھجکتے' کبھی گوشمالی کرنی چاہتے اور کالج سے شہر بدر کرتے اور پھر منت وسماجت سے کالج میں بلائے جاتے اس طرح احباب باصفا ہندوستان کی اسلامی سیاسیات میں حصہ لیتے رہے۔ اور اپنی گویا گھروندے کی زندگی میں ہندوستان کے مستقبل کا خمیر تیار کرتے رہے۔

علی گڈھ کے اس دور میں "پان اسلامزم" کی عالمگیر تحریک جاری تھی۔ یہی سودا لئے سید محمود ولایت گئے۔ اب "دشمنوں" سے مقابلہ انہیں کے گھر پر تھا' بہت سی غلط فہمیاں انکی دور ہوئیں اور بہت سی غلط فہمیاں انھوں نے دور کیں۔ یورپ میں اس دور میں اسلامی سیاسیات سے جو اکابر دلچسپی رکھتے تھے۔ ان سے ان کے براہ راست مراسم پیدا ہوئے۔ جو ذاتی تعلقات کی حد تک پہنچ گئے چنانچہ آج بھی ذخیرہ مکاتیب میں یورپ کے بہ کثرت مشاہیر کے بے شمار تاریخی خطوط محفوظ ہیں۔

یورپ سے واپسی کے بعد جنگ بلقان کا دور آتا ہے۔ پھر تحریک خلافت شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد تحریک ترک موالات کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ سنہ ۳۵ء میں اس کا پہلا ثمرہ صوبہ وار اصلاحات سنہ ۳۵ء کی شکل میں نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ اور ڈاکٹر محمود ہمارے صوبہ کی وزارت کے عہدہ جلیلہ پر نظر آتے ہیں۔ اور وزارت کے خاتمہ کے بعد وہ پھر ہندوستان کی سب سے بڑی منظم سیاسی جماعت کی مجلس عاملہ کے رکن رکین منتخب ہو جاتے ہیں۔ یہ دور ابھی ہماری آپ کی نگاہوں کے سامنے سے گذر رہا ہے۔

ضرورت ہے کہ اس شخصیت کی زندگی کے جملہ خط وخال پوری تفصیل سے قلمبند کئے جائیں۔ یہ ارادہ انشاء اللہ کتاب حیات محمود کی ترتیب سے پورا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب ممدوح نے ازراہ نوازش اپنے نام کے خطوط اور بعض دوسرے قلمی مسودے عنایت فرمائے ہیں۔ موصوف سے ہم نے یہ چیزیں اس لئے حاصل کی تھیں کہ تاریخی شخصیتوں کی نادر روزگار قلمی تحریریں' ندیم کے ذریعہ ذوق عام کی جائیں۔ لیکن جب میں نے ان تاریخی دستاویزات کا مطالعہ کیا تو سب سے پہلے جس چیز نے میرے دل و دماغ کو متاثر کیا وہ خود سید محمود کی قابل احترام شخصیت تھی۔ اور اسی وقت حیات محمود کی ترتیب کا خیال ذہن میں آیا۔ چنانچہ ہم نے مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی مدیر ندیم سے درخواست کی کہ وہ ڈاکٹر صاحب موصوف سے یہ قیمتی تاریخی دستاویزات مستقل طور پر حاصل فرمائیں۔ موصوف نے میری درخواست قبول فرمائی اور ——————— یہ قیمتی کاغذات دفتر میں آگئے۔ جو اب راقم الحروف کے زیر مطالعہ ہیں۔ سردست بہار نمبر کی خاطر سے چند سطروں میں محمود کی سیرت کے مختلف ابواب کا خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور پھر انشاء اللہ ناظرین ان کے تفصیلی معلومات ومباحث حیات محمود میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

(۱)

ڈاکٹر سید محمود کی ولادت سنہ ۱۸۸۹ء میں ضلع غازی پور کے ایک قدیم تاریخی مردم خیز قصبہ سید پور بھتری میں ہوئی بمقام بھتری

کو ہندوستان کے عہد رفتہ میں غیر معمولی تاریخی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بھتری "بھیم" اور "تری" سے مرکب ہے۔ یعنی یہ بھیم کی پیدائش کا مقام ہے۔ یہ مقام اس زمانہ میں راجدھانی تھا۔ آج بھی آثار قدیمہ یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ایک لاٹ یہاں اب بھی موجود ہے۔ جو بودھوں کی پہلی شکست کی یادگار ہے۔ یہ فتح سمندر گپت نے پہلی مرتبہ یہاں حاصل کی تھی۔ ابھی کچھ زمانہ گذرا۔ کہ اس موضع میں پتھر کا ایک طباق ملا۔ جو دھوپ کے ساتھ رنگ بدلتا ہے۔ اس سے علم ہیئت کا گہرا تعلق تھا۔ مہاراجہ بنارس نے اس کو حاصل کرنا چاہا۔ مگر نہیں دیا گیا۔ اسی موقع پر چاندی کی کچھ تختیاں برآمد ہوئی تھیں۔ جو کلکتہ کے عجائب خانہ میں محفوظ ہیں۔ اسیطرح وقتاً فوقتاً قیمتی اشیا اس موضع سے برآمد ہوتی رہیں۔ جسکی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں اس قصبہ میں قد آدم سے زیادہ کھدائی قانوناً ممنوع قرار دیدی گئی۔ یہ ممانعت پھر کبھی اٹھائی نہیں گئی۔ اب بھی کبھی کبھی سونے کے چھوٹے چھوٹے سکے یہاں مل جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے خاندان میں کتابوں کا قیمتی ذخیرہ بھی تھا۔ اس کتب خانہ کا بیشتر حصہ انگریزی تسلط کے زمانہ میں ضائع ہوگیا۔ کچھ بیش قیمت کتابیں انگریزوں نے منتقل کرلیں۔ کچھ تھوڑی سی کتابیں اس خاندان میں اب بھی باقی رہ گئی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کا خاندان لودیوں کے زمانہ میں صوبہ بہار کے سرحدی علاقہ میں آکر آباد ہوا۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کا خانوادہ عہد قدیم سے ایک "بہاری خاندان" ہے۔ پھر یہاں سے منتقل ہو کر سید پور بھتری چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا خانوادہ اس دور کے ممتاز مشائخ میں گذرا ہے۔ اکبر جب بنگال کی فتح کے خیال سے چلا تو سید پور بھتری میں اس خاندان کے شیخ سے ملنا چاہا۔ مگر انھوں نے انکار کیا اور چند عدد بیل بھیجدئے۔ واپسی میں اس نے ملنے کی کوشش کی پھر وسیع جائداد وقف کی۔ وہ جائداد اب تک ڈاکٹر صاحب موصوف کے خاندان میں موجود ہے۔ رفتہ رفتہ موصوف کا خاندان رؤسا کی صف میں آگیا۔ اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے دادا مرحوم کی وفات کے وقت ڈھائی لاکھ سالانہ آمدنی کی جائداد موجود تھی۔

مقام سید پور اکبر کے زمانہ میں سرکار جونپور میں تھا۔ پھر نئی تقسیم سے غازی پور میں آیا۔ یہ خاندان اس جوار کے ممتاز ذی اثر رؤسا میں شمار کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے دادا مرحوم قاضی سید فرزند علی صاحب تھے۔ وہ اس جوار کے ممتاز ذی علم و ذی اثر رئیس تھے انکی داد و دہش کے افسانے اب بھی اس جوار کی بڑی بوڑھیوں کی زبان پر ہیں۔ موصوف کے بڑے چچا مولانا اسمٰعیل شہید کے زیر علم آئے اور جہاد میں جام شہادت نوش کیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے والد بزرگوار کا اسم گرامی جناب ملا سید محمد عمر صاحب تھا۔ یہ علوم دینیہ میں دستگاہ رکھتے تھے۔ تصوف کا وجدانی ذوق تھا۔ مولانا عبدالعلیم آسی مرحوم کے تلامذہ میں تھے۔ جناب شاہ غلام معین الدین جو سارن میں مدفون ہیں۔ ان سے بیعت کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو بھی مولانا عبدالعلیم آسی سے شرف بیعت حاصل ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے ایک بہنوئی مولوی سید محمد عمر صاحب تھے۔ اگلے وقتوں کے بزرگوں کے حفظ مراتب کا یہ حال تھا کہ مولانا آسی شاہ غلام معین الدین کے عرس میں تشریف لاتے تھے۔ مولوی سید محمد عمر بھی یہاں اس سلسلہ میں آیا کرتے۔ مولانا آسی کسی مجلس میں ہوتے اور وہاں مولوی محمد عمر صاحب پہنچتے تو مولانا اپنے کبر سنی کے باوجود ان کی تعظیم کے لئے سر و قد کھڑے ہوجاتے اور ان سے خوردانہ ملتے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ تقریباً تین سو برس پہلے ان کے خاندان کے کسی بزرگ نے مولانا کا عمر کے خاندان کے کسی بزرگ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اور محض اس وجہ سے اس جذبۂ احترام کے ساتھ وہ ان سے پیش آتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے طریق زندگی میں پرانی تہذیب و تمدن کا جو غیر معمولی اثر ہے وہ انہی بابرکت صحبتوں کا فیض ہے۔ اس کا اعتراف اکبر الہ آبادی مرحوم نے اکثر اپنے منظوم خطوں میں کیا ہے۔ ان کے خطوں سے ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کی شرافت اور قدیم تہذیب و متانت کے حامل ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ افسوس کہ ان خطوں کے نقل کرنے کا اختصار بیان کے باعث یہاں پر موقع نہیں!

ڈاکٹر صاحب موصوف نے ابتدائی کتابیں مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب سے جونپور میں پڑھیں۔ پھر اپنے بہنوئی مولوی سید محمد عمر صاحب کی معیت میں بنارس چلے آئے۔ یہاں مولوی محمد عمر صاحب نے ڈاکٹر صاحب موصوف کے والد کے اختلاف کے باوجود ان کی انگریزی تعلیم شروع کرائی۔

بنارس میں تین سال تک انگریزی کی ابتدائی تعلیم جاری رہی۔ انگریزی تعلیم کے اثر سے آنکھیں کھلیں۔ مولوی محمد عمر صاحب ملک کے نئے ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے یہاں کتابیں مہیا تھیں۔ علامہ شبلی نعمانی وغیرہ کی تصنیفات کا مطالعہ یہیں شروع کیا۔ ایک انجمن اخوان الصفا کے نام سے قایم تھی۔ جس میں ہر ہفتہ تقریریں ہوتی تھیں۔ موصوف اس انجمن سے وابستہ ہوئے اس کے جلسوں میں تقریریں کرتے رہے۔

ابتدائی تعلیم میں موصوف کے طبعی رجحانات کو دیکھ کر ان کے سرپرستوں کو ان کے علی گڈھ بھیجنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ وہ تعلیم کی غرض سے سنہ ۱۹۰۸ء میں بنارس سے علی گڈھ بھیج دئے گئے اور موصوف کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

(۲)

اس زمانہ میں علی گڈھ مسلمانان ہند کی ذہنی سیاسی تعلیمی اور علمی ترقیوں کا محور تھا جو آواز علی گڈھ سے اٹھتی سارے ہندوستان میں پھیل جاتی۔ حکومت برطانیہ مسلمانوں کے قومی دملی مفاد کے لئے علی گڈھ ہی کو مسلمانوں کا ترجمان جانتی تھی۔ سید محمود بچپن سے علی گڈھ گئے۔ گرچہ ان میں ذہنی بیداری بنارس ہی کے مختصر قیام میں پیدا ہو چکی تھی۔ مگر ان کی حقیقی نشو و نما علی گڈھ ہی میں ہوئی۔ یہی زمانہ تھا جب مسلمانوں میں ایک آزاد خیال طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم اور مولانا سید وحید الدین سلیم مرحوم وغیرہ مسلمانوں کو ایک نئی راہ پر لگانا چاہتے تھے۔ مغرب پرستی کا تخیل اب نگاہوں میں کھٹکنے لگا تھا۔

دوسری طرف جو انگریز پروفیسر علی گڈھ سے وابستہ تھے۔ انکے تخیلات بھی بدل رہے تھے۔ اس کا اندازہ طلبہ علی گڈھ کے رسالہ "عرض حال" سے ہوسکتا ہے۔ مرقوم ہے:-

> سرسید کے دور میں علی گڈھ کالج کا بہت بڑا مقصد یہ تھا کہ یورپینوں اور مسلمانوں کے درمیان دوستانہ مراسم پیدا ہوں اور جو گوناگوں مغالطات ایک دوسرے کی نسبت دلوں میں بھرے ہوئے ہیں وہ رفع ہو جائیں
>
> ...... مگر سرسید کے انتقال کے ساتھ ہی، تین برس کے زمانہ ہی میں، یہ بات زبان سے سنی جانے لگی کہ پروفیسروں کا سلوک طلبہ کے ساتھ پہلا سا نہیں ہے ...... سرسید کے زمانہ میں جس شئے کو ہم رحمت سمجھتے تھے وہ اب زحمت معلوم ہونے لگی۔ سرسید کے زمانہ میں جس قدر یوروپین دخیل ہوتے تھے، ہم خوش ہوتے تھے ...... اپنی حالت غیر منظم نظر آنے لگی۔ اور آہستہ آہستہ بے اطمینانی کے بجائے تشکوک اور تشکوک کے بجائے بدظنی اور بدظنی کے بجائے منافرت پیدا ہو گئی۔ اور سب فرشتہ رحمت کی شکل آنکھوں میں مہیب ــــ معلوم ہونے لگی ہے"
>
> (رسالہ عرض حال، مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڈھ بحضور ٹرسٹیان و سابق طلبہ مدرسۃ العلوم صفحہ ۲۷)

جس وقت سید محمود نے علی گڈھ میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے گرد و پیش یہی ماحول قائم تھا اور اسی فضا میں انکی ذہنی تربیت کی داغ بیل پڑی اور آگے چل کر اسی بنیاد پر ایک وسیع عمارت تیار ہوئی۔

اس کے ساتھ ایک طبقہ ایسا بھی علی گڈھ میں موجود تھا۔ جس کی ذہنیت مذکورہ بالا ماحول سے علیحدہ نشو و نما پا رہی تھی۔ اس زمانہ میں علی گڈھ پر انگریز پرنسپل اور پروفیسروں مسٹر مارلین وغیرہ چھائے ہوئے تھے "انگریز بادشاہ" اور "ہم رعایا" کا احساس بڑھ رہا تھا۔ سطحی دماغوں میں ہر بڑے شخص کے متعلق بطور تمثیل یہ تخیل آتا "یہ بڑا انگریز ہے" یعنی یہ خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں فطری بلندیوں کے جوہر موجود ہیں۔ "یہ بڑا ہندوستانی ہے" یعنی یہ برائیوں سے گھرا ہوا ہے اس میں فطری پستی پائی جاتی ہے"

کالج کے طلبہ میں سے چند ہوشمند حساس طبیعت والوں کو یہ ناگوار گزرا اور انہی میں سید محمود بھی تھے۔ اس پست ذہنیت کے خلاف جس نے عملی طور پر سب سے پہلے حصہ لیا وہ سید محمود ہی تھے۔ یہ اور ان کے چار یار عبدالرحمٰن بجنوری، تصدق احمد خاں شروانی، عبدالمجید بیرسٹر، قاضی تلمذ حسین سے نے طالب علموں کی اس ذہنی مرعوبیت کو دور کرنا چاہا، ایک خفیہ سائٹی کی بنا ڈالی گئی۔ یہ گویا کالج کے احاطہ میں منچلے نوجوانوں کی ایک جماعت تھی۔ اس سوسائٹی کو اندر ہی اندر عروج حاصل ہونا شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ کالج میں گویا دو قسم کے نظریوں کے طلبہ تیار ہو گئے۔ ایک "باغی سرکار" دوسری "شہنشاہیت پرست"۔ ـــــــــ

اس خفیہ سوسائٹی میں مضامین پڑھے جاتے اور مباحثے ہوتے کہ انگریزی طاقت کو کیونکر فنا کیا جائے۔ اسی سلسلہ میں عملی جدوجہد شروع ہوئی۔ سید محمود نے مصر کے مشہور مخالف انگریز رہنما مصطفےٰ کامل سے خفیہ خط و کتابت شروع کی۔ اس سلسلہ میں ان کے چند خط موصول ہوئے مگر افسوس کہ اب وہ ضائع ہو گئے۔

اسی زمانہ میں مسٹر کارنا جو اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے کالج کے پرنسپل بنائے جانے لگے۔ نوجوان محمود کے لئے اس کا برداشت کرنا دشوار تھا۔ محمود نے سخت مخالفت کی۔ مسٹر مارنین محمود کو کالج سے نکالنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ مگر نواب محسن الملک نے پشت پناہی کی۔ ٹرسٹیوں میں معاملہ گیا اور پھر دب دبا گیا

اسی زمانہ میں نواب محسن الملک سے ان کے ذاتی مراسم پیدا ہوئے۔ رفتہ رفتہ انہیں محمود کی ذات پر اعتماد ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس زمانہ کی سیاست ہند میں صیغہ راز کا وہ اہم واقعہ بھی ان کے لئے راز نہ رہ سکا۔ جبکہ ایک وفد لارڈ منٹو سابق وائسرائے ہند کی خدمت میں مسلمانوں کی شکایت کا عرض حال کرنے کے لئے پیش ہوا تھا اور دراصل یہ وفد خود لارڈ منٹو کا در پردہ بلایا ہوا تھا۔ آگے چل کر جب سیاسی حیثیت سے اس واقعہ کے طشت از بام کرنے کی ضرورت پڑی اور سید محمود نے اس کو پریس میں شائع کرایا تو مسٹر محمد امین زبیری نے کمال بیباکی سے اس کی تردید کی۔ گرچہ اسوقت کوئی ثبوت سید محمود کے پاس موجود نہ تھا لیکن مشیت ایزدی دیکھئے کہ جب لیڈی منٹو کی ڈائری شائع ہوئی تو اس میں وفد کے خود بلانے کا تذکرہ تصریح سے موجود پایا گیا۔ اور ارباب سیاست انگشت بدنداں ہو کر رہ گئے۔

اگرچہ سید محمود، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے خاص معتمد تھے، کالج کے چھوٹے بڑے معاملوں میں ان سے مشورے کرتے، اسلامی سیاسیات پر ان کے نقطۂ نظر کو معلوم کرتے اور ان کی رہنمائی کرنی چاہتے۔ لیکن انگریز قوم، انگریزی حکومت، اور کالج کے انگریز اسٹاف کے خلاف جو آگ اندر اندر سلگ رہی تھی وہ تیز ہوتی گئی۔ "کالج کا انگریز اسٹاف اپنے کو "حاکم" اور طلبہ کو "محکوم" سمجھنے لگا"۔ اس طرح خاص ہندوستانی طلبہ اور انگریز اسٹاف میں مغایرت کی خلیج پیدا ہو گئی۔ اور آہستہ آہستہ وہ بڑھتی گئی یہاں تک کہ ۱۹۰۷ء میں یہ آگ بھڑک اٹھی اور کالج کی اسٹرائک کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا جس نے سارے ہندوستان کو علی گڑھ کی طرف ایک مرتبہ پھر متوجہ کر دیا۔ اسٹرائک کرنے، کرانے، سزا بھگتنے اور معاف کئے جانے، غرض کہ اس کی ہر منزل میں سید محمود سب میں پیش پیش اور کالج کے نوخیز طلبہ کے محبوب ترجمان اور مخلص رہنما تھے۔

۱۹۰۷ء کی یہ اسٹرائک کن اسباب سے پیش آئی، اس کا اشارہ اس اقتباس میں گذر چکا ہے جو "عرض حال" سے اوپر نقل کیا گیا۔ بہانہ کے لئے واقعہ صرف اس قدر پیش آیا کہ انگریز پرنسپل نے غلام حسین کو ناروا طریق پر بعض غیر صحیح الزامات لگا کر کالج سے نکالنے کا حکم دیا۔ اور اس ہمدردی میں طلبہ نے متفقہ اسٹرائک کی۔ ٹرسٹیز اور کالج اسٹاف نے گفتگو کے لئے طلبہ کے ترجمان طلب کئے۔ طلبہ نے ۱۵ طلبہ کو نامزد کیا۔ جن میں سید محمود صاحب کا نام صف اول میں تھا۔ پھر طلبہ کی سیکڑوں کی تعداد میں سے چار سرغناؤں کو چنا گیا۔ جن کے نکال دئے جانے کے بعد گویا کالج مفسدوں کے وجود سے پاک ہو جاتا تھا۔ یہ چاروں وہی چار یار یعنی "عبدالرحمٰن بجنوری، تصدق احمد شروانی، عبدالعزیز اور سید محمود" تھے۔ (عرض حال صفحہ   )

اسٹرائک کرنے والوں کے مطالبوں میں بعض مطالبات یہ تھے:-

"بورڈنگ اور ڈائننگ ہال بالکل انگریز پروفیسروں کے سپرد نہ کئے جائیں" ——— اسی طرح

"ملازمان کالج ہندوستانی ہوں یا انگریز، اگر ان کی نااہلیت ثابت ہو جائے تو برطرف کر دئے جائیں"

اسی طرح شکایات میں انگریز پروفیسروں کے ہاتھوں ڈائننگ ہال کی بدنظمی، مسٹر کارنا کا برا سلوک، مسٹر براؤن کا برتاؤ، پروفیسری کا دباؤ، یونین کلب پر انگریزی اثر، تقریر کی آزادی کی روک تھام اور غیر ضروری سختیاں وغیرہ تھیں۔

یہاں تک کہ مسلم قوم نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی تحریک سے دہلی میں اسٹرائک کے معاملہ کو سلجھانے کے لئے یادگار زمانہ اجلاس ہوا۔ نواب وقار الملک کو جلسے میں شرکت کے لئے سید محمود ہی لانے گئے۔ وہ شریک اجلاس ہوئے۔ پھر مولانا نذیر احمد کی خدمت میں چند طلبہ کو ساتھ لیکر پہنچے۔ ان سے دلچسپ گفتگو ہوئی، انہوں نے اثنائے گفتگو میں فرمایا۔

"تم جانتے نہیں ہو۔ انگریز کتے کی ذات ہے، جہاں ایک کتے نے پیشاب کیا۔ پیشاب لگے یا نہیں ہر کتا وہاں آکر ضرور پیشاب کرے گا"

پھر اثنائے گفتگو میں تیز ہو کر کہنے لگے۔

"بدمعاشو! سودیشی سوجھی ہے، سودیشی! سودیشی سُوت کہاں سے آئیگا۔ کیا تمہاری خالائیں سُوت کاتینگی؟ انگریز کا مقابلہ کرنے چلے ہیں"

اس کے بعد جب سنجیدہ گفتگو پر آئے تو اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ دہلی کے جلسہ میں سب انگریزوں (اسٹاف کالج) کو نکالنا چاہتے تھے، لیکن نواب محسن الملک نے سمجھا بجھا کر رات بھر میں راضی کر لیا۔

اسٹرائک کے سلسلہ میں نواب محسن الملک نے جو خطوط لکھے تھے وہ سب ڈاکٹر سید محمود کے ذخیرہ کاغذات میں محفوظ ہیں۔ اور دفتر ندیم میں آ گئے ہیں۔

اسٹرائک کا خاتمہ بخیر و خوبی ہوا۔ سید محمود کالج میں دوبارہ داخل کر لئے گئے۔ اب یونین کلب میں سید محمود کی پارٹی کا قبضہ تھا۔ یوں تو قبضہ پہلے بھی تھا، مگر پرنسپل کی مداخلت سے بے اثر تھا۔ اسٹرائک کے بعد یونین کلب کو اس پارٹی نے آزادانہ استعمال کیا۔ اور اسکی آواز ملک میں ایک با وزن آواز سمجھی جانے لگی۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے وقت یونین میں مباحثہ ہوا۔ حسینین (سابق ایڈیٹر اینڈ سینیڈ ڈینٹ و حال مقیم امریکہ) سید محمود کے ہم سبق تھے، انہوں نے یونین کے جلسہ میں مسلم لیگ کے پرخچے اڑا دیئے۔ کالج کے کارکنوں کا حصہ اس کی تاسیس میں نمایاں تھا۔ ان لوگوں نے لڑکوں کو بلایا اور سمجھا بجھا کر خاموش رہنے کی تلقین کی۔

علی گڈھ میں سید محمود کا زمانہ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۶ء تک رہا۔ اس اثنا میں ان کی ذہنی نشو و نما جس رفتار پر رہی وہ ان کی کالج کی عملی زندگی سے آشکارا ہے۔ وہ ذہنی طور پر انگریزوں کے دشمن بن چکے تھے، اور انگریز قوم کو ہندوستان کے لئے ایک عذاب تصور کرتے تھے۔

(۳)

سید محمود انگریزی قوم کی دشمنی سے تیار کیا ہوا دل و دماغ لیکر یورپ پہنچے اور انگریزوں ہی کے وطن میں تین سال قیام کیا۔ پھر جرمنی میں اور پھر کیمبرج آئے۔ انگلستان سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی، اور جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ ہندوستان کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھی، اور اس پر وہ عالمانہ نظر رکھتے ہیں۔

وہ ہندوستان سے انگریزوں کے دشمن بن کر گئے تھے لیکن انگلستان میں ان کی صحبت سے اس قوم کی خوبیاں آشکارا ہوئیں۔ اور ذاتی حیثیت سے انگریزی قوم سے جو تنفر تھا وہ دور ہوا۔ لیکن سیاسی خیالات میں مزید پختگی آئی۔ ہندوستان کی آزادی کا خیال ذہن میں جڑ پکڑتا گیا۔ اور انگلستان میں نوجوانی کے جوش میں کچھ دنوں ریولیوشن (انقلابی) سوسائٹی سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن پھر اس پالیسی کی غلطی کا اندازہ ہوا۔ اور اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ یورپ کے زمانہ قیام میں سیاسیات میں بھی نمایاں حصہ لیتے رہے۔ مسٹر بلنٹ، محمود جن کے ارشد تلامذہ میں تھے وہ ان سے مستقبل میں غیر معمولی توقعات وابستہ رکھتے تھے۔ مسٹر بلنٹ ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے انہیں سیاسیات میں ایمانداری کے اصول پر استوار رہنے کا نکتہ ذہن نشین کرایا۔

مسٹر بلنٹ اس عہد کے ممتاز ترین اہل علم اور ماہرین سیاسیات میں سے تھے۔ لیڈی اسکویتھ نے غیر معمولی اہمیت کے ساتھ ان کا تذکرہ اپنی ڈائری میں بار بار کیا ہے۔ اسلامی سیاسیات سے غیر معمولی دلچسپی اور اسلامیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہی مشہور زمانہ اعرابی پاشا کو پھانسی کے تختہ سے بھی اتروانے والے تھے۔ وہ ترکی خلافت سے مایوس اور عرب خلافت کے حامی تھے۔ "فیوچر آف اسلام" میں ان کے یہ خیالات موجود ہیں۔ سید محمود صاحب مسٹر بلنٹ کے ان خیالات کو پولٹیکل تخیلات جانتے تھے۔

مسٹر بلنٹ سے ان کے غیر معمولی ذاتی مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ جنگ بلقان کے بعد انہوں نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو پچیس تیس صفحوں کا مفصل خط لکھا تھا جو ترکی تحریک کے لحاظ سے مایوسانہ تھا۔ ڈاکٹر سید محمود کے نام وہ خط کامریڈ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس زمانہ میں اس خط سے اتفاق ممکن نہ تھا۔ لیکن یہ قابل ذکر بات ہے کہ اس مکتوب میں مسٹر بلنٹ نے جو جو پیشین گوئیاں کی تھیں وہ حرف بہ حرف پوری اتریں۔

مسٹر بلنٹ نے اپنی کئی کتابوں میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ افسوس کہ ان کے اقتباسات پیش کرنے کا موقع اس مختصر مقالہ میں نہیں ہے اور نہ ان مباحث کے چھیڑنے کا۔ حیات محمود میں یہ تفصیلات آپ کی نگاہوں سے گذرینگی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے ذخیرہ مکاتیب میں ان کے نام کے پچاسوں خطوط ہیں جن میں کا ہر مکتوب اپنی اپنی جگہ جداگانہ اہمیت رکھتا ہے اور مستقل سیاسی مباحث پر تفصیلی رائے زنیوں کا حامل ہے۔ یہ مکاتیب دفتر ندیم میں آ گئے ہیں۔ ان کے بیشتر حصے حیات محمود میں ملاحظہ فرمائیگا۔ اور چند کے نمونے کسی آیندہ نمبر میں پیش خدمت ہونگے۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں جب ایران کی تقسیم کا مسئلہ پیش آیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ان دنوں انگلستان ہی میں تھے۔ پروفیسر براؤن اس میں غیر معمولی حصہ لے رہے تھے۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب ان کے بھی زیر درس تھے۔ پروفیسر موصوف بھی ان کی غیر معمولی صلاحیتوں، اصابت رائے، فکر سیاسی، اور حسن تدبیر کے قایل تھے۔ ایرانی مسئلہ کے سلسلہ میں پروفیسر براؤن کے ذریعہ سے مشہور ایرانی قائدین مرزا یحیٰی، آقا تقی وغیرہ سے ڈاکٹر صاحب موصوف کی تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان اکابر ایران کے مشورے سے ایرانی مسئلہ کے لئے انگلستان میں ایک بڑی میٹنگ کا اہتمام کیا۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ ایرانی مسئلہ میں ایران کے ہمنوا تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف انہیں بھی شرکت کے لئے جلسہ میں لائے۔ جلسہ کی صدارت کے لئے میجر سید حسن بلگرامی کو انہوں نے آمادہ کیا۔ لیکن پھر وہ انڈیا آفس کی دھمکی سے صدارت سے انکار کر گئے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے وعدہ کا پاس کو یاد دلا کر دوسرے دن انہیں پھر آمادہ کر لیا۔ جلسے میں پروفیسر براؤن نے ایک ریزولیشن پیش کیا۔ لیکن وہ کماحقہ پوری وضاحت کے ساتھ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے مسٹر بلنٹ کو ایک کھلا ہوا ریزولیشن پیش کرنے پر آمادہ کر لیا۔ جس میں سلطان ٹرکی و امیر افغانستان سے ایران کے مسئلہ میں مداخلت کرنے کی استدعا کی گئی۔ یہ ریزولیشن کامیابی کے ساتھ جلسہ میں منظور کر لیا گیا۔ اس ریزولیوشن سے انگلستان کے سیاسی حلقہ میں ایک ہلچل پڑ گئی۔ ٹائمز نے دوسرے دن اس کی مخالفت میں سخت آرٹیکل لکھا۔ ہندوستان میں اس کے خلاف سخت آواز بلند کرائی گئی۔ اور بالآخر یہ مسئلہ دب دبا کر ادھورا رہ گیا۔ اسی طرح مختلف سیاسی مباحث خصوصاً مسئلہ ایران و ٹرکی پر یورپ کے مختلف اکابر سے وہاں کے زمانہ قیام میں بحث و مباحثے جاری رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انگلستان میں انگریزی ماہرین سیاست کے پہلے سے دو طبقے رہے۔ ایک تو وہ جو حکمران جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے سیاسی نظریے، خیالات اور ہندوستان کے متعلق اس کی خواہشات جداگانہ ہیں۔ اور دوسرا آزاد خیال انگریز ماہرین کا طبقہ ہے۔ جس میں اس زمانہ میں مسٹر بلنٹ وغیرہ تھے۔ یہ لوگ ہندوستانی مسائل پر آزادانہ زاویہ نگاہ سے غور کرنے کے عادی رہے ہیں۔

مسٹر بلنٹ "ایجپٹ" نام سے ایک سالہ نکالتے تھے۔ وہ لارڈ لٹن کے سمدھی تھے۔ ہندوستانی سیاسیات سے انہیں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ وقتاً فوقتاً یہاں کے مسائل و مباحث اس کے اوراق پر آتے گئے۔ لارڈ رپن کا وہ واقعہ قابل ذکر ہے، جس میں انہوں نے پٹنہ کے ایک قدیم شریف رئیس کے خانوادہ کے چشم و چراغ ولایت علی خاں پر ایک انگریزی ملیٹری نے کوڑا چلا دیا، اور لارڈ رپن نے فوراً وائسرائے کو تار دیکر مطلع کیا اور اس کا تدارک عمل میں آیا۔

ڈاکٹر صاحب کے مراسم اسی طبقہ کے مقتدر اصحاب سے تھے۔ وہ لوگ بھی اس بیدار مغز ہندوستانی نوجوان کے سیاسی افکار و جذبات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، اور ان سے متاثر ہوتے تھے۔ اور دوسری طرف ڈاکٹر صاحب موصوف کے سیاسی خیالات کی تربیت ہوتی رہی۔ اور دونوں ایک دوسرے سے اثر قبول کرتے رہے۔ چنانچہ پروفیسر براؤن۔ ایرش لیڈر، جان ڈمنڈ جو بعد میں ایران کے قونصل مقرر ہو گئے تھے، اور سر راس شین نے مختلف سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا تذکرہ اپنی تصنیفات میں کیا ہے اور یہ کتابیں مطبوع ہو چکی ہیں۔ نیز ان اکابر سے دیرینہ مراسم قائم رہے اور مسلسل خط و کتابت جاری رہی۔ ان مشاہیر کے مکتوبات کا ذخیرہ بھی محفوظ تھا اور وہ دفتر ندیم میں آ گیا ہے۔ ان کتابوں کے اقتباسات ان کے مسائل و مباحث اور خطوط میں ان مختلف اکابر کے مختلف اہم سیاسی مسائل پر نقطۂ نظر کسی آئندہ فرصت میں نذر ناظرین ہونگے۔ ورنہ یہ ذخیرہ تمام و کمال حیاتِ محمودؔ میں تو منتقل ہو ہی جائے گا۔

ان اکابر نے ہندوستان کی سیاسیات پر وقتاً فوقتاً جو رائے زنی کی وہ حیرت انگیز ہے۔ مسٹر بلنٹ کی مسلمانان ہند کے متعلق یہ آخری وصیت حیرت سے پڑھنے کے لائق ہے کہ

"ہندوستان کی قومی تحریک میں مسلمان شریک ہوں ورنہ ہندو ہندوستان پر چھا جائیں گے۔"

مسٹر بلنٹ کی اس وصیت کے آئینہ میں ہم دور حاضر کی ہندوستانی سیاست کے جملہ خط و خال کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ترکوں کی ہمدردی میں انگلستان میں جلسہ کیا، اور یورپ کی نگاہیں ان کی جانب اٹھ گئیں۔

ڈاکٹر صاحب کے یورپ کے زمانہ قیام میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ رائٹ آنریبل جسٹس امیر علی نے لندن میں مسلم لیگ قائم کی۔ مارلے منٹو ریفارم کے سلسلہ میں ڈاکٹر سید محمود کو مسلم لیگ کا جوائنٹ سکریٹری بنایا گیا۔ لیگ کی میٹنگ میں سر علی امام مرحوم نے مشترکہ انتخاب کی تحریک پیش کی اور ڈاکٹر سید محمود نے اس کی تائید میں جلسہ کرا لیا اور وہ کامیاب ہوا۔

یہ واقعہ مسٹر امیر علی کے لئے ہوش ربا ثابت ہوا۔ انہوں نے انگلستان میں ایک پمفلٹ لکھ کر چھپوایا جس میں اس واقعہ کو دکھایا کہ ایک بہاری لڑکے (سید محمود) نے علی امام کے بہکانے سے یہ جرأت کی، اس کے بعد سر آغا خاں اور موسیٰ خاں وغیرہ نے امیر علی کو اس واقعہ پر سید محمود کی تادیب کے لئے زور دیا۔ اور عدم صورت میں علیحدگی کی دھمکی دی۔ آخر امیر علی اور سید محمود میں نہایت سخت کشمکش کی نوبت آئی اور آخر سید محمود نے لیگ سے استعفےٰ دے دیا۔ امیر علی کے جو خطوط اس سلسلہ میں سید محمود کے پاس آتے گئے، اور جو اختلافات سے مملو ہیں اس وقت تک محفوظ ہیں اور دفتر ندیم میں آ گئے ہیں۔

سید محمود کے خلاف امیر علی کا یہ پمفلٹ بہت بڑی تعداد میں ہندوستان بھیجا گیا اور یہاں اس کی عام اشاعت کی گئی۔ اس کی ایک کاپی ڈاکٹر سچدا آنند سنہا کے پاس اب تک محفوظ ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف ۱۹۰۷ء میں ولایت تشریف لے گئے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں واپس آئے۔ چھ سال کے زمانہ قیام کے بعد علمی تعلیمی اور سیاسی حیثیت سے ایک پختہ کار انسان تھے۔ زمانہ کے سرد گرم اور نشیب و فراز کو پہچان چکے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں علی گڈھ میں جس فضا میں انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اس فضا کا اب وہ گہرا مطالعہ کر چکے تھے۔ ان کی رائے پختہ اور نظر وسیع ہو چکی تھی۔ اور ہندوستان کی خدمت کا پرجوش ولولہ دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ غرض انہیں تخیلات اور ذہنی نشو و نما کے ساتھ وہ ولایت سے واپس ہو کر ۱۹۱۳ء میں ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہیں۔

(۴)

ہندوستان واپس آنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے مستقل مستقر کا سوال سامنے آیا۔ ایک طرف جونپور کے نامی رئیس نواب عبد المجید (نواب سر محمد یوسف کے والد محترم) وغیرہ تھے۔ دوسری طرف سر سید علی امام مرحوم تھے۔ الہ آباد یا پٹنہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو ان کی پریکٹس کے لئے منتخب کرنا تھا۔

ڈاکٹر سید محمود پہلی مرتبہ ۱۹۰۴ء میں بہار تشریف لائے تھے، سر علی امام نے ان کی ہوشمندی دیکھی اور گرویدہ ہوئے۔ رفتہ رفتہ ان سے غیر معمولی روابط پیدا ہو گئے۔ اور انہیں چھوٹے بھائی کے بمنزلہ اپنے دل میں جگہ دی۔ ولایت سے واپسی کے بعد سر علی نے ڈاکٹر صاحب کو آخری مرتبہ الہ آباد میں زور دیا کہ وہ پٹنہ ان کی معیت میں چلے آئیں۔ دوسری طرف نواب عبد المجید نے روکا۔ لیکن سر علی کی کشش غالب آئی اور وہ پٹنہ میں پریکٹس کرنے کے لئے ۱۹۱۳ء میں چلے آئے۔ چند ہی دنوں میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ دوسری طرف سیاسیات میں بھی عملی حصہ لیتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رفتار ترقی کو دیکھ کر مسٹر مظہر الحق مرحوم بھی ان سے محبت کرنے لگے۔ اور ۱۹۱۵ء میں ان کی صاحبزادی سے ان کی شادی انجام پائی۔

پٹنہ میں ڈاکٹر صاحب کی پریکٹس کا زمانہ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۱ء تک رہا۔ ان آٹھ برسوں میں وہ پٹنہ ہائیکورٹ کے ممتاز بیرسٹروں اور صوبہ بہار کے مدبر رہنماؤں کی صف اول میں داخل ہو گئے تھے۔ جنگ بلقان میں انہوں نے سخت تقریریں کی، اور اہل شہر اور حکمران طبقہ دونوں ان کی طرف غیر معمولی طور پر متوجہ ہو گئے۔ اب وہ شہر کی رہنمائی کی خدمت انجام دینے لگے۔

(۵)

اس کے بعد ۱۹۲۱ء کا ہنگامہ خیز انقلابی دور ہندوستان میں آیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ۱۹۱۵ء سے مستقل ممبر تھے خلافت کی تحریک کے بانیوں میں تھے، اگر اس دور کی ان کی بنیادی خدمات منظر عام پر آئیں تو حیرت و استعجاب سے نگاہیں اٹھ جائیں لیکن افسوس کہ ان مختصر سوانح میں تفصیلات کی گنجائش نہیں۔ پھر اس دور میں ان کے جو خدمات ملک میں انجام پاتے رہے، وہ نگاہوں سے پوشیدہ بھی نہیں ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے پریکٹس چھوڑ دی اور مرکزی خلافت کمیٹی کے جنرل سکریٹری کے اہم اور ذمہ دار عہدہ پر ان کا تقرر عمل میں آیا اور بمبئی میں قیام پذیر ہوئے۔ اس دور میں ان کے خدمات کا ایک جداگانہ باب ہے، جس کو ہم یہاں پر نظر انداز کرتے ہیں۔

اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں پنڈت جواہر لال کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری کے اہم ترین عہدہ پر سرفراز کئے گئے۔ اور ملک و قوم کے غیر فانی خدمات انجام دئے۔ قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں اور ایثار و قربانی کے نہ مٹنے والے نقوش قائم کئے۔ لیکن افسوس کہ ان کی تفصیلات میں بھی ہم جانے کے لئے تیار نہیں۔

اس کے بعد سنہ ۱۹۲۵ء سے دوبارہ پریکٹس شروع کی۔ اس اثنا میں ملک کے اکابر ان کی معاونت کے حاصل کرنے کے لیئے اصرار کرتے رہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۶ء میں دوبارہ جنرل سکریٹری بنائے جانے لگے۔ لیکن اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ بالآخر سنہ ۱۹۲۹ء میں ایثار و قربانی کی دعوت کو دوبارہ لبیک کہنے پر مجبور ہو گئے۔ اور سنہ ۱۹۲۹ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک مسلسل سات برس تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری کے عہدہ پر سرفراز رہے۔ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کی ممبری کا سلسلہ جو شروع سے قایم ہوا وہ آخر تک جاری رہا۔ اس دور میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا۔ ہزاروں ہزار جلسوں میں پرجوش تقریریں کیں۔ خصوصاً صوبہ بہار کے چپہ چپہ کو چھان مارا۔ بحیثیت ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور جنرل سکریٹری کی حیثیت سے وہ لازوال خدمات انجام دئے۔ جن کے پایدار نقوش ہندوستان کی تاریخ میں محفوظ رہ گئے۔ اور جن کی تفصیلات تو ایک مستقل تصنیف کی محتاج ہیں۔

جس زمانہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی غیر قانونی جماعت تھی اور اس کی خبروں کا چھپنا چھپانا قانوناً ممنوع تھا۔ اس دور میں ڈاکٹر صاحب نے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے "خفیہ مسنجر سسٹم" کا جو حیرت انگیز طریق اختیار کیا۔ اس نے کانگریس کی تحریک کو بہت آگے بڑھایا۔ مسنجر سسٹم کو ڈاکٹر صاحب نے کس طور پر ترتیب دیا تھا اور کس کامیاب طریقہ سے اس پر عمل کیا گیا، اس کی تحریری تفصیلات محفوظ ہیں۔

پھر ہندوستانی ملوں پر معاہدہ کی جو پابندی عاید کی گئی وہ بھی ڈاکٹر صاحب ہی کے جنرل سکریٹری شپ کا رہین منت تھا۔ ایک دن انہوں نے بیٹھے بیٹھے ملوں کے لیئے چند شرائط قلمبند کیئے۔ پھر مل والوں کو اطلاع دی۔ پندرہ دن کی نوٹس جاری کی۔ اخبارات میں اطلاع شایع کرائی۔ پھر ملوں کی ایک فہرست چھاپی اور اس فہرست کی مندرجہ ملوں کی تجارت کو غیر معمولی فروغ، اور خارج شدہ ملوں کی تجارت کے مندہ پڑجانے سے سارے ہندوستان کی ملوں میں ہلچل پڑ گئی۔ کانگریس کی شرایط پر دستخط کرنے کے لیئے مل والے بیتاب ہو کر دوڑے آئے۔ دفتر میں تاروں کا تانتا بندھ گیا اور پھر لال املی وغیرہ نے ڈاکٹر صاحب کے دستخط سے کر ان کے سارٹیفکٹ چھاپے اور سودیشی تحریک کے نقطہ نظر سے ہندوستان کی ملوں پر کانگریس کو کامل اقتدار حاصل ہو گیا۔ ملوں کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی دو تحریریں اس زمانہ میں اخبارات میں چھپتی رہتی تھیں۔ ان کے مطالعہ کرنے والوں کی یاد تازہ ہوئی ہوگی ان تحریروں کا مکمل مواد اس وقت ہمارے سامنے ہے، جن میں ملوں کے بائیکاٹ کے متعلق ان کی وہ مفصل مطبوعہ رپورٹ بھی ہے جو اس زمانہ میں انہوں نے شایع کی تھی

آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کی خدمات مختلف نوعیتوں کے تھے۔ ایک طرف وہ ملک و قوم کی بنیادی خدمات میں دیگر اکابر کے رفیق کار رہتے تھے دوسری طرف وہ مسلمانان ہند کے مفاد کی نگرانی ذمہ دارانہ طریق پر انجام دیتے تھے۔ موپلا قوم پر جو مظالم ڈھائے گئے تھے۔ ان کی تحقیقات کی پہلی آواز ڈاکٹر صاحب ہی نے اٹھائی۔ اور وہ کامیاب ہوئی، پھر سرحد کے مظالم کی تحقیقات کی تحریک بھی انہیں کی طرف سے پہلی مرتبہ اٹھائی گئی۔

دوسری طرف ڈاکٹر صاحب موصوف فرقہ پرور، حکومت پرست مسلم جماعتوں کے زہر کا علاج بھی کرتے رہے۔ اس دور میں مسلم لیگ دو جماعتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک جناح لیگ تھی، دوسری سر شفیع لیگ، اور اسی دوسری لیگ کو اقتدار حاصل تھا۔ مسٹر جناح سیاسیات سے گویا کنارہ کش تھے پھر آل انڈیا مسلم کانفرنس کا ڈھونگ رچایا گیا تھا۔ یہ تمام رجعت پسند عناصر ملک کی ترقی و بہبود میں سخت روڑے اٹکا رہے تھے۔ اور سب کچھ مسلم قوم اور مذہب اسلام کے نام سے انجام دے رہے تھے۔ ان رجعت پسند عناصر کے استیصال کے لیئے ڈاکٹر صاحب نے سنہ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے قیام کی تحریک پیش کی۔ ملک کے قوم پرور طبقہ نے اس صدا کو لبیک کہا۔ اور لکھنؤ اور دوسرے مقامات پر اس کے پرجوش جلسے ہوئے، اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کو مجبوراً نیشنلسٹ مسلمانوں کی آواز سے دبنا پڑا۔ اور دوسری طرف حکومت برطانیہ نے بھی کوئی قدم جلد اٹھانے سے گریز کیا۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف مسلمانوں کے ملی تحفظات کے مطالبے سے بے پروا رہے۔ اس سلسلہ میں ان کی جو سب سے نمایاں خدمت ہے وہ اتحاد کانفرنس الہ آباد کا انعقاد ہے، اس اتحاد کانفرنس کا تخیل پہلی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں آیا اور انہوں نے ماہ جون سنہ ۱۹۳۲ء میں اس کانفرنس کے لیئے اپنا بیان شایع کرایا۔ پھر کلکتہ روانہ ہوئے۔ وہاں راجندر بابو اور مالوی جی کو بلوایا۔ اخبارات کو موید کرایا اور اس طریقہ سے اس کی فضا تیار کرائی۔ اس کے بعد اتحاد کانفرنس کے بنیادی مطالبات کا خاکہ کلکتہ میں بیٹھ کر تیار کیا۔ اس سلسلہ کے بیانات اخبارات کے آرار۔ مسلمانوں کے مطالبات کا وسیع مطبوعہ چارٹر اور ان پر قلمی اتفاق و اختلاف کے نشانات ہمارے پاس موجود ہیں۔ یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ان بنیادی مسائل میں بنگال میں مسلمانوں کے لیئے ۵۱ فیصدی کا مطالبہ بردھان چندر نے مان لیا تھا۔ اور تحریر بھی دیدی تھی۔

ان بنیادی مسائل کے بعد ڈاکٹر سید محمود بمبئی تشریف لے گئے۔ ان دنوں مولانا شوکت علی آل انڈیا مسلم کانفرنس میں شرکت کر چکے تھے،

ہزاروں جلسوں کی صدارت کی اور خطبات صدارت میں صحیح رہنمائی کی خدمت انجام دی۔ اور

وہاں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی سعی بلیغ سے اتحاد کانفرنس کے لئے مولانا شوکت علی کو آمادہ کرلیا۔ اس کے بعد مولانا شوکت علی نے لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند سے اس کانفرنس کے منعقد کرنے کا مشورہ کیا۔ اور سیاسی دنیا کے لئے اس امر واقعہ کا اعلان غیر معمولی حیرت و استعجاب کا باعث ہوگا کہ لارڈ ولنگڈن نے اس کانفرنس کے منعقد کرنے کی شدید مخالفت کی اور نامہ و پیام دیر تک جاری رہا۔

لیکن ڈاکٹر محمود کی کوششیں سرسبز ہو رہی تھیں، کانفرنس کے منعقد ہونے کے آثار پیدا ہوگئے۔ مولانا شوکت علی بھی شرکت پر آمادہ رہے اور دوسری طرف حریف برطانیہ نے یہ نئی چال دیکھ کر اپنا نیا پینترا بدلا۔ یہاں تک کہ الہ آباد کی اتحاد کانفرنس میں ہندو مسلمان رہبران قوم سر جوڑ کر بیٹھے۔ اور اسلامی تحفظات اور مطالبات کے بنیادی اصول اپنی پوری تشریح کے ساتھ مان لئے گئے۔ ادھر یہ رنگ دیکھ کر حکومت برطانیہ نے تیزی سے قدم آگے بڑھایا، اور ۱۹۳۲ء کے ریفارم میں "فرقہ وارانہ عطیہ،، (کمیونل اوارڈ) کا اعلان کیا گیا۔ جس میں وہ سارے مطالبات موجود تھے جو اتحاد کانفرنس میں طے ہوئے تھے اور بعض دوسرے اہم قدم ——— یہ پوری صداقت اور صحت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ الہ آباد کی اتحاد کانفرنس نہ ہوتی تو کمیونل اوارڈ کسی دوسری شکل میں ترتیب دیا جاتا اور پھر بنگال میں یوروپین گروپ کو اہمیت دیکر مسلمانوں کی حقیقی اکثریت کا تو خاتمہ ہی کر دیا گیا۔

سیاسیات میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے جو خدمات رہے، ان کی تفصیلات کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ الغرض ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۶ء تک کی مسلسل جد و جہد، ایثار اور قربانیوں کا ایک مختصر ثمرہ ۱۹۳۵ء کی اصلاحات کی شکل میں ہندوستان میں نمودار ہوا۔ اور اس کے بعد ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے اور ڈاکٹر صاحب بھی اپنی زندگی کے ایک نئے دور میں قدم رکھتے ہیں۔

(۶)

۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے نفاذ کے بعد جب اسمبلی کے لئے الکشن کی نوبت آئی، اور آل انڈیا کانگریس نے انتخابات میں عملی حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو ڈاکٹر صاحب موصوف دو حلقوں سے کھڑے ہوئے۔ مخالفوں نے مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ الکشن کے زمانہ میں جو پمفلٹ، لیفلٹ اور پوسٹر شایع کئے گئے وہ مخالفین کی ذہنیت کو آشکارا کرتے ہیں۔ ان کا پلندہ بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ ان کے بعض اقتباسات بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے۔ افسوس کہ اس مختصر تحریر میں ان کی گنجائش نہیں۔

غرض ڈاکٹر صاحب موصوف دو حلقوں سے منتخب ہوکر اسمبلی میں آئے اور کانگریس نے عہدے قبول کرنے کا فیصلہ کیا اس فیصلہ کے بعد جب بہار میں وزارت کی ترتیب ہونے لگی تو یہ سمجھی بوجھی بات تھی کہ بہار میں راجندر بابو کے بعد کانگریس کے حلقہ میں جو سب سے زیادہ ممتاز تھا، جس کے خدمات سب سے زیادہ وسیع اور کانگریس میں جس کی شخصیت سب سے زیادہ قابل ترجیح ہو سکتی تھی وہ ڈاکٹر محمود کی ذات گرامی تھی۔ ان کے ذاتی ایثار و قربانی کو نظر انداز بھی کیا جائے تو آل انڈیا ورکنگ کمیٹی کی ممبری اور جنرل سکریٹری کا اعزاز اس امر کے لئے کافی تھا کہ وزارت عظمی کا قلمدان ڈاکٹر صاحب کے آگے ہوگا۔ لیکن اس موقع پر ہمیں برادران وطن کی تنگ دلی کا اظہار کرنا ان کے حق میں نا انصافی نہیں ہے کہ انہوں نے صحیح فیصلہ سے گریز کیا اور آل انڈیا کے سابق ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور جنرل سکریٹری کا احترام اس کے شایان شان نہ کر سکے۔ اور ملک کی وہ جماعتیں اور افراد جن کے دلوں سے برادران وطن اپنا اعتماد کلیتہً ضایع کر چکے ہیں انہیں اپنی رائے کے مضبوط ہونے کا یقین دلایا۔ چنانچہ ہندوستان کے اسلامی پریس میں کلکتہ سے لاہور تک اس کے خلاف آوازہ اٹھائی گئی اور برادران وطن کی تنگ دلی کے ثبوت میں اس واقعہ کو بار بار پیش کیا گیا۔

بہر حال اس مسئلہ میں صحیح پوزیشن یہ ہے کہ یا تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے سالہا سال تک ڈاکٹر صاحب کو جنرل سکریٹری رکھنے میں غلطی کی، یا بہار اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے تنگ دلی کو راہ دے کر محمود کو صرف اس لئے وزیر اعظم نہیں بنایا کہ ان کا نام محمود تھا۔ ان دونوں جماعتوں میں سے غلطی کسی ایک نے ضرور کی، اب خواہ غلطی کے مرتکب گاندھی جی، پنڈت موتی لال، مسٹر سی۔ آر داس، پنڈت جواہر لال، پٹیل برادران اور راجگوپال آچاریہ وغیرہ ہوئے، جنہوں نے انہیں جنرل سکریٹری کا اہم عہدہ دیا اور سالہا سال اس پر قایم رکھا۔ اور یا ڈاکٹر راجندر پرشاد، بابو سری کرشن اور بابو انو گرہ نرائن وغیرہ سے یہ حرکت سرزد ہوئی کہ انہوں نے وزارت کی ترتیب کے وقت ان کو انکے شایان شان عہدہ پیش نہیں کیا۔ اگرچہ ہماری نظروں سے اسی زمانہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا وہ بیان گذرا تھا۔ جس میں انہوں نے از خود اس سے علحدہ ہونے کا اعلان کیا تھا اور وہ تراشہ ہمارے فائل میں موجود بھی ہے۔ لیکن ہمیں ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے سوانح نگار کی حیثیت سے اس اظہار حق پر معاف فرمائیں کہ ہمارا ضمیر ان کے بیان سے مطمئن نہ اس وقت ہوا تھا نہ ان سطور کے قلمبند کرنے کے وقت ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے اس بیان کی اہمیت اس سے زیادہ نہیں کہ معاملہ رفع دفع کرنے اور نکتہ چینوں

کو خاموش کرنے کا ایک ذریعہ تھا اس سے آگے کچھ نہیں۔

بہرحال ہمیں اس واقعہ میں بھی ڈاکٹر صاحب کی سیرت کی بلندی کے نشانات ملتے ہیں۔ جو روش انہوں نے اختیار کی وہ بلند اسلامی اخلاق کے اصولوں کے عین مطابق تھی، اور اس حیثیت سے وہ لائق مبارکباد ہیں۔

لیکن اس سلسلہ میں یہ امر واقعہ لائق ذکر ہے کہ وزارت کی تشکیل میں صیغوں کی جو تقسیم عمل میں آئی، اس میں اس کا لحاظ خاص طور پر کیا گیا کہ اہم صیغے جن پر صوبہ کی آئندہ تعمیری ترقیوں کا دار و مدار تھا وہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے سپرد کئے گئے۔ چنانچہ وزارت تعلیم، صنعت، حرفت، تجارت اور زراعت کے محکموں کا قلمدان ــــ ڈاکٹر صاحب موصوف کے سپرد کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے دورِ وزارت میں غیر معمولی انہماک کے ساتھ مصروف رہے، اور اپنے تحت کے ہر صیغہ میں مفید تعمیری خدمات انجام دیئے ہمیں افسوس ہے کہ اس وقت دورِ وزارت کے مفید خدمات کی کوئی مستند رپورٹ حاصل نہ ہوسکی تاہم اخبار کے ذریعہ جو کچھ علم میں آتا گیا وہ ناظرین سے پوشیدہ نہیں۔

صیغۂ تعلیم میں ڈاکٹر صاحب نے پرائمری تعلیم پر خاص طور پر توجہ کی۔ اس کی ترقی کے لئے بعض نئی اسکیم مرتب کی، اور اس کو جلد سے جلد نفاذ میں لے آئے۔ چنانچہ ان دنوں اسی اسکیم کے ماتحت مختلف شہروں میں کمیٹیاں قایم ہیں اور شاید وہ تعلیمی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

اشاعتِ تعلیم عام - کی تحریک شہرت عام حاصل کر چکی ہے۔ اس مسئلہ میں ڈاکٹر صاحب کی بدولت بہار نے دوسرے صوبوں کی رہنمائی کی۔ اس وقت صوبہ کے مختلف مقاموں پر تعلیمی مرکز قایم ہیں۔ جن کی نگرانی میں عام تعلیم پھیلانے کی مفید خدمت انجام پا رہی ہے۔ اور ہزاروں ہزار ان پڑھ اس وقت تک تعلیم یافتہ بن چکے ہیں۔

پٹنہ یونیورسٹی میں اردو کا مسئلہ بھی لاینحل بنا ہوا تھا، اردو کے پروفیسر کی جگہ کا تقرر عمل میں آیا۔

اصلاح نصاب کی کوششیں بھی شروع ہو چکی تھیں، مگر وہ شاید عمل میں نہ آسکیں۔

ہندوستانی زبان کے مسئلہ میں ڈاکٹر صاحب کی بدولت بہار نے پورے ہندوستان کی رہنمائی کی، اردو و ہندی کے مختلف فیہ مسئلہ کو اس ذریعہ بحسن و خوبی طے کیا۔ ہندوستانی کمیٹی کے نام سے ایک کمیٹی اس وقت تک موجود ہے جو ہندوستانی زبان کا معیار اور اس کے مطابق کورس کی کتابوں کی درستی کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ اگر برادران وطن نے آزاد خیالی کے ساتھ ہندوستانی کمیٹی کے ساتھ معاونت کی تو یقین ہے کہ جس اصول کے ماتحت یہ کمیٹی کام کرنا چاہتی ہے، اس پر اردو کے اختلافات کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔

زبان کے مسئلہ میں جب ہندو پریس نے ہندوستانی زبان کی تحریک کی مخالفت شروع کی اور ہندو پریس نے یہ جائز روش بھی گوارا نہ کرنا چاہی تو ڈاکٹر صاحب نے پنڈت جواہر لال کو زبان کے متعلق اپنا تاریخی مکتوب بھیجا اور اس کا مفصل جواب پنڈت جی نے اخبارات میں شایع کرایا۔ وہ اس سلسلہ میں مطالعہ کے لائق ہے۔

محکمۂ زراعت میں بھی ڈاکٹر صاحب کے دورِ حکومت میں مفید اضافے ہوئے۔ صنعت و حرفت اور تجارت کے سلسلہ میں شکر کی ملوں سے متعلق بھی انہوں نے کچھ خدمات انجام دئے ہیں، جن کی تفصیل اس وقت ذہن میں نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے ماتحت شعبوں کو ترقی دینے کے علاوہ چند ایسے مسائل بھی اپنے ہاتھ میں لئے جن کا تعلق صوبہ کے مسلمانوں سے تھا اور ان مسائل کو پوری مضبوطی کے ساتھ اپنے رفقار کار سے منوایا۔ ان مختلف فیہ مسائل میں ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے حق تناسب استحفاظ اور لوکل بورڈ میں مسلمانوں کی نیابت کے مسئلے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اخبارات میں آیا۔ ان مسائل میں دیگر وزراء سے ان کی رسہ کشی بھی ہوئی لیکن ڈاکٹر صاحب نہایت مضبوطی سے اپنے مطالبہ پر قایم رہے۔ اور ملازمتوں میں تناسب کے مسئلہ کو گویا حل کرایا، اور بورڈ میں مسلمانوں کی نیابت کے متعلق اسمبلی میں بحث آنیوالی تھی کہ وزارت اچانک جنگ عظیم میں ہندوستان کی شرکت سے پہلے ہندوستان کی حیثیت کی وضاحت کے مطالبہ پر اپنے عہدوں سے مستعفی ہوگئی۔ اور رام گڈھ سیشن کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف پھر اپنے سابق اعزاز یعنی کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بن کر کانگریس ہائی کمانڈ کی صف میں داخل ہوگئے۔ اور ہندوستان کے اس نازک دور میں ہندوستان کے مستقبل کے متعلق نیک مشوروں میں شریک ہیں۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ان سے ملک اور اسلام کی خدمات لے۔

(۷)

ڈاکٹر صاحب موصوف کے سوانح کا خاکہ نامکمل رہ جائے گا اگر ان کی علمی مرتبت کی جانب بھی چند اشارات نہ کر دئے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کو علم کا پاکیزہ مذاق عطا ہوا ہے۔ درحقیقت اگر وہ سیاسیات کے پُرخار وادی میں قدم نہ رکھتے تو ان کا صحیح مرتبہ کسی علمی خانقاہ میں ان کا زاویہ نشیں ہو جانا تھا۔

لیکن قدرت نے ان کو تاریخ لکھنے والوں کی بجائے تاریخ بنانے والوں کی صف میں رکھا۔ تاہم ان کے علمی رجحانات کے اثرات بھی ان کی زندگی کی مختلف دوروں میں ظاہر ہوتے رہے۔ پچھلے دور میں علامہ شبلی نعمانی مرحوم کو جو علمی مرتبت حاصل تھی وہ آشکارا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ان کے خاص معتقدین میں تھے۔ مختلف علمی مباحث پر مراسلت جاری تھی۔ اسی طرح ڈاکٹر آرنلڈ اور پروفیسر نواب علی وغیرہ سے بھی مکاتبت رہی۔ یہ خطوط ندیم میں وقتاً فوقتاً شایع ہوں گے۔ ان سے ان کے علم کے ذوق کا اندازہ ہوگا۔ ہندوستان کی تاریخ پر عالمانہ نظر رکھتے ہیں اور انگریزی رسائل میں وقتاً فوقتاً مضامین لکھے ہیں۔

ان کی تصنیفات میں ایک تو ان کا مشہور رسالہ خلافت اور انگلستان ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ہزاروں ہزار کی تعداد میں شایع ہوا۔ اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ دیوان غالب کے بدایوں اڈیشن کو ڈاکٹر صاحب ہی نے مرتب کیا تھا۔ اور غالب کے کلام پر نئے انداز میں مقدمہ لکھا اسی طرح مختلف مطبوعات پر وقتاً فوقتاً مقدمے اور دیباچے لکھے ہیں۔ بعض ناتمام تصنیفات اور مضامین ڈاکٹر صاحب کے ذخیرۂ کاغذات میں موجود ہیں۔

مختلف علمی، تعلیمی اداروں، علی گڈھ یونیورسٹی، دار المصنفین، جامعہ ملیہ وغیرہ سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موجودہ ہندوستان کے ان مشاہیر میں ہیں جو نئے ہندوستان کے بنانے والوں میں ہیں۔ ان کے خدمات نوجوان ہندوستان کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ صوبۂ بہار کے لئے یہ باعث فخر ہے کہ وہ اسی صوبہ سے ہمیشہ کے لئے وابستہ ہوگئے۔ چھپرہ میں مستقل توطن اختیار کرلیا ہے۔ گاندھی جی۔ مولانا ابوالکلام مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی کے خطوط جن میں سے بعض اس نمبر میں بھی کسی دوسری جگہ چھپ رہے ہیں۔ اندازہ ہوگا کہ ان بزرگوں کی نظر میں صوبہ کے سیاسی حالات کی نگرانی کی خدمت انہیں کے سپرد رہی ہے۔ جو خدمات انہوں نے اس صوبہ میں انجام دئے ہیں۔ باشندگانِ صوبہ ان کے احسانات کو فراموش نہیں کرسکتے۔

دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ان کے ذریعہ صوبہ میں مزید مفید خدمات انجام دلائے۔ کہ یہ اس صدی کے بہترین دل و دماغ کے مالک ہیں، اور بہترین خدمات کے انجام دینے کی صلاحیتیں ان میں ودیعت کی گئی ہیں۔

عزیزِ ملّت

یعنی

نازشِ بہار فخرِ ملکؒ عزیزِ ملّت عالیجناب سید عبدالعزیز بالقابہ

صدرالمہام عدالت و امورِ مذہبی حکومتِ آصفیہ حیدرآباد دکن،

اثرِ خامہ جناب سید انوار الحق صاحب بی۔ اے۔ پٹنہ

ملتِ اسلامیہ ہند اور جمعیت علیہ بہار کے ان ناموز زعمار کو جب مستقبل کا مامنی نواز قلم ڈھونڈھنے بیٹھے گا جو انگریزوں کے تسلط کامل اور مسلمانوں کے انحطاطِ روز افزوں کے تاریک دور میں پیدا ہو کر ملتِ بیضا کی کشتی کو طوفانِ حوادث سے بچانے کے لئے روح فرسا کوششوں میں اپنی زندگی اپنی قوتِ عمل اور اپنا سرمایۂ حیات صرف کرتے رہے تو فخرِ ملک عزیزِ ملت مسٹر سید عبدالعزیز بالقابہ کا نام اُس کی مرتبہ فہرست کا سرنامہ درخشان ہوگا۔ قوم کے وہ فرزندانِ رشید جو اپنے پیشرؤوں کی سعی و محنت کی منت شناسی کا حق ادا کرنے کے لئے اپنی بحث کا قدم تاریخِ ماضی کی وادی میں بڑھائیں گے۔ اُنہیں ہمارے **عزیزِ قوم** کا روشن نام بلندی پر چمکتا ہوا نظر آئیگا، اور وہ پکار اٹھیں گے کہ

لمع البرق من الطور و آنست بہ فلعلی لک آتی بشہاب قبس

جس طرح آج زندہ قومیں اپنے اُن پیشرؤوں کے نام پر فخر کرتی اور اُن کے ناموں کو اپنے قومی خزانے کا جواہرِ بے بہا سمجھتی ہیں جن کے ہاتھوں سے اُن کے قومی عروج کا پہلا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا، اسی طرح ہماری قوم کے وہ مایۂ ناز اخلاف جو چمنستانِ ملت کے گلہائے تر سے کسی دن اپنے دامنوں کو معمور پائیں گے، اپنے اُن باغبانانِ قدیم کی تصویروں کو ڈھونڈھیں گے جن کے پسینے اور خون نے سینچ سینچ کر نازک اور کمزور پودوں کو اس کے قابل بنا دیا کہ وہ پھولوں سے اپنی لدی ہوئی ڈالیاں اُن کی گودوں میں ڈال دیں۔ کامیاب اور منزلِ مقصود کو پہونچنے والے قافلے جو آیندہ نسلوں سے وابستہ ہوں گے، وہ تلاش کریں گے کہ ہمارے اُن رہنمایانِ پیشین کی مبارک صورتیں اور ہمایوں فال خط و خال کیسے ہیں جن کی صدائے جرس نے سوئی ہوئی جماعت کو بادیہ پیمائے جادہ جہد ورہ نوردِ سعی و محن بنا دیا تھا، اور آنے والی شکر گذار نسلیں اُن گرانقدر مجسمۂ صدق و خلوص اور پیکرِ جانفشانی و ایثار ہستیوں کا مرقع صفحاتِ تاریخ میں ڈھونڈھیں گی جن کی تگ و دو ہمت و جرأت اور عقل و تدبیر نے وہ جادۂ عمل تیار کر دیا جس پر چل کر قوم اور اُس کے فرزند منزلِ کامرانی تک پہونچ گئے۔ اُس وقت ہماری آج کی غفلتوں اور بے پروائیوں نے اگر انہیں حسرت زدہ اور محروم تمنا رکھا تو یہ نہ صرف ہمارا اپنا ناشکر گذارانہ اور احسان فراموش کردار ہوگا۔ بلکہ آنے والی نسلوں کے جذبۂ محبت پر سنگدلانہ ظلم اور کاری وار ہوگا۔

اپنی دسترس کے مطابق مجھے عزیزِ قوم عالیجناب مسٹر سید عبدالعزیز بالقابہ کا نام اس عنوان کے ذیل میں حاصل ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی مبارک و قابلِ فخر زندگی کے چند اوراق کو دنیا کے سامنے پیش کر سکوں تاکہ جس طرح میں نے اس سلسلہ کی پہلی کڑیوں سے اپنی یہ کڑی وابستہ کر دی ہے اور پہلے نقشِ قدم کو دیکھکر یہ قدم آگے بڑھایا ہے، اسی طرح آنیوالی کڑیاں اور نئے نقشِ قدم میرے پیچھے ایک سلسلۂ دراز قایم کر دیں جس سے آنیوالی صدیاں تلاش و جستجوئے حقائق میں پریشان نہ ہوں۔ اور انہیں اپنے پیشِ نظر منزل کے ساتھ پچھلے نشانِ راہ کا صحیح اندازہ مل سکے۔

ممکن ہے میری یہ کوشش مخدومِ قوم کے افتادِ طبع کے خلاف اور آپ کی کبیدگیِ خاطر کا باعث ہو لیکن میں جنابِ ممدوح سے اس کی معافی چاہتا ہوں کہ اس جسارت بیجا کا حق مجھے اور قوم کے ہر فرد کو حاصل ہے کہ آپ کی سوانح حیات خود قوم کی داستانِ زندگی کا ایک صفحہ ہے اور وہ آپ کی چیز ہو یا نہ ہو مگر قوم و ملک کا ایک سرمایۂ گراں بہا ضرور ہے۔ پس ہم خدامِ قلم پر اگر الزامِ رہزنی اور تصرفِ بیجا کی فردِ جرم لگائی جائے

تو قوم کی عدالت ہمیں ضرور بری کردے گی۔

آسمانِ سعادت و اقبال کا یہ آفتاب جس خاندان کا چشم و چراغ ہوا اس کی خوش نصیبی میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ آپ کے والد بزرگوار عالیجناب حکیم سید حفاظت حسین صاحب مرحوم السنۂ مشرقیہ کے ادیب اور اپنے عہد کے نامور طبیب تھے، اور آپ کی فیض گستری سے روسا، ریاست و امرائے دولت کے ساتھ غربا و اہلِ حاجت بھی مستفید ہوتے رہے۔ عہدِ آخر میں آپ کی عمر کا بیشتر حصہ جودھپور (ریاست راجپوتانہ) میں گذرا، جہاں آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مہاراجہ جودھپور آپ کی عقیدتمندانہ نیازمندی کے ساتھ آپ کی قیام فرمائی جودھپور کے لئے اس قدر مصر ہے کہ آپ کی خواہش گریز و نیت پرہیز کامیاب نہ ہو سکی۔

عزیزِ قوم مسٹر سید عبدالعزیز نسباً پھلواری شریف کے ایک پرانے علمی خاندان کے نخلِ آرزو ہیں۔ آپ کی والدہ محترمہ سید علی امام مرحوم کے خاندان نیورہ سے وابستہ تھیں۔

عہدِ طفلی کا موسم بہار علومِ مشرقی کی تعلیم و تربیت میں گذرا۔ پھر آپ نے پٹنہ کالجیٹ اسکول میں انٹرنس تک میدانِ علم کو طے کیا اور یہاں سے فارغ ہو کر ہزاری باغ کالج میں بی۔ اے تک تعلیم پائی، اور اسی دوران میں آہستہ آہستہ آپ کا وہ جوہر بھی کھلتا رہا جو آج بے نقاب ہو کر "عزیزِ ملت" کو بارگاہ بلند تک پہونچا کر رہا، یعنی متعدد قومی اداروں اور مفیدِ ملت انجمنوں اور قومیت پرور مجلسوں کی عنانِ ہدایت آپ کے ہاتھوں میں رہتی یا جسے آپ کی حمایت حاصل ہوا کی۔ ہزاری باغ کی تعلیم کے بعد آپ کا ذوقِ علمی آسودہ نہ ہوا اور یہ تشنگی آپ کو سرچشمہ انگلستان تک لے گئی جو آپ کے لئے مبارک ہوا تو قوم کے لئے بھی میمون و مسعود۔ یہ سفر سنہ ۱۹۰۷ء میں ہوا اور سنہ ۱۹۱۱ء میں آپ نے بیرسٹری کی سند حاصل کر لی اور سند لیکر دو سال مزید لندن میں قیام کیا۔ زمانہ قیام انگلستان میں بہاری طالبانِ علم کو آپ کی بلند حوصلہ طبیعت نے قیامِ انجمن پر آمادہ کیا اور اجتماعی و متحرک زندگی کا درس دیا۔ آپ کی روان و تیز طبیعت نے انگریزی اخباروں اور انجمنوں کے ممبروں کو تحریر و تقریر سے بہار و ہندوستان کی قوتِ فطانت و ذکاوت اور صلاحیت تدبر و فکر کی جلوہ گاہ بنا دیا۔

کیکسٹن ہال میں وہ معرکۃ الآرا تقریر آپ نے کی تھی جس کو آج تک ہندوستانی طلبہ یاد کر کر کے جھومتے ہیں، نہ صرف ہندوستانی اہلِ علم بلکہ خود انگریز مدبرین کی نظروں میں آپ کی تحریر و تقریر نگاہِ قدر و وقار سے دیکھی جانے لگی۔

انگلستان سے آپ کی واپسی سنہ ۱۹۱۳ء میں ہوئی جب کہ آپ کی تشریف آوری کی تقریب پر اہلِ بہار کی طرف سے بلا قیدِ مذہب و ملت آپ کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ اور مخلصانہ دعوتیں دی گئیں۔ اور اس طرح انگلستان میں رہکر ہندوستانی علم و دماغ کی نمایندگی کی پبلک کی طرف سے متفقہ داد دی گئی۔

بیرسٹری میں آپ کو جو ید طولیٰ حاصل ہے اس کی شعاعیں ابتدائے ایام ہی سے نکلنے لگیں۔ ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی می تافت ستارۂ بلندی

جوہر شناس نگاہیں اسی وقت سمجھ گئی تھیں کہ یہ ستارۂ درخشاں ایک دن آفتاب ہو کر چمکے گا۔ آپ کی انگلستان سے واپسی کے بعد ضلع شاہ آباد۔ کیمون پور۔ بہار شریف۔ داناپور، اور دوسرے مقامات میں جب فرقہ وارانہ فساد کی چنگاریاں شعلۂ جوالہ بن کر نمودار ہوئیں اور بہار کا ہر خطہ جب مسلمانوں کی قتل گاہ بننے لگا۔ تو اس وقت سب سے پہلے ان جلنے مرنے اور ڈوبنے والوں کو سہارا دینے کے لئے سب سے پہلے آپ ہی کی ذات ستودہ صفات آگے بڑھی۔ آپ کی دستگیری نے بہت سے خاندانوں کو بچا لیا، اور آپ کی ہوشمندانہ اور مدبرانہ کارروائیوں نے ہندو مسلم تعلقات کو خوشگوار بنا کر کامل امن و امان اور شانتی کی فضا پیدا کر دی۔

مقدمات کی کامیابی نے ایک طرف مسلمانوں کو بشارت و خوشخبری دی، تو دوسری طرف آپ کی اعلیٰ سیرت، صداقت شعاری اور حسنِ اخلاق کی وجہ سے برادرانِ وطن بھی آپ کے مداح ہو گئے، اور بڑی عزت و احترام سے دیکھنے لگے۔

اس کے بعد آپ کا وہ حسنِ معنوی پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جو ان تمام کمالات سے زیادہ قیمتی اور دلکش ہے اور جس سے انسان کے "احسن تقویم" ہونے کا وہ باطنی جمال کھلتا ہے جو نہ کسی اسکول سے حاصل کیا جا سکتا ہے نہ کسی پروفیسر کی جیبوں میں پایا جاتا ہے، نہ کسی ملا کے دامنِ عبا میں ہے ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

آپ کی نرم دلی۔ رقت قلب۔ سیر چشمی۔ انصاف پسندی و معدلت مآبی و کرم گستری یہ ایسے محاسن و فضائل ہیں جنہیں آپ کسی تعلیم گاہ سے نہیں لائے۔ بلکہ آپ کو بطور موہبت الٰہی ورثہ میں ملیں۔

صداقت شعاری و فیاضی کی روز افزوں واقعات کے شمار سے قطع نظر کرکے اگر صرف ایک ہی مثال پیش کیجائے تو تخمینہ تبصرہ کیلئے کافی ہو سکتی ہے۔ آپ اکثر و بیشتر مقدمات میں اپنے موکلوں پر اپنا دباؤ و اثر ڈال کر فریق ثانی سے مصالحت کرا دیتے کہ جناب ممدوح کو اپنے موکل کے ساتھ فریق کی تباہی و بربادی بھی بر اصول ہمدردی نوع انسان منظور نہیں تھی۔ حالانکہ اس طریقہ کار سے ایک کامیاب بیرسٹر کو کہاں تک مالی نقصان پہنچ سکتا ہے، ظاہر ہے۔

۱۹۳۲ء میں دہلی کا تاریخی مقدمہ سازش جس میں حکومت ہند نے آپ کو ایک بڑی فیس پر تاج کا وکیل مقرر کیا تھا۔ وہ محض آپ ہی کے مشورہ سے اٹھا لیا گیا۔ اور ملزمین میں سے بعض کو بری کر دیا گیا۔ اور بعض کو خفیف تعزیرات ہند کے دفعات میں ماخوذ کرکے ہلکی سزائیں دی گئیں۔ ورنہ اس مقدمہ کے کافی عرصہ تک چلنے کی امید تھی، اور اندریں صورت آپ حکومت ہند کے خزانہ عامرہ سے لاکھوں روپے وصول کر سکتے تھے مگر آپ کی دیانت داری اور ضمیر نے اس کو پسند نہیں کیا۔

اس کے علاوہ مختلف مقدمات میں آپ نے اپنے پاس سے مصارف سفر تک برداشت کرکے بلا فیس اور متعدد مقدمات میں ناقابل برداشت تخفیف کے ساتھ کام کیا ہے۔ اور اس کے خلاف بارہا ظالم اور برسر ناحق ملزمین کے مقدمات میں گرانقدر فیسوں کے ملتے ہوئے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

جوہر علم و ادب کے ساتھ یہ جوہر اخلاق و عمل آپ کی شہرت و منزلت کو اور بھی آب و تاب دینے لگا۔

انجمن اسلامیہ پٹنہ کی سرپرستی اور اس کی موجودہ توسیع تعمیر، نیز اس میں بہار کی سب سے پہلی اردو لائبریری کا قیام اور اردو زبان کی توسیع و اشاعت کے لئے آپ کی دوسری خدمات آپ کے عہد فیض مہد کی زریں یادگاریں ہیں۔ نیز موجودہ پٹنہ کلب کی تاسیس و قیام بھی آپ ہی کی اولین عنایت کی ممنون کرم ہے۔

دار الیتامی پٹنہ سٹی اس وقت مسلمانان بہار کی کوشش و ہمت کا ایک حوصلہ افزا نمونہ ہے۔ اور اس کی اصلاح و نگرانی میں آپ کی چشم عنایت کو بہت بڑا دخل ہے۔ آپ نے اُس کی صدارت و سرپرستی قبول فرما کر اُس میں چار چاند لگا دیے۔

آپ کی مقبولیت عامہ کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ آپ نے قوم کی خواہش کو مد نظر رکھتے ہوئے جب کبھی مجلس مقننہ صوبہ بہار میں جانے پر آمادگی ظاہر فرمائی۔ قوم نے ہاتھوں ہاتھ آپ کو بلا طلب و آرزو الکشن کی ناخوشگوار کنویسنگ سے بے نیاز رکھکر اسمبلی کی کرسیوں تک پہونچا دیا۔ آپ پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء میں بہار کے سب سے وسیع حلقہ انتخاب سے ممبر لیجسلیٹو کونسل ہوئے۔ پھر ۱۹۳۰ء میں آپ ہی منتخب ہوئے۔ پھر ۱۹۳۷ء میں آپ مع اپنے رفقا کی کافی تعداد کے جو آپ کی جماعت سے وابستہ تھے جدید دستور ہند کے ماتحت اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔

۱۹۳۷ء سے بیشتر ۱۹۳۴ء میں حکومت بہار کی نگاہ انتخاب نے وزارت صیغہ تعلیمات و ترقیات کے منصب کیلئے آپ ہی کو منتخب کیا۔ عہد وزارت میں آپ کے زریں کارناموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ مشہور و معروف تاریخی زلزلے کی تباہ کاریوں کے بعد جب کہ سلسلۂ رسل و رسائل بند اور باکثر علاقے تہ آب اور نذر سیلاب ہو رہے تھے شدید موسم سرما میں بذریعہ ایروپلین قصبات و قریات دور افتادہ کا معائنہ فرمایا۔ کانگریس اور حکومت دونوں کی جداگانہ ریلیف پارٹیوں کی محض بہ سبیل فلاح نوع انسانی و ماورائے فرقہ آرائی جس سے نیشنل کانگریس اس وقت بھی غافل نہ رہی، آپ نے مدد فرمائی کہ آپ نے اپنے ذاتی و سکونتی مکان کا ایک حصہ کانگریس ریلیف کمیٹی کے حوالہ کر دیا۔ اور دوسری طرف حکومت کی امدادی مساعی میں پوری مدد دی۔ اور ریلیف فنڈ میں اپنے ذاتی اثرات کو استعمال کرکے حکومت ہند سے ایک کروڑ روپیہ کا گرانٹ منظور کرایا۔

آل انڈیا صنعتی اور زرعی نمائش جس حسن و سلیقہ شعاری کے ساتھ پٹنہ میں ہوئی، اس کو دیکھنے والے آج تک اُس لطف نظارہ کو نہیں بھول سکتے۔ پھلوں کی کاشت کو ترقی دینے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے آپ نے اپنے عہد وزارت میں آموں کی نمائش قائم کی جس میں متعدد اور گوناگوں اقسام کے آموں کا انعامی مقابلہ کرکے اس فن کے شائقین کی ہمت افزائی فرمائی، اور اس کے ذریعہ نہ صرف ہندوستان کو بلکہ ممالک بیرون ہند کو بھی صوبہ بہار کی اس نعمت الٰہی سے روشناس کرایا اور اس طرح اس شعبہ تجارت کے فروغ پر اچھا اثر پڑا۔

معذورینِ بصارت پر بارشِ رحمت بھی آپ ہی کے ابرِ کرم کا کرشمہ ہے، اسی دَور میں آپ نے اپنی فیض رسانی اور ہمدردی نوعِ انسانی کے جذبہ مبارک کا رُخ معذورینِ بصارت کی طرف منعطف کر دیا۔ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں زن و مرد نزول الماء یعنی موتیا بند (کیٹ ریکٹ) کے شکار صوبۂ بہار کے ہر قریہ و ضلع میں موجود تھے۔ جن کے علاج کے لئے بجز صدر مقام کے بعض ڈاکٹروں کے اور کوئی سبیل نہ تھی۔ اول تو ہسپتال ہی اس پایہ کے معدودہ قلیل اور پھر ہسپتالوں میں ان کی سیٹیں اور بھی کم۔ مشاق و چابکدست ماہرین کا اور بھی قحط۔ اس قلت و رفعت کی تہ بہ تہ آفتوں میں اتنے حاجتمندوں کی دستگیری کیونکر ممکن تھی۔ یہی تصور آپ کی اس تحریک ہمدردی کا باعث ہوا۔ اور آپ نے اپنی جیب خاص پر ہزارہا ہزار روپے کا اور اپنے مکانات و صحن مکان کی تمام گنجائشوں و نیز اپنے ذرائع اخلاق سے وابستہ محبت افراد کثیر کی رضا کارانہ خدمات کے ساتھ تمام ممکنہ سعی و کوشش کا سرمایہ اس فیض عام میں صرف کیا جو تفریقِ ملت و مذہب سے بالاتر رکھا گیا اور مجھے جہانتک معلوم ہے کہ ہندو مستفیدانِ فیض بمقابلہ مسلمانوں کے ۹۰ فیصدی زیادہ رہے۔ اس دریائے کرم کی یہ روانی دیکھ کر جو مسلسل چند سال سے تشنہ کامانِ حاجت کو سیراب کرتی رہی، اور جس کا سرچشمہ صرف آپ کی ہمت و سخاوت اور آپ کی جیب خاص کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اور جس کا جوشِ موج ہر سال روز افزوں ہوتا گیا۔ حکومتِ وقت کی غیرت بھی مجبور ہوئی کہ خزانہ سلطنت کو متوجہ کرنے اور رام راج کے آرزومندوں کو اسلام راج کے طرز مروت اور عنوانِ مرحمت کی ان کرنوں کو دکھا کر جو روحِ وطن عزیز قوم کے برج سخا اور نیرِ کرم سے ہر قوم پر یکساں برس رہی تھیں، غیرت دلائے۔ چنانچہ کانگریسی حکومت نے بھی اپنے میزانیہ میں چار ہزار کی گرانٹ منظور کی، لیکن اخراجاتِ کثیر کے مقابلے میں یہ رقم بالکل قلیل ہے۔ اسلئے اندھوں کے عارضی ہسپتال کے مصارف کا کافی بار عزیزِ ملت بالقابہٗ کی جیبِ خاص پر ہی اب تک پڑتا ہے۔

اس سلسلہ میں عزیزِ ملت نے اس عارضی ہسپتال کو مستقل شکل دینے کے لئے ایک مفید اسکیم پیش کی جس کی توصیف و تحسین میں "اسٹیٹسمین"، "سرچ لائٹ"، "انڈین نیشن"، "بہار ہیرلڈ" اور ملک کے بہت سے موقر اخبارات نے مقالے لکھے۔

وزارت صیغہ تعلیم کا ذمہ دار عہدہ نیکنامی اور کامیابی کی غلغلہ انداز نعرہ ہائے تحسین کے ساتھ ختم ہوا تو جدید دستور ہند کے ماتحت آپ اسمبلی کی کرسی رکنیت سے قوم و ملک کی خدمت انجام دیتے رہے لیکن کانگریسی حکومت کی تنگدلانہ روش اور جمہوریت کی غلط تعبیروں اور فرقہ وارانہ منظر کو دیکھ کر جو کانسل کے اندر موجود تھا۔ اور جہاں اب نہ معقولیت کو گنجائش باقی تھی نہ دلائل کا کوئی وقار، جہاں لاٹھی اور بھینس کی لڑائی جاری تھی، عقل و تمیز کو جہاں سے کوچ کر جانا پڑا تھا آپ نے اپنی آنکھوں کے سامنے شرافت اور حق و انصاف کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھنا گوارا نہ کیا اور استعفا دیکر اپنی جگہ خالی کر دی۔ ؎

اچھا سلام جاتے ہیں تیری گلی سے ہم

مسلم لیگ کی صدارت ۔ برادرانِ وطن کی نامہربانیوں اور دلآزاریوں کے باعث انہیں ایام میں جبکہ اندرون کانسل آپ نے بے ترتیبی و بے انصافی کا سماں دیکھ کر کنارہ کشی کی تھی، بیرون کانسل طائفۃ الملوکی کا دَور چل رہا تھا اور مسلمانوں کے قلوب پر برادرانِ وطن کے تیر و خدنگ لگ رہے تھے اور مسلمانوں میں ایک ہمہ گیر ہیجانِ اضطراب کار فرما تھا۔ جس کا لازمی انجام کار یہ ہوا کہ مسلم لیگ کا علم بلند ہوا اور مسلمانوں کی تنظیم و اجتماع اس کے پرچم کے نیچے شروع ہوئی۔ اور شہروں سے قصبات و قریات تک ایک جذبۂ بیداری اور حرکت زندگی کشروع ہوئی۔ اس وقت آنکھیں چاروں طرف اٹھتی تھیں، مگر صوبۂ بہار کے شایانِ شان ایک ایسی ہمہ گیر اور وسعت پذیر تنظیم کی کرسی صدارت کا اہل بجز عزیز قوم کی ذاتِ گرامی کے دوسرا نظر نہ آسکا۔ اور ہرچند عزیز قوم اس بارِ عظیم کو برداشت کرنے سے انکار فرماتے رہے مگر قوم کے متفقہ اصرار و التجا کو آپ کی قوم پرور طبیعت رد نہ کر سکی۔ اور بالآخر قوم کی پیہم درخواستوں کے سامنے آپ کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

آپ کے دورِ صدارت میں مسلم لیگ جس حسنِ اسلوب اور شائستگی اور ڈسپلن کے ساتھ میدانِ عمل میں ترقی کرتی رہی وہ مسلمانانِ بہار کے لئے ایک قابلِ فخر و ناز حقیقت ہے۔ اخر آپ اپنے کثیر مشاغل کے باوجود اپنے معزز پیشۂ وکالت سے بے نیاز و بے پروا ہو کر جس طرح پورے صوبے کی صدارت کے تمام لوازم خدمت سے عہدہ برآ ہوئے، وہ صوبے کے ہر مسلمان پر آشکارا ہے۔ یہاں گنجائش تحریر کی تنگی مانع ہے ورنہ آپ کے زمانہ صدارت سے وابستہ سوانح حیات خود ایک مستقل زندگی کی کتاب ضخیم ہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا شہرۂ آفاق اجتماع الہ آباد کا ظاہری اور معنوی حسن و جمال آپ ہی کی تجلی تدبیر و حسنِ عمل کا نتیجہ تھا۔ پھر مسلم لیگ کی درکرس کانفرنس کا عظیم الشان صوبائی اجلاس جو گذشتہ

دسمبر میں ہوا، آپ کے سلیقہ شعار فکر و تدبر کا دوسرا تاریخی مظاہرہ تھا۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی ظاہر کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ مسلم لیگ کی ان گہری اور پر اثر خدمات کے باوجود ہندو برادران وطن کی نگاہوں اور دلوں میں آپ کی عزت و عظمت اور محبت کم نہ ہوئی۔ انہوں نے آپ کی بلندیٔ اخلاق اور اعلیٰ کیریکٹر کی پورے اعتماد کے ساتھ برابر قدر کی۔ چنانچہ کانگریس گورنمنٹ کو جب ضرورت ہوئی کہ "انسداد رشوت ستانی" کی مہم کو سر کرنے کے لئے ایک کمیٹی کو تشکیل دے تو اس کی عنان صدارت کے لئے آپ کی طرف رجوع کرنا پڑا اور آپ نے اس مشترکہ ملکی مفاد کو اپنے دائرۂ عمل یا مسلم لیگ کے ضابطہ کار کے خلاف نہ سمجھ کر اس کو بلا معاوضہ قبول فرمایا۔ اور گویا اس طرح اس طریقہ کار کو پیش کیا کہ جہاں مسلم لیگ مسلمانوں کے لئے عدل و انصاف اور رواداری و مساوات کی طلبگار ہے، وہاں ہندوؤں اور دیگر اقوام ہند کے لئے بھی انصاف و داد گستری میں اپنی جدوجہد کو پیش کر سکتی ہے۔ اس کے بعد وہ دور آتا ہے جب آپ کی ہدایت و رہنمائی اور صدارت سے بہار صوبائی مسلم لیگ محروم ہوتی ہے اور اس کے ساتھ مسلمانان بہار کو اس منزل سے گذرنے کا موقع ملتا ہے جہاں "قدر نعمت بعد زوال" کا معمہ آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنے صوبے کی خدمات اور اندرونی اصلاحات کی مشغولیوں سے نہ کبھی مہلت پائی اور نہ کبھی آپ نے اس کی کوشش و آرزو کی کہ آل انڈیا کے کسی بلند افق سے اپنی تنویر و ضیا کی جلوہ باریاں فرما کر ہندوستان کے ہر گوشے کو مہارت علمی و قوت ذہنی سے روشناس کرتے۔ آپ کی قانونی لیاقت، آپ کا حسن تقریر روانی تحریر، انگریزی ادب کا بلند معیار، تدبر و تفکر، اصابت رائے مشک کی خوشبو بن کر اطراف دنیا میں پھیلی اور آپ پر جہاں ساری دنیا کی نگاہ قدر پڑ رہی تھی **اعلیٰ حضرت نظام الملک آصفجاہ ہفتم شہریار دکن** کی دور بین نظر اور جوہر شناس نگاہ بھی تخمینہ ۴ وقیاس میں مشغول تھی، چنانچہ اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ نے آپ کو طلب فرما کر صدر المہام عدالت و امور مذہبی کا مہتم بالشان منصب جلیل عطا فرمایا، اور اعلیٰ حضرت کی اس صحیح اور جنچی تلی ہوئی نظر پر ملک کے ہر اخبار نے بے انتہا داد دی اور ہر طرف اور ہر گوشۂ ملک سے خیر مقدم و مرحبا کی صدائیں آنے لگیں۔ ابھی کہ عزیز قوم کو دو مہینے ہوئے ہیں دکن کی خدمات عالیہ کی ابتدائی منزلیں شروع ہوئی ہیں، آپ ریاست فرخندہ بنیاد حیدرآباد کے ہر حلقۂ عزت میں شمع انجمن کی حیثیت سے جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ اپنے جلیل القدر شہریار کی نظر میں بھی محبوب ہیں اور رعایائے دکن کی نگاہوں میں بھی عزیز۔

اس جگہ مختصر لفظوں میں ایک ہلکی سی جھلک دکھانا چاہتا ہوں، جو پتہ دیگی کہ آفتاب کی روشنی جہاں پہونچتی ہے یکساں طور پر ضیا باری و تنویر کا فرض انجام دیتی ہے۔ خواہ وہ افق مشرق میں یا دامن مغرب یا کنار جنوب میں۔ اہل بہار نے آپ سے چھوٹنے اور آپ کے حیدرآباد دکن تشریف لیجانے کے موقعہ پر جس بے تابیٔ دل اور اضطراب قلب کا مظاہرہ کیا ہے، اُسے وہ آنکھیں بتا سکتی ہیں جو خود اشکبار تھیں اور جنہوں نے دوسروں کو اشک بار دیکھا۔ ہر مذہب و ملت کے ہزاروں افراد بلا فرق قومیت و جماعت اس یوسف کنعاں کے دامن کو ہاتھ سے نکلتا ہوا دیکھ کر کف افسوس مل رہے تھے۔ مسلم لیگ کے علمبرداروں اور خدمت گذاروں کا حال کیا کہیے کہ اُن کیلئے سرمایۂ صبر و متاع ناز و فخر آپ ہی کی ذات تھی اور بے اختیارانہ زبان حال سے یہ صدائیں نکل رہی تھیں ۵

اے تماشا گاہ عالم روئے تو ۔ تو کجا بہر تماشا می روی،

کانگریس کے حلقہ بگوشان وفا بھی آپ کی جدائی پر چشم پرنم تھے۔ "سرچ لائٹ" اور "انڈین نیشن" جیسے کانگریسی کیمپ کے موقر اخبارات نے اپنے حلقے کی نمایندگی کرتے ہوئے جو مضامین لکھے ارباب نظر شاہد ہیں، ایک طرف یہ ہمہ گیر اضطراب تھا جو چھوٹنے والوں اور کھونے والوں کی دنیا میں بپا تھا اور عزیز قوم کی محبوبیت اور قدر و قیمت کو تاریخ بہار کے اوراق پر ثبت دوام دے رہا تھا تو دوسری طرف پانیوالوں اور جڑنیوالوں کا ایک ہجوم تھا جو خندہ جبیں اور شاداں و فرحاں اپنے خزانۂ دولت میں ایک در گوہر شاہوار کے آنے پر مست و سرشار تھا یعنی حیدرآباد دکن کا ہر حلقہ خواہ وہ ارباب حکومت کا ہو یا افراد رعیت کا آپکی تشریف آوری پر نعرۂ مسرت ہر گوشۂ دکن سے بلند کر رہا تھا، جس پر دکن کے اخبارات کے فائل اور مضامین شاہد ہیں۔ اعلیٰ حضرت ظل سبحانی کی قدر افزائی بڑھتی جا رہی ہے تو عزیز قوم کی قوت عمل کے مظاہرے بھی یوماً فیوماً بحمد اللہ جلوہ ریز ہوتے جا رہے ہیں۔ موقع اور وقت صفحات رسالہ اور راقم کی مجبوریاں مانع ہیں کہ اجمالاً بھی اُن تمام سپاسناموں اور اظہار خیال کا ذکر کر سکوں جو پٹنہ میں بوقت رخصت اور حیدرآباد میں بوقت آمد عزیز ملت کی بارگاہ عقیدت میں پیش ہوئے۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ایسے چشمۂ فیض کو تا دیر موجزن رکھے اور اس ذات حمیدہ صفات سے ملت اسلامیہ اور ملک وطن کے ہر گوشے کو مستفید کرے۔ نیز اعلیٰ حضرت شہریار دکن کی حکومت اور حکومت کی محبوب رعایا کو آپکی خدمات عالیہ سے استحکام ترقی عطا فرمائے۔ آمین

۵ یہ سال آمد ان و فتہ - حکایت سمجھا ان ۱۹۴۰ء

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جناب ڈاکٹر سید محمود

وزیر تعلیمات سید عبدالعزیز

جناب آنریبل سید حسین امام

مسٹر سید حسن امام بیرسٹر مرحوم

آنریبل سید حسین امام

گیا کے دو اعلیٰ ترین ذی وجاہت خاندانوں کا اجتماع جس ذات گرامی میں ہوا ہے، وہی آج ہمہ ہند شہرت کی مالک ہے۔ بہار کو خصوصاً اور مسلمانوں کو عموماً ناز ہے کہ اقتصادیات پر عام طور سے اور شرح تبادلہ (اکسچینج) پر خصوصیت کے ساتھ سید حسین امام صاحب کی رائے کا وہی احترام کیا جاتا ہے جو صرف ماہرین علم کے لئے مخصوص ہے۔ تقریباً دس سال سے آپ ایوان مملکت ہند (کونسل آف اسٹیٹ) میں تمام صوبہ بہار کی طرف سے نمایندگی فرما رہے ہیں۔ کم از کم بہار کے نمایندوں میں سے کسی نے ایوان اعلیٰ میں اپنی نمایندگی سے بہار کو یہ سربلندی نہیں بخشی تھی جو آنریبل موصوف کی ذات سے حاصل ہوئی ہے۔

گیا کے شہرہ آفاق نیک نام وکیل مولوی سید مظہر امام صاحب مغفور صورت و سیرت میں اپنی نظیر آپ تھے۔ حضرت سید شاہ محی الدین صاحب قدس سرہ سے آپ کا سلسلہ جدی ملتا ہے۔ اور خانوادہ مودودی کے چشم و چراغ حضرت خواجہ عبد اللہ چشتی بن خواجہ اسد اللہ چشتی شیر ملک گنج نشین بکہری سے آپ کا مادری سلسلہ ہے۔ جناب وکیل صاحب کے ہمعصر خان بہادر میر ابو صالح صاحب تھے۔ جن کا جدی شجرہ حضرت سیدنا حسین علیہ السلام خدا اقدس سرہ پر منتہی ہے۔ اور مادری شجرہ حضرت سیدنا محمد القادری الجہری پر تمام ہوتا ہے۔ میر صاحب مرحوم دولت کے اعتبار سے "بے ملک کے راجہ" کہے جاتے تھے۔ مولوی صاحب مذکور الصدر کے صاحبزادے حاجی سید علی امام صاحب بیرسٹر ایٹ لا مرحوم کی شادی میر صاحب موصوف کی صاحبزادی صاحبہ سے ہوئی جو بفضلہ بقید حیات ہیں اور زہد و ورع عبادت و ریاضت میں رابعہ بصری کے نقش قدم پر ہیں۔ اس قرآن السعدین کے ثمر دو بکیں ہمارے آنریبل موصوف ہیں۔ جو ۲۲ فروری سنہ ۱۸۹۷ء مطابق بستم رمضان المبارک سنہ ۱۳۱۴ھ کو پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ابتدائی کتب میں ناظرہ قرآن شریف، اردو، فارسی، پڑھنے کے بعد جناب سید امیر حیدر صاحب سے انگریزی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ کچھ دن مولانا عبد الوہاب منطقی سہسوانی کے جوانمرگ شاگرد مولانا توقیر الحسن صاحب سے اسباق پڑھے۔ مگر عربی علوم کی تحصیل زیادہ تر مولانا خیر الدین صاحب قبلہ سے کی۔ چند ماہ علی گڑھ کالج کے اسکول میں اور چند ہی ماہ گیا ضلع اسکول کے رجسٹر میں آپ کا نام درج رہا۔ علی گڑھ کا سلسلہ تو آپ کی یتیمی نے درہم برہم کر دیا جب کہ ۳۰ نومبر سنہ ۱۹۰۹ء کو چھتیس سال کی عمر میں آپ کے حضرت قبلہ گاہی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کے قریب ترین عصبہ آپکے عم گرامی خان بہادر ڈاکٹر سید حسن صاحب آپکے سرپرست و کفیل ہوئے اور اپنے ساتھ رکھنے لگے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب گورنمنٹ کے ملازم اور بارہ ضلع پٹنہ کے میڈیکل آفیسر تھے لہذا باڑھ کے بلی ہائی انگلش اسکول میں تقریباً ڈھائی تین سال سلسلہ درس و تدریس جاری رہا۔ تا آنکہ مارچ سنہ ۱۹۱۳ء میں بمعیت عم بزرگوار آپ لندن تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے اپنی غیر معمولی صلاحیت کا پہلا ثبوت دیا یعنی لنڈن میٹرک پاس کر لیا۔ حالانکہ ہندوستان میں آپ نے محض سکنڈ کلاس تک تعلیم پائی تھی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ لندن میٹرک اس زمانہ کے نصاب تعلیم کے اعتبار سے یہاں کے بی اے کے برابر تھا۔ اس کامیابی کے بعد آپ نے سٹی اینڈ گلڈس کالج میں انجینیرنگ کی تعلیم کی تحصیل شروع کی مگر گذشتہ جنگ عظیم نے اس نصاب کو بھی پورا نہ ہونے دیا۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں آپ واپس طلب کر لیے گئے۔ یہاں آپنے بھاگلپور کے سبور ایگریکلچر کالج میں علم فلاحت حاصل کرنا چاہا۔ مگر پھر ہوڑہ کے قریب سبور کالج میں آپ نے داخلہ لیا۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں آپ کی شادی آپکے صاحب احتشام ماموں جان جناب سید ظفر نواب صاحب مرحوم کی دختر خرد سے ہو گئی اور سلسلہ درسیات منقطع ہو گیا۔

جس زمانے میں آپ لندن میں تھے اس زمانے میں خواجہ کمال الدین صاحب، مولانا ظفر علی خان صاحب، مسٹر شیر حسین قدوائی وغیرہ بھی وہیں تھے جن سے آپ کا خلا ملا رہتا تھا۔ چونکہ آپ کے عم گرامی اپنے تکملہ کے تحت مجبور تھے کہ اسکاٹلینڈ اور آیرلینڈ میں قیام فرمائیں۔ موصوف پہلے مسلمان تھے جو فیلو آف دی روائل فیکلٹیز آف فزیشینز اینڈ سرجنس (Fellow of the Royal Faculties of the Physicians and Surgeons)

کی سند لیکر ہندوستان واپس آئے تھے۔ اس کے علاوہ لندن سے ڈی۔ پی۔ ایچ کی سند بھی لی تھی۔ افسوس ہے کہ آپ کے ان اعلیٰ اسناد کا کما حقہ لحاظ نہ کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ کی ملازمت میں ڈاکٹر صاحب آخر آخر تک اسسٹنٹ سرجن ہی رہے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب انتہائی نیک خو اور نام و نمود سے قطعی بیزار طبیعت رکھتے تھے۔ اسلئے لازمی تھا کہ حق تلفیوں کی طرف سے چشم پوشی فرماتے رہتے۔ حسین امام صاحب کو اگر بروقت رکنیت ایوان مملکت کی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس نہ ہوجاتا تو خطرہ تھا کہ اپنے عم بزرگوار کے فیض صحبت کی زندہ یادگار ہو کر رہجاتے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ عظیم کے بعد ہوم رول۔ خلافت۔ عدم تعاون وغیرہ سیاسی تحریکوں کا دور یکے بعد دیگرے پورے ہیجان سے آتا ہے، سر اٹھاتا ہے۔ اور پھر دب دبا کر رہجاتا ہے۔ مگر حسین امام صاحب کہیں عملی حصہ لیتے نظر نہیں آتے۔ وہ ہیں اور ان کے خانگی معاملات۔ خاص اعزا و احباب کا بس ایک بے تکلف حلقہ۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے کانسل آف اسٹیٹ کے ممبر منتخب ہوجانے کے بعد ان کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے والے بھی مطمئن نہ تھے کہ ایوان مملکت میں وہ کسی خاص صلاحیت کا ثبوت دے سکیں گے۔ مگر یہ کیا معلوم تھا کہ آپ کو آپ کے بے تکلف اعزا و احباب کا مزاحاً "سیٹھ جی" کہنا، اور اپنے ہم درسوں میں آپ کا علم الحساب میں "اچھا" سمجھا جانا، ایک دن ان سے غیر معمولی قومی خدمات کے ادا ہوجانے کا ایک ذریعہ بن جائے گا، اقتصادی معاملات پر ایوان مملکت سے جب آپ کی کوئی آواز بلند ہوئی۔ لب کشائی کا حق رکھنے والوں نے تحسین و آفرین کی۔ وزرا و مندوبین نے اس میں گلا ملایا، اس وقت اعزا و اقربا کو معلوم ہوا کہ "چہ می ارزد و چوں داشتہ"۔

عام طور سے ابھی اس کا احساس نہیں ہوا ہے کہ بہار کے اس لائق فرزند نے کیا اور کیسی خدمتیں انجام دی ہیں۔ اس میں صرف پبلک کا قصور نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اصلی جوابدہی ملک کی نشر و اشاعت کی ایجنسیوں کے سر بھی ہے۔ جب تک حسین امام صاحب ہندو اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ جماعت پروگریسو پارٹی (Progressive Party) کے صدر نائب کی حیثیت سے کام کرتے رہے اکثر آپ کی معرکتہ الآرا تقریریں اور بحث مباحثے مدح و ثنا کے ساتھ اخبارات کے کالموں میں نظر افروز ہوا کرتے تھے۔ لیکن مسلم لیگ پارٹی کی قیادت جب سے آپ سے متعلق ہوئی ہے۔ کچھ جمود سا نظر آنے لگا ہے۔ حاشا اس کا تعلق حسین امام صاحب کی بے عملی سے نہیں ہو سکتا۔ نہ مسلم لیگ کے ارباب حل و عقد کی یہ کوئی دانستہ حرکت ہو سکتی ہے بلکہ اس کی وجہ آپ کو قوم کی عام بے مائگی میں تلاش کرنی ہوگی۔ خصوصاً ذرائع نشر و تبلیغ کی تکلف وہ حد تک شدید کمی کا کوئی مداوا ہی نہیں معلوم ہوتا بے موقع نہ ہوگا اگر ایک پر لطف انقلاب کا تذکرہ کر دیا جائے۔ کبھی تو یہ تھا کہ ٹریزری بنچیس (گورنمنٹی حلقہ) سے حسین امام صاحب کی گفتگو کے نہ سمجھ پانے کا اعلان ہوتا تھا۔ مگر اب پنڈت ہردے ناتھ کنزرو جی بھی کبھی کبھی نعرہ لگاتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا! ایوان مملکت کے اندر اور باہر ہمارے آنریبل ممدوح جس عزت کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔ وہ بہار کے نوجوانوں کے لئے شگون نیک اور بڑوں کے لئے سامان تبریک ہے۔ "ندیم" کی محدود گنجائش اجازت نہیں دیتیں کہ حسین امام صاحب کے سرمایہ فخر و مباہات کے کارنامے دہرائے جائیں۔ بے لاگ اور نڈر نمایندگی بہار کی اگر کسی نے کی ہے تو وہ حسین امام ہی ہیں۔ مسلم کانفرنس کی کامیابی بڑی حد تک آپ کی دست نگر تھی، اور مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ میں آپکی مسیحا نفسی کارفرما تھی۔

آنریبل حسین امام صاحب کو تعلیمی معاملات سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ دہلی یونیورسٹی کورٹ کے آپ ممتاز ممبر تھے۔ آپ بالطبع از حد غیور واقع ہوئے ہیں۔ عام روش کے طریق پر موقت الشیوع اکابر کی بیجا خوشامد کے ذریعہ آپ حصول اعزاز کو منافی غیرت سمجھتے ہیں۔ خود سے اپنے کو پیش کرنے کی ضرورت کے آپ کبھی قائل نہ رہے۔ خود ستائی اور جرگہ بندی کی خدا نے آپ کو صلاحیت ہی نہیں بخشی ہے۔ رخ دیکھ کر بات کرنا آپکو آتا ہی نہیں ہے۔ چونکہ فی زمانہ یہی ذرائع بیباک طور سے استعمال کر کے مناصب جلیلہ تک پہونچنے کے ہیں۔ اس لئے حسین امام صاحب بہت سے ایسے منصبوں سے محروم ہیں۔ جو ان ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہیے تھے۔ ہر چند وہ ان سے بے نیاز ہیں مگر حق ناشناسی اہل بصیرت کا جوہر نہیں ہو سکتا۔ عام اس سے کہ اس کا تعلق ارباب حکومت سے ہو یا ملک و ملت سے۔ اسی طرح کونسل آف اسٹیٹ میں وقتاً فوقتاً آپ نے جو خدمات انجام دیں۔ ان کا ایک مختصر خاکہ حسب ذیل ہے۔:-

(۱) صوبۂ بہار و اڑیسہ کی علیحدگی سے چھوٹا سا رہ گیا ہے۔ اس کی توسیع کے لئے آپنے آواز بلند کی مگر ناکامی صرف اس وجہ سے ہوئی کہ اس کی تائید کافی نہ ملی

(۲) مسلمانوں کو ریلوے میں کافی ملازمتیں ملنے کے واسطے آپ نے انتہائی جدوجہد کی اور ایک وفد کے شامل سرجارج رینی ہزاکسلینسی وائسرائے کے یہاں گئے۔ جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو ۲۵ فیصدی ریلوے میں ملازمتیں مل رہی ہیں۔

(۳) آئے دن اخراجات کی زیادتی ہی اضافہ ٹیکس کا باعث ہوتی ہے تخفیف اخراجات کے لئے پرزور سفارش کی اور اس کے کمیٹی کی تجویز پیش کی اور خود بھی کمیٹی میں شامل رہکر دس کرور روپیہ سالانہ اخراجات کی کمی کے باعث ہوئے۔

(۴) اخراجات افواج کی کمی پر زبردست بحث کی۔ اور اس کا دعویٰ پیش کیا کہ انگریزی حکومت سے ہندوستان کو بطور اعانت اس مد میں سالانہ ملنا چاہیے۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد حکومت برطانیہ نے دو کروڑ سالانہ دینا منظور کیا۔ گویا ہندوستان کو اس طرح پر دو کروڑ سالانہ اخراجات سے بچانے کے باعث ہوئے۔

(۵) بزمانہ بجٹ آپ نے زور دیا کہ SINKING FUND کی رقم بجائے ۶ کروڑ ڈھائی کروڑ کر دیجائے۔ اگرچہ سرکاری ممبر نے اس وقت نامنظور کیا، مگر سنہ ۱۹۳۲ء کے شروع سے یہ خرچ صرف ۳ کروڑ کر دیا گیا۔

(۶) بزمانۂ پیشی بجٹ آپ نے اس امر پر بھی زور دیا تھا۔ کہ انگلش قرضۂ جنگ کا سود تعدادی ۸۶ لاکھ بدر کر دیا جائے۔ اگرچہ سرکاری ممبر نے اُس وقت جواب دیتے ہوئے نامنظور کیا تھا۔ مگر بعد میں بجٹ سے یہ رقم بدر کر دی گئی ہے۔

(۷) حادثۂ کراچی پر آپ نے بہت زبردست احتجاجی تقریریں کیں۔ اور حکومت سے تحقیقاتی کمیشن کا مطالبہ کیا۔

(۸) کلکتہ ہائیکورٹ میں سنہ ۱۹۱۶ء سے سنہ ۱۹۳۱ء تک مسلسل صرف ایک ہی مسلم جج ہوتا رہا۔ اس کے متعلق آپ نے چند بار حکومت سے احتجاج کیا۔ اور اپنے احباب سے بھی اس کے متعلق سوالات کرائے۔ جس کا نتیجہ اس وقت ظاہر ہے کہ اب وہاں دو مسلم جج ہیں۔

(۹) گذشتہ اجلاس کونسل میں آپ نے ایک پرزور تقریر اس مسئلہ پر فرمائی کہ مسلمانوں کی تقرری کے متعلق جو اعلان گورنمنٹ کا ہوا ہے اس میں بہت سی خامیاں باقی رہ گئی ہیں۔ جس کے سبب تناسب ملازمت پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ جس کے متعلق گورنمنٹ نے تحقیقات کا وعدہ کیا ہے۔

مندرجہ بالا روداد کے مطالعہ سے یہ حقیقت صاف ظاہر ہے کہ جب جب موقع ملا، آپ نے ملک و ملت کی خدمت کے لئے نہایت پرخلوص طریقہ پر کام کیا۔ میں اس نتیجہ پر تنہا نہیں پہنچا ہوں بلکہ طول و عرض ہند سے باوقات مختلفہ بطور اعتراف خدمات قابل رشک اعزاز اخوان ملت نے بخش کر اپنی قدر دانی کا ثبوت دیا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے:-

(۱) اپریل سنہ ۱۹۳۳ء میں یو۔پی مسلم کانفرنس منعقدہ فرخ آباد کی صدارت کے لئے مسلمانان یو۔پی نے آپ ہی کو اپنے اعتماد کا اعزاز بخشا۔

(۲) سنہ ۱۹۳۴ء میں مسلم کانفرنس نے سر آغاخاں کو ہیئت ترکیبی درست کرنے کے واسطے حَکَم مقرر کیا تو مسٹر حسین امام صاحب کو نظامت کا عہدہ دیکر ان کی خدمات ملی کا اعتراف کیا گیا۔

(۳) اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء میں مسلمانان آسام نے اپنے سالانہ اجلاس کی صدارت کے واسطے منتخب کیا اور طلب کیا۔ مگر بسبب علالت طبع آپ کو شرکت کا موقع نہ ملا۔ صرف خطبۂ صدارت وہاں پڑھا گیا۔

(۴) اپریل سنہ ۱۹۳۵ء میں پورنیہ ضلع مسلم کانفرنس جس کا افتتاح آنریبل وزیر تعلیمات نے اپنے ہاتھوں انجام دیا تھا اُس کی صدارت کی اہم ذمہ داری مسٹر حسین امام سے متعلق رہی۔

(۵) ۱۹ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء کو سالانہ اجلاس مسلم ریلوے ملازمین لاہور کی صدارت کے لئے مسٹر حسین امام ہی کو دعوت دی گئی اور آپ ایک سال تک من حیث صدر اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔

(۶) ۲۲ مئی سنہ ۱۹۳۶ء کو مسٹر حسین امام موپلا بھائیوں کی دعوت پر اُن کے سالانہ سیاسی اجتماع کی صدارت کیلئے (CANNA NORE) جیسے دُور افتادہ مقام تشریف لیگئے۔

(۷) یکم اکتوبر سنہ ۳۶ء میں آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے سالانہ جلسہ منعقدہ پٹنہ کی صدارت فرماکر طلبہ کی رہنمائی فرمائی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی خدمات کی بدولت نہ صرف بہار میں بلکہ سارے ہندوستان میں مقبول و ہر دلعزیز ہیں۔ اور آپ کی خدمات کا ہر گوشہ ملک سے اعتراف

ریزرو بنک کمیٹی Reserve Bank committee میں کونسل آف اسٹیٹ کی نمایندگی کے لئے نگاہ انتخاب آپ ہی کی طرف اٹھی تھی۔
۱۹۳۹ء کے اکتوبر میں آسام مسلم ایسوسیئیشن کانفرنس کا انعقاد بمقام جور ہاٹ ہوا تھا، اس کی صدارت حسین امام صاحب سے متعلق رہی۔ گرچہ آپ شدید علالت فرزند اصغر کی سبب شرکت نہ فرما سکے، مگر خطبہ صدارت آپ ہی کا پڑھا گیا۔ اس خطبہ صدارت سے ذیل کا انتخاب دلچسپی سے دیکھا جائے گا :-

"ہندوستان میں ایک قومیت کا تخیل کا ساتھ میں نہیں دے سکتا۔ آپ کی اجازت سے میں مدعی ہوں کہ ہندوستان میں مقاصد کا تنوع - آبادی کا تباین - جغرافیائی امتیازات اور معاشرتی اختلافات نے ایک مخصوص عقدہ لاینحل کی صورت اختیار کرلی ہے۔ تلازمہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان خود ہی ایک چھوٹی سی دنیا ہے۔ جب تک اس کے متعلقہ معاملات بین الاقوامی ذہنیت سے نہ دیکھے جائیں گے، کسی خوشگوار اور مستقل نتیجہ کی امید مجھے نہیں ہے۔ ہندوستان میں بسنے والی اور آپس میں شدید اختلاف رکھنے والی قوموں کے پیش کردہ علحدہ علحدہ مطالبے قلوب سے زیادہ ذہنی تبدیلی چاہتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت تک زور صرف دل کی صفائی پر ہی دیا جاتا رہا ہے۔ ہندوستان میں اتحاد قایم ہو سکتا ہے، مگر متحدہ قومیت اور ہندوستان خلط مبحث کے سوا اور کچھ نہیں "

مارچ سن رواں میں پاکستانی تخیل لیگ نے پیش کیا۔ لیکن کئی برس قبل ہی حسین امام صاحب کی اقتدا کی جاسکتی تھی۔ اگر قوم واقعی پاکستان کی ضرورت سمجھتی۔

ہمیں اپنے صوبہ کے اس جلیل القدر رہنما سے امید ہے کہ وہ مستقبل میں ہماری ٹھوس رہنمائی کا صحیح حق ادا کرے گا - خداوند تعالیٰ ان کی خدمات میں حسن نیت برقرار رکھے - اور ان کے حسن عمل سے اس صوبہ کو بیش از بیش فوائد حاصل ہوں۔

رباعیات مبارک

ازتاجدار سخن حضرت مبارک عظیم آبادی

ہو نکہت گل تو اسکو خوشبو کہئے | صورت اگر پری تو خوشرو کہئے
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا صاحب | اردو ہے مبارک اسکو اردو کہئے

کام اردو میں اردو کی زباں سے لیجئے | جنس اردو کی اردو کی دکاں سے لیجئے
جب دے نہ سکے آپ کو اردو بازار | آگے بڑھئے یہاں وہاں سے لیجئے

رباعیات حمید

ازحضرت حمید عظیم آبادی

دنیا کے لئے دیں کی تباہی کیسی؟ | اور نفس لعیں کی خیرخواہی کیسی؟
توبہ کرو اب بھی تو گناہوں سے حمید | اس ریش سفید پر سیاہی کیسی؟

بن بن کے لہو اشک بہا جاتا ہے | پانی یہ کلیجا بھی ہوا جاتا ہے
کیا جانے کہ کیا انکی نظر میں ہے اثر | اس پر بھی یہ دل ہے کہ کھچا جاتا ہے

اے دشمن دیں سیاہ کاری کب تک؟ | کمبخت تری گنا ہگاری کب تک؟
ہوکر بھی مسلماں نہ خدا سے ڈرنا | اے تیرہ دروں تو بیں سپاری کب تک؟

ہیرالال بنّاجی[1]

ہیرالال بنّاجی کی شخصیت ایک باکمال مصور کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں۔ متعدد آل انڈیا نمائشوں میں آپ طلائی و نقرئی تمغے حاصل کر چکے ہیں۔ اور آپ کی تصویریں خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ بنارس۔ پٹنہ۔ گیا۔ بھاگلپور۔ کلکتہ وغیرہ کی نمائشوں میں کئی بار آپ کی تصویریں کامیاب رہیں اور منتظموں اور سارٹیفکٹوں سے آپ کے کمال فن کی داد دی گئی۔ گذشتہ سال بھی پٹنہ کی پروونشل اگزبیشن میں آپ کی تصویر "ستار نواز" پر ایک طلائی تمغہ ملا تھا۔ کلکتہ کی انڈین سوسائٹی آف اورینٹل آرٹس کی سالانہ نمائشوں میں آپ کی تصاویر اکثر جایا کرتی ہیں۔ انجمن مذکور کے بانی اور قدیم ہندوستانی آرٹ کو حیات نو بخشنے والے ڈاکٹر سر اے۔ این ٹیگور آپ کے کمال فن کے معترف ہیں اور بزرگانہ شفقت کی نظر رکھتے ہیں۔ مسٹر پرسی براؤن سوپرنٹنڈنٹ وکٹوریا موریل اور سابق پرنسپل گورنمنٹ آرٹس سکول کلکتہ کے ایسے نقاد فن نے آپ کی تصویروں کو ہندوستانی آرٹ کا نمونہ قرار دیا ہے۔ آپ کے ہمعصر مشہور ہندوستانی مصورین جناب محمد عبدالرحمٰن صاحب چغتائی وغیرہ آپ کے کمال فن کے معترف ہیں۔

اردو داں حضرات آپکے نام اور کمالات سے کم واقف ہیں کیونکہ زیادہ تر آپ کی تصاویر ہندی اور بنگلہ کے پرچوں میں شایع ہوتی رہی ہیں۔ اردو کے رسایل میں تصاویر شایع ہونے کا بہت کم اتفاق ہوا۔ ایک دو مواقع پر تصویریں جو دی بھی گئیں تو اس کے تجربے کچھ تلخ ہی ثابت ہوئے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بند کر دینا پڑا۔ رسالہ ندیم گیا۔ کے بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں آپکی دو تصویریں شایع ہوئی تھیں اور انشاء اللہ اب یہ سلسلہ جاری ہی رہے گا۔

ہندی کے ماہناموں میں آپ کی تصاویر برابر شایع ہوتی رہی ہیں۔ شری شاردا۔ سرسوتی۔ مادھری۔ سدھا کے ایسے مقتدر پرچوں میں بیسیوں تصاویر شایع ہو کر ہندی داں پبلک سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ رسالہ مادھری۔ جو نول کشور پریس لکھنؤ کا خاص جریدہ ہے۔ تو آپ کی تصاویر کے لئے وقف سا ہو گیا تھا۔ نول کشور پریس ہی نے مشہور ڈراما "خان جہاں لودی" کو بڑے اصرار سے آپ سے مصور بھی کرایا تھا ——— بنگالی رسایل مانسی۔ بھارتی۔ پرواسی۔ بھارت ورش وغیرہ میں بھی آپ کی تصاویر شایع ہوتی ہی ہیں۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے آپ کی تصویروں کی اشاعت کا سلسلہ بند ہے جسکی وجہ یہ ہے کہ ادھر آپ کلام حافظ کو مصور کرنے میں مشغول ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی دوسری مصروفیتیں بھی بہت بڑھ گئی ہیں۔ اس سے بھی اس شغل لطیف کی طرف زیادہ توجہ صرف کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ پھر بھی شاعر حافظ پر مینا کاری کے لئے کچھ ذوقت نکال ہی لیتے ہیں۔ پانچ سال سے زیادہ سے یہ سلسلہ جاری ہے لیکن ابھی بیس یا تیس اشعار سے زیادہ مصور نہیں ہو سکے ہیں۔ قدر دانان فن ہی کچھ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کس جگر کاوی اور دماغ سوزی سے تصویریں بنایا کرتے ہیں۔

جملہ فنون لطیفہ کی طرح مصوری بھی اکتسابی فن نہیں ہے اکتساب اور ریاضت سے فن میں پختگی اور استادی تو بے شک آجاتی ہے لیکن فطری ذوق خداداد نعمت ہوتا ہے جو حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ آپکو بھی تصویروں سے شغف بچپن ہی سے تھا۔ گھر کے کتب خانے میں بہت سی قلمی مصور کتابیں موجود تھیں نیز قدیم استادوں کے شاہکار کثرت سے تھے انہیں دیکھ دیکھ کے آپ کا شوق بڑھتا گیا اور انہیں کو نمونہ رکھ کر آپ مشق بھی کرتے رہے۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں ہمارے صوبہ کے مایہ ناز مشہور مصور بابو ایشوری پرشاد ورما[2] سابق معلم گورنمنٹ آرٹس اسکول کلکتہ والد صاحب سے ملے۔ آپ کے والد صاحب نے ان کے بڑھتے ہوئے شوق کو دیکھ کر ورما جی کو تصویر کشی کی تعلیم دینے کے لئے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ چار ہی پانچ مہینے کے بعد بنّا جی کو انٹرنس کا امتحان دینے کے لئے کلکتہ جانا پڑا۔ بابو ایشوری پرشاد بھی آپ کی نگرانی کے لئے آپ کے ساتھ کلکتہ بھیجے گئے۔ اور استاد کی نظر توجہ اپنے عزیز شاگرد پر قائم رہی۔ کلکتہ کے اسی سلسلہ قیام میں بابو ایشوری

لہ ندیم موصوف کا تذکرہ جناب رادھا موہن صاحب کے مضمون "فن مصوری میں پٹنہ قلم" میں تفصیل سے گذرا ہے۔

پرشاد وہاں کے آرٹس اسکول سے وابستہ ہوئے اور بن جی اپنی مزید تعلیم کے حصول میں مصروف ہو گئے ۔ اس کے بعد پھر آپ نے کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا۔ صرف آپ کا ذوق سلیم اور استادوں کے شاہکار آپکی رہنمائی کرتے رہے ۔

مصوری کے علاوہ آپ کو مطالعہ کتب کا بھی بہت شوق ہے اور کثرت مطالعہ کی وجہ سے متعدد علوم پر عالمانہ دست رس رکھتے ہیں ۔ تاریخ و فلسفہ میں آپکے معلومات بہت وسیع ہیں ۔ اور چونکہ متعدد زبانوں پر عبور کلی حاصل ہے۔ علوم کے COMPA — RITIVE STUDY — پر آپ اچھی طرح قادر ہیں ۔

ادب سے بھی آپ کو بہت شغف ہے ۔ فارسی ۔ سنسکرت ۔ انگریزی ۔ اردو ۔ ہندی اور بنگلہ کے لٹریچر کا آپ نے بغایر مطالعہ کیا ہے ۔ فارسی اور سنسکرت تو بی ۔ اے میں آپ کے اختیاری مضامین رہ چکے ہیں ۔

ابتدائی تعلیم اپنے گھر ہی پر حاصل کی تھی ۔ انٹرنیس میں داخلہ کلکتہ کے ڈفٹن کلیجیٹ سکول میں کرایا ۔ اف ۔ اے سنٹرل ویلیس کالج سے پاس کیا ۔ اور بی ۔ اے کے لئے پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں داخلہ کرایا تھا لیکن آخری سال کچھ ایسے حادثات پیش آگئے اور برادران یوسف کی طرح عزیزوں نے اس طرح خاندان برباد کیا کہ بی ۔ اے کا امتحان بھی نہیں دے سکے ۔

آپ کی پیدائش ۱۸۸۵ء میں ضلع شاہ آباد کی ایک ریاست سورجپورہ میں ہوئی تھی ۔ ہسوا ضلع گیا (بہار) میں آپکی شادی ہوئی اور اپنے والد کے انتقال کے بعد یہیں سکونت پذیر ہو گئے آپ کی جو لاکھوں لاکھ کی مالیت کی جائداد تھی وہ شروع ہی میں رشتہ داروں کے بغض و حسد اور مقدمہ بازی کی نذر ہو گئی اسوقت گذر اوقات کا وسیلہ ہسوا ریاست کی پنشن ہے ۔ ریاست مذکور کا انتظام (منیجری) بھی ادھر چند سال سے آپ ہی کے ہاتھوں میں چلا آیا ہے ۔

انکی مصوری کے متعلق آخیر میں یہ عرض کر دینا ہے کہ بن جی کی مصوری کا کوئی مخصوص طرز نہیں ہے اور نہ آپ کسی خاص قلم کے پیرو ہیں ۔ آپ کو جس طرح قدیم ہندوستانی مصوری پر قدرت حاصل ہے ہیں جسکی شہادت انکی مندرجۂ ذیل عنوان کی تصاویر دے رہی ہیں ۔ نماز ۔ محو خیال ۔ انتظار ۔ انگڑائی ۔ ستار نواز وغیرہ وغیرہ ۔ ایرانی قلم پہ آپکو جو قدرت حاصل ہے اسکی شاہد وہ تصاویر ہیں جو کلام حافظ پہ بنائی جا رہی ہیں ۔ اگرچہ ان پر بھی یورپین اثر بہت نمایاں ہے ۔ آپکی تصاویر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے خط و خال سے جذبات و واردات نمایاں ہوتے ہیں ۔ اور عموماً آپ نقاط سے سایہ پیدا کرتے ہیں ۔ غالباً یہ خوبی آپکی مصوری کی امتیازی شان ہے جس کا تتبع بعض ممتاز اور نامی گرامی مصورین ہند تک سے نہ ہو سکا ہے اور اس حیثیت سے پورے ہندوستان میں آپکی انفرادیت قائم ہے ۔ کبھی موقع ہوا تو آپکے فن کے کمالات پر فنی حیثیت سے ان صفحوں میں تفصیلی نظر ڈالی جائے گی ۔

۱؎ ندیم بہار نمبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہو چکی ہے ۲؎ ندیم یہ تصویریں دفتر ندیم میں آگئی ہیں ۔ چند اس نمبر میں شائع ہو رہی ہیں ۔ اور بعض آئندہ شائع ہونگی
۳؎ ندیم اس سلسلہ کی چند تصویریں بھی دفتر ندیم میں آگئی ہیں ۔ بعض اس نمبر میں چھپ رہی ہیں ۔ بعض آئندہ شائع ہونگی ۔

رباعیات توحید

از حضرت توحید عظیم آبادی

تکمیل صفات کی نظر پیدا کر　　انسان بن اوصاف بشر پیدا کر
اشرف کے لقب کی لاج رکھ لے توحید　　آنکھوں میں جگہ دلوں میں گھر پیدا کر

گلزار ارم مجکو ہے صحرائے الم　　ہے جام سرور اپنے لئے ساغر غم
مسرت ہمدم کرتی ہے ماتم میرا　　کرتا ہوں تمنا کا میں ہر دم ماتم

تو موسم گل! وفا شناس کہاں　　بیگانہ! تجھے چمن کا ہے پاس کہاں
گلہائے خزاں دیدہ کی فریاد ہے یہ　　وہ رنگ کہاں نہم میں وہ بو باس کہاں

یاد رفتگاں :-

میت کی پریت

از جناب سید حسن امام صاحب رکن ادارہ شعبۂ منظومات رسالہ ندیم گیا

(۱)

سلطان الہند غریب نواز قدس سرہٗ کی درگاہ کی زیارت کے لئے اجمیر شریف جانے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا شخص نکلے جو تاراگڈھ کے گنج شہیداں اور امیر الشہدا سید حسن خنگ سوار قدس سرہٗ کی آستانہ بوسی سے مشرف نہ ہوا ہو مگر ان زائرین میں کتنے ہیں جو اس بات کو جانتے ہیں کہ حضرت خنگ سوار کے برادر حقیقی موضع نیورہ (ضلع پٹنہ) میں آسودہ ہیں۔ جن کی اولاد احترام وصیت کی وجہ سے خود حضرت خنگ سوار سے اجتناب رکھتی ہے۔ میر فرزند علی صاحب رئیس نیورہ ان ہی سلف صالحین کی یادگار تھے۔ آپ کے تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ بڑے صاحبزادے سید فخر الدین صاحب تھے، جن کی دو صاحبزادیاں سر علی امام و مسٹر حسن امام صاحبان کے حبالۂ عقد میں آئیں۔ منجھلے صاحبزادے خان بہادر مولوی نصیر الدین صاحب سی۔ آئی۔ ای نصیر المہام بھوپال تھے۔ اور چھوٹے صاحبزادے آنریبل مسٹر جسٹس سید شرف الدین صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔ و ممبر اگزیکیوٹو کونسل بہار و اڑیسہ تھے۔ میر فرزند علی صاحب کی بڑی صاحبزادی نواب شمس العلماء مولوی سید امداد امام صاحب بالقابہم کی شریک زندگی تھیں۔ جن کے بطن سے فخر بہار سر علی امام و مسٹر حسن امام صاحبان پیدا ہوئے۔ میر فرزند علی کی چھوٹی صاحبزادی خان بہادر مولوی سید ظہیر الدین صاحب نیورہ کے عقد میں آئیں جن کے دو صاحبزادے مولوی نذیر الدین صاحب پنشنر ڈپٹی مجسٹریٹ اور مسٹر بشیر الدین صاحب بیرسٹر ڈسٹرکٹ جج ہیں۔ خان بہادر ظہیر الدین صاحب پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ کی وائس چیرمینی پر بہت عرصہ تک فائز رہے جس طرح شہر گیا میں پروفیسر اے۔ بی حلیم صاحب کے پدر بزرگوار مسٹر عبد الحلیم صاحب بیرسٹر مرحوم تھے۔ خان بہادر صاحب کے بڑے داماد مولوی سید زین الدین صاحب سابق پرنسپل لا کالج ہیں جن کے نہ معلوم کتنے شاگرد صوبہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پرنسپل صاحب کے نواسے مسٹر شہاب الدین رحمت اللہ۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ بنگال میں برسر کار ہیں۔ دوسرے داماد خان بہادر مسٹر ذکریا ہاشمی بیرسٹر ایٹ لا دھنباد میں مسلم لیگ کے پرجوش حامی ہیں۔

راقم الحروف نے ان نام آوران نیورہ میں سے اپنے ہمنام بزرگ کے حالات قلمبند کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ دیگر بزرگوں کا ذکر خیر بھی اسی سلسلہ میں آجائے گا۔ مگر معلومات کی کمی کی وجہ سے تفصیلی حالات سب کے علیحدہ علیحدہ لکھنا ممکن نہیں ہوا۔ حضرت مخدوم الملک بہاری قدس سرہٗ کا مشہور مقولہ کہ "بہار میرا۔ بہاری میرے نہیں" آج بھی اپنی صداقت کی داد لے رہا ہے۔ سر علی امام صاحب بالقابہم سچ تو یہ ہے کہ اس صوبہ کے خالق مجازی تھے جسٹس شرف الدین صوبہ بہار سے کانگریس کے پہلے مندوب (ڈیلیگیٹ) اور پہلے ہائیکورٹ جج تھے مگر کس قدر شرم کی بات ہے کہ یادگاریں تو رہیں ایک طرف آج باوجود تلاش کوئی ایسی تحریر بھی نہ مل سکی جس سے میں اپنی خواہش کے مطابق ان بزرگواروں کے سوانح حیات کی ترتیب دے سکوں۔ میرا اپنا تیار کردہ نوٹ جس میں علاوہ مذکورہ بالا معززین کے بابو نند کشور لعل صاحب مسنت وکیل گیا۔ ان کے چھوٹے بھائی مسٹر رمیشر لعل صاحب بیرسٹر آنجہانی۔ بابو رام پرشاد تیں وکیل گیا۔ مسٹر نور اللہ شاہ صاحب وحشت مرحوم وغیرہ کے متعلق ضروری معلومات تھے افسوس ہے کہ تبدیل جائے قیام کے سلسلہ میں خبر نہیں کن کاغذوں اور رسالوں کے ساتھ ضائع ہو گیا ہے۔ ورنہ مجھے اس کی مجبوری نہ ہوتی۔ کہ اور کہیں سے معلومات بہم پہنچاؤں۔

نواب شمس العلماء مولوی سید امداد امام صاحب زیدی سادات کے خانوادہ سے تھے آپ کے والد ماجد خان بہادر مولانا وحید الدین

صاحب صدر اعلیٰ اپنی شان کے ایک ہی بزرگ تھے۔ سادہ منش، بے ہمہ و باہمہ، مرنجاں مرنج۔ اور باوجودیکہ اپنے عہدۂ جلیلہ کے اعتبار سے اُس زمانے کی اقتضا یہی تھی۔ کہ جس قدر بھی اپنا اعزاز و تمکنت چاہتے۔ ہوسکتا تھا مگر انکسار کا یہ عالم تھا کہ ملنے ملانے میں نہ تو کسی سے دبتے تھے نہ کسی کے سر چڑھتے تھے۔ آپکو تو میں نے دیکھا نہیں تھا۔ بزرگوں سے سنی سنائی آپ کے متعلق عرض کر رہا ہوں۔ مگر نواب صاحب مغفور کو خوب اچھی طرح دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کم از کم اس خصوص میں ممدوح الولد سر لابیہ کی پوری شان رکھتے تھے۔ ایسے لوگ اب کاہی کو پیدا ہوں گے؟ صدر اعلیٰ صاحب کے مزاج میں ظرافت بھی بہت تھی۔ ایک دفعہ جب علی امام صاحب اور حسن امام صاحب کا لڑکپن تھا۔ کھیل کود میں جوتوں کا فٹ بال ہو رہا تھا کہ کسی کا جوتا پانی کے خم میں جا گرا۔ بہار شریف کے رہنے والے ایک نیم سالک نیم مجذوب قسم کے بزرگ تھے جو اپنے کو "کلک صاحب" کہتے تھے۔ ان سے صاحبزادوں نے طہارتِ خم کا مسئلہ دریافت کیا۔ آپ نے چاہ کی پیالی سے ساٹھ یا تین سو ساٹھ پیالیاں پانی خم سے نکال دینے کی ہدایت فرمائی۔ اس ہدایت پر عمل شروع ہی ہوا تھا کہ صدر اعلیٰ صاحب جو اس وقت گھر پر موجود نہ تھے تشریف لے آئے۔ آپ بہت کم کسی پر خفا ہوا کرتے تھے۔ مگر آپ کا اٹل حکم تھا کہ جو بات ہو بے کم و کاست گوش گذار کر دی جایا کرے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی دریافت کرنے پر واقعہ اپنی پوری تفصیل کے ساتھ کہہ سنایا گیا۔ سنتے ہی آپ نے کلک صاحب کو مخاطب کرکے کہا کہ آپ نے مسئلہ کی توجیہ غلط کی۔ کنواں زمین کے نیچے ہوتا ہے نہ کہ اوپر۔ لہذا اس خم کو دال کا پیالہ تصور کرنا چاہیئے۔ جوتے کو مکھی فرض کیجئے۔ جس طرح مکھی کو دوبارہ دال میں غوطہ دیا جاتا ہے۔ کہتے ہوئے آپ نے بھیگے ہوئے جوتے کو اٹھا کر خم میں غوطہ دیکر نکالا اور فرمایا کہ لیجئے اب مسئلہ درست ہوگیا۔ اس کے بعد خم کا سب پانی پھکوا دیا۔ صدر اعلیٰ صاحب کے علمی تبحر۔ قانونی وقوف اور ذکاوت و ذہانت کے بکثرت واقعات ہیں۔ صرف آپ کے متعلق صفحے کے صفحے سیاہ کئے جا سکتے ہیں۔ پھر نواب صاحب کے متعلق لکھنا شروع کردوں تو بقول نظیری نیشا پوری ؎

ز شرح قصۂ ما رفتہ خواب از چشم خاصاں را
شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد

نواب صاحب نے آخر عمر میں ایک عقد ثانی کر لیا تھا۔ اس بطن سے آپ کے کئی صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہوئی صاحبزادی کی شادی مولوی اسد رضا صاحب وکیل سے ہوئی۔ بڑے اور منجھلے صاحبزادے حسین امام اور کاظم امام نواب صاحب کو داغ جدائی دے گئے۔ اور انہی کے داغوں نے آپکے دل میں ناسور پیدا کر دیا جس کا اندمال بغیر موت نہ ہو سکا۔ نواب صاحب کو گیا سے اتنا ہی انس تھا کہ یہیں توطن اختیار کر لیا اور یہیں کی خاک کے پیوند ہوگئے۔ اپنی خرید کردہ کوٹھی واقع آنگلہ میں اپنے لختہائے جگر کو پہلو میں لئے آسودہ ہیں۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو اس جامع کمالات ہستی نے دار فانی سے کوچ کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ندیم بابت اکتوبر ۱۹۳۶ء میں رضا قاسم صاحب مختار نے نواب صاحب کے متعلق کچھ وضاحت سے لکھا ہے۔ اس تحریر کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ صرف ایک غلطی اس تحریر میں ہے جس کی ذمہ داری کاتب کے سر ہے۔ جسٹس شرف الدین صاحب کی خواہر محترمہ کے بطن سے نواب صاحب کی جو صاحبزادی تھیں وہ مولوی عبد المجید کے بجائے مولوی عبد الحمید صاحب نیورہ کی زوجۂ محترمہ تھیں۔ حاجی عبد المجید صاحب آپ کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ مولوی عبد الرشید صاحب اور مسٹر حفیظ امام صاحب بیرسٹر ایٹ لا ہیں جو مظفر پور میں پریکٹس کرتے ہیں۔ اس صدی کے ابتدائی سالوں تک مولوی عبد الحمید صاحب گیا کے پبلک پراسیکیوٹر تھے۔ آپ کا قیام اسی مکان میں تھا جو اب ڈاکٹر محمد وحید صاحب کا ہے، مگر اُس وقت شاہ درگاہی صاحب کا کہلاتا تھا۔ حفیظ امام صاحب سے راقم الحروف کی ملاقات اسی زمانے سے ہے۔

(۲)

ایماں بغیب تفرقہ ہا رفت از ضمیر
ز اسما گزشتہ ایم و مسمّٰی نوشتہ ایم

سید حسن امام صاحب کی ولادت بمقام نیورہ ضلع پٹنہ ۱۳ اگست ۱۸۷۱ء کو ہوئی تھی۔ آپ اپنے بھائی بہن میں سب سے چھوٹے تھے۔ آپ کے بڑے بھائی نواب مؤید الملک سید علی امام صاحب کے سی۔ ایس آئی، بیرسٹر ایٹ لا، لا ممبر گورنمنٹ آف انڈیا۔ جج پٹنہ ہائیکورٹ، ممبر ایگزیکیٹو کونسل بہار و اڑیسہ و صدر اعظم حیدرآباد دکن کی پیدائش ۱۱ فروری ۱۸۶۹ء کو ہوئی تھی۔

حسن امام صاحب کا ابتدائی زمانہ تعلیم گھر پر گذرا۔ پھر آپ ٹی۔ کے۔ گھوش اکاڈمی اور پٹنہ کالجیٹ اسکول میں انٹرنس تک پہونچے تھے اور

لہ دو صاحبزادے عابد امام و صادق امام آپ کی یادگار ہیں۔ خدا عمر دراز کرے اور یہی یادگار ہونا نصیب کرے۔

پاس نہ کرنے پائے تھے کہ ۱۸۸۹ء میں آپ کو ولایت بیرسٹری کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ جہاں ستمبر ۱۸۸۸ء میں آپکے بڑے بھائی سید علی امام صاحب روانہ ہو چکے تھے۔ ولایت میں آپنے مڈل ٹمپل میں داخلہ کرایا۔ جہاں ہفتہ کے پانچ دن التزام کے ساتھ ۱۰ بجے صبح سے ۶ بجے شام تک آپ درسیات قانون کا مطالعہ فرمایا کرتے اور راتوں کو اس زمانے کے استاد فن مسٹر جولین[۱] آئیوان امانوئیل وان برلن سے مشق خطابت فرماتے تھے۔ مسٹر برلن نے یہ کمال اپنے دادا بیرن برلن[۲] سے حاصل کیا تھا جو اس فن میں شہرۂ آفاق ایکٹر سر ہنری[۳] ارونگ کے شاگرد تھے۔ ادبیات و ز بادلنی میں آپ کو ریورنڈ چارلس[۴] کیرون بس سے فیض تلمذ کا موقع ملا تھا۔ مسٹر مظہر الحق مرحوم ستمبر ۱۸۸۸ء میں اور مسٹر سچتانند سنہا ۱۸۹۰ء کے فروری میں ولایت پہونچے تھے۔ حسن امام صاحب اور سنہا صاحب بہت زیادہ یکجا رہا کرتے تھے۔ لندن یونیورسٹی کالج کے مشہور تاریخ دان پروفیسر ہنری[۵] کے لکچروں میں دونوں معمول کیساتھ ایک سال تک شرکت کرتے رہے۔ لندن میں پیڈنگٹن[۶] پارلیمنٹ کے نام سے ایک مشہور ادارہ تھا۔ جس کے مباحث میں حسن امام صاحب بہت پیش پیش تھے۔ انکی تقریریں دلچسپی کے ساتھ سُنی جاتی تھیں اور اکثر جریدوں میں اعترافی مقالے اُن تقریروں پر شایع ہوتے تھے۔ حسن امام صاحب اس ہندوستانی سوسائیٹی کے سکریٹری بھی تھے جس کی صدارت دادا بھائی نوروجی سے متعلق تھی۔ انجمن اسلامیہ لندن کی نظامت بھی حسن امام صاحب ہی کے لئے مخصوص تھی۔ چار مہینے آپ نے مسٹر ولیم ڈگبی کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے ان کے ہمراہ صوبہ ویلس کی سیر کی۔ حسن منزل کی لائبریری میں ڈگبی صاحب کی مولفہ کتابیں خود ان کی پیش کردہ ان کے دستخط سے مزین موجود تھیں۔ ۱۸۹۱ء میں دادا بھائی نوروجی پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے جب کھڑے ہوئے تو حسن امام صاحب کی مساعی جمیلہ بڑی حد تک ان کی کامیابی کا سبب ہوئی تھیں اسطرح کارزار حیات کے لئے مسلح ہو کر ۱۸۹۲ء میں حسن امام صاحب مراجعت فرمائے وطن ہوئے، اور پٹنہ میں اپنے پیشہ کا اجرا فرمایا۔

(۳) بیرسٹری و دیگر مشاغل

آپ فوجداری اور دیوانی دونوں کے مقدمات میں برابر کی کامیابی کے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں آپ پٹنہ سے کلکتہ چلے گئے ... ہائیکورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔ ۱۹۱۱ء میں حسن امام صاحب علی گڈھ کالج کے ٹرسٹی منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک آپ ہائیکورٹ کلکتہ کے جج رہے۔ اس کے بعد جب پٹنہ ہائیکورٹ، کلکتہ ہائیکورٹ سے جدا ہو کر مستقل طور پر کھلا تو آپ اس عہدۂ جلیلہ سے مستعفی ہو گئے کیونکہ سر چارلس بیلی گورنر بہار کو کسی طرح گوارا نہ ہوا کہ آپ پٹنہ میں ہائیکورٹ کے قایم ہو جانے کے بعد اپنی ملازمت کے تقرر کے شرایط کے بموجب اس صوبہ میں بطور جج چلے آئیں۔ راقم الحروف کو ایک موقع یاد ہے جب سر چارلس کی زبان سے ان کا بغض للّٰہی معلوم کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ سر علی اور حسن امام صاحب سے خار کھاتے تھے۔ پٹنہ کے صوبہ کے صدر مقام قرار دے جانے پر اس کے نئے نام کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی تو انہوں نے خاص انداز سے فرمایا تھا کہ آپ لوگ تو چاہتے ہونگے کہ پٹنہ کا نام "امام آباد"، رکھا جائے۔ ممدوح نے حسن امام صاحب کے پٹنہ ہائیکورٹ میں آنے کی صورت میں اپنے استعفار دینے کی دھمکی دی تھی، اس لئے گورنمنٹ نقض عہد پر مجبور ہو گئی، اور حسن امام صاحب کو اپنی خوشی خاطر کا موقعہ ملا۔ کیونکہ دراصل ہائیکورٹ کی ججی ان کو پسند نہ تھی، ان کا تقرر بھی میں جانتا ہوں کہ ان کی مرضی کے خلاف ہوا تھا اور محض سر علی کی زبردستی سے ان کو اس جُوئے کو کاندھا دینا پڑا تھا۔

ہائیکورٹ کے جج کی حیثیت سے بھی آپنے جہاں سلہ رد و رعایت انصاف اور قانون کی پابندی اور احترام پر سختی سے عامل رہنے سے اپنے ملک کی نظر میں غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل کی، وہیں سرکار بہادر کے لئے آپ کے اس طرز عمل سے مشکلات پیدا ہو گئی تھیں۔ بابو راسبہاری منڈل اور راجندر اُن سنگھ زمینداران ضلع بھاگلپور حکام ضلع کی خفگی کا شکار ہو کر تعزیرات ہند کے کئی دفعات کے ہدف بنے ہوئے تھے، دونوں پر علحدہ علحدہ فوجداری مقدمات چل رہے تھے۔ مرافعات بڑھتے بڑھتے آخر حسن امام صاحب کے اجلاس میں پہونچی۔ حسن امام صاحب نے مسٹر ہیمنڈ اور مسٹر لائل کی جیسی خبر اپنے فیصلہ میں لی تھی، وہ آج تک یادگار ہے اور اس زمانہ میں تو اس سے سنسنی پھیل گئی تھی۔ یہ ہیمنڈ صاحب وہی ہیں جو جنگ عظیم کے زمانہ میں بہار کے ایکٹنگ

۱۔ Julian Ivan Emanuel Von-Berlin
۲۔ Baron Berlin
۳۔ Sir Henry Irving
۴۔ The Revd Charles Coron-Bus
۵۔ Professor Henry.
۶۔ ...ddington Parliamint London.

چیف سکریٹری تھے اور آخر کار سرلارمی ہیمنڈ بنکر گورنر آسام ہوئے تھے۔

۱۹۱۶ء سے مرتے دم تک آپ اپنے پیشہ کی خدمت کرتے رہے۔ جس میں آپکی کامیابی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت دیا جاسکتا ہے کہ آپ کی آمدنی کے برابر اس پیشہ سے ملک میں اور کسی قانوندان کی آمدنی نہیں تھی۔ سالانہ ۷۵ ہزار روپے سے بالا آپ صرف انکم ٹیکس ادا کرتے تھے۔ آپ کی پریکٹس صوبہ کے اندر محدود نہیں تھی بلکہ تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ چالاکی۔ دھوکا دھڑی، حصول مقصد کی خاطر ناجائز فائدہ اٹھانا یا اسی قسم کی اور اوچھی اور غیر شریفانہ حرکتوں سے آپ کو قطعی احتراز تھا۔ متانت۔ سنجیدگی اور معقولیت کو کبھی آپ ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ قانون وضوابط کا آہنی بت آپ کی توجہات کی گرفت میں موم کی گڑیا ثابت ہوکر وہی روپ دھار لیتا تھا جس صورت میں آپ پیش کرنا چاہتے تھے۔ آپ کا مدمقابل قانون دان کبھی مطمئن نہیں رہتا تھا کہ کس آن آپ مقدمہ کی صورت حال کو یا قانون کے مفہوم کو کون سا جامہ پہنا دیں گے۔ ایک دفعہ پٹنہ کے بعض سربرآوردہ وکلا روبیر سٹر حسن منزل میں میرے سامنے موجود تھے اور ایک مقدمہ کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی جو دوسرے ہی دن پیش ہونے والا تھا۔ حسن امام صاحب نے لائق تر لوگوں کو منتخب فرما کر مخالفت میں بحث کرنے کی اجازت دی اور محض کمسن جونیروں کو اپنے ساتھ لیا۔ سرآمد مخالفین نے جب اپنی بحث ختم کی ہے تو میں سچ عرض کر رہا ہوں کہ مجھے یقین تھا کہ حسن امام صاحب تین دفعہ مرکر زندہ ہوں تو بھی ان کے پیش کردہ عقلی ونقلی دلائل کا جواب نہیں دیسکتے ہیں۔ لیکن حسن امام صاحب نے ع ایک رحمت اس کی ہے اس سارے دفتر کا جواب ۔ کے مصداق دفعہ قانون کے الفاظ اور شارع قانون کے مافی الذہن کو جو بیان کیا تو اب نہ پوچھیے۔ کیا عالم تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ طرف ثانی کو واقعی دستور الصبیان کی واقفیت نہیں۔ باوجودیکہ یہ ساری باتیں تھیں۔ مگر حسن امام صاحب مقدمہ کی مسل کو اس بری طرح دیکھتے تھے کہ کم از کم مجھے ہر بار یہ شک رہجاتا تھا کہ ممدوح نے عدم توجہ سے کام لیا ہے۔ مجھے اپنے ذاتی مقدمات میں موصوف سے کام لینے کا اتفاق ایک سے زیادہ بار ہوا۔ مگر ایک طرف مسٹر مانک کا بڑے ضابطے اور قاعدے کے ساتھ کاغذ دیکھنا، اور اس سے اپنی پوری تشفی حاصل کرنا ذہن میں رکھتے ہوئے دوسری طرف حسن امام صاحب کی جلد جلد ورق گردانی اور سطروں پر انگلی یا سرخ پنسل چلاتے چلے جانے کو دیکھکر لازمی تھا کہ میں پریشان ہوتا۔ ممدوح کو میری اس کمزوری کا احساس تھا۔ اکثر آپ اس کا اظہار فرما کر مجھے شرمندہ کرتے۔ مگر میری ندامت کی انتہا نہ رہتی تھی جب آپ مقدمہ کو خود بیان فرمانا شروع کرتے تو چھوٹی سی چھوٹی تفصیل بھی نہیں چھوٹتی۔ اسما جس قدر ہوتے وہ صحیح صحیح زبان سے ادا ہوتے۔ واقعات کی تاریخ میں کبھی غلطی نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ تو آپ نے کمال کر دیا کہ بعض جگہ سن اور بعض جگہ نام غلط ٹائپ ہو گئے تھے۔ مقدمہ کو بیان کرتے وقت آپ نے ٹائپ کی اس غلطی کو بھی بیان کر دیا۔ میں نے ایسا حافظہ دیکھا ہی نہیں۔ حسن منزل ہی میں ایک دفعہ کا میرا چشم دید واقعہ ہے کہ جس زمانے میں مہاراجہ ڈمرانؤں اور آرہ کے مشہور رئیس ہری جی سے برما اسٹیٹ کے لئے مقدمہ بازی ہو رہی تھی تو ہری جی کی طرف سے حسن امام صاحب کام کر رہے تھے۔ ہری جی کے یہاں سے کاغذات کے پلندے کے پلندے لیکر کچھ لوگ آئے۔ حسن امام صاحب نے سب کاغذات میز کے ایک گوشہ کیطرف انبار کر دینے کی ہدایت فرمائی۔ لانے والے حضرات چلے تو ان میں سے ایک ضعیف العمر شخص اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ حسن امام صاحب نے سمجھا کہ ان کو کچھ کہنا ہے لہذا ان سے مخاطب ہوکر دریافت حال کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ محض آپ کے درشن کی خاطر ٹھیر گیا ہوں۔ حسن امام صاحب نے فرمایا کہ اچھا تو بیٹھ جائیے اور جی بھر کر درشن کر لیجیے۔ مگر وہ اسی طرح کھڑے رہے اور فرمایا تو صرف یہی کہ "آپ نے ہم کو کاہے کو پہچانا ہوگا"۔ حسن امام صاحب نے نہایت اطمینان کے ساتھ فرمایا کہ آپ نے کیوں ایسا خیال کیا۔ اس کے بعد جو بتلانا شروع کیا کہ آپ کا نام یہ ہے، آپ آرہ میں اس مکان کے مقابل رہتے تھے جس میں ہمارے منجھلے ماموں صاحب بحیثیت ڈپٹی مجسٹریٹ کرایہ دار تھے۔ ہم کمسن تھے، آپ جوان تھے۔ آپ کے اس وقت توند تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان باتوں کو سن کر لالہ صاحب کا حیرت سے کیا حال ہوا۔ الفاظ میں نہیں بیان کیا جا سکتا ہے۔ غریب رو دئے۔ معلوم ہوا کہ تقریباً تیس برسوں سے زیادہ عرصہ پر حسن امام نے ان کو دیکھا تھا۔ بھلا کوئی حد ہے اس حافظے کی؟

(۴) رجحان سیاسی

حسن امام صاحب کو جو چیز سب سے ممیز کرنے والی تھی وہ ان کی بے روو ریا آزادی رائے تھی۔ ان کی پوری زندگی اسی رائے کی آزادی کی مشق و استحفاظ میں بسر ہوئی۔ ایسی صورت میں حسن امام صاحب کے لئے سوائے کانگریس کی آزادی طلب فضا کے اور کہیں گذر ہی نہیں تھی ۱۹۰۸ء میں آپ نے کانگریس میں شرکت کر لی اور برابر اس ادارہ کی خدمت میں دامے درمے قدمے پیش پیش رہے۔ کانگریس کا پہلا اجلاس آپ ہی کی موت پر پٹنہ میں ہوا تھا۔ مگر آپ اس وقت کلکتہ ہائیکورٹ کے جج ہو چکے تھے۔ اسی لئے عملی حصہ نہ لے سکے۔ مسٹر مظہر الحق مرحوم کا صدر استقبالیہ ہونا

محض حسن امام صاحب کی معذوری پر مبنی تھا، اس سے مظہر الحق صاحب کی تنقیص مراد نہیں ہے بلکہ یہ دکھلانا ہے کہ حسن امام صاحب اُن سے آگے تھے۔ ۱۹۱۶ء
میں گاندھی جی جب بہار آئے تو کچھ لوگ تو ان پر ہنستے رہے مگر حسن امام صاحب نے اس منحنی اور کم رو شخص کے پیکر میں عزم راسخ کا بلند پہاڑ اور مستقبل کا
محبوب ترین قائد دیکھ کر اس سے اپنا رشتۂ عقیدت استوار کر لیا اور دو ہزار کی رقم پیش کرکے اُن کے ہاتھ بٹانے والوں میں سب پر سبقت حاصل کر لی۔
اس کے بعد ہی ہوم رول لیگ کی جب مسز اینی بسنٹ نے طرح ڈالی تو چونکہ کانگریس سے یہ ایک قدم آگے تھی اسلئے حسن امام صاحب پوری تن دہی
کے ساتھ اس کے بھی حامی ہو گئے۔ مسٹر سچدانند سنہا اور انہوں نے ملک کے اکثر اضلاع کا دورہ کیا۔ گیا میں بھی تشریف لائے۔ آنریبل بشن پرشاد
بابو کشن پرکاش سین سنہا۔ درگا پرشاد وکیل اور راقم الحروف نے لیگ میں شرکت کی۔ اسی سلسلے میں ایک مجلس مشاورت حسن منزل میں بیٹھی تھی۔
اس وقت سر علی امام مرحوم پٹنہ ہائیکورٹ کے جج تھے۔ اتفاق سے وہ اپنی برادر زادیوں کو دیکھنے کے لئے تشریف لائے۔ ہم شوریدہ سروں کو یکجا
دیکھ کر ممدوح نے مزاحاً سوال کیا کہ "تم نیٹو[۵] سب بیٹھے کیا سازش کر رہے ہو" حسن امام صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ "ہم نیٹو یہ سازش کرتے
ہیں کہ آپ جیسا کالا آدمی چیف جسٹس ہوا کرے"۔

۱۹۱۸ء میں مونٹفورڈ[۶] اسکیم پر غور کرنے کے لئے کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس بمبئی میں منعقد ہونا قرار پایا تو مسز اینی بسنٹ اور سی آر داس
صاحب کے کہنے سننے سے حسن امام صاحب نے اس کی صدارت قبول کی۔ یہ اجلاس اپنی اہمیت کے اعتبار سے بہت ہی یادگار تھا۔ کانگریس کی
اعتدال پسند جماعت اسکیم کو چلانے کا وعدہ کر چکی تھی۔ اور کانگریس کی مخالفت پر کانگریس سے الگ ہو گئی تھی۔ صرف مدراسی اعتدال پسند
باقی رہ گئے تھے۔ مگر وہ بھی دھمکی دے رہے تھے۔ دیوان بہادر، گووند رگھوا آئر اعتدال پسندوں میں پیش پیش تھے۔ مگر ان کے مقابلہ میں تلک مہاراج
اپنی پوری طاقت سے جمے ہوئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس منجدھار سے کانگریس کی کشتی کو نکال لیجانا حسن امام صاحب ہی کا کام تھا۔ اسکیم کے
متعلق جو ریزولیوشن کا مسودہ تھا اس میں ایک خاص ترمیم پر مدراسیوں نے پورا زور لگا دیا مگر ناکامی کے آثار دیکھ کر علیحدگی کی دھمکی دی۔ جواب
میں تلک مہاراج نے ایک سنسکرت اشلوک پڑھا جس کے معنی تھے کہ بچوں کی قوت اتنی ہی ہے کہ رو پڑیں۔ اس پر مدراسیوں کو موقعہ مل گیا اور وہ مصر
سے داد خواہ ہوئے کہ تلک مہاراج سے ان الفاظ کو واپس لینے کا مطالبہ ہو۔ عجب نازک موقع آ گیا تھا، مگر حسن امام صاحب نے بلا پس و پیش
فرمایا کہ تلک مہاراج کو اپنے الفاظ واپس لینے پڑیں گے۔ تلک مہاراج اس پر کیوں راضی ہوتے، مگر حسن امام صاحب نے جب اعلان کر دیا کہ اگر تلک مہاراج
اپنے الفاظ واپس نہیں لیں گے تو سبجکٹ کمیٹی کو توڑ دیا جائے گا۔ تو تلک مہاراج مجبور ہوئے اور بالآخر اُنہوں نے اپنے الفاظ واپس لے لئے۔ حسن امام
صاحب نے ادھر تو یہ کیا اُدھر اجلاس کمیٹی کے ختم ہوتے ہی تلک مہاراج کو بھی یہ کہہ کر راضی کر لیا کہ جو کچھ میں نے کیا وہ محض اس عہدہ کا احترام تھا جسکی
عزت آپ ہی نے بخشی تھی، ورنہ آپ کو تو میں خود اپنا گرو (قائد) مانتا ہوں، اس پر بھی از بزرگان خطا کے تحت میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔
تلک مہاراج خود بڑے دل گردے والے تھے۔ یہی نہیں کہ وہ محض راضی ہی ہو گئے، بلکہ اس وقت سے حسن امام کی حمایت میں وقف ہو گئے۔

۱۹۱۹ء میں آپ نے ایک وفد خلافت کی سرکردگی فرمائی تھی جو مسلمانان ہند کے خیالات کو وزرائے سلطنت کے حضور میں پیش کرنے
کیلئے ولایت گیا تھا، رئیس الاحرار مولانا محمد علی صاحب بھی ایسا ہی وفد لیکر گئے تھے۔ دونوں بزرگواروں کے وہ خطبے موجود ہیں جو مسٹر لائیڈ جارج
کے سامنے دئے گئے تھے۔ ممکن ہے کہ احباب مجھے شخصیت پرستی کا الزام دیں، مگر آخر میں بھی اپنے ممدوح ہی کے نام سے پکارا جاتا ہوں۔ ہوسکتا ہے
کہ اپنی رائے نہ بدلنے کی وجہ سے وہ نیک نام ہوں، اور میں اسی قصور کی وجہ سے بدنام کیا جاؤں۔ مگر میں مجبور ہوں کہ جو میرے دل میں ہے وہی میرا قلم بھی لکھے۔
میرے خیال میں مولانا کی خطابت اپنی تمام و کمال خوبیوں کے بعد بھی وہاں ختم نہ ہو سکی، جہاں سے حسن امام صاحب کی خطابت کی ابتدا ہوتی تھی۔ خود
مسٹر لائیڈ جارج کو اعتراف کرنا پڑا۔ حسن امام صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ وہ چھوٹ کر رہ گئے جب مسٹر لائیڈ جارج نے ان کو وہ مراسلہ دکھلایا جس میں
ترکوں نے خلافت کے جوئے کو اتار پھینکنے کے فیصلے کے ساتھ حجاز کی حکومت کی ذمہ داری سے انکار کیا تھا۔ اور اس طرح "دانائے راز" اقبال کا
۱۹۱۱ء کا لکھا ہوا شعر ۱۹۱۹ء میں عملاً "شرمندہ معنی" ہوا۔

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی ترکوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

[۵] Native
[۶] مونٹیگو چیمسفورڈ کا مخفف مونٹفورڈ :- MONT-FORD

۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا۔ لالہ ہرکشن لال۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو۔ ڈاکٹر ستیہ پال وغیرہ پر بغاوت کا مقدمہ چلا۔ اسپیشل کمیشن کے سامنے حسن امام صاحب نے جس بیجگری کے ساتھ کام کیا۔ اس سے پنجاب والوں میں عموماً اور کانگریس کے حلقہ میں خصوصاً ان کی جو عزت قایم کرادی تھی اس کے مظاہرے ان آنکھوں نے دیکھے۔ کانگریس کا اجلاس اُس سال امرتسر میں ہوا تھا۔ گیا سے بابو کشن پرکاش سین سنہا اور مولوی توفیر احمد مختار کے ساتھ میں بھی ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ہوا تھا۔ اتفاق سے جس ٹرین میں ہم لوگ سفر کر رہے تھے۔ اسی میں پنڈت موتی لال نہرو صاحب اور حسن امام صاحب کے خاص ڈبے بھی لگے ہوئے تھے۔ نہ معلوم پنجاب والوں کو اس کی خبر کیسے ہو گئی تھی مگر باوجود شدید سردی کے جس جس اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری، تمام پلیٹ فارم آدمیوں سے بھرا ہوا تھا، جو صرف حسن امام صاحب کی زیارت کے مشتاق تھے۔ سبجکٹ کمیٹی میں میں نے دیکھا کہ حسن امام صاحب کی ذات فیصلہ کن تھی۔ اوروں کی بڑی بڑی دلیلیں ایک طرف رہ جاتی تھیں۔ لیکن حسن امام صاحب جو کہہ دیتے تھے اسی پر اتفاق آرا ہو جاتا تھا۔

ناگپور سیشن میں کانگریس نے عدم تعاون شروع کرنے کی ٹھان لی تو حسن امام صاحب نے خاموشی اختیار کر لی۔ چونکہ وہ اس کے ساتھ نہ تھے۔ چنانچہ اس موقع پر گاندھی جی کی کوششیں بھی بارآور نہ ہو سکیں، حسن امام صاحب نے اپنی رائے نہ بدلنا تھی نہ بدلی۔ لیکن اس جمود کو سی آر داس صاحب کی گرفتاری نے توڑ دیا۔ اور حسن امام صاحب لیڈر صاحب گورنر کے پاس جا پہنچے۔ اسی زمانہ میں تاجدار شاہ ایڈورڈ ہشتم بحیثیت شہزادہ ولیعہد بہادر تشریف لا کر پٹنہ میں دربار کرنے والے تھے۔ حسن امام صاحب نے صاف کہہ دیا کہ اگر ترمیم شدہ قانون فوجداری کے تحت گرفتاریاں بند نہ کی جائیں گی تو دربار میں شرکت سے وہ خود اور اُن کے زیر اثر احباب و عمائد باز رہیں گے۔ دوسرے ہی دن دربار مقرر تھا۔ گورنر صاحب کو بادل ناخواستہ احکام امتناعی جاری ہی کرنا پڑے۔

اس کے بعد ۱۹۲۷ء کی مقاومت مجہول نے پھر حسن امام صاحب کی رگِ حمیت کو پھڑکا دیا۔ باوجود اختلاف شدید کے آپ بنفس نفیس معہ اپنے بال بچوں کے میدان میں اتر آئے۔ چونکہ آپ سے دیکھا نہ گیا کہ بعض یورپین افسران پولیس اپنی بیتوں کی مشق کانگریس والنٹیروں پر بلا خیال خطر کئے جائیں۔ اس ایک ذات کا سینہ سپر ہونا تھا کہ پولیس کے افسروں نے بھی تہذیب کا چھوٹا ہوا دامن پھر پکڑ لیا۔ راقم الحروف کے علم میں اور آنکھوں دیکھی جتنی باتیں ہیں وہ اگر سب بیان کی جائیں تو دفتر کا دفتر سیاہ ہو جائے گا، جس کو رسالہ ہذا کی محدود گنجائشیں سنبھال نہ سکیں گی۔ لہذا اب اس روئداد کو یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ بظاہر گرچہ حسن امام صاحب کا عملی تعلق کانگریس سے عدم تعاون کی تحریک سے اختلاف کی وجہ سے ختم ہو گیا تھا۔ مگر پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مرتے دم تک آپ حافظ کے اس شعر کی سانس لیتی ہوئی تصویر تھے کہ ؎

وست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

بلکہ میں تو یہ بھی کہنے کو تیار ہوں کہ ؎

مپندار اینکہ مہرت از دل عاشق رود ہرگز
چوں میرد مبتلا میرد چوں خیزد مبتلا خیزد

(۶) عقاید مذہبی

کفر و ایماں را یکے گفتم دلش راضی نشد
دیر و کعبہ ہر دو ویراں کرد از دینش مپرس

جو لوگ میرے میتا پر الحاد و زندیقیت کا شبہ کرتے ہیں میرے نزدیک ان کی ایمانداری مسلم ہے۔ میں اس کا رد ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ اسی سے ممدوح کی روحانی رفعت قایم ہوتی ہے۔ بزرگان دین میں ہمارے مخدوم الملک بہاری قدس سرہٗ العزیز کے ایک مکتوب کا ایک اقتباس قابل غور ہے وہو ہذا —— "تا ہفتاد صدیق بر زندیقیت تو سوگند نہ خورند صدیق نہ شوی"

بعض احباب تو حسن امام صاحب کو غلوئے ہندو دوستی کی وجہ سے ہندو کہنے سے بھی باز نہ آئے، بلکہ اس مغالطے میں چند ہندو احباب ہنوز مبتلا ہیں۔ حالانکہ ؎

اگر مشہور ہو افسانہ اپنی بت پرستی کا
برہمن کیا عجب ایماں لے آئے بنارس میں
(مومن خاں)

میں کسی کو بھی غلط نہیں کہتا۔ جب تک مجھے خود حقیقت حال معلوم نہیں ہوئی تھی۔ میں بھی بعض وقت یہی کہہ اٹھتا تھا کہ ؎

در بتخانہ عشق بتاں اور آپ اے مومن!
یہ حضرت آ گئے اکبار کیا طبع مقدس میں

واقعہ صرف یہ ہے کہ حسن امام صاحب کو ان کے پیر دستگیر حضرت حاجی صاحب قبلہ اعظم ذکرہ کے فیوض نامتناہی نے اس وادی حیرت میں پہنچا دیا تھا جہاں ۔ ع

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ——— کی کیفیت میں رنگ جانے کے بعد غالب مطلقہ مومن جیسا کہ کہہ سکتا ہے کہ ؎

ڈھونڈھے مجھ کو حرم میں نہ سوئے دیر گئے ۔ راہ ہی چھوڑ دی وہ ہم نے جدھر غیر گئے

اس کے بعد غلط فہمیوں کے احتمال کو کیا کیا جا سکتا ہے ! ——— اور ؎

مارا بزندی بدنام کردند ۔ پیران جاہل شیخان گمراہ

کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا ۔ مجھے حسن امام صاحب کے ساتھ آخری اشتراک عمل کا موقع اس وقت ملا جب انھوں نے ایک حد تک اصرار کے ساتھ خدمت آستانۂ فیض کا نشانہ دیوہ شریف کیلئے اپنے کو پیش کیا اور ۲۵ رمئی ۱۹۳۰ء کو ہم لوگوں نے ان کو ٹرسٹ کمیٹی کا پریسیڈنٹ یہ کہہ کر مقرر کیا کہ ؎

خیر یارب سجود عشق کی خیر ۔ ایک کافر امام ہوتا ہے

۱۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے ۔ اسی زمانے میں اعتقادی مسائل پر تبادلہ خیالات اور ان کے دل کی باتیں معلوم کرنے کا موقع ملا جس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان کا یہ دعویٰ بالکل بجا تھا کہ ابن آذر ہونے کا شدید ترین احساس انکو مجبور کرتا تھا کہ مادی ہو یا خیالی کسی بت کو بھی وہ توڑے بغیر نہیں رہ سکتے تھے ۔ حالانکہ یہ بھی ایک بت تھا ۔ بقول مصلح شیراز

تا در تو زپندار تو ہستی باقی ست ۔ می داں بیقیں کہ بت پرستی باقی ست

گفتی بت پندار شکستم رستم ۔ ایں بت کہ تو پندار شکستی باقی ست

مگر یہ وہ بت تھا جس کو توڑنا ممکن نہ ہوا ہے نہ ہوگا ۔ رباعی کا جو تھا مصرعہ بھی یہی کہہ رہا ہے ۔ اسکو بندگی بیچارگی کی مجبوری کہئے یا تسلیم و رضا کا آخری زینہ مگر ہوتا یہی ہے کہ اُس بت کو توڑنے کے بجائے اس کی پرستش کرنی پڑتی ہے ؎

رفتم بطواف کعبۂ دل کانجا ۔ دیدم خود را و خود پرستی کردم

لیکن مذہب کا ظاہری حلیہ جو بڑی حد تک انسان کی معاشرت کی تربیت کرتا ہے اور توریث و تملیک کے وقت کام آتا ہے ۔ اسکے اعتبار سے وہ اپنے کو شیعہ کہتے تھے ۔ لیکن اس میں بھی مسائل خلافت ۔ تبرا ۔ تقیہ ۔ متعہ کا استغفار فرمایا کرتے تھے ۔ کم سے کم دو بار تو اسکے متعلق مجھے پوری صراحت و وضاحت سے انکی زبان سے اسکو سننے کا موقع ہوا ہے ۔ ایک مرتبہ تو لکھنؤ کے کارلٹن ہوٹل میں مولانا حاجی حکیم سید احمد صاحب کے ساتھ دوسری دفعہ گیا کے ڈاک بنگلہ میں اس آخری موقعہ پر محترمی سید احمد نواب صاحب مظفر پوری ڈپٹی مجسٹریٹ اور مولوی خلیل الرحمن صاحب ایڈوکیٹ گیا اور بعض دوسرے اشخاص موجود تھے ۔ برادران اہل تشیع کو برا نہ ماننا چاہئے میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر حسن امام صاحب اپنے کو سنی کہنے کیلئے تیار ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ اسمیں بھی بہت سے مستثنیات وہ ضروری نہ سمجھتے ۔ البتہ بلا کسی قسم کے استثنائے وہ اپنے کو "وارثی" بالاعلان کہا کرتے تھے ۔ جس زمانہ میں وہ ٹرسٹ کمیٹی دیوہ شریف کے پریسیڈنٹ تھے تو یہ بات بھی محقق ہو چکی تھی کہ سوائے حضرت حاجی فیضو شاہ صاحب خادم خصوصی کے حسن امام صاحب سے متقدم (سینیر) اور کوئی وارثی نہ تھا ۔ نہ تو ٹھاکر پنجم سنگھ عرف وقار شاہ صاحب ان پر سبقت لے جاسکے نہ بابو کنھیا لعل صاحب سکریٹری ٹرسٹ کمیٹی ۔ بابو صاحب کے اس دار فانی سے گذر جانے کے بعد راقم الحروف کے سپرد یہ خدمت ہوئی تھی ۔

(۷) خانگی حالات

تمہید مضمون میں عرض کیا جا چکا ہے کہ علی امام صاحب و حسن امام صاحب کی پہلی شادیاں انکے بڑے ماموں کی صاحبزادیوں سے ہوئی تھیں ۔ ان سے علی امام صاحب کے یہاں چار بیٹیاں اور پانچ بیٹے علی امام صاحب کے بعد یادگار رہے ۔ بڑی صاحبزادی کی شادی رئیس ڈمری مولوی نظیر الدین صاحب سے ہوئی ۔ منجھلی صاحبزادی مولوی سید احمد صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ سائن رہائی کی شریک زندگی ہوئیں ۔ سنجھلی صاحبزادی مسٹر سید جمال احسن صاحب بیرسٹر کے حبالۂ عقد میں آئیں ۔ چھوٹی صاحبزادی نے بی بی پور کے سید مجید عالم صاحب بی اے (آکسن) انسپکٹر آف اسکولس کا گھر آباد کیا ۔ صاحبزادے سب بیرسٹر ہوئے ۔ بڑے صفدر امام صاحب منجھلے حیدر امام صاحب کی شادی نواب نور الحسن صاحب کلکتوی کی صاحبزادی سے ہوئی ۔ سنجھلے جعفر امام صاحب ایڈوکیٹ جنرل بہار نے اپنی خواہر عم زاد کو شریک زندگی بنایا ۔ چوتھے افسوس ہے کہ ۱۹۳۳ء میں جوانمرگ دنیا سے اٹھ گئے ۔ اُن کا نام سید رضا امام تھا ۔ انکی شادی موجودہ مہاراجہ محمود آباد کی ہمشیر سے ہوئی تھی ——— پانچویں مسٹر نقی امام صاحب ہیں جو کانگریس گورنمنٹ کے دار دورے میں کونسل کے ڈپٹی پریسیڈنٹ تھے ۔ علی امام صاحب کی دوسری شادی ایک فرانسیسی خاتون سے کی تھی جو پہلے انکے یہاں ملازمہ تھیں ۔ یہی پہلی لیڈی امام تھیں ۔ ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی اور شادی کے چند ہی سال بعد ان کا انتقال ہو گیا ۔ علی امام صاحب نے تیسری شادی موجودہ لیڈی انیسہ امام صاحبہ سے کی ۔ ان سے بھی کوئی اولاد نہیں ہے ۔ لیڈی انیسہ صاحبہ پٹنہ عظیم آباد کے مشہور با وضع وارثی بزرگ مولوی یحییٰ صاحب وکیل

منغود کی نواسی ہیں - اور علم و اخلاق میں اپنی نظیر آپ ہیں - سوسائٹی کے اعلیٰ ترین مگر مسموم ترین حلقہ کی روح رواں ہو کر رابعہ عہد و مریم زمانی ثابت ہونا آپ ہی کا کام ہے -

حسن امام صاحب کو اپنی ممیری بہن کے بطن سے دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہوئے - جن میں سے ایک صاحبزادہ کا داغ حسن امام صاحب کے دل پر آیا - بڑی صاحبزادی مسٹر سمیع مرحوم بیرسٹر مونگیر کی بیوی تھیں - دوسری صاحبزادی صبیا کہ اوپر مذکور ہوا اپنے برادر عم زاد سید جعفر امام صاحب کی زندگی کی شریک ہیں - حسن امام صاحب کے صاحبزادے مسٹر سید مہدی امام صاحب کی شادی جسٹس فضل علی صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی - مہدی امام صاحب بیرسٹر ہونے کے علاوہ سنسکرت کے ماہر اور روحانیات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں - خدا عمر میں برکت دے اور سیدھے راستے چلائے ——— حسن امام صاحب کی شریک زندگی عرصہ دراز تک جنون میں مبتلا رہیں - سالہا سال آپنے تجرد میں بسر کیا - لیڈی میری امام مرحومہ کی بہن حسن امام صاحب کے یہاں لڑکیوں کی گورنس تھیں ان سے حسن امام صاحب نے عقد کر لیا تھا - ان کے بطن سے ایک لڑکا تھا - حسن امام صاحب کے انتقال کے بعد بیگم صاحبہ نے دوسرا عقد کر لیا - راقم الحروف کو معلوم نہیں وہ لڑکا کس ڈھرے لگا -

"اول بہ آخر نسبتے دارد" کے مصداق حسن امام صاحب آخر زمانہ میں نہایت سادہ طرز معاشرت پر اتر آئے تھے - اس طرح آپ جب جیل آتے جاتے تو مجھے تار سے اکثر مطلع فرما دیا کرتے تھے - ایک دفعہ جیل سے پٹنہ جانے کی ایسی ہی اطلاع پاکر میں اسٹیشن پہونچا تو حسب معمول فرسٹ کلاس کے کسی ڈبہ میں ہونے کے بجائے صرف کرتے پائجامے میں آپ ڈیوڑھے درجے سے اترتے نظر آئے - انگریزی لباس آپ نے عرصے سے ترک ہی کر دیا تھا - ٹھیٹ ہندوستانی قدیم وضع کا لباس بند دار انگرکھا اور پنڈت جی والی ٹوپی ہی پر گاؤن اور سفید ٹائی مستزاد کرکے آپ جلاسوں پر بھی کام کیا کرتے تھے - مگر پر سگریٹ بہت پیتے تھے - ایک دفعہ سگریٹ دیا سلائی سے سلگا لیتے جب یہ ختم ہونے پر آتا تو اسی سے دوسرا سگریٹ اور اسی طرح بجھے بعد دیگرے روشن کرتے جاتے - مگر اجلاس پر گھنٹوں سگریٹ پینے کی نوبت نہ آتی تو بھی سخت عادی ہونے کے باوجود آپ پر انقباض کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا تھا - آپ بڑے مخیر تھے مگر اس میں نمائش یکدم روا نہیں رکھتے تھے - بہار نیشنل کالج اور اخبار سرچ لائٹ پر جب وقت پڑا تو حسن امام صاحب ہی آڑے آئے - مختصر یہ ہے کہ ؎ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں -

(۸) **ختم کلام**

از بہار رفتہ در کس رنگ و بو دارم ہنوز   در غنت خاطر فریب جان ناشاد خودم

اس بات کو ٹھنڈے دل سے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جب حسن امام صاحب نے آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھا - سب سے پہلے تو یہ کہہ دینا ہے کہ انکے گھر میں اگر عسرت و تنگ حالی نہ تھی تو من بھی نہیں برس رہا تھا - وہ خود بہت مزے لیکر اس واقعہ کو بیان کیا کرتے تھے کہ ایک دفعہ اسکول سے کسی عزیز کی تقریب تھی تو دونوں بھائیوں نے گھر چلنے کی ٹھہرائی - دانا پور سے پیدل نوبت روانہ ہوئے - اتفاقاً تیز بارش ہونے لگی - نہر کے پل پر دونوں بھائی کھڑے رہکر پانی کھلنے کا انتظار کرنے لگے - چونکہ ایک ہی چھتری تھی لہذا چلنے بھی رہتا اور ترشح سے محفوظ بھی رہنا ممکن نہیں تھا - یہ واقعہ انھوں نے جس وقت بیان کیا اسوقت قریب ستر ہزار سالانہ ٹیکس ادا کرتے تھے - باوجود فقدان امارت انھوں نے اپنے اعزا و اقارب کو ممتاز و معزز پایا - بلکہ مسلمانوں کا وقار انتزاع سلطنت کے بعد بھی اتنا کچھ باقی رہ گیا تھا کہ سوسائٹی پرانی ہی معاشرت اپنا رنگ جمائے ہوئے تھی - حکام رسی دربار داری میں ان سے پیش پاتا کوئی نظر نہیں آتا تھا - کوئی شک نہیں کہ علم جدید سے بڑی حد تک بے بہرہ تھے - دولت میں برادران وطن کی ان سے بہتر حالت اسوقت کے بڑے بنتے والے بھائیوں سے موروثی مسلمانوں ہی کو بڑا بھائی سمجھا اور کہتے تھے - راج ہندو کا ہوتا تھا مگر کاج کر نیوالے مسلمان ہوتے تھے اور کیوں نہ ہوتا اسوقت کا مسلمان بزبان حال کہہ رہا تھا کہ ؎

تازہ دور افتادہ طرف بساط عشرتم   می تواں افسردے از لائے پا لایم ہنوز

لہذا کوئی تعجب کی بات نہیں اگر حسن امام صاحب نے بھائیوں کے ساتھ ہمدردی کے جذبہ کی اپنے دل میں پرورش اس حد تک کی کہ وہ خود انکو بہالے جانے پر قادر ہو گیا - وہ سچے تھے انکی باتیں سچی تھیں - اسپر یہ آندھی تھی طبیعت جدھر آئی ادھر آئی - میں نے انکو ہندوؤں کے متعلق باتیں کرتے جب سنا تو یہی محسوس کیا انکے خیال میں ہندو قوم کی قوم بدآئین کے لئے یا پیرس کے معصومین پر شامل تھی - لہذا انکے دل مقام منزل نے ضرورت محسوس کی اسی طبقہ کو زیادہ ابھارا جائے اور مستقبل کیلئے تیار کیا جائے انھوں نے ایمانداری کے ساتھ یہی سمجھا اور اسی پر عمل پیرا ہوئے - خوش قسمت تھے وہ کہ اسی خوش خیالی کو لئے دئے چہار شنبہ ۱۹ اپریل ۱۹۳۳ء کو علی الصباح اس دار فانی سے فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر کے جوار رحمت میں چل دئے - انا للہ و انا الیہ راجعون - جپلا حسین آباد ضلع پلاموں میں اپنی وصیت کے مطابق آسودہ ہیں - آج ۱۹ اپریل سنہ ۱۹۴۰ء کو یہ مضمون ختم کر رہا ہوں اور زبان حال سے سن رہا ہوں کہ انکی زندگی کہہ رہی ہے کہ ؎

من آں نیم کہ بہ گم جہاں بہ کس نخورد   نغان زاہد و فریاد برہمن یاد آر

انکے ماتم میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو مات دیا مگر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ۱۹۳۷ء میں زمام حکومت کا نشہ ایسا چڑھا کہ بھائیوں کو "میت کی پریت" بھی یاد نہیں رہی - ہندو بھائی کا یہ کہنا بجا سہی کہ حسن امام کا سا مسلمان کہاں - مگر میرا صرف ایک سوال ہے کہ حسن امام اپنے منہ نہیں بلکہ آپکے مانے ہوئے بڑے بھائی ہو کر جو کچھ انکو چاہئے تھا اس سے زیادہ کر کے گئے - یہاں تک کہ اپنوں سے برے بنے مگر آپکی بھلائی سے باز نہیں رہے - کیا آپ چھوٹے بھائی بننے کے مدعی ہو کر اسکا عشر عشیر کرنے پر تیار ہوئے ؎

یاد وہ کہ میں کوئی غیر نہ تھا یا یہ کہ بنا ہوں بیگانہ   اس کا بھی ایک زمانہ تھا اس کا بھی ایک زمانہ ہے

حسن امام صاحب نے کانگریس نوازی میں غلطی کی یا علی امام صاحب نے مسلم لیگ قائم کرنے میں اسکا جواب مستقبل دے گا مگر آج تو بتلا رہا ہے کہ بڑے کی بڑی بات - مگر ہم کو تو اپنے میت کی پریت سے کام ہے - رہے نام اللہ کا -

افکار و خیالات :۔

زندگی کدھر؟

از جناب کامریڈ علی اشرف محبوس سنٹرل جیل ہزاری باغ

زندگی کے دھارے میں بے سدھ بہتا جا رہا ہوں کبھی کبھی ہوش آتا ہے تو اٹھ کر آس پاس دیکھنے لگتا ہوں۔ ماحول کو دیکھتا ہوں اور اس کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ سمجھنا چاہتا ہوں جیون کا یہ بہاؤ مجھے کہاں سے کہاں لئے جا رہا ہے۔ کس ساگر میں لا کر ڈالنے والا ہے۔ سوچتا ہوں میں کیا تھا۔ کیا ہو رہا ہوں کیا ہو جاؤں گا؟

حافظہ کی تختی پر ماضی کے دیونے چند لکیریں کھینچی ہیں ___ بھدی اور بدصورت! آنکھیں جن کو دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتیں۔ میرے بیتے ہوئے دنوں نے ایک محل بنایا مگر محل کی دیواریں کالی ہیں اور اس میں بھوت بستے ہیں! میرے ماضی میں پھول نہیں سراسر کانٹے ہیں جہاں جا کر میں الجھتا ہوں۔ اور گرتا ہوں۔ وہ ایک جہنم زار ہے جس کی تپش میں تخیل کے پر جلنے لگتے ہیں۔ اس میں افلاس کی درندگی اور اخلاق کی بہیمیت ہے ___ گندگی اور گندگی کی عفونت!

زندگی کے گلشن میں آنکھ کھلی تو افلاس کے کانٹے دامن سے الجھے پائے۔ کانٹوں سے چبھن اور احساس ملا۔ احساس نے درد اور سنجیدگی دی۔ میں اداس رہنے لگا۔ اور جب جوانی آئی تو میں بڑھاپے کی سرحد سے قریب تھا۔ چہرہ غم و مایوسی کی تصویر اور دھنسی دھنسی بھیانک آنکھیں بے بسی اور بے پناہی کی آئینہ دار ہو رہی تھیں۔ تنہائی میری عادت اور تنہائی کی عادت اداسی! اس حال میں کہ

دل مجھکو مناتا تھا میں دل کو مناتا تھا
آپس کی شکایت میں کٹ جاتی تھی تنہائی

میرا ہنسنا بناوٹ اور میری مسرت ظاہرداری ___ پھر ایک دن تعجب میں ہنسنا بھول چکا تھا۔ اور میرا فلسفہ ___ شکست خوردگی یا آگے بڑھا تو شوپنہار۔

زندگی کی التجائیں بھلائی جا سکتی ہیں اور افلاس زدہ بچپن کی زندگی ہی کیا؟ مگر جب جوانی نے زندگی کی مہار تھامی تو مجھے آگے بڑھنا ہی پڑا۔

جی چاہتا تھا کسی سے انتہائی شدت کے ساتھ محبت یا نفرت کروں۔ سماج اور یزداں کی سازش سے جو بندشیں ڈالی گئی ہیں انہیں توڑ ڈالوں کہ انسانوں کے ٹوٹے ہوئے رشتے پھر سے جوڑے جا سکیں۔ زندگی نفرت کا آتش فشاں ہو جائے جس کی گرم آہ فلک تک پہونچے اور اہرمن اور یزداں دونوں کو جلا کر خاک کر دے پھر نفرت کے اس ٹیلے سے محبت کا ایک سوتا پھوٹے جس سے انسانیت کی کھیتی کی آبیاری کی جا سکے۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

میں آگے بڑھا۔ اب میں نے اوروں کی زندگی دیکھی جو اپنی عریانیت اور غلاظت کے ساتھ سامنے کھڑی تھی۔ گھر کی چار دیواری کے باہر جو شفاف سمندر لہریں مارا کرتا تھا وہ سراب نکلا۔ وہاں ایک دلدل کے سوا کچھ نہ تھا۔ بے شمار انسانوں کا خون جم کر کیچڑ بنا تھا اور ان کے سڑتے ہوئے مردہ بدن جس میں کیڑے لگ چکے تھے!

میں نے دیکھا انکی زندگی اور اسکی کرب اور بے چینی، مرگھٹ کی پرسکون بھیانک سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ میں سوچنے لگا یہ سب کیوں؟ پھول بن کھلے مرجھائے کیوں اور دامن میں کانٹے کیوں الجھیں؟ انسانیت افلاس کے عذاب سے تڑپتی ہے ___ مگر کیوں؟

شوپنہار نے جواب دیا ___ باغبان کی مرضی۔ اور اس کے نام پر دو چار صلواتیں۔ سنا گیا۔ اقبال نے آگے بڑھ کر کہا۔

درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

مگر جوانی کی زندہ اور بے چین عقل کی ان باتوں سے تسلی نہ ہو سکی۔ دونوں کے جواب میں شکست خوردگی کی مایوسی اور بے بسی کی جھلک تھی۔ میں اور آگے بڑھا۔ اقبال۔ شوپنہار، اور ٹالسٹائی کے کاندھوں پر ہوتا ہوا مارکس کے قدموں تک پہونچا۔

یہاں آ کر یہ معلوم ہوا گویا میں منزل پر پہونچ گیا۔ مگر منزل کہاں؟ اس گھڑی تک میں ذہنی فضا میں تخیل ہی کے سہارے

بھٹکتا اپھر رہا تھا۔ مارکس نے مجھے حقیقت کی روشنی دی اور زمین پر سیدھی طرح لا کھڑا کیا۔ اور اب چلتا ہوں۔
جہاں منزل سمجھا تھا وہاں سے منزل کی طرف سفر کا آغاز ہوا۔ اور تب تک ہے — نشانِ راہ کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔
اور زندگی؟ تو اسکی ہیئت بدل چکی ہے۔ بند پانی کی نالی جس میں گندگی کی باس آ چکی تھی اب دریا اور دریا سے ساگر میں مل چکی ہے۔ تاریک حجرہ کی گوشہ نشین زندگی اب ہجوم میں آ ملی ہے اور جلوس کے ساتھ چل رہی ہے۔ یہی اجتماعیت ہے۔ مگر اس میں انفرادیت کی نفی لازم نہیں۔ بلکہ انفرادیت کی نشو و نما کے حقیقی موقعے تو یہیں ملیں گے ندی میں لہریں کبھی کبھی اٹکھیلیاں ضرور کرتی ہیں مگر موجیں تو سمندر میں ہی اُٹھ سکتی ہیں۔ اور یوں اپنی دو انگل کی ناؤ تو ہر شخص بنا سکتا ہے۔ مگر اس میں بڑے جہاز کی روانی اور شکوہ کہاں؟ اس صورت میں کوئی ہنستا ہے کوئی مرتا ہے۔ مگر یہاں تو بقول مخفی ایک سماں ہے مرنا بھی جشن ہے"

حقیقت کی روشنی نے تخیل کی حد نظر کو وسعت دیا ہے۔ مستقبل کے مسئلے اپنی ذات تک محدود نہیں رہے۔ انکی حیثیت عالمگیر ہے۔ انکا حل بھی عالمگیر ہوگا۔ آگے چلنے کا راستہ پتلی گلی نہیں ہو سکتا۔ اس سے افراد کو نہیں ہجوم کو گذرنا ہے۔ اسے شاہراہ ہونا ہے۔ ہمارے مسایل جنہیں ہم انفرادیت کی تنگ عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں حقیقت میں عالمگیر ہیں اور زندگی کے خاص حالات کی پیداوار ہیں۔ انکا درماں ان حالات کو بدلنے سے ہی ہو سکتا ہے اور اسکے لئے — عمل کی ضرورت ہے —
— اور عمل ہی میرا مستقبل ہے

کیا لکھوں؟

از جناب سید نصیر حیدر صاحب نصیرؔ بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی ڈپٹی کلکٹر گیا

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کچھ لکھوں تو کس زبان میں؟ عربی فارسی انگریزی اپنی زبان نہیں علم حاصل کرنے کے بعد دوسری زبان میں بے تکلفی برتنی ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ رہی اردو۔ وہ بھی دہلی اور لکھنؤ کے جھگڑوں میں بہار والوں کی نہیں ہے۔ ہاں ہم لوگ بزعم خود سہی یہ دعویٰ ضرور کرتے ہیں کہ اردو اپنی بھی ہے۔ ہاں تو اردو میں لکھوں اب رہا یہ امر کہ یہ تحریر نظم میں ہو یا نثر میں۔ نثر میں لوچ نہیں۔ اچھا تو موضوع کیا ہو۔ حمد لکھوں مجھ سے بڑے بڑوں نے اس میدان میں عجز کا اقرار کرکے قلم رکھ دیا ہے۔ میں کس شمار میں ہوں۔ بھاری پتھر ہے۔ میں بھی چوم کر چھوڑتا ہوں۔ نعت اور منقبت لکھنے بس کی نہیں۔ اگر عالم کے تمام اشجار قلم بن جائیں تمام دریا اور سمندر روشنائی کا کام دیں اور تمام انس و جن کتابت کریں تب بھی کلمات اللہ کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ اب بھلا بتاؤ تو سہی میں کیوں کر اس بات کی جرأت کر سکتا ہوں۔ نفوس عالیہ سے اُتر کر کسی کی مدح میں قصیدہ لکھوں مگر اپنا تو کوئی ممدوح مطمح نظر نہیں طلاقت لسانی جب تک واقعات سے جوڑ نہ کھائے نتیجہ اچھا نہیں نکل سکتا یہ کام بھی میرے بس کا نہیں پھر رام سلا پہاڑی جیسے بڑے بڑے الفاظ قطب مینار جیسے بلند استعارے بحر الظلمات کی گہرائی جیسی عمیق تشبیہیں کہاں سے لاؤں جھوٹ کا طومار بہم سے گریز کے لئے اپنے کو کیوں کر اور کہاں تک تیار کروں۔

بس غزل لکھوں یہ کام کچھ آسان معلوم ہوتا ہے ہلکے پھلکے الفاظ سیدھی سادی ترکیبوں کی ضرورت ہے معشوق کو ظالم جفا کار بے وفا ستمگر لکھنا پرانا چلن ہے۔ خود کو ہجر زدہ مجبور فراق دیدہ بد نصیب حرماں کشیدہ وحشی بد قسمت باندھنا آسان ہے۔ واعظ اور ناصح کو برا کہنا اصول تغزل ہے خضر موسیٰ عیسیٰ اور داؤد پر زباں درازیاں سلف سے ہوتی آئی ہیں۔ میں اگر ان سے پرہیز کروں تو اردو کا شاعر خصوصاً غزل گو ہو ہی نہیں سکتا۔ فرضی عاشق بننا۔ رقیبوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مد مقابل بنانا۔ شراب سے شوق ہو نہ ہو ارتباط رکھنا لوازم غزل گوئی ہیں۔ اور میں یہ سب مرحلے جھیلنے کو تیار ہوں مگر دقت یہ آن پڑی ہے کہ استاد کہاں سے لاؤں اور بغیر استاد کی مدد کے غزل گوئی آسان نہیں کیوں کہ دو دماغ ایک سے ضرور بہتر ہوتے ہیں۔ پھر رواج بھی یہی ہے کہ شاعر کو استاد کی ضرورت ہے الشعراء تلامیذ الرحمٰن کا تعلق ہندوستان کی خاک سے نہیں اور ہو بھی تو کیوں کر یہ تو عربی زبان کا مقولہ ہے اور ریگستان عرب ہی کے لئے موزوں بھی ہے۔ یہاں کی فضا میں کثرت آبادی کی وجہ سے شاگرد سے زیادہ استادوں کی بہتات ہے۔ اسلئے یہاں خدا کے بندوں میں سے کسی نہ کسی کو استاد ضرور ماننا پڑیگا

ورنہ شاعر بننا ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہے۔ مگر قیامت تو یہ ہے کہ کچھ دنوں سے اپنے استاد ہاتھ نہیں لگتے۔ گروہ کا گروہ کچھ ایسا بدظن ہو گیا ہے کہ خدا کی پناہ۔ نکاح کی شرطیں ان کی شرطوں کے سامنے مات ہیں۔ اور یہ سب آفتیں جناب شوق سندیلوی کی لائی ہوئی ہیں۔ جنھوں نے "اصلاح سخن" ایک کتاب چھاپ کر سارے استادوں کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ ادھر تو اپنے شاگردوں سے اپنے ہوئے استادوں کو بدظن کر دیا ہے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ میری ہمت نہیں پڑتی کہ بغیر کسی استاد کو غزل دکھائے ہوئے مشاعرہ میں پڑھوں یا کسی رسالہ میں چھپواؤں۔ غیر اصلاحی غزلوں میں جھول ضرور رہے گا اور روایاتی عاشقی کی غزلیں ناقابل قبول ہیں۔ سوا اس کے اب کوئی چارہ نہیں کہ غزل گوئی کے خیال کو بھی دور کر دوں۔

اب تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں، ندیم کے لئے کوئی مضمون لکھوں۔ لاحول و لاقوۃ تو آخر یہ خامہ فرسائی کا تہیہ تھا کس لئے۔ نظم سے اب کام نہیں نکلتا، بدنظمی کے آثار ہیں۔ آخر نثری میں نظم کے جذبات اور خیالات بھر کر نظم معریٰ کیوں نہ کر دوں، نہ قافیہ کی ضرورت پڑے گی نہ ردیف کی پابندی۔ وزن کسی نہ کسی طرح درست ہو ہی جائے گا لیکن اگر یہ منثور اشعار تقطیع سے گر گئے تو گرفت ہو جائے گی۔ لو اس کی درستی میں بھی استاد کی ضرورت آ پڑی۔ نہیں میں اب نری نثر ہی لکھوں گا مگر نثر میں سوا افسانوں کے اور کیا لکھوں۔ بہتیرے سنے سنائے قصے ذہن نشین ہیں۔ انہیں کو الٹ پھیر کر کے اچھا خاصا افسانہ تیار کر لے سکتا ہوں۔ لیکن افسانوں میں جب تک عریانیت نہ ہو قبول عام نہیں۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ "ندیم" کے مدیر صاحب بڑی پخ نکالتے ہیں کہتے ہیں کہ ندیم میں اخلاق سوز افسانے ہرگز درج نہ ہوں گے۔ اب ان سے پوچھے کون کہ حضرت! افسانوں کو اخلاق سوز ہی ہونا چاہئے کیونکہ اگر اخلاق کو بلند کرنے والی باتیں لکھی جائیں تو وہ کوئی فلسفیانہ مضمون یا علمی تبصرہ ہوگا۔ افسانہ کاہے کو ہوگا۔ نہیں میں افسانے ہرگز ان پابندیوں کے ساتھ نہیں لکھ سکتا۔ اگر لکھا بھی تو دوسری مصیبت یہ ہے کہ "ندیم" میں ہر وہ نظم و نثر شائع ہو سکے گی جو کہ معیار پر پوری اترے لیکن اس افسانہ والی نثر کو معیار پر پوری اترنے والی اب معیار کا کوئی معیار یا ماخذ تو ہے نہیں کہ جانوں پوری اترے گی یا نہیں اور معیار ہر شخص کا جداگانہ ہے۔ میرے معیار پر پوری تو اترے لیکن اگر ریاست صاحب کے معیار پر پوری نہ اترے تو میں کیا کروں۔ میں باز آیا اپنے معیار کا سربستہ راز کھولنے سے، چلو افسانوں سے بھی چھٹی ہوئی۔

سر میں کچھ نہ کچھ لکھنے کی کچھ ایسی دھن سوار ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں اور کیا لکھوں۔ ہاں خوب یاد آیا کوئی خط لکھوں، کس کو لکھوں۔ سوا معشوق کے اور کسی کو لکھنے سے حاصل، مگر نامہ بر کہاں سے لاؤں۔ ڈاک کی مدد تو مجھے عار ہے۔ بس کبوتر پالوں اور اس کو صغیر بلگرامی کا وہ مشہور قطعہ جو کہ کوے قاتل کا پتہ بتاتا ہے حفظ کرا دوں۔ خیر یہ سب سامان بہم پہنچ جائیگا۔ مگر پہلے لکھوں القاب میں کیا لکھوں "باعث فرحت و انبساط من" نہیں یہ تو نہ نظم ہے اور نہ اچھی نثر۔ اور پھر معشوق کو نہیں بلکہ بیوی کو بیوی اور معشوق میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے۔ بیویاں تو چار چار مل سکتی ہیں مگر معشوق ایک سے زیادہ ہوا اور عشق میں خلل آ گیا۔ اس ایک معشوق کے ہزاروں عاشق بھی ہوں تو بھی کچھ پروا نہیں۔ مگر معشوق تنہا ایک ہی بھلا معلوم ہوتا ہے ورنہ ——— وصل میں یکتائی اور ہجر میں وحدانیت کا تعلق قائم نہیں رہ سکتا۔ پھر معشوق اگر باعث فرحت و انبساط ہی ہو گیا تو وہ معشوق کیا ہوا، اسکو عاشق کی ذلت کا سبب اور رسوائی کا موجب ہونا چاہئے۔ ورنہ چاک گریبانی، صحرا نوردی، دربان کی خوشامد، رقیب کے ندامت کا لطف ہی کیا رہے گا۔ یہ القاب ٹھیک نہیں، کچھ اور سوچوں۔ خیر القاب کو چھوڑئے، خط کا مضمون کیا ہوگا یہ مشکل سوال ہے۔ اگر فراق کا ذکر کروں تو اولاً طبع نازک کو گراں گزریگا۔ دوسرے یقین کب آئیگا۔ اس لئے ہجر کا ذکر فضول ہے۔ وصل کی تمنا لکھوں، معاذ اللہ ایسی جرأت کیونکر کروں تو آخر لکھوں کیا؟ از دیاد حسن کی دعا لکھوں، گویا انکو یہ بتاؤں کہ آپ کا حسن ابھی ناقص ہے۔ اس میں ترقی کی ضرورت ہے۔ واللہ یہ گستاخی ناقابل معافی ہوگی۔ تو پھر کیا لکھوں۔ بس بہتر اسی میں ہے کہ کچھ نہ لکھوں ———— !

بیانِ اعجاز

از جناب سعید احمد صاحب اعجاز

معلوم نہیں راز وجود ہستی
کچھ بھی نہیں، نہیں کیا ہے نمود ہستی
سمجھا نہ ہوا ہستی ہی فقط ہستی ہے
کس کو خبر بود و نبود ہستی؟

اصلاح و ترقی:- صوبہ بہار میں محکمہ ترقی دیہات یا دیہات سدھار

از جناب محمد مجتبیٰ صاحب ایم - اے - بی - ایل - ڈپٹی ارگنائزر محکمۂ دیہات سدھار صوبہ بہار

آپ نے "انقلاب زندہ باد" کے نعروں کی گونج میں یہاں بہت سے نئے نعرے سنے ہوں گے، وہاں "دیہات سدھار" کا نام بھی ضرور سنا ہوگا۔ مہذب اور تعلیم یافتہ مسلمان اس نئے لغت کو غیر فصیح کہتے ہیں۔ ایک نہایت ہی ممتاز "ایڈیٹر" یا صحافت نگار، نے مجھ سے کہا کہ "ترقی دیہات" کی اصطلاح استعمال کیا کروں۔ اسی "فہمایش" یا فرمایش کی بنا پر میں اس مضمون کی سُرخی "ترقی دیہات" لکھنا چاہتا تھا مگر حق تو اس کا مستحق ہے کہ میں "دیہات سدھار" ہی لکھوں کہ ہمارے محکمہ کی زبان پر یہی لفظ رات دن جاری ہے، اور اسی کو جاہل، عالم، ہندو، اور مسلمان ہر شخص آسانی سے سمجھ جاتا ہے۔ بہرکیف آپ نے "دیہات سدھار" کی اصطلاح ضرور سُنی ہے۔ اور شاید اتنا سمجھتے بھی ہوں گے کہ اس سے مراد "ترقی دیہات" کا محکمہ ہے، یعنی حکومت بہار کا وہ محکمہ جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ دیہاتی باشندوں کی زندگی میں اصلاح و ترقی کی کوشش کی جائے اور ان کی زندگی کو شاد و مسرور اور فارغ البال بنانے کا ہر ممکن ذریعہ ڈھونڈا جائے۔

اس ملک کے تمام صوبوں کی حکومتوں نے یہ محکمہ جاری کیا ہے، اور اغراض و مقاصد سب کے یکساں ہیں۔ یہی ایک تعجب کی بات نہیں ہے کہ دیہاتی آبادی تو حضرت آدمؑ کے بعد ہی سے پھیلنے لگی اور تاریخ عالم میں جب منظم حکومتیں قایم ہوئیں، اس کے صدیوں پہلے دیہاتی انسان بستے تھے۔ پھر یہ نیا محکمہ حکومتوں کی فہرست محکمہ جات میں معدوم کیوں تھا؟ اور اب کونسی ضرورت لاحق ہوئی کہ یک بہ یک تمام حکومتوں نے ایک نیا بوجھ اپنے سر پر ڈالنا ضروری سمجھا؟ آپ کی حیرت شاید اور زیادہ ہو جاوے گی، اگر میں آپ کو ایک بات اور بتلاؤں اور وہ یہ ہے کہ ماہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں جنیوا کی انجمن الاقوام، (لیگ آف نیشنز) کا ایک جلسۂ خاص اس مسئلے کو سوچنے کو منعقد ہوا تھا کہ دیہاتی آبادی کی ترقی و اصلاح کے لئے کون سے بہترین ذرایع اختیار کئے جائیں اور زندگی کے وہ کون سے پہلو ہیں جن کو دیہات میں ترقی دینا ضروری ہے۔ اسی جلسے میں تمام متمدن اقوام سے جو انجمن کے ممبر ہیں یہ استدعا کی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے ملک کی دیہاتی آبادی کے حالات زندگی اور ذرایع و وسایل ترقی و اصلاح پر ادبی ذخیرہ تیار کرائیں۔ چنانچہ ابھی چند ماہ ہوئے کہ باوجود اس عبرت خیز ہنگامۂ خونیں کے جو یورپ کی سیاسی فضا کو غلیظ و مکدر کئے ہوئے ہے، ڈنمارک - ہالینڈ - فن لینڈ - انگلینڈ فرانس - امریکہ، زیکوسلاویکا - اسٹریا - اٹلی - یونان اور روس نے قابل قدر ادبی ذخیرے تصنیف و تالیف کر کے انجمن کے پاس بھیجے ہیں اور اگر آپ چاہیں تو اپنے کتب خانے میں بیٹھ کر متمدن دنیا کی دیہاتی آبادی کی سیر کر سکتے ہیں۔ غرض اس لطیف اشارے سے صرف یہ ہے کہ وہ قومیں جو اپنی ہست و بود کی فکر اور بقائے دوام کی کوشش میں لگی رہتی ہیں، تعمیری کاموں کو ہمیشہ آگے بڑھاتی رہتی ہیں اور اگر ایک طرف ان کے سورما سپاہی میدان جنگ میں غارتگری کا خوفناک منظر شب و روز پیدا کرتے ہوتے ہیں تو دوسری طرف ان کے مفکرین ارتقائے نسل و بقائے اصلح کے خاموش سرچشموں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تشنہ کام کی سیرابی کا سامان کرتے ہوتے ہیں۔

ہمارے صوبہ میں حکومت کی طرف سے یہ دفتر کھل چکا ہے۔ کیوں کھلا، اور پوشیدہ اغراض کیا ہیں؟ اس سے بحث نہیں محکمہ کرنا کیا چاہتا ہے، اس کی تفصیل بتلانا مقصود ہے۔ طریقۂ کار کیا ہے، اس کی واقفیت آپ کے لئے ضرور مفید ہے۔ افسوس کہ اس وقت تک اس محکمہ سے عام مسلمان علیحدہ رہے ہیں۔ اور اس تعلق سے اردو زبان کو بھی اس محکمہ میں بہت کم حصہ ملا ہے۔ اس کی تلافی کی طرف آپ کو مائل کرنا ہے۔ ورنہ آپ بحسرت یہ شعر پڑھیں گے۔

یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا — ہم وقف نالۂ جرس کارواں رہے

اس محکمہ کے قیام کی غرض یہ ہے کہ دیہاتی آبادیوں میں تعلیم، حفظان صحت، زراعتی ترقیاں، ان پڑھوں کی تعلیم، سلسلۂ رسل و رسائل، شفاخانے، اور کتب خانے وغیرہ کے اجرا، اور نظم و نسق کے سامان بہم پہنچائے۔ کام بہت اہم ہے۔ ایک زمانے سے یہ کام غفلت کا

تنکار ہے۔ خود حکومت کے پاس وسائل اتنے نہیں ہیں کہ فوری ترقی کی امید کیجا سکے۔ سر دست ہر ہر ضلع میں دفتر کھولے گئے ہیں۔ ان کی فہرستیں اخباروں میں شایع ہوگئی ہیں۔ اور آپ جب چاہیں اپنے ضلع کے دفتر کے انچارج سے مل سکتے ہیں۔ اور اپنے قصبہ اور گاؤں کی اصلاح و درستی میں اس سے مدد لے سکتے ہیں۔

چند جملے ہمیں ادیبوں کی خدمت میں بھی پیش کرنے ہیں۔ ہم نے ادب و شاعری کا لطف بہت اٹھایا۔ ارٹ اور فنون جمیلہ کو بہت سراہا۔ روم و عجم کی داستانیں خوب پڑھیں اور پڑھائیں۔ اب ہمیں اپنے قلم کی گردش کو دیہی زندگی کے خط و خال اتارنے کی طرف بھی مائل کرنا ہے۔ دیہاتی زندگی کی معمولی باتیں، دیہاتیوں کے عادات و اطوار کی درستی، ان کی تعلیم اور روزگار کا مسئلہ اور اس طرح کی ہزاروں باتیں ہمارے اہل قلم کے لئے قابل توجہ ہیں۔ برادران وطن اپنی زبان و ادب کو مالا مال کر رہے ہیں۔ مگر ہم "دیہات سدھار" کتب خانے سے اردو حصے کے لئے رسائل و ادب کی تلاش میں بہار سے یو پی، دہلی اور پنجاب کی خاک چھانکر بھی ایک سو رسالے اور کتابوں کی فہرست بمشکل تیار کر سکتے ہیں۔

علمی خدمت کی ترکیبیں بلاشبہ بدل گئیں۔ یہ چیزیں جو زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ جاہل دہقان، بے مایہ کسان، مزدور، اس کی کس مپرسی زندگی، دیہات کے جھونپڑے، ان کی غیر مرتب زندگی، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے مشاغل، کھیتی اور کھیتی کی آبادی یا بربادی اور اس کے متعلق تمام مضامین ہمارے پختہ و خام مصنفوں کے لئے کافی دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں۔ وقت کی ضرورت اس طرف آپ تمام حضرات کو پکار رہی ہے ؎ آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند۔

حقیقی اشتراکیت تو یہی ہے کہ ہم اپنے پسندیدہ تمدن کو ہر دہقان کی جھونپڑی تک پہونچا دیں۔ قومیں جھونپڑیوں میں رہتی ہیں شہروں اور محلوں میں نہیں بستیں۔ شہروں کی پر فضا سڑکیں، پر رونق بازار، سینما گھر، بجلی گھر، جادو گھر اور تمام دلچسپیوں کے گھر، ہائیکورٹ اور چھوٹی عدالتیں، سکریٹریٹ کا دفتر اور کچہریاں، اور وہ تمام خوشگوار اور خوش منظر زمین و مکان، جن سے بہترین شہر بنے ہیں، دیہاتی آبادی کے اضطراب سکون کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ محض "آنکھ" کا فرق ہے۔ اگر جذب دل پیدا ہو تو اس سکون اضطراب کی دنیا میں جس کو دیہات کہتے ہیں جو فطری لہر دوڑ رہی ہے۔ وہ شہروں میں نصیب نہیں۔

خدا کی مخلوق تو خدا کی بنائی بستی میں آباد ہے۔ دیہات کی اصلاح و ترقی قوم کی حقیقی اصلاح و ترقی ہے، کیا آپ کبھی فرصت کے لمحے میں اس حقیقت پر غور کریں گے؟ اگر آپ اس سلسلہ میں خدمت کا کوئی بھی جذبہ رکھتے ہوں تو ہمارا محکمہ دیہات سدھار آپ ہر ہر قسم کی علمی معاونت کیلئے آمادہ ہے۔ ہمارے محکمہ کے نمائندے آپ کے ہر ضلع میں موجود ہیں۔ ان سے آپ اپنے دیہات کی ترقی کی خدمتیں لیں، وہ آپ کی خدمتیں بجا لائیں گے۔ وما علینا الا البلاغ۔

جرعات

از جناب اختر قادری ام۔ اے

جب کالی گھٹا چرخ پہ چھا جاتی ہے
پینے کو طبیعت میری للچاتی ہے
کرتی ہے بہت فساد "توبہ" لیکن
رحمت کی امید کام آجاتی ہے

ایام شباب اور یہ چڑھتی برسات
مے دیکھ کے پھڑک نہ سکے میرے ہات
مجبوری میں پینا ہی پڑا آخر کار
مالک ہے تو میں تجھ سے چھپاؤں کیا بات

آثارِ علمیہ ادبیہ :-

چند مشاہیر کے خطوط ڈاکٹر سید محمود کے نام

بہار نمبر میں آثار علمیہ و ادبیہ کے تحت مشاہیر کے ایسے خطوط رکھے گئے تھے، جنکی بیساختہ تحریروں میں علم ادب اور راز ہائے سربستہ کے گرانمایہ جواہر پنہاں تھے راقم سطور کے علم میں اس قسم کا قیمتی ذخیرہ - مخدوم محترم ڈاکٹر سید محمود کے پرانے کاغذوں میں بےترتیبی سے موجود تھا - حالانکہ ان میں سے بیشتر مشاہیر (علامہ شبلی، اکبر الہ آبادی، محسن الملک) وغیرہ کے خطوط ملکے مجموعے غیر معمولی اہتمام سے شائع ہو چکے تھے - اگر جناب موصوف انہیں شائع کرانا چاہتے تو وہ ان کتابوں کے اجزاء بن چکے ہوتے لیکن قدرت نے انکو ندیم کیلئے وقف کر رکھا تھا - حسن اتفاق کہ موصوف سے پٹنہ میں اس کا ذکر آیا ـــــ اور موصوف نے اس ذخیرہ کو ندیم کے حوالہ کر دینے کا وعدہ فرمایا۔
چنانچہ چھپرہ پہنچ کر موصوف کا حسب ذیل گرامی نامہ موصول ہوا :-

چھپرہ — ۲۸ ربیع [illegible] ۶

برادرم — تسلیم —

میں آج پٹنہ جا رہا ہوں — بہار نے فرمایا کر آپ مجھے وہاں ۳۰ مارچ کو ملئے — اسقدر زیادہ کاغذات ہیں کہ میں انکو ایک بکس میں لا رہا ہوں — فقط

میں جانے سے پہلے وہیں ٹیلیفون کر دونگا

خاکسار سید محمود

راقم سطور اس تحریر کے بموجب پٹنہ گیا - اور دو دن گھنٹوں بیٹھ کر جناب موصوف کی معاونت سے اس انبار کو ترتیب دیا جا سکا - ہم موصوف کی اس غیر معمولی عنایات کے تہ دل سے شکر گذار ہیں ـــــ اس قیمتی ذخیرہ میں جو انمول جواہر ہیں ہمیں ان کے متعلق کچھ زیادہ کہنا نہیں - کہ وہ خود آپ اپنی اہمیت اور اپنے افادی پہلوؤں کو آشکارا کریں گے -
ان خطوط میں بیشتر حصہ انگریزی مکتوبات کا ہے جن میں سے مسٹر ڈبلو - اس بلنٹ' مسٹر آرچ - بویلے' مسٹر ہیوبرچ' مسٹر کینٹس' مسٹر اول الین پول' سر ولیم ویڈربرن' پروفیسر براؤن' سر اسٹینلی ریڈ' سر تھیوڈور ماریسن' ایڈون بیوان' سر ٹی ڈبلو آرنلڈ' مارما ڈیوک پکتھال' مسٹر ہورن' راسمشن' مسٹر چیوود (مشہور ریاضی دان) وغیرہ یوروپین افاضل اہل علم ارباب سیاست میں سے ہر ایک کے متعدد خطوط ہیں - پھر ہندوستانی ارباب سیاست میں رائٹ آنریبل سید امیر علی' سر علی امام' حسن امام - ڈاکٹر انصاری - پنڈت موتی لال نہرو' مولانا محمد علی' مولانا شوکت علی - گاندھی جی - پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ کے مکتوبات ہیں - پھر اردو مکتوبات علامہ شبلی نعمانی - نواب محسن الملک' نواب وقار الملک' اکبر الہ آبادی' مولانا ابو الکلام آزاد' مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ ـــــ مولانا عبد الباری فرنگی محلی - شاد عظیم آبادی - جمیل عظیم آبادی - پروفیسر نواب علی' مولانا عبد الماجد دریا بادی - مولانا عبد الباری ندوی' مولانا ابو المحاسن محمد سجاد - جناب بی اماں محترمہ سعادت بیگم (مسز ڈاکٹر کچلو) وغیرہ کے مکتوبات ہیں - نیز شگفتہ اردو میں ایک مکتوب پنڈت موتی لال نہرو (مرحوم علیہ) کا بھی ہے - ذیل میں اردو کے چند خطوں کا عکس پیش کیا جاتا ہے - ہمیں یہ مناسب نظر آیا کہ یہ خطوط جس شکل میں ہم تک پہنچے اسی شکل میں ہم انکو ناظرین کی خدمت میں پیش کریں تاکہ وہ اکابر کی شان تحریر کی زیارت بھی کریں - ان مکتوبات کے بعد ایک خط مرزا اقبال مرحوم کے ان خطوں میں سے درج کیا جاتا ہے - جو مولوی مسعود عالم ندوی کے نام ہیں - اور آخر میں حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کے ایک مکتوب کی نقل پیش ہے جسکو انھوں نے فرانس سے مولانا عبد الماجد کے نام لکھا تھا - افسوس ہے کہ قلت گنجایش کی وجہ سے اس نمبر میں انہی چند خطوں پر اکتفا کیا جاتا ہے - "آثار علمیہ" کا باب ندیم میں پہلے سے قائم ہے - آیندہ بھی قائم رہیگا -

عکس تحریر حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہٗ

46 Ripon Lane,
CALCUTTA.

............192

جمیل مرالشد　السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔　تار اور پھر خط پہنچا۔ آپکا خط
رمضان سے چند یوم بیشتر آیا تھا اور میں نے بروقت جواب دیدیا تھا منتظر تھا کہ اسکا
جواب آپکی جانب سے موصول ہو تو بعض امور موعودہ کی نسبت لکھوں۔
بہرحال اب آپ کا منتظر ہوں اور احتیاطاً خط کا جواب بھی روانہ کردیا ہے۔ معمول
بہار کیلیے میری جانب سے کبھی کوتاہی نہ ہوگی بشرطیکہ کم سے کم آپ
پوری طرح مستعد رہیں۔ گاندھی جی سے بعض ضروری امور طے کرنے ہیں
اسلیے خیال ہے عین عید کی شام ہی کو [illegible] کیلیے روانہ ہوجاؤں اور پھر واپسی
میں بانکی پور ٹھہروں۔ آپ بہار کیلیے ایک نظم اور طے شدہ پروگرام
طیار کر رکھیں اور میرے لیے ایک ایک دو حرف ان جگہوں میں ٹھہرائیں
جہاں واقعی اور ناگزیر ضرورت ہو کیونکہ علاوہ بھی اور مرکزی خلافت
کی ضروریات اور باہر کے تاجر کے تقاضوں کے خود بنگال کا تمام
کام دلی ہی میں رہا ہے اور شوال میں اسکیلیے کافی وقت کا نکالنا
نہایت ضروری ہے۔ ۱۲ جون سے ۲۵ تک بنگال کیلیے قرار دیچکا تھا
اور بعض مقامات کے مشاغل بھی کرچکا تھا لیکن آپکے خط کی وجہ بہار

کو ترجیح دی اور بنگال کی تاریخیں پیچھے ڈال دیں۔ پس اسکا لحاظ رہے
کہ کم سے کم وقت و کاوش صرف ہو اور صرف ناگزیر اور واقعی
ضروری نقاط سر رشتہ انتخاب کر لیے جائیں۔ پھر جولائی میں
انشاء اللہ بقیہ مقامات کا بھی دورہ ہو جائیگا۔

امید ہے کہ آپکی یادگاریں جنکا میرٹھ میں تذکرہ ہوا تھا
قائم ہو گئی ہونگی بلکہ مزید محکم و استوار۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ
کچھ دنوں معیت رہے اور آپکی خواہش کے مطابق سفر و حضر
میں یکجائی رہی علی الخصوص سفر میں۔ خدا نے چاہا تو موجب
نتائج و ثمرات ہوگا۔

امید ہے کہ مسٹر مظہر الحق (جنکو اب بقاعدہ عام
مولانا مظہر الحق کہنا چاہیے اگرچہ وہ اس سے خوش نہ ہونگے) بدستور
مشغول و منہمک ہونگے۔ اب انسے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے
اللہ تعالیٰ انکے ایثار و اخلاص کو مزید قبولیت و ثمرات عطا فرمائے

فقیر ابوالکلام احمد

نقشِ سلیمانی

یعنی

مکتوب حضرت علامہ سید سلیمان ندوی بنام مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ بی اے

حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی وفدِ خلافت کے رکن ہو کر مولانا محمد علی مرحوم وغیرہ کے ساتھ یورپ تشریف لے گئے تھے، یہ مکتوب حضرت ممدوح نے فرانس سے مولانا عبدالماجد کے نام لکھا تھا۔ مکتوب ادبی لطافتوں کے ساتھ نئی معلومات کا حامل ہے۔ یہ ذاتی مکتوب اب ناظرین بہار نمبر کی خاطر وقفِ عام کیا جاتا ہے۔ ناظرین بہار نمبر کی خوش نصیبی ہے کہ یہ نوادر ان کے حصہ میں آئے۔

السّلام علیٰ مبلّغ السّلام[1]

ادھر چند ہفتوں سے میں جناب کے علمکدہ میں حاضر نہیں ہوا۔ عفو کا خواستگار ہوں، واقعہ یہ ہے کہ میں یکایک سخت بیمار ہو گیا، میرے پیٹ میں ہندوستان میں دو دفعہ درد ہوا تھا جو ریاحی سمجھا گیا، مگر جہاز پر قدم رکھنے کے ساتھ وہ ماہانہ دورہ کی شکل اختیار کرتا گیا، یہاں تک کہ پچھلا دورہ ۱۹ رجون کو اس قدر سخت پڑا کہ میں مایوس سا ہو چلا، اور اس سکرات کے عالم میں تمام مقدس ادعیۂ ماثورہ و کلماتِ طیبہ میں سے "مردِ آزاد" (غالب) کا یہ شعر زبان پر تھا

مارا دیارِ غیر میں مجھکو وطن سے دور[2] رکھ لی میرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

بارے علاج سے تسکین ہوئی، "گال بلیڈر" نام ایک بیماری تجویز ہوئی، اور صرف آپریشن اس کا علاج بتایا گیا، تین چار انگریز ڈاکٹروں کی یہی رائے ہوئی، مگر ہم لوگوں کے ایک کرم فرما ترک ڈاکٹر نہاد رشاد نے جو پیرس کے اخبار "ایکو ڈی اسلام" (نوائے اسلام) کے ایڈیٹر ہیں بامرار کہا کہ آپریشن کے بغیر علاج ہو سکتا ہے، اور اس سلسلہ میں انہوں نے یہ خوب کہا کہ ہندوستان میں انگریز ڈاکٹروں کا اعتبار کتنا ہی ہو، لیکن دنیا میں ان کو کوئی ڈاکٹر تسلیم نہیں کرتا، فرنچ ڈاکٹروں کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں، چنانچہ وہ خود مجھے لیکر امراضِ معدہ وجگر کے ایک فرنچ ماہر کے پاس گئے، اُس نے دیکھا تو کہا کہ آپریشن کی ضرورت نہیں، اور طبی رائے میں ڈاکٹر رشاد کی ہر طرح تائید کی، بہرحال ان لوگوں کے مشورہ سے چند روز کے لئے ویشی (فرانس میں) قیام ہے، یہ معدہ وجگر کی بیماریوں کے لئے تمام دنیا میں ایک ہی صحت گاہ، یہاں ان بیماریوں کے بہترین ڈاکٹر ہیں، یہاں کے قدرتی چشموں کا پانی معدہ وجگر کے لئے اکسیر ہے، ڈاکٹر رشاد کے ایک فرنچ دوست یہاں ڈاکٹر ہیں ما انہیں کے زیرِ علاج ہوں، دوا یہ ہے کہ دن میں پانچ چھ مرتبہ مختلف چشموں کا پانی پینا، صبح اُٹھ کر انہیں چشموں کے گرم حمام میں خاص طریقہ سے غسل کرنا۔

آپ نے اپنے عنایت نامہ میں اپنے مذہب[2] کی جو تفصیل کی ہے مجھے اس سے قطعاً اختلاف نہیں، دنیا میں امن و سلامتی کے دور کا مسلمان تو

---

[1] اس زمانہ میں مکتوب الیہ "امن عام" کے فلسفہ کے منادی تھے اور رچرڈ ہال کی کتاب "پیام امن" کا ترجمہ کر رہے تھے۔

[2] یعنی امن و سلامتی کی عالمگیری اور ہر طرح کی لڑائی سے پرہیز۔

سے بڑھکر خواہاں کون ہوگا، کمزور قوموں کے لئے تو یہ آواز نوید حیات ہے لیکن میرا یہ کہنا ہے کہ اس آب حیات کی ضرورت ستمگر، جفا پیشہ، اپنی قوت وطاقت پر مغرور، امن وسلامتی کو اپنی تلواروں سے وابستہ سمجھنے والی قوموں کو ہے، آپ ہندوستان کی اسپرٹ کو امن وسلامتی کے وعظ سے کیا فائدہ پہونچا سکتے ہیں، ہاں اس سے یہ ہوگا کہ اس میں زندگی کی جو کچھ بھی روح ہے اس کا بھی خاتمہ ہوجائے - ع

جو خود ہی مر رہا ہے اس کو گر مارا تو کیا مارا

میری قسمت میں ہندوستان کے ہیروں سے ملاقات بھی وطن سے دور ہی مقدر تھی، لندن میں ٹیگور کا شرف دیدار نصیب ہوا اور پیرس میں ڈاکٹر بوس سے نیاز حاصل ہوا۔ ۲۰ جولائی کو پیرس کے عجائب خانۂ تاریخ طبعی (میوزیم آف نیچرل ہسٹری) میں ڈاکٹر موصوف کا لکچر تھا، یہ عجائب خانہ ایک وسیع عمارت ہے جس کے اندر نباتات وشجریات کا مجموعۂ عجائبات ہے، میں نے اس کو بالکل سرسری دیکھا کیونکہ یہ میری دلبستگی کی چیز نہ تھی، ڈاکٹر بوس کا لکچر طبعاً نباتات کے قوائے احساس پر تھا، حاضرین میں فرانسیسیوں کے ساتھ ہندوستانی طلبہ کا بھی مجمع تھا، برقی روشنی کا عکس سامنے کی دیوار کے پردہ پر ڈال کر اپنے ایجاد کردہ نازک ولطیف آلات کے ذریعہ سے اس میں نباتات کی نہایت ہی لطیف حرکت کا نقشہ دکھا رہے تھے، اور زبانی مسائل کو سمجھاتے تھے، وہ فرنچ نہیں جانتے، انگریزی میں تقریر کر رہے تھے اور ایک فرنچ پروفیسر اُن کی انگریزی تقریر کا فرنچ میں لفظی ترجمہ سُناتا جاتا تھا، تقریر کے بعد چند پروفیسروں نے ڈاکٹر موصوف کی تعریف کی، اس کے بعد ہندوستانیوں نے ان کو اسٹیج پر جا لیا، اور وہ اس ہالہ کے چاند بنکر ہمارے درمیان کھڑے ہوگئے - ایک دوست نے میرا تعارف کرایا، انہوں نے کہا کہ مسلمان مایوس نہ ہوں، ترقی امید کے سہارے چلتی ہے، پھر کہا کہ میں بھی ایشیا ہی کی خدمت کر رہا ہوں، اور بتاتا ہوں کہ ایشیا کا دماغ خدا کے عطیوں سے محروم نہیں، میں چاہتا ہوں کہ ہندوستانی ادھر بھی توجہ کریں، ڈرتا ہوں کہ میرے بعد یورپ یہ نہ کہے کہ بوس ایک مستثنیٰ ایشیائی تھا، ورنہ ایشیائیوں کا دماغ حقیقت میں اس لائق نہیں،

پیرس میں میں نے عربی کی چند کتابیں دار المصنفین کے لئے خریدی ہیں، اکثر تاریخ وجغرافیوں سے متعلق ہیں، ان میں آپ کے کام کی کوئی چیز نہیں یعنی فلسفہ کی کوئی کتاب نہیں، ہیئت پر ایک دو کتابیں ہیں، اور یہ سب یورپ کی چھپی ہوئی ہیں، جس مقام سے میں آپ کو خط لکھ رہا ہوں یہ اس شہر کا ایک کلب ہے، جس میں مختلف مقامات پر کئی ہزار کرسیاں پڑی ہیں، جس کے ممبر ہی ان پر بیٹھ سکتے ہیں، اب آپ سنئے کہ یہ تمام کرسیاں شروع سے آخر تک ہمیشہ معمور رہتی ہیں، اس کے ایک گوشہ میں تھیٹر ہے، دوسرے گوشہ میں رسٹران ہے، ایک کمرے میں اخبارات ہیں، جن کو لوگ پڑھ رہے ہیں، اس کے مقابل کے دو بازوؤں کے کمروں میں میز کرسی اور بنچ پر خط لکھنے کے لئے لفافہ، کاغذ اور دوات وقلم ہیں، اور یہ دونوں کمرے لکھنے والوں سے بھرے ہیں۔ سامنے لائبریری ہے اور لائبریری کے سامنے ہی قمار خانہ ہے، جہاں تمام دن شرفائے فرانس بیٹھے جوا کھیلتے رہتے ہیں، کھیلنے والوں کے چاروں طرف تماشائی ہیں، باغ کی ایک روش پر "لذتِ شب" کے سوداگروں کا بازار ہے، تماشا خود محوِ خرام ہے، اور تماشائی زیر جیب چکر کاٹ رہے ہیں، ایک اور طرف رقص وسرود کا سامان ہے، یہ مجموعۂ نیرنگی اور ایک ہی دسترخوان پر صف بصف مختلف الوانِ طعام، فرنچ تمدن کی خاص خصوصیت ہے، کیا آپ ہندوستان میں بھی یہی نقشہ چاہتے ہیں؟،

افسوس کہ میں "اہل تجربہ" میں نہیں، ورنہ کچھ "نیچرل میوزیم" کی "ہسٹری" بھی سُناتا، دور سے دیکھتا ہوں اور سہم جاتا ہوں کہ یورپ کے علم کا سایہ جس سرزمین پر پڑا وہ اسی رنگ میں رنگ جاتا ہے، فلسطین اور عراق انگریزی برکات کے ظل ہمایوں میں، اور بلاد شام فرانسیسی ندیم برزل کے زیر سایہ انہیں سعادتوں سے مالامال ہونگے، اب آپ سُنیں گے کہ بیت المقدس میں مقام خلیل میں، خانقاہ بغداد میں، مدفنِ بلال میں، مرقدِ حسن بصری میں، مقتل حسین میں، کس قدر قمار خانے، کس قدر قحبہ خانے، اور کس قدر دار الفواحش قائم ہوئے ہیں، اور تھیٹروں اور سینماؤں کے لئے ان مقامات مقدسہ کے کون کون سے موزوں قطعے منتخب ہوئے ہیں،

ترکوں کے عہد حکومت میں یہ چیزیں قانوناً منع تھیں، کیونکہ وہ جفا کار وحشی تھے، اور اب تو آزادی کا دور دورہ ہے، یورپ ہمکو اخلاقی آزادی بخشتا ہے، کیوں؟ تاکہ ہم سیاسی آزادی کے قابل نہ رہیں، ورنہ وہ کون سی آزادی ہے جو مغربی اقوام کے ماتحت مشرقی قوموں کو نصیب ہو، یہاں الجیریا کے مسلمانوں سے بکثرت ملاقاتیں ہوئیں، وہ اپنی آزادی کی وہ دردناک کہانی سناتے ہیں کہ آپ اپنے امن کا افسانہ اُس کے سامنے بھول جائیں،

اب میرے پانی پینے کا وقت آگیا اسلئے خط تمام کرتا ہوں اور "گرادلی تال" چشمہ کا گرم، شور، پانی پینے جاتا ہوں، سلام رخصت

سید سلیمان، یکم اگست

(۱۹۲۰ء)

ادبیات:-

عام فہم

از علامہ فضل حق آزاد عظیم آبادی

جھوٹ ہے اُس کے نہ آنے کا بہانہ کیونکر
روکے رکھتا ہے اب آنسو کا بہانا کیونکر

جسکو تاکا مرے عیّار نے مارا اُس کو
قدر انداز جو چوکے تو نشانہ کیونکر

دستِ نازک سے اگر پھول بھی وہ مایۂ ناز
پھینک مارے تو اتر جائے نہ شانہ کیونکر

دلِ دانا میں نہ ہو رازِ نہاں کیوں پنہاں
ایک خرمن ہی چھپائے ہوئے دانہ کیونکر

مشتِ گل غنچوں کے زر بادِ خزاں نے لوٹا
ہو جو ممسک نہ لٹے اس کا خزانہ کیونکر

کل یوم ہو فی شان کا مضمون ہے قدیم
جس میں جدت ہو بھری ہو وہ پرانا کیونکر

صبح کی سیر میں ہو ہمدم ہم رنگ کا ساتھ
وقت دلخواہ ہو ایسا نہ سہانا کیونکر

آنکھوں سے دیکھتے ہیں سنتے ہیں سب کانوں سے
مردمک چشم کو پھر کہتے ہیں کانا کیونکر

عام فہم اس سے زیادہ ہو غزل کیا آزاد
فہم والوں کا پلٹ آئے زمانہ کیونکر

عاشق ناکام

آبرو عاشقِ ناکام سے ہے سودا کی
قیس کے بعد وہ رونق نہ رہی صحرا کی

قیسِ ناکام کی وحشت نے بڑھائی شہرت
ورنہ اک کوفت جو تھی خاص وہ تھی لیلےٰ کی

میں نے دیکھے ہیں بہت دشت میں خوش چشم غزال
شوخ چشمی تری دیکھی نہ تری حیا لا کی

تیرا ناکام جو ساحل کی طرف جا نکلا
آئی پابوس کو ہر موجِ رواں دریا کی

ہوسِ زر میں ہوا مائلِ دنیا طلباں
تو نے اے مردِ خدا عقل و درایت کیا کی

شغلِ امروز میں اتنا بھی نہ ہو تو مشغول
دل کو مطلق نہ رہے فکر کوئی فردا کی

گھورنا اب بھی حسینوں کا نہ چھوٹا یہ ہے
دیکھئے آزاد کی مسجد میں کوئی بے باکی

تعزیراتِ عشق

مجرمِ عشقِ بتاں لائقِ تعزیر نہیں
قیدی زلف کو کچھ حاجتِ زنجیر نہیں

حسنِ اخلاق سے بھی ہوتے ہیں دل گردیدہ
جس میں ہو ناوکِ دلدوز وہی تیر نہیں

عالی العزم جوانوں میں جوان سال کہاں
پیر ہے پیر اولوالعزم تو وہ پیر نہیں

کیا کرے عاشقِ بدحال پریشاں خاطر
آپ کو شرم نہیں آہ میں تاثیر نہیں

جبر کفارۂ عصیاں ہے پلا اے ناصح
کھول تو تل کے دہن خیر میں تاخیر نہیں

آج کل صحبتِ آزاد مقطع ہے بہت
بادہ و بنگ نہیں چنگ و مزامیر نہیں

---

[1] شعرائے حال ہائے مختفی کو قافیہ میں الف سے بدلنا ضروری سمجھنے لگے ہیں حالانکہ عروض کو تلفظ سے بحث ہے نہ کتابت سے۔ خاقانی۔ کردلوا نصیب راالوان نو [illegible] لو آدم من دو نہ [illegible] اسلئے کہ وہ قدر ناساز ...... ہی نہ ہو کا جو نشانہ چوکے [illegible] کو غش گرد فی بمعنی بلند کو غش ہونا چاہیے تھا یا معنی اُور۔

جذبات مبارک

از تاجدار سخن یادگار داغ حضرت مبارک عظیم آبادی

عشق کی چوسر کس نے کھیلی یہ تو کھیل ہمارے ہیں / دل کی بازی مات ہوئی تو جان کی بازی ہارے ہیں

کیسے کیسے لختِ جگر ہیں کیا کیا دل کے پیارے ہیں / ایسے لعل کہاں دنیا میں جیسے لعل ہمارے ہیں

اِسکو مارا اُسکو مارا یہ بسمل وہ لوٹ گیا / نوک پلک والوں سے ڈریئے قاتل انکے اشارے ہیں

صدقے تیری محبت کے کیا داغِ محبت ہات آئے / باغ میں ایسے گل بوٹے نہ فلک پر ایسے تارے ہیں

چتون جنکی قہر الٰہی تیور جن کے قہر خدا / کون کہے ان بانکوں سے یہ تم نے ناوک مارے ہیں

سیر ہوئی کب چشمِ تمنا ذوقِ نظر بڑھتا ہی گیا / سیرِ جمالِ یار کی ہے کس لطف کے یہ نظارے ہیں

چھلنی چھلنی دل بھی جگر بھی روزن روزن سینہ بھی / ایک نگاہِ ناز نے تیری تیر ہزاروں مارے ہیں

کلبۂ احزاں گوشۂ عزلت حاصلِ لطفِ تنہائی / دنیا ہم سے کنارہ کش ہے ہم دنیا سے کنارے ہیں

اِسکی چمک پر جان تصدق اسکی کسک پر دل صدقے / دردِ محبت کی تکلیفیں راحت کے گہوارے ہیں

پھونک رہا ہے سوزِ نہانی کون اس آگ پہ ڈالے پانی / دل کی لگی نے آگ لگا دی داغ نہیں انگارے ہیں

لالہ رخوں میں عمر گذاری اور بہاریں بھی لوٹیں
آج بھی گل سے گالوں والے مجھکو مبارک پیارے ہیں

بادۂ عرفاں

از جناب سید شاہ اکرام الدین احمد صاحب عرفان رئیس اسلام پور، پٹنہ

تو ادھر مست طرب محو خود آرائی تھا — دل ادھر محو طلب تیرا تماشائی تھا
لے گئی آہ وہ سب اک نگہ شوخ تری — دل کا سرمایہ جو دعوائے شکیبائی تھا
مل گیا خاک میں وہ ضعف کے ہاتھوں یکسر — دل میں میرے جو سر بادیہ پیمائی تھا
کیا کہوں شغلۂ دشت نوردی ہمدم — آہ کچھ بھی نہیں عذر آبلہ فرسائی تھا
کیا کھلایا ہے گل زخم شہیداں نے چمن — اس ستمگر کو جو ذوق چمن آرائی تھا
اختلاط اہل جہاں سے انہیں کہنا تھا ہمیں — سچ ہے یہ امن کی جا گوشۂ تنہائی تھا
اب یہ کہتا ہوں مٹی اپنی جو ہستی صد حیف — اپنی ہستی پہ مجھے دعوی پیدائی تھا
ہے گل عارض جانانہ کی یہ خوشبو ورنہ — کب صبا تجھ میں یہ انداز چمن سائی تھا
شان کیوں بڑھتی نہ گلزار جہاں کی اس سے — حسن تیرا گل صد خوبی و رعنائی تھا
بزم ایجاد کا تو صدر نہ ہوتا کیونکر — خاص تو ہی سبب انجمن آرائی تھا

جان دی عشق میں عرفاں نے خرد مندی سے
لوگ کہتے ہیں کہ دیوانہ تھا سودائی تھا

نالۂ بلبل

از بلبل بہار حضرت سریر مینائی کابری گیاوی

کوئی یہ کہہ گیا ٹھوکر لگا کر میری تربت پر — کہو اب بھی نہ کیا ایمان لاؤ گے قیامت پر
ہمارا قتل آساں ہے اگر تم کو طبیعت پر — تمہیں قاتل کہے گا کون بھولی بھالی صورت پر
ابھی اے جوش گریہ ضبط غم سے کام لینا تھا — ڈبویا مجھکو پانی پھر گیا راز محبت پر
تہ خنجر یہ منظر بھی عجب منظر تھا اے قاتل — گلے پر تھا ترا خنجر نظر تھی تیری صورت پر
یہاں تو وعدہ دیدار تم نے حشر پر ٹالا — قیامت میں اٹھا رکھو گے اسکو کس قیامت پر
سر مرقد کہاں کی شمع کیسی پھول کی چادر — فقط اک بیکسی سر پھوڑتی ہے سنگ تربت پر
خیال وضع پاس آبرو و شرم رسوائی — یہ سب ہو جب رہے تھوڑا سا قابو بھی طبیعت پر
اثر کرتا ہے تجھ سے بھی دل میں حسن وشتہ ہے — دم زینت مجھے سکتہ ہے آئینہ کی حیرت پر
دوا کا ذکر کیا ہے آب خنجر کو ترستے ہیں — ستم یہ ہے کہ پانی بند ہے بیمار فرقت پر
اٹھانا آئینہ اور مسکرا کر ان کا فرمانا — مجھے بھی اب تو رشک آنے لگا ہے تیری قسمت پر
ستم سے بھاگ گئے ہیں بات کا پہلو بدلتے ہیں — ترس آ ہی نہیں سکتا انہیں میری مصیبت پر
کسی کی توبہ رہ سکتی نہیں برسات میں ساقی — اٹھا بادل تو بجلی گر پڑی زاہد کی نیت پر
ستمگر کی جفائیں جھیلیں دشمن کے سہے طعنے — ملیں دو دو سزائیں مجھ کو اک جرم محبت پر

افکارِ جمیل

از حضرت جمیل مظہری ام۔ اے پبلسٹی آفیسر صوبہ بہار

میں شبِ فراق کا خوابِ خوش ہوں جہانِ ناز و نیاز میں
میری زندگی نے حقیقتوں کو بدل دیا ہے مجاز میں

نہ فروغِ حسن ہے مضمحل نہ مزاجِ عشق ہے معتدل
وہی ایک محشرِ آب و گل کہیں سوز میں کہیں ساز میں

مرے شوق نے جو تری نظر سے ترے جہاں پہ نگاہ کی
تو نہ پستیاں تھیں نشیب میں نہ بلندیاں تھیں فراز میں

جو فزوں ہے جذبۂ بندگی تو ہے شوق مائل بت گری
کہ ازل سے فطرت آذری ہے مرے مذاق نیاز میں

جو یہی مزاج ہے حسن کا تو کسے ہو عشق کا حوصلہ
نظر آرہا ہے کسی کا دل مجھے شمع تیرے گداز میں

تیرے گیسوؤں ہی کی داستاں نہیں یہ ہے ختم پہ داستاں
کہ جنوں کے اور بھی سلسلے ہیں ہوس کی زلفِ دراز میں

یہ خودی کہ عارضِ مہوشاں میں بھی محو خودنگری رہا
مرا آئینہ جو بچا ہوا تھا مذاقِ آئینہ ساز میں

نہ کہیں جہاں میں جگہ ملی تو نمودِ حسن میں کھل پڑیں
وہ حقیقتیں جو مچل رہی تھیں کسی کے سینۂ راز میں

یہ وہ زندگی ہے جمیل سے بھی جو آجتک نہ سلجھ سکی
جو الجھ گیا سو الجھ گیا خم و پیچ زلفِ دراز میں

نقوشِ عابدؔ

از جناب سید زین العابدین صاحب عابدؔ نقوی ایم۔ اے (مصنف دل) گیتا

گئے دین و ایماں بھی اس عاشقی میں
خدا جانے کیا کہہ دیا بیخودی میں
تمہیں نے زمانہ سے مجھکو چھڑایا
تمہیں یاد آتے ہو اب بیکسی میں
مرے عشق کے حوصلے بڑھ رہے ہیں
مزا آرہا ہے تری بے رخی میں
یہ کیوں اپنے جلووں کو دیتے ہو زحمت
بھلا ہوش باقی بھی ہے اب کسی میں
مجھے اپنی ہستی کا احساس ہوتا
نہ وقت آیا ایسا کبھی زندگی میں
تڑپتا ہوا دیکھ لو آ کے مجھکو
مرا غم منا لو مری زندگی میں
اسی سمت ہے منزلِ عشق اے دِل!
نگاہیں مڑیں جس طرف بے بسی میں
کِیا اعتبار اُن کے وعدوں پہ عابدؔ
نظر آئی تسکیں کی صورت اسی میں

اِدّعا

از حضرت تمنا عمادی مجیبی پھلواروی

دل نشیں ہوتی نہیں مسند بیانِ ادعا
کند ہے ہر چند قینچی سے زبانِ ادّعا

رفعت افزائی ترفع میں نہیں اُسے مِلی
پست ہے گو ظاہرا اونچی ہے شانِ ادّعا

یاد رکھو وہ اُسے واپس ہی کر دیگا نہیں
جس کے آگے لے گئے تم ارمغانِ ادّعا

کچھ مزا آئے نہ ان کا ہو سکے ہضم صحیح
لاکھ ہیں الوانِ نعمت زیبِ خوانِ ادّعا

سننے والے سن نہیں سکتے ہیں تھوڑی دیر بھی
اور ہوتی ہے مطول داستانِ ادّعا

تم غلط سمجھے ہو اس کو زینۂ بامِ عروج
ہے یہ قعرِ ذلت زیرِ بامِ ادعا

مدعا کھو بیٹھتا ہے یا تو ہے وہ مدعی
جس کے دعوی پر ہو سامع کو گمانِ ادعا

اس کا چلّہ چڑھ نہیں سکتا چڑھانے سے کبھی
صرف کھلانے کا حربہ ہے کمانِ ادعا

سر کے بل گرتا ہے آخر منہ اٹھا کر جو چلا
منھ کی کھاتے ہیں سراسر خوگرانِ ادعا

شکل محبت کی ہو کیوں پیدا دمِ عرضِ دلیل
کیوں کوئی دعوی کرے کوئی بلسانِ ادعا

تم نے تو جب سے تمنا دونوں آنکھیں پائی ہیں
ٹکٹکی مفروضوں ہی کو دیکھ تر زبانِ ادعا

مئے ہر دو میخانوں کی اک جام میں

از یادگارِ حضرت کوثر خیرآبادی جناب رسا ہمدانی رسیں گیا۔ ایم۔ اے (آنرس) گولڈ میڈلسٹ

(ایک قافیہ کا رنگ تغزل)

وہ کہاں ہے گردشِ ایام میں
جو مزہ ساقی ہے دورِ جام میں

ہے نہاں حسرت دلِ ناکام میں
مئے بھری ہے ایک ٹوٹے جام میں

آہ جو نکلی الم سے دل میں تھے
ہے شراب تند الٹے جام میں

چشمِ ساقی کا تصور دل میں ہے
مئے ہر دو میخانوں کی اک جام میں

میکدے میں شیخ نے چپکے سے کل
رکھ لئے توبہ کے ٹکڑے جام میں

آہ! وہ ساقی کی چشمِ نیم باز
مست ہو جاتا ہوں آدھے جام میں

مٹ کے بھی ہم مٹ نہیں سکتے کبھی
مئے بقا کی ہے فنا کے جام میں

لطف یہ ہے فیضِ کوثر سے رسا
بادۂ کوثر ہے میرے جام میں

رنگ شفق

از مولانا ابو احمد عبداللہ تاب صاحب شفق ایڈوکیٹ۔ گیا

کشمکشِ حدوث میں زندگی ایک خواب ہے
سلسلۂ سکون میں لمحۂ اضطراب ہے

ہماری بادہ خواری کی کرامت دیکھ اے زاہد — جہاں ہم بیٹھ جاتے ہیں وہیں میخانہ ہوتا ہے
محبت میں کبھی جلنے کی جل کر خاک ہونے کی — تجھے ہوتی نہیں پروا وہی پروانہ ہوتا ہے
جنوں افزا تھا کتنا یہ میرے معشوق کا کہنا — نہیں دیوانہ بننے سے کوئی دیوانہ ہوتا ہے
مجھے بیدل[1] بھی دل سے یاد کرلیتے ہیں اے کشتہ
جہاں بزم ادب[2] کا جلسۂ سالانہ ہوتا ہے

لبریز مئے شوق یہ ساغر تو نہیں ہے

از جناب توحید عظیم آبادی

ہم رنگ مرے دل کا گل تر تو نہیں ہے — لبریز مئے شوق یہ ساغر تو نہیں ہے
شرمندۂ احساں ہوں ترا اے طپش شوق — میں جیسا ہوں ایسا کوئی مضطر تو نہیں ہے
رہ رہ کے کھٹکتا ہے یہ کیا سینے کے اندر — حسرت جسے کہتے ہیں وہ نشتر تو نہیں ہے
کہتے ہیں کہ تم جیسے ہوئے ہیں بہت عاشق — ہم جیسے ہیں ایسا کوئی دلبر تو نہیں ہے
ارمان نکلتا نظر آتا نہیں اپنا — شمشیر تری میان سے باہر تو نہیں ہے
دل میرا سنبھلتا بھی نہیں ہات میں تم سے — پھر یہ بھی کہے جاتے ہو مضطر تو نہیں ہے
سنتے ہیں مرے شعر تو وہ کہتے ہیں توحید
دیوانہ ہے کمبخت سخنور تو نہیں ہے

ہوتی ہے اب تو وحشت دو چار آدمی میں

از جناب سید بدرالدین احمد صاحب صابر رضوی مخدوم آبادی سہریکی

حد سے گذر نہ جائے ہرگز کوئی خوشی میں — دیکھا گیا ہے آنسو گرتے ہوئے ہنسی میں
جو کچھ نہ ہو وہ تھوڑا ہے نفس پروری میں — عمر عزیز کھوئی دشمن کی دوستی میں
ناموس کی بھی پروا رہتی نہیں ہے باقی — کر بیٹھتا ہے سب کچھ انسان بے بسی میں
ہوش و حواس رکھ کر سنبھلے تو کیا عجب ہے — جب لطف تھا کہ لغزش ہوتی نہ بیخودی میں
دل دے رہے ہیں اسکو ہم بیوفا سمجھ کر — اللہ یہ اندھیرا اور وہ بھی روشنی میں
تھا دوستوں کا مجمع اکدن خوشی کا باعث — ہوتی ہے اب تو وحشت دو چار آدمی میں
دولت بھی صابر کو کچھ ہوتی تو کیا نہ کرتا
شاہوں سے بھی غنی ہے دل اس کا مفلسی میں

پھول

از جناب شاہ علی تنطاری صاحب رئیس پنہسہ

دلکش ہوئے چمن میں جو اس گلبدن کے پھول — غیرت سے زرد پڑ گئے سارے چمن کے پھول

---

[1] جناب عبدالمنان صاحب بیدل - پروفیسر پٹنہ کالج [2] بزم ادب پٹنہ کالج

یکساں گواہ ہیں تری صنعت کے خار و گل
ہیں آنکھ والوں کے لئے کانٹے بھی بن کے پھول

ہر دم ہے انقلاب یہاں کس کو ہے ثبات
دو دن کی تازگی پہ نہ پھولیں چمن کے پھول

بزم جہاں میں کون ہوا کس کا آشنا
غافل! اس انجمن پہ نہ بے عقل بن کے پھول

ہر دم ہے رنج فرقت جاناں سے لالہ زار
ہیں کیا سدا بہار دل پُر محن کے پھول

آنکھیں اگر ہیں انکی بھی نرگس کے پھول ہوں
قطرات اشک اپنے بھی ہیں نسترن کے پھول

دشنام میں بھی اس کے عجب لطف ہے علی
گویا برستے منہ سے ہیں اس گلبدن کے پھول

کمال رضا

از مولانا حکیم سید محمد طٰہٰ صاحب کمال ندوی

جس حال میں رکھتے ہو اس حال میں رہتے ہیں
ہم ناز اٹھاتے ہیں ہم جور بھی سہتے ہیں

اچھا ہے جو کہتے ہیں وہ ان کو زلال دل!
ہیں اشک نہیں سمجھو آنکھوں سے جو بہتے ہیں

اللہ ری ناچاری اکتا کے کہے ہمدم
رو رو کے خدا جانے کیا بات یہ کہتے ہیں

در پہ ہیں کبھی آنکھیں دیوار کو تکتی ہیں
یوں کلبۂ احزاں میں اب ہم پڑے رہتے ہیں

جس حال میں وہ چاہیں رکھیں بخوشی ہم کو
مرضی پہ کمال انکی ہم شوق سے رہتے ہیں

تمہیں کیا ہو گیا کیوں چشم تر ہے

از جناب سید محمد ایوب قمر دانگلوی

ستارہ بخت کا آج اوج پر ہے
مرے پہلو میں وہ رشک قمر ہے

نہ اب انکی نہ اپنی ہی خبر ہے
مآل زندگی درد جگر ہے

چلے جاتے ہیں مثل شمع اغیار
کرم کی مجھ پہ جو انکی نظر ہے

تغافل کا ترے بے جا ہے شکوہ
میری آہوں میں خود ہی کب اثر ہے

ستم ہے مسکرا کر ان کا کہنا
تمہیں کیا ہو گیا کیوں چشم تر ہے

بہار کے زخم دل کا حال سنکر
لگے کہنے یہ الفت کا ثمر ہے

سوئے میخانہ واعظ جا رہا تھا
سنا ہے اب تو وہ کچھ راہ پر ہے

وہی ہے جستجوئے لیلیٰ حسن
وہی بیتابیٔ قلب و جگر ہے

جناب منذر کا ہی فیض اے قمر
کہ معنی آفریں تیری نظر ہے

بادۂ میکش

از جناب مشہور عالم میکش عظیم آبادی - جمشید پور

گر کر قدم پہ ساقی رعنا کے پی گیا
مائل بہ لطف اسکو غرض پا کے پی گیا

اے ہوش! تیری خیر ہو ساقی کے ہاتھ سے
پیمانے نکلے آج میں گھبرا کے پی گیا

جب میری بیخودی کو مٹانے لگی خرد
بد مستیوں کی اپنی قسم کھا کے پی گیا

میخانۂ خیال کی بد مستیاں نہ پوچھ
یاد دل شراب عشق کے برسا کے پی گیا

میکش ہوں میں غم کو سمجھتا ہوں نوش جاں
چند آنسوؤں کو آنکھ میں چھلکا کے پی گیا

رباعیات :-

"رباعیات صبیح"

از مولانا سید شاہ صبیح الحق صاحب عمادی خانقاہ عمادیہ - پٹنہ

ظاہر میں اگرچہ دلربا ہے دنیا — لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کیا ہے دنیا
پھندے میں نہ اس کے کبھی آنا اے دل — آفت ہے، مصیبت ہے، بلا ہے دنیا

مانا کوئی راحت مری قسمت میں نہیں — قسمت کو بدلنا بھی تو قدرت میں نہیں
ہوگا وہی، ہوگی جو خدا کی مرضی — انسان کا کچھ دخل مشیت میں نہیں

اس عشق میں آتی ہے بلا روز نئی — دکھلاتے ہیں وہ اپنی ادا روز نئی
عاشق ہیں نئے ہم، نہ وہ معشوق نئے — ہوتی ہے مگر ہم پہ جفا روز نئی

اگلی سی زمانہ کی وہ حالت نہ رہی — وہ ربط باہم اور وہ الفت نہ رہی
اپنوں ہی نے اس طرح کے آزار دئے — غیروں سے مجھے کوئی شکایت نہ رہی

افکارِ فلسفی

از جناب مولوی سید راحت حسین صاحب فلسفی بی - ایل -

کبھی اسرارِ محبت کا میں دم بھرتا ہوں — کبھی فطرت کے حقایق پہ نظر کرتا ہوں
جان کیا چیز ہے؟ میں کیا ہوں؟ یہ دنیا کیا ہے — رازِ سربستہ! تماشوں پہ ترے مرتا ہوں

غافل نہ ہوے دلی کا عادی — ہے اس کا نتیجہ نامرادی
جب تک نہ ہو ذوق دل میں پیدا — بڑھتی نہیں قوتِ ارادی

ہستی

از مولوی سید محمد ایوب صاحب شمیم ندوی

مشہور ہے دنیا میں حباب ہستی — ہے بلبلہ پانی کا شباب ہستی
ہاں دیکھ کے مضراب لگا نغمہ سنج — اک ضرب میں ٹوٹے گا رباب ہستی

نوٹ :- (بقیہ رباعیات ملاحظہ ہوں صفحات ۴۰۸--۴۱۰-۴۲۱- ۴۲۳ پر)

تصویرجذبات :-

حسن ومحبت کا تذکرہ

از جناب سید عزیزالحسن صاحب ضیا بازیدپوری

کوئی شخص حسن ومحبت کا نام نہ لے۔
کوئی شخص حسن وجمال کے تذکرے نہ کرے۔
میرا غم آلود دل اس کے تذکرے سے رو رو اٹھتا ہے
میں حسن ومحبت کی باتیں سن سن کر پریشان ہوجاتا ہوں
اس لئے کہ آہ!
میں نے بھی کسی سے محبت کی تھی'
میں بھی حسن ومحبت کا دلدادہ تھا۔
مدتوں میں اس کی محبت میں سرشار رہا۔
ہائے! ہائے! جو اب دنیا میں باقی نہیں
یہ خیال کتنا حزن آمیز ہے کہ انسان جس سے محبت کرے' وہ باقی نہ رہے!
جس سے ساری امیدیں' ساری خوشیاں وابستہ ہوں'
وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلے'
وہ ایسی نیند سو رہے' جس کو دنیا کی کوئی آواز جگا نہ سکے!
ہائے یہ خیال کتنا ملال پرور ہے
جب وہ زندہ تھا' میں کن کن خوشیوں سے خود کو گھرا ہوا پاتا تھا!
جب وہ تقید حیات تھا' میری دنیا میں بھی چاندنی امرت لٹاتی تھی'
میری دنیا میں بھی پھول کھلتے تھے ——— طرح طرح کے پھول
میرے دل میں بھی آرزوئیں تھیں' تمنائیں تھیں۔ اسوقت میرا دل ایک
نوشگفتہ پھول کی مانند تھا۔
اور اب آہ! اس کے مرنے کے بعد'
میرا دل سرد ہوچکا ——— میرے دل میں کوئی آرزو نہیں مجھے اچھی
سے اچھی چیز نہیں بھاتی! خوشی میرے لئے غم کا پیام لاتی ہے' اور خون کے
آنسو رلاتی ہے۔
اس لئے اے لوگو!
حسن ومحبت کا تذکرہ نہ کرو
مجھے اس کے تذکرے سے اس کی محبت کی بہار آفریں راتیں' اور
دل خوش کن ایام یاد آتے ہیں۔
وہ وقت یاد آتا ہے جب وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دیتا
تھا' اور اس کی تبسم ریزی میری کائنات دل میں ہنگامہ پیدا کردیتی تھی
وہ مسرت کے نورانی لمحے یاد آتے ہیں' جب ہم دونوں بہار کی نشاط
افزا راتوں میں چمن میں آزادانہ پھرا کرتے تھے
اسوقت چاندنی اس طرح پھیلی رہتی تھی' جیسے نور کا دریا بہہ رہا ہو'
اور خوشگوار ہوائیں ہمیں مس کرتی تھیں' اور ہم بے انتہا مسرور ہوتے تھے
اور اسوقت حسن کی سب ادائیں میرے لئے وقف ہوتی تھیں
مگر آہ' اب وہ دن بیت گئے۔
اب اس کا حسین چہرہ کبھی نظر نہ آئے گا!
اس لئے لوگو! حسن ومحبت کا تذکرہ نہ کرو
حسن ومحبت کا تذکرہ میرے کانوں میں تیر بنکر پہونچتا ہے
بس! بس!
اب مجھ میں سننے کی تاب نہیں۔

سنگدل حسینہ

از جناب ملک فضل امام صاحب شیدا کیوردی - پٹنہ

اے سلح بند نوجوان! تو افسردہ و تنہا کیوں بھٹکتا پھر رہا ہے
تیرا چہرہ غم سے کیسے کہ پتے کی طرح پیلا ہو رہا ہے
بہار رنگ بھی جھیل کے کنارے کی سرسبز گھانس کا مخملی فرش خشک ہوگیا
پرندے اپنا نغمہ ختم کرچکے ہیں۔
آہ! اے بدبخت وناشاد انسان تیرے پژمردہ چہرہ پر رنج وغم
کے یہ آثار کیوں ہیں؟
دنیا مسرور و شاد کام ہے۔ گلہری نے سال بھر کے لئے دانے کا
ذخیرہ جمع کرلیا' کسان اپنی فصل کاٹ چکے ہیں۔

تیری پیشانی کے کنول کا رنگ فق ہوا جاتا ہے اور اس پر اندوہ و یاس کی اوس پڑی ہوئی ہے۔ تیرے عارض گلگوں خزاں رسیدہ پھول دیکھتے دیکھتے نذرِ خزاں ہوئے جا رہے ہیں۔

مرغزار میں ایک حسین خاتون میری نگاہوں کے سامنے آئی اسکی نظر سے شراب کی سی ننھی ننھی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ جن سے روح میں سیکڑوں سرور کی لطیف کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ایک تصویر تھی رعنائی ——— ایک مجسمہ تھی خندانی۔

میں نے اسے اپنے سبک رفتار گھوڑے پر بٹھا لیا۔ تمام دن وہ میری رفیقِ سفر رہی اور مجھے اسکے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ وہ گھوڑے پر کبھی ایک طرف جھکتی اور کبھی دوسری طرف۔ اور پریوں کا سا کوئی نغمہ چھیڑتی۔

میں نے اس کے سر کے لئے پھولوں کا تاج بنایا۔ اس کے ہاتھوں کے لئے پھولوں کے گجرے اور اسکی کمر کیلئے پھولوں کا ایک پٹکا۔

جب وہ میری طرف دیکھتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی ساری رعنائیاں سمٹ کر میری آنکھوں ہی آنکھوں میں آ گئی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں محبت کا رس بھرا ہوا ہے۔ اور وہ میٹھے میٹھے نالے بلند کر رہی ہے۔ اس نے مجھے خودرو پھول پھل میٹھا میٹھا شہد اور جنگل کی قدرتی نعمتیں لا کر دیں۔ اور یقیناً میں نے آنکھوں کی عجیب و غریب بان سے یہ بھی کہا کہ مجھے تم سے سچی محبت ہے۔

وہ مجھے اپنے پریوں کے مسکن میں لے گئی۔ جہاں اس نے مجھ پر اپنی پرشوق نگاہیں جما دیں اور لمبی لمبی سرد آہیں بھریں۔

میں نے اسکی غمگین اور وحشی آنکھوں کو نرمی سے بند کیا اور انکو چوم چوم کر اسے سلا دیا۔

پھر ہم گھاس کے فرش پر اونگھتے رہے اور آہ اس پہاڑ کی ٹھنڈی زمین پر میں نے وہ آخری خواب دیکھا ——— جس کے بعد میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے نیند سے محروم ہو گئیں۔

مجھے زرد رو بادشاہ شہزادے اور سپاہی نظر آئے۔ ان سب کے چہروں پر موت کی سی زردی چھا رہی تھی۔

وہ بہ یک زبان کہہ رہے تھے کہ سنگدل حسینہ نے تجھے اپنا حلقہ بگوش بنا لیا ہے۔ میں نے ڈوبتے ہوئے سورج میں اس کے ہونٹوں کو دیکھا جن پر پپڑیاں جمی ہوئی تھی۔

میں چونک کر اٹھا اور میں نے اپنے آپکو پہاڑ کی ٹھنڈی زمین پر یک و تنہا پایا یہی وجہ ہے کہ میں نے یہاں ڈیرہ ڈال رکھا ہے اور افسردہ و تنہا بھٹکتا پھرتا ہوں۔ حالانکہ جھیل کے کنارے کی سرسبز گھاس خشک ہو گئی ہے۔ اور پرندے اپنا نغمہ ختم کر چکے ہیں۔

(کیٹس)

کیوپڈ

از جناب ملک ولی امام صاحب شباب کیوروی - پٹنہ

میں گہری نیند کی ان عمیق ترین گہرائیوں میں پڑی تھی جن سے میں پہلے آشنا نہ تھی کہ ایک عریاں لڑکے نے آ کر میرے دروازہ کو کھٹکھٹایا اور ایک شور برپا کر دیا۔

وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ باہر بادل گرج رہے تھے۔ موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ اور بجلی بار بار چمکتی تھی۔ میرا بھولا دل بہت نرم واقع ہوا ہے۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور وہ لڑکا اپنے کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

میں نے اس سے اس کا نام دریافت کیا لیکن اس نے کہا کہ میں اپنا نام بھی بتاؤنگا۔ ابھی میں سردی سے کانپ رہا ہوں۔ مجھے آگ کی ضرورت ہے۔ جو میرے جسم کو گرما دے۔ میں بالکل بھیگ رہا ہوں۔

وہ اپنی کمان کو نہایت احتیاط سے اٹھائے ہوئے تھا۔ اور اسے ڈر تھا کہ کہیں بارش نے اسکی تانت کو خراب نہ کر دیا ہو۔

وہ کانپ رہا تھا اور مجھ سے آنکھیں نہ ملانا چاہتا تھا۔ میں نے اسکے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے ننھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور کہا یہ بچہ ہی ہے۔ خوف کی کونسی بات ہے۔

لیکن اس لڑکے نے شوخی سے اپنے سر کو اس طرح حرکت دی کہ اسکے دلکش لمبے سنہری بال ادھر ادھر ہو گئے۔ اور گوری گوری پیشانی نظر آنے لگی۔ اس نے اپنے ترکش سے ایک دل آویز تیر نکالا۔ اور پھر خطا نہ ہونیوالے نشانے سے میرے سینہ پر کھینچ مارا۔

اور بولا لو اب وفا لڑکے تیرا خوفناک اور مسرت بخش نام معلوم ہوتا ہی ہوں۔ آہ! یہ تو نے میری مہربانی کا اجر دیا ہے۔ شوخ دیوتا شرارت آمیز ہنسی کے ساتھ بولا۔

طوفان کی ان شورشوں کے باوجود جنکی اسوقت فضا پر حکومت ہے میری کمان محفوظ ہے۔ لیکن اے بھولی لڑکی کیا تو کہہ سکتی ہے کہ تیرا دل بھی محفوظ ہے؟

(انگریزی سے)

نوادرات:۔ عکس وصلی تحریر نمودہ حضرت سید شاہ اکرام الدین احمد صاحب عرفان رئیس اسلام پور

قند پارسی:-

گلگونۂ شفق

جناب شفق کے سوانح میں موصوف کی خوشخطی کا ذکر آیا ہے۔ اسلئے مناسب نظر آیا کہ موصوف کی غزل کو موصوف کے عکس تحریر کیساتھ پیش کیا جائے۔
(ندیم)

غزل تازہ در زمین تازہ از ناچیز شفق بے خبر
برائے نذر سخنور فرخندہ سیر جناب حسن والا گہر

ـــــــ ۲۶ ـــــــ

رنگِ چمن از جوشِ بہاراں خبرم داد　　داماں گُل از چاک گریباں خبرم داد
ازناوکِ تو جنبشِ مژگاں خبرم داد　　قرباں نگاہیکہ بہ پیکاں خبرم داد
از سیلِ بلا دیدۂ گریاں خبرم داد　　دریا شد و ہر قطرہ ز طوفاں خبرم داد
ہر آبلۂ اشک فشانِ کفِ پایم　　از تشنگیِ خار مغیلاں خبرم داد
ہر ذرۂ خاکِ من سرگشتہ و حیراں　　از گرد جنوں خیز بیاباں خبرم داد
خاکسترِ دل یافت ز پروانہ فروغے　　سوزِ جگر از شمعِ شبستاں خبرم داد
با وسعتِ اندیشہ دلِ تنگِ من آخر　　صحرا شد و از گوشۂ زنداں خبرم داد
خورشیدِ جمالِ تو سرِ عرصۂ محشر　　بے پردہ ز حسنِ رُخِ تاباں خبرم داد
وارفتگی از آئینۂ حُسنِ تو افزود　　آشفتگی از زلف پریشاں خبرم داد
بیچارگیِ من خجل از چارہ گراں شد　　دردِ دلم از منّتِ درماں خبرم داد
دردے بدل از ہجرِ تو بیتاب و تپاں کرد　　جانے بلب از وصلِ تو جاناں خبرم داد
از گریۂ بیخوابیِ من پنجۂ مژگاں　　گوہر بکفِ اشک بداماں خبرم داد
داغے بجبیں بردرِ بتخانہ نشستہ　　از سجدۂ سنگِ درِ جاناں خبرم داد
چوں منفعل از جرم و خطا دیدہ بمحشر　　لطفِ تو ز آمرزشِ عصیاں خبرم داد
نازم بہ عطائے نگہِ مستِ تو ساقی　　در بیخبری از مےِ عرفاں خبرم داد

نیرنگیِ بختم شفق آورد پیامے
صبحِ وطن از شامِ غریباں خبرم داد

کلام حسن

از جناب سید حسن امام صاحب حسن رکن ادارہ شعبۂ منظومات "ندیم"

سرگشتگی از گردش دوران خبرم داد وز آبلہ پا خارِ بیابان خبرم داد
از درس فسون نرگسِ فتان خبرم داد وز مشق جنوں چاک گریبان خبرم داد
از سوزِ دلم سروِ چراغان خبرم داد وز سیل غمم گوشۂ داماں خبرم داد
از داغ غلامی ست طلوعِ مہِ کنعاں آسودگی از خوابِ پریشان خبرم داد
تا رازِ انا الحق بکسے باز نہ گویم از نفس خودم مستیِ عرفان خبرم داد
تاثیر عجب ریخت زچشمم دمِ آخر یک قطرہ سرشکے کہ ز طوفان خبرم داد
دامانِ ترم آتشِ شوقِ تو برافروخت وز عفو اثم لذتِ عصیان خبرم داد
بد مست کہ بیہودہ دہد راز ز دل باز از موجۂ گل گوشِ بہاران خبرم داد
ہر خار کہ بوسید کفِ پائے جنونم! در دل ز گلشکاریِ پیکان خبرم داد
پروانہ ہم از رشکِ جگر سوزیِ من سوخت وز داغِ دلم شمعِ شبستان خبرم داد
ہنگامِ بہار آمد و بلبل بفغاں شد آشفتہ بیانے چہ پریشان خبرم داد
شد طائرِ جاں از قفسِ عنصری آزاد خاموشیِ پر معنیِ زندان خبرم داد
صد دردِ سر افزود ز سامانِ مداوا دردا کہ نہ از حاصلِ درماں خبرم داد

در جامِ شفق دوش حسن خونِ جگر ریخت
ہنگامِ سحر سر بگریبان خبرم داد

(ولہ)

طوفانِ بلا چشمِ پر آب دلِ ما ریخت بر ساحلِ تمکین خود آب دلِ ما ریخت
جز چشمِ قبولِ شہِ لولاک نداریم این گوہرِ شہوار سحاب دلِ ما ریخت
از شوقِ تو جبریل چنان گرم روی داشت آمد شبِ معراج و شتابِ دلِ ما ریخت
اینک شبِ عصیان و سحرگاہِ کرامت تعبیر ز چشمِ تو بخوابِ دلِ ما ریخت
زیں تند خرامیِ براقِ شہِ کونین سر فتنۂ شوخی بشبابِ دلِ ما ریخت

معمورۂ پندار حسن شد کفِ صحرا
این خانہ برانداز خرابِ دلِ ما ریخت

عکس تحریر حضرت شفق

چند حرف مزخرف از نتائج انامل شفق رضوی برائے تلمیذ
بر غزل لاجواب عالیجناب سید حسن امام صاحب وارثی

چوں سوز غم عشق تو آب دل ما ریخت — خون جگر ما بہ کباب دل ما ریخت

مستی مے حسن تو آب دل ما ریخت — از دیدۂ مخمور شراب دل ما ریخت

عشق تو نہاں داشت چو سیلے تہ مژگاں — طوفاں بہ سر خانہ خراب دل ما ریخت

ہیہات کہ چوں برگ خزاں دیدہ ز صرصر — تازہ ورق غم ز کتاب دل ما ریخت

از دیدۂ خونبار چو کردند صوائے — گلہا سر مژگاں بجواب دل ما ریخت

تعمیر خرابات شد از پیکر خاکی — چوں روز ازل قطرۂ آب دل ما ریخت

رازیکہ نہاں بود پس پردہ عیاں شد — حسن تو بیک جلوہ حجاب دل ما ریخت

شبہا صفت طالع بیدار زلیخا — تعبیر مہ مصر ز خواب دل ما ریخت

دردا شفق آئینۂ نیرنگی دوراں
از پیری ما رنگ شباب دل ما ریخت

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

از جناب خان بہادر نواب سید احمد علی خاں صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر رئیس عظیم آباد

باروئے جبین مہ من شمس ضحیٰ ہیچ — باشد ز جبین تہ مو بدر دجیٰ ہیچ

مارا ہمہ دم آہ و بکا صبر و رضا ہیچ — اورا ہمہ تن جور و جفا مہر و وفا ہیچ

باللہ چہ انگارم ز غدو ابرو و خالش — ہیچیست قمر ہیچ ہلال است سہا ہیچ

درست رخ او کہ برش حور نثار است — وصف گل رخسار بجز صل علیٰ ہیچ

واعظ کہ بہ بر دلق و بکف سبحہ دارد — در دل بودش پاس ورا خوف خدا ہیچ

افسوس بر آں دل کہ بر او نقش ولا نیست — سنگیست کہ آں را بجہانست بہا ہیچ

روبہ چہ کند زعم تقابل بہ غضنفر — مکر است ورا فربہ بہ تن تاب و قوا ہیچ

بے نور و لا تیرہ دروں می بود انساں — دارد ہمہ تن شین ریا زین صفا ہیچ

چوں ماہ من اصلا نبود ماہ کہ ہر شب — بے پردہ بروں آید و در چشم حیا ہیچ

خورشید جبیں باشد براں شوخ سخن ساز — گو نام ذکا ہست و لے ذہن او ذکا ہیچ

دل صید کمند خم گیسوے بلند نیست — در مخلصی اش کار کند بخت رسا ہیچ

از باد حوادث بہ خطر شمع حیاتست — اسباب فنا وافر و امید بقا ہیچ

مارا مرضے ہست کہ دارد نہ علاجے — در فعل دوا عاجز و تاثیر دعا ہیچ

ما جاہل محض ایم و بلا وجہ شہیریم — گمنام بدن بہ کہ بود نشو و نما ہیچ

احمد بود ایں مصرع مشہورہ خور ما — عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

قطعہ تاریخ وفات

حضرت سید شاہ حسین الدین احمد صاحب منعمی علیہ الرحمہ

از جناب سید ریاض حسن خاں صاحب خیال رئیس مظفرپور

حسین الدین احمد منعمی رفت ❊ جہانے شد حزیں از فرقت او

زہے صوفی منش صافی نہادے ❊ تعالی اللہ صفائے طینت او

نمایاں جلوۂ عرفاں ز رویش ❊ درخشاں نور حق از طلعت او

جمال ظاہر و ہم حسن باطن ❊ عیاں از صورت و از سیرت او

فیوض بوالعلا و شاہ منعم ❊ شدے حاصل ز فیض صحبت او

بوقت چاشت در دیگر جمادی ❊ بروز شنبہ نہم شد رحلت او

دعا این ست و تاریخ وصالش ❊ منور باد الٰہی! تربت او

۱۳۵۸ھ

دیگر

چوں حسین الدین احمد از جہاں ❊ رخت برد و جا بہ علیین گزید

گفت تاریخ وصال او سروش ❊ در جوار رحمت ایزد رسید

۱۳۵۸

قطعۂ تاریخ طبع "بہار نمبر" سنہ ۴۰ء

از جناب خان بہادر نواب سید احمد علی خان صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر رئیس عظیم آباد

ہزار شکر الٰہی ندیم یافت شیوع　　بہ صوبہ ہائے بعید و بہ شہر ہائے قریب

بود رسالۂ سالانہ قابل تعریف　　تو گفتنی کہ بود شان آں عجیب و غریب

چہ بے عدیل مضامیں چہ بے مثیل اشعار　　چہ اہتمام بلیغ و چہ احسن ترتیب

بود مدیر صحیفہ ریاست ندوی　　فروغ بزم صحافت زہے ادیب لبیب

ز فیض او بہ گیا افتخار شد حاصل　　بہار از ریاضش بود بہار نصیب

زند بہ کشور انشا مساعیش سکہ　　بفیض احمد مختار و فضل رب مجیب

نوشت مصرع سالش دعائیہ احمد

ندیم باد ندیم سخن شناس و ادیب

۱۳۵۹

فرمان عالمگیر (دیکھیے مضمون قلعہ رہتاس)

قلعہ رہتاس

مسجد شیر شاہ مغل پورہ

روضۂ شیر شاہ سہسرام